الکوثر

فی تفسیر القرآن

محسن علی نجفی

جلد دوم

محسن علی نجفی

مِصْبَاحُ الْقُرآن ٹرسٹ۔لاہور

تفسیر

آل عمران ۔ النساء ۔ المائدۃ

نام کتاب: الکوثر فی تفسیر القرآن (جلد دوم)
مفسر: محسن علی نجفی
کمپوزنگ: حسن علی۔علی حیدری
فارمٹنگ: خادم حسین
انتظامی امور: علی حیدری
تعداد: ایک ہزار
باراول: ربیع الاول ۱۴۲۵ھ/اپریل ۲۰۰۴ء
بار دوم: شوال المکرّم ۱۴۳۰ھ/اکتوبر ۲۰۰۹ء
بارسوم: ذی القعدہ ۱۴۳۴ھ/ستمبر ۲۰۱۳
مطبع: شوکت پریس ۔ لاہور
پیشکش: جامعۃ الکوثر۔ اسلام آباد
ناشر: مصباح القرآن ٹرسٹ۔ لاہور
فون: 0321 448 1214
ای میل: info@misbahulqurantrust.com
ویب: www.misbahulaqurantrust.com

اس کتاب میں نقل شدہ اکثر روایات کے متن اور حوالوں کی اصلاح و تطبیق، کتب احادیث پر مبنی سافٹ ویئر ''جامع الاحادیث'' تیار کردہ کمپیوٹر ریسرچ سینٹر آف اسلامک سائنسز اور المحدث سے کی گئی ہے۔
نہج البلاغۃ کے اکثر اقتباسات کا ترجمہ نہج البلاغۃ ترجمہ مفتی جعفر حسینؒ مطبوعہ امامیہ کتب خانہ لاہور سے نقل کیا گیا ہے۔
تشریح کلمات مفردات القرآن راغب اصفہانی، ترجمہ مولانا محمد عبدہ فیروز پوری سے ماخوذ ہے۔

ملنے کا پتہ: محمد علی بک ایجنسی۔ کراچی کمپنی۔ اسلام آباد
معراج کمپنی۔غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

قارئین کرام!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ!مصباح القرآن ٹرسٹ عہد حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں ایک عظیم اور پُر وقار مرکز کی حیثیت سے امت مسلمہ کے لیے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔ ادارہ ہذا کی یہ شہرت اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور آپ حضرات کی تائید واعانت کا ثمرہ ہے۔

خالقِ کائنات نے ''انسان'' کو روح و بدن سے مرکب، عقلِ سلیم اور قوتِ گویائی کی نعمات سے مالا مال فرما کر موجوداتِ عالم میں منفرد و ممتاز مقام عطا فرمایا ہے۔ جس طرح بدن کو اپنے ہی اعضا کی تقویت وارتقا کے لیے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح روح کی بلندی اور تازگی کے لیے زہد و تقویٰ سے ملبوس ہوکر علمی تفکر کے میدان میں اترنا پڑتا ہے۔ روحانی تسکین اور معرفت کی بلندیوں سے فیض یاب ہونے کے لیے آیاتِ قرآن پر غور وفکر کرنا، اس کے رموز وحقائق کو سمجھنا اور فرمودات الٰہی پر عمل پیرا ہو کر اپنی زندگی گزارنا آخرت کی کامیابی کا باعث ہے۔

بلاشبہ قرآنِ مجید دین اسلام کا حقیقی آئین و دستور ہے۔ دنیا کے ہر طبقہ اور ہر نسل کو اپنی استعداد کے مطابق اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت امام رضا علیہ السلام سے منقول روایت میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے سوال کیا گیا: کیا وجہ ہے کہ قرآن مجید کو جس قدر بیان اور نشر کیا جاتا ہے اسی قدر اس میں مزید تازگی آ جاتی ہے؟ جواب میں امام علیہ السلام نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو نہ ایک زمانے کے ساتھ مخصوص فرمایا، نہ کچھ لوگوں کے ساتھ، بلکہ یہ ہر دور میں جدت اور ہر قوم کے لیے قیامت تک تازگی رکھتا ہے۔''

کامیاب زندگی گزارنے کے لیے دنیا کے ہر شخص کے لیے قرآنی آیات کے مفہوم اور تفاسیر کا سمجھنا ضروری ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر علمائے اسلام نے عربی، فارسی، انگریزی اور دیگر کئی زبانوں میں

قرآن مجید کی بہت سی تفاسیر اورتراجم مرتب فرمائے ہیں۔ اس سلسلے میں برصغیر پاک و ہند کے اہل تشیع و اہل سنت علماء نے بھی اردوزبان میں قرآن کریم کے متعدد تراجم وتفاسیر پیش کیے ہیں۔ پاکستان میں اردو زبان میں طبع شدہ اکثر تراجم وتفاسیر انڈیا (لکھنؤ) کے مترجمین ومفسرین کی محنت کا نتیجہ ہیں۔لکھنؤ کی اُردو پاکستان کی موجودہ اردو سے ذرامختلف ہے۔

چونکہ دنیا کا ہرشخص دوسری زبانوں کے علاوہ اپنی قومی زبان بلکہ اپنے خطے کی زبان سے زیادہ مانوس ہوتا ہے لہٰذا خطے کی موجودہ اردو زبان کے پیش نظر اورقرآنی تصریحات کے بارے میں نئی نسل کی طرف سے اٹھنے والے سوالات کے جوابات اورجدید معاندانہ تحریروں اورالزام تراشیوں کے مقابلے میں مکتب اہل بیت علیہم السلام کا موقف بیان کرنے کے لیے ۱۰ جلدوں پر مشتمل زیرنظرتفسیرقرآن ”الکوثر فی تفسیر القرآن“ کی دوسری جلد قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ یہ تفسیری مجموعہ حجۃ الاسلام والمسلمین الشیخ محسن علی نجفی مدظلہ العالیٰ کی غیر معمولی مساعی اور شبانہ روز محنت کا ثمر ہے۔ خداوندعالم اُن کا سایہ ہمارے سروں پر قائم و دائم رکھے اورانہیں طاقت وصحت کی نعمت سے سرفراز فرمائے۔

اراکین مصباح القرآن ٹرسٹ قبلہ موصوف کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے ادارہ ہذا کو یہ تفسیری مجموعہ پرنٹ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

مزید برآں آپ ہماری کتب مصباح القرآن ٹرسٹ کی ویب سائٹ:

www.misbahulqurantrust.com

کے ذریعے گھر بیٹھے بھی پڑھ سکتے ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق مصباح القرآن ٹرسٹ کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے۔ اس گوہر نایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادہ فرمائیں گے اور ادارے کو اپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔

والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاهور۔

پاکستان

بسم الله الرحمن الرحيم

آغاز سخن

بسم اللّٰہ الرحمن الرحيم

الحمد للّٰہ الذی نزل علی عبده الكتاب۔ و الصلوٰة و السلام علی من اوتی الحكمة و فصل الخطاب و علی آله الذين لهم الزلفی و حسن مآب۔ و صُبّ علی اعدائهم من ربّهم سوطُ عذاب۔

قرآن مجید کی جلالت کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے تجلّی فرمائی ہے:

... فتجلی لهم سبحانه فی كتابه من غير ان يكونوا رأوه بما اراهم من قدرته و خوفهم من سطوته۔[1]

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں تجلّی فرمائی ہے، بغیر اس کے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کو دیکھیں بلکہ اپنی قدرت کی نشانیاں دکھا کر اور اپنی قہاریت کا خوف دلا کر (تجلّی فرمائی)۔

قرآن مجید میں تجلیات رب کا مشاہدہ اور اس کے معجزاتی پہلو کا مطالعہ کرنے کے لیے ایک خاص علمی بصیرت اور اس کے فکری آفاق کی بلندیوں میں پرواز کرنے کے لیے ایک طاقت ور شہپر کی ضرورت ہے۔

اس حقیر کو نہ صرف مذکورہ چیزیں میسر نہیں ہیں بلکہ تھکا دینے والی گونا گوں مصروفیات اور فکری و علمی ماحول کی عدم دستیابی جیسے نامساعد حالات سے دوچار رہتا ہے۔

اس کے باوجود یہ قدم اس لیے اٹھایا:

قرآن مجید سے ہر شخص اپنی بساط کے مطابق فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ قرآن مجید دریا کی طرح ہے،

---

[1] نہج البلاغۃ خ ۱۴۵

جس سے ایک شخص صرف اپنی پیاس بجھا سکتا ہے اور دوسرا شخص اس سے ایک سرزمین بلکہ ایک ملک کو سیراب کر سکتا ہے۔ ایک شخص قرآن مجید کی تحریر پر صرف نگاہ کر کے ثواب حاصل کر سکتا ہے، دوسرا شخص اس کے ذریعے ایک امت کو راہ راست پر لا سکتا ہے۔ یہ قدم اس لیے بھی اٹھایا کہ حقیر کو اپنی بساط کے مطابق اور قارئین کو اپنی توفیق کے مطابق قرآن مجید سے فیض حاصل ہو۔

نیز معلم قرآن حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تفسیری احادیث، جو ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں، سے ہم قرآن مجید سے ایک حد تک فیض حاصل کر سکتے ہیں،

نیز نئی نسل کی طرف سے اٹھنے والے سوالات کے جوابات دینا بھی ہماری ذمے داری ہے،

اور جدید معاندانہ تحریروں اور الزام تراشیوں کے مقابلے میں مکتب اہل بیت علیہم السلام کا موقف بیان کرنا بھی ہماری ذمے داری ہے۔

اس امید کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ کوشش قبول ہو تو میرے حسنات جاریہ میں شامل ہو اور سفر آخرت کی بیکسی اور بے بسی میں رفیق سفر ہو۔ مجھے امید ہے کہ قارئین محترم اس حقیر سی کاوش کو پسند فرمائیں گے اور میری غلطیوں سے مجھے آگاہ کریں گے اور درگزر بھی۔

میں جناب محترم السید اظہر علی رضوی دامت توفیقاتہ کا نہایت شکرگزار ہوں جن کی عرق ریزی سے اس تفسیر کی دوسری جلد کی طبع دوم اپنی طباعتی خوبیوں کے ساتھ طباعت کے مرحلے میں داخل ہو سکی۔ خداوند کریم انہیں ہمیشہ اپنی توفیقات خیر سے نوازے، جیسا کہ موصوف ایک مدت سے میرے دست راست بن کر ذریعۂ توفیق بن رہے ہیں۔

ان تمام علماء و مومنین کا بھی شکرگزار ہوں جنہوں نے میری اس حقیر سی کاوش کو پسند کیا اور میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

و السلام علیکم و رحمة اللّٰه و برکاته

محسن علی

ابن مولانا اخوند حسین جان تغمده اللّٰه بواسع رحمته

۱۳، رجب روز ولادت مولائے متقیان علی ابن ابی طالب علیه افضل الصلوة و السلام

۱۴۳۰ھ

☆☆☆☆☆

سُورَةُ آلِ عِمرَان

بسم اللہ الرحمن الرحیم
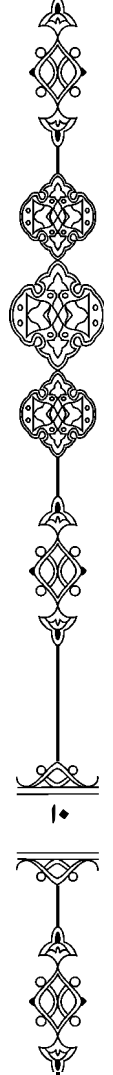
اس سورہ میں ایک مقام پر آل عمران کا ذکر آیا ہے، اس وجہ سے سورے کا یہی نام قرار دے دیا گیا۔ عمران حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے والد کا نام ہے۔ بائبل میں ان کا نام عمرام آیا ہے۔

شان نزول: شیخ طوسی التبیان میں بعض مفسرین کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ اس سورہ کی تقریباً ساٹھ آیات نجران کے وفد کی آمد کے موقع پر نازل ہوئیں۔

اس سورۂ مبارکہ کی تلاوت کرتے ہوئے ان حالات کو سامنے رکھنا ہو گا، جو بوقت نزول موجود تھے۔ یہ آیات اس وقت نازل ہوئیں، جب امت قرآن ناقابل تحمل اندرونی و بیرونی مشکلات سے دوچار اور اپنی تشکیل و تعمیر میں مشغول تھی۔ ہجرت کے بعد مدینہ، جو کہ ہر طرف سے دشمنوں میں گھری ہوئی ایک چھوٹی سی آبادی تھی، جس میں بے سر و سامانی کے عالم میں ایک جدید معاشرہ تشکیل پا رہا تھا، ان حالات میں اس تحریک کو درپیش ممکنہ مشکلات کے لیے رہنما اصول اس سورہ میں موجود ہیں۔ یہاں بتایا جا رہا ہے کہ عام حالات میں دشمنوں سے کس طرح کے تعلقات استوار رکھنے چاہییں نیز خاص اور معروضی حالات میں اس تحریک اور اس کے ارکان کے تحفظ کے لیے کیا حکمت عملی (تقیہ) اختیار کرنی چاہیے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	بنام خدائے رحمٰن رحیم
الٓـمّٓ ۟ۙ﴿۱﴾	۱۔ الف لام میم
اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ؕ﴿۲﴾	۲۔ اللہ وہ ذات ہے جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں جو زندہ (اور کائنات کا) زبردست نگہدار ہے۔

تفسیر آیات

ان آیات کی تفسیر کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ، آیۃ الکرسی کی تفسیر۔

نَزَّلَ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ وَاَنۡزَلَ التَّوۡرٰىةَ وَالۡاِنۡجِيۡلَ ﴿۳﴾

۳۔ اس نے حق پر مبنی ایک کتاب (اے رسول) آپ پر نازل کی جو سابقہ کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور اس نے توریت و انجیل کو نازل کیا۔

مِنۡ قَبۡلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ ؕ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمۡ عَذَابٌ شَدِيۡدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ ذُو انۡتِقَامٍ ﴿۴﴾

۴۔ اس سے پہلے انسانوں کی ہدایت کے لیے اور فرقان (حق و باطل میں امتیاز کرنے والا قانون) نازل فرمایا، جنہوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا ان کے لیے سخت عذاب ہے، اللہ بڑا غالب آنے والا، خوب بدلہ لینے والا ہے۔

تشریح کلمات

اِنۡتِقَامٍ: (ن ق م)۔ قسمت۔ عذاب۔ بدلہ لینا۔

الۡحَقِّ: (ح ق ق) حقیقت۔ جو کلام، حقیقت کے مطابق ہو اسے صادق کہتے ہیں اور جو حقیقت کلام کے مطابق ہو اسے حق کہا جاتا ہے۔

التَّوۡرٰىةَ: (و۔ر۔ی) شریعت، قانون۔ یہ موجودہ بائبل کے عہد قدیم کا نام ہے جو یہودیوں کے مندرجہ ذیل صحیفوں کا مجموعہ ہے۔

الف ۔ توریت: یہ یہودیوں کا سب سے زیادہ مستند اور مقدس صحیفہ ہے اور پانچ کتب پر مشتمل ہے۔ i. تکوین ii. خروج iii. لاویین iv. اعداد v. تثنیہ۔

یہ پانچ کتابیں حضرت موسیٰ (ع) کی طرف منسوب ہیں، باقی حضرت عیسیٰ (ع) سے ۳۹۷ سال قبل والے انبیاء (ع) کی طرف منسوب ہیں۔

ب۔ صحائف انبیاء: یہ آٹھ صحیفوں پر مشتمل ہیں۔

ج۔ صحائف مقدسہ: یہ گیارہ صحیفوں پر مشتمل ہیں۔ کل ۲۴ صحائف بنتے ہیں۔

تفسیر آیات

قرآنی دلائل کے علاوہ جدید تحقیق سے بھی ثابت ہو گیا ہے کہ موجودہ توریت اور دیگر صحائف اللہ

کا کلام نہیں ہیں، بلکہ مختلف زمانوں میں مختلف انسانوں کی ساختہ و پرداختہ ہیں۔ یعنی توریت کے اصل صحیفوں کے ضیاع کے بعد یہودیوں نے انہیں نئے سرے سے مرتب کیا۔ اصل صحائف کے ضائع ہونے پر بہت سے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ مختلف ادوار میں حملہ آوروں اور فاتحین نے فلسطین کو اور خاص کر یروشلم کو تہ و بالا کر دیا اور ان کی آبادی کو جلا کر راکھ کر ڈالا اور وہاں کے یہودیوں کو جلا وطن کر دیا۔

ظاہر ہے اس زمانے میں نہ تو آج کل کی طرح کتابوں کے زیادہ نسخے اور نہ ہی پڑھے لکھے لوگ ہوتے تھے۔ چند نسخے چند ایک لوگوں کے پاس ہوا کرتے تھے، جو حادثات کی نذر ہو گئے۔ بعد میں یہودی علماء نے روایات کی بنا پر ان صحیفوں کو مرتب کر دیا۔ چنانچہ عہدین کتاب دوم تاریخ ایام ۱۵: ۲ میں آیا ہے:

بنی اسرائیل ایک لمبی مدت توریت کے بغیر رہے۔

نیز عہدین تاریخ باب ۲۲۔۲۳ میں آیا ہے:

بنی اسرائیل کے بادشاہ یوشیا کے دور میں خانۂ خدا میں داخل شدہ چاندی کو جب باہر نکال رہے تھے تو حلقیا کاہن نے یوشیا کے وزیر شافان سے کہا: مجھے خانۂ خدا میں توریت مل گئی۔ شافان نے بادشاہ سے کہا: حلقیا کاہن نے توریت مجھے دی ہے۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ توریت کو یہودیوں نے حضرت موسیٰ (ع) کے بعد ۵۸۶ ق م میں بخت نصر کے حملے اور یروشلم کی تباہی اور یہودیوں کی مملکت بابل میں اسیری کے پچاس سال بعد لکھا ہے، کیونکہ ماہرین کے مطابق موجودہ توریت میں بابلی الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔

بعض ماہرین کی تحقیقات کے مطابق موجودہ توریت حضرت موسیٰ (ع) کے پانچ سو سال بعد لکھی گئی ہے اور اس زبان کا بھی علم نہیں ہو سکا، جس میں توریت لکھی گئی تھی۔ کیونکہ اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ (ع) عبرانی زبان جانتے تھے، بلکہ ان کی زبان تو مصری تھی۔ لہٰذا اس توریت کا سرے سے کوئی علم ہی نہیں ہے جو مصری زبان میں لکھی گئی تھی اور نہ ہی اس بات کا علم ہے کہ یہ ترجمہ کس نے کیا ہے؟

علامہ محمد جواد بلاغی اپنی کتاب الھدی الی دین المصطفیٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

عہد قدیم کی قدیم زبان، بابل کی اسیری تک عبرانی تھی اور بابل کی اسیری کے بعد ان میں سے بعض کتب کلدانی زبان میں تھیں جو بابل کی زبان ہے۔ بعد میں ۷۲ یہودی دانشوروں نے ۲۸۲ یا ۲۸۵ یا ۲۸۶ ق م میں یونانی زبان میں ترجمہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ترجمہ ۷۲ دنوں میں مکمل کیا گیا۔ اس لیے اس ترجمے کو سبعینۃ کہتے ہیں۔ یہ ترجمہ یہودیوں اور قدیم مسیحیوں میں نہایت محترم اور قابل اعتبار سمجھا جاتا تھا اور عہد جدید کے مصنفوں نے توریت کے اکثر حصوں

کو اسی نسخے سے لیا ہے۔

عبرانی متن میں ایسے آثار بھی پائے جاتے ہیں، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں مختلف وجوہ کی بنا پر متن میں رد و بدل کرنا جائز سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً اسماء میں تبدیلی، عبارت میں تغیر و تبدل وغیرہ۔ پھر یہ تغیرات ایک وقت میں نہیں، بلکہ مختلف اوقات میں ہوتے رہے۔ اتنا تو خود یہودی علماء بھی تسلیم کرتے ہیں کہ توریت میں ۱۸ مقامات ایسے ہیں جہاں زمانۂ قدیم میں کاتبوں نے عمداً تبدیلیاں کیں۔ ان کے علاوہ معلوم نہیں کہ کس قدر تغیر و تبدل ہوا ہوگا، جسے یقین کے ساتھ معلوم کرنا اس وقت یا آئندہ ناممکن ہے۔[1]

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرآن ان سب باتوں کی تصدیق کرتا ہے، جو ان صحیفوں میں درج ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ (ع) نے بنی اسرائیل کے سامنے جو توریت پیش کی تھی، قرآن کریم نے اس کا ذکر بڑی عزت و تجلیل کے ساتھ کیا ہے اور اسے فرقان، ضیاء اور رحمت جیسے قابل احترام الفاظ کے ساتھ یاد کیا ہے۔ قرآن اس توریت کی تصدیق کرتا ہے جو اللہ نے حضرت موسیٰ (ع) کے لیے الواح پر تحریر کی تھی:

وَ کَتَبۡنَا لَہٗ فِی الۡاَلۡوَاحِ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ مَّوۡعِظَۃً وَّ تَفۡصِیۡلًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ ...[2]

اور ہم نے موسیٰ کے لیے (توریت کی) تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھی۔

ممکن ہے کہ موجودہ توریت میں مختلف مقامات پر حقیقی توریت کے کچھ منتشر اجزا موجود ہوں۔ قرآن کریم ان حقیقی اجزا کی تصدیق کرتا ہے۔ قرآن تحریف سے پاک توریت کی مکمل تصدیق کرتا ہے۔ موجودہ توریت کے بارے میں قرآن کا مؤقف یہ ہے کہ یہ تحریف شدہ ہے اور لوگوں نے اسے خود اپنے ہاتھوں سے لکھ کر اللہ کی طرف منسوب کیا ہے۔

انجیل: قرآن کی نظر میں انجیل سے مراد وہ تعلیمات ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئیں۔ مسیحی نقطہ نظر کے مطابق چار کتابوں کے مجموعے کا نام انجیل ہے۔ جو کتابیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد مرتب ہوئیں:

۱۔ انجیل متی: یہ کتاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے تیس سال بعد یروشلم میں عبرانی زبان میں مرتب ہوئی۔ یہ انجیل اصل میں عبرانی زبان میں تھی۔ بعد میں یونانی زبان میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اصل انجیل ناپید اور مفقود ہے۔[3]

---

[1] دائرہ معارف اسلامی ۶: ۱۰۷ [2] ۷ اعراف: ۱۴۵ [3] تفسیر المیزان از کتاب میزان الحق و قاموس الکتاب المقدس

۲۔انجیل مرقس: یہ کتاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ۶۶ سال بعد یونانی زبان میں مرتب ہوئی۔
مرقس، بطرس کا شاگرد تھا اور حواریوں میں سے نہیں تھا۔ مرقس نے بطرس کے کہنے
پر یہ انجیل لکھی۔ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے اللہ ہونے کے قائل نہ تھے۔[1]

۳۔انجیل لوقا: یہ تیسری انجیل ہے جو پہلی دو انجیلوں کے بعد لکھی گئی۔ لوقا حواری نہ تھا، بلکہ اس
نے نصرانیت بولس سے سیکھی اور بولس متعصب یہودی تھا۔ وہ حضرت مسیح علیہ السلام
پر ایمان لانے والوں کو اذیتیں دیا کرتا تھا۔ بعد میں اس نے بظاہر مسیحیت قبول
کرنے کا اعلان کیا۔ موجودہ نصرانیت کی تشکیل کرنے والا یہی بولس ہے۔[2]

۴۔ انجیل یوحنا: یہ کتاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات، یعنی زمین سے اٹھ جانے کے ساٹھ سال
بعد مرتب ہوئی۔[3]

قرآن انجیل کا ذکر لفظ مفرد کے ساتھ کرتا ہے، جب کہ نزول قرآن کے وقت چار اناجیل مسیحیوں میں رائج تھیں، کیونکہ یہ چاروں اناجیل قرآن کے نزدیک اللہ کی طرف سے نازل شدہ نہیں بلکہ تحریف شدہ ہیں۔

دین اسلام کو مومنین کے اذہان میں راسخ کرنے کے لیے ان آیات میں یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ دین اسلام ادیان عالم کا ایک تسلسل ہے اور جو کتاب اسلامی دستور لے کر آئی ہے، وہ حق پر مبنی ہے۔ یہ کتاب سابقہ آسمانی کتب توریت اور انجیل کی تصدیق کرتی ہے۔ اس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ جو توریت اور انجیل اس زمانے میں لوگوں کے پاس موجود تھیں، ان کی تصدیق کرتی ہے۔ اگرچہ ان میں تحریف و تبدیلی واقع ہوئی ہے، کیونکہ ان میں حقیقی توریت و انجیل کے کچھ اجزاء تو بہرحال موجود ہیں۔

فرقان: حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر کتاب نازل فرمانے اور توریت و انجیل کے ذکر کے بعد فرمایا کہ اللہ نے فرقان نازل کیا ہے۔ قرآن کے ذکر کے بعد فرقان کے ذکر سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ فرقان سے مراد قرآن نہیں ہے، بلکہ فرقان سے مراد وہ اسلامی تعلیمات ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر بذریعہ وحی نازل ہوئی ہیں۔ فرقان حق و باطل میں امتیاز کرنے کے معنی میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے علاوہ بھی ایسے دستور و احکام نازل فرمائے ہیں، جو انسانیت کی ہدایت اور حق و باطل میں امتیاز کا کام دیتے ہیں اور وہ سنت رسول (ص) ہیں۔

کتاب و فرقان نازل کرنے اور حجت پوری کرنے کے بعد منکرین کو عذاب میں ڈالنا اور ان سے انتقام لینا خدائی فیصلہ ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنی گرفت کی مضبوطی کی طرف اشارہ فرما رہا ہے۔ بہت

---

[1] ترجمہ الاخبار تالیف بطرس قرماج ۔ المیزان ۳:۳۱۱　[2] قاموس الکتاب المقدس تالیف : مسٹر ھاکس
[3] دائرہ معارف قرن عشرین۔

سے مجرمین سزا سے اس لیے بچ جاتے ہیں کہ سزا دینے والے کا علم یا اس کی طاقت محدود ہوتی ہے، لیکن چونکہ اللہ کی طاقت اور اس کا علم بھی لامحدود ہے، لہٰذا کوئی مجرم سزا سے نہیں بچ سکتا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخۡفٰی عَلَیۡہِ شَیۡءٌ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ ؕ﴿۵﴾

۵۔ زمین و آسمان کی کوئی چیز اللہ سے یقیناً پوشیدہ نہیں ہے۔

تفسیر آیات

اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور خالق سے اس کی مخلوق پوشیدہ نہیں رہ سکتی نیز کسی چیز اور اللہ کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہوسکتی۔ جس چیز کو بھی حائل فرض کیا جائے، اللہ اس سے آگے بھی موجود ہے۔ لہٰذا کسی مجرم سے انتقام لینے کے لیے یہ امکان موجود نہیں ہے کہ کوئی بھی جرم اللہ سے پوشیدہ رہ جائے۔ خواہ وہ جرم مجرم کے دل میں ایک پوشیدہ راز ہی کیوں نہ ہو۔ جھوٹی گواہی دینے والے کا جرم اس کے قلب میں پوشیدہ ہے۔ مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو البقرۃ آیت ۲۸۴۔

ہُوَ الَّذِیۡ یُصَوِّرُکُمۡ فِی الۡاَرۡحَامِ کَیۡفَ یَشَآءُ ؕ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۶﴾

۶۔ وہی تو ہے جو (ماؤں کے) رحموں میں جیسی چاہتا ہے تمہاری تصویر بناتا ہے، اس غالب آنے والے، حکمت کے مالک کے سوا کوئی معبود نہیں۔

تفسیر آیات

ہُوَ الَّذِیۡ یُصَوِّرُکُمۡ فِی الۡاَرۡحَامِ: الارحام، رحم کی جمع ہے۔ وہ جگہ جہاں جنین کی تخلیق و تدوین اور آیت کی تعبیر کے مطابق صورت گری ہوتی ہے۔ رحم کے اطلاق سے نزول قرآن کے زمانے اور ہمارے زمانے میں رحم مادر ذہنوں میں آتا ہے، کیونکہ گزشتہ زمانے میں ماں کے بغیر رحم کا تصور ممکن نہ تھا۔ قرآنی تعبیر میں الارحام مطلق ذکر ہوا ہے، ارحام الامھات (ماؤں کے رحم) نہیں فرمایا، لہٰذا رحم میں ہر وہ جگہ شامل ہے جس میں جنین کی پرورش ہوتی ہے۔

انسان کی تخلیق خلیوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ خلیہ (cell) اس کائنات کی سب سے زیادہ حیرت انگیز مخلوق ہے اور اس خلیے میں راز حیات مضمر ہے۔ جو درس اللہ تعالیٰ نے ابتدائے تخلیق میں اس خلیے کو پڑھایا ہے، وہ اسے خود بھی یاد رکھتا ہے اور آنے والی نسلوں کی طرف بھی منتقل کرتا ہے:

وَ اِذۡ اَخَذَ رَبُّکَ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اٰدَمَ مِنۡ

اور جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشتوں سے

ظُهُوۡرِہِمۡ ذُرِّیَّتَہُمۡ وَ اَشۡہَدَہُمۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ ۚ اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰی ۚۛ شَہِدۡنَا ۚۛ ....[1]

ان کی نسل کو نکالا تھا اور ان پر خود انہیں گواہ بنا کر (پوچھا تھا:) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا تھا: ہاں! (تو ہمارا رب ہے) ہم اس کی گواہی دیتے ہیں،

اس درس سے وہ اپنے خالق کو پہچانتا ہے اور تقسیم کے ذریعے ارتقاء و تخلیق کا عمل انجام دیتا ہے۔ اس درس کے ذریعے یہ خلیات اپنے اسلاف کی خاصیتوں کو آنے والی نسلوں کو منتقل کرتے ہیں۔ مثلاً اس درس نے، جو سیلز (Cells) کے جینیاتی سالموں میں درج ہے، یہ کہدیا ہے کہ بچے کو ماموں کی شکل میں لانا ہے تو اس خلیے کو ماموں کی آنکھ، ناک، منہ اور قد کی ساخت کا علم ہے۔

خلیے کی دو قسمیں ہیں: جسمانی خلیہ اور جنسی خلیہ۔ جسمانی خلیے کا مرکزہ ۴۶ کروموزومز (chromo somes) پر مشتمل ہوتا ہے جو ایک مستقل خلیہ ہے۔ لیکن جنسی خلیے کا مرکزہ ۲۳ کروموزومز (chromo somes) پر مشتمل ہوتا ہے جو ایک مستقل خلیے کا نصف ہے۔

انسانی تخلیق یا ابتدائی سیل (cell) کی تشکیل میں مرد و زن دونوں شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ جرثومہ پدر اور تخم مادر، ہر ایک ۲۳ کروموزومز (chromosomes) پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان دونوں کی آمیزش (۲۳ + ۲۳) سے ۴۶ کروموزومز (chromosomes) پر مشتمل ایک مکمل سیل (cell) تشکیل پاتا ہے، جسے قرآن نے نطفۃ امشاج، مخلوط نطفہ کہا ہے۔ اس سیل (cell) اور دیگر جسمانی (cell) میں فرق یہ ہے کہ یہ سیل تقسیم کے ذریعے ارتقائی مراحل طے کرتا ہے۔ ایک سے دو۔ دو سے چار۔ آٹھ، سولہ، بتیس۔ اس کے بعد تخصص، سپیشلائزیشن (specialization) کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ بعض ماہرین کے مطابق تخصص کا عمل خلیوں کی تعداد ۱۲۸ تک پہنچنے کے بعد شروع ہوتا ہے اور ہر سیل کو ایک ایک شعبے کا انچارج بنا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے اپنے شعبوں میں فعال ہوتے ہیں۔ کچھ ہڈیاں، کچھ اعصاب، کچھ آنتیں، کچھ دماغ وغیرہ بنانے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ جب ہر شعبہ اپنا کام مکمل کر لیتا ہے تو ایک کامل انسان (خَلۡقًا اٰخَرَ) وجود میں آ جاتا ہے:

ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰہُ خَلۡقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ ؕ[2]

پھر ہم نے اسے ایک دوسری مخلوق بنا دیا، پس بابرکت ہے وہ اللہ جو سب سے بہترین خالق ہے۔

لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ: اس ذات کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہو سکتا جس نے تمہاری تصور گری کی ہے۔ اس سے عبادت کی تعریف نکل آتی ہے کہ کسی ذات کو خالق سمجھ کر اس کی تعظیم کی جائے، وہ عبادت ہے۔

---

[1] ۷ اعراف: ۱۷۲ [2] ۲۳ مومنون: ۱۴

هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ مِنۡہُ اٰیٰتٌ مُّحۡکَمٰتٌ ہُنَّ اُمُّ الۡکِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِہٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَہَ مِنۡہُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَۃِ وَ ابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِہٖ ۚ وَ مَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَہٗۤ اِلَّا اللّٰہُ ۘ وَ الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِہٖ ۙ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا ۚ وَ مَا یَذَّکَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ﴿۷﴾

۷۔وہی ذات ہے جس نے آپ پر وہ کتاب نازل فرمائی جس کی بعض آیات محکم (واضح) ہیں ،وہی اصل کتاب ہیں اور کچھ متشابہ ہیں، جن کے دلوں میں کجی ہے، وہ فتنہ اور تاویل کی تلاش میں متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں، جب کہ اس کی (حقیقی) تاویل تو صرف خدا اور علم میں راسخ مقام رکھنے والے ہی جانتے ہیں جو کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں، یہ سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے اور نصیحت تو صرف عقل مند ہی قبول کرتے ہیں۔

تشریح کلمات

مُّحۡکَمٰتٌ: (ح ک م) شیخ طوسی علیہ الرحمہ نے محکم کی یہ تعریف بیان فرمائی ہے:

المحکم ما علم المراد بظاهره من غیر قرینة - المتشابه مالا یعلما لمراد بظاهره.[۱]

محکم وہ ہے جس کی ظاہری عبارت سے مطلب اور مراد بلا قرینہ معلوم اور واضح ہو جائے۔ متشابہ وہ ہے جس میں ظاہری عبارت سے مفہوم اور مراد واضح نہ ہو.

قرآن کی بعض آیات ایسی ہیں جن کا مفہوم ان آیات کے الفاظ سے ظاہر بظاہر سمجھ میں آجاتا ہے۔ انہیں سمجھنے کے لیے آیات کی عبارت ہی کافی ہوتی ہے، مزید کسی قرینے اور دلیل کا سہارا لینا نہیں پڑتا۔ ان کا مفہوم متعین کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی اور نہ ہی اشتباہ کی گنجائش رہتی ہے، جب کہ متشابہات وہ ہیں جن کے معانی، الفاظ اور جملوں کے ظاہری ڈھانچے سے معلوم نہیں ہوتے اور ان میں اشتباہ کی گنجائش رہتی ہے۔

اُمّ: (ا م م) ہر چیز کی اصل، جس کی طرف رجوع کیا جائے۔

---

[۱] التبیان ۔ ذیل آیہ

تفسیر آیات

اس آیہ شریفہ میں قرآن مجید کی آیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حصہ محکمات پر مشتمل ہے اور انہیں بنیادی حیثیت حاصل ہے، جب کہ دوسرا حصہ متشابہات پر مشتمل ہے۔ محکمات کو دو لحاظ سے بنیادی حیثیت حاصل ہے:

i۔ آیات محکمات میں مسلمہ اصولوں کے اہم احکام اور حیات انسانی کے اہم دستور صاف الفاظ میں بغیر کسی پیچیدگی کے بیان ہوئے ہیں۔

ii۔ آیات متشابہات کو سمجھنے میں چونکہ اشتباہ کی گنجائش موجود ہوتی ہے، اس لیے اس اشتباہ کو ختم کرنے کے لیے محکمات کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اسی لیے محکمات کو اُمُّ الۡکِتٰبِ کہا گیا ہے، کیونکہ متشابہات کی توضیح وتبیین کا واحد ذریعہ محکمات ہیں۔ جب محکمات کی طرف رجوع کیا جاتا ہے تو متشابہ آیات کو سمجھنے کی راہ میں موجود اشتباہ ختم ہو جاتا ہے اور متشابہ آیات بھی محکم بن جاتی ہیں۔

اللہ کی طرف سے عطا شدہ اس طریقے کے مطابق اگر قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو پورا قرآن محکم ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

کِتٰبٌ اُحۡکِمَتۡ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ مِنۡ لَّدُنۡ حَکِیۡمٍ خَبِیۡرٍ ۝[1]

یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات مستحکم کی گئی ہیں پھر ایک باحکمت باخبر ذات کی طرف سے تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔

لہٰذا محکمات میں متشابہات کا بیان ہے۔ محکمات کے ذریعے متشابہات کا تشابہ ختم کیا جاتا ہے۔ محکمات میں متشابہات کی تفسیر ہوتی ہے:

القرآن یفسر بعضه بعضا۔ — قرآن کی تفسیر خود قرآن کرتا ہے۔

بطور مثال یہ آیت ملاحظہ ہو:

وُجُوۡہٌ یَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ ۝ اِلٰی رَبِّہَا نَاظِرَۃٌ ۝[2]

بہت سے چہرے اس روز شاداب ہوں گے۔ وہ اپنے رب (کی رحمت) کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

اس آیت سے یہ اشتباہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن دکھائی دے گا۔ لیکن محکم آیات کی طرف رجوع کیا جائے تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ مثلاً:

لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ ...[3] — اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔

لَا تُدۡرِکُہُ الۡاَبۡصَارُ ...[4] — نگاہیں اسے پا نہیں سکتیں۔

---

[1] ۱۱ ہود: ۱ [2] ۷۵ قیامت: ۲۲۔۲۳ [3] ۴۲ شوریٰ: ۱۱ [4] ۶ انعام: ۱۰۳

ایک اور آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ قلب کے لیے بھی رویت ہے:

مَا کَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰی۔[1]　جو کچھ نظروں نے دیکھا اسے دل نے نہیں جھٹلایا۔

ان محکم آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی ذات قابل رویت نہیں ہے، البتہ قلب کی نگاہ سے اللہ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ بعض آیات سے واضح ہوتا ہے کہ کچھ ہستیوں کے لیے پورا قرآن محکم ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:

بَلۡ ہُوَ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ فِیۡ صُدُوۡرِ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ ....[2]　بلکہ یہ روشن نشانیاں ان کے سینوں میں ہیں جنہیں علم دیا گیا ہے۔

متشابہات کیوں ہیں؟: قرآن کے بعض مطالب محسوسات اور مادیات سے ماوراء اور ما بعد الطبیعیات سے مربوط ہیں۔ ان مفاہیم کی اصل حقیقت انسان کے لیے قابل درک نہیں ہوتی۔ مثلاً قرآن فرماتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌۢ بَصِیۡرٌ [3] اللہ، سمیع و بصیر ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی سماعت اور بصارت ہماری سماعت و بصارت کی طرح نہیں ہے۔

اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی ○ [4]　وہ رحمٰن جس نے عرش پر اقتدار قائم کیا۔

ظاہر ہے اللہ لا مکان ہے۔ اس کے لیے کسی مکان کی محدودیت میں آنا درست نہیں ہے نیز ارشاد ہوا:

وَّ جَآءَ رَبُّکَ وَ الۡمَلَکُ صَفًّا صَفًّا ○ [5]　اور آپ کے پروردگار (کا حکم) اور فرشتے صف در صف حاضر ہوں گے۔

جب کہ اللہ کے لیے آنا جانا مفہوم نہیں رکھتا۔ ان عبارات کو اس لیے استعمال کرنا پڑا کہ انسان کو سمجھانے کا وہی طریقہ ممکن ہے جس سے انسان مانوس ہے۔ لہٰذا ما بعد الطبیعیاتی حقائق کو انہی چیزوں کی شکل وصورت میں بیان کیا جائے تو کلام قابل فہم بنتا ہے۔ چنانچہ یہ بات اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ جن چیزوں کو انسان نے اپنے حواس سے درک نہ کیا ہو، ان کا تصور ناممکن ہے۔ مثلاً اگر پانی کا وجود نہ ہوتا تو اس کا تصور ممکن نہ ہوتا۔ چونکہ بعض حقائق لاہوتی اور ما بعد الطبیعیاتی امور سے مربوط ہوتے ہیں اور ہمارے اذہان ناسوتی اور محدود ہونے کی بنا پر انہیں درک نہیں کر سکتے، اس لیے اللہ ان لاہوتی حقائق کو ناسوتی و مادی مفاہیم کے قالب میں بیان فرماتا ہے، کیونکہ اس کے علاوہ سمجھانے کا کوئی اور طریقہ موجود نہیں۔ مثلاً ایک ایسے شخص کو کمپیوٹر کا بتانا ہو، جس نے تمدن کا چہرہ بالکل نہ دیکھا ہو تو اس کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے کہ جو چیزیں اس کے مشاہدے میں آئی ہوں ان کے ذریعے سمجھایا جائے۔ اس صورت میں متشابہات کا وجود میں آنا ایک لازمی بات ہے۔ البتہ اس کے حل کے لیے محکمات موجود ہیں، جن کی طرف رجوع کرنے سے یہ متشابہات بھی محکمات

---

[1] ۵۳ نجم: ۱۱　[2] ۲۹ عنکبوت: ۴۹　[3] ۵۸ مجادلہ: ۱　[4] ۲۰ طہ: ۵　[5] ۸۹ فجر: ۲۲

میں بدل جاتے ہیں۔

فتنہ۔ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَہَ مِنۡہُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَۃِ وَ ابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِہٖ:

البتہ فتنہ پرور اور مفاد پرست لوگ متشابہات کے حل کے لیے محکمات کی طرف رجوع کرنے کی بجائے متشابہات کے ابہام سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور قرآن کے مطالب کو مسخ کرتے ہیں۔

شان نزول: چنانچہ اس آیت کی شان نزول میں ایک روایت کہتی ہے:

> نجران کے وفد نے حضور (ص) سے حضرت مسیح (ع) کے بارے میں پوچھا: الیس ھو کلمۃ اللّٰہ و روح منہ؟ کیا حضرت عیسیٰ (ع) کلمہ خدا اور اس کی روح نہیں ہیں؟ تو حضور (ص) نے فرمایا: بے شک عیسیٰ (ع) کلمۂ خدا اور روح خدا ہیں تو مسیحی وفد نے کہا: حَسْبُنا پھر یہی بات ہمارے لیے کافی ہے۔ اس پر آیت نازل ہوئی: فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَہَ مِنۡہُ یعنی جن کے دلوں میں کجی ہے، وہ فتنہ اور تاویل کی تلاش میں متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں

چنانچہ مسیحیوں نے کلمہ اور روح کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے کے لیے محکمات کی طرف رجوع کرنے کی بجائے خود ان کلمات سے حضرت عیسیٰ (ع) کے اللہ کا بیٹا ہونے پر استدلال کیا، جو ان کے دلوں کی کجی اور فتنہ انگیزی کی علامت ہے، ورنہ کسی مذہب کے نظریات سے استدلال کے لیے اس مذہب کے دیگر مسلمات کو سامنے رکھا جاتا ہے اور وہ محکم آیات ہیں۔

تاویل۔ وَ مَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَہٗۤ اِلَّا اللّٰہُ ۘؔ وَ الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ: کسی چیز کی اصل کی طرف رجوع کرنا تاویل کہلاتا ہے۔ یعنی ہر حکم اور عمل کو اس کے منطقی محور (جس پر اس کا دارومدار ہو) کی طرف لوٹانا اس کی تاویل ہے۔ اللہ کے ہر حکم کی تاویل ہوتی ہے، خواہ وہ محکم ہو یا متشابہ۔ وہ تاویل آیت کا لفظی مفہوم نہیں ہے، بلکہ آیات اور احکام کا وہ مرکزی نکتہ اور اس کے پوشیدہ اسرار و حکمت ہیں، جن پر ان کا دارومدار ہے۔ چنانچہ دانا باپ، بچے کو کبھی کچھ رقم دیتا ہے اور کبھی نہیں دیتا۔ کبھی پیار کرتا ہے اور کبھی مارتا ہے۔ کبھی کسی بات کو صاف لفظوں میں بیان کرتا ہے اور کبھی اجمال و ابہام کے ساتھ بات کرتا ہے۔ ان مختلف رویوں کے پیچھے جو منطقی محور اور مرکزی نکتہ ہے، وہ تاویل کہلاتا ہے۔

اس آیت میں ارشاد ہو رہا ہے کہ متشابہات کا مرکزی نکتہ اور منطقی محور صرف اللہ اور راسخون فی العلم جانتے ہیں۔ تاویل اور محکم و متشابہ کے بارے میں مزید تشریح کے لیے اسی تفسیر کا مقدمہ ملاحظہ فرمائیں۔

الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ: اہل سنت کی ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ تاویل قرآن کو صرف خدا جانتا ہے۔ جب کہ علمائے شیعہ امامیہ اور بعض علمائے اہل سنت کے نزدیک یہ نظریہ درست نہیں ہے۔ ان

کے نزدیک قرآن یا اس کا کوئی حصہ ایسا نہیں جو انسانوں کے لیے قابل استفادہ نہ ہو۔ آیہ کریمہ وَالرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ نیا جملہ نہیں ہے، بلکہ سابقہ جملے پر عطف ہے اور آیت کا مطلب یہ بنتا ہے: اس کی تاویل اللہ اور راسخون فی العلم کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جملہ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِہٖ ۙ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا جملہ مستانفہ حالیہ ہے اور حبر امت حضرت ابن عباس کا بھی یہی نظریہ ہے۔

مزید تشریح کے لیے اسی تفسیر کا مقدمہ ملاحظہ فرمائیں۔

راسخون فی العلم کون ہیں؟: رسوخ یعنی کسی چیز کا محکم ہو جانا۔ الراسخ فی العلم سے مراد وہ محقق شخص ہے، جسے کوئی شک اور شبہ پیش نہ آئے۔[1]

حضرت علی علیہ السلام سے مروی ہے:

اَنَّ الرَّاسِخِيْنَ فِی الْعِلْمِ هُمُ الَّذِيْنَ اَغْنَاهُم اللّٰه عَنِ الاقْتِحَامِ فِی السُّدَدِ الْمَضْرُوْبَةِ دُوْنَ الْغُيُوْبِ۔[2]	علم میں راسخ و پختہ لوگ وہی ہیں جن کو اللہ نے غیب کے پردوں میں چھپی ہوئی چیزوں میں الجھنے سے بے نیاز کیا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

وَ سَمَّى تَرْكَهُمُ التَّعَمُّقَ فِيْمَا لَمْ يُكَلِّفْهُمُ الْبَحْثَ عَنْ كُنْهِهٖ رُسُوْخاً۔[3]	اللہ نے جس چیز کی حقیقت سے بحث کرنے کی تکلیف نہیں دی اس کی گہرائی میں جانے کے ترک کا نام رسوخ رکھا ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے:

(ان الراسخین فی العلم) مَنْ لَا يَخْتَلِفُ فِی عِلْمِه۔[4]	(راسخین فی العلم وہ لوگ ہیں) جن کے علم میں اختلاف نہیں ہوتا۔

اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ راسخون فی العلم وہ ہیں جن کا ایمان پختہ ہونے کی وجہ سے انہیں اللہ کے فرمان میں تردد اور شبہ لاحق نہیں ہوتا۔ وہ محکمات پر عمل کرتے ہیں اور متشابہات میں اپنے ایمان پر عمل کرتے ہیں۔ یعنی اللہ کے بتائے ہوئے طریقے پر چلتے ہیں۔ خود متشابہات میں نہیں الجھتے۔

پس الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ کا مفہوم وسیع ہے، تاہم الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ کے کامل ترین مصادیق محمد و آل محمد (ع) ہیں۔

احادیث

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے:

---

[1] راغب [2] نہج البلاغۃ خطبہ اشباح ۸۹، ص ۲۳۹۔ مستدرک الوسائل ۱۲: ۲۴۷ [3] حوالہ سابق
[4] اصول الکافی ۱: ۲۴۵

اَوَّلُ الرَّاسِخُونَ فِیْ الْعِلْمِ رَسُوْلُ اللّٰہِ۔[1] سب سے پہلے راسخ فی العلم رسول اکرم (ص) ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

نَحْنُ الرَّاسِخُونَ فِی الْعِلْمِ وَ نَحْنُ نَعْلَمُ تَاْوِیلَہُ۔[2] ہم ہی راسخون فی العلم ہیں اور ہم ہی قرآن کی تاویل جانتے ہیں۔

نیز مروی:

من رد متشابہ القرآن الی محکمہ ھدی الی صراط مستقیم۔[3] جو متشابہ کو محکم کی طرف لوٹا دے، وہ راہ راست کی طرف رہنمائی پائے گا۔

اہم نکات

۱۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت یہ ہے کہ دین کے احکام کو اپنی خواہشات کے تابع نہ بنایا جائے۔

۲۔ متشابہات اور غیر واضح آیات کی من پسند تاویل کی جگہ ان میں راسخون فی العلم کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

۳۔ ہدایت کے لیے، قرآن کی تفسیر کے لیے، راسخون فی العلم کی رہنمائی بھی ضروری ہے۔

۴۔ راسخون فی العلم کے کامل ترین مصادیق محمد و آل محمد علیہم السلام ہیں۔

۵۔ خدا کے نزدیک برتری کا معیار علم اور ایمان کی پختگی ہے۔

۶۔ نصیحت قبول کرنا عقلمندی کی علامت ہے۔

۷۔ متشابہات کی اتباع، کجروی اور فتنہ پروری کی علامت ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا وَھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً ۚ اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ ﴿۸﴾

۸۔ اے ہمارے پروردگار! جب تو نے ہمیں ہدایت بخشی ہے تو اس کے بعد ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عنایت فرما، یقیناً تو بڑا عطا فرمانے والا ہے۔

تفسیر آیات

سابقہ آیت میں فرمایا گیا کہ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنے اور تاویل کی تلاش میں متشابہات کے

---

[1] بحار الانوار ۹۲: ۷۸ [2] اصول الکافی ۱: ۲۱۳۔ تفسیر البرھان ۱: ۲۷۱ [3] مستدرک الوسائل ۲۷: ۱۱۵

پیچھے پڑے رہتے ہیں، جب کہ راسخون فی العلم یہ دعا کرتے ہیں: مالک تونے علم دے کر ہمارے دلوں کو کجی سے بچایا ہے اور ہدایت کی نعمت سے ہمیں نوازا ہے، اب اس ہدایت کو برقرار رکھنا۔ راسخون فی العلم جانتے ہیں کہ بندہ ہمیشہ اپنے رب کی طرف سے ہدایت کا محتاج ہے اور اگر ایک لمحے کے لیے اس کی رحمت سے محروم ہو گیا تو پھر اسے تباہی سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔

وَهَبۡ لَنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ رَحۡمَۃً: ہدایت پر قائم رہنے کے بعد انسان رحمت الٰہی کے لیے اہل بن جاتا ہے۔ اہل بننے کے بعد رحمت کی درخواست کرتا ہے۔ ہدایت ملنے کے بعد مؤمن خوف و رجا، بیم و امید کے درمیان ہوتا ہے:

... یَّحۡذَرُ الۡاٰخِرَۃَ وَ یَرۡجُوۡا رَحۡمَۃَ رَبِّہٖ ...[1] — آخرت کا خوف رکھتا ہے اور اپنے رب کی رحمت کی امید رکھتا ہے۔

امام جعفر صادق (ع) سے روایت ہے:

اکثروا من ان تقولوا: رَبَّنَا لَا تُزِغۡ قُلُوۡبَنَا بَعۡدَ اِذۡ هَدَیۡتَنَا و لا تأمنوا الزیغ.[2] — رَبَّنَا لَا تُزِغۡ قُلُوۡبَنَا بَعۡدَ اِذۡ هَدَیۡتَنَا اکثر کہا کرو اور کجی آنے کے بارے میں بے فکر مت رہو۔

۱۔ انسان ہر آن اور ہر لحظہ ہدایت و رحمت کا محتاج ہے لہٰذا اسے ہمیشہ درگاہ خداوندی میں دست بدعا رہنا چاہیے۔

۲۔ انسان کسی بھی لمحے ہادی سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

۳۔ فکری کجروی، ہدایت و رحمت اور فکری تکامل کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

رَبَّنَاۤ اِنَّکَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوۡمٍ لَّا رَیۡبَ فِیۡہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ ۟

۹۔ ہمارے پروردگار! بلاشبہ تو اس روز سب لوگوں کو جمع کرنے والا ہے جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں، بے شک اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

تفسیر آیات

۱۔ رَبَّنَاۤ اِنَّکَ جَامِعُ النَّاسِ: علم میں رسوخ کا نتیجہ ایمان کامل اور پختہ یقین ہوتا ہے۔ راسخون فی

---

[1] ۳۹ زمر۔ ۹   [2] تفسیر عیاشی ۱: ۱۶۴

العلم اللہ سے طلب ہدایت اور طلب رحمت کے لیے خلوص کے ساتھ دعا اس لیے کرتے ہیں کہ انہیں یقین ہے کہ ایک ایسا دن آنے والا ہے جس میں اللہ کی رحمت کے علاوہ کوئی اور چیز کام نہیں آئے گی۔

۲۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ: اس ایمان کامل اور یقین محکم کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے اس دن کا وعدہ کر رکھا ہے اور اللہ کی طرف سے وعدہ خلافی ناممکن ہے، لہٰذا اس روز کے آنے کے بارے میں ان کے لیے شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

اہم نکات

۱۔ راسخون فی العلم ہی یقین محکم کی اعلیٰ ترین منزل پر فائز ہو سکتے ہیں۔

۲۔ انسان کو اپنے گناہوں اور زیادتیوں کا خوف لاحق رہنا چاہیے۔ کیونکہ قیامت کے دن عدل و انصاف کا ترازو قائم ہو گا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَنۡ تُغۡنِیَ عَنۡہُمۡ اَمۡوَالُہُمۡ وَ لَاۤ اَوۡلَادُہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ شَیۡئًا ؕ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمۡ وَقُوۡدُ النَّارِ ﴿۱۰﴾

۱۰۔ جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان کے اموال و اولاد انہیں اللہ سے ہرگز کچھ بھی بے نیاز نہیں بنائیں گے اور یہ لوگ دوزخ کے ایندھن ہوں گے۔

تفسیر آیات

جو لوگ رسول کریم (ص) کی رسالت پر ایمان نہیں لاتے اور متشابہات کے بہانے کفر پر مصر رہتے ہیں اور اپنے دنیاوی مال و منال اور اولاد پر ناز کرتے ہیں، قیامت کے دن ایسے کافروں کو ان کا مال اور اولاد اللہ سے بے نیاز نہیں کرے گا اور ان سے تمام انسانی قدر و قیمت اور وقار سلب ہو جائے گا اور وہ جہنم کا ایندھن بن کر قابل نفرت اور ذلیل ہو جائیں گے۔

وَ اُولٰٓئِکَ ہُمۡ وَقُوۡدُ النَّارِ: یہ لوگ ایسا نہیں کہ جہنم میں خود جل جائیں گے، بلکہ وہ دوسرے اہل جہنم کو جلانے کے لیے ایندھن بھی بنیں گے۔

اہم نکات

۱۔ دنیاوی دولت اور اولاد پر بھروسا کرنے والے قیامت کے دن انبیاء (ع) کی تکذیب کرنے والوں کے ساتھ محشور ہوں گے۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَھُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ⑪

۱۱۔ ان کا حال بھی فرعونیوں اور ان سے پہلے لوگوں کا سا ہوگا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، پس اللہ نے انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے گرفت میں لے لیا اور اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

دَاب:　　عادت۔ رسم۔

تفسیر آیات

ان کفار کی فکری و عملی روش فرعونیوں کی طرح ہے، جنہوں نے حضرت موسیٰ (ع) کی نبوت کا انکار کیا اور اپنے جرائم کے انجام کو پہنچ گئے۔ اسی طرح حضرت محمد مصطفیٰ (ص) کی نبوت کی تکذیب کرنے والوں کا انجام بھی ایسا ہی ہوگا۔

۱۔ فَاَخَذَھُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ: اللہ نے ازخود نہیں، بلکہ ان کے گناہوں کی وجہ سے ان کو گرفت میں لیا۔ یہ خود ان کا عمل تھا، جس نے ان کو مبتلا کیا۔

۲۔ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ: اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ عذاب کی سختی کی وجہ خود ان کی برائی ہے، جو ان کی جان نہیں چھوڑے گی، نہ وہ اس سے فرار کر سکیں گے۔

اہم نکات

۱۔　فرعون صفت لوگوں کا انجام فرعون جیسا ہوگا۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ⑫

۱۲۔ (اے رسول) جنہوں نے انکار کیا ہے ان سے کہد یجیے: تم عنقریب مغلوب ہو جاؤ گے اور جہنم کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے اور وہ بدترین ٹھکانا ہے۔

شان نزول: یہ آیت جنگ بدر میں قریش کی شکست فاش کے بعد نازل ہوئی، جب حضور (ص) نے یہودیوں کو بازار قینقاع میں جمع کیا اور انہیں اسلام کی دعوت دی نیز انہیں تنبیہ کی کہ کہیں ان کا حشر بھی

وہی نہ ہو جائے جو قریش کا ہوا۔ یہودیوں نے کہا: ہم قریش کی طرح فنون حرب سے نابلد نہیں ہیں۔ ہمارے ساتھ آپ (ص) کی جنگ ہوئی تو آپ ہماری طاقت دیکھ لیں گے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اس آیت میں ایک صریح پیشگوئی ہے کہ آئندہ بھی جنگیں ہوں گی اور ان جنگوں میں کفار مغلوب ہو جائیں گے اور فتح و نصرت مسلمانوں کی ہوگی۔

اہم نکات

۱۔ حق کے منکرین کا انجام شکست و خواری ہے۔

قَدۡ کَانَ لَکُمۡ اٰیَۃٌ فِیۡ فِئَتَیۡنِ الۡتَقَتَا ؕ فِئَۃٌ تُقَاتِلُ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ اُخۡرٰی کَافِرَۃٌ یَّرَوۡنَہُمۡ مِّثۡلَیۡہِمۡ رَاۡیَ الۡعَیۡنِ ؕ وَ اللّٰہُ یُؤَیِّدُ بِنَصۡرِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَعِبۡرَۃً لِّاُولِی الۡاَبۡصَارِ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ تمہارے لیے ان دو گروہوں میں جو (جنگ بدر کے دن) باہم مقابل ہوئے ایک نشانی تھی، ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا کافر تھا وہ (کفار) ان (مسلمانوں) کو اپنی آنکھوں سے اپنے سے دگنا مشاہدہ کر رہے تھے اور خدا جسے چاہتا ہے اپنی نصرت سے اس کی تائید کرتا ہے، صاحبان بصیرت کے لیے اس واقعے میں یقیناً بڑی عبرت ہے۔

تشریح کلمات

فِئَۃٌ: (ف ی ء) اس سے مراد وہ جماعت ہے جس کے افراد باہمی تعاون کے لیے ایک دوسرے کی طرف رجوع کرتے ہوں۔

یُؤَیِّدُ: (أ ی د) تائید کرنا۔ تقویت دینا۔

تفسیر آیات

سنہ ۲ ہجری میں واقع ہونے والی جنگ بدر کی طرف اشارہ ہے۔ جہاں جنگی ساز و سامان اور مقدار وغیرہ کے لحاظ سے مومنین اور کفار میں نمایاں فرق کے باوجود مومنین کو فتح و نصرت حاصل ہوئی، جو ایک معجزہ تھا۔ یہ رسول اللہ (ص) کی حقانیت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھی۔

اس جنگ میں دشمن کے ایک ہزار جنگجوؤں کے مقابلے میں ۷۷ مہاجرین اور ۲۳۶ انصار پر مشتمل مسلمانوں کے صرف ۳۱۳ سپاہی تھے۔ ایک سو گھوڑوں کے مقابلے میں صرف دو گھوڑے تھے اور تلواروں کی مقدار

بھی آٹھ سے زیادہ نہ تھی۔ اس کے باوجود دشمن کو ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ مسلمانوں کے صرف بائیس افراد شہید ہوئے، جب کہ دشمن کے ستر افراد مارے گئے اور اتنے ہی اسیر ہو گئے۔

یَرَوۡنَہُمۡ مِّثۡلَیۡہِمۡ رَاۡیَ الۡعَیۡنِ: وہ انہیں دوگنا دیکھ رہے تھے۔ یہاں یہ مسئلہ مورد بحث ہے کہ کس نے کس کو دوگنا دیکھا۔ کیا کفار نے مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا یعنی دو ہزار دیکھا یا یہ کہ خود مسلمانوں کی حقیقی تعداد ۳۱۳ کا دوگنا ۶۲۶ یا کفار نے اپنے آپ کو مسلمانوں سے دوگنا دیکھا۔

پہلا اور تیسرا نظریہ خلاف ظاہر ہے۔ احتمال قوی یہ ہے کہ کفار نے مسلمانوں کو ان کی حقیقی تعداد سے دوگنا دیکھا تھا۔ یہ ایک ایسی نشانی تھی جو رسول کریم (ص) کی حقانیت اور اسلام کی سچائی پر دلالت کرتی ہے۔

وَاللّٰہُ یُؤَیِّدُ بِنَصۡرِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ: اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنی نصرت سے اس کی تائید کرتا ہے۔ واضح رہے اللہ کی چاہت اور مشیت اندھی بانٹ نہیں ہے۔ اس کی تائید کے لیے اہلیت اور لیاقت شرط ہے۔ جیسا کہ اللہ ارحم الراحمین ہے، لیکن اس کی رحمت کے لیے اہل ہونا شرط ہے۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَعِبۡرَۃً: جنگ بدر میں ایک درس ایک سبق ایک عبرت ہے۔ صاحبان نظر کے لیے یعنی ان لوگوں کے لیے جو بصیرت کی نظر رکھتے ہیں، وہ دیکھ سکیں گے کہ طاقت کا توازن کس چیز میں ہے۔ سامان حرب میں ہے یا استقامت درحرب میں ہے۔

اہم نکات

۱۔ حق و باطل کا معرکہ ہمیشہ رہا ہے اور فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے۔

۲۔ طاقت کا توازن تعداد سے نہیں استعداد سے قائم ہوتا ہے۔

۳۔ تاریخی حقائق صاحب بصیرت انسان کے لیے درس عبرت ہوتے ہیں: لَعِبۡرَۃً لِّاُولِی الۡاَبۡصَارِ.

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّہَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الۡبَنِیۡنَ وَ الۡقَنَاطِیۡرِ الۡمُقَنۡطَرَۃِ مِنَ الذَّہَبِ وَ الۡفِضَّۃِ وَ الۡخَیۡلِ الۡمُسَوَّمَۃِ وَ الۡاَنۡعَامِ وَ الۡحَرۡثِ ؕ ذٰلِکَ مَتَاعُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ وَ اللّٰہُ عِنۡدَہٗ حُسۡنُ الۡمَاٰبِ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ لوگوں کے لیے خواہشات نفس کی رغبت مثلاً عورتیں، بیٹے، سونے اور چاندی کے ڈھیر لگے خزانے، عمدہ گھوڑے، مویشی اور کھیتی زیب و زینت بنا دی گئی ہیں، یہ سب دنیاوی زندگی کے سامان ہیں اور اچھا انجام تو اللہ ہی کے پاس ہے۔

تشریح کلمات

الۡقَنَاطِیۡرِ: (ق ن ط ر) قنطار کی جمع ہے۔کثیر مال۔مقنطرۃ ذخیرہ شدہ مال کثیر۔
الۡمُسَوَّمَۃِ: (س و م) نشان زدہ۔عمدگی کی علامت کے طور پر عرب اپنے گھوڑوں پر نشانی لگاتے تھے۔
مَتَاعُ: (م ت ع) سامان زیست۔

تفسیر آیات

یہاں دنیاوی زندگی کے اسباب اور وسائل کی مذمت نہیں ہو رہی، بلکہ ان سے عشق و محبت کی مذمت ہو رہی ہے۔ بالفاظ دیگر متاع زندگی اور سامان حیات کے بارے میں موقف درست کرنے اور ایک غلط فہمی کو دور کرنے کی بات ہے۔

دنیاوی زندگی کے مال و متاع کو اصلی مقصد قرار دے کر اگر اس سے محبت کی جائے تو اسلامی تعلیمات کے مطابق قابل مذمت ہے۔لیکن اگر مال و متاع کو ایک اعلیٰ و ارفع مقصد کے لیے وسیلہ اور ذریعہ قرار دیا جائے تو اس کی نہ صرف یہ کہ مذمت نہیں، بلکہ قرآن نے اسے خیر سے تعبیر کیا ہے۔اسی سلسلے میں ارشاد ہے:

قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِیۡنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیۡۤ اَخۡرَجَ لِعِبَادِہٖ وَ الطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزۡقِ ...[1]　　کہدیجیے: اللہ کی اس زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے نکالی، کس نے حرام کیا اور پاک رزق کو؟

مال و متاع دنیا کی مثال کشتی اور پانی سے دی جاتی ہے کہ جب تک پانی کشتی کے نیچے رہے تو یہ کشتی کو دریا پار لے جانے کے لیے بہترین ذریعہ ہے، لیکن اگر پانی کشتی کے اندر چلا جائے تو یہی پانی ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے۔اسی طرح دنیا کے مال و متاع کو وسیلہ بنایا جائے تو بہترین ذریعہ سعادت ہے اور اگر مال و دولت کو مقصد بنا لیا تو یہ مال انسان کو ہلاکت کی طرف لے جائے گا۔دوسرے لفظوں میں اگر مال دولت پر انسان مسلط رہا تو یہ انسان کے ماتحت ہو کر ذریعہ سعادت بنے گا اور یہی مال اگر انسان پر مسلط ہو گیا تو یہ زر کا غلام بن کر ہلاک ہو جائے گا۔ کیونکہ روحانی مقاصد کا حصول مادی وسائل کے بغیر ممکن نہیں۔لہٰذا اسلام کوئی ایسا حکم صادر نہیں کرے گا جو فطرت کے منافی ہو۔

۱۔　مِنَ النِّسَآءِ: ان خواہشات پرستی میں سب سے پہلے عورتوں کا ذکر آتا ہے۔اگر خواہشات کو لگام نہ دی جائے تو عورت سب سے خطرناک فتنہ ہے۔حدیث میں ہے:

ما ترك بعدی فتنة اضر علی الرجال من النسآء[2]　　میں اپنے بعد مردوں کے لیے عورتوں سے زیادہ خطرناک آزمائش نہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔

---

[1] ۷ اعراف: ۳۲　　[2] مستدرک الوسائل ۱۴: ۳۰۲

لیکن قانون اور شرافت کے دائرے میں رہ کر اس خواہش کو پورا کرنا قابل مذمت نہیں ہے۔ رسول کریمؐ کی یہ حدیث مشہور ہے:

ما احب من دنیاکم الا النسآء و الطیب۔[1]	میں تمہاری اس دنیا سے صرف عورتوں اور خوشبو کو پسند کرتا ہوں۔

۲۔ وَالۡبَنِیۡنَ: لڑکے اگر صرف دیناوی فخر و مباہات کے لیے ہوں تو مذمت ہے لیکن یہی اولاد اگر صالح ہو تو فضیلت ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

الولد الصالح ریحانۃمن اللّٰہ.[2]	نیک اولاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے گلدستہ ہے۔

۳۔ وَالۡقَنَاطِیۡرِ الۡمُقَنۡطَرَۃِ: اس مال کی مذمت ہے جس میں خود مال مقصد ہوتا ہے اور اسے ذخیرہ کیا جاتا اور اس حبّ مال کی وجہ سے ملک کا سرمایہ چندلوگوں کے ہاتھوں میں مرتکز ہو جاتا ہے۔ قرآنی تعبیر کے مطابق قناطیر یعنی کثیر مال اس وقت مذموم ہے جب یہ مقنطرۃ ذخیرہ کی شکل میں آ جائے اور ضرورت مندوں کو اس سے کوئی استفادہ نہ ہو۔ یہ سورۃ التوبۃ کی آیت ۳۴ کے معنی میں ہے، جس میں فرمایا:

وَالَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّہَبَ وَالۡفِضَّۃَ وَلَا یُنۡفِقُوۡنَہَا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۙ فَبَشِّرۡہُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ○	اور جو لوگ سونا اور چاندی ذخیرہ کرتے ہیں اور اسے راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے، انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجیے۔

آگے دولت سمیٹنے والوں کے ذرائع کا ذکر ہے۔ وہ سونا چاندی، عمدہ گھوڑے، مویشی اور کھیتی باڑی ہے۔

یہی سونا چاندی راہ خدا میں خرچ کرنے کے لیے، عمدہ گھوڑے جہاد کے لیے، مویشی اور کھیتی باڑی اپنی معیشت کے لیے ہو تو ان میں کوئی مذمت نہیں، فضیلت ہے۔

اہم نکات

۱۔ دنیاوی نعمات سے فائدہ اٹھانا حرام نہیں، بلکہ انہیں اصلی مقصد قرار دینا ممنوع ہے۔

۲۔ دنیاوی مال و متاع کو نجات آخرت کا ذریعہ بنانے کی واحد صورت یہ ہے کہ انسان اپنے اندر متقین کے اوصاف پیدا کرے۔

۳۔ عمل کی درستی عقیدے و نظریے کی درستی پر موقوف ہے۔

قُلۡ اَؤُنَبِّئُکُمۡ بِخَیۡرٍ مِّنۡ ذٰلِکُمۡ ؕ لِلَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا عِنۡدَ رَبِّہِمۡ جَنّٰتٌ	۱۵۔ کہدیجیے: کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز بتاؤں؟ جو لوگ تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان

---

[1] الکافی ۵: ۳۲۱ [2] الکافی ۶: ۲ باب فضل الولد

تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا وَ اَزۡوَاجٌ مُّطَہَّرَۃٌ وَّ رِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ ؕ وَ اللّٰہُ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴿۱۵﴾

کے لیے ان کے رب کے پاس باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے نیز ان کے لیے پاکیزہ بیویاں اور اللہ کی خوشنودی ہو گی اور اللہ بندوں پر خوب نگاہ رکھنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اَؤُنَبِّئُکُمۡ: کہد یجیے میں تمہیں دیناوی مال و متاع سے بہتر چیز کی نشاندہی کروں، وہ کس قدر بہتر ہے۔ یہ خود اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ ہر عاقل عارضی مال و متاع عیش و آرام پر ابدی و دائمی نجات اور آرام کو ترجیح دیتا ہے۔

۲۔ لِلَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا: جو لوگ تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔ ان کے لیے وہ بہتر چیزیں میسر آئیں گی۔ تقویٰ وقایۃ سے ہے یعنی بچاؤ۔ جو لوگ اس بہتر چیز کو حاصل کرنے میں رکاوٹ بننے والی چیزوں سے اپنا بچاؤ کرتے ہیں۔ ان کو اللہ کے پاس بہتر چیزیں ملیں گی۔

۳۔ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ: ایسی جنت میں داخل ہوں گے جن میں وہ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ہمیشہ رہیں گے۔ ایک ابدی زندگی ملے گی۔ خیر کا اندازہ یہاں سے بھی ہو سکتا ہے، جو نعمت ہو گی وہ ابدی ہو گی۔

۴۔ وَ اَزۡوَاجٌ مُّطَہَّرَۃٌ: پاکیزہ بیویاں۔ شوہر کے لیے رفیقہ حیات کی پاکیزگی بہت اہم ہوتی ہے، جس کی نگاہ صرف اور صرف اپنے شوہر پر مرکوز ہو اور کسی چیز کا شائبہ تک نہ ہو۔

۵۔ وَّ رِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ: اس ابدی زندگی میں باقی نعمتوں کے علاوہ ایک ناقابل وصف و بیان نعمت ہے۔ وہ اللہ کی خوشنودی ہے، جو تمام قابل تصور نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے۔ چنانچہ دوسری آیت میں جنت کی نعمتوں کو شمار کرنے کے بعد فرمایا: رِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ...[1] اور اللہ کی طرف سے خوشنودی تو ان سب سے بڑھ کر ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی خوشنودی سب نعمتوں سے بڑی ہے۔

اَلَّذِیۡنَ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اِنَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَ قِنَا عَذَابَ

۱۶۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں: ہمارے رب! بلاشبہ ہم ایمان لائے، پس ہمارے گناہ بخش

[1] ۹ توبہ: ۷۲

النَّارِ ﴿۱۶﴾ ۚ

دے اور ہمیں آتش جہنم سے بچا۔

تفسیر آیات

اس آیہ میں اہل تقویٰ کا ذکر ہے جو یہ جانتے ہیں کہ ایمان لانے کے نتیجے میں اللہ گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا:

وَ اٰمِنُوۡا بِہٖ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ....[1]

اور اس پر ایمان لے آؤ کہ اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا۔

اَلصّٰبِرِیۡنَ وَ الصّٰدِقِیۡنَ وَ الۡقٰنِتِیۡنَ وَ الۡمُنۡفِقِیۡنَ وَ الۡمُسۡتَغۡفِرِیۡنَ بِالۡاَسۡحَارِ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ یہ لوگ صبر کرنے والے، راست باز، مشغول عبادت رہنے والے، خرچ کرنے والے اور سحر (کے اوقات) میں طلب مغفرت کرنے والے ہیں۔

تفسیر آیات

یہاں اہل تقویٰ کے چھ خصائل بیان کیے گئے ہیں:

۱۔ ان سے ایمان کی علامت، جو طلب مغفرت ہے، ظاہر ہوتی ہے۔ اٰمَنَّا فَاغۡفِرۡ لَنَا ....۔

۲۔ صبر: یعنی اطاعت پر صبر، ترک گناہ پر صبر اور مصیبت پر صبر۔

۳۔ سچائی: زبان کی سچائی کے علاوہ ظاہر کا باطن کے مطابق ہونا۔

۴۔ قنوت: یعنی عبادت میں مصروف رہنا۔

۵۔ انفاق: یعنی فیاضی اور راہ خدا میں خرچ کرنا۔

۶۔ وقت سحر (یعنی رات کے آخری حصے میں) طلب مغفرت کرنا۔ یہ نماز تہجد کی طرف اشارہ ہے۔ نماز وتر کے قنوت میں استغفار کیا جاتا ہے۔

احادیث

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

مَنْ قَالَ فِی وَتْرِہِ اِذَا اَوْتَرَ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ وَ اَتُوبُ اِلَیْہِ سَبْعِینَ مَرَّۃً وَ ھُوَ قَائِم

شخص نماز وتر میں ستر مرتبہ استغفر اللّٰہ و اتوب الیہ حالت قیام میں پڑھے اور ایک سال تک اس پر

----

[1] ۴۶ احقاف: ۳۱

فَوَاظَبَ عَلَی ذٰلِکَ حَتّٰی تَمْضِیَ سَنَۃٌ کَتَبَہُ اللّٰہُ عِنْدَہُ مِنَ الْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ وَ وَجَبَتْ لَہُ الْمَغْفِرَۃُ مِنَ اللّٰہِ عَزَّ وَ جَلَّ۔[1]

عمل کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ اس کا شمار سحر کے وقت طلب مغفرت کرنے والوں میں فرمائے گا اور اس کے لیے مغفرت واجب ہو جائے گی۔

اہم نکات

۱۔ ایمان باللہ باعث مغفرت ہے۔
۲۔ متقی کی سب سے پہلی نشانی صبر و استقامت ہے۔ اَلصّٰبِرِیۡنَ ....۔

شَہِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَ اُولُوا الۡعِلۡمِ قَآئِمًۢا بِالۡقِسۡطِ ؕ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ اللہ نے خود شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں اور اہل علم نے بھی یہی شہادت دی، وہ عدل قائم کرنے والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

تشریح کلمات

شَہِدَ: (ش ہ د) شہادت۔ کسی چیز کا مشاہدہ کرنا اور وہ بات جو یقین کامل کے ساتھ کہی جائے۔ البتہ مشاہدہ شرط ہے، خواہ وہ عینی ہو یا قلبی۔

الۡقِسۡطِ: (ق س ط) عدل و انصاف۔

تفسیر آیات

اس آیہ مبارکہ میں اللہ کی وحدانیت پر تین شہادتوں کا ذکر ہے جو نہایت قابل توجہ ہیں:

۱۔ اللہ کی شہادت: اللہ کی وحدانیت پر سب سے پہلی شہادت خود اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ قولاً و فعلاً اپنے عدل اور اپنی وحدانیت کی گواہی دیتا ہے۔ قولاً اسی آیت میں شہادت دے رہا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ عدل و انصاف پر قائم ہے۔ عملی شہادت یہ ہے کہ اللہ کا ہر عمل اور کائنات کی ہر چیز اور اس میں رونما ہونے والا ہر واقعہ اللہ کی وحدانیت اور عدل پر دلالت کرتا ہے۔ کائنات کا نظام بذات خود ایک

---

[1] ثواب الاعمال ص ۱۷۱۔ المیزان ۳ : ۱۱۹

عملی گواہ ہے:

یَا مَنْ دَلَّ عَلَی ذَاتِهِ بِذَاتِهِ۔[1] اے وہ ذات جوخود اپنی ذات پر دلیل ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ کائنات کا نظام کس طرح اللہ کی وحدانیت پر گواہ ہے؟

ہم جانتے ہیں کہ ذرے سے لے کر نظام شمسی اور کہکشاؤں تک سارا نظام کائنات ایک ہی طرز کے نظام پر قائم ہے۔ چنانچہ ذرے (atom) میں ایک شے کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور مختلف ذرات اس کے گرد گھومتے ہیں۔ یہی نظام، شمسی نظام اور کہکشاؤں میں بھی کارفرما ہے۔ نظام کائنات کی وحدت اور ہم آہنگی ملاحظہ ہو کہ یہاں سب چیزیں اپنے اپنے مرکز کے گرد گھوم رہی ہیں۔ الیکٹران اپنے مرکزے کے گرد گھومتے ہیں۔ سیارے گھومتے ہیں، سورج گھومتا ہے، چاند گھومتا ہے، ستارے گھومتے ہیں، کہکشائیں گھومتی ہیں۔ اس طرح مخلوق کی وحدت، خالق کی وحدت پر دلالت کرتی ہے۔ اگر نظام دہندہ ایک نہ ہوتا تو کائناتی نظام اور انسانی وجود میں تصادم اور تضاد واقع ہوتا۔ اس کے تکوینی اور تشریعی نظاموں میں ناہم آہنگی ہوتی۔ نظام دہندہ مختلف ہوتے تو نظام بھی مختلف ہوتے۔ سچ فرمایا خالق نے:

لَوۡ کَانَ فِیۡہِمَاۤ اٰلِہَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا ...۔[2] اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا معبود ہوتے تو دونوں (کے نظام) درہم برہم ہو جاتے۔

بعض اوقات اس نظام میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات میں مضمر حکمت اور عدالت ہماری فہم و ادراک میں نہیں آتی اور شک پیدا ہوتا ہے، لیکن ایسے واقعات دو صورتوں سے خالی نہیں ہیں یا تو ان میں مضمر حکمت و فلسفہ اور عدل و انصاف بعد میں سمجھ میں آتا ہے، یعنی ان کا انکشاف اور علم حاصل ہو جاتا ہے یا اس راز کا انکشاف نہیں ہوتا۔ اگر انکشاف نہ ہو تو اس صورت میں بھی عدل و انصاف کے راز کا علم نہ ہونا، عدل و انصاف کے نہ ہونے کی دلیل نہیں بنتا۔ لہٰذا صحیفہ کائنات، اللہ کی وحدانیت پر دلیل ہے۔ اگر اللہ کے علاوہ کوئی اور معبود بھی اس کائنات میں دخیل ہوتا تو ہر ایک اپنے لیے عدل و انصاف کرتا، لیکن دوسرے کی نسبت عدل سے کام نہ لیتا، جب کہ پوری کائنات پر عدل و انصاف حاکم ہے۔

اللہ کی وحدانیت پر پختہ یقین رکھنا اور اس کے عدل و انصاف پر ایمان رکھنا، اس آیت کی روحِ مطلب ہے، کیونکہ انسان جب تک آسودہ رہتا ہے، خدا کو عادل اور منصف تصور کرتا ہے، مگر جب کسی امتحان سے دوچار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی عدالت کا سوال اٹھاتا ہے۔ لہٰذا صحیح مومن وہ ہے جو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو عادل سمجھے اور اس کے ہر فیصلے کو تَسْلِيْمًا لِاَمْرِهِ وَ رِضًا بِقَضَائِهِ کے طور پر قبول کرے۔

۲۔ ملائکہ کی شہادت: فرشتے اس نظام کائنات کے کارندے ہیں اور اسی وجہ سے اللہ کی وحدانیت

---

[1] بحار الانوار ۸۴: ۳۳۹
[2] ۲۱ انبیاء: ۲۲

اور اس کے عدل و انصاف کا براہ راست علم رکھتے اور حکم خدا سے کائنات کے بہت سے انتظامی امورانجام دیتے ہیں:

... بَلۡ عِبَادٌ مُّكۡرَمُوۡنَ ۙ لَا یَسۡبِقُوۡنَہٗ بِالۡقَوۡلِ وَ ہُمۡ بِاَمۡرِہٖ یَعۡمَلُوۡنَ ۝ [1]

بلکہ یہ (فرشتے) تو اللہ کے محترم بندے ہیں۔ وہ تو اللہ (کے حکم) سے پہلے بات (بھی) نہیں کرتے اور اسی کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔

۳۔ **صاحبان علم کی شہادت:** صاحبان علم بھی اللہ تعالیٰ کے نظام عدل میں موجود راز ہائے پنہاں کو جانتے ہیں اور صحیفہ آفاق و انفس کے صفحات کا بغور مطالعہ کرتے ہیں اور کہ اٹھتے ہیں:

رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا [2]

ہمارے پروردگار! یہ سب کچھ تو نے بے حکمت نہیں بنایا۔

اس آیت سے اہل علم کی اہمیت و فضیلت کا اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ اور فرشتوں کے بعد اہل علم ہی اس کائنات میں شہادت کے قابل ہیں۔

۴۔ قَآئِمًۢا بِالۡقِسۡطِ: وہ تدبیر کائنات، جزائے اعمال اور نظام علل و اسباب میں عادل ہے:

وَ اَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی [3]

اور یہ کہ انسان کو صرف وہی ملتا ہے جس کی وہ سعی کرتا ہے۔

منکر و ملحد کا پودا اسی طرح پھلتا پھیلتا ہے، جس طرح مؤمن و متقی کا اور گناہ کی سزا ایک اور نیکی کی جزا دس گنا نیز خود عدل و انصاف کا فہم و شعور ہمارے ذہنوں میں موجود ہونا، اس بات پر دلیل ہے کہ ہمارا خالق اور ہمارا معبود عدل و انصاف کا خالق اور مالک ہے۔

احادیث

جابر بن عبد اللہ راوی ہیں کہ پیغمبر اکرم (ص) نے فرمایا:

سَاعَۃَ مِنۡ عَالِمٍ یَتَّکِئُ عَلَیٰ فِرَاشِہٖ یَنۡظُرُ فِیۡ عِلۡمِہٖ خَیۡرٌ مِنۡ عِبَادَۃِ العَابِدِ سَبۡعِیۡنَ سَنَۃً۔ [4]

عالم کا اپنے بستر پر تکیہ لگا کر ایک گھڑی اپنے علم میں غور و فکر کرنا، عابد کی ستر سالوں کی عبادت سے بہتر ہے۔

اس آیت کی فضیلت میں رسول خدا (ص) سے مروی ہے:

مَنۡ قَرَأَ آیَۃَ شَہِدَ اللہُ ...، عِنۡدَ مَنَامِہٖ خَلَقَ اللّٰہُ تَعالیٰ لَہٗ سَبۡعِیۡنَ اَلۡفَ مَلَكٍ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لَہٗ اِلَی یَوۡمِ القِیٰمَۃِ [5]

جو شخص آیہ شَہِدَ اللہُ ... کو سونے کے وقت پڑھے، اللہ تعالیٰ اس سے ستر ہزار فرشتے پیدا فرمائے گا جو اس شخص کے لیے قیامت تک استغفار کرتے رہیں گے۔

---

[1] ۲۱ انبیاء: ۲۶۔ ۲۷　[2] ۳ آل عمران: ۱۹۱　[3] ۵۳ نجم: ۳۹

[4] جامع الاخبار ص ۳۷۔ روضۃ الواعظین ۱: ۱۲۔　[5] بحار الانوار ۸۴: ۱۷۹۔ مجمع البیان ۱: ۷۱۷

اہم نکات

۱۔ اللہ کی وحدانیت اور عدل کی شہادت قرآن میں قولاً اور نظام کائنات میں عملاً موجود ہے۔

۲۔ مومن زندگی کے تمام امتحانات میں اللہ کی وحدانیت اور اس کے عدل پر پورا ایمان رکھتا ہے۔

۳۔ اللہ کی وحدانیت اور اس کے عدل و انصاف کے گواہ، نزدیک سے مشاہدہ کرنے والے فرشتوں کے بعد صاحبان علم ہی ہیں۔

اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ ۟ وَ مَا اخۡتَلَفَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَہُمُ الۡعِلۡمُ بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ ؕ وَ مَنۡ یَّکۡفُرۡ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۱۹﴾

۱۹۔ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے اور جنہیں کتاب دی گئی انہوں نے علم حاصل ہو جانے کے بعد آپس کی زیادتی کی وجہ سے اختلاف کیا اور جو اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتا ہے تو بے شک اللہ (اس سے) جلد حساب لینے والا ہے۔

تشریح کلمات

الدِّیۡنَ: (د ی ن) اطاعت اور جزاء کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بطور استعارہ شریعت کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ اصطلاح میں اللہ کے تعیین کردہ دستور اور نظام حیات کو دِین کہتے ہیں۔

الۡاِسۡلَامُ: (س ل م) اسلام کا معنی امن و آشتی اور صلح میں داخل ہونا ہے۔ اللہ کے دین میں داخل ہونے سے امن اور سلامتی ملتی ہے۔ یہ کلمہ سر تسلیم خم کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ: خدائے واحد نے انسان کو ایک ہی نظام حیات اور طریقہ زندگی عنایت فرمایا ہے اور انسانوں تک اس نظام حیات کو پہنچانے کے لیے انبیاء بھیجے ہیں۔ ہر نبی نے اپنے عصری تقاضوں کے مطابق انسانوں کو اللہ کا عطا کردہ ضابطہ حیات پہنچایا۔ ان سب کا پیغام مشترک ہے اور وہ ہے اسلام، جو توحید اور نفی شرک کا مذہب ہے۔

مروی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام، اسلام کی تعریف یوں فرماتے ہیں:

لَاَنْسُبَنَّ الْاِسْلَامَ نِسْبَۃً لَمْ یَنْسُبْھَا　　میں اسلام کی ایسی تعریف بیان کرتا ہوں جو مجھ سے

اَحَدٌ قَبْلِی اَلْاِسْلَامُ ھُوَ التَّسْلِیْمُ وَ التَّسْلِیْمُ ھُوَ الْیَقِیْنُ وَ الْیَقِیْنُ ھُوَ التَّصْدِیْقُ وَ التَّصْدِیْقُ ھُوَ الْاِقْرَارُ وَ الْاِقْرَارُ ھُوَالْاَدَاءُ وَ الْاَدَاءُ ھُوَ الْعَمَلُ۔[1]

پہلے کسی نے بیان نہیں کی: اسلام سر تسلیم خم کرنا ہے اور سر تسلیم خم کرنا یقین ہے، یقین تصدیق ہے اور تصدیق اعتراف ہے، جب کہ اعتراف فرض کی ادائیگی ہے اور فرض کی ادائیگی عمل کہلاتی ہے۔

اسلام کا بنیادی عقیدہ توحید ہے اور ہر قسم کے شرک کی نفی ہے ۔نفی شرک ابو الانبیاء حضرت ابراہیم اور تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ہے:

ثُمَّ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ اَنِ اتَّبِعۡ مِلَّۃَ اِبۡرٰہِیۡمَ حَنِیۡفًا ؕ وَ مَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿﴾[2]

(اے رسول) پھر ہم نے آپ کی طرف وحی کی کہ یکسوئی کے ساتھ ملت ابراہیمی کی پیروی کریں اور ابراہیم مشرکین میں سے نہ تھے۔

اسی نفی شرک کی بنیاد پر حضرت ابراہیم (ع) کو مُسْلِمْ کہا گیا ہے :

مَا کَانَ اِبۡرٰہِیۡمُ یَہُوۡدِیًّا وَّ لَا نَصۡرَانِیًّا وَّ لٰکِنۡ کَانَ حَنِیۡفًا مُّسۡلِمًا ... [3]

ابراہیم نہ یہودی تھے نہ عیسائی بلکہ وہ یکسوئی کیساتھ مسلم تھے اور وہ مشرکین میں سے ہرگز نہ تھے۔

۲۔ وَمَا اخۡتَلَفَ: واضح رہے کہ اہل کتاب نے اس دین واحد میں اختلاف پیدا کیا۔ اس کی وجہ ان کی لاعلمی نہیں تھی، بلکہ وہ جانتے تھے کہ دین میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ جانتے ہوئے آپس کی ضد بازی میں اور ایک دوسرے پر زیادتی کی توجیہ کرنے کے لیے اختلاف کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے خلاف قتال کرتے نیز دین میں تصرف وتحریف کرتے اور اپنے ذاتی مفادات کو دین پر مقدم رکھتے تھے۔

۳۔ بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ : ادیان عالم کے ماہرین جانتے ہیں کہ ۳۲۵ء میں شاہ قسطنطین نے مسیحی مذہب کے توحید پرستوں پر کفر و الحاد کا فتویٰ لگایا اور ان کی کتابوں کو آگ لگا دی۔ بعد میں جب تثلیث پر مبنی ان کے مذہب کی جڑیں مضبوط بنا دی گئیں تو ۶۲۸ء میں ایک قانون کے ذریعے ان توحید پرستوں کی نسل کشی کی گئی۔[4]

افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ اس امت نے بھی آپس میں دست بہ گریباں ہونے، تکفیر و قتال اور کتب سوزی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اب تک یہ سلسلہ شد و مد کے ساتھ جاری ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسانی نجات کے لیے اللہ کی طرف سے ایک ہی دین آتا رہا ہے جو اسلام ہے۔

۲۔ اہل کتاب نے جاہ پرستی اور مفادات کی وجہ سے دین واحد میں اختلاف ڈالا۔

---

[1] نہج البلاغۃ کلمات قصار: ۱۲۵ص ۸۰۷۔ ترجمہ مفتی جعفر حسینؒ۔ [2] ۱۶ النحل: ۱۲۳

[3] ۳ آل عمران: ۶۷ [4] تفسیر مراغی ۳: ۱۲۰

فَاِنۡ حَآجُّوۡکَ فَقُلۡ اَسۡلَمۡتُ وَجۡہِیَ لِلّٰہِ وَ مَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَ قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ وَ الۡاُمِّیّٖنَ ءَاَسۡلَمۡتُمۡ ؕ فَاِنۡ اَسۡلَمُوۡا فَقَدِ اہۡتَدَوۡا ۚ وَ اِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ ؕ وَ اللّٰہُ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴿۲۰﴾

۲۰۔(اے رسول) اگر یہ لوگ آپ سے جھگڑا کریں تو ان سے کہہ دیجیے: میں نے اور میری اتباع کرنے والوں نے تو اللہ کے آگے سر تسلیم خم کیا ہے، پھر اہل کتاب اور ناخواندہ لوگوں سے پوچھیے کیا تم نے بھی تسلیم کیا ہے؟ اگر یہ لوگ تسلیم کر لیں تو ہدایت یافتہ ہو جائیں گے اور اگر منہ موڑ لیں تو آپ کی ذمے داری تو صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر خوب نظر رکھنے والا ہے۔

۱۔ فَاِنۡ حَآجُّوۡکَ: یہ آیت نجران کے اس وفد کے بارے میں ہے جو مسیحیت اور اسلام کے حوالے سے بحث و مناظرہ کرنے کے لیے آیا تھا۔ ان کے بارے میں حکم ہوا کہ وہ آپ سے بحث کریں تو آپ کا جواب یہ ہونا چاہیے: اَسۡلَمۡتُ وَجۡہِیَ لِلّٰہِ وَ مَنِ اتَّبَعَنِ یعنی میں نے اور میرے پیروکاروں نے اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا ہے۔ اس میں دلیل یہ ہے کہ جس اللہ کو تم بھی خالق مانتے ہو، ہم صرف اسی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں، تمہیں بھی ایسا کرنا چاہیے اور اپنے خالق کی بندگی میں کسی اور کو شریک نہیں کرنا چاہیے۔ ساتھ یہ بات بھی واضح فرما دی کہ جو لوگ اللہ کے لیے تسلیم و رضا کی منزل میں نہیں ہوتے، وہ کلمہ حق نہیں سمجھتے۔ ان سے بحث و مباحثہ بے نتیجہ ہے۔

وَجۡہِیَ: اپنی ذات کو وجہ (چہرہ) کے ساتھ اس لیے تعبیر فرمایا کہ چونکہ اکثر حواس چہرے میں ہیں۔ شناخت بھی چہرے سے ہوتی ہے۔ چہرہ تسلیم کرے تو پورا وجود تسلیم کی منزل میں ہوتا ہے۔

۲۔ وَ قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ: اہل کتاب اور ناخواندہ لوگ یعنی مشرکین دونوں کو صرف اللہ کی بندگی کرنی چاہیے، کیونکہ اللہ ان دونوں کے نزدیک خالق ہے۔ اگر وہ کسی دلیل کو سمجھنے اور ماننے پر آمادہ ہو جائیں تو اس دعوت کو قبول کر لیں گے۔

۳۔ ءَاَسۡلَمۡتُمۡ: کیا تم نے تسلیم کیا ہے تم اسلام قبول کرتے ہو؟ یہ جملہ بعض کے نزدیک حکم ہے۔ یعنی اسلام لے آؤ اور بعض کے نزدیک تہدید ہے۔ میرے نزدیک یہ جملہ تہدید ہے۔ اس پر وَ اللّٰہُ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ قرینہ ہے۔

۴۔ وَ اِنۡ تَوَلَّوۡا: اور اگر وہ قبول نہیں کرتے او ر منہ موڑ لیتے ہیں تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ ان کے گمراہ ہونے کے آپ (ص) ذمہ دار نہیں ہیں۔

۵۔ فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ: آپ (ص) کی ذمہ داری تبلیغ و دعوت ہے، نہ جبر و بحث۔ اللہ آپ (ص) کی دعوت و تبلیغ اور ان کے کفر و الحاد پر نظر رکھے ہوئے ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان اپنی ذمہ داری نبھانے کا ذمہ دار ہے، نتیجے کا نہیں: فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ ۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَ یَقۡتُلُوۡنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیۡرِ حَقٍّ ۙ وَّ یَقۡتُلُوۡنَ الَّذِیۡنَ یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡقِسۡطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرۡہُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۲۱﴾

۲۱۔ جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے ہیں اور لوگوں میں سے انصاف کا حکم دینے والوں کو بھی قتل کرتے ہیں انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیں۔

تفسیر آیات

اہل کتاب کو بالعموم اور یہودیوں کو بالخصوص بے نقاب کیا جا رہا ہے:

۱۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ: وہ آیات الٰہی کی تکذیب کرتے ہیں۔

۲۔ نبیوں کو یہ قتل کرتے ہیں۔ قتل سے ان کی تاریخ کے اوراق کے اوراق سیاہ ہیں۔ یسیعا، یرمیا، زکریا اور یحییٰ علیہم السلام کا قتل اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اقدام قتل سب کو معلوم ہے۔

ماضی میں ان کا یہی کردار رہا ہے اور چونکہ موجودہ نسل بھی اسی قسم کی سوچ رکھتی ہے، لہٰذا یہ بھی اس جرم میں برابر کی شریک ہے۔

وَّ یَقۡتُلُوۡنَ الَّذِیۡنَ یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡقِسۡطِ سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کے بعد عدل و انصاف کی دعوت دینے والوں، یعنی علماء کا درجہ آتا ہے۔ یہ لوگ حق و انصاف کے داعیوں کو بھی قتل کرتے ہیں۔ چونکہ وہ ان کے جرائم کے آگے رکاوٹ بن جاتے تھے

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُہُمۡ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ۫ وَ مَا لَہُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ ایسے لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت میں برباد ہو گئے اور ان کا کوئی مددگار نہیں۔

تفسیر آیات

حَبِطَتۡ اَعۡمَالُہُمۡ فِی الدُّنۡیَا: دنیا میں تو یہ لوگ کسی نیک نامی کے سزاوار نہ رہے اور انبیاء کی زبان سے ان کا راز فاش ہو جانے کی وجہ سے قابل نفرت ہو گئے۔

وَ الۡاٰخِرَۃِ: آخرت میں بھی ان کے اعمال کا نہ کوئی ثواب ہو گا اور نہ ہی کوئی ان کی شفاعت کرنے والا ہو گا، کیونکہ انبیاء (ع) اور عدل و انصاف کے داعیوں کو قتل کرنے کی وجہ سے ان میں کوئی خوبی نہ رہی۔ جب عمل کرنے والے میں خوبی نہیں رہتی تو عمل کی خوبی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یوں ان کے اعمال حبط ہو جائیں گے۔

اَعۡمَالُہُمۡ سے مراد توریت پر عمل کرنے اور شریعت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ متمسک رہنے کے عمل کا بے نتیجہ رہنا ہے۔ حبط اعمال کے بارے میں تفصیل کے لیے سورہ احزاب، آیت ۱۹ اور سورہ حجرات، آیت ۴۹ ملاحظہ فرمائیں۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ یُدۡعَوۡنَ اِلٰی کِتٰبِ اللّٰہِ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَہُمۡ ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ وَ ہُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ہے انہیں کتاب خدا کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق کج ادائی کرتے ہوئے منہ پھیر لیتا ہے۔

شان نزول: خیبر کے یہودیوں میں زنا اور اس کی تعزیرات کا ایک مسئلہ پیش آیا تو انہوں نے رسول اللہ (ص) کی طرف رجوع کیا۔ حضور (ص) نے توریت کے حوالے سے شوہر دار عورت کے ساتھ زنا کرنے کی تعزیر کے طور پر سنگساری کا حکم دیا، لیکن یہودیوں نے اس بات کے ثبوت کے باوجود کہ یہ فیصلہ توریت کے مطابق ہے، اسے ماننے سے انکار کر دیا، جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1]

دوسری روایت کے مطابق یہ آیت ان یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی، جن کو رسول اللہ (ص)

---

[1] مجمع البیان

نے اسلام کی دعوت دی تو نعمان بن عمرو و دیگر یہودیوں نے کہا: آپ کس دین پر ہیں؟ فرمایا: میں دین ابراہیمی پر ہوں۔ یہودیوں نے کہا: ابراہیم تو یہودی تھے۔ فرمایا: ہم توریت کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ ابراہیمؑ کا دین کیا تھا، تو وہ آمادہ نہ ہوئے۔

اَنصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ: جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، سے مراد اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ ہیں۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں: اول یہ کہ اہل کتاب کے پاس موجود توریت و انجیل میں صرف کچھ حصہ اللہ کا کلام ہے، باقی تحریف کی نذر ہو گئے ہیں۔ دوم یہ کہ جن آیات میں اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ کہا گیا ہے، ان میں کتاب سے مراد کتاب کا ایک حصہ ہے۔

ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَالُوۡا لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ ۪ وَ غَرَّہُمۡ فِیۡ دِیۡنِہِمۡ مَّا کَانُوۡا یَفۡتَرُوۡنَ ﴿۲۴﴾

۲۴۔ ان کا یہ رویہ اس لیے ہے کہ وہ کہتے ہیں: جہنم کی آگ ہمیں چند روز کے سوا چھو نہیں سکتی اور جو کچھ یہ بہتان تراشی کرتے رہے ہیں اس نے انہیں اپنے دین کے بارے میں دھوکے میں رکھا ہے۔

تفسیر آیات

ان سیاہ کاریوں کا اصل سرچشمہ ان کے باطل نظریات ہیں جن کے تحت وہ انسانیت سوز مظالم و جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ہماری معاصر تاریخ بھی ان یہودیوں کے لرزا دینے والے جرائم و مظالم سے پر ہے۔ ان باطل نظریات میں سے ایک یہ نظریہ ہے کہ یہودی کو جہنم کی آگ گنتی کے چند ایام کے سوا چھو نہیں سکتی نیز اولاد یعقوب اللہ کی برگزیدہ مخلوق ہے اور یہ کہ اولاد یعقوب سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انہیں کوئی عذاب وغیرہ نہیں دیا جائے گا۔

وَ غَرَّہُمۡ: افتراء اور بہتان پر مبنی یہی نظریات تمام یہودی جرائم کا سرچشمہ ہیں۔ گ

فَکَیۡفَ اِذَا جَمَعۡنٰہُمۡ لِیَوۡمٍ لَّا رَیۡبَ فِیۡہِ ۟ وَ وُفِّیَتۡ کُلُّ نَفۡسٍ مَّا کَسَبَتۡ وَ ہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۵﴾

۲۵۔ پس اس دن ان کا کیا حال ہو گا جب ہم ان سب کو جمع کریں گے جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں اور ہر شخص اپنے اعمال کا پورا بدلہ پائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

تفسیر آیات

لَا رَیۡبَ فِیۡہِ: قیامت کے دن کے آنے میں کسی قسم کے شبہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جو

لوگ اس میں شبہ پیدا کرتے ہیں، وہ درحقیقت شبہ نہیں ہے، بلکہ شبہ کرنے والے کی کوتاہ بینی ہے۔ دنیا میں یہ لوگ اپنے خود ساختہ باطل نظریات کی بناء پر جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

وَوُفِّيَتۡ كُلُّ نَفۡسٍ مَّا كَسَبَتۡ: قیامت کے دن سب کو اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ یہاں نہ بہتان کام آئے گا اور نہ ہی دھوکہ دہی سے کام چلے گا: فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ....[1]

وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ: نہ ان کے اعمال سے کم ثواب دیا جائے گا، نہ گناہوں سے زیادہ عذاب دیا جائے گا۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کا پسندیدہ دین ایک ہی ہے۔ اگر اختلافات نظر آتے ہیں تو یہ لوگوں کی ضد بازی، تعصب اور مفاد پرستی کی وجہ سے ہیں۔

۲۔ انسانی کردار و سیرت پر باطل نظریات کا گہرا اثر مرتب ہوتا ہے۔ لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ ....

۳۔ قیامت کے دن ہر شخص کو اپنے اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ یہاں رنگ و نسل فائدہ نہیں دے گی۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الۡمُلۡكِ تُؤۡتِي الۡمُلۡكَ مَنۡ تَشَآءُ وَتَنۡزِعُ الۡمُلۡكَ مِمَّنۡ تَشَآءُ ۫ وَتُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الۡخَيۡرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ کہد یجیے: اے اللہ! اے مملکت (ہستی) کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہے حکومت چھین لیتا ہے اور تو جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل کر دیتا ہے، بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

تشریح کلمات

الۡمُلۡكَ: (م ل ک) حکومت۔ بادشاہت۔ زیر تصرف چیز کو بذریعہ حکم کنٹرول کرنا۔

تَنۡزِعُ: (ن ز ع) چھین لینا۔ کھینچ لینا۔ ایک دوسرے کو کھینچنا یعنی مخاصمت کرنا۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الۡمُلۡكِ: اس عاجزانہ مناجات میں توحید کا اعتراف ہے کہ پوری کائنات اللہ

---

[1] ۹۹ الزلزال: ۷

تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ ایک طرف سے وہ کائنات کا خالق ہونے کے لحاظ سے سب کا مالک ہے:

لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۔۔۔[1]　　جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اس کی ملکیت ہے۔

جس طرح اللہ کی قوت تخلیق میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہے، اسی طرح اس کی سلطنت، مالکیت اور بادشاہی میں بھی کوئی شریک نہیں ہے۔ دوسری طرف کائنات کی ہر شے اللہ کے فیض کے بغیر ایک لمحے کے لیے بھی اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی۔ لہٰذا کوئی شے اپنی ذات کی مالک نہیں۔ اللہ مالك الملك ہے۔ یعنی جن چیزوں پر دوسروں کا تصرف ہے، ان کا مالک حقیقی اللہ ہی ہے۔ یعنی اللہ کی مالکیت کسی کی طرف سے نہیں، اللہ کل کائنات کا بذات خود مالک ہے۔ اللہ کے علاوہ کوئی بھی بذات خود مالک نہیں ہے، بلکہ اللہ کی طرف سے مالک بنانے پر مالک ہوئے ہیں۔ چونکہ غیر اللہ کی ملکیت اس کی ذاتی نہیں ہے، اس لیے اس کی ملکیت قابل انتقال ہے۔

۲۔ **اللہ کی مشیت۔** تُؤۡتِی الۡمُلۡکَ مَنۡ تَشَآءُ: اللہ جسے چاہتا ہے بادشاہت اور حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔ اس میں ہر قسم کی حکومت اور بادشاہت شامل ہے۔ حق و باطل اور ظالم و عادل، تمام بادشاہتیں اللہ کی مملکت کے دائرے کے اندر موجود ہیں۔

واضح رہے اللہ کی مشیت عدم جبر پر قائم ہے کہ انسان کو اس کے قائم کردہ نظام علل و اسباب میں ڈال دیتا ہے اور حق و باطل کی رہنمائی کرتا ہے، پھر اپنے ارادہ و اختیار سے فیصلہ کرنے کا موقع دیتا ہے:

اِنَّا ہَدَیۡنٰہُ السَّبِیۡلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوۡرًا ۝[2]　　ہم نے اسے راستے کی ہدایت کر دی، خواہ شکر گزار بنے اور خواہ ناشکرا۔

i۔ اللہ اپنے برگزیدہ بندوں کو استحقاق و انتخاب کے لحاظ سے نعمت و حکومت سے نوازتا ہے۔ جیسا کہ آل ابراہیم کو ملک عظیم عنایت فرمایا:

وَ اٰتَیۡنٰہُمۡ مُّلۡکًا عَظِیۡمًا ۔[3]　　اور ان کو عظیم سلطنت عنایت کی۔

ایسی حکومت قابل تعریف و تمجید ہے۔

ii۔ کبھی اللہ کے بندے علل و اسباب اور اللہ کے عطا کردہ وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومت، بادشاہت اور مال و دولت حاصل کرتے ہیں۔ یہ عمل بھی اس لحاظ سے اللہ کی طرف منسوب ہے کہ اس کے عطا کردہ وسائل سے یہ مال و دولت یا حکومت و سلطنت حاصل ہوئی ہے۔

☆ اگر ان نعمتوں کو جائز مقام دیا جائے، حکومت سے عدل و انصاف اور مال و دولت سے احسان اور خدمت خلق کا کام لیا جائے تو ایسی دولت اور حکومت نعمت اور سعادت کا موجب بنتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

---

[1] ۲ بقرہ: ۱۱۶　[2] ۷۶ دھر: ۳　[3] ۴ نساء: ۵۴

وَ ابۡتَغِ فِیۡمَاۤ اٰتٰىکَ اللّٰہُ الدَّارَ الۡاٰخِرَۃَ ...[1]

اور جو (مال) اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر حاصل کر۔

☆ اگر ان نعمتوں کا غلط استعمال کیا جائے تو اس صورت میں مال و دولت اور حکومت انسان کے لیے نعمت و سعادت بننے کی بجائے عذاب بن جائیں گی۔ اس سلسلے میں ارشاد خداوندی ہے:

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ بَدَّلُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ کُفۡرًا وَّ اَحَلُّوۡا قَوۡمَہُمۡ دَارَ الۡبَوَارِ ۝[2]

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ کی نعمت کو ناشکری سے بدل دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں اتار دیا؟

لہٰذا اس قسم کی دولت وحکومت کبھی موجب نعمت و سعادت اور کبھی موجب عذاب ہوتی ہے۔ خصوصاً ظالم حکمرانوں کو مہلت اس لیے دی جاتی ہے کہ وہ عذاب الٰہی کے زیادہ سے زیادہ سزاوار ٹھہریں۔ اس صورت میں حکومت وسلطنت ان ظالموں کے لیے ابدی عذاب کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔

ایک واقعہ، ایک عظیم درس: یزید ملعون نے اپنے دربار میں اسیران اہل بیت علیہم السلام کے سامنے بطور طنز اس آیت کو پڑھا:

... تُؤۡتِی الۡمُلۡکَ مَنۡ تَشَآءُ وَ تَنۡزِعُ الۡمُلۡکَ مِمَّنۡ تَشَآءُ ...۔

تو جسے چاہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہے حکومت چھین لیتا ہے ...۔

جواب میں جناب سیدہ زینب سلام اللہ علیہا نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

وَ لَا یَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّمَا نُمۡلِیۡ لَہُمۡ خَیۡرٌ لِّاَنۡفُسِہِمۡ ؕ اِنَّمَا نُمۡلِیۡ لَہُمۡ لِیَزۡدَادُوۡۤا اِثۡمًا ۚ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ ۝[3]

کافر لوگ یہ گمان نہ کریں کہ ہم انہیں جو ڈھیل دے رہے ہیں وہ ان کے لیے بہتر ہے، ہم تو انہیں صرف اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں تاکہ یہ لوگ اپنے گناہوں میں اور اضافہ کر لیں، آخرکار ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔

لہٰذا اللہ کی مشیت ایسی نہیں جو حکمت اور فلسفے سے عاری ہو کہ بلا وجہ جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے حکومت چھین لے، بلکہ اللہ بعض لوگوں کو بطور استحقاق، بعض کو بطور آزمائش و امتحان اور بعض کو بطور عذاب یہ نعمت دیتا ہے۔

۳۔ وَ تُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ: عزت اس حالت کو کہتے ہیں، جس تک پہنچنا آسان نہ ہو۔ اس لیے نادر چیز کو عزیز الوجود کہتے ہیں اور جس پر غالب آنا مشکل ہو اس کو بھی عزیز کہتے ہیں۔ ناقابل تسخیر کو عزیز کہتے ہیں۔

---

[1] ۲۸ قصص: ۷۷ [2] ۱۴ ابراہیم: ۲۸ [3] ۳ آل عمران: ۱۷۸

عزت کا بذات خود مالک صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے: اِنَّ الۡعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیۡعًا [1] لہٰذا واقعی اور حقیقی عزت کی مالک صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کے بعد اللہ جس کو عزت دے، وہ بھی عزت کا مالک ہوتا ہے لیکن یہ عزت اس کی ذاتی نہیں ہے، بلکہ خدادادی ہے۔

۴۔ وَ تُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ: جس کو اللہ عزت نہ دے، وہ ذلیل ہے۔ چونکہ عزت صرف اللہ کے پاس ہے، غیر اللہ کے پاس اللہ کی طرف سے عزت آئے تو عزیز ہوتا ہے، ورنہ اپنی اصلی حالت، یعنی ذلت پر برقرار رہتا ہے۔

۵۔ بِیَدِکَ الۡخَیۡرُ: بھلائی اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ ہر حالت میں خیر و بھلائی اسی کے ہاتھ میں ہے، خواہ نعمتیں دے، خواہ سلب کرے۔ چاہے تو کسی کو عزت دے یا ذلیل کر دے۔ ان سب میں مثبت پہلو صرف خیر کا ہے اور ان کا منفی پہلو شر ہے، جو اللہ کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا۔ اللہ کی طرف صرف مثبت پہلو منسوب ہوتا ہے۔ مثلاً عزت دینا اللہ کی طرف سے ہے جو خیر ہے، نہ دینا عدم ہے اور یہ عدم اللہ کی طرف منسوب نہیں ہوتا، کیونکہ عدم، تخلیق نہیں ہے۔ اس جگہ خیر و شر کا نظریہ رکھنے والے صریح قرآن کی تاویل کرتے ہیں اور کہتے ہیں: بِیَدِکَ الۡخَیۡرُ کے بعد و الشر محذوف ہے۔

شر کیوں خلق ہوا؟: یہ بات نہایت قابل توجہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز کا ذاتی پہلو خیر ہی خیر ہے اور یہ پہلو اللہ تعالیٰ کا تخلیقی پہلو ہے اور شر اس کا معروضی پہلو ہے۔ مثلاً پانی کا ذاتی پہلو خیر ہی خیر ہے اور معروضی پہلو یہ ہے کہ کبھی اس میں انسان غرق ہو کر مر جاتا ہے تو یہ پہلو اللہ کا تخلیقی پہلو نہیں ہے۔ یعنی اللہ نے پانی کو حیات کے لیے بنایا ہے، غرق کے لیے نہیں۔ اگر اس میں کوئی انسان غرق ہوتا ہے تو یہ اس کا ایک معروضی پہلو ہے، جو پانی کی غرض تخلیق سے مربوط نہیں ہے۔ اسی طرح سانپ، بچھو وغیرہ میں موجود زہر کا مثبت پہلو خیر ہے۔ چنانچہ اس پہلو سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔ اگر کسی منفی پہلو سے ضرر پہنچتا ہے تو یہ اس کا معروضی پہلو ہے۔

ثانیاً ارتقا پذیر طبیعیات میں نقائص کا ہونا ایک ضروری امر ہے۔ ارتقا کے درجات میں سے ہر درجے میں ایک نقص اور ایک کمی لازمی چیز ہے، کیونکہ اگر یہ نقص نہ ہوتا تو مادہ جامد اور ساکن ہوتا اور یہاں کوئی سبقت، رونق اور تحرک نہ ہوتا، بلکہ ایک جامد، خاموش اور بے رونق بلکہ بے معنی نظام ہوتا۔

لہٰذا کائنات اور ہماری مثال اس راہرو اور اس عمارت کی سی ہے، جسے منہدم کیا جا رہا ہو اور گزرنے والا دیکھ کر یہ اعتراض کرے کہ اس خوبصورت عمارت کو کیوں گرایا جا رہا ہے، جب کہ وہ اس کے ماضی کے بارے میں علم نہیں رکھتا کہ یہ عمارت بہت بوسیدہ ہو چکی ہے اور ایک دن یہ عمارت خود اس پر بھی گر سکتی ہے اور نہ ہی مستقبل پر اس کی نظر ہے، ممکن ہے اسے ایک علمی مرکز میں تبدیل کرنے کے لیے منہدم کیا جا رہا ہو۔

---

[1] ۱۰ یونس: ۵۶

اہم نکات

۱۔ اللہ کی مشیت اندھی بانٹ نہیں ہوتی۔ وہ کچھ لوگوں کو از روئے احسان اور کچھ کو از روئے انتقام نعمت وحکومت عطا فرماتا ہے۔

۲۔ اللہ ہر شے کا حقیقی مالک ہے اور اس کے فیض کے بغیر کوئی شے ایک آن بھی اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی: مٰلِكَ الۡمُلۡكِ ....

۳۔ شر اور آفت مادی اشیاء کی ناقص ذوات کا لازمہ ہیں۔

تُوۡلِجُ الَّیۡلَ فِی النَّہَارِ وَتُوۡلِجُ النَّہَارَ فِی الَّیۡلِ ۫ وَتُخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ وَتُخۡرِجُ الۡمَیِّتَ مِنَ الۡحَیِّ ۫ وَتَرۡزُقُ مَنۡ تَشَآءُ بِغَیۡرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ تو رات کو دن اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور تو ہی جاندار سے بے جان اور بے جان سے جاندار پیدا کرتا ہے اور تو جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

تشریح کلمات

تُوۡلِجُ: (و ل ج) کسی تنگ جگہ میں داخل ہونا اور بتدریج نفوذ کر جانا۔

تفسیر آیات

۱۔ تُوۡلِجُ الَّیۡلَ: شب و روز کے یکے بعد دیگرے آنے میں اس بات کی ایک بین دلیل موجود ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کے پیچھے ایک ذی شعور ذات ہے۔ جس نے نہ رات کی تاریکی کو برقرار رکھا ہے اور نہ دن کی روشنی کو ہمیشہ جاری رکھا ہے، بلکہ ان دونوں میں سے ہر ایک کو دوسرے میں داخل کیا، جس سے اس زمین پر زندگی ممکن ہوئی۔ اگر رات دن کا تبادلہ نہ ہوتا تو کرۂ زمین پر حیات ممکن نہ تھی:

یُقَلِّبُ اللّٰہُ الَّیۡلَ وَ النَّہَارَ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَعِبۡرَۃً لِّاُولِی الۡاَبۡصَارِ ○ [1]

اللہ شب و روز کو بدلتا رہتا ہے، جس میں صاحبان بصیرت کے لیے یقیناً عبرت ہے۔

وَ اٰیَۃٌ لَّہُمُ الَّیۡلُ ۚۖ نَسۡلَخُ مِنۡہُ النَّہَارَ ... [2]

رات بھی ان کے لیے ایک نشانی ہے جس سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں۔

---

[1] ۲۴ نور: ۴۴ [2] ۳۶ یس: ۳۷

اس آیت کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ رات کو دن اور دن کو رات میں داخل کرنے سے مراد مختلف موسموں میں رات کو گھٹا کر دن میں داخل کیا جاتا ہے اور کبھی دن کو گھٹا کر رات میں داخل کیا جاتا ہے۔ اس طرح دن اور رات میں سے کچھ حصے کا تبادل ہوتا ہے اور مختلف موسم وجود میں آتے ہیں۔

۲۔ وَتُخۡرِجُ الۡحَیَّ: دن اور رات کی آمد و رفت کا حیات کے ساتھ ایک گہرا ربط ہے، چنانچہ اس کے بعد فرمایا کہ وہ بے جان چیزوں سے جاندار پیدا کرتا ہے۔ جب کہ سائنسی نقطہ نظر سے بے جان مادے سے جاندار شے پیدا نہیں ہو سکتی، حیات کا منبع حیات ہی بن سکتی ہے۔ لہٰذا خدا ہی وہ ذات ہے جو بے جان سے جاندار پیدا کرتا ہے۔

اس آیت کی ایک اور تفسیر بیان کی گئی ہے، جس میں حیات سے مراد معنوی زندگی لی گئی ہے، یعنی ایمان و علم نیز موت سے مراد بھی معنوی موت لی گئی ہے، یعنی کفر و جہل۔ بنابریں اس کی تفسیر یوں ہو گی کہ اللہ نے بے جان (یعنی کافر و جاہل) سے جاندار (یعنی مومن و عالم) پیدا کیے، اسی طرح جاندار (یعنی مومن و عالم) سے بے جان (کافر و جاہل) پیدا کیے۔

۳۔ وَتَرۡزُقُ مَنۡ تَشَآءُ: تو جس کو چاہتا ہے رزق دیتا ہے۔ رزق کی تعریف یہ ہے کہ رزق اس عطیہ کو کہتے ہیں جو ضرورت اور احتیاج کو پورا کرے۔ خواہ وہ مال و دولت ہو یا علم و حکمت ہو یا جاہ و سلطنت۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔ رُزِقتُ وُلَداً۔ مجھے بیٹا عنایت ہوا ہے۔

بذات خود رازق صرف اللہ کی ذات ہے۔

هَلۡ مِنۡ خَالِقٍ غَیۡرُ اللّٰهِ یَرۡزُقُكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ ....[1]	کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے جو آسمان اور زمین سے تمہیں رزق دے؟
وَاَنۡفِقُوۡا مِنۡ مَّا رَزَقۡنٰكُمۡ ....[2]	اور جو رزق ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرو...

سورہ نساء آیت ۵ میں فرمایا:

وَلَا تُؤۡتُوا السُّفَهَآءَ اَمۡوَالَكُمُ الَّتِیۡ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمۡ قِیٰمًا وَّارۡزُقُوۡهُمۡ فِیۡهَا وَاكۡسُوۡهُمۡ ....۔	اور اپنے وہ مال جن پر اللہ نے تمہارا نظام زندگی قائم کر رکھا ہے بیوقوفوں کے حوالے نہ کرو (البتہ) ان میں سے انہیں کھلاؤ اور پہناؤ....۔

اس آیت میں لوگوں سے کہا ہے ان کو رزق دے دو۔ روایت میں آیا ہے: وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ یعنی و مما علمناھم یبثون۔ اس حدیث میں رزقنا کے معنی علمنا سے کیا ہے۔

۴۔ بِغَیۡرِ حِسَابٍ: بعض فرماتے ہیں کہ بِغَیۡرِ حِسَابٍ کا مطلب، بغیر عوض، استحقاق رزق دینا ہے.

---

[1] ۳۵ فاطر۔۳ [2] ۶۳ منافقون۔۱۰

کافر، منکر اور مجرم کو بھی رزق دیتا ہے، نہ اس کے عوض میں وہ شکر بجا لاتے ہیں، نہ وہ اس کے مستحق ہوتے ہیں۔

بعض اہل تحقیق کے نزدیک بِغَيْرِ حِسَابٍ سے یہ معنی مراد لینا درست نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں مَنْ تَشَآءُ کی قید ہے، جس کو تو چاہے بغیر حساب رزق دیتا ہے، نہ سب کو۔ جبکہ بغیر عوض و استحقاق جو رزق دیتا ہے وہ سب کو دیتا ہے، بلکہ ان کے نزدیک بغیر حساب کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ بعض کو اس کے عمل اور سعی کے مطابق رزق دیتا ہے، مگر بعض کو اس کے عمل اور سعی کے مطابق محدود نہیں، بلکہ بغیر حساب رزق دیتا ہے۔

احادیث

امام محمد باقر و امام جعفر صادق علیہما السلام سے مروی ہے کہ بے جان سے جاندار اور جاندار سے بے جان پیدا کرنے سے مراد کافر سے مومن اور مومن سے کافر پیدا کرنا ہے۔[1]

اہم نکات

۱۔ انسان کی حقیقی زندگی علم و ایمان سے عبارت ہے۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ مومنوں کو چاہیے کہ وہ اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو سرپرست نہ بنائیں اور جو کوئی ایسا کرے، اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں، ہاں اگر تم ان (کے ظلم) سے بچنے کے لیے کوئی طرز عمل اختیار کرو (تو اس میں مضائقہ نہیں) اور اللہ تمہیں اپنے (غضب) سے ڈراتا ہے اور بازگشت اللہ ہی کی طرف ہے۔

۴۸

تشریح کلمات

تَتَّقُوْا: (و ق ی) تقاۃ۔ تقیۃ اپنے آپ کو گزند سے بچانا۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا يَتَّخِذِ: آیت کا مضمون یہ ہے کہ مؤمنین کو چھوڑ کر کافروں کو اولیاء نہ بناؤ۔ یعنی مؤمنین اور کفار کے درمیان ولایت کا رشتہ نہیں ہے۔ ولایت کی تعریف یہ ہے:

----

[1] المیزان: ۳:۱۶۶

الولایة عقد النصرة للموافقة فی الدیانة۔[1]	ولایت سے مراد باہمی نصرت و حمایت کا معاہدہ ہے جو ایک دین میں ہونے کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔

یعنی ان کی صلح و جنگ ایک ہو۔ ولایت لغت میں ایسی قربت کو کہتے ہیں جس میں کوئی اور شئے حائل نہ ہو۔

۱۔ یہ قربت اگر باہمی حمایت و نصرت کی خاطر ہے تو یہ ''ولایت نصرت'' ہے۔

۲۔ اگر یہ قربت باہمی کشش کی وجہ سے ہے تو اسے ''ولایت محبت'' کہتے ہیں۔

۳۔ اور اگر اس قربت کا سبب رشتہ داری ہے تو یہ ''ولایت وراثت'' ہے۔

۴۔ اور اگر یہ قربت کسی کا حکم کسی پر نافذ ہونے کے بارے میں ہے تو یہ ''ولایت طاعت'' ہے۔

اس آیت میں مطلق ولایت قائم کرنے سے منع کیا گیا ہے، لہٰذا مؤمن کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کافر سے نصرت و حمایت کا معاہدہ کرے۔ نہ کافر اور مؤمن میں وراثت قائم ہو سکتی ہے، نہ کافر کی اطاعت اور نہ کافر کی حاکمیت ہو سکتی ہے۔ البتہ اگر خطرے کے باعث ان باتوں میں سے کسی ایک بات کا مظاہرہ کرنا پڑے، مثلاً محبت و دوستی کا مظاہرہ کرنا پڑے تو یہ بات از باب تقیہ و تحفظ (مال و جان کا تحفظ) جائز ہے، ورنہ ولایت کی تمام قسمیں صرف مؤمنین کے درمیان آپس میں قائم ہیں۔ حتیٰ کہ عصر رسالت (ص) میں یہ ولایت مؤمنین کے درمیان بھی اس وقت تک قائم نہ ہوتی تھی، جب تک وہ ہجرت نہ کریں۔ چنانچہ درج ذیل آیت میں اس بات کی صراحت موجود ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ هَاجَرُوۡا وَ جٰهَدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَ اَنۡفُسِهِمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَالَّذِیۡنَ اٰوَوۡا وَّ نَصَرُوۡۤا اُولٰٓئِكَ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ ؕ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَمۡ یُهَاجِرُوۡا مَا لَكُمۡ مِّنۡ وَّلَایَتِهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ حَتّٰی یُهَاجِرُوۡا ...۔[2]	بے شک جو لوگ ایمان لائے اور وطن سے ہجرت کر گئے اور انہوں نے اپنے اموال سے اور اپنی جانوں سے راہ خدا میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے پناہ دی اور مدد کی وہ آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں اور جو لوگ ایمان تو لائے مگر انہوں نے ہجرت نہیں کی تو ان کی ولایت سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک وہ ہجرت نہ کریں....

۲۔ وَمَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ: اس قسم کی ولایت اور باہمی حمایت کہ جس سے جنگ و صلح ایک ہو جائے، کا عہد مؤمنین اور کفار کے درمیان قائم کرنا منع ہے۔

عموماً اَوۡلِیَآءَ کا ترجمہ دوستی کیا جاتا ہے، جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ قرآن کفار کے ساتھ ہر قسم کے انسانی تعلقات کو ممنوع قرار دیتا ہے اور انسانوں میں نفرت کا درس دیتا ہے، حالانکہ اسلام ان کافروں کے

---

[1] مجمع البیان [2] ۸انفال: ۷۲

ساتھ اچھے تعلقات رکھنے کا حکم دیتا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ حالت جنگ میں نہیں ہیں:

لَا يَنۡهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيۡنَ لَمۡ يُقَاتِلُوۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ وَ لَمۡ يُخۡرِجُوۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡهُمۡ وَ تُقۡسِطُوۡۤا اِلَيۡهِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ ۞[1]	جن لوگوں نے دین کے بارے میں تم سے جنگ نہیں کی اور نہ ہی تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے، اللہ تمہیں ان کے ساتھ احسان کرنے اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا، اللہ یقیناً انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

قرآن مجید نے متعدد مقامات پر امت قرآن کو خود اعتمادی اور استقلال کی تاکید فرمائی ہے کہ وہ دشمنوں کو اپنی صفوں میں گھسنے نہ دیں اور ان کی سازشوں سے آگاہ رہیں۔ امت قرآن کا جب یہ ایمان ہے کہ پوری کائنات کا حقیقی مالک خدا ہے اور ہر چیز اس کے ہاتھ میں ہے تو اس خدا کی اطاعت گزار امت سے ہٹ کر کسی اور امت کو اپنا حامی بنانا، ایمان کے منافی ہے۔ جو ایسا عمل انجام دے، یعنی ایسا معاہدہ کرے جس کے تحت وہ کفار کی نصرت کے لیے ایک قوت بن جائے تو اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ نہ دین کا تعلق اور نہ عقیدے کا۔ نہ اللہ کی حاکمیت کا تعلق اور نہ اس کی ربوبیت کا اور نہ ہی اس کی معبودیت کا۔ غرض ایسی صورت میں اللہ سے تمام رشتے منقطع ہو جائیں گے۔ یہ حکم عام حالات کے لیے ہے۔

۳۔ اِلَّاۤ اَنۡ تَتَّقُوۡا: اس آیت کے دوسرے فقرے میں فرمایا: ہاں کفار کے ظلم سے بچنے کے لیے اگر ایسے طرز عمل کا اظہار کرو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس آیت سے تقیے کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

آیت کی قرائت میں صدر اسلام کے علماء کا اختلاف ہے۔ درج ذیل علماء نے اِلَّا اَنۡ تَتَّقُوۡا تَقِيَّةً کی قرائت اختیار کی ہے:

۱۔ جابر بن زید	۲۔ مجاہد	۳۔ ضحاک[2]
۴۔ یعقوب[3]	۵۔ ابو الرجاء قتادہ[4]	۶۔ ابن عباس
۷۔ حمید بن قیس	۸۔ سہل	۹۔ ابو حیوۃ
۱۰۔ قتادہ[5]		

استثناء: اِلَّاۤ اَنۡ تَتَّقُوۡا مِنۡهُمۡ تُقٰىةً کو بعض مفسرین نے اس لحاظ سے مستثنائے منقطع کہا ہے کہ دشمن سے بطور تقیہ دوستی کا اظہار حقیقتاً دوستی نہ ہوگی، لہٰذا یہ استثنائے منقطع ہے، جب کہ حقیقتاً یہ استثنائے متصل ہے، کیونکہ لَا يَتَّخِذِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الۡكٰفِرِيۡنَ اَوۡلِيَآءَ مطلق ہے۔ یعنی مومنین کو چاہیے کہ وہ اہل ایمان کو چھوڑ کر کفار

---

[1] ۶۰ ممتحنہ: ۸ [2] تفسیر قرطبی: ۴: ۵۸ [3] بیضاوی ۱: ۲۰۰۔ المنار ۳: ۲۸۰
[4] روح المعانی ۳: ۱۲۱۔ طبری ۶: ۳۱۴ [5] البحر المحیط ۳: ۹۴

کو کسی حال میں بھی اپنا دوست نہ بنائیں۔ نہ ظاہراً اور نہ ہی حقیقتاً۔ اِلَّآ اَنۡ تَتَّقُوۡا مِنۡهُمۡ تُقٰىةً مگر یہ کہ ان سے سے بچنے کے لیے ظاہری دوستی کریں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

تقیہ کی عمومیت: ۱۔ تقیہ دشمن سے مصنوعی دوستی کے اظہار کے ذریعے انجام پاتا ہے اور گاہے مذہب کو چھپا کر تقیہ انجام دیا جاتا ہے۔ فخر الدین رازی فرماتے ہیں:

و قد تجوز ایضا یتعلق باظهار الدین۔ — کبھی اظہار دین کے سلسلے میں بھی تقیہ جائز ہو جاتا ہے۔

۲۔ آیت کے ظاہری الفاظ کے مطابق کفار کے ساتھ تقیہ کرنا جائز ہے، لیکن اگر خود مسلمانوں کے درمیان بھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو تقیہ کر کے اپنا تحفظ ضروری ہے۔ جیسا کہ امام شافعی کا مؤقف بھی یہی ہے کہ اپنے تحفظ کے لیے مسلمانوں کے درمیان بھی تقیہ کرنا جائز ہے۔[1]

۳۔ فخر الدین رازی فرماتے ہیں کہ جہاں حفظ جان کے لیے تقیہ کرنا جائز ہے، وہاں حفظ مال کے لیے بھی تقیہ جائز ہے۔ جیسا کہ حضور (ص) سے مروی ہے: حُرۡمَةُ مَالِ الۡمُسۡلِمِ كَحُرۡمَةِ دَمِهٖ۔[2] مال مسلم کی حرمت بھی خون مسلم کی حرمت کی طرح ہے۔

و قال اصحاب ابی حنیفة التقیة رخصة من اللّٰه تعالیٰ و ترکها افضل۔[3] — علمائے احناف نے کہا ہے: تقیہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اجازت ہے لیکن اس کا ترک کرنا بہتر ہے۔

۴۔ حسن بصری کہتے ہیں: التقیة جائزة للانسان الی یوم القیامة۔[4] قیامت تک انسان کے لیے تقیہ جائز ہے۔

۵۔ امام محمد عبدہ تفسیر المنار میں فرماتے ہیں:

اذا جازت موالاتهم لاتقاء الضرر فجوازها لاجل منفعة المؤمنین یکون اولی۔[5] — جب دفع ضرر کی خاطر کفار سے دوستی جائز ہے تو مومنین کے مفاد کے لیے ایسا کرنا بطریق اولی جائز ہے۔

۶۔ حدیث میں آیا ہے:

مَا وَقَا بِهِ الۡمُؤۡمِنُ مِنۡ عِرۡضِهٖ صَدَقَةٌ۔[6] — جس چیز سے مومن اپنی آبرو بچاتا ہے، وہ صدقہ ہے۔

رَاۡسُ الۡعَقۡلِ بَعۡدَ الۡاِيۡمَانِ بِاللّٰهِ مُدَارَاةُ — اللہ پر ایمان کے بعد عقل کا سرمایہ لوگوں کے ساتھ

---

[1] تفسیر کبیر ۸: ۱۴ [2] بحار الانوار ۲۹: ۴۰۷ [3] البحر المحیط۔۳: ۹۵
[4] تفسیر قرطبی ۴: ۵۷۔ تفسیر کثیر ۱: ۵۰۷ [5] المنار ۳: ۲۸۰ [6] تفسیر روح المعانی ۳: ۱۲۴۔ تفسیر مراغی ۳: ۱۳۸

النَّاسِ۔[1] رواداری ہے۔

مُدَارَاۃُ النَّاسِ صَدَقَۃٌ۔[2] لوگوں کے ساتھ رواداری صدقہ ہے۔

مذکورہ بیان سے ان حضرات کی تشفی ہونی چاہیے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ شیعہ امامیہ نے تقیہ کی حدود بہت وسیع کر دی ہیں۔ جیسا کہ آلوسی اور دریا آبادی کا یہی خیال ہے۔

تدبر قرآن کے مؤلف نے تو یہ کہکر: اِلَّآ اَنۡ تَتَّقُوۡا مِنۡهُمۡ کا جملہ فَلَيۡسَ مِنَ اللّٰهِ فِىۡ شَىۡءٍ سے مستثنیٰ ہے، لغت، نظائر قرآن اور سباق و سیاق کی دھجیاں اڑا دی ہیں نیز تفسیر بالرائے اور تحریف معنوی میں ہمارے معاصرین میں ایک نامناسب مثال قائم کی ہے۔ کیونکہ تقیہ کی حدود و قیود میں مفسرین اور فقہاء میں اختلاف ہے، لیکن اس آیت سے تقیہ کے ثابت ہونے میں تو اصحاب، تابعین، تبع تابعین، فقہاء اور مفسرین میں سے کسی کو بھی اختلاف نہیں۔[3]

مولانا مودودی نے دیگر بہت سے مفسرین کی طرح لکھا ہے:

حتیٰ کہ شدید خوف کی حالت میں جو شخص برداشت کی طاقت نہ رکھتا ہو، اس کو کلمہ کفر تک کہ جانے کی رخصت ہے۔[4]

چنانچہ حضرت عمار بن یاسر نے اپنے آپ کو ہلاکت سے بچانے کے لیے کلمہ کفر کہدیا تو یہ آیت نازل ہوئی:

مَنۡ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اِيۡمَانِهٖۤ اِلَّا مَنۡ اُكۡرِهَ وَقَلۡبُهٗ مُطۡمَئِنٌّۢ بِالۡاِيۡمَانِ ....[5]

جو شخص اپنے ایمان کے بعد اللہ کا انکار کرے (اس کے لیے سخت عذاب ہے) بجز اس شخص کے جسے مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو (تو کوئی حرج نہیں)....

کیا تقیہ مناسب عمل ہے؟: حالت خوف میں اپنی جان اور عزت و ناموس کے تحفظ کے لیے تنگ نظر دشمن سے بچنے کا نام تقیہ ہے۔ تقیہ نہ صرف یہ کہ مناسب اور معقول روش ہے، بلکہ ایک انسانی حق بھی ہے، البتہ عار و ننگ ہے اس معاشرے کے لیے، جس میں دہشت گردوں کے ہاتھوں ایک شخص کو فکر و نظر کی

---

[1] تحف العقول ص ۴۲ [2] روضۃ الواعظین ۲: ۳۸۰

[3] ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر، تفسیر کبیر فخر الدین رازی، تفسیر بیضاوی، تفسیر قرطبی، تفسیر روح المعانی، تفسیر المنار، تفسیر فی ظلال القرآن، بیان القرآن، تفسیر مراغی وغیرہ۔

[4] تفہیم القرآن ۱: ۲۴۴ [5] نحل ۱۶: ۱۰۶

آزادی حاصل نہ ہو اور وہ تقیہ کرنے پر مجبور ہوجائے۔ ایسے تنگ نظر معاشروں کی تشکیل کے ذمہ داروں کے بارے میں حضور (ص) سے مروی ہے:

اِنَّ مِنْ شَرَارِ النَّاسِ مَنْ تَرَکَهُ النَّاسُ اتِّقَاءَ فُحْشِهِ۔[1] لوگوں میں بدترین شخص وہ ہے جس کی بے حیائی سے بچنے کے لیے لوگ اسے ڈھیل دیے رکھیں۔

علماء اور تقیہ: قرآن وسنت کی تعلیمات سے نابلد بہت سے غیر امامی متعصب علماء نے تقیہ پر طعن و تشنیع کرتے ہوئے مذہب امامیہ پر حملے کیے ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں دیکھا جائے تو وہ خود بھی ہر زمانے میں تقیہ کرتے چلے آئے ہیں۔

عباسی خلیفہ معتصم سے پہلے کے علماء تقیہ کی مخالفت میں شاید کسی حد تک معذور ہوں اور تقیہ کے عمل سے دوچار نہ ہوئے ہوں، لیکن معتصم کے بعد کے علماء کو تو کسی صورت بھی تقیہ کے خلاف بات کرنے کا حق نہیں پہنچتا، کیونکہ معتصم نے جب خلق قرآن کے مسئلے میں جبر و تشدد سے کام لیا تو قرآن کو غیر مخلوق سمجھنے والے علماء کے پاس تقیہ کے ذریعے جان بچانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ ان میں سب سے زیادہ ثابت قدم امام احمد بن حنبل تھے، جنہوں نے بطور تقیہ یہ مؤقف اختیار کیا تھا:

القرآن کلام اللّٰہ لا ازید و لا انقص۔ قرآن بس کلام اللہ ہے، نہ اس سے زیادہ نہ کم۔

احادیث

کافی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے

التَّقِيَّةُ فِي كُلِّ شَيْءٍ يُضْطَرُّ اِلَيْهِ ابْنُ آدَمَ فَقَدْ اَحَلَّهُ اللّٰهُ لَهُ۔[2] تقیہ ہر اس عمل کے لیے جس پر انسان مجبور ہوتا ہے اللہ نے جائز قرار دیا ہے۔

اصحاب رسول (ص) میں سے دو افراد مسیلمہ کذاب کے ہاتھوں اسیر ہو گئے۔ مسیلمہ نے ایک صحابی سے پوچھا: کیا تو مجھے رسول اللہ تسلیم کرتا ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ مسیلمہ نے اسے چھوڑ دیا۔ دوسرے صحابی سے یہی سوال کیا تو صحابی نے تین بار کہا: میں گونگا ہوں۔ مسیلمہ نے اس صحابی کو قتل کر دیا۔ یہ خبر رسول (ص) کو ملی تو آپ (ص) نے فرمایا:

اَمَّا هَذَا الْمَقْتُوْلُ فَمَضٰى عَلَى صِدْقِهِ وَ يَقِيْنِهِ فَهَنِيْئاً لَهُ وَ اَمَّا الْآخَرُ فَقَبِلَ مقتول تو اپنے یقین اور صداقت کے ساتھ (اس دنیا سے) چلا گیا، لیکن دوسرے نے اللہ کی طرف سے حاصل شدہ اجازت سے فائدہ اٹھایا، پس اس پر کوئی

---

[1] مستدرک الوسائل ۱۲: ۷۸۔ صحیح البخاری باب ما یجوز اغتیاب اھل الفساد۔
[2] اصول الکافی ۲: ۲۲۰۔ المیزان ۳: ۱۸۸

رُخْصَۃَ اللّٰہِ فَلاَ تَبِعَۃَ عَلَیْہِ۔[1] سرزنش نہیں ہے۔

حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں:

ایک شخص نے رسول اللہ (ص) سے حاضر ہونے کی اجازت طلب کی جب کہ میں ان کی خدمت میں تھی۔ رسول اللہ (ص) نے فرمایا: بِئْسَ اِبْنُ الْعَشِیْرَۃِ اَوْ اَخُوْ الْعَشِیْرَۃِ۔ یہ قبیلے کا بدترین فرزند ہے یا بدترین فرد ہے۔

پھر اسے اجازت مل گئی اور اس کے ساتھ حضور (ص) نے نرم گفتاری فرمائی۔

جب وہ چلا گیا تو میں نے عرض کیا: اس کے بارے میں آپ (ص) نے فرمایا تھا، پھر نرم کلامی بھی کی؟ آپ (ص) نے فرمایا:

یَا عَائِشَۃَ اِنَّ مِنْ شَرِّ النَّاسِ مَنْ یَتْرُکُہُ النَّاسُ اتِّقَاءَ فُحْشِہِ۔[2] لوگوں میں بدترین شخص وہ ہے جس کی بے حیائی سے بچنے کے لیے لوگ اسے ڈھیل دیے رکھیں۔

نیز حضور (ص) سے مروی ہے:

اِنَّا لَنَکْشُرُ فِیْ وُجُوْہِ اَقْوَامٍ اِنَّ قُلُوْبَنَا لَتَلْعَنُھُمْ۔[3] ہم ایسے لوگوں کے منہ پر تبسم اختیار کرتے ہیں جن پر ہمارے دل لعنت بھیجتے ہیں۔

۴۔ وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفۡسَہٗ: اللہ تم کو اپنے سے، یعنی اپنے غضب سے خوف دلاتا ہے۔ معصیت کاروں کے لیے کسی اور چیز سے خوف لاحق نہیں ہے تاکہ وہ اس سے بچ سکیں۔ ان کو خوف ہو گا تو صرف اللہ کے غضب کا خوف ہو گا، جس سے بچانے والا خود اللہ کے علاوہ کوئی نہ ہو گا۔

۵۔ وَاِلَی اللّٰہِ الۡمَصِیۡرُ: جانا اللہ ہی کی بارگاہ میں ہے تو کوئی اور کیا بچا سکتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ طاقت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہے، لہٰذا مسلمانوں کو خود اعتمادی اور استقلال کے ساتھ صرف اسی پر بھروسا کرنا چاہیے۔

۲۔ تقیہ ایک قرآنی حقیقت ہے، جس پر تمام مفسرین وفقہاء کا اتفاق ہے: تَتَّقُوۡا مِنۡہُمۡ تُقٰىۃً ....

۳۔ تنگ نظر دشمن سے تحفظ کی خاطر تقیہ کرنا، ایک قرآنی، اسلامی، عقلائی اور انسانی حق ہے۔

قُلۡ اِنۡ تُخۡفُوۡا مَا فِیۡ صُدُوۡرِکُمۡ اَوۡ ۲۹۔ کہہ دیجیے: جو بات تمہارے سینوں میں ہے

---

[1] بحار الانوار ۲۹: ۴۰۴۔ تفسیر مراغی ۳: ۱۳۷

[2] صحیح البخاری باب المداراۃ مع الناس [3] روح المعانی ۱۳: ۱۲۴۔ تفسیر المراغی ۳: ۱۳۸

تُبۡدُوۡہُ یَعۡلَمۡہُ اللّٰہُ ؕ وَ یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲۹﴾

اسے خواہ تم پوشیدہ رکھو یا ظاہر کرو اللہ بہرحال اسے جانتا ہے، نیز آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اِنۡ تُخۡفُوۡا: یعنی اگر تم دل میں کفار سے محبت نہیں رکھتے اور بطور تقیہ دوستی کرتے ہو یا اس کے برعکس ان سے دوستی رکھتے ہوئے ان سے بیزاری کا اظہار کرتے ہو تو دونوں صورتوں میں اللہ تمہارے دل کی حالت سے آگاہ ہے۔ وہ اپنے اس علم کے مطابق جو آسمانوں اور زمین پر محیط ہے، اپنی مخلوق کے ساتھ عمل کرے گا۔

یعنی اللہ کے نزدیک معیار ما فی الصدور ہے۔ اگر دل میں ایمان ہے تو عمل اس ایمان کے مطابق ہی ہوگا۔ لیکن اگر کبھی خطرے کی وجہ سے ایمان کے مطابق عمل نہیں ہوسکتا تو اس صورت میں معیار وہ ایمان ہے جو دل میں ہے۔

۲۔ وَ یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ: اس کائنات میں کوئی ذرہ علم الٰہی سے پوشیدہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اللہ اور اللہ کی مخلوقات کے درمیان کسی قسم کا حجاب ممکن نہیں ہے کہ اللہ سے پوشیدہ رہے۔

اہم نکات

۱۔ خوف کی وجہ سے تقیہ کرنے والے کو قلبی حالت کے مطابق سزا و جزا ملے گی۔

یَوۡمَ تَجِدُ کُلُّ نَفۡسٍ مَّا عَمِلَتۡ مِنۡ خَیۡرٍ مُّحۡضَرًا ۚۖ وَّ مَا عَمِلَتۡ مِنۡ سُوۡٓءٍ ۚۛ تَوَدُّ لَوۡ اَنَّ بَیۡنَہَا وَ بَیۡنَہٗۤ اَمَدًۢا بَعِیۡدًا ؕ وَ یُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفۡسَہٗ ؕ وَ اللّٰہُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ اس دن ہر شخص اپنا نیک عمل حاضر پائے گا، اسی طرح ہر برا عمل بھی، (اس روز) انسان یہ تمنا کرے گا کہ کاش یہ دن اس سے بہت دور ہوتا اور اللہ تمہیں اپنے (غضب) سے ڈراتا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔

تشریح کلمات

اَمَدًا: غیر معلوم مدت کو اَمَد اور غیر محدود مدت کو اَبَد کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

متعدد قرآنی آیات میں صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ روز آخرت ہر شخص اپنے اعمال کو حاضر پائے گا۔ قدیم مفسرین یہ تاویل کرتے تھے کہ عمل تو دنیا میں ہو چکا، انہیں حاضر پانا ممکن نہیں۔ لہٰذا مراد جزا و سزائے عمل ہے۔

اولاً: موجودہ دور کے انسان کے علم میں یہ بات آ چکی ہے کہ انسانی اعمال بذات خود قابل دید ہیں اور نابود نہیں ہوتے۔ اس طرح قرآن کی یہ تصریح بھی سمجھ میں آتی ہے:

وَعِنۡدَنَا كِتٰبٌ حَفِيۡظٌ ۔[1]		ہمارے پاس محفوظ رکھنے والی کتاب ہے۔

ثانیاً: اس آیت میں حاضراً نہیں محضراً (اسم مفعول کا صیغہ) ذکر فرمایا، جس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ عمل کو حاضر کیا جائے گا، یعنی اعمال مٹ نہیں جاتے بلکہ موجود ہوتے ہیں اور قیامت کے دن حاضر کیے جائیں گے۔

ثالثاً: ممکن ہے کہ جزائے اعمال قرار دادی اور قانونی ہو۔ یعنی ہر عمل کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص جزا یا سزا مقرر کر رکھی ہے نیز یہ بھی ممکن ہے کہ جزائے اعمال وضعی و طبیعی ہو، یعنی ہر عمل کے اپنے طبیعی و تکوینی مزاج کے مطابق قدرتی طور پر خود سزا و جزا مرتب ہوتی ہے۔ چنانچہ اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ توانائی ختم نہیں ہوتی بلکہ شکل بدلتی رہتی ہے۔ لہٰذا نیکی پر صرف ہونے والی توانائی روز قیامت مادے کی شکل میں جزا بن کر سامنے آئے گی اور برائی پر صرف ہونے والی توانائی مادے کی شکل میں سزا بن کر سامنے آئے گی۔

چنانچہ بعض احادیث سے بھی یہ عندیہ ملتا ہے کہ ہر تسبیح جنت کے محلات کی تعمیر کے لیے اینٹیں بن جاتی ہیں۔

اہم نکات

۱۔	انسان کا ہر نیک اور برا عمل محفوظ رہتا ہے۔

قُلۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ		۳۱۔ کہد یجیے: اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری
فَاتَّبِعُوۡنِيۡ يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ		اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری

----

[1] ق ۵۰:۴

وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ	خطاؤں سے درگزر فرمائے گا اور اللہ نہایت
غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۳۱﴾	بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔
قُلۡ اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ ۚ	۳۲۔ کہد یجیے: اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، پس
فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ	اگر وہ لوگ روگردانی کریں تو اللہ کافروں سے
الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۳۲﴾	محبت نہیں کرتا۔

شان نزول: کچھ ایسے افراد نے رسول اللہ(ص) کے سامنے اللہ سے محبت کا دعویٰ کیا جو اللہ کے احکام کی تعمیل میں کوتاہی کرتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔[1]

تفسیر آیات

محبت امر قلبی ہے اور قلب حقیقت پرست ہوتا ہے، جس پر حقیقت کے سوا کوئی اور چیز کارگر نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ دین بھی عقیدے سے عبارت ہے اور عقیدہ امر قلبی ہے، جس پر جبر و اکراہ کارگر نہیں ہو سکتا: لَاۤ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ[2] کی طرح کہا جا سکتا ہے کہ لَا اِکْرَاهَ فِی الْحُبِ۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

هَلِ الدِّيْنُ اِلَّا الْحُبُّ۔[3]	کیا دین محبت کے علاوہ بھی کچھ ہے؟

سچی محبت وہ ہے جو محبوب کی ذات کے ساتھ ہو۔ کسی مفاد کے لالچ اور کسی سزا کے خوف سے محبت نہیں ہوتی۔ طمع اور خوف سے گردن تو جھکتی ہے، لیکن دل نہیں جھکتا۔ اللہ کے سچے عاشق حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے مروی ہے:

مَا عَبَدْتُكَ طَمَعاً فِيْ جَنَّتِكَ وَ لَا خَوْفاً مِنْ نارِكَ وَلٰكِنْ وَجَدْتُكَ اَهْلاً لِلْعِبَادَة فَعَبَدْتُكَ۔[4]	اے میرے معبود! میں نے تیری جنت کے لالچ میں یا تیری جہنم کے خوف سے تیری عبادت نہیں کی بلکہ میں نے تجھے عبادت کا اہل پایا تو تیری عبادت کی۔

دیگر تمام عوامل سے قطع نظر صرف ذات سے محبت کا یہی انداز ہوتا ہے۔

عوامل: اللہ سے محبت کا اصل محرک، اللہ کی ذات ہے۔ یعنی اس ذات کا کمال اور کمال سے محبت ایک قدرتی امر ہوتا ہے اور اس کے لیے شرط یہ ہے کہ کمال کا ادراک ہو۔ اگر کسی کے کمال کی معرفت نہ ہو تو

---

[1] التبیان جلد اول ذیل آیۃ　[2] ۲ بقرۃ: ۲۵۶　[3] اصول الکافی ۸: ۷۹　[4] عوالی اللآلی ۱: ۴۰۴

اس کے ساتھ محبت نہیں ہوسکتی۔

آ ثار: محبت اور عشق الٰہی کے آثار:

i۔ اتباع رسول (ص): اگر محبت سچی ہو تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ محبّ اپنے محبوب کا مطیع و فرمانبردار ہو بلکہ محبّ تو محبوب کے حکم اور اشارے کا بے تابی سے منتظر رہتا ہے۔ جب وہ محبوب کا حکم سنتا ہے تو وجد اور کیف و سرور کی حالت میں آ جاتا ہے۔

یہاں محبوب حقیقی (اللہ) کی محبت تب ہی میسر آتی ہے، جب اس کی اور اس کے رسول (ص) کی اطاعت کی جائے۔ اس نے اپنے رسول (ص) کے ذریعے جو دستور حیات عطا کیا ہے، اس پر عمل کر کے محبت کا ثبوت فراہم کیا جا سکتا ہے۔ امام جعفر صادق (ع) سے روایت ہے: مَا اَحَبَّ اللّٰہَ مَنْ عَصَاہُ۔[1] جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے وہ اللہ کا محبّ نہیں ہوسکتا۔

جملہ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ مقام مصطفیٰ (ص) کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ ذات محمدی (ص) جہاں رشد و ہدایت کا ذریعہ ہے، وہاں محبت و عشق الٰہی سے فیضیاب ہونے کا وسیلہ بھی ہے۔ آپ (ص) کی پیروی سے ہی محبوب خدا ہونے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔

ii۔ محبّ کے لیے محبوب کی طرف سے محبت کا جواب نہایت اہم ہوتا ہے۔ محبّ کے لیے اس سے زیادہ خوش کن خبر اور کیا ہوسکتی ہے کہ محبوب بھی اس کے ساتھ محبت کرتا ہے۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ اپنی محبت کے دعویداروں کو یہ نوید سنا رہا ہے کہ میرے رسول (ص) کی پیروی کرو گے تو میں بھی تم سے محبت کروں گا۔ ورنہ اس جملے کا لہجہ یوں بھی ہوسکتا تھا: ''اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو اس کی اطاعت کرو۔'' لیکن یہاں دو باتوں کی طرف اشارہ فرمایا: اول یہ کہ رسول (ص) کی پیروی کرو۔ دوم یہ کہ اللہ بھی تم سے محبت کرے۔

iii۔ وَ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ: اللہ کی طرف سے محبت کا نتیجہ اور لازمہ یہ ہو گا کہ وہ تمہاری خطاؤں سے بھی درگزر فرمائے گا۔

خلاصہ یہ کہ اللہ سے محبت کا لازمہ اتباع رسول (ص) ہے اور رسول (ص) کی اتباع کا لازمہ اللہ کی طرف سے محبت اور اللہ کی محبت کا لازمہ اس کی طرف سے مغفرت اور درگزر ہے۔

قُلۡ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوۡلَ: دوبارہ صراحت کے ساتھ بیان فرمایا: اتباع کا مطلب اطاعت ہے اور اطاعت کراہت کے مقابلے میں ہے۔ اطاعت قلبی لگاؤ کے ساتھ مطلوبہ کام کو انجام دینے کے معنوں میں ہے، جب کہ اتباع پیچھے چلنے کو کہتے ہیں۔ یعنی اللہ نے جو احکام صادر فرمائے ہیں، ان کو قلبی لگاؤ کے ساتھ انجام دے دو تو یہ اطاعت خدا و رسولؐ ہے اور اتباع رسولؐ، احکام کی تعمیل کی صورت میں وجود میں آتی ہے۔

---

[1] وسائل الشیعة ۱۵: ۳۰۸

احادیث

کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

وَ مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یَعْلَمَ اَنَّ اللّٰہَ یُحِبُّہٗ فَلْیَعْمَلْ بِطَاعَۃِ اللّٰہِ وَ لْیَتَّبِعْنَا۔[1]

جو یہ جاننا چاہتا ہے کہ اللہ اس سے محبت کرتا ہے تو اسے چاہیے کہ اللہ کی اطاعت اور ہماری اتباع کرے۔

اہم نکات

۱۔ اطاعت کے بغیر محبت کا دعویٰ محض دھوکہ ہے۔

۲۔ ذات محمدی سے عشق، مغفرت خداوندی سے فیضیابی کا ذریعہ ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوۡحًا وَّ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿ۙ۳۳﴾

۳۳۔ بیشک اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام عالمین پر برگزیدہ فرمایا ہے۔

ذُرِّیَّۃًۢ بَعۡضُہَا مِنۡۢ بَعۡضٍ ؕ وَ اللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿ۚ۳۴﴾

۳۴۔ وہ اولاد جو ایک دوسرے کی نسل سے ہیں اور اللہ خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔

تشریح کلمات

نوح: حضرت نوح (ع) بن لامخ پہلے صاحب شریعت، صاحب کتاب اور اولوالعزم رسول ہیں۔ آپؑ حضرت آدم (ع) کے بعد دوسرے ابو البشر ہیں۔ یعنی طوفان کے بعد موجودہ انسانی نسل کے ابوالبشر آپ (ع) ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کی دسویں پشت میں سے تھے۔ آپ (ع) موجودہ عراق کے بالائی علاقے کے رہنے والے تھے۔ ۹۵۰ سال زندگی گزاری۔

آل: اس لفظ کی تشریح سورۂ بقرہ آیت ۴۹ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

عمران: اس نام کی دو شخصیات گزری ہیں۔ ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد۔ بائبل میں ان کا نام عمرام آیا ہے اور دوسرے حضرت مریم (س) کے والد ماجد۔ اس آیہ شریفہ میں دونوں عمران مراد لیے جا سکتے ہیں۔ تاہم قرین قیاس یہ ہے کہ مراد حضرت مریم (س) کے والد ماجد ہوں، کیونکہ سلسلہ کلام حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے بارے میں ہے۔ اناجیل میں حضرت

---

[1] اصول الکافی ۸: ۱۳۔ المیزان: ۳: ۱۸۹

مریم (س) کے والدین کا نام مذکور نہیں ہے۔ تاہم مسیحی روایت میں حضرت مریم (س) کے والد کا نام یوآخیم آیا ہے۔

ذُرِّيَّةً: (ذ ر ء) خلقت۔ اصل میں اس سے خرد سال اولاد مراد ہے، لیکن چھوٹی بڑی سب اولاد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

خداوند عالم کسی ہستی کو انسانیت کی رہبری اور ہدایت کے لیے برگزیدہ فرماتا ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ اسے اتفاقیہ طور پر بلا وجہ اور بلا حکمت وسبب انتخاب کرتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے غیبی علم کے ذریعے جانتا ہے کہ کون سی ہستی کس اہلیت کی مالک ہے۔ صرف علم خدا سے بھی برگزیدہ ہونے کا استحقاق پیدا نہیں ہوتا بلکہ اسے امتحانی مراحل سے گزارا جاتا ہے، پھر مقام اصطفیٰ پر فائز کیا جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے:

اِذَا اَحَبَّ اللّٰهُ عَبْداً ابْتَلَاهُ فَاِنْ صَبَرَاجْتبَاهُ وَ اِنْ رَضِیَ اصْطَفَاهُ۔[1]

جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے آزمائش میں ڈالتا ہے۔ پس اگر اس نے صبر کیا تو اسے پسندیدہ قرار دیتا ہے، پھر جب اس امتحان پر راضی ہوتا ہے تو خصوصی طور پر برگزیدہ فرماتا ہے۔

اس مختصر سی آیت میں انبیاء اور ہادیان برحق کا پورا سلسلہ بیان فرمایا:

۱۔ یہ سلسلۂ ہدایت حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور حضرت نوح علیہ السلام تک اولاد آدم میں جاری رہا۔

۲۔ دوسرا مرحلہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے شروع ہوا۔ عہد نوح علیہ السلام میں انسان کو شریعت اور دستور حیات عطا کیا گیا:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا ....[2]

اس نے تمہارے لیے دین کا وہی دستور معین کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا۔

یہ سلسلہ اولاد نوح میں جاری رہا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ۝[3]

اور ان کی نسل کو ہم نے باقی رہنے والوں میں رکھا اور ہم نے آنے والوں میں ان کے لیے (ذکر جمیل) باقی رکھا۔ تمام عالمین میں نوح پر سلام ہو۔

---

[1] مستدرک الوسائل ۲: ۴۲۷ [2] ۴۲ شوریٰ: ۱۳ [3] ۳۷ صافات: ۷۷ تا ۷۹

۳۔ تیسرا مرحلہ ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوا اور اولاد اسحاق علیہ السلام میں یہ سلسلہ جاری رہا۔

۴۔ چوتھا مرحلہ آل عمران سے شروع ہوا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور شریعت دی گئی۔

۵۔ پانچواں مرحلہ حضرت خاتم الانبیاء (ص) سے شروع ہوا۔ یہاں سلسلۂ نبوت ختم ہوا۔ البتہ سلسلہ ہدایت ہنوز جاری ہے اور تا قیامت یہ سلسلہ آل محمد (ص) میں جاری رہے گا۔

ذُرِّيَّةً بَعۡضُهَا مِنۡۢ بَعۡضٍ: انبیاء کا سلسلہ نسل در نسل جاری رہا۔ چنانچہ نوح، آدم علیہما السلام کی ذریت ہے اور آل ابراہیم، نوح علیہا السلام کی ذریت ہے اور آل عمران، ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ محمد و آل محمد آل علیہم السلام ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔

یہ بات اب روز روشن کی طرح واضح ہوگئی ہے کہ اولاد اپنے آباء و اجداد سے اوصاف حمیدہ اور نیک خصلتیں وراثت میں لیتی ہے اور وراثت ہی واحد ذریعہ ہے، جس کے ذریعے پے در پے آنے والی نسلوں میں امامت و رہبری کے لیے لازم خصلتوں کو منتقل اور محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بار امانت کو ایک خاص نسلی تسلسل میں ودیعت فرمایا ہے، جس کا ذکر اس آیت اور دیگر آیتوں میں مکرر آیا ہے۔

قَالَ وَ مِنۡ ذُرِّيَّتِيۡ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهۡدِي الظّٰلِمِيۡنَ [1]	ابراہیم نے کہا: میری اولاد سے بھی (امام ہوں گے) فرمایا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔
وَوَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ وَ يَعۡقُوۡبَ وَجَعَلۡنَا فِيۡ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالۡكِتٰبَ [2]	اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب عنایت کیے اور ان کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھ دی۔
وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا وَّ اِبۡرٰهِيۡمَ وَ جَعَلۡنَا فِيۡ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالۡكِتٰبَ [3]	اور ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا اور ان دونوں کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھ دی۔

آپ نے دیکھا اللہ تعالیٰ نے اس بار امانت کو نسل ابراہیمی سے باہر نہیں رکھا۔ چونکہ امامت و رہبری میں خاندانی نجابت اور ظرف کی طہارت کا بہت بڑا دخل ہے۔ حدیث رسولؐ میں آیا ہے:

...ثم اخرجنا الی اصلاب الآباء و ارحام الامهات و لایصیبنا نجس الشرك و لا سفاح الکفر۔ [4]	... پھر ہم کو آباء و اجداد کی پشتوں سے ماؤں کے رحموں میں منتقل کیا۔ نہ شرک کی نجاست ہمارے نزدیک آئی، نہ کفر کی ناپاکی۔

مامون نے حضرت امام رضا علیہ السلام سے پوچھا: کیا عترت کو دوسرے لوگوں پر فضیلت حاصل ہے؟ امام نے فرمایا:

---

[1] ۲ بقرہ: ۱۲۴ [2] ۲۹ عنکبوت: ۲۷ [3] ۵۷ حدید: ۲۶ [4] علل الشرائع ۱: ۲۰۸

ان اللّٰہ فضل العترۃ علی سائر الناس فی محکم کتابہ۔[1] اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی صریح (آیات) میں عترت کو دوسرے لوگوں پر فضیلت دی ہے۔

مامون نے کہا: کتاب اللہ میں یہ بات کہاں ہے؟ امام علیہ السلام نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

اہم نکات

۱۔ خدا نے مذکورہ ہستیوں کو اہلیت اور استحقاق کی وجہ سے برگزیدہ فرمایا۔

اِذۡ قَالَتِ امۡرَاَتُ عِمۡرٰنَ رَبِّ اِنِّیۡ نَذَرۡتُ لَکَ مَا فِیۡ بَطۡنِیۡ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلۡ مِنِّیۡ ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۳۵﴾

۳۵۔(وہ وقت یاد کرو) جب عمران کی عورت نے کہا: پروردگارا! جو (بچہ) میرے شکم میں ہے اسے تیری نذر کرتی ہوں، وہ (اور باتوں سے) آزاد ہوگا، تو میری طرف سے قبول فرما، بے شک تو بڑا سننے والا، جاننے والا ہے۔

تشریح کلمات

نَذَرَ: (ن ذ ر) کسی حادثے کی وجہ سے غیر واجب چیز کو اپنے اوپر واجب کر لینا۔[2] بنی اسرائیل میں اولاد نذر کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ہونے والا بچہ ہیکل کی جاروب کشی اور مجاوری میں عمر بسر کرے گا.

تفسیر آیات

عمران کی عورت یعنی حضرت مریم (س) کی والدہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نانی کا نام حنہ تھا۔ شام میں ان کا مدفن کلیسائے حنہ کے نام سے مشہور ہے۔ بعض دیگر روایات کے مطابق ان کا نام حسنہ بنت فاقود تھا۔ عمران کی عورت سے مراد آل عمران کی عورت نہیں، عمران کی بیوی ہی ہو سکتی ہے، کیونکہ قرآن کی تعبیر کے مطابق یہ ترکیب بیوی کے لیے استعمال ہوتی ہے: امۡرَاَتُ الۡعَزِیۡزِ تُرَاوِدُ فَتٰىہَا[3]، امۡرَاَتُ فِرۡعَوۡنَ[4] امۡرَاَتَ نُوۡحٍ[5] وغیرہ۔ بنا بر ایں معلوم ہوا، حضرت مریم (س) کے والد کا نام عمران تھا۔ اس صراحت کے مقابلے میں وہ مسیحی روایت بے اہمیت ہو جاتی ہے جس میں ان کا نام یواخیم ذکر ہوا ہے نیز سورۂ تحریم میں صراحت سے بیان ہوا ہے کہ حضرت مریم کے والد عمران تھے:

---

[1] عیون اخبار ۱: ۲۲۸ [2] راغب [3] ۱۲ یوسف: ۳۰ [4] ۲۸ قصص: ۹ [5] ۶۶ تحریم: ۱۰

وَ مَرۡیَمَ ابۡنَتَ عِمۡرٰنَ الَّتِیۡۤ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَہَا ....[1] اور مریم بنت عمران کو بھی (اللہ مثال کے طور پر پیش کرتا ہے) جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی....۔

ان تمام صراحتوں کے باوجود بعض اہل قلم کو یقین حاصل نہیں ہوتا کہ حضرت مریم کے والد کا نام عمران تھا۔[2]

مُحَرَّرًا: یعنی ذاتی مفاد میں نہیں۔ کنیسہ کی مجاورت کے ساتھ مختص ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ مریم بنت عمران کی اولاد کو آل عمران کہا گیا تو فاطمہ بنت محمد (ص) کی اولاد کو آل محمد (ع) کیوں نہیں کہا جا سکتا۔

فَلَمَّا وَضَعَتۡہَا قَالَتۡ رَبِّ اِنِّیۡ وَضَعۡتُہَاۤ اُنۡثٰی ؕ وَ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا وَضَعَتۡ ؕ وَ لَیۡسَ الذَّکَرُ کَالۡاُنۡثٰی ۚ وَ اِنِّیۡ سَمَّیۡتُہَا مَرۡیَمَ وَ اِنِّیۡۤ اُعِیۡذُہَا بِکَ وَ ذُرِّیَّتَہَا مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ﴿۳۶﴾

۳۶۔ پھر جب اسے جن چکی تو کہنے لگی: مالک میں نے تو لڑکی جنی اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس (مادر مریم) نے کیا جنا اور لڑکا (اس) لڑکی جیسا نہیں ہو سکتا تھا اور میں نے اس (لڑکی) کا نام مریم رکھا اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔

تشریح کلمات

مَرۡیَمَ: سریانی لفظ ہے جس کا معنی بقولے خادمہ اور بقولے عابدہ ہے۔

تفسیر آیات

بعض روایات کے مطابق حضرت مریم (س) کی والدہ نے اس بنا پر یہ نذر مانی تھی کہ ہونے والا نومولود لڑکا ہی ہوگا۔ کیونکہ ان کے والد عمران کو یہ بشارت ملی تھی کہ ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہونے والا ہے جو مریضوں کو شفا دے گا اور مردوں کو زندہ کرے گا، لیکن جب بچی پیدا ہوئی تو وہ پریشان ہوئیں۔ کیونکہ بچی سے نذر پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ سوچا کہ لڑکی کس طرح ہیکل یعنی مَعۡبَد کی مجاور بن سکے گی؟ اللہ تعالیٰ نے یہ

---

[1] ۶۶ تحریم: ۱۲ — [2] ملاحظہ ہو تفہیم القرآن ۱: ۲۴۷

کہکر تسلی کرا دی کہ اول تو لَیۡسَ الذَّکَرُ کَالۡاُنۡثٰی، ذہن میں موجود لڑکے سے یہ لڑکی زیادہ افضل ہے۔ کیونکہ اس کے بطن سے بغیر باپ کے ایک نبی پیدا ہو گا جو گہوارے میں کلام کرے گا اور اپنی نبوت کا اعلان کرے گا۔ دوم یہ کہ اس نذر کو اللہ نے بطریق احسن قبول فرمایا ہے۔

بعض کے نزدیک یہ والدہ مریم کا قول ہے کہ لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہو سکتا۔ لڑکا ہیکل کی مجاورت کر سکتا ہے، لڑکی نہیں۔

وَ اِنِّیۡ سَمَّیۡتُہَا مَرۡیَمَ : حضرت مریم کی پاکباز والدہ نے اس لڑکی کا نام مریم (عابدہ) رکھ دیا کہ بیت اللہ کی مجاہدہ نہ ہو، گھر کی عابدہ ہو۔

وَ اِنِّیۡۤ اُعِیۡذُہَا بِکَ وَ ذُرِّیَّتَہَا : سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کی والدہ اس بچی سے ہونے والی اولاد سے ایک پاکیزگی کی توقع رکھتی تھی۔ جو بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شکل میں پوری ہوتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ تعالیٰ نے عمران کو بیٹے کی جگہ بیٹی عنایت کی اور اسے بلند مرتبہ عنایت فرما کر عورتوں کو مقام دیا۔

۲۔ صالح مائیں اولاد کو شیطان کے شر سے محفوظ رکھنے کی تمنا اور دعا کیا کرتی ہیں۔

فَتَقَبَّلَہَا رَبُّہَا بِقَبُوۡلٍ حَسَنٍ وَّ اَنۡۢبَتَہَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ کَفَّلَہَا زَکَرِیَّا ۚؕ کُلَّمَا دَخَلَ عَلَیۡہَا زَکَرِیَّا الۡمِحۡرَابَ ۙ وَجَدَ عِنۡدَہَا رِزۡقًا ۚ قَالَ یٰمَرۡیَمُ اَنّٰی لَکِ ہٰذَا ؕ قَالَتۡ ہُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ بِغَیۡرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

۳۷۔ چنانچہ اس کے رب نے اس کی نذر (لڑکی) کو بوجہ احسن قبول فرمایا اور اس کی بہترین نشوونما کا اہتمام کیا اور زکریا کو اس کا سرپرست بنا دیا، جب زکریا اس کے حجرۂ عبادت میں جاتے تو اس کے پاس طعام موجود پاتے، پوچھا: اے مریم! یہ (کھانا) تمہارے پاس کہاں سے آتا ہے؟ وہ کہتی ہے: اللہ کے ہاں سے۔ بے شک خدا جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

تشریح کلمات

انبت۔ نبات: (ن ب ت) انبت اس نے پرورش کی۔ نبات، ہر بڑھنے والی چیز۔

کفل : (ك ف ل) کفالت کرنا۔ ضمانت دینا۔

المحراب : (ح ر ب) حجرۂ عبادت۔ جو لوگ یہودی معبد کی مجاورت کرتے تھے، ان کی عبادت اور اعتکاف کے لیے مخصوص کمرے اونچی جگہ پر بنائے جاتے تھے، جنہیں محراب کہا جاتا تھا۔ مسلمانوں کی مساجد میں امام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو محراب کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

یہ اس وقت کا ذکر ہے، جب حضرت مریم (س) رشد کو پہنچ گئیں۔ لڑکی ہونے کی وجہ سے حسب نذر ہیکل کی خادمہ تو نہ بن سکیں، البتہ عبادات اور اعتکاف کے لیے عبادت گاہ (ہیکل) میں داخل کر دی گئیں۔ سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم (س) کے والد حضرت عمران زندہ نہ تھے، اس لیے حضرت مریم (س) کی کفالت ایک مسئلہ بن گئی تھی۔ کیونکہ ہیکل کے مجاوروں میں سے ہر شخص ان کا کفیل بننے کی خواہش رکھتا تھا۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی زوجہ اور حضرت مریم (س) کی والدہ آپس میں بہنیں تھیں۔ اس لیے یہ ایک ترجیح بنتی تھی کہ حضرت مریم (س) ان کی کفالت میں دے دی جائیں، کیونکہ خالہ ماں کی جگہ ہوتی ہے، لیکن دوسرے لوگ اس پر راضی نہ ہوئے۔ آخر قرعہ اندازی ہوئی تو قرعہ بھی حضرت زکریا علیہ السلام کے نام نکل آیا۔ چنانچہ حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم (س) کو ہیکل کے حجرہ ہائے عبادت میں سے ایک حجرے میں بٹھا دیا۔ وہ حضرت مریم (س) کے حجرے کا قفل لگا دیتے اور خود ہی آ کر کھولتے تھے۔ لیکن یہ دیکھ کر انہیں تعجب ہوتا تھا کہ حضرت مریم (س) کے پاس بے موسم کے میوے اور کھانے کی چیزیں موجود ہوتی تھیں۔ لفظ کُلَّمَا سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہمیشہ پیش آتا تھا۔ ظاہر ہے کہ حضرت زکریا (ع) نے ان تمام ذرائع کا مطالعہ کیا ہوگا جہاں سے کھانا آ سکتا تھا۔ لیکن بے موسم کے میوے کہاں سے آتے؟ اس لیے پوچھا: مریم یہ کھانا کہاں سے آتا ہے؟ مریم (س) جواب دیتیں: اللہ کی جانب سے۔

اہم نکات

۱۔ مریم (س) کی تربیت کے لیے اللہ نے حضرت زکریا (ع) کو منتخب فرمایا تاکہ معصوم کا مربی معصوم ہو۔

۲۔ صاحب کرامات کے لیے نبی ہونا ضروری نہیں۔

۳۔ معصوم ہستیوں کی صحیح تربیت کا بندوبست اللہ تعالیٰ خود کرتا ہے: اَنۡۢبَتَہَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ کَفَّلَہَا۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ اس مقام پر زکریا نے اپنے رب کو پکارا اور کہا: پروردگارا! مجھے اپنی عنایت سے صالح اولاد عطا کر، یقیناً تو ہی دعا سننے والا ہے۔

فَنَادَتۡهُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَهُوَ قَآئِمٌ یُّصَلِّیۡ فِی الۡمِحۡرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُکَ بِیَحۡیٰی مُصَدِّقًۢا بِکَلِمَۃٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَیِّدًا وَّحَصُوۡرًا وَّنَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۳۹﴾

۳۹۔ چنانچہ جب وہ حجرۂ عبادت میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے تو فرشتوں نے آواز دی: اللہ تجھے یحیٰی کی بشارت دیتا ہے، جو کلمہ اللہ کی طرف سے ہے، وہ اس کی تصدیق کرنے والا، سیادت کا مالک، خواہشات پر ضبط رکھنے والا، نبوت کے مقام پر فائز اور صالحین میں سے ہوگا۔

تشریح کلمات

کَلِمَۃ: (ک ل م) سے ماخوذ ہے۔ اس سے کلام بھی مراد لیا جاتا ہے اور ذوات بھی۔ یہاں کلمۃ سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق بغیر باپ کے کلمۃ کن سے ہوئی۔ اس لیے آپ علیہ السلام کو کلمۃ کہا جاتا ہے۔

حَصُوۡرًا: (ح ص ر) ضبط نفس اور خواہشات پر کنٹرول رکھنے والا۔

یحییٰ: عھد جدید میں ان کا نام یوحنا آیا ہے۔ آپ حضرت مریم (س) کے خالہ زاد بھائی ہیں۔ انجیل کے مطابق آپ حضرت عیسیٰ (ع) سے صرف چھ مہینے بڑے تھے۔ اس زمانے کے بادشاہ ہیرود نے ایک بدکردار عورت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے آپ کو شہید کیا اور آپ کا سر قلم کر دیا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام ہمیشہ حضرت یحیٰی علیہ السلام کو یاد کر کے گریہ فرماتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ ھُنَالِکَ: اس مقام پر۔ یعنی حضرت مریم کی منزلت و پاکیزگی اور ان کو ملنے والے غیبی رزق اور عند اللہ ان کا مقام دیکھ کر حضرت زکریا علیہ السلام کے دل میں اولاد کی خواہش زیادہ ہوگئی۔ چونکہ حضرت زکریا کے ہاں اولاد نہ تھی۔

۲۔ مِنۡ لَّدُنۡکَ ذُرِّیَّۃً: حضرت زکریا علیہ السلام نے صرف اولاد کی نہیں، طیب و طاہر اولاد کی خواہش کی۔ پاکیزہ اولاد باقیات صالحات ہوتی ہیں اور خاندانی متبرکات منجملہ خانۂ رسول کی وارث ہوتی ہیں۔ چنانچہ سورہ مریم آیت ۵ میں حضرت زکریا علیہ السلام کی اس دعا کو ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

فَهَبۡ لِیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ وَلِیًّا ۙ یَّرِثُنِیۡ وَیَرِثُ مِنۡ اٰلِ یَعۡقُوۡبَ ٭ۖ وَاجۡعَلۡهُ رَبِّ رَضِیًّا ...

پس تو مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا فرما۔ جو میرا وارث بنے اور آل یعقوب کا وارث بنے...

حضرت زکریا علیہ السلام کے اپنے بعد کے لیے وارث کی درخواست سے یہ بات قرآنی صراحت سے

واضح ہو جاتی ہے کہ انبیاء کے وارث ہوتے ہیں۔ اس موضوع پر تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سورہ مریم آیت ۵،۶۔ سورہ نمل آیت ۱۶۔

۳۔ فَنَادَتۡہُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ: چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے یہ خوش خبری سنا دی کہ انہیں ایک بچہ دیا جائے گا، جس کے یہ اوصاف ہوں گے:

۱۔ مُصَدِّقًۢا بِکَلِمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ۔ وہ کلمۃ اللّٰہ یعنی حضرت عیسیٰ (ع) کی تصدیق کرنے والا ہو گا۔

۲۔ سیادت و سرداری کا مالک ہو گا: وَ سَیِّدًا۔

۳۔ خواہشات نفسانی پر ضبط اور اختیار رکھنے والا ہو گا: وَّ حَصُوۡرًا۔

۴۔ نبوت کے مقام پر فائز ہو گا: وَّ نَبِیًّا ۔

۵۔ صالحین میں سے ہو گا: مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ ۔

دوسری جگہ حضرت یحییٰ (ع) کے بارے میں ارشاد ہے:

... وَ اٰتَیۡنٰہُ الۡحُکۡمَ صَبِیًّا ۝ۙ[1]　　اور ہم نے اسے بچپن ہی سے حکمت عنایت کی۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے نیک بندے فقط اولاد کی نہیں، بلکہ اولاد صالح کی تمنا کیا کرتے ہیں: رَبِّ ہَبۡ لِیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ ذُرِّیَّۃً ....

قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوۡنُ لِیۡ غُلٰمٌ وَّ قَدۡ بَلَغَنِیَ الۡکِبَرُ وَ امۡرَاَتِیۡ عَاقِرٌ ؕ قَالَ کَذٰلِکَ اللّٰہُ یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ ﴿۴۰﴾

۴۰۔ زکریا بولے: پروردگارا! میرے ہاں لڑکا کہاں سے پیدا ہو گا جب کہ میں تو سن رسیدہ ہو چکا ہوں اور میری عورت بانجھ ہے، اللہ نے فرمایا: ایسا ہی ہو گا، اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

قَالَ رَبِّ اجۡعَلۡ لِّیۡۤ اٰیَۃً ؕ قَالَ اٰیَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمۡزًا ؕ وَ اذۡکُرۡ رَّبَّکَ کَثِیۡرًا وَّ سَبِّحۡ بِالۡعَشِیِّ وَ الۡاِبۡکَارِ ﴿۴۱﴾

۴۱۔ عرض کیا: پالنے والے! میرے لیے کوئی نشانی مقرر فرما، اللہ نے فرمایا: تمہاری نشانی یہ ہو گی کہ تم تین دن تک لوگوں سے اشارے کے علاوہ بات نہ کرو گے اور اپنے رب کو خوب یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔

---

[1] ۱۹ مریم: ۱۲

تشریح کلمات

عَاقِرٌ: (ع ق ر) بانجھ۔
رَمۡزًا: (ر م ز) ہونٹوں سے اشارہ کرنا۔ آنکھوں اور ہاتھوں کے اشاروں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔
الۡعَشِیِّ: (ع ش و) دن کا آخری حصہ۔ عشوۃ سے ماخوذ ہے جو تاریکی کے معنی میں ہے۔
الۡاِبۡکَارِ: (ب ك ر) دن کی ابتدا۔ سویرے۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوۡنُ: اگرچہ حضرت زکریا (ع) نے خود اللہ سے اولاد کی خواہش کی تھی، تاہم یہ خواہش پوری ہونے پر تعجب کرنا، اس کیفیت کی وجہ سے ہے، جو قبول دعا کی خوش خبری سن کر طاری ہوئی۔ گویا حضرت زکریا (ع) فرما رہے ہیں: پروردگارا! اولاد کی خواہش تو پوری ہو رہی ہے، لیکن وہ انجام کس طرح پائے گی؟ کیونکہ طبعی طور پر اس کے لیے دو رکاوٹیں موجود ہیں: بڑھاپا اور بیوی کا بانجھ پن۔ جواب میں اللہ تعالیٰ اپنی قدرت مطلقہ کا ذکر فرماتا ہے کہ اس کی مشیت کے آگے کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی: کَذٰلِکَ اللّٰہُ یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ۔

۲۔ قَالَ رَبِّ اجۡعَلۡ لِّیۡۤ اٰیَۃً۔ نشانی کا تعین: اولاد عطا ہونے کے بارے میں جو نشانی طلب کی گئی، ممکن ہے کہ وہ کیفیت کے بارے میں ہو۔ اس مقصد کے لیے تین دن تک لوگوں سے بات نہ کرنے اور اولاد عطا ہونے کے درمیان کیا ربط ہو سکتا ہے؟ نیز لوگوں سے بات نہ کرنا، کس مطلب کی طرف اشارہ ہے؟ آیت سے اس بارے میں کچھ ثابت نہیں ہوتا۔

۳۔ وَاذۡکُرۡ رَّبَّکَ: روایت میں آیا ہے کہ حضرت زکریا (ع) تین دن تک لوگوں سے بات کر ہی نہ سکے، لیکن جب تسبیح و ذکر خدا کرنے پر آتے تو زبان کھل جاتی تھی۔ یہ علامت تھی کہ حضرت یحییٰ (ع) کا حمل قرار پا گیا ہے۔

وَ اِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرۡیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰکِ وَ طَہَّرَکِ وَ اصۡطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۲﴾

۴۲۔ اور (وہ وقت یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بے شک اللہ نے تمہیں برگزیدہ کیا ہے اور تمہیں پاکیزہ بنایا ہے اور تمہیں دنیا کی تمام عورتوں پر برگزیدہ کیا ہے۔

يٰمَرۡيَمُ اقۡنُتِىۡ لِرَبِّكِ وَاسۡجُدِىۡ وَارۡكَعِىۡ مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ ﴿۴۳﴾	۴۳۔ اے مریم! اپنے رب کی اطاعت کرو اور سجدہ کرتی رہو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرتی رہو۔
ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهِ اِلَيۡكَ ؕ وَمَا كُنۡتَ لَدَيۡهِمۡ اِذۡ يُلۡقُوۡنَ اَقۡلَامَهُمۡ اَيُّهُمۡ يَكۡفُلُ مَرۡيَمَ ۖ وَمَا كُنۡتَ لَدَيۡهِمۡ اِذۡ يَخۡتَصِمُوۡنَ ﴿۴۴﴾	۴۴۔ یہ غیب کی خبریں ہم آپ کو وحی کے ذریعے بتا رہے ہیں اور آپ تو ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ اپنے قلم پھینک رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کی سرپرستی کرے اور نہ ہی آپ ان کے پاس (اس وقت) موجود تھے جب وہ جھگڑ رہے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِكَةُ: اس آیت سے واضح ہو جاتا ہے کہ غیر انبیاء پر بھی فرشتے نازل ہوتے ہیں، البتہ تبلیغ احکام سے متعلق وحی، انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے۔ فرشتوں سے ہمکلام ہونے والی ہستیاں درج ذیل ہیں۔

الف۔ نبی: نبی پر وحی نازل ہوتی ہے۔ جو تبلیغ احکام سے مربوط ہوتی ہے، لیکن تبلیغ کا حکم نافذ نہیں ہوتا۔

ب۔ رسول: رسول پر بھی تبلیغ احکام سے مربوط وحی نازل ہوتی ہے۔ ساتھ تبلیغ کا حکم بھی نافذ ہوتا ہے۔

ج۔ محدث: جس سے گفتگو کی جائے۔ یعنی اولیاء اللہ۔ ان سے بھی فرشتے ہمکلام ہوتے ہیں، لیکن تبلیغ احکام کے لیے نہیں۔ جیسے مادر موسیٰ (ع) کو حکم ہوا کہ موسیٰ (ع) کو دریا میں ڈال دو وغیرہ۔ اس جگہ حضرت مریم (س) سے ہمکلام ہونے کے لیے فرشتے نازل ہوئے۔

مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں:

> دوسری بات قابل تحقیق یہ ہے کہ فرشتوں کا کلام کرنا خواص نبوت سے نہیں۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت عمران بن حصین کو فرشتوں کا سلام کرنا مروی ہے۔[۱]

شیعہ احادیث میں حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں وارد ہے کہ آپ علیہ السلام محدث ہیں۔[۲]

---

۱ بیان القرآن ۱: ۱۹۴   ۲ المیزان ۳: ۲۵۴

۲۔ اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰىکِ: پہلی بار حضرت مریم (س) کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے نوازتے ہوئے برگزیدہ فرمایا۔ دوسری بار تطہیر کے بعد برگزیدہ فرمایا۔ اس بار عملی استحقاق اور کردار کی بلندی کی وجہ سے تمام دنیا کی عورتوں پر برگزیدہ فرمایا۔

۳۔ عَلٰی نِسَآءِ الۡعٰلَمِیۡنَ: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت مریم (س) کو اللہ نے اپنے دور کی عورتوں پر برگزیدہ فرمایا ہے یا اولین و آخرین کی عورتوں پر؟ یہاں بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ عالمین کا اطلاق تمام زمانوں پر ہوتا ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہاں عالمین سے مراد حضرت مریم (س) کے زمانے کے تمام عالمین ہیں۔ دوسرے زمانے کے عالمین اس میں شامل نہیں ہیں۔ چنانچہ عمران بن حصین اور ابن عباس کی روایت ہے کہ رسول اللہ (ص) نے حضرت فاطمہ (س) سے فرمایا:

اَمَا تَرۡضِیۡنَ اَنۡ تَکُوۡنِیۡ سَیِّدَۃَ نِسَآءِ الۡعَالَمِیۡنَ. قَالَتۡ: فَاَیۡنَ مَرۡیَمُ بِنۡتِ عِمۡرَانَ؟ قَالَ لَھَا: اَیۡ بُنَیَّ تِلۡكَ سَیِّدَۃُ نِسَآءِ عَالَمِھَا وَ اَنۡتِ سَیِّدَۃُ نِسَآءِ الۡعَالَمِیۡنَ.[1]	کیا آپ اس بات پر راضی نہیں ہیں کہ آپ عالمین کی عورتوں کی سردار ہیں؟ عرض کیا: مریم بنت عمران پھر کہاں؟ فرمایا: بیٹی! وہ اپنے عالم کی عورتوں کی سردار ہیں اور آپ تمام عالمین کی عورتوں کی سردار ہیں۔

۴۔ یٰمَرۡیَمُ اقۡنُتِیۡ: اللہ کی طرف سے برگزیدگی اور تطہیر کی نوید دینے کے بعد فرمایا: عالمین کی عورتوں کی سردار ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ اپنے رب کی اطاعت اور عبادت کرو۔ یعنی اللہ کے اس فضل و کرم پر اس کی اطاعت و عبادت کرو۔

۵۔ وَارۡکَعِیۡ مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ: اس سے باجماعت نماز پڑھنے کا حکم ثابت نہیں ہوتا، بلکہ ممکن ہے مقصود یہ ہو کہ رکوع کرنے والوں کی طرح رکوع کیا کرو۔ یعنی مَعَ سے مراد معیت در سیرت ہے۔

۶۔ ذٰلِکَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَیۡبِ: مریم کی تطہیر اور برگزیدگی و دیگر خصوصیات کا ذکر صرف وحی کے ذریعے غیبی خبریں ہیں۔ اس کے دیگر مصادر نہیں ہیں۔ چنانچہ عہد قدیم و جدید میں حضرت زکریا علیہ السلام کے واقعات کا ذکر نہیں ہے۔

۷۔ اِذۡ یُلۡقُوۡنَ اَقۡلَامَھُمۡ: حضرت مریم (س) کی ولادت کے بعد ان کی مادر گرامی نے ان کو کنیسا میں پیش کیا کہ میں نے اس بچی کی خانہ خدا کی خدمت کے لیے نذر مانی ہے۔ چنانچہ کنیسا کے راہبوں میں مریم کی سرپرستی کے لیے ایک دوسرے سے نزاع ہوا۔ بات قرعہ اندازی تک پہنچی اور قرعہ میں زکریا علیہ السلام کا نام نکل آیا۔ امام صادق علیہ السلام سے مروی آیا ہے:

اَیُّ قَضِیَّۃٍ اَعۡدَلُ مِنَ الۡقُرۡعَۃِ۔[2]	قرعہ سے زیادہ انصاف پر مبنی فیصلہ نہیں ہے۔

---

[1] بشارۃ المصطفیٰ ص ۶۹۔ ۱۷۷۔ الجمع بین صحاح الستۃ جلد دوم باب مناقب فاطمہ۔　[2] وسائل الشیعۃ ۲۷: ۲۱۱۔ باب الحکم...

اہم نکات

۱۔ غیر انبیاء پر بھی فرشتے نازل ہوتے ہیں۔
۲۔ اللہ نے دو بار حضرت مریم (س) کو برگزیدہ کیا۔
۳۔ پاکیزگی کے بغیر قرب خداوندی کا حصول ممکن نہیں۔

اِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرۡیَمُ اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَۃٍ مِّنۡہُ ٭ۖ اسۡمُہُ الۡمَسِیۡحُ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ وَجِیۡہًا فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ وَ مِنَ الۡمُقَرَّبِیۡنَ ﴿۴۵﴾

۴۵۔ جب فرشتوں نے کہا: اے مریم اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک کلمے کی بشارت دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا، وہ دنیا و آخرت میں آبرومند ہوگا اور مقرب لوگوں میں سے ہوگا۔

تشریح کلمات

الۡمَسِیۡحُ: یہ عبرانی لفظ مشیحا کا معرب ہے۔ یعنی مبارک۔ بعض مفسرین کہتے ہیں: لفظ مسیح ان کے ہاں بادشاہوں کا لقب ہے۔ کیونکہ ان کے ہاں جو شخص بھی ملک کا اقتدار سنبھالتا ہے، کاہن اس کے جسم پر مقدس تیل ملتا ہے۔ اس طرح ملک کا اقتدار سنبھال لینے والے کو بادشاہ مسیح کہتے ہیں۔[1]

تمام انبیائے سلف نے مسیح علیہ السلام کی آمد کی بشارت دی۔ چنانچہ یہودی اس مسیح علیہ السلام کے منتظر تھے۔ لیکن حضرت مسیح (ع) نے ظہور فرمایا تو ان میں سے صرف کچھ یہودی ایمان لائے۔

عِیۡسَی: یہ عبرانی لفظ یسوع کا معرب ہے۔ نجات دہندہ یا صاحب حیات یعنی یحیٰ کا ہم معنی ہے۔

تفسیر آیات

اس آیہ مبارکہ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ فرشتے حضرت مریم (س) سے براہ راست کلام کرتے تھے۔ اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں دو متضاد نظریات رد کرنے کے ساتھ ساتھ درست مؤقف بیان ہو رہا ہے۔ یہودیوں کے منفی مؤقف اور مسیحیوں کے غالیانہ مؤقف کو رد کرنے کے بعد یہ بتایا جا رہا ہے

---

[1] المراغی

کہ حضرت عیسیٰ (ع) اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے ہیں اور دنیا و آخرت میں محترم ہیں۔

۱۔ بِكَلِمَةٍ مِّنۡهُ: قرآن حضرت مسیح کو کلمۃ اللّٰہ کا لقب دیتا ہے۔ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور اللہ کی طرف سے صادر ہونے والے کلمہ، کن سے وجود میں آئے ہیں یا اس لیے کلمہ ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کی غیر محدود قدرت کی نشانی ہیں، جس طرح کوئی کلمہ کسی معنی کی نشاندہی کرتا ہے۔

۲۔ وَجِيۡهًا فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ: آخرت میں آبرومند ہونا تو واضح ہے۔ دنیا میں بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی آبرومندی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ روئے زمین پر بسنے والوں میں ایک بہت بڑی تعداد آپ کے تقدس کی قائل ہے۔ اس سلسلے میں یہودیوں کی طرف سے بہتان تراشی اس آبرومندی کے لیے مضر نہیں ہے، چونکہ یہود خود دنیا میں ایک مجرم قوم کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ حضرت عیسیٰؑ اللہ کے فرزند نہیں، بلکہ اللہ کے برگزیدہ اور مقرب بندے ہیں: مِنَ الۡمُقَرَّبِيۡنَ...

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الۡمَهۡدِ وَكَهۡلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۝۴۶

۴۶۔ اور وہ لوگوں سے گہوارے میں اور بڑی عمر میں گفتگو کرے گا اور صالحین میں سے ہوگا۔

تشریح کلمات

الۡمَهۡدِ: (م ہ د) گہوارہ۔

كهل: (ك ہ ل) چالیس سے پچاس سال کی عمر کا عرصہ۔ اس سے کم کو شباب اور زیادہ کو شیخوخہ کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

اس آیت میں حضرت مریم (س) لیے بشارت ہے کہ ان کا نور چشم گہوارے میں گفتگو کرے گا، حتیٰ کہ سن کہولت کو پہنچے گا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ (ع) نے ولادت کے فوراً بعد اپنی والدہ کی پاکیزگی اور اپنی نبوت کے بارے میں کلام کیا، جس کا ذکر سورۂ مریم میں آئے گا۔ گہوارے میں گفتگو کرنے سے حضرت مریم (س) کی طہارت ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ یہودیوں کی بہتان تراشی کو بھی رد کر دیا۔

فِى الۡمَهۡدِ: گہوارے میں بات کرنا ایک منفرد معجزہ تھا۔ اس معجزے سے حضرت مریم (س) کی

طہارت ثابت ہوئی اور حضرت مسیح علیہ السلام کی نبوت بھی۔ لہٰذا یہ کہنا اَلۡمَهۡدِ، گہوارے، دو سال تک کے بچے کو بھی گہوارے کا بچہ کہا جاتا ہے، قرآنی صراحت کے خلاف ہے۔ سورہ مریم میں فرمایا:

فَاَتَتۡ بِہٖ قَوۡمَہَا تَحۡمِلُہٗ ؕ قَالُوۡا یٰمَرۡیَمُ لَقَدۡ جِئۡتِ شَیۡـًٔا فَرِیًّا ۝ [1]
پھر وہ اس بچے کو اٹھا کر اپنی قوم کے پاس لے آئیں، لوگوں نے کہا: اے مریم! تو نے بہت غضب کی حرکت کی.

اور

قَالُوۡا کَیۡفَ نُکَلِّمُ مَنۡ کَانَ فِی الۡمَہۡدِ صَبِیًّا ۝ [2]
لوگ کہنے لگے: ہم اس سے کیسے بات کریں جو بچہ ابھی گہوارے میں ہے؟

دلیل ہے کہ یہ بچہ دو سال کا نہیں تھا، کیونکہ اگر دو سالہ بچہ ہوتا تو نہ یہ گہوارے کا ہوتا، نہ اس سے بات کرنا مشکل ہوتا۔ پھر اگر دو سال کا بچہ بات بھی کرتا ہے تو:

اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیۡ نَبِیًّا ... [3]
اللہ نے مجھے کتاب عنایت کی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے.

کہنا ایک دو سالہ بچے سے ممکن نہیں ہے۔

قَالَتۡ رَبِّ اَنّٰی یَکُوۡنُ لِیۡ وَلَدٌ وَّ لَمۡ یَمۡسَسۡنِیۡ بَشَرٌ ؕ قَالَ کَذٰلِکِ اللّٰہُ یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۴۷﴾

۴۷۔ مریم نے کہا: پروردگارا! میرے ہاں لڑکا کس طرح ہو گا؟ مجھے تو کسی شخص نے چھوا تک نہیں، فرمایا: ایسا ہی ہوگا، اللہ جو چاہتا ہے خلق فرماتا ہے، جب وہ کسی امر کا ارادہ کر لیتا ہے تو اس سے کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَنّٰی یَکُوۡنُ لِیۡ وَلَدٌ: یہ استفہام از باب تعجب ہے یا حقیقت جاننا چاہتی ہیں کہ کیا کسی بشر کے چھونے کے بعد بچہ ہوگا یا بطور اعجاز ہوگا۔ جواب میں فرمایا: بطور خاص اعجاز ہوگا۔

بغیر باپ کے بچہ خلق کرنا اللہ کے لیے تو ایسا ہی ہے جیسے باپ کے ذریعے بچہ پیدا کرنا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ چیزوں کو وسائل و آلات کے ذریعے پیدا نہیں کرتا کہ کچھ کام اس کے لیے آسان، کچھ مشکل یا کچھ ناممکن ہوں، بلکہ ہر جگہ اس کا ارادہ چلتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی چیز کے خلق کرنے پر اس کا کاف و نون بھی خرچ نہیں ہوتا۔ آیات میں استعمال شدہ کُن کا لفظ تو خدائی ارادے کی وضاحت کے لیے ایک تعبیر ہے۔ اس آیت کی

---

[1] ۱۹ مریم: ۲۷　[2] ۱۹ مریم: ۲۹　[3] ۱۹ مریم: ۳۰

مزید تفسیر سورۂ بقرہ آیہ ۱۱۷ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

احادیث

باب مدینۃ العلم مولائے متقیان حضرت علی علیہ السلام سے مروی ہے:

یَقُوْلُ لِمَنْ اَرَادَ کَوْنَہٗ: کُنْ فَیَکُوْنُ، لَا بِصَوْتٍ یُقْرَعُ وَ لَا بِنِدَاءٍ یُسْمَعُ وَ اِنَّمَا کَلَامُہٗ سُبْحَانَہٗ فِعْلٌ مِنْہُ اَنْشَاَہٗ.[۱]

جسے پیدا کرنا چاہتا ہے اسے "ہو جا" کہتا ہے، جس سے وہ ہو جاتی ہے بغیر کسی آواز کے جو کان (کے پردوں) سے ٹکرائے اور بغیر کسی ایسی صدا کے جو سنی جا سکے، بلکہ اللہ سبحانہ کا کلام بس اس کا ایجاد کردہ فعل ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کا ارادہ کسی عام طبیعی قانون کے تابع نہیں، کیونکہ طبیعی قوانین بھی اسی کے بنائے ہوئے ہیں.

۲۔ آسان اور مشکل کا تصور مخلوقات کے ہاں پایا جاتا ہے، خالق کے ہاں نہیں۔

۳۔ کُن سے مراد الفاظ نہیں، بلکہ ارادۂ خداوندی ہے۔

وَ یُعَلِّمُہُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ وَ التَّوْرٰىۃَ وَ الْاِنْجِیْلَ ﴿۴۸﴾

۴۸۔ اور (اللہ) اسے کتاب و حکمت اور توریت و انجیل کی تعلیم دے گا۔

وَ رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۬ۙ اَنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ ۙ اَنِّیْۤ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَہَیْـَٔۃِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْہِ فَیَکُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰہِ ۚ وَ اُبْرِیٴُ الْاَکْمَہَ وَ الْاَبْرَصَ وَ اُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ ۚ وَ اُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِیْ بُیُوْتِکُمْ ؕ اِنَّ فِیْ

۴۹۔ اور (وہ) بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے رسول کی حیثیت سے (کہے گا:) میں تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر تمہارے پاس آیا ہوں، (وہ یہ کہ) میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی شکل کا مجسمہ بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ خدا کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے اور میں اللہ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور برص کے مریض کو تندرست اور مردے کو زندہ کرتا ہوں اور میں تم لوگوں کو بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں کیا جمع کر کے رکھتے ہو، اگر تم

۱۔ نہج البلاغۃ خطبہ ۱۸۴۔ ترجمہ مفتی جعفر حسینؒ۔ طبع امامیہ کتب خانہ۔ لاہور

ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۴۹﴾	صاحبان ایمان ہو تو اس میں تمہارے لیے نشانی ہے۔

تشریح کلمات

الْاَكْمَهَ: (ك م ه) مادر زاد اندھا۔
تَدَّخِرُ: (ذ خ ر) ذخر سے مشتق۔ ذخیرہ کرنا۔
الْاَبْرَصَ: (ب ر ص) برص کا مریض۔

تفسیر آیات

۱۔ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ: انہیں کتاب کی تعلیم دے گا۔ اس جگہ کتاب سے مراد جنس کتاب ہے، جس میں سابقہ انبیاء کی کتابیں اور آنے والی کتاب شامل ہیں۔ بعد میں توریت و انجیل کا ان کتابوں کے مصادیق کے طور پر ذکر فرمایا۔

۲۔ وَالْحِكْمَةَ: حکمت کی تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کی سنگینی کو اپنے کاندھوں پر لینے کے بعد لوگوں کو حق کی طرف دعوت دینے کی راہ میں پیش آنے والی حوصلہ شکن مشکلات میں سوجھ بوجھ کا مالک ہو۔ اس سوجھ بوجھ کو حکمت کہتے ہیں، جس کی وجہ سے رائے صائب اور فیصلہ درست ہوتا ہے۔ چنانچہ ابی عبد اللہ علیہ السلام سے روایت ہے: ...الْحِكْمَةَ... الفهم و القضاء،[1] یعنی حکمت سمجھداری اور قوت فیصلہ کو کہتے ہیں۔

۳۔ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ: توریت و انجیل کے بارے میں تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، سورہ آل عمران آیت ۳۔

۴۔ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ: اس جملے سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ کی رسالت عالمگیر نہیں تھی۔ انجیل میں بھی اس بات کی صراحت موجود ہے۔ ملاحظہ ہو متی ۱۰: ۵ تا ۷۔ مؤلف تفسیر المیزان اس جگہ فرماتے ہیں کہ حضرتؑ کی نبوت عالمگیری تھی، مگر رسالت صرف بنی اسرائیل تک محدود تھی۔ نبوت اور رسالت میں انہوں نے یہ فرق بیان کیا ہے: نبوت وہ منصب ہے جس کے ذمے لوگوں میں دین کی تبلیغ کرنا ہے، جب کہ رسالت اس منصب کو کہتے ہیں جس میں اللہ کی خاص رسالت اور پیغام کو مکمل پہنچانا ہوتا ہے۔ جس کے قبول کرنے پر نعمت و بقا اور رد کرنے پر ہلاکت مترتب ہوتی ہے۔

۵۔ اَنِّيْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ، میں بناتا ہوں۔ فَاَنْفُخُ، میں پھونک مارتا ہوں۔ وَاُبْرِئُ، تندرست کرتا ہوں۔ وَاُحْيِ، زندہ کرتا ہوں۔ ان جملوں میں ان معجزات کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جس حد تک اپنی ذات

---

[1] الکافی ۱: ۲۰۶۔ باب ان الائمة ع ولاة الأمر...۔

کی طرف نسبت دی ہے، یعنی باذن اللّٰہ کی شرط کے ساتھ، اسی حد تک ہم بھی انبیاء کی طرف تکوینی امور کی نسبت دے سکتے ہیں۔ یعنی باذن اللّٰہ کی شرط کے ساتھ۔

۶۔ وَاُنَبِّئُکُمۡ : غیب کی خبریں دیتا ہوں۔ غیب بذات خود صرف اللہ جانتا ہے:

قُلۡ لَّا یَعۡلَمُ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ الۡغَیۡبَ اِلَّا اللّٰہُ ...[1]	کہد یجیے: جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، وہ غیب کی باتیں نہیں جانتے سوائے اللہ کے ....

اللہ کے بعد وہ ہستیاں غیب جانتی ہیں جن کو اللہ غیب کی تعلیم دیتا ہے۔

۷۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمۡ : حضرت عیسیٰ علیہ السلام چونکہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے، اس لیے آپ علیہ السلام کے معجزات سے بیک وقت تین اہم باتیں ثابت ہوتی ہیں:

۱۔ حضرت مریم علیہا السلام کی طہارت۔

۲۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت۔

۳۔ بغیر باپ کے پیدا ہونے کا معجزہ۔

لہٰذا ان معجزات سے جہاں نبوت و طہارت ثابت ہوتی ہے، وہاں ایک بنیادی معجزہ بھی ثابت ہوتا ہے، جس پر باقی دو باتوں کا دار و مدار ہے اور وہ ہے، بغیر باپ کے پیدا ہونا۔

خلق، متعدد معنوں میں استعمال ہوتا ہے:

۱۔ خلق ابداعی: یعنی عدم سے وجود میں لانا۔ یہ بات صرف ذات خداوندی کے ساتھ مخصوص ہے۔

۲۔ خلق ترکیبی: یعنی ایک شے سے دوسری شے بنانا۔ مثلاً لکڑی سے میز کرسی بنانا۔

۳۔ خلق تقدیری: یعنی اندازے معین کرنا۔

خلق کے موخر الذکر دو معانی سے غیر اللہ بھی متصف ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ (ع) فرماتے ہیں: اَخۡلُقُ لَکُمۡ مِّنَ الطِّیۡنِ ۔ تیسرے معنی کے لحاظ سے اللہ کو اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ [2] کہا گیا ہے۔

معجزہ اور قانون طبیعیت: سورۂ بقرہ آیت ۲۳ کے ذیل میں اس موضوع پر تفصیلی بحث ہوئی ہے، تاہم یہاں تطبیقی بحث مناسب معلوم ہوتی ہے۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ طبیعی واقعات کے پیچھے طبیعی علل و اسباب ہی کارفرما ہوتے ہیں، مگر یہ علل و اسباب عام طور پر مانوس اور قابل تسخیر ہوتے ہیں۔

معجزات کے پیچھے بھی علل و اسباب ضرور ہوتے ہیں، لیکن یہ اسباب نامانوس اور عام حالات میں لوگوں کے لیے ناقابل تسخیر ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک نابینا کو آپریشن کے ذریعے بینائی دینا طبیعی اور تکوینی قانون کی

---

[1] ۲۷ نمل: ۶۵　[2] ۲۳ مومنون: ۱۴

عام دفعات کے تحت ممکن اور قابل تکرار ہے۔ مگر مادر زاد نابینا کو بغیر کسی علاج کے بینائی دینا اس قانون کے خلاف ہے۔ اسے ''خرق عادت'' یا ''غیر معمولی'' کہتے ہیں۔ کیونکہ معجزہ اس وقت معجزہ ہوتا ہے جب یہ سطحی اور ظاہری علل و اسباب کے اصولوں کو توڑ دے۔ مثلاً مردے کو زندہ کرنے کے علل و اسباب سطحی نہیں ہوتے بلکہ اس کے ماوراء ہوتے ہیں۔ عام طبیعی قوانین کی رو سے لوگوں کے لیے یہ نا قابل تسخیر وتکرار ہوتے ہیں۔

پس معجزات بھی علل و اسباب کے بغیر نہیں ہوتے۔ البتہ معجزات کے اپنے علل و اسباب ہوتے ہیں۔ لہٰذا معجزات کے علل واسباب کو طبیعی قوانین کی عام دفعات میں تلاش کرنا، انکار معجزہ کے مترادف ہے۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے ان واضح اور صریح معجزات کی بھی مادی تاویل وتوجیہ کرنے کی نامدوح کوشش کی ہے۔

ولایت تکوینی: انبیاء اور اولیاء علیہم السلام اظہار حجت و اثبات حق کے لیے باذن خدا عالم خلقت کے تکوینی امور میں تصرف کرتے ہیں۔ وہ مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور شق القمر کرتے ہیں نیز بوقت ضرورت دیگر معجزات رکھتے ہیں جو عالم تخلیق وتکوین سے مربوط ہیں۔ البتہ یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ یہ تصرف اور اختیار اللہ کے تصرف کے مقابلے میں نہیں، بلکہ اللہ کے تصرف و اختیار کے ذیل میں آتا ہے۔ اس قسم کے تصرفات کے ساتھ عام طور پر باذن اللّٰہ کا ذکر آتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ اپنے اولیاء کو علم لدنی عطا کرتا ہے: وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ....

۲۔ انبیاء مردوں کو باذن خدا زندہ کرتے ہیں۔ اس حقیقت کا عقیدہ رکھنا شرک نہیں، بلکہ عین توحید ہے: وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ۔

۳۔ غیر اللہ کے لیے (باذن خدا) علم غیب کا عقیدہ رکھنا کفر و شرک نہیں: وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ ...

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝

۵۰۔ اور اپنے سے پیشتر آنے والی توریت کی تصدیق کرتا ہوں اور جو چیزیں تم پر حرام کر دی گئی تھیں ان میں سے بعض کو تمہارے لیے حلال کرنے آیا ہوں اور میں تمہارے رب کی طرف سے نشانی لے کر تمہارے پاس آیا ہوں، لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝

۵۱۔ بیشک اللہ میرا رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے لہٰذا تم اس کی بندگی کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمُصَدِّقًا: قرآن کریم اس حقیقی توریت کی تصدیق فرما رہا ہے جس کی تعلیم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھی۔ ورنہ مروجہ توریت کے بارے میں تو قرآن کا مؤقف یہ ہے کہ اس میں تحریف واقع ہوئی ہے۔

۲۔ وَلِاُحِلَّ لَکُمۡ: حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں: میں شریعت موسوی میں جزوی ترمیم و تنسیخ کے ساتھ اسی کی تکمیل و تشریح کرنے آیا ہوں۔ اگر میں سچا نبی نہ ہوتا تو کسی نئے دین کی بنیاد رکھتا۔ سابقہ دین کی تائید اس بات کی دلیل ہے کہ میری نبوت بھی سلسلۂ نبوت کی ایک کڑی ہے۔

۳۔ وَجِئۡتُکُمۡ بِاٰیَۃٍ: اپنی دعوت کی حقانیت پر دلیل اور معجزہ بھی رکھتا ہوں۔ لہٰذا خوف خدا رکھنے والوں کے لیے میری اطاعت لازم ہے۔

۴۔ اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیۡ۔ اس جملے میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ عبادت صرف رب کی ہوتی ہے۔ اس لیے ہم نے عبادت کی یہ تعریف کی ہے: کسی کو خالق یا رب تسلیم کر کے اس کی تعظیم کرنا عبادت ہے۔

اہم نکات

۱۔ پہلے اظہار معجزہ پھر اطاعت کی دعوت: ... وَجِئۡتُکُمۡ بِاٰیَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ ۟ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوۡنِ۔

۲۔ عبادت صرف اس کی کرو جو رب ہے: اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیۡ وَرَبُّکُمۡ فَاعۡبُدُوۡہُ ...۔

فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِیۡسٰی مِنۡہُمُ الۡکُفۡرَ قَالَ مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ قَالَ الۡحَوَارِیُّوۡنَ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰہِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ ۚ وَاشۡہَدۡ بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۵۲﴾

۵۲۔ جب عیسیٰ نے محسوس کیا کہ وہ لوگ کفر اختیار کر رہے ہیں تو بولے: اللہ کی راہ میں کون میرا مددگار ہوگا؟ حواریوں نے کہا: ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور آپ گواہ رہیں کہ ہم فرمانبردار ہیں۔

تشریح کلمات

حَوَارِیۡ: (ح و ر) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگردوں کے لیے یہ لفظ مخصوص ہو گیا، جس طرح مدینے کے مسلمانوں کے لیے انصار کا لفظ خصوصی طور پر استعمال ہوا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ: جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے کافرانہ عزائم کا خدشہ محسوس کیا تو ان عزائم کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی طاقت وقوت کو مجتمع کرنا شروع کیا۔ بیعت عقبہ اور بیعت شجرہ میں حضور ختمی مرتبت (ص) نے بھی ایسا ہی طرز عمل اختیار کیا۔ چنانچہ حضرت عیسی علیہ السلام نے اپنی قوم کے برگزیدہ افراد کو آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے اور اس دعوت کو آگے بڑھانے کے لیے آمادہ کرنا شروع کیا اور فرمایا: قَالَ مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ۔ اللہ کی راہ میں کون میرا مددگار ہے؟

تبلیغ دین اور دعوت حق میں جدوجہد کرنے والوں کو اَنۡصَارُ اللّٰہِ کا عظیم مرتبہ حاصل ہوتا ہے جو کسی عابد و مجاہد کو نہیں ملتا۔ اسی لیے علماء کے قلم کی سیاہی شہداء کے خون سے بہتر قرار پائی۔[1] اسی دعوت و تبلیغ کے مقام پر فائز ہونے کی وجہ سے حواریوں کو اَنۡصَارُ اللّٰہِ کہا گیا ہے۔

۲۔ قَالَ الۡحَوَارِیُّوۡنَ: حضرت عیسیٰ (ع) کے حواری اس نصرت کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔

۳۔ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ: یہ انصار اس نکتے سے باخبر ہیں کہ ایثار وقربانی کا جذبہ ایمان کی پختگی سے آ سکتا ہے۔

۴۔ وَاشۡہَدۡ: یہ بھی انصار اللہ کو علم ہے کہ ہر عصر کا رسول اپنی امت کے لیے شاہد ہوتا ہے اور قیامت کے دن گواہی دیتے ہیں کہ ان لوگوں نے حق کی آواز پر لبیک کہا تھا۔

اہم نکات

۱۔ کافرانہ رجحانات کا مقابلہ کرنے کے لیے مددگاروں کی قوت مجتمع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے: مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ۔

۲۔ تبلیغ دین میں جدوجہد کرنے والوں کو اللہ اپنے اَنۡصَار کے لقب سے نوازتا ہے۔ یہ لوگ عام عابدوں اور مجاہدوں سے افضل ہوتے ہیں۔

۳۔ حلقہ اَنۡصَار میں لوگوں کی بھرتی جبری نہیں، بلکہ اختیاری تھی: مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ قَالَ الۡحَوَارِیُّوۡنَ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰہِ ۔

۴۔ حلقہ اَنۡصَار کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:

i۔ ایمان باللہ: اٰمَنَّا بِاللّٰہِ ۔

ii۔ اتباع رسول: وَاتَّبَعۡنَا الرَّسُوۡلَ ۔

----

[1] الفقیہ ۴: ۳۹۹

iii۔ روح تسلیم: وَاشۡهَدۡ بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ۔
iv۔ اللہ کی خاطر نصرت: نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰهِ۔

رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ وَاتَّبَعۡنَا الرَّسُوۡلَ فَاكۡتُبۡنَا مَعَ الشّٰهِدِيۡنَ ﴿۵۳﴾

۵۳۔ ہمارے پروردگار! جو تو نے نازل فرمایا ہم اس پر ایمان لائے اور ہم نے رسول کی پیروی قبول کی، پس ہمارا نام بھی گواہوں کے ساتھ لکھ دے۔

تفسیر آیات

۱۔ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ وَاتَّبَعۡنَا: ایمان یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے اپنے رسول پر جو کچھ نازل ہوا ہے، اس پر یقین کیا جائے، تمام ما انزل اللّٰہ پر ایمان ہو۔ ایمان میں تبعیض اور تفریق قابل تصور نہیں ہے۔ یعنی بعض ما انزل اللّٰہ کا انکار، تمام ما انزل اللّٰہ کا انکار ہے۔

۲۔ وَاتَّبَعۡنَا الرَّسُوۡلَ: تمام ما انزل اللّٰہ پر ایمان کا قدرتی لازمہ اتباع رسول ہے۔ اتباع رسول میں تبعیض و تفریق قابل تصور نہیں ہے کہ جنگ میں اتباع نہ کی جائے اور امن میں پیروکار بن جائے۔

۳۔ فَاكۡتُبۡنَا مَعَ الشّٰهِدِيۡنَ: ہم کو شاہدین کے ساتھ کر دے۔ یعنی ہمارا حشر شاہدین کے ساتھ ہو۔ جیسا کہ سورۃ المائدہ ۸۳ میں فرمایا:

وَاِذَا سَمِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَى الرَّسُوۡلِ تَرٰۤى اَعۡيُنَهُمۡ تَفِيۡضُ مِنَ الدَّمۡعِ مِمَّا عَرَفُوۡا مِنَ الۡحَقِّ ۚ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكۡتُبۡنَا مَعَ الشّٰهِدِيۡنَ ○

اور جب وہ رسول کی طرف نازل ہونے والے کلام کو سنتے ہیں، آپ دیکھتے ہیں کہ معرفت حق کی بدولت ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں، وہ کہتے ہیں: ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے ہیں، پس ہمیں گواہی دینے والوں میں شامل فرما۔

ان دونوں آیتوں میں من الشاھدین نہیں فرمایا بلکہ مع فرمایا۔ لہٰذا یہ دعا الشّٰهِدِيۡنَ میں شامل ہونے کی نہیں ہے بلکہ الشّٰهِدِيۡنَ کے ساتھ محشور ہونے کی دعا ہے۔

سورۃ بقرہ آیت ۱۴۳ میں بات کا تفصیل سے ذکر ہو گیا کہ الشّٰهِدِيۡنَ کون ہیں۔

اہم نکات:

۱۔ جس طرح حواریین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انصار بننے سے شاہدین کے ساتھ محشور ہوں گے،

اسی طرح حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی انصار شاھدین کے ساتھ محشور ہوں گے۔

وَ مَكَرُوۡا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيۡرُ الۡمٰكِرِيۡنَ ۝۵۴

۵۴۔ ان لوگوں نے (عیسیٰ کے قتل کی) تدابیر سوچیں اور اللہ نے (بھی جوابی) تدبیر فرمائی اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔

تشریح کلمات

مَكَرَ: (م ك ر) چال چلنا۔ تدبیر سوچنا۔ راغب لکھتے ہیں: مَکر کا معنی کسی شخص کو حیلے کے ذریعے اس کے مقصد سے منحرف کرنا ہے۔ یہ لفظ عربی میں نیک و بد دونوں قسم کی چال چلنے اور تدبیر سوچنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَكَرُوۡا وَ مَكَرَ اللّٰهُ: یہود کا مکر و سازش، ظلم و نا انصافی پر مبنی تھا اور اللہ کا مکر و تدبیر، عدل و انصاف پر مبنی تھا۔ ظلم اور عدل، دونوں کے لیے ایک تعبیر اختیار کرنا ایک محاورہ ہے۔ جیسے فرمایا:

فَمَنِ اعۡتَدٰی عَلَیۡکُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَیۡہِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰی عَلَیۡکُمۡ ....[1]

لہٰذا جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر اسی طرح زیادتی کرو، جس طرح اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔

ظاہر ہے زیادتی کا اسی طرح جواب دینا زیادتی نہیں ہے۔ اس کے باوجود دونوں کے لیے ایک لفظ استعمال کیا ہے۔

۲۔ وَ اللّٰهُ خَيۡرُ الۡمٰكِرِيۡنَ: اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔ کیونکہ اللہ کی تدبیر، عدل و انصاف پر مبنی ہوتی ہے۔

یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے بارے میں خفیہ تدابیر سوچتے رہے، لیکن اللہ کی خفیہ تدبیر کے مقابلے میں ان کی تدابیر بے نتیجہ رہیں، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قتل نہ ہوئے بلکہ آسمان پر اٹھا لیے گئے.

اہم نکات

۱۔ داعیان حق کو اہل باطل کی سازشوں کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔

اِذۡ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيۡسٰۤى اِنِّىۡ

۵۵۔ جب اللہ نے فرمایا: اے عیسیٰ اب میں تمہاری

---

[1] ۲ بقرہ: ۱۹۴

مُتَوَفِّيۡكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَجَاعِلُ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡكَ فَوۡقَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرۡجِعُكُمۡ فَاَحۡكُمُ بَيۡنَكُمۡ فِيۡمَا كُنۡتُمۡ فِيۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۵۵﴾

مدت پوری کر رہا ہوں اور تمہیں اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور تمہیں کافروں (کی ناپاک سازشوں) سے پاک کرنے والا ہوں اور جو لوگ تمہاری پیروی کریں گے انہیں قیامت تک کفر اختیار کرنے والوں پر بالادست رکھوں گا، پھر تم لوگوں کو میری طرف لوٹ کر آنا ہے، پھر اس وقت میں تمہارے درمیان (ان باتوں کا) فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔

تشریح کلمات

مُتَوَفی: (و ف ی) توفی، توفیہ۔ یہ کلمہ کسی قسم کی کمی کے بغیر پورا پورا دے دینے یا پورا کرنے یا پورا لینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے:

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفۡسٍ ...[1] پھر وہاں ہر شخص کو اس کے کیے کا پورا بدلہ مل جائے گا.

مدت پوری ہونے یا زندگی پوری ہونے، یعنی موت کی آمد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الۡاَنۡفُسَ حِيۡنَ مَوۡتِهَا ...[2] موت کے وقت اللہ روحوں کو قبض کرتا ہے۔

تفسیر آیات

اس آیۂ مبارکہ میں درج ذیل امور زیر بحث آئے ہیں:

الف۔ اِنِّیۡ مُتَوَفِّيۡكَ: کیا اس سے مراد موت ہے؟ اور کیا اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرما رہا ہے کہ میں تجھے موت دینے والا ہوں؟ یا اس سے مراد مدت رسالت و تبلیغ کا پورا کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہا ہے کہ میں اب تمہاری مدت تبلیغ و رسالت پوری کرنے والا ہوں اور تجھے اپنے پاس اٹھانے والا ہوں؟

دوسرا معنی مراد لینے کے حق میں چند ایک قرائن موجود ہیں:

i۔ وَمَكَرُوۡا وَمَكَرَ اللّٰهُ: یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی تدبیر سوچی اور اللہ نے بھی اپنی تدبیر اختیار فرمائی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہودی اپنی سازش میں ناکام ہوئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ رہے۔ اگر متوفی کا مطلب موت لیا جائے تو یہودی تدبیر کو کامیاب ماننا پڑے گا۔ کیونکہ ان کی تدبیر کا ہدف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت تھی۔

---

[1] ۲ بقرہ: ۲۸۱ [2] ۳۹ زمر: ۴۲

ii۔ سورۂ نساء میں فرمایا:

وَمَا قَتَلُوۡہُ وَمَا صَلَبُوۡہُ وَلٰکِنۡ شُبِّہَ لَہُمۡ ... [1] جبکہ فی الحقیقت انہوں نے نہ انہیں قتل کیا اور نہ سولی چڑھایا بلکہ (دوسرے کو) ان کے لیے شبیہ بنا دیا گیا تھا.

iii۔ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ: اور تمہیں اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔ سورۂ نساء میں فرمایا:

وَمَا قَتَلُوۡہُ یَقِیۡنًۢا ۙ﴿۱۵۷﴾ بَلۡ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیۡہِ ...۔ [2] اور انہوں نے مسیح کو یقیناً قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ نے انہیں اپنی طرف اٹھایا...۔

یہاں قتل کی نفی کر کے اٹھانے کا تذکرہ اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں زندہ اٹھایا گیا ہے۔

iv۔ سورۂ نساء میں فرمایا:

وَ اِنۡ مِّنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ اِلَّا لَیُؤۡمِنَنَّ بِہٖ قَبۡلَ مَوۡتِہٖ ... [3] اور اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں جو ان کی موت سے پہلے ان پر ایمان نہ لائے ....

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ علیہ السلام کو موت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک سب اہل کتاب ایمان نہ لے آئیں۔

v۔ احادیث میں بکثرت مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔ بعض مفسرین نے تو کہا ہے کہ یہ احادیث تواتر کی حد تک ہیں۔

vi۔ موت کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ اکثر اوقات لفظ موت استعمال فرماتا ہے۔ مثلاً خود حضور (ص) کے بارے میں فرمایا: اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّہُمۡ مَّیِّتُوۡنَ ﴿۫۳۰﴾ [4] لہٰذا زیر بحث آیت میں مُتَوَفِّیۡکَ کا لفظ موت کو صریحاً بیان نہیں کرتا، بلکہ موت پر دلالت کا صرف احتمال پیدا کرتا ہے جو قرائن سے رفع ہو جاتا ہے۔

vii۔ خود مسیحیوں کے ایک فرقے کا یہ عقیدہ تھا کہ مسیح علیہ السلام قتل نہیں ہوئے، بلکہ آسمان پر زندہ اٹھا لیے گئے تھے۔

ب۔ مُطَہِّرُکَ مِنَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: کافروں کی ناپاک تہمتوں سے تجھے پاک کرنے والا ہوں کہ آیندہ یہ کافر آپ کی قدسیت کے خلاف گندی زبان استعمال نہیں کر پائیں گے۔

ج۔ وَجَاعِلُ الَّذِیۡنَ ....: مسیح کے ماننے والوں کو یہودیوں پر غالب رکھے گا۔ قرآن کے اس دعوے کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے مقصد میں ناکام دیکھنا چاہتے تھے تاکہ ہمیشہ کے لیے یہودیت ہی کا بول بالا رہے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل

---

[1] ۴ نساء: ۱۵۷ [2] ۴ نساء: ۱۵۷۔ ۱۵۸ [3] ۴ نساء: ۱۵۹

[4] ۳۹ زمر: ۳۰۔ (اے رسول) یقیناً آپ کو بھی انتقال کرنا ہے اور انہیں بھی یقیناً مرنا ہے۔

کرنا چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ یہ وعدہ فرما رہا ہے کہ مسیح علیہ السلام کے ماننے والوں کا بول بالا رہے گا۔ اس وعدے میں عصر مسیح علیہ السلام میں مسیحیت کے حقیقی پیروکار، اسلامی نقطہ نگاہ کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کو رسول اللہ ماننے والے اور عصر ظہور و نزول مسیح علیہ السلام میں آپ علیہ السلام کو ماننے والے سب شامل ہیں۔

اہم نکات

۱۔ یہودی عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے میں ناکام رہے اور وہ زندہ آسمان پر اٹھا لیے گئے: وَرَافِعُكَ اِلَيَّ ....۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾

۵۶۔ پس جنہوں نے کفر اختیار کیا ان کو دنیا و آخرت میں سخت عذاب دوں گا اور ان کا کوئی فریادرس نہ ہو گا۔

تفسیر آیات

اسی وعدۂ تفوق کا تسلسل ہے۔ کفار سے مراد یہودی ہیں۔ جب مسیح (ع) کے ماننے والے غالب ہو جائیں گے تو مسیح (ع) کا انکار کرنے والے دنیا میں بھی ذلیل رہیں گے اور اخروی زندگی میں بھی عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾

۵۷۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال بجا لائے، اللہ انہیں ان کا پورا صلہ دے گا اور اللہ ظالموں سے ہرگز محبت نہیں کرتا۔

تفسیر آیات

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کے لیے بشارت ہے۔ لیکن یہ بشارت تمام پیروکاروں کے لیے نہیں، بلکہ ایمان کے ساتھ عمل صالح بجا لانے والوں کے لیے مخصوص ہے۔ اسی اختصاص کی وجہ سے آیت کے آخر میں فرمایا: وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۔ یہاں پر بھی ظالمین سے مراد یہودی ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نسب تک کے منکر ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اللہ انہی لوگوں کو پورا صلہ دے گا جو ایمان کے ساتھ ساتھ عمل صالح بھی بجا لائیں۔

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾

۵۸۔ یہ اللہ کی نشانیاں اور حکمت بھری نصیحتیں ہیں جو ہم آپ کو پڑھ کر سنا رہے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ مِنَ الْاٰيٰتِ: حضرت مسیح علیہ السلام کے حالات و واقعات کو حقیقت کے مطابق بیان کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قرآن اللہ کی طرف سے ہے۔ کیونکہ عصر رسول (ص) میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تاریخ سے آگاہی کا کوئی وسیلہ موجود نہیں تھا اور عرب قوم تو ایک ناخواندہ قوم تھی۔ جزیرہ نمائے عرب کبھی علمی مرکز نہیں رہا تھا، لہٰذا ان کے واقعات کا صحیح علم صرف وحی کے ذریعے سے ہی ممکن تھا۔

۲۔ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ: الذِّكْرِ سے مراد قرآن مجید ہو سکتا ہے، جو حکمت و حقائق پر مشتمل ہے۔

اہم نکات

۱۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعات کو بیان کرنا وحی خداوندی کی بدولت ہی ممکن ہوا، جو ایک معجزہ ہے۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۵۹﴾

۵۹۔ بے شک اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے کہ اس نے پہلے اسے مٹی سے خلق کیا، پھر اسے حکم دیا: ہو جا اور وہ ہو گیا۔

تفسیر آیات

یہ آیت نصارائے نجران کے وفد کے بارے میں نازل ہوئی۔ نجران کے عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللّٰہ ہونے کی بنیادی دلیل یہ پیش کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش عام طریقوں سے مختلف اور بغیر باپ کے ہوئی ہے، لہٰذا وہ ما فوق البشر اور ابن اللّٰہ ہیں۔

اس آیت میں یہ جواب دیا گیا کہ عام طریقوں کے خلاف بغیر باپ کے پیدا ہونا، اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ ما فوق البشر ہیں۔ آدم (ع) کی مثال موجود ہے۔ وہ بھی ماں باپ کے بغیر پیدا ہوئے، پھر بھی وہ بشر اور اللہ کی مخلوق ہیں۔ عیسائیوں کی دلیل کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کے ابن اللّٰہ ہونے کے لیے دو باتیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بیشتر موجود ہیں:

i۔ آدم علیہ السلام ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے، جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف باپ کے بغیر پیدا ہوئے۔

ii۔ آدم علیہ السلام کسی جاندار سے پیدا نہیں ہوئے، بلکہ مٹی سے پیدا ہوئے، جو بے جان ہے۔ جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت مریم (س) کے بطن سے پیدا ہوئے۔

یہ استدلال یہود و نصاریٰ دونوں کے خلاف ایک تیر دو ہدف تھا۔ یہودیوں کے خلاف اس طرح کہ بغیر باپ کے پیدا ہونا کوئی ناممکن امر نہیں۔ خدا کے لیے بے جان چیزوں سے انسان پیدا کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا ایک انسان سے۔ نصاریٰ کے خلاف یوں کہ بغیر باپ کے پیدا ہونے سے خدا کا بیٹا ہونا لازم نہیں آتا، جیسا کہ آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا ہونے کے باجود اللہ کا بیٹا نہیں کہلائے۔

اہم نکات

۱۔ باپ کے بغیر بچہ پیدا کرنا اللہ کے لیے اتنا ہی آسان ہے، جتنا ماں باپ دونوں کے بغیر مٹی سے پیدا کرنا۔

اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ فَلَا تَکُنۡ مِّنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ ﴿۶۰﴾	۶۰۔ حق آپ کے رب کی طرف سے ہے پس آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔

تفسیر آیات

یہاں خطاب اگرچہ رسول کریم (ص) سے ہے، تاہم اس کلام کے حقیقی مخاطب افراد امت ہیں اور ان کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ حق وہ ہے جو اللہ کی جانب سے ہو۔ اللہ ہی حق کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ اللہ کے علاوہ دوسرے حق کے ساتھ تو ہو سکتے ہیں، لیکن حق کا منبع و سرچشمہ نہیں بن سکتے۔ حق کا سرچشمہ صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ لہٰذا جو بات سرچشمۂ حق کی طرف سے ہو (یعنی آپ (ص) کی رسالت) اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ حق کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے۔ پس امور خداوندی میں شک کرنا حق میں شک کرنے کے مترادف ہے، جس کی گنجائش نہیں۔

فَمَنۡ حَآجَّکَ فِیۡہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الۡعِلۡمِ فَقُلۡ تَعَالَوۡا نَدۡعُ اَبۡنَآءَنَا وَ اَبۡنَآءَکُمۡ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَکُمۡ وَ اَنۡفُسَنَا وَ اَنۡفُسَکُمۡ ۟ ثُمَّ نَبۡتَہِلۡ فَنَجۡعَلۡ لَّعۡنَتَ اللّٰہِ عَلَی الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۶۱﴾

۶۱۔ آپ کے پاس علم آجانے کے بعد بھی اگر یہ لوگ (عیسیٰ کے بارے میں) آپ سے جھگڑا کریں تو آپ کہدیں: آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی بیٹیوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنی بیٹیوں کو بلاؤ، ہم اپنے نفسوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنے نفسوں کو بلاؤ، پھر دونوں فریق اللہ سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

تشریح کلمات

مباھلہ: (ب ہ ل) کسی چیز کو دیکھ بھال کے بغیر اپنی حالت پر چھوڑ دینا۔ نفرت کرنا۔ اللہ کی رحمت سے دور اپنے حال پر چھوڑ دینے کے لیے بد دعا کرنا۔ الابتہال عاجزی سے دعا کرنا۔

تفسیر آیات

یہ آیت تاریخ اسلام کے ایک نہایت اہم واقعے کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو واقعہ مباہلہ کے نام سے مشہور ہے اور داعی اسلام کی حقانیت کی ایک واضح اور ناقابل تردید دلیل ہے۔

فَمَنۡ حَآجَّکَ فِیۡہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الۡعِلۡمِ: علم آجانے کے بعد بھی جو لوگ آپ (ص) سے جھگڑا کریں۔ فِیۡہِ، یعنی فی الحق۔ دلیل و برہان اور قطعی و یقینی دلیل قائم ہونے کے بعد بھی اگر نصارائے نجران جان بوجھ کر اپنی ہٹ دھرمی پر ڈٹے رہیں تو نجران کے وفد کے عقیدے کو باطل ثابت کرنے اور ان کے مذہب کی قلعی کھولنے کا واحد حل یہ ہے کہ مباہلہ اور ملاعنہ کر کے جھوٹوں پر عذاب کے نزول کی دعا کی جائے۔ پس وہ دعا کریں یا نہ کریں، دونوں صورتوں میں اسلام کی حقانیت اور نصرانیت کی گمراہی ثابت ہو جائے گی۔

فَنَجۡعَلۡ لَّعۡنَتَ اللّٰہِ عَلَی الۡکٰذِبِیۡنَ: ہم قرار دیں کہ جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ہو۔ یعنی نَجۡعَلۡ، نَبۡتَہِلۡ

کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے کہ مباہلے کے نتیجے میں اللہ کی لعنت کا مرحلہ آئے گا۔ یہ نہیں فرمایا: نَبۡتَهِل اَن یَجۡعَل۔ یعنی ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ لعنت کرے۔ دوسرے لفظوں میں لعنت کا سوال نہیں ہو رہا ہے، بلکہ مباہلے کے بعد لعنت کے خود بخود وقوع اور قرار پانے کی بات ہو رہی ہے۔ کیونکہ سوال میں قبولیت کا سوال پیدا ہوتا ہے، لیکن نَجۡعَلۡ میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے داعیٔ اسلام کے مرتبۂ ایقان و اطمینان کا اندازہ ہوتا ہے۔

عَلَی الۡکٰذِبِیۡنَ: جھوٹوں پر لعنت ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مباہلے کے فریقین اپنا اپنا دعویٰ رکھتے ہیں، جس میں ایک فریق صادق اور دوسرا کاذب ہوگا۔ نَجۡعَلۡ صیغہ جمع سے معلوم ہوا کہ حضور (ص) کے ساتھ دیگر افراد بھی ہیں، جو اس دعویٰ میں شریک اور دعوائے حقانیت میں حصہ دار ہیں۔ یہ ان ہستیوں کے لیے بڑی فضیلت ہے جو اس مباہلے میں رسالت مآب (ص) کے ساتھ شریک تھیں۔

اگرچہ اَبۡنَآءَنَا، نِسَآءَنَا اور اَنۡفُسَنَا میں جمع ہونے کی وجہ سے مفہوم کے اعتبار سے بہت وسعت اور بڑی گنجائش تھی کہ حضور (ص) اصحاب و انصار بلکہ خود بنی ہاشم کے بہت سے بچوں کو اَبۡنَآءَنَا کے تحت اور جلیل القدر خواتین کو نِسَآءَنَا کے تحت اور بہت سی قدآور شخصیات کو اَنۡفُسَنَا کے تحت اس تاریخ ساز مباہلے میں شریک فرماتے، لیکن اَبۡنَآءَنَا میں صرف حسنین علیہما السلام، نِسَآءَنَا میں صرف حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اور اَنۡفُسَنَا میں صرف حضرت علی علیہ السلام کو شامل فرمایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت اسلام کا ان ہستیوں کے ساتھ ایک خاص ربط ہے اور یہی ہستیاں ارکان دین میں شامل ہیں۔

نہایت قابل توجہ امر یہ ہے کہ زمخشری نے اس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نِسَآءَنَا اور اَنۡفُسَنَا میں تو ایک ایک ہستی حضرت فاطمہ (س) اور حضرت علی (ع) پر اکتفا کیا، لیکن اَبۡنَآءَنَا میں ایک ہستی پر اکتفا نہیں کیا۔ کیونکہ نساء اور انفس میں چونکہ حضرت فاطمہ (س) اور علی (ع) کی کوئی نظیر موجود نہیں تھی، لہٰذا ان کے وجود کے بعد کسی اور کے وجود کی گنجائش باقی نہیں رہتی، لیکن حسنین (ع) میں سے کسی ایک کے وجود کی صورت میں بھی دوسرے کا وجود ضروری تھا، لہٰذا ان دونوں ہستیوں کو بلایا۔[1]

اگر ان افراد کے علاوہ کسی اور فرد کے لیے کوئی گنجائش ہوتی تو حضور (ص) نجرانی وفد کی تعداد کے برابر افراد مباہلے میں شامل کر لیتے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ نجران کا وفد چودہ افراد پر مشتمل تھا۔

واقعہ مباہلہ: فتح مکہ کے بعد غلبہ اسلام کا دور شروع ہوا اور اسلام نے جزیرہ نمائے عرب سے باہر پھیلنا شروع کیا۔ چنانچہ ہرقل روم، کسرائے ایران، مقوقس، حارث شاہ حیرہ، شاہ یمن اور شاہ حبشہ تک اسلام کی دعوت پہنچ گئی۔ نجران کے مسیحی ان حالات سے نہایت پریشان تھے۔ اتنے میں ان کے پاس رسول اللہ (ص) کی طرف سے دعوت اسلام پہنچ گئی۔ نجران کے مسیحی پادریوں میں بے چینی پھیل گئی۔ ان کے ارباب حل

---

[1] زمخشری، الکشاف۔

وعقد اور سرداران قبائل ایک جگہ جمع ہو گئے اور اسلام سے بچنے کی تجاویز زیر غور آئیں۔ اس گرما گرم بحث میں کچھ لوگ اسلام کے حق میں مؤقف رکھتے تھے، لیکن اکثر لوگ اسلام کے خلاف سخت مؤقف رکھتے تھے۔ آخر میں اپنے رہنماؤں السید اور العاقب کی رائے معلوم کی تو ان دونوں نے کہا: دین محمد (ص) کی حقیقت معلوم ہونے تک اپنے دین پر قائم رہیں۔ ہم خود یثرب جا کر قریب سے دیکھتے ہیں کہ محمد (ص) کیا دین لائے ہیں۔ چنانچہ السید اور العاقب اپنے مذہبی پیشواء ابو حاتم کی معیت میں چودہ رکنی وفد اور ستر افراد کے ہمراہ یثرب کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ لوگ نہایت نفیس لباس زیب تن کیے، نہایت تزک و احتشام کے ساتھ شہر مدینہ میں داخل ہوئے۔ اہل مدینہ کا کہنا ہے:

ما رأينا وفداً اجمل من هؤلاء — ہم نے ان سے زیبا ترین وفد نہیں دیکھا تھا۔

چنانچہ جب وہ مسجد نبوی میں داخل ہوئے تو ان کی عبادت کا وقت آ گیا۔ ناقوس بجا اور انہوں نے مشرق کی طرف رخ کر کے عبادت شروع کر دی۔ لوگوں نے روکنا چاہا، لیکن حضور (ص) نے منع فرمایا۔ یہ آزادئ عقیدہ وعمل کا بے مثال نمونہ ہے کہ مسجد نبوی (ص) کی چار دیواری کے اندر بھی غیر مسلموں کو اپنے مذہبی عقائد کا اظہار کرنے اور اعمال بجا لانے کی آزادی دی گئی، جب کہ یہ لوگ رسالت محمدی (ص) کے منکر تھے۔ عقیدے کے معمولی اختلاف پر دیگر مسلمانوں کو واجب القتل قرار دینے والے دہشت گردوں کی پالیسی اور رسول رحمت (ص) کی پالیسی میں کس قدر فاصلہ نظر آتا ہے۔

انہیں تین دن تک مہلت دے دی گئی۔ تین روز کے بعد حضور (ص) نے انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تو انہوں نے کہا: مسیح علیہ السلام کے بعد آنے والے نبی سے متعلق توریت میں موجود تمام اوصاف آپ (ص) کے اندر موجود ہیں، سوائے ایک صفت کے، جو سب سے اہم ہے۔ وہ یہ کہ آپ مسیح علیہ السلام کو برا بھلا کہتے ہیں، ان کی تکذیب کرتے ہیں، انہیں بندۂ خدا کہتے ہیں۔ حضور (ص) نے فرمایا: میں مسیح علیہ السلام کی تصدیق کرتا ہوں، ان پر ایمان لاتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ وہ نبی مرسل اور عبد خدا تھے۔

وفد: کیا وہ مردوں کو زندہ نہیں کرتے تھے، مادر زاد اندھوں کو بینائی نہیں دیتے تھے اور برص کے مریضوں کو شفا نہیں دیتے تھے؟

حضور (ص): یہ سب باذن خدا انجام دیتے تھے۔

وفد: مسیح بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ بھلا کوئی بندہ بغیر باپ کے پیدا ہوتا ہے؟

حضور (ص): اللہ کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال آدم علیہ السلام کی طرح ہے کہ اسے مٹی سے خلق فرمایا پھر حکم دیا: بن جاؤ، وہ بن گیا۔

نجران کا وفد اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہا۔ انہوں نے دلیل و برہان کو قبول نہیں کیا۔

اس وقت حضور (ص) پر غشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور وحی نازل ہوئی:

فَمَنۡ حَآجَّكَ فِيۡهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ فَقُلۡ تَعَالَوۡا نَدۡعُ اَبۡنَآءَنَا وَاَبۡنَآءَكُمۡ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمۡ وَاَنۡفُسَنَا وَاَنۡفُسَكُمۡ ثُمَّ نَبۡتَهِلۡ فَنَجۡعَلۡ لَّعۡنَتَ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰذِبِيۡنَ ○

حضور (ص) نے یہ آیت پڑھ کر حاضرین کو سنائی اور فرمایا: اگر تم اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے تو اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ تمہارے ساتھ مباہلہ کروں۔

وفد والے اپنے ٹھکانے پر واپس چلے گئے اور آپس میں کہنے لگے کہ محمد (ص) نے ہمیں ایک فیصلہ کن دوراہے پر کھڑا کر دیا ہے۔ کل دیکھو وہ کس قسم کے لوگوں کے ساتھ مباہلے کے لیے نکلتے ہیں۔ اپنے سارے پیروکاروں کے ساتھ؟ یا اپنے بڑے اصحاب کے ساتھ؟ یا اپنے قریبی رشتہ داروں اور تھوڑے دیندار لوگوں کے ساتھ؟ اگر یہ بڑی جمعیت کی معیت میں جاہ وجلالت کے ساتھ شاہانہ انداز میں نکلتے ہیں تو کامیابی تمہاری ہے۔ اگر تواضع کے ساتھ چند ہی لوگوں کے ساتھ نکلتے ہیں تو یہ انبیاء کی سیرت اور ان کے مباہلے کا انداز ہے۔ اس صورت میں تمہیں مباہلے سے گریز کرنا چاہیے۔

دوسری طرف رات بھر مسلمان آپس میں قیاس آرائیاں کرتے رہے کہ کل رسول خدا (ص) اَبۡنَآءَنَا، نِسَآءَنَا اور اَنۡفُسَنَا میں کن کن ہستیوں کو شامل کریں گے؟

۲۴ ذی الحجۃ کی صبح طلوع ہوئی اور حق و باطل میں ہمیشہ کے لیے فیصلہ کن دن آ گیا۔ رسول خدا (ص) نے حکم دیا کہ دو درختوں کو کاٹ کر ان کی درمیانی جگہ کو جھاڑو دے کر صاف کیا جائے۔ صبح ہوئی تو ان دونوں درختوں پر ایک سیاہ کساء (چادر) خیمے کی شکل میں ڈال دی گئی۔

نجرانی وفد میں السید اور العاقب اپنے دونوں بیٹوں کی معیت میں نکلے۔ وفد کے دیگر ارکان یعنی قبائل کے سردار بھی بہترین لباس زیب تن کیے نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ہمراہ تھے۔

دوسری طرف رسول اللہ (ص) حسنین (ع) کا ہاتھ پکڑے نکلے۔ پیچھے حضرت فاطمہ (س) اور ان کے پیچھے علی (ع) تھے۔ اس کساء کے نیچے پانچوں تن تشریف فرما ہوئے اور حضور (ص) نے فرمایا: میں دعا کروں تو تم آمین کہنا۔ اس کے بعد حضور (ص) نے السید اور العاقب کو مباہلے کی دعوت دی۔ ان دونوں نے عرض کی: آپ (ص) کن لوگوں کو ساتھ لے کر ہمارے ساتھ مباہلہ کر رہے ہیں؟ حضور (ص) نے فرمایا: باھلکم بخیر اھل الارض۔ میں اہل زمین میں سب سے افضل لوگوں کو ساتھ لے کر تمہارے ساتھ مباہلہ کر رہا ہوں۔

یہ دونوں اپنے اسقف (پادری) کے پاس لوٹ گئے اور اس سے پوچھا: آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟ پادری نے کہا: انی لأری وجوھاً لو سئل اللّٰہ بھا ان یزیل جبلاً من مکانہ لازالہ۔ میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ شخص (محمدؐ) ان کو وسیلہ بنا کر خدا سے دعا کرے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو ضرور

ہٹ جائے گا۔ خبردار ان کے ساتھ ہرگز مباہلہ نہ کرنا، ورنہ روئے زمین پر قیامت تک کوئی نصرانی نہیں رہے گا۔ چنانچہ وہ مباہلہ کی جرأت نہ کر سکے اور جزیہ دینے کا معاہدہ کر کے واپس چلے گئے۔[1]

محدثین، مفسرین، مورخین اور سیرت نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضور (ص) نے مباہلے کے موقع پر حسنین، فاطمہ اور علی علیہم السلام کو ساتھ لیا۔ چنانچہ چوتھی صدی کے مقتدر عالم ابوبکر جصاص لکھتے ہیں:

رواة السير و نقلة الاثر لم يختلفوا فی ان النبی صلی اللّٰہ علیہ (و آله) وسلم اخذ بيد الحسن و الحسين و علی و فاطمة رضی اللّٰہ عنهم ثم دعا النصاری الذين حاجوه الی المباهلة۔[2]

سیرت نگاروں اور مورخین میں سے کسی نے بھی اس بات میں اختلاف نہیں کیا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ (و آلہ) وسلم نے حسن، حسین، فاطمہ اور علی رضی اللہ عنہم کا ہاتھ پکڑ کر نصاریٰ کو مباہلے کی دعوت دی۔

ہم ذیل میں چند اصحاب کا ذکر کرتے ہیں۔ جنہوں نے مباہلے میں صرف اہل البیت (ع) کی شرکت کا ذکر کیا ہے۔

i۔ سعد بن ابی وقاص۔ ان کی روایت صحیح مسلم ۷: ۱۲۰ طبع مصر۔ مسند احمد بن حنبل ۱: ۱۸۵ اور المستدرك للحاکم ۳: ۱۵۰ میں ملاحظہ ہو۔

ii۔ عبد اللّٰہ بن عباس۔ ملاحظہ ہو معرفة علوم الحديث للحاکم ص ۵۰۔ الدر المنثور۔

iii۔ جابر بن عبد اللّٰہ انصاری۔ ملاحظہ ہو دلائل النبوۃ ص ۲۹۷ اور اسباب النزول ص ۷۴۔

iv۔ سلمة بن یسوع عن ابیه عن جده ۔ دیکھیے البداية و النهاية ۵: ۵۲۔

سید ابن طاؤس علیہ الرحمہ اپنی کتاب سعد السعود میں لکھتے ہیں:

میں نے کتاب مانزل من القرآن فی النبی و اهل بیته تالیف محمد بن العباس بن مروان میں دیکھا کہ انہوں نے حدیث مباہلہ پچاس سے زائد صحابیوں سے روایت کی ہے۔ ان میں سے حسن بن علی (ع)، عثمان بن عفان، سعد بن ابی وقاص، بکر بن سمال، طلحه، زبیر، عبد الرحمن بن عوف، عبد اللّٰہ بن عباس، ابو رافع، جابر بن عبد اللّٰہ، براء بن عازب اور انس بن مالك قابل ذکر ہیں۔

علیؑ نفس رسول (ص): بعض اردو مترجمین نے اس آیت میں اَنۡفُسَنَا کا یہ ترجمہ کیا ہے: ''آؤ ہم

---

[1] سید ابن طاؤسؒ کی الاقبال [2] احکام القرآن ۲: ۱۵

اورتم خود بھی آ جائیں۔" جب کہ آیت میں "آ جانے" کا نہیں بلکہ "بلانے" کا ذکر ہے اور انسان اپنے آپ کو بلایا نہیں کرتا۔ اَنۡفُسَنَا کی جگہ حضور (ص) نے حضرت علی علیہ السلام کو بلایا ہے، جس پر سب کا اجماع ہے۔ لہٰذا حضرت علی علیہ السلام نفس رسول (ص) کے مقام پر فائز ہیں۔

اگر نفس سے مراد خود رسول اللہ (ص) ہیں تو حسنین (ع) اور حضرت زہراء (ع) کو ساتھ لینے سے حکم خدا کی تعمیل ہو جاتی اور حضرت علی (ص) کو ساتھ لینے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہتی۔

واحدی نے اسباب النزول صفحہ ۵۷ میں شعبی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اَبۡنَآءَنَا میں حسن و حسین علیہما السلام ہیں، نِسَآءَنَا سے مراد فاطمہ (س) ہیں اور اَنۡفُسَنَا سے مراد علی علیہ السلام ہیں۔

اور حضرت علی علیہ السلام نے خود شوریٰ کے موقع پر استدلال میں فرمایا:

اَنۡشُدُکُمۡ اللّٰہَ ھَلۡ فِیۡکُمۡ اَحَدٌ جَعَلَہُ اللّٰہُ نَفۡسَ النَّبِیِّ وَ اَبۡنَاءَ ہُ اَبۡنَاءَ ہُ وَ نِسَاءَہُ نِسَاءَہُ غَیۡرِیۡ قَالُوۡا:اَللّٰھُمَّ لَا۔[1]

بخدا تم یہ بتاؤ کیا میرے علاوہ تم میں کوئی ایسا فرد موجود ہے جسے اللہ نے نفس نبی قرار دیا ہو؟ جس کے بیٹوں کو رسول خدا (ص) کے بیٹے اور جس کی خاتون کو رسول خدا (ص) کی بیٹی قرار دیا ہو؟ لوگوں نے کہا: نہیں۔

اس روایت سے یہ توجیہ بھی غلط ثابت ہوگئی کہ حضرت علی (ع) اَبۡنَآءَنَا میں شامل ہیں۔ جیسا کہ مولانا اشرف علی تھانوی کی کوشش ہے۔[2]

تفسیر المنار نے علامہ محمد عبدہ کا یہ قول اپنے صفحات پر ثبت کر کے محدثین خاص کر ارباب صحاح کے علمی مقام کو مخدوش کر دیا ہے:

> مباہلے میں حضور (ص) نے صرف علی، فاطمہ اور حسنین (علیہم السلام) کو ساتھ لیا۔ یہ متفقہ روایت ہے مگر شیعوں کی عادت یہ رہی ہے کہ انہوں نے اپنے خاص مقصد کے لیے اس کو ہوا دی ہے۔ یہاں تک کہ بہت سے اہل سنت میں بھی یہ بات رائج ہوگئی اور اس حدیث کے گھڑنے والوں نے آیت کی تطبیق کا خیال بھی نہیں رکھا۔ کیونکہ عربی محاورے میں نساء کہکر اپنی بیٹی مراد نہیں لی جاتی۔[3]

جواب یہ ہے:

۱۔ کیا ارباب صحاح، مثلاً مسلم اور ترمذی، محدثین، مورخین اور مفسرین کے پاس کوئی معیار نہیں ہے کہ وہ ایک من گھڑت روایت پر متفق ہوجاتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کے بعد کسی صحیح محدث، راوی اور جرح وتعدیل کرنے والے پر وثوق نہیں رہتا۔

---

[1] الصواعق المحرقة [2] بیان القرآن ۱: ۲۰۰ [3] المنار ۳: ۳۲۲

۲۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ نساء کا مفہوم بیٹی ہے اور روایات کا مفہوم بھی یہ نہیں ہے، بلکہ روایات اس بات کو بالاتفاق بیان کرتی ہیں کہ حضور (ص) نے عملی طور پر مباہلے کے لیے نِسَآءَنَا کی جگہ صرف حضرت فاطمہ (س) کو اور اَنۡفُسَنَا کی جگہ حضرت علی علیہ السلام کو ساتھ لیا۔ لہٰذا یہ حضرات ان الفاظ کے مصداق قرار پائے، نہ کہ مفہوم۔ ورنہ مفہوم کے اعتبار سے ان الفاظ میں بڑی وسعت پائی جاتی ہے۔ اہل بیت علیہم السلام کی فضیلت اس بات سے زیادہ اجاگر ہو جاتی ہے کہ مفہوم و معنی میں گنجائش کے باوجود ان کے علاوہ کسی کو مباہلے میں شریک نہیں کیا گیا۔

بعض اہل تحقیق نے خوب کہا ہے: قرآنی استعمالات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں نسآء کا لفظ ابنآء کے ساتھ ذکر ہوا ہے، وہاں نسآء کا مفہوم بیٹیاں ہوتی ہیں۔ چنانچہ قرآن میں متعدد مقامات پر یہ استعمال موجود ہے: یُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَکُمۡ وَ یَسۡتَحۡیُوۡنَ نِسَآءَکُمۡ ....[1] تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔ ملاحظہ ہوں آیات: الاعراف: ۱۲۷۔ ابراھیم: ۶۔ قصص: ۴۔ غافر: ۲۵۔ آیہ مباہلہ میں بھی نسآء کا لفظ ابنآء کے ساتھ ہے، لہٰذا یہاں نسآء سے مراد بیٹیاں ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ (ص) کو یہ حکم تھا کہ اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر مباہلہ کریں۔

اہم نکات

۱۔ مباہلے کی باری تب آتی ہے جب واضح عقلی دلائل سے انکار کیا جائے۔
۲۔ مباہلے کے افراد کا تعین اللہ نے کیا: فَقُلۡ تَعَالَوۡا نَدۡعُ اَبۡنَآءَنَا ....۔
۳۔ مورخین کا اتفاق ہے کہ اَبۡنَآءَنَا سے مراد حسنین علیہما السلام اور نِسَآءَنَا سے مراد فاطمہ سلام اللہ علیہا اور اَنۡفُسَنَا سے مراد علی علیہ السلام ہیں۔ واضح ہو گیا کہ آل رسول (ص) کون ہیں۔
۴۔ حق و باطل کے اس عظیم معرکے میں یہی پانچ ہستیاں شامل ہوئیں۔ ثابت ہوا کہ دعوت اسلام کی کامیابی ان کے بغیر ممکن نہیں۔
۵۔ آج بھی داعیان حق کو انہی کے دامن سے متمسک رہنا چاہیے۔
۶۔ جو ان کے منکر ہیں، وہ دعوت رسول (ص) سے ناآشنا ہیں۔
۷۔ یہ صادقین کا گروہ تھا اور ان کے مقابلے پر آنے والے کاذبین تھے۔
۸۔ ان عظیم ہستیوں کی ہم پلہ مزید ہستیاں موجود نہیں تھیں، ورنہ مباہلے کے دن رسول (ص) انہیں بھی لے کر نکلتے۔

---

[1] ۲ بقرۃ: ۴۹

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡقَصَصُ الۡحَقُّ ۚ وَ مَا مِنۡ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۶۲﴾	۶۲۔ یقیناً یہ برحق واقعات ہیں اور بے شک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ ہی کی ذات غالب آنے والی اور باحکمت ہے۔
فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِیۡمٌۢ بِالۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۶۳﴾	۶۳۔ اگر یہ لوگ (قبول حق سے) پھر جائیں تو اللہ مفسدوں کو یقیناً خوب جانتا ہے۔

تشریح کلمات

الۡقَصَصُ: (ق ص ص) قصہ۔ نشان قدم پر چلنا۔ پیچھا کرنا۔ واقعات کو قصہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ قصے میں صاحب کردار کا پیچھا کیا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ الۡقَصَصُ الۡحَقُّ: گزشتہ آیات میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں، وہ حضرت عیسیٰ (ع) کی حقیقی اور صحیح سرگزشت ہے کہ حضرت عیسیٰ (ع) عبد اور رسول خدا ہیں۔ وہ حضرت آدم (ع) کی طرح بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ وہ خدا یا خدا کا بیٹا نہیں۔

۲۔ وَ مَا مِنۡ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ: اور حق و حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ عیسی و غیر عیسی، معبود کی منزل پر فائز نہیں ہو سکتے۔

۳۔ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ: اس نے اپنی قوت و حکمت کی بنا پر عیسیٰ کو باپ کے بغیر پیدا کیا ہے۔

۴۔ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا: اس آیت میں حضورؐ کی مزید تقویت کے لیے ارشاد فرمایا: اگر یہ لوگ آپ کا مقابلہ کرنے سے منہ موڑ لیں یا آپ (ص) پر ایمان لانے سے انکار کر دیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپ (ص) کی حقانیت ان پر واضح نہیں ہوئی، بلکہ یہ لوگ مفسد ہیں، جس کی وجہ سے یہ ایمان نہیں لاتے۔

اہم نکات

۱۔ مفسد دانشور ہمیشہ اپنے مفادات سے متصادم حقائق سے انکار کرتے ہیں۔

قُلۡ یٰۤاَهۡلَ الۡکِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمۡ اَلَّا	۶۴۔ کہدیجیے: اے اہل کتاب! اس کلمے کی طرف آ جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک

نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَ لَا نُشۡرِکَ بِہٖ شَیۡئًا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُوۡلُوا اشۡہَدُوۡا بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۶۴﴾	ہے، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ بنائیں اور اللہ کے سوا آپس میں ایک دوسرے کو اپنا رب نہ بنائیں، پس اگر نہ مانیں تو ان سے کہدیجیے: گواہ رہو ہم تو مسلم ہیں۔

تفسیر آیات

یہاں روئے سخن عام اہل کتاب کی طرف ہے۔ اب آسمانی ادیان کی مشترکہ اور یکساں اقدار کی حفاظت کی دعوت ہے۔ وہ مشترکہ اقدار جو تمام ادیان عالم کی روح ہیں اور انسانی فطری تقاضوں کے عین مطابق ہیں:

۱۔ اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰہَ: یعنی ''ہم غیر اللہ کی عبادت نہ کریں'' اور مسیح و روح القدس وغیرہ کی پرستش ترک کر کے صرف خدائے واحد کی عبودیت کے پرچم تلے جمع ہو جائیں۔ کیونکہ توحید تمام ادیان کا نقطۂ اتفاق ہے۔ چنانچہ توریت، توحید کی تعلیمات اور شرک کی ممانعت سے بھری پڑی ہے اور انجیل میں بھی توحید کی تعلیم پائی جاتی ہے۔ دیگر ادیان میں انحراف اور غیر اللہ کی پرستش عام ہونے کے بعد اب توحید پرستی صرف دین اسلام کا خاصہ ہے۔

۲۔ وَ لَا نُشۡرِکَ بِہٖ شَیۡئًا: یہ دین فطرت اور دین توحید کی طرف رجوع کی دعوت ہے۔ ان لوگوں کے لیے دعوت فکر ہے، جو اللہ کو ثالث ثلاثہ قرار دیتے ہیں یا اللہ کو عیسیٰ (ع)، عزیر (ع) یا فرشتوں کا باپ بناتے ہیں۔

۳۔ وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ: آپس میں اپنے جیسے انسانوں کو رب نہ بنائیں۔ کسی مخلوق کی مطلق العنانی کو قبول کرنا، اس مخلوق کی ربوبیت اختیار کرنے کے مترادف ہے۔ اپنی ہم نوع مخلوق کو رب تسلیم کرنا، احترام آدمیت اور انسانی اقدار کے منافی ہے۔

غیر اسلامی نظاموں میں انسانوں پر انسانوں کی بالادستی ہوتی ہے۔ خواہ وہ نظام آمریت ہو یا نظام جمہوریت۔ سب سے بڑی بالادستی یہ ہے کہ کسی فرد یا جماعت کو قانون اور نظام حیات وضع کرنے کا حق دیا جائے۔ کسی انسان کو قانون سازی کا حق دینا، اس کو اپنا رب بنانے کے مترادف ہے۔ خدا اپنے رسول (ص) سے فرماتا ہے:

یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ ۚ	اے نبی! جو چیز اللہ نے آپ کے لیے حلال کر دی ہے، اسے آپ حرام کیوں ٹھہراتے ہیں؟ آپ اپنی

تَبۡتَغِیۡ مَرۡضَاتَ اَزۡوَاجِكَ ...۔[1] ازواج کی مرضی چاہتے ہیں؟

حالانکہ یہ رسول خدا (ص) کی طرف سے قانون سازی نہ تھی، بلکہ ان کا اپنا ذاتی عمل تھا اور آپ (ص) نے ایک حلال چیز کوترک کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

اہل کتاب نے اپنے مذہبی پیشواؤں کی مطلق العنانی قبول کر رکھی تھی۔ ان کے نزدیک ان کے علماء قانون شریعت میں تبدیلی لا سکتے ہیں ۔قرآن مجید نے تشریع میں دخل اندازی کوشرک قرار دیا:

اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَهُمۡ وَ رُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ...۔[2] انہوں نے اللہ کے علاوہ اپنے علماء اور راہبوں کو اپنا رب بنا لیا ہے ....

اس آیہ کریمہ میں ان لوگوں کی رد ہے جونص قطعی کے ہوتے ہوئے اجتہاد کرتے ہیں[3] اور شریعت میں دخل دیتے ہیں۔ یادرہے کہ ائمہ اہل بیت (ع) کومعصوم اور ان کے ہرقول وفعل کو حجت سمجھنے کا مطلب یہ نہیں کہ (نعوذ باللّٰہ) وہ اپنی طرف سے قانون سازی اور تشریع کا حق رکھتے ہیں، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ان کا ہرقول وفعل حکم رسول (ص) کے مطابق ہوتا ہے اور نگہبان شریعت ہونے کے ناطے اللہ نے انہیں علوم انبیاء کا وارث بنایا ہے۔ اس طرح امامیہ اپنے ائمہ کو بیان احکام میں معصوم سمجھتے ہیں۔ چنانچہ خود رسالتمآب (ص) کی عصمت کا مطلب یہ نہیں کہ ہم آپ (ص) کو اللہ کی جگہ شریعت سازی کا حق دیتے ہوں۔ دریا بادی نے اپنی تفسیر میں قرطبی کا قول نقل کیا ہے، لیکن صرف ایک حصہ نقل کیا۔ قرطبی کی پوری عبارت یہ ہے:

و هذا يدل على بطلان القول بالاستحسان المجرد الذی لا يستند الى دليل شرعی، قال الطبری: مثل استحسانات ابی حنيفة فی التقديرات التی قدرها دون مستندات بينة۔[4]

یہ آیت اس استحسان کے بطلان پر دلالت کرتی ہے جس کی تائید میں کوئی شرعی دلیل نہ ہو۔طبری کہتے ہیں: اس کی مثال ابو حنیفہ کے استحسانات ہیں، جنہیں وہ بغیر کسی واضح دلیل کے اپنی طرف سے حدود مقرر کر کے بنا لیتے تھے۔

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا: اگر یہ لوگ وحدتِ ادیان کی اس الٰہی آواز پر لبیک نہیں کہتے تو تم یہ اعلان کرو: اے منکرو! گواہ رہو، ہم تو مسلم ہیں۔ گواہ رہو کا جملہ ایک قسم کی تہدید ہے کہ تم کل دیکھو گے تمہارا کیا حشر ہو گا۔

احادیث

قال عدی بن حاتم : ما كنا نعبدهم يا رسول اللّٰه ص فقال: اَمَا كَانُوۡا يُحِلُّوۡنَ لَكُمۡ وَ يُحَرِّمُوۡنَ فَتَأۡخُذُوۡنَ

عدی بن حاتم نے رسول خدا (ص) سے عرض کیا: اے رسول خدا (ص) جب ہم مسیحی تھے تو اپنے علماء کی پرستش تو نہیں کرتے تھے۔آپ (ص) نے فرمایا: کیا

---

[1] ۶۶ تحریم:۱ [2] ۹ توبہ:۳۱ [3] بیان القرآن ۱:۲۰۲ [4] الجامع لاحکام القرآن ۴:۱۰۶

بِقَوْلِهِمْ؟ قَالَ: نَعَمْ۔ فَقَالَ: هُوَ ذَاكَ.[1]　　وہ اپنی مرضی سے حلال اور حرام نہیں بناتے تھے اور تم ان کی بات مانتے تھے؟ عرض کیا، جی ہاں! فرمایا: یہی عبادت ہے۔

اہم نکات

ادیان سماویہ کی روح یہ ہے:

۱۔ خدائے واحد کی عبادت کی جائے اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرایا جائے۔

۲۔ مخلوق کی ربوبیت کی نفی کر کے انسان کو اس کا انسانی وقار اور احترام آدمیت واپس دلایا جائے.

۳۔ نص کے مقابلے میں علماء کے اجتہاد اور شریعت میں مداخلت کو قبول کرنا ان کو رب بنانے کے مترادف ہے۔

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۶۵

۶۵۔ اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں نزاع کرتے ہو، حالانکہ توریت اور انجیل تو ابراہیم کے بعد نازل ہوئی ہیں؟ کیا تم عقل نہیں رکھتے؟

تفسیر آیات

باطل مذاہب جب اپنی حقانیت پر دلیل قائم نہیں کر سکتے تو مردان حق کی طرف اپنی نسبت قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ اپنے اباطیل کی پردہ پوشی کریں۔

یہود و نصاریٰ حضرت ابراہیم (ع) کو یہودی و نصرانی ثابت کر کے اپنے مذاہب کے لیے سند حقانیت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ قرآن نے ان کی اس کوشش سے بھی پردہ اٹھایا کہ یہودیت اور نصرانیت، توریت و انجیل کے نزول کے بعد کی پیداوار ہیں، جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دور اس سے بہت پہلے کا تھا۔ لہٰذا یہ بات ایک عام انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی ہو سکتے ہیں اور نہ نصرانی۔ البتہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سمیت تمام انبیاء (ع) کا ایک دین رہا ہے اور وہ دین توحید ہے، جسے اسلام کہا جاتا ہے۔ وہ شریعت قرآن کے تابع نہ تھے، لہٰذا اسلام پر تو یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ قرآن بھی تو ابراہیم کے بعد ہی نازل ہوا ہے: اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ اللہ کے نزدیک ہمیشہ سے دین صرف اسلام ہے۔ ملاحظہ ہو اسی سورہ کی آیت ۱۹ کی تفسیر۔

----

[1] متشابہ القرآن ۱: ۴۵

اہم نکات

۱۔ حق پر عمل نہ ہو تو صرف نسبت فائدہ مند نہیں ہے۔

هٰٓاَنۡتُمۡ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجۡتُمۡ فِيۡمَا لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِيۡمَا لَيۡسَ لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ‌ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۶﴾

۶۶۔ جن باتوں میں تمہیں کچھ علم تھا ان میں تو تم نے جھگڑا کر ہی لیا، اب تم ایسی باتوں میں کیوں جھگڑتے ہو جن کا تمہیں کچھ بھی علم نہیں؟ اور (یہ ساری باتیں) اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

تفسیر آیات

۱۔ فِيۡمَا لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ: یہودیوں کو توریت کے ذریعے یہ علم تھا کہ عیسیٰ (ع) رسول برحق ہیں، لیکن وہ تکذیب کرتے رہے اور ان کے نسب میں شکوک و شبہات پیدا کرتے رہے۔ دوسری طرف نصاریٰ کو یہ علم تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا یا خدا کا بیٹا نہیں، بلکہ اللہ کے رسول ہیں۔ اس علم کے باوجود یہود و نصاریٰ آپس میں جھگڑا کرتے رہے۔

۲۔ لَيۡسَ لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ: اب یہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہودی یا نصرانی ہونے کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں، جس کا انہیں علم بھی نہیں ہے۔ اس بات کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اگلی آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اللہ اپنے علم کا اظہار فرماتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ نظریاتی اور فکری کجروی اہل علم کی خیانت کا نتیجہ ہے۔

مَا كَانَ اِبۡرٰهِيۡمُ يَهُوۡدِيًّا وَّلَا نَصۡرَانِيًّا وَّلٰكِنۡ كَانَ حَنِيۡفًا مُّسۡلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿۶۷﴾

۶۷۔ ابراہیم نہ یہودی تھے، نہ عیسائی بلکہ وہ یکسوئی کے ساتھ مسلم تھے اور وہ مشرکین میں سے ہرگز نہ تھے۔

تشریح کلمات

حنیف: (ح ن ف) باطل کو چھوڑ کر صرف حق کی طرف یکسوئی اختیار کرنے والا۔ راہ راست پر آنے

والا۔

تفسیر آیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مسلم ہونے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ قرآنی شریعت کے پابند تھے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک ایک ہی دین اسلام ہے، جس کی بنیاد اللہ کی وحدانیت، معاد اور متابعت وحی پر استوار ہے۔ اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام سمیت تمام انبیاء اسی دین اسلام یعنی توحید پرستی کے داعی اور علمبردار تھے۔

اِنَّ اَوۡلَی النَّاسِ بِاِبۡرٰہِیۡمَ لَلَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡہُ وَ ہٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ وَاللّٰہُ وَلِیُّ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۶۸﴾

۶۸۔ ابراہیم سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنہوں نے ان کی پیروی کی اور اب یہ نبی اور ایمان لانے والے (زیادہ حق رکھتے ہیں) اور اللہ ایمان رکھنے والوں کا حامی اور کارساز ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یہود و نصاریٰ کے نزدیک ابراہیم علیہ السلام کی طرف نسبت حقانیت کی دلیل ہے، جب کہ حقانیت کا اصلی معیار نسبت نہیں بلکہ اتباع ہے۔ دین ابراہیمی کی اتباع کرنے والے ابراہیم علیہ السلام سے نسبت قائم کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں اور یہ حق رکھنے والے، یہ لوگ ہیں۔

۲۔ لَلَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡہُ: جن لوگوں نے عقیدۂ توحید میں ابراہیم کی پیروی کی۔ یعنی اسلام کے آنے سے پہلے۔

۳۔ وَ ہٰذَا النَّبِیُّ: اور یہ نبی۔ یعنی حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حق انتساب ہے۔

۴۔ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: اور جو لوگ اس نبی پر ایمان لے آئے ہیں، وہ بھی چونکہ موحد ہیں، حق انتساب رکھتے ہیں۔

بنابریں نبی آخر الزمان (ص) اور آپ (ص) پر ایمان لانے والے لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے انتساب اور ان کی وراثت کے زیادہ حقدار ہیں۔

اس آیت میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ کسی نبی کی امت یا کسی امام کے ماننے والوں میں شمار ہونے کے لیے واحد شرط اس نبی اور امام کی اتباع اور عملی پیروی ہے۔

اہم نکات

۱۔ کسی مذہب یا شخصیت سے انتساب کے لیے اس سے محبت اور اس کی حقانیت کا عقیدہ ہی کافی نہیں، بلکہ عملی پیروی بھی ضروری ہے۔

۲۔ یہود و نصاریٰ چونکہ ملت ابراہیمی کی عملی پیروی نہیں کرتے تھے، لہٰذا خدا نے ملت ابراہیمی سے ان کے انتساب کی نفی کی ہے۔

۳۔ رسول خدا (ص) چونکہ ہر لحاظ سے ملت ابراہیمی کے وارث ہیں، لہٰذا براہیم علیہ السلام سے نسبت کے وہ زیادہ حقدار ہیں۔

وَدَّتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ لَوۡ يُضِلُّوۡنَكُمۡ ؕ وَمَا يُضِلُّوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَمَا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۶۹﴾

۶۹۔ اہل کتاب کا ایک گروہ چاہتا ہے کہ تمہیں گمراہ کر دے، دراصل وہ اپنے آپ کو گمراہ کر رہے ہیں مگر وہ شعور نہیں رکھتے۔

تفسیر آیات

اس آیت کی تفسیر کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ آیت ۱۰۹۔

يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ ﴿۷۰﴾

۷۰۔ اے اہل کتاب! تم اللہ کی آیات کا انکار کیوں کرتے ہو؟ حالانکہ تم خود ان کا مشاہدہ کر رہے ہو۔

تفسیر آیات

اہل کتاب، توریت و انجیل میں نبی آخر الزمان (ص) کی علامات اور نشانیوں کا واضح طور پر مشاہدہ کرتے تھے نیز جو ضابطہ حیات آپ (ص) نے عطا فرمایا، وہ آپ (ص) کی رسالت کی واضح نشانی ہے۔ اس کے مشاہدے سے بھی انہیں یقین آتا تھا کہ آپ (ص) اللہ کے رسول ہیں، لیکن وہ اس کے باوجود منکر تھے۔

واضح رہے اہل کتاب اللہ کے منکر نہیں ہیں۔ وہ اللہ کی آیات کے منکر ہو گئے جو رسول آخر الزمان پر نازل ہوئی ہیں۔ اس اعتبار سے اہل کتاب کو بھی کافر کہتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ یقین اور عمل میں تضاد نہ صرف ممکن ہے بلکہ یہ علمائے یہود و نصاریٰ کی ایک خصوصیت بھی ہے۔

يٰٓاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَلۡبِسُوۡنَ الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ وَتَكۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۱﴾	۷۱۔ اے اہل کتاب! تم جان بوجھ کر حق کو باطل کے ساتھ کیوں خلط کرتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو؟

تشریح کلمات

اللبس: (ل ب س) شبہ پیدا کرنا۔ حق و باطل کو خلط کرنا۔

تفسیر آیات

۱۔ لِمَ تَلۡبِسُوۡنَ الۡحَقَّ: حق کو باطل کے ساتھ خلط کرنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ باطل کو حق کے لبادے میں پیش کیا جائے۔ اہل کتاب نے توریت، انجیل میں تحریف کر کے باطل کو حق کی شکل میں پیش کیا ہے یا یہ کہ حق اور باطل میں تمیز کر کے بیان کرنا چھوڑ دیا ہے۔ جیسے ہمارے زمانے میں آزادی، وطن پرستی، حقوق انسان، جمہوریت، ترقی وغیرہ کے نام سے باطل کو رائج کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اہل کتاب دین ابراہیمی کے نعرے کے ذریعے اپنے باطل نظریات کو رواج دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

۲۔ وَتَكۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی حقانیت کو چھپاتے کیوں ہو۔

۳۔ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ: حالانکہ تم حق اور باطل کو اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی حقانیت کو جانتے ہو۔

وَقَالَتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اٰمِنُوۡا بِالَّذِيۡٓ اُنۡزِلَ عَلَى الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَجۡهَ النَّهَارِ وَاكۡفُرُوۡٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ ﴿۷۲﴾	۷۲۔ اور اہل کتاب کا ایک گروہ (آپس میں) کہتا ہے: ایمان لانے والوں پر جو کتاب نازل ہوئی ہے، اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو انکار کردو، شاید وہ (مسلمان) برگشتہ ہو جائیں۔

تفسیر آیات

دعوت اسلام کی روز افزوں مقبولیت کو روکنے اور مسلمانوں کا ایمان متزلزل کرنے کے لیے چند یہودی علماء نے بعض افراد کو تیار کیا کہ وہ علانیہ طور پر اسلام قبول کرلیں، پھر مرتد ہو جائیں اور یہ مشہور

کریں کہ پیغمبر اسلام (ص) کو نزدیک سے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ برحق رسول نہیں ہو سکتے۔ یاد رہے کہ ھرقل بادشاہ روم کو جب رسول اکرم (ص) کی طرف سے دعوت اسلام ملی تو اس نے پوچھا تھا کہ کیا اس رسول پر ایمان لانے والے برگشتہ بھی ہو جاتے ہیں؟ جواب دیا گیا کہ ایسا کبھی نہیں ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (ص) کو یہودیوں کی اس سازش سے باخبر کیا۔ یہ خبر اپنی جگہ ایک معجزہ ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قرآن اس ذات کی طرف سے ہے، جو دلوں کے راز جانتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ باطل ہمیشہ اپنی سازشوں کو ففتھ کالم کے ذریعے بروئے کار لاتا ہے۔

وَلَا تُؤۡمِنُوۡۤا اِلَّا لِمَنۡ تَبِعَ دِیۡنَکُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ الۡہُدٰی ہُدَی اللّٰہِ ۙ اَنۡ یُّؤۡتٰۤی اَحَدٌ مِّثۡلَ مَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ اَوۡ یُحَآجُّوۡکُمۡ عِنۡدَ رَبِّکُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ الۡفَضۡلَ بِیَدِ اللّٰہِ ۚ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿ۚۙ۷۳﴾ یَّخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۷۴﴾

۷۳۔ اور (یہ لوگ آپس میں کہتے ہیں) اپنے دین کے پیروکاروں کے سوا کسی کی بات نہ مانو، کہد یجیے: ہدایت تو بے شک وہ ہے جو اللہ کی طرف سے ہو، (لیکن اہل کتاب باہم یہ کہتے ہیں:) کہیں ایسا نہ ہو جیسی چیز تمہیں ملی ہے ویسی کسی اور کو مل جائے یا وہ تمہارے رب کے حضور تمہارے خلاف حجت قائم کر لیں، ان سے کہد یجیے: فضل تو بے شک اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہے عطا فرمائے اور اللہ بڑی وسعت والا، جاننے والا ہے۔

۷۴۔ وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے مختص کرتا ہے اور اللہ عظیم فضل والا ہے.

تفسیر آیات

۱۔ وَلَا تُؤۡمِنُوۡۤا: یہود کے سازش کار اپنے کارندوں سے کہتے ہیں: جب ایمان کا اظہار کرو تو ظاہری طور پر کرو، حقیقی ایمان صرف دین یہودی پر رکھو۔

۲۔ قُلۡ اِنَّ الۡہُدٰی ہُدَی اللّٰہِ: یہ جملہ معترضہ ہے اور ساتھ لَا تُؤۡمِنُوۡۤا کا جواب بھی ہے کہ ہدایت دینے والا صرف اللہ ہے تمہارے آمنوا اور لَا تُؤۡمِنُوۡۤا کو ہدایت میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اگر کسی کو اللہ کی طرف سے ہدایت ملتی ہے تو وہ تمہارے لَا تُؤۡمِنُوۡۤا کے باوجود ملے گی۔

۳۔ اَنۡ یُّؤۡتٰۤی اَحَدٌ: اس جملے کا عطف وَلَا تُؤۡمِنُوۡۤا پر ہے۔یعنی یہود آپس میں کہتے ہیں: لَا تُؤۡمِنُوۡۤا اس کی بات پر یقین نہ کرو کہ نبوت اور رسالت کا جو منصب یہودیوں کو حاصل رہا ہے، وہ کسی اور کو بھی مل سکتا ہے۔

۴۔ اَوۡ یُحَآجُّوۡکُمۡ عِنۡدَ رَبِّکُمۡ : اور مسلمانوں کو یہ موقع بھی نہ دو کہ تمہارے خلاف اللہ کے حضور حجت قائم کریں۔ اس قسم کی سازش کا ذکر سورہ بقرہ آیت ۷۶ میں ہوا ہے۔

وَ اِذَا خَلَا بَعۡضُہُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ قَالُوۡۤا اَتُحَدِّثُوۡنَہُمۡ بِمَا فَتَحَ اللّٰہُ عَلَیۡکُمۡ لِیُحَآجُّوۡکُمۡ بِہٖ عِنۡدَ رَبِّکُمۡ ....

اور جب خلوت میں اپنے ساتھیوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: جو راز اللہ نے تمہارے لیے کھولے ہیں وہ تم ان (مسلمانوں) کو کیوں بتاتے ہو؟ کیا تم نہیں سمجھتے کہ وہ (مسلمان) اس بات کو تمہارے رب کے حضور تمہارے خلاف دلیل بنائیں گے؟

بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ آیت تحویل قبلہ کے بارے میں یہودیوں کی ایک سازش کے بارے نازل ہوئی ہے۔

۵۔ قُلۡ اِنَّ الۡفَضۡلَ بِیَدِ اللّٰہِ: نبوت و رسالت اللہ کا تفضّل ہے۔ اللہ کا تفضّل اندھی بانٹ نہیں ہے کہ ہر کس و ناکس کو مل جائے یا کسی سازش و حیلوں کی وجہ سے رک جائے یا کسی ایک نسل کے ساتھ اہلیت کے بغیر خاص ہو جائے، بلکہ یہ اللہ کی حکیمانہ مشیت پر مبنی ہے: یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ ....

۶۔ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ : اللہ کے تفضّل میں کسی قسم کی کمی نہیں ہے اور نہ اس کے علم میں کمی ہے کہ کس کو ملنا چاہیے اور کس کو نہیں ملنا چاہیے۔

۷۔ یَّخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِہٖ: وہ اپنی اس حکمت و علم کی بنا پر اپنی رحمت کو ایسے لوگوں کے ساتھ مخصوص کر دیتا ہے جو اس کے لیے اہلیت رکھتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ کسی کی سازش سے اللہ اپنے فضل و کرم سے کسی کو محروم نہیں کرتا۔

وَ مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ مَنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡہُ بِقِنۡطَارٍ یُّؤَدِّہٖۤ اِلَیۡکَ ۚ وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡہُ بِدِیۡنَارٍ لَّا یُؤَدِّہٖۤ اِلَیۡکَ اِلَّا مَا دُمۡتَ عَلَیۡہِ قَآئِمًا ؕ

۷۵۔ اور اہل کتاب میں کوئی ایسا بھی ہے کہ اگر آپ اسے ڈھیر دولت کا امین بنا دیں تو وہ آپ کو لوٹا دے گا، البتہ ان میں کوئی ایسا بھی ہے جسے اگر آپ ایک دینار کا بھی امین بنا دیں تو وہ آپ کو ادا نہیں کرے گا جب تک آپ اس کے سر پر کھڑے نہ رہیں، اس کی

ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَالُوۡا لَیۡسَ عَلَیۡنَا فِی الۡاُمِّیّٖنَ سَبِیۡلٌ ۚ وَ یَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ وَ ہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ﴿۷۵﴾	وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: ناخواندہ (غیر یہودی) لوگوں کے بارے میں ہم پر کوئی ذمے داری نہیں ہے اور وہ جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ: یہودی آج بھی اپنی قوم کو اللہ کی برگزیدہ قوم خیال کرتے ہیں اور پوری انسانیت کو اپنی سیادت و قیادت کے تابع سمجھتے ہیں۔ لہٰذا وہ کسی غیر یہودی کے لیے انسانی اور اخلاقی حقوق کے قائل نہیں ہیں۔ وہ غیر یہود کو ناخواندہ قوم کہکر ان کے لیے تمام انسانی حقوق کے منکر ہیں۔ ان کے نزدیک کسی غیر یہودی کا مال و جان محترم نہیں ہے۔ یہودیوں کی یہ بدعملی اور خیانت کاری صرف ان کے عملی کردار تک محدود نہیں ہے، بلکہ یہ بدعملی اور خیانت یہودیوں کی مذہبی تعلیم اور یہودیت کے دستور و ضابطۂ حیات اور اخلاقیات کا حصہ بھی ہے۔ بطور مثال اگر کسی اسرائیلی کا بیل کسی غیر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کر دے تو اس پر کوئی تاوان نہیں ہے، لیکن اگر کسی غیر اسرائیلی کا بیل کسی اسرائیلی کے بیل کو زخمی کرے تو اس پر تاوان ہے۔[۱] اس پر طرہ یہ کہ نسلی امتیاز و تفریق پر مبنی اس حکم کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ لہٰذا یہود اپنے اخلاقیاتی نظریات کے تحت امین نہیں ہیں۔ تاہم بعض یہود امین ہو سکتے ہیں، کیونکہ یہ بات خارج از امکان نہیں ہے کہ ایک یہودی کے فطری تقاضے ان کی خیانت پر مبنی اخلاقیات پر غالب آ جائیں اور امین بن جائے۔ چونکہ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ تمام انبیاء کی تعلیمات میں ادائے امانت کو انتہائی اہمیت حاصل ہے۔ حتیٰ کہ یہ بات کسی دیانت اور مذہب سے بھی بالاتر ایک انسانی مسئلہ ہے۔ امام جعفر صادق (ع) سے روایت ہے:

ثَلَاثَۃٌ لَا عُذْرَ فِیْھَا لِاَحَدٍ اَدَاءُ الْاَمَانَۃِ اِلَی الْبَرِّ وَ الْفَاجِرِ وَ الْوَفَاءُ بِالْعَھْدِ اِلَی الْبَرِّ وَ الْفَاجِرِ وَ بِرُّ الْوَالِدَیْنِ بَرَّیْنِ کَانَا اَوْ فَاجِرَیْنِ،[۲]	تین چیزوں کے بارے میں کسی کے لیے عذر کی گنجائش نہیں ہے ۔ ادائے امانت، اچھے آدمی کی ہو یا برے آدمی کی۔ وفا بعہد، اچھے آدمی کے ساتھ ہو یا برے آدمی کے ساتھ۔ والدین کے ساتھ احسان، دونوں نیک ہوں یا برے۔

دوسری روایت میں آیا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَ جَلَّ لَمْ یَبْعَثْ نَبِیّاً اِلَّا	اللہ کے تمام انبیاء کو اس تعلیم کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے

۱۔ تلمود ۲۔ الکافی ۵: ۱۳۲۔ باب اداء الامانۃ....

بِصِدْقِ الْحَدِيْثِ وَ اَدَاءِ الْاَمَانَةِ اِلَى الْبَرِّ وَ الْفَاجِرِ.[1]　　کہ گفتگو سچائی کے ساتھ ہو اور امانت کی ادائیگی ہو، خواہ یہ نیک کی ہو یا برے کی۔

۲۔ اِلَّا مَا دُمۡتَ عَلَيۡهِ قَآئِمًا: یہودی ادائے امانت کے لیے اس وقت تک آمادہ نہیں ہوگا، جب تک آپ اس کے سر پر کھڑے نہ رہیں۔ یعنی اس خیانت کار یہودی سے اپنی امانت واپس لینے کے لیے آپ کو تکلیف اٹھانا پڑے گی۔

۳۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡا لَيۡسَ عَلَيۡنَا فِى الۡاُمِّيّٖنَ سَبِيۡلٌ: اس خیانت کے پیچھے ان کی نسلی امتیاز پر مبنی سوچ ہے کہ غیر یہودی کے حقوق نہیں ہوتے۔

۴۔ وَيَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ: پھر وہ اس نسلی امتیاز پر مبنی خیانت کو اللہ کی طرف نسبت دیتے ہیں، جو اللہ پر افترا ہے۔

اہم نکات

۱۔ نسل پرستی اور انسانیت کے استحصال کو مذہب کا حصہ قرار دے کر انہیں اللہ کی طرف منسوب کرنا یہودیوں کا خاصہ رہا ہے۔

بَلٰى مَنۡ اَوۡفٰى بِعَهۡدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۷۶﴾

۷۶۔ ہاں! (حکم خدا تو یہ ہے کہ) جو بھی اپنا عہد پورا کرے اور تقویٰ اختیار کرے تو اللہ تقویٰ والوں کو یقیناً دوست رکھتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ يَشۡتَرُوۡنَ بِعَهۡدِ اللّٰهِ وَاَيۡمَانِهِمۡ ثَمَنًا قَلِيۡلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنۡظُرُ اِلَيۡهِمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيۡهِمۡ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۷۷﴾

۷۷۔ بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور اللہ قیامت کے دن ان سے نہ تو کلام کرے گا اور نہ ان کی طرف نگاہ کرے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا بلکہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

تشریح کلمات

خَلَاقَ: (خ ل ق) نصیب۔ حصہ۔

---

[1] وسائل الشیعة ۱۹: ۷۳

تفسیر آیات

۱۔ بَلٰی مَنۡ اَوۡفٰی بِعَہۡدِہٖ: اس آیت میں یہودیوں کے عزائم کی رد ہے کہ محبوب خدا ہونے کا معیار عہد کی پابندی اور تقویٰ ہے۔ نسل، قومیت اور صرف انتساب نہیں ہے۔

۲۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَشۡتَرُوۡنَ: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ کسی نسل یا قوم سے تعلق ہونا کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا بلکہ جو بھی بدعہدی کرے گا، اسے تین سزائیں بھگتنا ہوں گی:

اول: لَا خَلَاقَ لَہُمۡ: آخرت میں یہ لوگ نہایت بدنصیب ہوں گے۔

دوم: لَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ: اللہ ان سے ہمکلام ہو گا اور نہ ہی ان کی طرف نگاہ کرے گا۔ یعنی اللہ خود ان سے حساب نہیں لے گا بلکہ فرشتے حساب لیں گے۔ ممکن ہے ''اللہ ان سے ہم کلام ہو گا اور نہ ہی ان کی طرف نگاہ کرے گا'' کا مطلب یہ ہو کہ یہ لوگ بغیر حساب جہنم کی طرف بھیج دیے جائیں گے۔

سوم: وَلَا یُزَکِّیۡہِمۡ: اللہ تعالیٰ دنیا میں ان کے لیے پاک ہونے اور ان کے تزکیے کا سامان فراہم نہیں کرے گا، بلکہ انہیں ان کی نخوت، نسلی عصبیت اور قومی مفاخرت کی تاریکی میں چھوڑ دے گا اور جسے اللہ اپنے حال پر چھوڑ دے، یہ اس کے لیے سب سے بڑی سزا ہے۔ نتیجتاً یہ لوگ عذاب الیم میں مبتلا ہوں گے۔

اہم نکات

۱۔ بدعہدی، بدکرداری اور نسلی عصبیت کی سزا گمراہی اور دردناک عذاب ہے۔

وَاِنَّ مِنۡہُمۡ لَفَرِیۡقًا یَّلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَہُمۡ بِالۡکِتٰبِ لِتَحۡسَبُوۡہُ مِنَ الۡکِتٰبِ وَمَا ہُوَ مِنَ الۡکِتٰبِ ۚ وَیَقُوۡلُوۡنَ ہُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ وَمَا ہُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ۚ وَیَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ وَہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۸﴾

۷۸۔ اور (اہل کتاب میں) یقیناً کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اپنی زبان کو اس طرح پھیرتے ہیں کہ تمہیں یہ خیال گزرے کہ یہ خود کتاب کی عبارت ہے حالانکہ وہ کتاب سے متعلق نہیں ہے اور وہ کہتے ہیں: یہ اللہ کی جانب سے ہے، حالانکہ یہ اللہ کی جانب سے نہیں ہوتی اور وہ جان بوجھ کر اللہ کی طرف جھوٹی نسبت دیتے ہیں۔

تشریح کلمات

یَلْوٗنَ: (ل و ی) پھیرنا۔ موڑنا۔ لوی لسانہ کنایۃً جھوٹ بولنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

شان نزول: یہود و نصاریٰ کے ان لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی جو توریت و انجیل میں تحریف اور کتاب خدا میں الٹ پھیر کرتے تھے۔ کچھ مواد کتاب خدا پر اپنی طرف سے اضافہ کرتے تھے۔ کتاب خدا کا وہ حصہ جو دین اسلام سے متعلق تھا، حذف کرتے تھے۔[1]

زبان پھیرنا، ایک جملے کو اس کا ایک حرف کم یا زیادہ کر کے بولنا یا پڑھنا ہے۔ جیسے انظرنا کی جگہ راعنا اور راعنا میں ایک یا کا اضافہ کے راعینا کر دینے سے عبرانی معنی بنتا ہے اور جیسے السلام علیکم میں لام کو حذف کر کے السام علیکم کہہ دینا۔ سام موت کو کہتے ہیں۔ ہمارے غیر عرب معاشروں میں بھی نہ جاننے کی وجہ سے سلام میں فحش غلطی کرتے ہیں۔ السلام علیکم کی جگہ ساکم یا سالکم اور و علیکم السلام کی جگہ واکو سام کہہ دیتے ہیں، جس سے معنی بدل کر دعا کی جگہ بد دعا ہو جاتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ الفاظ اور عبارات میں تحریف کر کے مذہب کی حیثیت کو بگاڑنے کی کوشش کرنا یہودیوں کی ایک خصوصیت ہے۔

مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ یُّؤۡتِیَہُ اللّٰہُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحُکۡمَ وَ النُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوۡلَ لِلنَّاسِ کُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّیۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَ لٰکِنۡ کُوۡنُوۡا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا کُنۡتُمۡ تُعَلِّمُوۡنَ الۡکِتٰبَ وَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَدۡرُسُوۡنَ ﴿۷۹﴾

۷۹۔ کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اللہ تو اسے کتاب، حکمت اور نبوت عطا فرمائے پھر وہ لوگوں سے کہے: اللہ کی بجائے میرے بندے بن جاؤ بلکہ (وہ تو یہ کہے گا:) جو تم (اللہ کی) کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور جو کچھ پڑھتے ہو اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم سچے ربانی بن جاؤ۔

تشریح کلمات

بشر: (ب ش ر) انسانی جلد کو بشرۃ کہتے ہیں۔ انسان یعنی مانوس مخلوق۔ انسان اور بشر مترادف

---

[1] مجمع البیان ذیل آیہ

الفاظ ہیں۔ چنانچہ حضرت آدم (ع) کے بارے میں فرمایا: میں مٹی سے بشر پیدا کرنے والا ہوں اور سورہ حجر میں انسان کے بارے میں کہا:

وَ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ۚ[1] تحقیق ہم نے انسان کو سڑے ہوئے گارے سے تیار شدہ خشک مٹی سے پیدا کیا۔

ربانی: (ر ب ب) علم کی پرورش کرنے والا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ رب کی طرف منسوب ہے۔ یعنی اللہ والا۔ حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے: انا ربانی ھذہ الامۃ۔[2] میں اس امت کا عالم ربانی ہوں۔ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی روایت ہے۔ عَلِیٌّ رَبَّانِیُّ هَذِهِ الْاُمَّةِ[3]۔ علی اس امت کے ربانی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ لفظ سریانی ہے اور اس سے مراد ہے اللہ والا۔ جیسے رِبِّيُّوۡنَ كَثِيۡرٌ ...۔[4]

تَدۡرُسُوۡنَ: (د ر س) درس، تجربے اور مشق سے عبارت ہے۔ درست الحوادث فلانا۔ فلاں کو حادثات نے تجربے سکھا دیے۔ درست الکتاب سے مراد ہے، کتاب کو حفظ کر کے اس کا اثر لیا اور یہ مسلسل پڑھنے سے ہی حاصل ہوتا ہے، اس لیے مسلسل پڑھنے کو درس کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

اب روئے سخن نصرانیوں کی طرف ہے کہ حضرت عیسیٰ (ع) نہ تو رب تھے اور نہ ہی انہوں نے اپنے لیے ربوبیت کا دعویٰ کیا۔ حضرت عیسیٰ (ع) کا (نعوذباللّٰہ) ربوبیت کا دعویٰ کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ کیونکہ اولاً تو وہ بشر ہیں اور بشر مخلوق ہے، رب نہیں ہے۔ معبود کے لیے ضروری ہے کہ محتاج نہ ہو۔ کیونکہ اگر وہ محتاج ہے تو کوئی اس محتاج کی عبادت کیوں کرے؟

ثانیاً: جب اس بشر کو اللہ نے علم و حکمت عطا کی ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے یقین اور علم کے خلاف فیصلہ کرے۔ کیونکہ اس انسان کو علم قطعی ہے کہ اللہ کی ذات نے علم و حکمت عطا کی ہے۔ لہٰذا اس ذات سے بغاوت کر کے انسانوں کو اپنی بندگی کی دعوت دینا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔

ثالثاً: اَللّٰهُ اَعۡلَمُ حَيۡثُ يَجۡعَلُ رِسَالَتَهٗ ...[5] اللہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں رکھے۔

لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ اس شخص میں نبوت و رسالت کی اہلیت بھی ہو اور دوسری طرف سے وہ شرک کی بھی دعوت دے۔ کیونکہ اگر وہ شرک کی دعوت دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ (نعوذ باللّٰہ) اللہ نے لاعلمی میں ایک نااہل کو رسالت کی ذمہ داری سونپ دی۔

---

[1] ۱۵ حجر: ۲۶ [2] مفردات راغب۔ مادہ رب ب
[3] بحار الانوار ۴۰: ۱۶۰ [4] ۳ آل عمران: ۱۴۶ [5] ۶ انعام: ۱۲۵

حضرت عیسیٰ (ع) نے کتاب کی تعلیم دینے کی جو ذمہ داری انجام دی ہے، اس کا نتیجہ توحید ہے، نہ کہ شرک۔ کیونکہ توریت ہو یا انجیل، تمام آسمانی کتب کی تعلیمات توحید پر استوار ہیں۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ جس نبی نے توریت وانجیل کی تعلیم و تدریس کی ہو، وہ شرک باللہ کا حکم دے؟

وَلٰکِنۡ کُوۡنُوۡا رَبّٰنِیّٖنَ: بلکہ وہ نبی تو حکم دے گا کہ ربانی بن جاؤ یعنی رب والا بن جاؤ۔ ایک رب کی بندگی کی دعوت دے گا شرک کی نہیں۔ حضرت علیؑ سے روایت ہے، آپ نے فرمایا:

کونوا علماء فقہاء　　عالم اور فقیہ بن جاؤ۔ (مجمع البیان)

بِمَا کُنۡتُمۡ تُعَلِّمُوۡنَ الۡکِتٰبَ: تعلیم کتاب کا لازمہ یہ ہونا چاہیے کہ انسان اللہ کی توحید کو سمجھے اور لوگوں کو بھی توحید کی طرف بلائے، کیونکہ علم کا لازمہ عمل ہے۔ چونکہ ہر چیز جو اس کا متعلقہ نتیجہ نہ دے، اس کی مذمت ہوئی ہے، لہٰذا جس علم کا عمل کی شکل میں کوئی نتیجہ نہ ہو، وہ علم قابل مذمت ہے۔

وَبِمَا کُنۡتُمۡ تَدۡرُسُوۡنَ: جس درس توحید کو تم نے مسلسل پڑھا ہے اور بار بار اس دہرایا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ ربانی ہو۔

اہم نکات

۱۔ علم و حکمت کی صحیح رعایت کا نتیجہ شرک نہیں، بلکہ توحید ہے۔

وَلَا یَاۡمُرَکُمۡ اَنۡ تَتَّخِذُوا الۡمَلٰٓئِکَۃَ وَالنَّبِیّٖنَ اَرۡبَابًا ؕ اَیَاۡمُرُکُمۡ بِالۡکُفۡرِ بَعۡدَ اِذۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۰﴾

۸۰۔ اور وہ تمہیں فرشتوں اور پیغمبروں کو رب بنانے کا حکم نہیں دے گا، کیا (ایک نبی) تمہیں مسلمان ہو جانے کے بعد کفر اختیار کرنے کا حکم دے سکتا ہے؟

تفسیر آیات

حکمت و نبوت ملنے کے بعد کسی نبی کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے علم و یقین کے خلاف فرشتوں یا انبیاء (ع) کو رب بنانے کا حکم دے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ کسی کو مسلمان بنانے کے بعد کفر کا حکم دے اور اپنے ہی مقصد کے خلاف قدم اٹھائے۔

اَیَاۡمُرُکُمۡ بِالۡکُفۡرِ: کیا ایمان کی طرف دعوت دینے کے لیے مبعوث ہونے والا نبی، کفر کی دعوت

دے گا؟

واضح رہے دور جاہلیت کے مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں اور تدبیر کائنات میں شریک سمجھتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ دین ابراہیمی پر قائم ہیں۔ آیت میں ان تمام مشرکانہ نظریات کی تردید ہے، جو وہ کسی نہ کسی پیغمبر کی طرف منسوب کرتے تھے۔

وَ اِذۡ اَخَذَ اللّٰہُ مِیۡثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَاۤ اٰتَیۡتُکُمۡ مِّنۡ کِتٰبٍ وَّ حِکۡمَۃٍ ثُمَّ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمۡ لَتُؤۡمِنُنَّ بِہٖ وَ لَتَنۡصُرُنَّہٗ ؕ قَالَ ءَاَقۡرَرۡتُمۡ وَ اَخَذۡتُمۡ عَلٰی ذٰلِکُمۡ اِصۡرِیۡ ؕ قَالُوۡۤا اَقۡرَرۡنَا ؕ قَالَ فَاشۡہَدُوۡا وَ اَنَا مَعَکُمۡ مِّنَ الشّٰہِدِیۡنَ ﴿۸۱﴾

۸۱۔ اور جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب میں تمہیں کتاب اور حکمت عطا کر دوں پھر آئندہ کوئی رسول تمہارے پاس آئے اور جو کچھ تمہارے پاس ہے، اس کی تصدیق کرے تو تمہیں اس پر ضرور ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنا ہوگی، پھر اللہ نے پوچھا: کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور میری طرف سے (عہد کی) بھاری ذمہ داری لیتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں! ہم نے اقرار کیا، اللہ نے فرمایا: پس تم گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

تشریح کلمات

الۡاَصۡرُ: (ا ص ر) اس کے اصل معنی کسی چیز میں گرہ لگانے اور زبردستی روک لینے کے ہیں۔ یہاں سے الاصر ان دشواریوں کو بھی کہتے ہیں جو خیرات کے لیے رکاوٹ بنتی ہیں اور اس عہد کو بھی کہتے ہیں جو خلاف ورزی کرنے والے کو ثواب اور خیرات سے روک دے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِذۡ اَخَذَ اللّٰہُ مِیۡثَاقَ النَّبِیّٖنَ: کیا میثاق سے مراد، انبیاء سے میثاق لیا گیا ہے یا انبیاء کا میثاق لیا گیا ہے ان کی امتوں سے یا انبیاء اور امتوں دونوں سے لیا گیا ہے۔ تین اقوال ہیں:

پہلا قول: انبیاء سے میثاق لیا گیا ہے۔ اس بات پر چند ایک قرائن موجود ہیں: کتاب وحکمت انبیاء کو دی جاتی ہے۔ وَ اَخَذۡتُمۡ عَلٰی ذٰلِکُمۡ اِصۡرِیۡ۔ انبیاء کو حکم ہے کہ وہ آگے اپنی اپنی امتوں

سے میثاق لیں۔ فَاشۡهَدُوۡا انبیاء اپنی امتوں کے شاہد ہو سکتے ہیں۔

دوسرا قول: انبیاء کا میثاق امتوں سے لیا گیا ہے۔ اس پر قرآئن ہیں۔ بعد کے خطابات امتوں سے ہیں کہ جب تمہارے پاس انبیاء کتاب لے کر آئیں اور آنے والے رسول کی آمد کی خبر دیں، ان کی دی ہوئی حکمت سے رسولوں کے مبعوث ہونے کی حکمت کو سمجھ سکو گے۔ ثُمَّ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌ تمہارے پاس رسول آئے، قرینہ ہے کہ امت مراد ہے۔ لَتُؤۡمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنۡصُرُنَّہٗ بھی قرینہ بن سکتا ہے۔ بعد والی آیت کے الفاظ فَمَنۡ تَوَلّٰی بھی قرینہ بن سکتے ہیں۔ چونکہ منہ پھیرنے والے امت میں ہوں گے، انبیاء نہیں ہو سکتے۔

تیسرا قول: یہ میثاق انبیاء اور امتوں دونوں سے لیا گیا ہے اور مذکورہ دونوں اقوال پر قرائن تیسرے قول کے لیے دلیل بنتے ہیں۔ چنانچہ جو میثاق انبیاء سے لیا جاتا ہے، وہ امتوں سے بھی ہوتا ہے اور یہ میثاق انبیاء اور امتوں سے لیے جانے کے بارے میں جو روایات موجود ہیں، وہ بھی دلیل ہے کہ یہ اس میثاق میں دونوں شامل ہیں۔

۲۔ لَمَاۤ اٰتَیۡتُکُمۡ مِّنۡ کِتٰبٍ وَّ حِکۡمَۃٍ: قرآن میں انبیاء اور امتوں، دونوں سے اس قسم کے خطابات موجود ہیں، جن میں کتاب وحکمت دینے کا ذکر ہے کہ اللہ نے کتاب کے ذریعے تعلیم دی اور حکمت کے ذریعے سوجھ بوجھ عنایت کی، پھر ذمہ داری ڈالی۔

۳۔ ثُمَّ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌ: پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے۔ رسول امتوں کی طرف آتے ہیں۔ وہ رسول اس کتاب کی تصدیق کرے گا جو تمہارے ساتھ ہے۔

۴۔ لَتُؤۡمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنۡصُرُنَّہٗ: اس رسول پر ایمان لانا امتوں پر فرض ہے، اگر کوئی معاصر رسول مبعوث ہوتا ہے تو نبی پر بھی فرض ہے۔ آنے والے رسول کی آمد کی خبر دینا اس رسول کی نصرت ہے۔

۵۔ قَالَ ءَاَقۡرَرۡتُمۡ وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰی ذٰلِکُمۡ اِصۡرِیۡ: یہ خطاب انبیاء سے ہو سکتا ہے کہ تم نے اپنی اپنی امتوں سے عہد لیا ہے۔

۶۔ قَالَ فَاشۡهَدُوۡا: یہ خطاب انبیاء سے ہے۔

واضح رہے ہم تیسرے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن یہ خطاب بالمطابقہ انبیاء سے ہے اور بالالتزام امتوں سے ہے۔ اس میثاق میں حضرت خاتم الانبیاء (ص) کی آمد کی خبر دینا سرفہرست ہے اور نبی کا فرض منصبی تھا کہ وہ اپنی اپنی امتوں کو یہ بشارت دے دیں۔

چنانچہ روایت میں آیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء سے جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے آئے ہیں، یہ عہد لیا ہے کہ وہ اپنی اپنی امتوں کو ہمارے نبی (ص) کے مبعوث ہونے کی خبر دیں اور ان کی مدح وصفت بیان کریں اور ان کی آمد کی بشارت دیں اور ان کی تصدیق کا حکم دیں۔	اِنَّ اللّٰہَ اَخَذَ الْمِیْثَاقَ عَلَی الْاَنْبِیَاءِ قَبْلَ نَبِیِّنَا اَنْ یُخْبِرُوْا اُمَمَھُمْ بِمَبْعَثِہٖ وَ نَعْتِہٖ وَ یُبَشِّرُوْھُمْ بِہٖ وَ یَاْمُرُوْھُمْ بِتَصْدِیْقِہٖ۔[1]

اہم نکات

۱۔ ہر نبی توحید کی دعوت دیتا ہے، سابقہ انبیاء کی تصدیق کرتا ہے اور آنے والے رسول کی بشارت دیتا ہے۔

فَمَنۡ تَوَلّٰی بَعۡدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۸۲﴾	۸۲۔ پس اس کے بعد جو (اپنے عہد سے) پھر جائیں وہی لوگ فاسق ہیں۔

تفسیر آیات

سارے انبیاء معصوم ہیں۔ لہٰذا انہوں نے اپنے عہد پر یقیناً عمل کیا ہے اور اپنی امت کو آنے والے رسول کے بارے میں بتایا ہے، لیکن اس کے باوجود اہل کتاب اس عہد کو توڑ رہے ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کر رہے ہیں۔ یوں وہ اپنے انبیاء کے عہد کی خلاف ورزی کر کے فاسق ہو چکے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اہل کتاب کا حضرت ختمی مرتبت (ص) کی رسالت سے انکار کرنا سابقہ انبیاء سے بدعہدی کے مترادف ہے۔

اَفَغَیۡرَ دِیۡنِ اللّٰہِ یَبۡغُوۡنَ وَ لَہٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّ کَرۡہًا وَّ اِلَیۡہِ یُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۳﴾	۸۳۔ کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کے خواہاں ہیں؟ حالانکہ آسمانوں اور زمین کی موجودات نے چار و ناچار اللہ کے آگے سر تسلیم خم کیے ہیں اور سب کو اسی کی طرف پلٹنا ہے۔

---

[1] بحار الانوار ۱۱: ۱۲۔ المجمع البیان، در ذیل آیہ۔ تاویل الآیات ص ۱۳۰

تشریح کلمات

طَوۡعًا: (ط و ع) اپنے اختیار اور مرضی سے۔

کَرۡهًا: (ك ر ه) غیر اختیاری طور پر۔

تفسیر آیات

۱۔ اَفَغَیۡرَ دِیۡنِ اللّٰهِ: اہل کتاب جو اسلام کے منکر ہیں، کیا اللہ کے پسندیدہ دین توحید کے علاوہ کسی اور دین کی تلاش میں ہیں؟ اور کیا اسی لیے وہ اسلام کی تصدیق نہیں کر رہے؟ یہ لوگ سن لیں کہ اسلام کے سوا اللہ کا کوئی اور دین ہے ہی نہیں۔

۲۔ وَلَهٗۤ اَسۡلَمَ: اسی دین واحد کے مطابق آسمانوں اور زمین کی سب موجودات اس کے آگے سر تسلیم خم کرتی ہیں۔

۳۔ طَوۡعًا: ان میں کچھ طَوۡعًا یعنی شعور و ارادے کے ساتھ اور کچھ کَرۡهًا یعنی فطری و تکوینی تقاضوں کے مطابق اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرتی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ خدائے واحد کو تسلیم کرنا ہی اللہ کا دین اور اسلام ہے، جو تمام آسمانوں اور زمین پر محیط ہے۔ اگر اللہ کے آگے سر تسلیم خم کرنے کا یہ عمل اختیار و ارادے کے ساتھ ہو تو وہ فرمانبردار شمار ہوں گے، لیکن اگر ایسا نہ ہو تب بھی اللہ کی حکمت ان پر نافذ ہوگی، جیسے موت، فقر اور بیماری وغیرہ۔

اہم نکات

۱۔ اسلام یعنی توحید اور یکتا پرستی ہی اللہ کا دین ہے، جو کائنات پر تکوینی اور تشریعی دونوں لحاظ سے حاکم ہے۔

۲۔ اسلام سے انکار اللہ کے پسندیدہ دین سے انحراف اور کائناتی نظام سے بغاوت ہے۔

۳۔ جو شخص علم و ارادے اور اپنی رضامندی سے اللہ تعالیٰ کے تکوینی و تشریعی نظام کے تحت چلے تو وہ خدا کا فرماں بردار کہلائے گا اور اجر و ثواب کا مستحق قرار پائے گا۔

قُلۡ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡنَا وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلٰۤی اِبۡرٰهِیۡمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ وَیَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ	۸۴۔ کہد یجیے: ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور جو ہماری طرف نازل ہوا ہے اس پر بھی نیز ان (باتوں) پر جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق،

وَمَاۤ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی وَعِیۡسٰی وَالنَّبِیُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّہِمۡ ۪ لَا نُفَرِّقُ بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡہُمۡ ۫ وَنَحۡنُ لَہٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۴﴾

یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل ہوئی ہیں اور جو تعلیمات موسیٰ و عیسیٰ اور باقی انبیاء کو اپنے رب کی طرف سے ملی ہیں (ان پر ایمان لائے ہیں) ہم ان کے درمیان کسی تفریق کے قائل نہیں ہیں اور ہم تو اللہ کے تابع فرمان ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ: کہد یجیے: ہم اللہ کی وحدانیت پر ایمان رکھتے ہیں۔

۲۔ وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡنَا: جو بذریعہ وحی ہم پر نازل ہوا ہے، اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

۳۔ وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلٰۤی اِبۡرٰہِیۡمَ: امت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے عہد و میثاق پر قائم ہے اور بلا تفریق تمام انبیاء پر ایمان لاتی ہے۔ یہ امت نسلی تفریق اور قومی عصبیت سے پاک ہے۔ کسی نبی پر ایمان لاتے وقت یہود و نصاریٰ کی طرح یہ نہیں دیکھتی کہ یہ نبی کس قوم اور نسل سے تعلق رکھتا ہے، بلکہ وہ کسی نبی (ع) پر صرف اس لیے ایمان لاتی ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے مبعوث ہوا ہے۔

۴۔ لَا نُفَرِّقُ بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡہُمۡ: ہم انبیاء (ع) کے درمیان کسی تفریق کے قائل نہیں ہیں، جب کہ یہود اسماعیل و اسحاق علیہما السلام کے بارے میں نسلی تعصب کی بنا پر تفریق کے قائل ہیں۔

اہم نکات

۱۔ امت مسلمہ نسلی اور قومی عصبیت سے پاک ہوتی ہے اور تمام انبیائے برحق پر بلا تفریق ایمان رکھتی ہے۔

وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ ۚ وَہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۸۵﴾

۸۵۔ اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا خواہاں ہو گا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور ایسا شخص آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو گا۔

تشریح کلمات

یَّبۡتَغِ: (ب غ ی) الابتغاء۔ کسی چیز کو کوشش کے ساتھ طلب کرنا۔

تفسیر آیات

گزشتہ آیات سے ایک لازمی نتیجہ یہ اخذ ہوا کہ جب اللہ کا دین ہی توحید کا دین ہے، جس کا امین اسلام ہے تو دوسرے تمام وہ ادیان جو توحید پر استوار نہیں ہیں، اللہ کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتے۔ پس دین اسلام ہی دین فطرت ہے اور فطرت سے انحراف کرنے والا خسارے میں ہوتا ہے۔

توحید چونکہ اللہ کا دین ہے نیز کائناتی حقائق اور فطرت سے ہم آہنگ ہے، لہٰذا توحید سے منحرف ادیان، اللہ کے لیے قابل قبول نہیں ہیں۔ نظریۂ توحید کے منکرین فطرت سے انحراف کے باعث انسانی سرمایہ حیات سے محروم رہیں گے۔

واضح رہے: جہاں اسلام اور ایمان دونوں کا ذکر ہو گا تو اسلام اور ایمان میں فرق ہو گا۔ حدیث میں آیا ہے:

الاسلام علانیة و الایمان فی القلب[1]　اسلام اظہار کا نام ہے اور ایمان عقیدہ قلبی کا۔

لیکن جہاں صرف اسلام کا ذکر ہو گا، وہاں اس سے مراد دین اسلام ہو گا، جس میں ایمان بھی موجود ہے۔ یعنی وہ اظہار جو عقیدہ پر مبنی ہو۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٦﴾

٨٦۔ اللہ کیونکر اس قوم کو ہدایت کرے جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئی ہے حالانکہ وہ گواہی دے چکے تھے یہ رسول برحق ہے اور ساتھ ہی اس کے پاس روشن دلائل بھی آ گئے تھے اور ایسے ظلم کے مرتکب ہونے والوں کو اللہ ہدایت نہیں کرتا۔

اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُھُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿٨٧﴾

٨٧۔ ان لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ، فرشتوں اور انسانوں، سب کی لعنت ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا: آیات کے تسلسل سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب کے بارے میں

---

[1] مجمع البیان ۹: ۲۰۸۔ بحار الانوار ۶۵: ۲۳۹

گفتگو ہو رہی ہے۔

۲۔ کَفَرُوۡا بَعۡدَ اِیۡمَانِہِمۡ : یہ لوگ رسول اکرم (ص) کے مبعوث ہونے سے قبل آپ (ص) کی علامات اور نشانیاں پڑھ کر آپ (ص) پر ایمان لا چکے تھے۔

۳۔ وَ شَہِدُوۡۤا اَنَّ الرَّسُوۡلَ حَقٌّ : اور آپ (ص) کے رسول برحق ہونے کی گواہی بھی دے چکے تھے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ وہ خود کفار کے مقابلے میں فتح و نصرت کی دعا مانگتے تھے۔ یعنی انہوں نے حضور (ص) سے اپنی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں: وَ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ یَسۡتَفۡتِحُوۡنَ عَلَی الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ....[1] اور وہ پہلے کافروں پر فتح کی امید رکھتے تھے.... بعد میں جب رسول اکرم (ص) مبعوث برسالت ہو گئے تو انہی لوگوں نے کفر اختیار کیا اور آپ (ص) کو ماننے سے انکار کیا:

فَلَمَّا جَآءَہُمۡ مَّا عَرَفُوۡا کَفَرُوۡا بِہٖ ۫ فَلَعۡنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ ۔[2]

پھر جب ان کے پاس وہ آ گیا جسے وہ خوب پہچانتے تھے تو وہ اس کے منکر ہو گئے، پس کافروں پر اللہ کی لعنت ہو۔

۴۔ وَّ جَآءَہُمُ الۡبَیِّنٰتُ : اس رسول کے برحق ہونے پر ان کے سامنے واضح دلائل بھی پیش کیے گئے۔

لیکن وہ لوگوں نے ان سب کو مسترد کر کے کفر کا راستہ اختیار کیا۔

۵۔ اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُہُمۡ : ایسے لوگوں سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کو رحمت خدا سے دور کیا جائے۔ ان پر اللہ فرشتے اور لوگوں کی طرف سے لعنت ہو۔ لوگوں سے مراد مؤمنین ہو سکتے ہیں۔

خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنۡہُمُ الۡعَذَابُ وَ لَا ہُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ ﴿۸۸﴾

۸۸۔ وہ ہمیشہ اس لعنت میں گرفتار رہیں گے، نہ ان کے عذاب میں تخفیف ہو گی اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی۔

اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ وَ اَصۡلَحُوۡا ۟ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۸۹﴾

۸۹۔ سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اصلاح کر لی، پس اللہ بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا : وہ اس لعنت میں ہمیشہ رہیں گے۔ یعنی وہ ہمیشہ اللہ کی رحمت سے دور رہیں گے اور جس عذاب کے یہ لوگ مستحق ٹھہرے ہیں، وہ ایسا عذاب ہے جس میں تخفیف کی نوبت کبھی بھی نہیں

---

[1] بقرہ ۲:۸۹ [2] حوالہ سابق

آئے گی۔

۲۔ اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا: البتہ توبہ کی گنجائش موجود ہے۔ صرف توبہ اور پشیمانی کافی نہیں، بلکہ توبہ کے بعد استقامت شرط ہے۔ یعنی دوبارہ ایسے گناہوں کا ارتکاب نہ کیا جائے۔

۳۔ وَ اَصۡلَحُوۡا: اصلاح سے مراد بھی یہی ہے۔ توبہ ایک باطنی انقلاب اور خاص کیفیت کا نام ہے اور اصلاح سے مراد اس کے مطابق عمل کرنا ہے۔ عمل نہ ہو تو ایک بار کا ارادہ کافی نہیں ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ ہمیشہ توبہ کے ساتھ اصلاح اور عمل کا بھی ذکر فرماتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ گناہوں کی مغفرت اور نجات کے لیے توبہ اور اصلاح، دونوں کی ضرورت ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بَعۡدَ اِیۡمَانِہِمۡ ثُمَّ ازۡدَادُوۡا کُفۡرًا لَّنۡ تُقۡبَلَ تَوۡبَتُہُمۡ ۚ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الضَّآلُّوۡنَ ﴿۹۰﴾

۹۰۔ جنہوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا پھر وہ اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے ان کی توبہ ہرگز قبول نہ ہو گی، اور یہی لوگ گمراہ ہیں۔

شان نزول: بعض روایات کے مطابق یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو رسول اسلام (ص) کے خلاف مصروف عمل رہتے اور یہ خیال رکھتے تھے کہ اگر محمد (ص) کامیاب ہوگئے تو وہ لوگ اپنی بداعمالیوں سے توبہ کر لیں گے۔

تفسیر آیات

کفر میں اضافہ اس وقت ہوتا ہے جب کفر کے تقاضوں کے مطابق بداعمالیوں میں بھی اضافہ کیا جائے۔ اسی طرح ایمان میں اضافے سے مراد یہی ہے کہ ایمان کے تقاضوں کے مطابق نیک اعمال میں بھی اضافہ ہو۔

سابقہ آیت میں ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے والوں کی توبہ قبول ہونے کا ذکر تھا۔ اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے، جن کی توبہ قبول نہیں ہو گی۔ اگرچہ یہ بھی وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا ہو گا، لیکن ان کی خاص بات یہ ہے کہ یہ لوگ کفر میں مزید آگے بڑھ گئے اور ان کے کفر میں اضافہ ہو گیا۔ ان کے جرائم اتنے بڑھ گئے ہیں کہ اب توبہ اور اصلاح ممکن نہیں رہی۔ چنانچہ اب ان سے توبہ صادر ہی نہیں ہوتی یا وہ اس وقت توبہ کرتے ہیں جب مایوسی و ناامیدی انہیں گھیر لیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ توبہ

نہیں ہے۔ یہ نہ صرف اللہ کے ساتھ، بلکہ اپنے ساتھ دھوکہ ہے۔

اہم نکات

۱۔ گناہ اور کفر میں تاثیر متقابل ہوتی ہے۔ یعنی گناہ سے کفر میں اور کفر سے گناہ میں اضافہ ہوتا ہے۔

۲۔ کفر اختیار کرنے کے بعد جرائم کے ارتکاب میں افراط سے توبہ اور اصلاح کی اہلیت ختم ہو جاتی ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ مَاتُوۡا وَ ہُمۡ کُفَّارٌ فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡ اَحَدِہِمۡ مِّلۡءُ الۡاَرۡضِ ذَہَبًا وَّ لَوِ افۡتَدٰی بِہٖ ؕ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ وَّ مَا لَہُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ ﴿۹۱﴾

۹۱۔ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور کفر کی حالت میں مر گئے ان میں سے کسی سے اس قدر سونا بھی، جس سے روئے زمین بھر جائے، ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، اگرچہ وہ اسے فدیہ میں دے دیں، ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہو گا اور ان کی مدد کرنے والے نہ ہوں گے۔

مِّلۡءُ: (م ل ء) برتن کا پر ہو جانا۔ کیونکہ درباری اور طبقہ حاکمہ نظروں کو ہیبت و جلال سے بھر دیتے ہیں، اسی لیے انہیں ملأ کہتے ہیں۔

اِفۡتَدٰی: (ف د ی)۔ فدیہ یعنی کچھ دے کر کسی دوسرے کو مصیبت سے چھڑا لینا۔ اِفۡتَدٰی اپنے آپ کو مال کے عوض چھڑا لینا۔

تفسیر آیات

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے زندگی میں توبہ نہیں کی اور کفر کی حالت میں مر گئے۔ ایسے لوگوں نے اگر دنیا میں روئے زمین کے برابر بھی سونا خرچ کیا ہوتا یا قیامت کے دن اپنی نجات کی خاطر اتنا مال بطور فدیہ ادا کریں، تب بھی اللہ قبول نہیں فرمائے گا۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا:

فَالۡیَوۡمَ لَا یُؤۡخَذُ مِنۡکُمۡ فِدۡیَۃٌ وَّ لَا مِنَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ؕ مَاۡوٰىکُمُ النَّارُ ؕ ہِیَ　پس آج تم سے نہ کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ ان سے جنہوں نے کفر اختیار کیا۔ تمہارا ٹھکانا آتش ہے

مَوْلٰىكُمْ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۵ [1] وہی تمہارے لیے سزاوار ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے.

حدیث میں آیا ہے:

> قیامت کے دن کافر کو پیش کیا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا: اگر تیرے پاس اتنا سونا ہو کہ روئے زمین بھر جائے، کیا اس کو فدیہ میں دے دیتا، تو وہ کہے گا: ہاں! تو اس سے کہا جائے گا، تجھ سے دنیا میں اس سے بہت آسان چیز مانگی تھی، تو نے رد کیا۔[2]

اہم نکات

۱۔ قرآن معاوضہ دے کر گناہ معاف کرانے کے نظریے کی نفی کرتا ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۥۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝۹۲

۹۲۔ جب تک تم اپنی عزیز چیزوں میں سے خرچ نہ کرو تب تک کبھی نیکی کو نہیں پہنچ سکتے اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو یقیناً اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔

تشریح کلمات

الْبِرَّ: (ب ر ر) البِرّ کے معنی مطلق نیکی کے ہیں۔ تاہم الْبِرَّ ، نیکیاں انجام دینے میں ایک معتد بہ منزل پر فائز ہونے کی صورت کو کہتے ہیں۔ چنانچہ الْبِرَّ کی تعریف سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۷ میں بیان ہو چکی ہے۔

تفسیر آیات

ربط کلام: سابقہ آیات میں کہا گیا تھا کہ کافر روئے زمین بھر سونا فدیہ کر دے تو بھی قبول نہ ہو گا۔ یہاں مومن کے ذہن میں یہ خیال آ سکتا ہے کہ مال خرچ کرنے کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس توہم کو دور کرنے کے لیے فرمایا: مومن کے لیے مال ایک بہترین وسیلہ ہے، جس کے ذریعے وہ نیکی کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو سکتا ہے نیز سلسلۂ حکم اہل کتاب کے بارے میں بھی اس طرح مربوط ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کی برگزیدہ قوم، اللہ کے فرزند اور اولیاء اللہ خیال کرتے ہیں، جب کہ وہ حرص، بخل اور دولت کے نشے میں اللہ کے احکام کو پامال کرتے ہیں۔ اس آیت نے بتایا کہ اگر اللہ سے محبت ہو تو دنیا کی کوئی چیز اس کے مقابلے میں عزیز نہ ہو گی۔ اگر کسی کے دل میں دنیا کی کوئی چیز حب خدا پر غالب آ جائے تو وہ سمجھ لے کہ نیکی کے

---

[1] ۵۷ حدید: ۱۵ [2] مجمع البیان

مقام پر فائز نہیں ہے۔

تمام نیکیوں میں انفاق مال کو ایک اہم خصوصیت حاصل ہے، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ انفاق مال کو بہت پسند فرماتا ہے۔ حتیٰ کہ ائمہ علیہم السلام کی عظیم نیکیوں میں خصوصی طور پر ان کے انفاق کو پسند فرمایا۔ چنانچہ خود رکوع سے زیادہ رکوع میں دی جانے والی زکوٰۃ کو درجہ دیا گیا۔

چنانچہ قرآن میں اولیاء کی یہ خصوصیت بتائی گئی:

وَ یُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسۡکِیۡنًا وَّ یَتِیۡمًا وَّ اَسِیۡرًا ○ اِنَّمَا نُطۡعِمُکُمۡ لِوَجۡہِ اللّٰہِ لَا نُرِیۡدُ مِنۡکُمۡ جَزَآءً وَّلَا شُکُوۡرًا○ [1]

اور اپنی خواہش کے باوجود مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں، (وہ ان سے کہتے ہیں) ہم تمہیں صرف اللہ (کی رضا) کے لیے کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ تو کوئی معاوضہ چاہتے ہیں اور نہ ہی شکرگزاری۔

مِمَّا تُحِبُّوۡنَ: جو چیز خود تمہاری اپنی پسند کی ہو اسے راہ خدا میں خرچ کرے تو مقام بِرّ پر فائز ہو گا۔ یعنی یہ مقام اس کو ملے گا جو اپنی پسند پر اللہ کی پسند کو ترجیح دیتا ہے۔ اگر ناکارہ اور ردی چیز دے دی جائے تو اس میں کوئی ایثار کارفرما نہ ہوگا۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا:

تَیَمَّمُوا الۡخَبِیۡثَ مِنۡہُ تُنۡفِقُوۡنَ وَلَسۡتُمۡ بِاٰخِذِیۡہِ اِلَّاۤ اَنۡ تُغۡمِضُوۡا فِیۡہِ ....[2]

اس میں سے ردی چیز دینے کا قصد ہی نہ کرو اور (اگر کوئی وہی چیز تمہیں دے دے تو) تم خود اسے لینا گوارا نہ کرو گے مگر یہ کہ چشم پوشی کرو۔

یہ ہے بِرّ یعنی نیکی کا مقام اور اولیاء اللہ کا جذبہ ایثار۔

امام صادق (ع) سے روایت ہے:

اَلْبِرُّ وَ حُسْنُ الْخُلْقِ یَعْمُرَانِ الدِّیَارَ وَ یَزِیْدَانِ فِی الْاَعْمَارِ۔ [3]

نیکی اور حسن خلق مملکت کی ترقی اور عمروں میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی محبت کو ہر چیز کی محبت پر برتری حاصل ہو تو یہی مقام بِر ہے۔

کُلُّ الطَّعَامِ کَانَ حِلًّا لِّبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِیۡلُ عَلٰی نَفۡسِہٖ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ

۹۳۔ بنی اسرائیل کے لیے کھانے کی ساری چیزیں حلال تھیں بجز ان چیزوں کے جو اسرائیل نے توریت نازل ہونے سے پہلے خود اپنے اوپر

---

[1] ۷۶ دہر: ۸۔۹ [2] ۲ بقرہ: ۲۶۷ [3] اصول الکافی ۲: ۱۰۰۔ باب حسن الخلق

التَّوۡرٰىةُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِالتَّوۡرٰىةِ فَاتۡلُوۡهَاۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۹۳﴾

حرام کر لی تھیں، کہدیجیے! اگر تم سچے ہو تو توریت لے آؤ اور اسے پڑھو۔

تفسیر آیات

یہودیوں کی طرف سے اٹھائے جانے والے جزئی اور فروعی اعتراضات کا جواب ہے۔ وہ موجودہ تحریف شدہ یہودی تعلیمات کی روشنی میں اعتراض اٹھاتے ہیں اور قرآن، اصلی دین ابراہیمی کی روشنی میں جواب دے رہا ہے۔

اعتراض یہ تھا: اسلام نے کھانے پینے کی بہت سی ایسی چیزوں کو حلال قرار دیا ہے جو سابقہ انبیاء کے ادوار میں حرام تھیں۔ مثلاً وہ اونٹ کا گوشت حرام سمجھتے تھے، لیکن اسلام اسے حلال قرار دیتا ہے۔ پھر اسلام کس طرح دین ابراہیمی کا پیروکار ہو سکتا ہے؟

اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِيۡلُ عَلٰى نَفۡسِهٖ: جواب میں قرآن ارشاد فرماتا ہے: بنی اسرائیل کے لیے کھانے کی ساری چیزیں حلال تھیں، سوائے ان کے جن سے اسرائیل یعنی حضرت یعقوب (ع) نے بعض طبی ضروریات کے تحت اجتناب کیا تھا، لیکن بعد میں بنی اسرائیل نے اسی امر کو اپنی دینی تعلیمات کا حصہ بنا لیا۔ پھر قرآن دعوت دیتا ہے کہ توریت لے آؤ اور دیکھ لو کہ یہ چیزیں حلال ہیں یا نہیں۔

چنانچہ آج بھی توریت میں یہ بات موجود ہے:

> وہ سب جیتے چلتے جانور تمہارے کھانے کے لیے ہیں۔ میں نے یہ سب نباتات کی مانند تمہیں دیے ہیں۔[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ درج ذیل فقرے کو یہودیوں نے بعد میں توریت کا حصہ بنایا ہے:

> جگالی کرنے والے اور پھٹے ہوئے سم والے جانور کھاؤ۔ اونٹ باوجودیکہ جگالی کرتا ہے، مگر اس کا سم پھٹا ہوا نہیں ہے، لہٰذا وہ تمہارے لیے حرام ہے۔[2]

فَمَنِ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۹۴﴾

۹۴۔ اس کے بعد بھی جنہوں نے اللہ کی طرف جھوٹی نسبت دی، وہی لوگ ظالم ہیں۔

---

۱ پیدائش ۹:۳ ۲ سفر لاویان فصل ۱۱

قُلۡ صَدَقَ اللّٰہُ ۟ فَاتَّبِعُوۡا مِلَّۃَ اِبۡرٰہِیۡمَ حَنِیۡفًا ؕ وَ مَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۹۵﴾

۹۵۔ کہد یجیے: اللہ نے سچ فرمایا، پس تم یکسوئی سے دین ابراہیمی کی پیروی کرو اور ابراہیم مشرکین میں سے نہ تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَمَنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ: جو لوگ دلیل و حجت قائم ہونے کے بعد بھی افترا جاری رکھیں تو ظالم ہوں گے۔ ان پر حجت پوری ہونے سے قبل بھی اللہ پر جھوٹ کہنے کی وجہ سے یہ لوگ ظالموں میں شامل تھے لیکن حجت پوری ہونے کے بعد ان کی طرف سے زیادتی کی انتہا ہو گی۔

۲۔ قُلۡ صَدَقَ اللّٰہُ: آپ کہد یجیے اللہ کا یہ فرمان سچا ہے کہ بنی اسرائیل کے لیے کھانے کی ساری چیزیں حلال تھیں۔ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِیۡلُ عَلٰی نَفۡسِہٖ۔ مگر وہ جو اسرائیل نے خود حرام کر لی تھیں اور اللہ کا یہ فرمان بھی سچا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دین ابراہیمی پر ہیں اور ابراہیم (ع) کا دین، توحید کا دین ہے، جو اسلام کا دین ہے۔

۳۔ فَاتَّبِعُوۡا مِلَّۃَ اِبۡرٰہِیۡمَ حَنِیۡفًا: پس اونٹ کا گوشت اور دودھ حلال ہونے میں ابراہیم کی پیروی کرو۔ اس ابراہیم (ع) کی پیروی کرو جو حنیف ہیں۔ یکسوئی کے ساتھ اللہ کی وحدانیت کے قائل تھے۔ تمہارے طرح مشرک نہیں تھے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ہُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿ۚ۹۶﴾

۹۶۔ سب سے پہلا گھر جو لوگوں (کی عبادت) کے لیے بنایا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے اور جو عالمین کے لیے بابرکت اور رہنما ہے۔

فِیۡہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبۡرٰہِیۡمَ ۬ۚ وَ مَنۡ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا ؕ وَ لِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الۡبَیۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَیۡہِ سَبِیۡلًا ؕ وَ مَنۡ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۹۷﴾

۹۷۔ اس میں واضح نشانیاں ہیں (مثلاً) مقام ابراہیم اور جو اس میں داخل ہوا وہ امان والا ہو گیا اور لوگوں پر اللہ کا حق ہے کہ جو اس گھر تک جانے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس گھر کا حج کرے اور جو کوئی اس سے انکار کرتا ہے تو (اس کا اپنا نقصان ہے) اللہ تو عالمین سے بے نیاز ہے۔

تشریح کلمات

بَیۡت: (ب۔ی۔ت) رات کا ٹھکانا۔ رات کا قیام بیوتہ کہلاتا ہے۔ بعد میں لفظ بَیۡت ہر مسکن اور مکان کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

بکة: یعنی مکہ۔ قدیم زمانے میں اس شہر کا نام بکّہ تھا، بعد میں باء میم سے بدل گیا۔ قرآن نے قدیم لفظ استعمال فرما کر خانہ کعبہ کی قدامت کی طرف لطیف اشارہ فرمایا ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ مسجد الحرام کی جگہ کو بکّہ اور پورے حرم کو جس میں دوسرے گھر بھی شامل ہیں مکہ کہا جاتا ہے۔[1] یہ اصل میں تباك سے ماخوذ ہے، جس کا معنی اژدھام ہے۔ چونکہ وہاں طواف کے لیے لوگوں کا اژدھام رہتا ہے اسی لیے بکّہ کہا گیا ہے۔
بعض ماہرین کہتے ہیں کہ بکّہ بابلی لفظ ہے، جس کا معنی آبادی ہے۔ جیسے بعلبك یعنی بعل کا شہر۔ ممکن ہے کہ یہ لفظ شروع میں حضرت ابراہیم (ع) نے استعمال کیا ہو، کیونکہ آپؑ بابل سے تشریف لائے تھے۔ چنانچہ قدیم صحیفوں میں اس وادی کا یہی نام مذکور ہے۔

مبارك: (ب ر ك) ہر وہ چیز جس میں خیر و برکت پائی جائے۔ بر کۃ کسی چیز میں اللہ کی طرف سے اچھائی ثابت ہونے کے معنوں میں ہے۔ اصل میں یہ لفظ برك یعنی اونٹ کا سینہ (جس پر وہ جم کر بیٹھتا ہے) سے ماخوذ ہے۔ یہاں سے ثابت قدمی اور استقامت کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ حوض کو اس لیے برکۃ کہا جاتا ہے کہ وہاں پانی جمع رہتا ہے۔ اسی وجہ سے مبارك خیر و برکت جمع ہونے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔

تفسیر آیات

اس آیہ شریفہ میں درج ذیل مباحث قابل توجہ ہیں:

۱۔ یہودیوں کو اعتراض تھا کہ رسول اسلام (ص) نے سابقہ انبیاء کے قبلے یعنی بیت المقدس کو چھوڑ کر اپنے لیے ایک نیا قبلہ بنا لیا ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا جا رہا ہے: سب سے پہلا گھر یعنی قبلہ تو کعبہ ہے، جو انبیاء کا قبلہ رہا ہے۔

۲۔ اَوَّلَ بَیۡتٍ: خانہ کعبہ کو اولین خانہ خدا ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اسلامی روایات کی رو سے سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے اس گھر کی تعمیر کی۔ بقول بعضے طوفان نوح علیہ السلام کے باعث انہدام کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے دوبارہ تعمیر کیا۔ قرآن مجید میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ

---

[1] التبیان ۲: ۵۳۵

خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کی۔ توریت میں بھی اس بات کا ذکر موجود ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت ایل یعنی بیت اللہ کی تعمیر کی۔ یہودی اس سے بیت المقدس مراد لیتے ہیں۔ حالانکہ خود یہودیوں کے ہاں یہ امر مسلم ہے کہ بیت المقدس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے سینکڑوں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ساڑھے چار سو برس بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا اور انہی کے زمانے میں اسے قبلہ قرار دیا گیا۔

بائبل کی ایک عبارت میں وادی مکہ کا ذکر اس طرح آیا ہے:

وہ بکّۃ کی وادی میں گزر کرتے ہوئے اسے ایک کنواں بناتے۔[1]

یہودیوں نے نسلی تعصب کی بنیاد پر اولاد اسماعیل (ع) سے مربوط تمام آثار کو اپنے تحریفی حربوں کے ذریعے اپنی کتب سے حذف کر دیا۔ چنانچہ بکّۃ کا ترجمہ ''رونے کی وادی'' کر دیا تا کہ کسی کا ذہن سر زمین حجاز میں واقع وادی مکہ کی طرف ہی نہ جائے، جہاں سے نبی آخر الزمان (ص) نے مبعوث ہونا تھا۔ افسوس کا مقام ہے کہ آج بھی بعض اسلامی ممالک سے شائع ہونے والی تاریخ اور حدیث کی کتب سے ان حقائق کو حذف کیا جا رہا ہے جو ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے وارث آل محمد (ص) کی حقانیت کو ثابت کرتے ہیں اور کسی مخصوص فرقے کے باطل نظریات کے خلاف ہیں۔ ذبیح اللّٰہ کے وارث جس طرح پہلے یہودی نسل پرستی کے ظلم وستم کا تختہ مشق بنے رہے، اسی طرح آج بھی خود مسلمانوں کے ہاتھوں مظلوم واقع ہو رہے ہیں۔

خانہ کعبہ، حضرت ابراہیم (ع) کی تعمیر سے پہلے بطور بیت اللّٰہ موجود تھا۔ اس پر قرآن کی دو آیتوں سے استدلال کیا جا سکتا ہے:

i۔ وَاِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰھمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ وَاِسۡمٰعِیۡلُ ...۔[1] — اور جب ابراہیم و اسماعیل اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنیادوں کا وجود پہلے سے تھا۔ حضرت ابراہیم (ع) تو اس کی صرف تعمیر نو کر رہے تھے۔

ii۔ رَبَّنَاۤ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ ...۔[2] — اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو تیرے محترم گھر کے نزدیک ایک بنجر وادی میں بسایا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم جب حضرت اسماعیل علیہما السلام کو طفولیت کے وقت سرزمین مکہ میں بسا رہے تھے، کعبہ اس وقت بطور بیت موجود تھا۔ بعد میں حضرت اسماعیل (ع) کے زمانۂ شباب میں

-----

[1] ۲ بقرہ: ۱۲۷ [2] ۱۴ ابراہیم: ۳۷

کعبے کی تعمیر نو فرمائی۔

۳۔ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ : بابرکت اس لیے ہے کہ دنیا کا مقدس ترین خانۂ خدا اور مناسک حج کا مرکز ہونے کی وجہ سے دنیا بھر کے موحدین کے لیے یہ جگہ قابل توجہ اور قابل احترام رہی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ساری دنیا سے لوگ دنیا بھر کی نعمتیں یہاں لاتے ہیں۔ اس طرح لوگوں کی آمد و رفت سے زندگی کے لوازم اور معیشت میں آسودگی آتی رہی ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم (ع) کی دعا میں انہی دو باتوں کا تذکرہ ہے:

i۔ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْۤ اِلَیْهِمْ وَ ارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ ..[1] لہٰذا تو کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور انہیں پھلوں کا رزق عطا فرما...۔

ii۔ یُّجْبٰۤی اِلَیْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَیْءٍ ...[2] جس کی طرف ہر چیز کے ثمرات کھنچے چلے آتے ہیں۔

یعنی باہر سے ہر چیز کے ثمرات اس کی طرف لائے جاتے ہیں۔

۴۔ وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ : کعبہ، عالمین کے لیے ہدایت کا مرکز اس لیے ہے کہ عصر ابراہیم (ع) سے بہت پہلے کے زمانے سے لے کر آج تک یہ جگہ بارگاہ تقرب الٰہی اور محل عبادت خداوندی رہی ہے۔ یہاں سے دعوت توحید کی ابتداء ہوئی اور ہجرت ابراہیمی کی انتہا۔ یہ جگہ وحی الٰہی کا محل نزول اور ہادی بشریت، محسن انسانیت کی جائے ظہور ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ بقرہ آیت ۱۴۲ کی تفسیر۔

۵۔ فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ : یہ مقام آیات بینات میں شامل ہے، کیونکہ یہ رسول اسلام (ص) کی صداقت اور قبلہ مسلمین کی قداست و قدامت کی واضح دلیل ہے۔ حضرت ابراہیم (ع) کے قدم مبارک کا نشان ایک زندہ ثبوت ہے کہ اس گھر کو ابراہیم خلیل اللہ (ع) نے تعمیر کیا اور یہی انبیاء (ع) کا قبلہ تھا۔ یہ علامات زمانے میں پیش آنے والے بے شمار طبیعی اور حربی حالات کے باوجود آج تک محفوظ اور موجود ہیں۔ جب کہ دوسرے مقامات پر اس سے کمتر حالات میں پورے تمدن کے نشانات مٹ جاتے اور پوری قوم کے آثار ناپید ہو جاتے ہیں۔

۶۔ وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا : دوسری نشانی یہ ہے کہ اس گھر کو خطہ امن قرار دیا گیا۔ یعنی قانونی امن فراہم کیا کہ یہاں آنے والا خواہ انسان ہو یا حیوان، مجرم اور قاتل ہو یا جرم و خطا کا مرتکب، اسے امن حاصل ہے۔ یہ دعائے ابراہیم (ع) کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وضع کردہ اس قانونی امن کا ایک نہایت دیرپا اثر انسانوں کے دلوں میں راسخ رہا۔ یہاں تک کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی، جہاں تمام اقدار کو پامال کیا جاتا تھا، اس قانونی امن کا احترام ہوتا رہا۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ بقرہ آیت ۱۲۶۔

---

[1] ۱۴ ابراہیم: ۳۷ [2] ۲۸ قصص: ۵۷

۷۔ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الۡبَيۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَيۡهِ سَبِيۡلًا : یہ تیسری نشانی ہے کہ یہ گھر حضرت ابراہیم (ع) سے مربوط ہے اور یہاں حج کا اعلان حضرت ابراہیم (ع) ہی نے کیا تھا:

وَاَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ ....[۱] اور لوگوں میں حج کے لیے اعلان کرو ....

چنانچہ عصر ابراہیم (ع) سے لے کر آج تک اس گھر کا حج ہو رہا ہے۔ عرب جاہلیت بھی اس تسلسل کو نہیں روک سکی۔ لہٰذا حج کا تواتر کے ساتھ عصر حضرت ابراہیم (ع) سے حضرت محمد (ص) تک جاری رہنا، اس بات کی واضح دلیل ہے کہ رسول کریم (ص)، دین ابراہیم (ع) کے وارث ہیں۔

احادیث

حضرت امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جب آپ (ع) سے فِيۡهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ کے بارے میں سوال کیا گیا کہ یہ نشانیاں کون سی ہیں تو آپ (ع) نے فرمایا:

مَقَامُ اِبۡرَاهِيمَ حِيۡثُ قَامَ عَلَى الۡحَجَرِ فَاَثَّرَتۡ فِيۡهِ قَدَمَاهُ، وَ الۡحَجَرُ الۡاَسۡوَدُ، وَ مَنۡزِلُ اِسۡمَاعِيۡلَ ع ۔[۲]

ایک تو مقام ابراہیمؑ ہے، جہاں آپؑ جس پتھر پر کھڑے ہوئے تو اس پر آپؑ کا نقش قدم ثبت ہوگیا۔ دوسرا حجر اسود اور تیسرا مسکن اسماعیلؑ ہے۔

اہم نکات

۱۔ کعبہ سب سے پہلا عبادت خانہ ہے۔ اس کے معمار حضرت ابراہیم (ع) ہیں اور ان کے وارث محمد مصطفیٰ (ص) ہیں۔ اس بات کے تین شواہد موجود ہیں:

الف: مقام ابراہیم (ع) ایک زندہ ثبوت ہے، جس میں آپ (ع) کا نقش قدم ثبت ہے۔

ب: اس گھر میں داخل ہونے والوں کے لیے حضرت ابراہیم (ع) نے امن کا تقاضا کیا تھا جو آج تک ایک قانون کی صورت میں نافذ العمل ہے۔

ج۔ حضرت ابراہیم نے بحکم خدا اس گھر کے حج کا اعلان کیا تھا، جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

چنانچہ حضرت ابراہیم (ع) کے ساتھ یہودیت کا نہیں، بلکہ دین اسلام کا ربط ثابت ہو جاتا ہے۔

قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ‌ۖ وَاللّٰهُ شَهِيۡدٌ عَلٰى مَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۸﴾

۹۸۔ کہد یجیے: اے اہل کتاب! تم اللہ کی نشانیوں کا انکار کیوں کرتے ہو جب کہ اللہ تمہارے اعمال کا مشاہدہ کرنے والا ہے۔

۱؎ ۲۲ حج: ۲۷ ۲؎ اصول الکافی: ۴: ۲۲۳

قُلۡ یٰۤاَهۡلَ الۡکِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ مَنۡ اٰمَنَ تَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا وَّ اَنۡتُمۡ شُهَدَآءُ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۹﴾	۹۹۔ کہد یجیے: اے اہل کتاب! تم ایمان لانے والوں کو راہ خدا سے کیوں روکتے ہو؟ تم چاہتے ہو اس راہ میں کجی آئے حالانکہ تم خود اس پر شاہد ہو (کہ وہ راہ راست پر ہیں) اور اللہ تمہاری حرکات سے غافل نہیں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یٰۤاَهۡلَ الۡکِتٰبِ لِمَ تَکۡفُرُوۡنَ: کھانے کی چیزوں کی حرمت وحلیت، کعبے کی قدامت وقدامت اور اس کے حضرت ابراہیم (ع) کے ساتھ ربط ونسبت اور دیگر حقائق سے پردہ اٹھانے کے بعد اب ان آیات میں ارشاد ہو رہا ہے کہ اے اہل کتاب تم اللہ کی نشانیوں کے منکر کیوں ہو رہے ہو، حالانکہ تم خود ان کے برحق ہونے پر شاہد ہو۔

لیکن اہل کتاب نہ صرف خود ان آیات کے منکر ہیں بلکہ وہ اسلامی احکام اور قبلۂ مسلمین کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کر کے اہل ایمان کو گمراہ کرنے کی گھناؤنی سازش بھی کر رہے ہیں۔

۲۔ وَاللّٰهُ شَهِیۡدٌ: حالانکہ تمہیں علم ہے یا ہونا چاہیے کہ تمہارے اعمال کی حقیقت پر اللہ گواہ ہے کہ تم اس کفر کا ارتکاب کن محرکات کی بنیاد پر کر رہے ہو۔

۳۔ لِمَ تَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ: اے اہل کتاب اگر تم اسلام کی طرف نہیں آتے ہو اور اسلام کو تم برحق نہیں سمجھتے ہو تو تم خود اسے اپنانے سے پرہیز کرو، دوسروں کو اس راستے پر آنے سے کیوں روکتے ہو؟ ترتیب کلام اس طرح ہے۔ لم تصدون من آمن عن سبیل اللّٰہ۔ موضوع کلام سبیل اللہ ہونے اور اہمیت سبیل اللہ کو دینے کے لیے اس کا ذکر پہلے کیا ہے۔

۴۔ تَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا: تم راہ خدا میں کجی لانا چاہتے ہو اور اس کے لیے دن رات سازش میں مشغول رہتے ہو ہر قسم کا حربہ استعمال کرتے ہو۔

۵۔ وَّ اَنۡتُمۡ شُهَدَآءُ: حالانکہ تم اس راہ کے برحق ہونے پر شاہد ہو۔ یعنی تم جانتے ہو یہ برحق سبیل اللہ ہے، جس کی بشارت تم اپنی کتابوں میں پڑھ چکے ہو۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تُطِیۡعُوۡا فَرِیۡقًا مِّنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ	۱۰۰۔ اے ایمان والو! اگر تم نے اہل کتاب میں سے کسی ایک گروہ کی بات مان لی تو وہ تمہارے

یَرُدُّوۡکُمۡ بَعۡدَ اِیۡمَانِکُمۡ کٰفِرِیۡنَ ﴿۱۰۰﴾	ایمان لانے کے بعد تمہیں کافر بنا دیں گے۔
وَ کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ وَ اَنۡتُمۡ تُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتُ اللّٰہِ وَ فِیۡکُمۡ رَسُوۡلُہٗ ؕ وَ مَنۡ یَّعۡتَصِمۡ بِاللّٰہِ فَقَدۡ ہُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۱۰۱﴾	۱۰۱۔ اور تم کس طرح پھر کفر اختیار کر سکتے ہو جب کہ تمہیں اللہ کی آیات سنائی جا رہی ہیں اور تمہارے درمیان اللہ کا رسول بھی موجود ہے؟ اور جو اللہ سے متمسک ہو جائے، وہ راہ راست ضرور پا لے گا۔

تفسیر آیات

شان نزول: ایک سازشی یہودی شماس بن قیس نے اوس اور خزرج کے دونوں قبائل کو لڑانے کے لیے گزشتہ عداوتوں کو پھر ہوا دینا شروع کی اور عہد جاہلیت کی مشہور لڑائی ''جنگ بغاث'' کے رزمیہ اشعار پڑھوا کر پرانی عداوتوں کو تازہ کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ان میں دوبارہ جنگ شروع ہونے ہی والی تھی کہ حضور (ص) کو اس کا علم ہو گیا۔ چنانچہ آپ (ص) کی نصیحتوں سے یہ دونوں قبائل پھر امن و آشتی کے پرسکون اسلامی ماحول میں واپس آ گئے۔ اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

۱۔ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تُطِیۡعُوۡا: اطاعت جس کی ہو انسان اس کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اطاعت اگر اللہ اور اس کے رسول (ص) کی ہے تو اللہ والے ہو جاتے ہیں۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اطاعت کافروں کی ہو اور وہ رہے مسلمان۔ لہٰذا ایمان کے بعد کافر کی اطاعت ارتداد کے حکم میں ہے۔

۲۔ وَ کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ: اس آیت میں ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے اور یہودیوں کی سازش کا شکار ہونے کو بعید از قیاس قرار دیا گیا ہے کہ تم کس طرح کفر اختیار کر سکتے ہو، جب کہ گمراہی سے روکنے کے دو اہم اسباب تمہارے درمیان موجود ہیں:

i۔ وَ اَنۡتُمۡ تُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتُ اللّٰہِ: تم نزول وحی کے زمانے میں زندگی بسر کر رہے ہو اور تمہیں اللہ کی آیات سنائی جا رہی ہیں۔

ii۔ وَ فِیۡکُمۡ رَسُوۡلُہٗ: اللہ کے رسول (ص) تمہارے درمیان موجود ہیں۔ تم ہر مسئلے میں ان کی طرف رجوع کر سکتے ہو۔ ہر شبہے کو دور کر سکتے ہو، ہر سوال کا جواب حاصل کر سکتے ہو اور ان (ص) سے صادر ہونے والے معجزات کا مشاہدہ کر رہے ہو۔ زمان بعد از رسول (ص) پر بھی کسی حد تک اس کا اطلاق ہو سکتا ہے کہ قرآن و سنت کی موجودگی میں کوئی انصاف پسند انسان اسلام چھوڑ کر

دوسرا دین اختیار نہیں کر سکتا۔

اہم نکات

۱۔ اہل باطل ہمیشہ اپنی سازشوں میں مصروف رہتے ہیں، مگر قرآن و سنت جیسی عظیم نعمات کی موجودگی میں یہ سازشیں کارگر نہیں ہوسکتیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

۱۰۲۔ اے ایمان والو! اللہ کا خوف کرو جیسا کہ اس کا خوف کرنے کا حق ہے اور جان نہ دینا مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔

تفسیر آیات

پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ تقویٰ اپنے آپ کو ہر قسم کی گزند سے بچانے کا نام ہے۔ عام طور پر تقویٰ سے مراد ''اللہ سے ڈرنا'' لیا جاتا ہے، حالانکہ یہ تقویٰ کا لازمہ ہے۔ خدا سے ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے عدل سے ڈرو اور گناہ نہ کرو۔ کیونکہ گناہگار اور مجرم ہمیشہ عدالت سے خوفزدہ رہتا ہے۔

اس آیت میں فرمایا: تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ تقویٰ اختیار کرنے کا حق ہے۔ یعنی اطاعت کرو، کوئی معصیت نہ ہو اور شکر خدا کرو، جس میں کوئی کفرانِ نعمت نہ ہو۔ ذکر خدا کرو، جس میں کوئی غفلت نہ ہو۔ لیکن تقویٰ کا حق ادا کرنا بہت سے لوگوں کے لیے ممکن ہی نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں دوسری آیت میں فرمایا:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ....[۱] پس جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو....

اس آیت کو سابقہ آیت کے ساتھ ملایا جائے تو یہ مطلب سامنے آتا ہے کہ اللہ سے ڈرو جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے اور اس مقام کو حاصل کرنے کے لیے جہاں تک تم سے ہوسکتا ہے کوشش جاری رکھو۔ اس طرح سب کے لیے راہ تقویٰ اختیار کرنا ضروری ہے۔ البتہ ہر شخص کی استطاعت کے مطابق اس کے درجات و مراتب ہیں۔

وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ: موت ایک غیر اختیاری امر ہے۔ اس پر امر و نہی نہیں ہوسکتی۔ البتہ مرتے دم تک اپنے آپ کو اسلام پر باقی رکھنا ممکن ہے۔ اس لحاظ سے یہ حکم آیا کہ اپنے آپ کو دین اسلام کے اصولوں پر اس طرح قائم رکھو کہ حالت اسلام میں تمہاری موت واقع ہو۔

---

[۱] ۶۴ تغابن: ۱۶

احادیث

جناب ابو بصیر نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا: اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ کا کیا مطلب ہے؟ آپ (ع) نے فرمایا:

يُطَاعُ فَلَا يُعْصَى وَ يُذْكَرُ فَلَا يُنْسَى وَ يُشْكَرُ فَلَا يُكْفَرُ ۔[1]

تقویٰ کا حق اس طرح ادا ہوتا ہے کہ اللہ کی اطاعت کی جائے، پس اس کی معصیت نہ کی جائے۔ اللہ کا ذکر کیا جائے اور اس میں نسیان و غفلت نہ برتی جائے نیز اللہ کا شکر بجا لایا جائے اور کفران نعمت نہ کیا جائے۔

اسی مضمون کی روایت درمنثور میں رسول کریم (ص) سے بھی مروی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

من اتقی اللّٰہ حق تقاتہ اعطاہ اللّٰہ انسا بلا انیس و غناء بلا مال و عزا بلا سلطان۔[2]

جو تقویٰ کا حق ادا کرتا ہے، اس کو اللہ کسی انس دینے والے کے بغیر انس اور کسی مال کے بغیر بے محتاجی اور کسی بادشاہی کے بغیر عزت عطا فرمائے گا۔

اہم نکات

۱۔ ہر شخص پر فرض ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق تقویٰ اختیار کرے اور آخری دم تک اس پر قائم رہے۔

وَ اعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوۡا ۪ وَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ کُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِہٖۤ اِخۡوَانًا ۚ وَ کُنۡتُمۡ عَلٰی شَفَا حُفۡرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنۡقَذَکُمۡ مِّنۡہَا ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمۡ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمۡ تَہۡتَدُوۡنَ ﴿۱۰۳﴾

۱۰۳۔ اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ نہ ڈالو اور تم اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈالی اور اس کی نعمت سے تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ گئے تھے کہ اللہ نے تمہیں اس سے بچا لیا، اس طرح اللہ اپنی آیات کھول کر تمہارے لیے بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔

---

[1] وسائل الشیعۃ ۱۵: ۲۳۵　　[2] مستدرک الوسائل ۱۱: ۲۶۵

تشریح کلمات

اعۡتَصِمُوۡا: (ع ص م) الاعتصام۔ کسی چیز کو پکڑ کر مضبوطی سے تھام لینا۔

حَبل: رسی ۔ملا دینا۔ ہر وہ چیز جس سے دوسری چیز تک پہنچا جائے۔[1]

تفسیر آیات

اللہ کی رسی سے مراد اس کی کتاب اور اس کے رسول (ص) ہیں۔ بعض احادیث کے علاوہ سابقہ آیت (۱۰۱) اس بات کی دلیل ہے جس میں فرمایا: تُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتُ اللّٰہِ وَ فِیۡکُمۡ رَسُوۡلُہٗ ... تمہیں اللہ کی آیات سنائی جا رہی ہیں اور تمہارے درمیان اللہ کا رسول بھی موجود ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا:

وَ مَنۡ یَّعۡتَصِمۡ بِاللّٰہِ فَقَدۡ ہُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ۔ اور جو اللہ سے متمسک ہو جائے، وہ ضرور راہ راست پا لے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ سے متمسک ہونے سے مراد اس کی کتاب اور اس کے رسول (ص) سے متمسک ہونا ہے۔ اللہ سے متمسک ہونے کا حکم دینے کی بجائے اللہ کی رسی سے متمسک ہونے کا حکم دیا گیا، جس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی رسی اس کی کتاب اور اس کے رسول (ص) ہیں۔ اس سلسلے میں دوسرے اقوال میں تضاد نہیں ہے اور سب قابل جمع ہیں۔

وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا: جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم آتا ہے کہ سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو تو طبیعی طور پر اذہان میں ایک خطرے کا احساس ہوتا ہے۔ گویا اللہ کی طرف سے خطرے کا اعلان ہو رہا ہے اور لگتا ہے کہ کوئی سیلاب آنے والا ہے اور غرق آب ہونے کا خطرہ ہے یا کوئی طوفان آنے والا ہے، جس سے اس امت کی کشتی کا شیرازہ بکھرنے والا ہے یا کوئی آندھی آنے والی ہے، جو اس انجمن کو منتشر کر دے گی یا کوئی آفت آنے والی ہے، جو اس باعظمت امت کو قعر مذلت میں گرا دے گی۔ لہٰذا بچنا ہے تو اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو۔

وَّ لَا تَفَرَّقُوۡا: اس جملے سے مذکورہ خطرے کی نوعیت کا پتہ چلتا ہے کہ یہ کس قسم کا سیلاب، کس قدر خطرناک طوفان اور کتنی مہلک آندھی ہے کہ اگر یہ امت اس خطرے سے دوچار ہو جاتی ہے اور حَبۡل اللّٰہ سے متمسک بھی نہیں ہوتی تو اس کا شیرازہ کس طرح بکھر سکتا ہے اور اس کی عظمت کس طرح مذلت میں بدل سکتی ہے۔

----

[1] مفردات

خطرہ یہ ہے کہ امت مسلمہ قرآن و رسول (ص) کی تعلیمات کی روشنی میں اپنے دستور حیات کو چھوڑ کر جزئیات اور فروعات میں منہمک نہ ہوجائے۔ دین سے زیادہ مسلک عزیز نہ ہو جائے۔ ایمان پر قومی عصبیت غالب نہ آ جائے۔ قرآن پر نسلی و لسانی رجحانات کا غلبہ نہ ہوجائے اور سنت رسول (ص) پر گروہی مفادات غالب نہ آ جائیں۔ اس آنے والے خطرے کے پیش نظر قرآن متعدد مقامات پر اس امت کو تنبیہ کرتا ہے:

i۔ وَ لَا تَنَازَعُوۡا فَتَفۡشَلُوۡا وَ تَذۡهَبَ رِيۡحُكُمۡ ....[1]	آپس میں نزاع نہ کرو ورنہ ناکام رہو گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔
ii۔ اِنَّ الَّذِيۡنَ فَرَّقُوۡا دِيۡنَهُمۡ وَ كَانُوۡا شِيَعًا لَّسۡتَ مِنۡهُمۡ فِىۡ شَىۡءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمۡرُهُمۡ اِلَى اللّٰهِ ....[2]	جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور گروہوں میں بٹ گئے بے شک آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کا معاملہ یقیناً اللہ کے حوالے ہے۔
iii۔ وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِىۡ مُسۡتَقِيۡمًا فَاتَّبِعُوۡهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمۡ عَنۡ سَبِيۡلِهٖ ....[3]	اور یہی میرا سیدھا راستہ ہے اسی پر چلو اور مختلف راستوں پر نہ چلو ورنہ یہ تمہیں اللہ کے راستے سے ہٹا کر پراگندہ کر دیں گے ....
iv۔ وَلَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ تَفَرَّقُوۡا وَاخۡتَلَفُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡبَيِّنٰتُ ....[4]	اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو واضح دلائل آ جانے کے بعد بٹ گئے اور اختلاف کا شکار ہوئے....
v۔ فَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَ يُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَكَ بِالۡعُرۡوَةِ الۡوُثۡقٰى ۚ لَا انۡفِصَامَ لَهَا ....[5]	پس جو طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے بتحقیق اس نے نہ ٹوٹنے والا مضبوط سہارا تھام لیا۔

وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ ۔ اس امت کے حال کو ماضی سے مربوط کر کے یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ تم اللہ کے اس احسان کو یاد کرو کہ جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی۔ پس اس کی نعمت سے تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ ایک قیمتی تجربہ ہے کہ اللہ کی مضبوط رسی کو تھامنے سے پہلے آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے اور کفر و گمراہی اور دشمنی کے شعلوں کی لپیٹ میں تھے۔ اسلام کے زیر سایہ آنے کے بعد، امن و محبت اور سکون و اطمینان کی فضا اور اسلامی اخوت و برادری کے پرکیف ماحول میں تمہاری یہ سرگزشت تمہارے سامنے ہے۔ اسی کی روشنی میں اپنے مستقبل کا حال بھی

---

[1] ۸ انفال: ۴۶ [2] ۶ انعام: ۱۵۹ [3] ۶ انعام: ۱۵۳ [4] ۳ آل عمران: ۱۰۵ [5] ۲ بقرہ: ۲۵۶

متعین کرو اور خبردار رہو کہ کہیں لاعلمی کی وجہ سے آگ کے گڑھے کے کنارے کی طرف دوبارہ پلٹ نہ جاؤ۔

احادیث

امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے کہ حَبْل اللّٰہ سے مراد قرآن ہے۔[1]

تفسیر عیاشی میں مذکور ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

آلُ مُحَمَّدٍ هُم حَبۡلُ اللّٰهِ الَّذِیۡ اَمَرَ بِالۡاِعۡتِصَامِ بِهٖ۔[2]　　آل محمدؐ ہی وہ حَبْل اللّٰہ ہیں جن سے متمسک ہونے کا حکم قرآن میں آیا ہے۔

حضرت امام جعفر صادق (ع) سے ابان بن تغلب اور ابو حفص الصائغ روایت کرتے ہیں کہ آپ (ع) نے فرمایا:

نَحۡنُ حَبۡلُ اللّٰهِ۔[3]　　حبل اللّٰہ ہم ہیں۔

ابن جبیر نے اپنی کتاب نخب میں عبدی سے روایت کی ہے اور محمد بن علی عنیری نے بھی اپنی سند سے روایت کی ہے کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ (ص) سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا تو آپ (ص) نے حضرت علی علیہ السلام کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا:

هَذَا حَبۡلُ اللّٰهِ فَاعۡتَصِمُوۡا بِهٖ۔[4]　　یہ حبل اللہ ہیں ان سے متمسک رہو۔

ان دونوں روایتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، کیونکہ حدیث ثقلین سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن و اہل البیت (ع) دونوں حَبْل اللّٰہ ہیں اور یہ اس بات کے بھی منافی نہیں ہے کہ قرآن اور سنت رسول (ص) حَبْل اللّٰہ ہیں۔ کیونکہ اہل بیت رسول (ص) ہی سنت رسول (ص) کے محافظ، امت رسول (ص) کے امام اور جانشین رسول (ص) ہیں۔

حدیث ثقلین

عن ابی سعید الخدری، قال رسول اللّٰه: اِنِّیۡ تَارِکٌ فِیۡکُمُ الثَّقَلَیۡنِ کِتَابَ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ حَبۡلٌ مَمۡدُوۡدٌ مَا بَیۡنَ السَّمَاءِ وَ الۡاَرۡضِ وَ عِتۡرَتِیۡ اَهۡلَ بَیۡتِیۡ۔

ابو سعید خدری راوی ہیں کہ رسول اللہ (ص) نے فرمایا: میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں: ایک اللہ کی کتاب جو ایک لمبی رسی ہے آسمان اور زمین کے درمیان، دوسری میری عترت، میرے اہل بیت ہیں۔

---

[1] المیزان ۳: ۳۷۸　[2] بحار الانوار ۲۴: ۸۵۔ تفسیر العیاشی ۱: ۱۰۴ (چند الفاظ کے اختلاف کے ساتھ)

[3] شواھد التنزیل ۱: ۱۶۹۔ تفسیر ثعلبی بنقل الصراط المستقیم ۱: ۲۸۶　[4] الصراط المستقیم ۱: ۲۸۶۔ المناقب لابن شھر آشوب ۳: ۷۶

یہ حدیث رسول اکرم (ص) سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔ چنانچہ اس حدیث کو ۳۵ اصحاب نے رسول اللہ (ص) سے نقل کیا ہے۔ فریقین کے محدثین، مفسرین، مورخین اور سیرت نگاروں کی ایک بڑی جماعت نے اپنی کتب میں اس حدیث کو ثابت کیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو عبقات الانوار اور ملحقات احقاق الحق۔

واضح رہے کہ قرآن و رسول (ص) اور اہل بیت رسول (ص) حَبْل اللّٰہ کی تشکیل کے لیے ارکان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ مجموعی طور پر یہ سب حَبْل اللّٰہ ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اسلام کو سب سے زیادہ خطرہ فرقہ پرستی سے لاحق ہے۔

۲۔ قرآن مسلمانوں کو مسلک پرستی، گروہی مفادات اور نسلی تعصّبات کو چھوڑ کر قرآن و سنت کی تعلیمات کی روشنی میں دستور حیات اپنانے کی دعوت دیتا ہے۔

وَلۡتَکُنۡ مِّنۡکُمۡ اُمَّۃٌ یَّدۡعُوۡنَ اِلَی الۡخَیۡرِ وَ یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ یَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۰۴﴾

۱۰۴۔ اور تم میں ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو نیکی کی دعوت اور بھلائی کا حکم دے اور برائیوں سے روکے اور یہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔

تفسیر آیات

وَلۡتَکُنۡ کا جملہ امر اور حکم ہے، جس کے تحت واجب ہے کہ معاشرے میں ایک گروہ ایسا ہو جو امر بمعروف اور نہی از منکر (خوبیوں کو عام اور برائیوں کو دور) کرے۔

معاشرے میں انسانی و اخلاقی اقدار کو زندہ رکھنا اور ان اقدار کا دفاع کرنا، ضمیر کو زندہ رکھنا اور اس میں احساس و شعور بیدار رکھنا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل اور اسلامی معاشرے کو مختلف آلودگیوں سے پاک اور صاف رکھنے کے لیے امر بمعروف اور نہی از منکر ایک فلٹر ہے، جس سے یہ صحت مند معاشرہ ہمیشہ پاک اور صاف رہتا ہے۔

اسلام اپنے معاشرے میں ایک نظام دعوت قائم کر کے بیدار، باشعور اور ہمہ وقت مستعد معاشرہ تشکیل دینے کا اہتمام کرتا ہے، جس میں کسی ظالم کو ظلم، کسی خونخوار کو استحصال اور کسی استعماری طاقت کو سازش

کرنے کا موقع ہی میسر نہ آئے۔

وہ معاشرہ کبھی آسودہ حال نہیں ہوسکتا، جس میں ظالم کو ظلم سے روکنے کے لیے کوئی طاقت، جرائم کے سیلاب کو روکنے کے لیے ایک بند اور وحشیانہ خواہشات کو قابو کرنے کے لیے کوئی لگام نہ ہو۔

یہ ایک عظیم ذمہ داری اور ایک مشکل عمل ہے، کیونکہ اس کے لیے معاشرے کے مختلف عناصر سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ظالم کو عدل وانصاف پسند نہیں ہوتا، مجرم کو پاکیزگی نفس اچھی نہیں لگتی اور متکبر کو تواضع راس نہیں آتی۔ خواہشات اور مفادات کے ایک لشکر جرار سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔

الامر بالمعروف و النہی عن المنکر: قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کسی مفاد پرستی اور دیگر دنیاوی عوامل کی وجہ سے نہیں، بلکہ آپس کی محبت، اخوت اور ہمدردی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ عمل نفرت اور نخوت سے نہیں، بلکہ محبت اور ہمدردی سے انجام پاتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتُ بَعۡضُہُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ ۘ یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ ...[1]	اور مومن مرد اور مومنہ عورتیں ایک دوسرے کے بہی خواہ ہیں، وہ نیک کاموں کی ترغیب دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔

قوت جاذبہ اور قوت دافعہ کے بغیر کسی نظام اور انتظام میں توازن قائم نہیں رہ سکتا۔ امر بمعروف اور نہی از منکر اسلامی معاشرے میں صحت مند توازن برقرار رکھنے کے لیے قوت جاذبہ اور قوت دافعہ ہے۔ یہ معاشرہ معروف کو جذب اور منکر کو دفع کرتا ہے۔

اس فریضے کی اہمیت

کوئی بھی نظام اور قانون خواہ کتنا ہی جامع اور مفید کیوں نہ ہو، اس وقت تک نتیجہ خیز نہیں ہوتا، جب تک وہ عملی نفاذ کی صورت اختیار نہ کرے۔ چنانچہ دنیا کے تمام نظامہائے اجتماعی کو قانون اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی ضرورت ہوتی ہے اور انہی اداروں سے قانون اور نظام قائم رہتا ہے۔

درج ذیل احادیث میں امر بمعروف اور نہی از منکر کی اسی اہمیت کو بیان فرمایا گیا ہے:

حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے روایت ہے:

وَ مَا اَعۡمَالُ الۡبِرِّ کُلُّھَا وَ الۡجِھَادُ فِی سَبِیۡلِ اللّٰہِ عِنۡدَ الۡاَمۡرِ بِالۡمَعۡرُوفِ وَ النَّھۡیِ عَنِ الۡمُنۡکَرِ اِلَّا کَنَفۡثَۃٍ فِی بَحۡرٍ لُجِّیٍّ ۔[2]	تمام نیک اعمال اور جہاد فی سبیل اللہ، امر بمعروف اور نہی از منکر کے مقابلے میں ایک ٹھاٹھیں مارتے سمندر کے مقابلے میں ایک چھوٹے سے قطرے کی مانند ہیں۔

---

[1] ۹ توبہ: ۷۱
[2] وسائل الشیعۃ ۱۶: ۱۳۴۔ باب وجوب الامر والنھی ...

ایک اور روایت میں آپ (ع) کا ارشاد ہے:

غَایَۃُ الدِّیْنِ الْاَمْرُ بِالْمَعْرُوفِ وَ النَّھْیُ عَنِ الْمُنْکَرِ وَ اِقَامَۃُ الْحُدُودِ۔ [1]	دین کی غرض و غایت، امر بمعروف اور نہی از منکر اور حدود شریعت کو قائم رکھنا ہے۔

نیز آپ (ع) سے روایت ہے:

قَوَامُ الشَّرِیْعَۃِ اَلْاَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّھْیُ عَنِ الْمُنْکَرِ وَ اِقَامَۃُ الْحُدُوْدِ۔ [2]	شریعت کی بنیاد امر بمعروف و نہی از منکر اور حدود شریعت کو قائم رکھنا ہے۔

فلاحی مملکت: امر بمعروف اور نہی از منکر (خوبیوں کو عام کرنے اور برائیوں کو دور کرنے) کے ذریعے ایک مہذب قوم وجود میں آ سکتی ہے۔ قوم تہذیب و ثقافت کی مالک ہونے کی صورت میں شعور کی اس منزل پر فائز ہو گی کہ کسی ظالم کو ظلم و استحصال کرنے کا موقع نہیں دیا جائے گا، ورنہ ایک تاریک معاشرے میں ظالم ملک کی ثروت پر دن دھاڑے ڈاکہ ڈالتا ہے اور لوگوں کو پتہ تک نہیں چلتا۔ جیسا کہ ہمارے معاشروں کا حال ہے۔

مولائے متقیان حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

لَا تَتْرُکُوا الْاَمْرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّھْیَ عَنِ الْمُنْکَرِ فَیُوَلِّی اللّٰہُ اَمْرَکُمْ شِرَارَکُمْ ثُمَّ تَدْعُونَ فَلَا یُسْتَجَابُ لَکُمْ۔ [3]	امر بمعروف اور نہی از منکر کو ترک نہ کرو، ورنہ اللہ تم پر بدترین لوگوں کو مسلط کر دے گا۔ پھر تم (اس سے نجات کے لیے) دعا کرو گے، تمہاری دعا قبول نہ ہو گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک تاریک معاشرہ خود ظالم کو جنم دیتا ہے۔

مملکت کی خوشحالی: ایک باشعور قوم کے وجود میں آنے سے استحصالی اور طبقاتی نظام کو تقویت نہیں ملے گی۔ نتیجتاً اس کی زمینیں آباد ہوں گی، جس سے رزق کی فراوانی ہو گی اور ملک کا دفاعی نظام بھی طاقت ور ہو گا۔ اس سلسلے میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ الْاَمْرَ بِالْمَعْرُوفِ وَ النَّھْیَ عَنِ الْمُنْکَرِ سَبِیْلُ الْاَنْبِیَآءِ وَ مِنْھَاجُ الصُّلَحَآءِ فَرِیضَۃٌ عَظِیمَۃٌ بِھَا تُقَامُ الْفَرَائِضُ وَ تَامَنُ الْمَذَاھِبُ وَ تَحِلُّ	امر بمعروف و نہی از منکر انبیاء (ع) کا راستہ صالح لوگوں کی روش اور عظیم ذمہ داری ہے جس سے واجبات کی ادائیگی ہوتی ہے، گزرگاہوں میں امن ملتا ہے اور کمائی حلال کی ہو جاتی ہے۔ ظلم کا مداوا ہو جاتا ہے،

---

[1] مستدرک الوسائل ۱۲: ۱۸۵ باب وجوبھما و تحریم ترکھما...۔ غرر الحکم ص۳۳۴ الفصل الثانی فی الامر بالمعروف و النھی...

[2] غرر الحکم ص۳۳۲۔ الفصل الثانی فی الامر بالمعروف و النھی... [3] اصول الکافی ۷: ۵۱ باب صدقات النبی (ص)

الْمَكَاسِبُ وَ تُرَدُّ الْمَظَالِمُ وَ تُعْمَرُ الْاَرْضُ وَ يُنْتَصَفُ مِنَ الْاَعْدَاءِ وَ يَسْتَقِيْمُ الْاَمْرُ۔ [1]

زمین آباد ہو جاتی ہے، دشمنوں کی طرف سے انصاف مل جاتا ہے اور تمام معاملات درست رہتے ہیں۔

سلامتی کی ضمانت: امر بمعروف و نہی از منکر جن علماء وصلحاء کی ذمہ داری ہوتی ہے، ان میں سے اکثر اس لیے اس فریضے پر عمل نہیں کرتے کہ انہیں لوگوں سے یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ اگر میں حق بات کروں تو میرے مفادات خطرے میں پڑ جائیں گے۔ یہ حضرات اگر مولائے متقیان حضرت علی علیہ السلام کے اس فرمان پر ایمان لائیں تو اس عظیم ذمہ داری سے سرخ روئی کے ساتھ سبکدوش ہو جائیں:

اِنَّ الْاَمْرَ بِالْمَعْرُوفِ وَ النَّهْیَ عَنِ الْمُنْكَرِ لَا يُقَرِّبَانِ مِنْ اَجَلٍ وَ لَا يَنْقُصَانِ مِنْ رِزْقٍ۔ [2]

امر بمعروف و نہی از منکر نہ موت کو نزدیک کرتا ہے اور نہ روزی میں کمی لاتا ہے۔

بدترین قوم: ظاہر ہے کہ ایک معاشرے کو تمام تر سعادتوں سے بہرہ مند کرنے والا یہ نظام جس معاشرے میں نہ ہو اور اس تقدیر ساز پروگرام کو معیوب سمجھا جائے تو ایسے معاشرے میں قوم بدتر حالات سے دوچار ہوگی۔ چنانچہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

بِئْسَ الْقَوْمُ قَوْمٌ يَعِيبُونَ الْاَمْرَ بِالْمَعْرُوفِ وَ النَّهْیَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ [3]

بدترین قوم، وہ قوم ہے جو امر بمعروف و نہی از منکر کو معیوب سمجھتی ہو۔

رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ (ص) نے فرمایا:

لَا يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَا اَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تَعَاوَنُوا عَلَی الْبِرِّ وَ التَّقْوَی فَاِذَا لَمْ يَفْعَلُوا ذَلِكَ نُزِعَتْ مِنْهُمُ الْبَرَكَاتُ وَ سُلِّطَ بَعْضُهُمْ عَلَی بَعْضٍ وَ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ نَاصِرٌ فِی الْاَرْضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ۔ [4]

جب تک لوگ امر بمعروف اور نہی از منکر، نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرتے رہیں گے، خیر و عافیت میں رہیں گے اور اس بات کو جب وہ ترک کر دیں گے تو ان سے برکتیں سلب کر لی جائیں گی اور وہ ایک دوسرے پر مسلط ہو جائیں گے اور ان کے لیے کوئی مددگار نہ زمین میں ہوگا اور نہ آسمان میں۔

یہ فریضہ کون ادا کرے؟: آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم میں ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو یہ ذمہ داری انجام دے۔ لیکن اس کے لیے ایک خاص صنف متعین نہیں ہے، بلکہ درج ذیل شرائط موجود

---

[1] اصول الکافی ۵ : ۵۵
[2] وسائل الشیعۃ ۱۶ : ۱۳۴ ۔ نہج البلاغۃ ۔ کلمات قصار : ۳۷۴
[3] اصول الکافی ۵ : ۵۷ ۔ التہذیب ۶ : ۱۷۶ ۔ وسائل الشیعۃ ۱۶ : ۱۱۷
[4] التہذیب ۶ : ۱۸۱ ۔ مستدرک الوسائل ۱۶ : ۱۱۲۳

ہونے کی صورت میں علماء، غیر علماء سب پر واجب ہے:

i۔ معروف اور منکر کو جانتا ہو۔ اگر نہیں جانتا تو واجب نہیں ہے۔ البتہ منکر و معروف کا سیکھنا واجب ہے۔

ii۔ نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کی صورت میں اثر پذیری کا امکان ہو۔ اگر مخاطب پر کسی قسم کے اثر کا امکان نہیں ہے تو واجب نہیں ہے۔ البتہ برائی سے دل میں کراہت رکھنا، بعض فقہاء احتیاطاً واجب سمجھتے ہیں۔

iii۔ منکر کا ارتکاب کرنے والا خود سے باز نہ آ رہا ہو۔ اگر خود سے باز آنے کے آثار سامنے آ جائیں تو واجب نہیں ہے۔

iv۔ معروف اور منکر خود پر بھی نافذ ہو۔ اگر خود پر کسی وجہ سے نافذ نہ ہو تو واجب نہیں۔ مثلاً اشتباہ کی وجہ سے وہ کسی حرام چیز کو حلال سمجھ رہا ہو یا دوائی کے طور پر ایک حرام چیز کو کھانے پر خود مجبور ہو رہا ہو تو اس سے دوسروں کو منع کرنا واجب نہیں ہے۔

v۔ اس عمل کے انجام دینے کی وجہ سے ناقابل تحمل ضرر نہ پہنچتا ہو۔

واضح رہے کہ امر بمعروف و نہی از منکر اپنے اہل خانہ کے بارے میں زیادہ تاکید سے واجب ہے۔

عزاداری اور امر بمعروف و نہی از منکر: سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کے روضہ اقدس کا زائر، قبر مطہر کی طرف رخ کر کے اپنی زیارت میں سلام کے بعد حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے فرمان کے مطابق یہ جملے ادا کرتا ہے:

اَشْھَدُ اَنَّکَ قَدْ اَقَمْتَ الصَّلَاۃَ وَ آتَیْتَ الزَّکَاۃَ وَ اَمَرْتَ بِالْمَعْرُوفِ وَ نَھَیْتَ عَنِ الْمُنْکَرِ..۔[1]	میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے نماز قائم کی، زکوۃ ادا کی اور امر بمعروف و نہی از منکر فرمایا۔

خود سید الشہداء علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ (ع) کربلا کے راستے میں فرمایا کرتے تھے:

اُرِیدُ اَنْ آمُرَ بِالْمَعْرُوفِ وَ اَنْھَی عَنِ الْمُنْکَرِ وَ اَسِیرَ بِسِیرَۃِ جَدِّیْ وَ اَبِیْ۔[2]	میں امر بمعروف و نہی از منکر کرنا چاہتا ہوں اور اپنے نانا اور پدر بزرگوار کی سیرت پر چلنا چاہتا ہوں۔

اہم نکات

۱۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر، استحکام نظام اور صحت مند معاشرے کی بنیاد ہیں۔

۲۔ بدترین قوم وہ ہے جو امر بمعروف اور نہی از منکر سے کراہت کرے۔

---

[1] اصول الکافی ۴ : ۵۷۰ باب زیارت۔ [2] بحار الانوار ۴۴ : ۳۲۸

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝۱۰۵

۱۰۵۔ اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو واضح دلائل آ جانے کے بعد بٹ گئے اور اختلاف کا شکار ہوئے اور ایسے لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہوگا۔

تفسیر آیات

سابقہ آیت میں بھی ذکر کیا گیا ہے کہ قرآن آیندہ وقوع پذیر ہونے والے حالات کے پیش نظر امت کو پیش آنے والے حادثات سے قبل از وقت خبردار کرتا ہے۔ قرآن جب بھی کسی معاملے میں تاکیدی جملوں کے ساتھ تنبیہ کرتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ یہ حادثہ پیش آنے والا ہے یا اس واقعے کا ارتکاب ہونے والا ہے۔

چنانچہ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ حضور (ص) کی حیات کے آخری ایام میں ہی یہ اختلاف خود حضور (ص) کے سامنے شروع ہوا اور یہ اختلاف اس قدر بڑھ گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان اختلاف کرنے والوں کو اپنی بارگاہ سے قوموا عنی کہکر نکال دیا۔ ملاحظہ ہو صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۸۴۶ کتاب المرضی حدیث ۵۶۶۹۔ صحیح مسلم باب ترک الوصیۃ جلد دوم صفحہ ۴۲۔

اس میں وہ اختلاف و افتراق بھی شامل ہے جو قطعی نص کے مقابلے میں ذاتی رائے پر عمل کے ذریعے اجتہاد کے نام سے ہوا کرتا ہے۔

احادیث

رسول اکرم (ص) سے روایت ہے:

اِفْتَرَقَتِ الْيَهُودُ عَلَى اِحْدَى وَ سَبْعِينَ فِرْقَةٍ، وَ تَفَرَّقَتِ النَّصَارَى عَلَى اِثْنَيْنِ وَ سَبْعِينَ فِرْقَةٍ، وَتَفْتَرِقُ اُمَّتِي عَلَى ثَلَاثٍ وَ سَبْعِينَ فِرْقَةٍ۔[1]

یہودی اکہتر (۷۱) فرقوں میں بٹ گئے اور نصاریٰ بہتر (۷۲) فرقوں میں اور میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی۔

یہ روایت مختلف عبارات میں مستند شیعہ کتب اور صحاح اہل سنت میں مذکور ہے۔ بعض روایات کے آخر میں ہے: كُلُّهُمْ فِي النَّارِ اِلَّا وَاحِدَةً۔ سب فرقے دوزخی ہوں گے سوائے ایک فرقے کے۔

---

[1] سنن ابن ماجہ باب افتراق الامم۔ صحیح ترمذی۔ سنن ابی داؤد باب شرح السنة۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے مروی ہے:

كُلُّ مَا كَانَ فِي الْأُمَمِ السَّالِفَةِ فَإِنَّهُ يَكُوْنُ فِي هَذِهِ الْأُمَّةِ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ وَ الْقُذَّةَ بِالْقُذَّةِ۔

سابقہ امتوں میں جو کچھ رونما ہوا ہے، وہ اس امت میں بھی قدم بقدم اور نشانہ بہ نشانہ رونما ہوگا۔

یہ روایت بھی تفسیر قمی، اکمال الدین اور صحیح ترمذی وغیرہ میں مختلف عبارتوں سے مذکور ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد پیش آنے والے واقعات کے بارے میں مزید توضیح کے لیے سورہ آل عمران کی آیت ۱۴۴ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

اہم نکات

۱۔ عالم اسلام کی پسماندگی، مسائل اور مشکلات کا سب سے بڑا سبب فرقہ پرستی ہے۔

۲۔ فرمان رسول(ص) کی غلط توجیہ اور افتراق کی ابتدا رسول اللہ (ص) کی زندگی کے آخری لمحات میں ہوئی۔

يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۟ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾

۱۰۶۔ قیامت کے دن کچھ لوگ سرخرو اور کچھ لوگ سیاہ رو ہوں گے، پس رو سیاہ لوگوں سے کہا جائے گا: کیا تم نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا؟ پس اب اپنے اس کفر کے بدلے عذاب چکھو۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

۱۰۷۔ اور جن کے چہرے روشن ہوں گے وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

تفسیر آیات

سابقہ آیات میں دو قسم کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ دعوت الی الخیر اور تفرقہ بازی سے اجتناب۔

اس آیت میں دو نتائج بیان ہو رہے ہیں، جو سابقہ دو آیات سے مربوط ہیں۔ یعنی جو دعوت الی الخیر پر عمل کرتے ہیں وہ فلاح پائیں گے، بروز قیامت وہ خوش ہوں گے اور ان کے چہرے منور ہوں گے۔ جب کہ

تفرقہ باز لوگ عذاب عظیم اور تاریکیوں میں ہوں گے اور ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔

۱۔ اَکَفَرۡتُمۡ بَعۡدَ اِیۡمَانِکُمۡ : ایمان کے بعد کفر سے مراد، بعض لوگ اہل کتاب کو لیتے ہیں اور بعض لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مرتد ہونے والے اہل بدعت کو لیتے ہیں۔ ان میں خوارج بھی شامل ہیں۔ بعض منافقین مراد لیتے ہیں۔ آیت کی تعبیر میں ایمان کے بعد کفر کا ذکر ہے، لہٰذا ان میں رسولؐ کے بعد مرتد ہونے والے مصداق قرار پاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ یہ لوگ اہل البدع و الاھواء اہل بدعت اور خواہش پرست لوگ ہیں۔[۱]

۲۔ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اسۡوَدَّتۡ وُجُوۡہُہُمۡ : جن کے چہرے چمکتے ہوں گے، وہ رحمت خدا میں ہمیشہ رہیں گے۔ چہروں کے چمکنے سے مراد آخرت کی کامیابی سے چہروں کا خوشی سے کھلنا مقصود ہوسکتا ہے۔ بہرحال اہل جنت کے چہرے منور ہوں گے اور ان کے آگے بھی نور ہو گا۔

یَوۡمَ تَرَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ یَسۡعٰی نُوۡرُہُمۡ بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ بِاَیۡمَانِہِمۡ ....[۲]

قیامت کے دن آپ مومنین اور مومنات کو دیکھیں گے کہ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کی دائیں جانب دوڑ رہا ہو گا...

اہم نکات

۱۔ افتراق و پراگندگی انسان کو روسیاہ بنا کر کفر کی وادی میں دھکیل دیتی ہے۔

۲۔ دعوت الی الخیر انسان کی سرخروئی اور حیات ابدی کی ضامن ہے۔

تِلۡکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتۡلُوۡہَا عَلَیۡکَ بِالۡحَقِّ ؕ وَ مَا اللّٰہُ یُرِیۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۰۸﴾

۱۰۸۔ یہ ہیں اللہ کی نشانیاں جو صحیح انداز میں ہم آپ کو سنا رہے ہیں اور اللہ اہل عالم پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔

وَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ اِلَی اللّٰہِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۱۰۹﴾

۱۰۹۔ اور آسمانوں اور زمین کی ساری چیزوں کا مالک اللہ ہے اور تمام معاملات کی بازگشت اللہ ہی کی طرف ہے۔

تفسیر آیات

کفار اور تفرقہ بازوں کے ساتھ جو کچھ ہونے والا ہے وہ بالکل وضاحت کے ساتھ بتایا جا رہا ہے۔

---

[۱] مجمع البیان ذیل آیت۔ بحار الانوار ۳۳ : ۳۳۷
[۲] ۵۷ الحدید۔ ۱۲

ان کے ساتھ جو کچھ بھی سلوک کیا جائے گا، وہ خود ان کے اپنے اعمال کا لازمی نتیجہ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی قسم کی زیادتی اور ظلم کا تصور ہو ہی نہیں سکتا۔ بھلا وہ کس غرض سے کسی پر ظلم کرے گا، جب کہ تمام آسمانوں اور زمین کی موجودات اس کے قبضہ قدرت میں ہیں؟ ظلم وہ کرتا ہے جو دوسروں اور دوسروں کی چیزوں کا محتاج ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ اپنی خالقیت میں عادل ہے۔ اپنے تخلیقی عمل میں ظلم نہیں کرتا۔ یعنی حکمت کے منافی کوئی تخلیق نہیں فرماتا۔ اللہ کا تکوینی نظام بھی عدل و انصاف پر قائم ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ اپنے تقنینی عمل میں ظلم نہیں کرتا، اللہ کا وضع کردہ قانون بھی عدل و انصاف پر قائم ہے۔

اہم نکات

۱۔ ظلم، احتیاج کا نتیجہ ہے۔ اللہ ظلم نہیں کرتا، کیونکہ وہ محتاج نہیں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّھُمْ ۭ مِنْھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۱۱۰

۱۱۰۔ تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے پیدا کیے گئے ہو، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو خود ان کے لیے بہتر تھا، اگرچہ ان میں سے کچھ لوگ ایمان والے ہیں لیکن ان کی اکثریت فاسق ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ كُنْتُمْ: ایک نظریہ کنتم کان تامہ ہے۔ یعنی تم بہترین امت ہو۔ دوسرا نظریہ ہے: کان ناقصہ۔ تم بہترین تھے۔ یعنی صدر اسلام میں تم بہترین امت تھے۔ امر بمعروف نہی از منکر کرتے تھے۔ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ تمہارا ایمان باللہ بھی مضبوط تھا۔

ہم نے پہلا نظریہ اختیار کیا۔ چونکہ آیت میں وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ قرینہ بنتا ہے کہ یہ خطاب امت مسلمہ سے ہے کہ اہل کتاب اگر ایمان لے آتے تو یہ ان کے لیے بہتر تھا۔ وہ اس امت میں شامل ہو جاتے۔

۲۔ خَیۡرَ اُمَّۃٍ: بہترین امت ہونے کا دار و مدار امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے وظیفے کی انجام دہی پر موقوف ہے۔ اس آیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو امت مسلمہ کی بہتری کی وجہ اور علت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس میں ساری امت شامل نہیں ہے بلکہ امت کا وہ گروہ مقصود ہے، جو اس ذمہ داری پر عمل کرتا ہے۔ جیسا کہ سابقہ آیت (۱۰۴) میں فرمایا:

وَلۡتَکُنۡ مِّنۡکُمۡ اُمَّۃٌ یَّدۡعُوۡنَ اِلَی الۡخَیۡرِ ....۔　　اور تم میں ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو نیکی کی دعوت دے....

ان دو عظیم فرائض سے اسلام کا انسان ساز اور حیات آفرین نظام حیات اور دستور زندگی عملاً نافذ رہتا ہے اور نفاذ اسلام کا ذریعہ یہی دو عظیم فرائض ہیں۔ لہٰذا ان دونوں کا ذکر، ایمان سے پہلے کیا گیا ہے۔

۳۔ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ: انسانوں کی امامت و رہنمائی کے منصب سے بنی اسرائیل کو معزول کرنے کے بعد جب اس منصب کا تاج امت مسلمہ کے سر پر سجایا گیا تو اس قائدانہ ذمہ داری سونپنے کے بعد یہ اعزاز فرمایا: تم بہترین امت ہو۔ اُخۡرِجَتۡ پیدا کیے گئے، لِلنَّاسِ لوگوں کے لیے۔ یعنی اس امت کی غرض تخلیق یہی ہے کہ لوگوں کی رہنمائی کریں۔

۴۔ وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ: امر بمعروف و نہی از منکر کی وجہ سے یہ امت بہترین امت قرار پاتی ہے۔ تاہم یہ کام ایک ایسا مستحسن کام ہے کہ اسے دیگر امتیں بھی اپنا سکتی ہیں۔ لہٰذا بعد میں وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ کی قید سے دیگر امتیں خارج ہو جاتی ہیں، جن میں ایمان نہیں ہے۔ اسی لیے بعد میں فرمایا: وَلَوۡ اٰمَنَ اَہۡلُ الۡکِتٰبِ اگر اہل ایمان بھی ایمان لے آتے تو ان کے لیے بہتر تھا۔

۵۔ مِنۡہُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ: البتہ اہل کتاب میں سے بعض ایمان لے آئے ہیں۔

۶۔ وَاَکۡثَرُہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ: اہل کتاب کی اکثریت فاسق ہے۔ اگر ایمان سے مراد اسلام پر ایمان ہے تو فاسق سے مراد خروج از ایمان ہے۔ اگر ایمان سے مراد ایمان بہ دین اہل کتاب لیا جائے تو فاسق سے مراد، ان کے اپنے دین سے نافرمانی ہو گی۔

وَلَوۡ اٰمَنَ اَہۡلُ الۡکِتٰبِ: اہل کتاب اگر تمہاری قیادت کو تسلیم کر کے رسول اسلام (ص) پر ایمان لے آتے تو اس میں خود اہل کتاب کی بھلائی تھی اور ایمان کی وجہ سے وہ بھی خیر امت میں شامل ہو جاتے۔

احادیث

در منثور میں مذکور ہے: خیر امت سے مراد اہل بیت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

اہم نکات

۱۔　　ہر اس اچھی بات کا دوسروں تک پہنچانا واجب ہے جو آپ کے علم میں ہے۔

---

[۱] ۳ آل عمران: ۱۰۴

۲۔ ارتکاب گناہ سے روکنا ضروری ہے۔ طاقتور کے لیے طاقت کے ذریعے اور کمزور کے لیے زبانی طور پر واجب ہے اور روکنا غیر مؤثر ہو تو قلبی کراہت ضروری ہے۔

۳۔ اصلاح معاشرہ اور امر بالمعروف کرنے والے ہی بہترین امت ہونے کے حقدار ہیں۔

۴۔ خیر امت کے منصب پر فائز رہنے کی شرط ایمان اور امر بالمعروف ہے۔

۵۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر انفرادی، اجتماعی اور ریاستی فریضہ ہے۔

لَنۡ یَّضُرُّوۡکُمۡ اِلَّاۤ اَذًی ؕ وَ اِنۡ یُّقَاتِلُوۡکُمۡ یُوَلُّوۡکُمُ الۡاَدۡبَارَ ۟ ثُمَّ لَا یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۱۱۱﴾

۱۱۱۔ یہ لوگ ایذا رسانی کے سوا تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور اگر تمہارے ساتھ لڑائی کی نوبت آئی تو یہ تمہیں پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں گے، پھر انہیں کہیں سے مدد نہیں ملے گی۔

تفسیر آیات

اگر مسلمان خیر امت کے منصب پر فائز رہنے کی شرط یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تحریک سے وابستہ رہیں تو اس صورت میں تین بشارتیں موجود ہیں:

اول: لَنۡ یَّضُرُّوۡکُمۡ: دشمن انہیں قابل ذکر ضرر نہیں پہنچا سکیں گے۔

دوم: یُوَلُّوۡکُمُ الۡاَدۡبَارَ: اگر دشمن میدان جنگ میں مسلمانوں کا مقابلہ کریں تو انہیں شکست ہوگی۔

سوم: لَا یُنۡصَرُوۡنَ: یہ کہ دشمن بے یارو مددگار رہیں گے اور ان کا کوئی حمایتی نہ ہوگا۔

سیاق آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں دشمن سے مراد اہل کتاب ہیں۔

اہم نکات

۱۔ مسلمانوں کی زبوں حالی کا ایک اہم سبب حکومتی اور معاشرتی سطح پر امر بالمعروف سے روگردانی ہے۔

ضُرِبَتۡ عَلَیۡہِمُ الذِّلَّۃُ اَیۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ حَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ

۱۱۲۔ یہ جہاں بھی ہوں گے ذلت و خواری سے دوچار ہوں گے مگر یہ کہ اللہ کی پناہ سے اور لوگوں کی پناہ سے متمسک ہو جائیں اور یہ اللہ

ۓ حضرت حذیفہ کی تحریک پر عہد عثمانی میں امت کو ایک قرائت پر متحد کر کے ایک رہنما نسخہ تیار کیا گیا تو اس میں یہاں خلاف قاعدہ واو کے بعد الف نہیں ہے۔ چونکہ قاعدۃً و بآء وا ہونا چاہیے۔ اس قسم کی املائی خلاف قاعدہ اور بھی ہیں۔ مثلاً سورہ نمل آیت ۲۱ میں لَاَذۡبَحَنَّہٗ کی جگہ لَااَذۡبَحَنَّہٗ ہے اور سورہ آل عمران آیت ۱۵۸ میں لَاِلَی اللّٰہِ کی بجائے لَااِلَی اللّٰہِ ہے۔ اس قسم کی دیگر مثالیں بھی ہیں۔ لیکن امت نے ان خلاف قاعدہ املاء کی بھی تصحیح اس خوف کی وجہ سے نہیں کی کہ بعد میں لوگ تصحیح کے نام سے قرآن میں تبدیلی نہ لائیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امت قرآن نے قرآن کے تحفظ کے لیے کس قدر احتیاط سے کام لیا ہے۔

وَ ضُرِبَتۡ عَلَیۡہِمُ الۡمَسۡکَنَۃُ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَانُوۡا یَکۡفُرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَ یَقۡتُلُوۡنَ الۡاَنۡۢبِیَآءَ بِغَیۡرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوۡا وَّ کَانُوۡا یَعۡتَدُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾	کے غضب میں مبتلا رہیں گے اور ان پر محتاجی محتاجی مسلط کر دی گئی ہے، یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے، ان (جرائم کے ارتکاب) کا سبب یہ ہے کہ وہ نافرمانی اور زیادتی کرتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ ضُرِبَتۡ عَلَیۡہِمُ الذِّلَّۃُ: سلسلہ کلام اہل کتاب کے بارے میں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے حق میں یہ ذلت و خواری قانون جزیہ وغیرہ نافذ ہونے کی وجہ سے ہو اور اسلامی شریعت کی رو سے یہ لوگ ذلیل ٹھہریں، جب تک وہ اسلامی قوانین کی بالادستی قبول نہ کریں یا مسلمانوں کی امان میں پناہ نہ لیں۔

ممکن ہے کہ اللہ ان کی تقدیر کی پیشگوئی فرما رہا ہو کہ یہ لوگ ہمیشہ ذلت و خواری سے دوچار رہیں گے۔

۲۔ اَیۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا: وہ جہاں کہیں بھی ہوں گے۔ مشرق میں ہوں یا مغرب میں، ذلت و خواری ان کا مقدر ہو گا۔ یہ ذلت و مسکنت صاحب المیزان کے نزدیک تشریعی ہے کہ ان کو قانونی بالا دستی نصیب نہ ہو گی اور ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں ان کی ذلت و خواری کی پیشگوئی ہو۔

۳۔ اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰہِ: ان کو اگر ذلت و خواری سے نجات ملے گی تو بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰہِ سے ملے گی۔ حبل رسی کو کہتے ہیں جو عھد من اللّٰہ کے معنوں میں ہیں۔ یعنی اللہ کے قانون سے عدم بغاوت سے عبارت ہے۔ وَ حَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ مؤمنوں سے امن کا معاہدہ ہو جائے تو ان کو امن و سکون مل سکے گا اور اگر انہیں کہیں امن و سکون نصیب ہو گا تو دوسروں کی مہربانی و حمایت سے ہو گا۔ یعنی کبھی اللہ کے قانون کی پناہ میں اور کبھی دوسرے لوگوں کے رحم و کرم کے سہارے سکھ اور چین نصیب ہو سکے گا۔

اس آیت میں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اس میں بعض گناہوں کو دیگر جرائم کے ارتکاب کے سبب اور زینے کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

۴۔ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَانُوۡا یَکۡفُرُوۡنَ: یہ ذلت و خواری ان کے کفر اور انبیاء کے ناحق قتل کی وجہ سے ان کو نصیب ہوئی۔

۵۔ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوۡا: کفر و قتل کے پیچھے جو سبب کارفرما تھا وہ ان کی معصیت ہے۔ خلاصہ یہ ہے:

یہ لوگ ذلت و خواری، غضب الٰہی اور فقر و مسکینی سے دوچار ہوئے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے۔

ان کے کفر و قتل کا سبب وہ معصیت اور زیادتی ہے جسے انہوں نے اپنا رکھا تھا۔

اہم نکات

۱۔ چھوٹے گناہوں کو اہمیت نہ دیتے ہوئے ان کے مکرر ارتکاب سے بڑے جرائم کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔

۲۔ ایمان و عمل صالح باعث عزت، جب کہ کفر و عصیان باعث ذلت ہے۔

۳۔ ذلت اور زبوں حالی سے نجات کا واحد راستہ خالق و مخلوق دونوں سے مثبت و مستحکم روابط برقرار رکھنا ہے۔

لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

۱۱۳۔ سب برابر نہیں ہیں۔ اہل کتاب میں کچھ (لوگ) ایسے بھی ہیں جو (حکم خدا پر) قائم ہیں، رات کے وقت آیات خدا کی تلاوت کرتے ہیں اور سربسجود ہوتے ہیں۔

يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

۱۱۴۔ وہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے، نیک کاموں کا حکم دیتے، برائیوں سے روکتے اور بھلائی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور یہی صالح لوگوں میں سے ہیں۔

وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

۱۱۵۔ اور یہ لوگ نیکی کا جو کام بھی انجام دیں گے اس کی ناقدری نہ ہو گی اور اللہ تقویٰ والوں کو خوب جانتا ہے۔

تشریح کلمات

اٰنَآءَ: (ا ن ی) انی یا انوا کی جمع ہے۔ یعنی وقت۔

يُسَارِعُوْنَ: (س ر ع) مسارعت۔ سرعت۔ بروقت اور بلاتاخیر انجام دینا۔ سرعت اور عجلت میں یہ

فرق ہے کہ سرعت سستی کے مقابلے میں اور عجلت سنجیدگی کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا سرعت اور مسارعت پسندیدہ اور عجلت ناپسندیدہ عمل ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَیۡسُوۡا سَوَآءً: ان آیات میں ایک ممکنہ غلط فہمی کا ازالہ ہے کہ اہل کتاب اور خاص کر یہودیوں کی سیاہ کاریاں دیکھ کر مسلمانوں کے ذہن میں ایک نسلی منافرت اور قومی عصبیت پیدا نہ ہو جائے۔ اس لیے انہیں بتایا گیا کہ تمام اہل کتاب کو یکساں نہ سمجھو اور ان سے نسلی اور قبائلی بنیادوں پر تعصب نہ برتو، کیونکہ ان میں اہل ایمان، صالح اور متقی لوگ بھی ہیں، جو اپنے غیر محرّف دین پر قائم ہیں۔

۲۔ اُمَّۃٌ قَآئِمَۃٌ: قائم سے مراد حق پر ثابت قدم ہیں۔ یعنی اپنے انبیاء کے لائے ہوئے دین پر قائم اور ثابت قدم ہیں۔ دوسرے اکثر لوگوں کی طرح منحرف نہیں ہوئے۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا:

وَ مِنۡ قَوۡمِ مُوۡسٰۤی اُمَّۃٌ یَّہۡدُوۡنَ بِالۡحَقِّ وَ بِہٖ یَعۡدِلُوۡنَ ﴿۱﴾	اور قوم موسیٰ میں ایک جماعت ایسی تھی جو حق کے مطابق رہنمائی اور اسی کے مطابق عدل کرتی تھی۔

۳۔ یَّتۡلُوۡنَ اٰیٰتِ اللّٰہِ: وہ اپنی غیر محرّف کتاب کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں اور ان کے غیر محرّف دین میں رائج دعاؤں سے اللہ کی بارگاہ میں قرب حاصل کرتے ہیں۔

۴۔ یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ: وہ اللہ تعالیٰ کی وحدت پر ایمان لے آئے ہیں۔ شرک نہیں کرتے اور روز آخرت پر بھی ان کا ایمان ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنی آخرت کو چند سکوں کے عوض فروخت نہیں کرتے۔

۵۔ وَ یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ: امر بمعروف اور نہی از منکر کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔ اگرچہ اپنی امت میں ان کی کوئی آواز نہیں ہوتی اور قلیل تعداد میں ہونے کی وجہ سے ان کو معاشرے میں کوئی مقام نہیں ملتا، تاہم وہ اپنے فریضہ کو انجام دیتے ہیں۔

۶۔ وَ یُسَارِعُوۡنَ فِی الۡخَیۡرٰتِ: اور بھلائی کے کاموں میں پیش قدم ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہر مؤمن کا شیوہ ہے۔

۷۔ وَ مَا یَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَلَنۡ یُّکۡفَرُوۡہُ: یہ لوگ جو بھی کار خیر انجام دیں گے اس کی ناقدری نہ ہو گی۔ فَلَنۡ یُّکۡفَرُوۡہُ میں یکفرو ناشکری کے معنوں میں ہے۔ یعنی ان کے کارہائے خیر کو چھپایا نہیں جائے گا۔ اس کے آثار ثواب کی شکل میں ظاہر ہوں گے۔

اہم نکات

۱۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر تمام ادیان الٰہی کا اہم عنصر رہا ہے۔

۲۔ تعصب کا جواب تعصب سے نہیں بلکہ حقیقت پسندانہ رویے سے دینا چاہیے۔

---

۱ ۷ اعراف: ۱۵۹

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَنۡ تُغۡنِیَ عَنۡہُمۡ اَمۡوَالُہُمۡ وَ لَاۤ اَوۡلَادُہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ شَیۡئًا ؕ وَ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾	۱۱۶۔ بے شک جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے اللہ کے مقابلے میں ان کے اموال اور اولاد کسی کام نہ آئیں گے اور یہ لوگ جہنمی ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔
مَثَلُ مَا یُنۡفِقُوۡنَ فِیۡ ہٰذِہِ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا کَمَثَلِ رِیۡحٍ فِیۡہَا صِرٌّ اَصَابَتۡ حَرۡثَ قَوۡمٍ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ فَاَہۡلَکَتۡہُ ؕ وَ مَا ظَلَمَہُمُ اللّٰہُ وَ لٰکِنۡ اَنۡفُسَہُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ ﴿۱۱۷﴾	۱۱۷۔ وہ اس دنیاوی زندگی میں جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کی مثال اس ہوا کی سی ہے جس میں تیز سردی ہو اور وہ ان لوگوں کی کھیتی پر چلے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور اسے تباہ کر دے اور اللہ نے ان پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا بلکہ یہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔

تشریح کلمات

صِرٌّ: (ص ر ر) شدید سردی۔

تفسیر آیات

اس آیت میں دشمنوں کے مالی اور انسانی وسائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کے اقتصادی حربوں کے انجام کا ذکر ہے کہ وہ مال و زر کے ذریعے بھی اپنے برے مقاصد میں کامیاب نہیں ہوں گے اور تخریب کاری پر انہوں نے جتنی دولت صرف کی ہو گی، وہ سب رائیگاں جائے گی۔

۱۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: صدر اسلام میں یہود، مشرکین اور منافقین، مسلمانوں کے مقابلے میں مال و دولت میں فراوانی رکھتے تھے۔ بعض روایت کے مطابق وہ کہتے بھی تھے، محمدؐ اور ان کے پیروکار اگر حق پر ہوتے تو ان کا رب ان کو فقر و تنگدستی میں نہ رکھتا۔ فرمایا: کفر کے ارتکاب کرنے والے کل بروز قیامت دیکھ لیں گے کہ ان کا مال اور اولاد ان کو کسی چیز سے بے نیاز نہیں کریں گے۔ نہ رحمت خدا سے بے نیاز کریں گے، نہ عذاب خدا کو ٹالنے میں کوئی کام آئے گا۔

۲۔ مَثَلُ مَا یُنۡفِقُوۡنَ: یہاں ایک سوال اٹھ سکتا ہے کہ کافر لوگ بھی صلۂ رحم اور فقرا و مساکین میں مال خرچ کرتے ہیں تو کیا ان کو اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ملے گا؟ فرمایا: ان کا انفاق اس سرد ترین ہوا کی طرح ہے جس سے کھیتی میں موجود فصل جل کر تباہ ہو جائے۔ یعنی ان کا یہ انفاق ایک تلف ہے، نفع دینے

والا سودا نہیں ہے۔

۳۔ حَرۡثَ قَوۡمٍ ظَلَمُوۡۤا: اس قوم کی کھیتی کی طرح ہے جو ظلم و زیادتی کی مرتکب ہے۔ یعنی غیر موسم میں کاشت کی ہے تو سرد ہوا کی وجہ سے فصل جل کر تباہ ہو جائے۔ ان کافروں نے اپنا انفاق نامناسب جگہ کیا ہے۔

۴۔ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ: ان کا یہ انفاق ایک تلف کی مانند ہونا، خود ان کے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہے، اللہ کی طرف سے نہیں ہے اور ان کا یہ انفاق اگرچہ بذات خود حُسن رکھتا ہے، لیکن انفاق کرنے والے حُسن نہیں رکھتے، لہٰذا ان کا یہ عمل حبط ہونا قدرتی بات ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا بِطَانَةً مِّنۡ دُوۡنِكُمۡ لَا يَاۡلُوۡنَكُمۡ خَبَالًا ؕ وَدُّوۡا مَا عَنِتُّمۡ ۚ قَدۡ بَدَتِ الۡبَغۡضَآءُ مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ ۖۚ وَمَا تُخۡفِىۡ صُدُوۡرُهُمۡ اَكۡبَرُ ؕ قَدۡ بَيَّنَّا لَكُمُ الۡاٰيٰتِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۱۸﴾

۱۱۸۔ اے ایمان والو! اپنوں کے سوا دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ، یہ لوگ تمہارے خلاف شر و فساد پھیلانے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے، جس بات سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچے وہی انہیں بہت پسند ہے، کبھی تو (ان کے دل کے کینہ و) بغض کا اظہاران کے منہ سے بھی ہوتا ہے لیکن جو (بغض و کینہ) ان کے سینوں میں پوشیدہ ہے، وہ کہیں زیادہ ہے، بتحقیق ہم نے آیات کو واضح کر کے تمہارے لیے بیان کیا ہے، اگر تم عقل رکھتے ہو۔

تشریح کلمات

بِطَانَةً: (ب ط ن) رازدان۔ بطانة، الثوب سے استعارہ ہے۔ یعنی اندر پہننے کا کپڑا جو جسم سے متصل ہو۔

يَاۡلُوۡ: (ا ل و) کوتاہی کرتا ہے۔ الوت فی الامر کسی کام میں کوتاہی کرنا۔

خَبَال: (خ۔ب۔ل) خرابی۔ فاسد ہونا۔ دیوانے کو اسی لیے خَبَل کہا جاتا ہے کہ اس کی عقل فاسد اور خراب ہو چکی ہوتی ہے۔

عَنِتُّمۡ: (ع ن ت) عنت۔ تکلیف پہنچنا۔

تفسیر آیات

لَا تَتَّخِذُوۡا بِطَانَةً مِّنۡ دُوۡنِكُمۡ: دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ۔ اسلامی سلطنت کی ذمہ داریوں

میں سے ایک اہم ذمہ داری اندرونی اور داخلی معاملات کی رازداری ہے۔ کسی دشمن کو مملکت کے امور میں راز دار بنانا مکمل طور پر ممنوع ہے۔ قرآن نے مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ دشمن کے عزائم برے ہوتے ہیں اور تمہارے بارے میں وہ ہمیشہ تاک میں رہتے ہیں کہ تمہاری کوئی کمزوری ان کے علم میں آ جائے تو وہ اسے اپنے حق میں اور تمہارے خلاف استعمال کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔ قرآن کا یہ حکم ایک ابدی دستور، ایک لازوال نظام کا اہم ستون اور اس جامع نظام حیات کی ایک بنیادی دفعہ ہے، جو ناقابل ترمیم و تنسیخ ہے۔

لیکن صد افسوس کہ اس کے باوجود مسلمانوں نے اسلامی دستور کی اس اہم شق پر عمل نہ کیا اور بہت جلد دشمنوں کو کاروبار حکومت میں دخل اندازی کا موقع فراہم کر دیا۔ قرطبی اپنے زمانے کی حالت زار پر نالاں ہے۔ حالانکہ دشمنوں کو اسلامی مملکت کا راز دان بنانے کا عمل حضرت عمر کی خلافت کے زمانے سے شروع ہوا تھا۔ جیسا کہ سید رشید رضا تفسیر المنار میں لکھتے ہیں:

> حضرت عمر کے زمانے میں ہی رومیوں کو منشی بنا کر انہیں بہت سے معاملات کا انچارج بنایا گیا تھا۔

آج کل تو معاملہ برعکس ہے۔ خود مسلمان اپنے راز ہائے مملکت سے اتنے واقف نہیں جتنے ان کے دشمن ہیں۔ اسلامی تخت سلطنت پر متمکن احساس کمتری میں مبتلا لوگ اغیار کو رازداں بنانے میں تامل نہیں کرتے بلکہ اغیار ان کے لیے زیادہ قابل اعتماد ہوتے ہیں۔ عثمانی سلطنت کے زوال میں یہ مسئلہ سب سے زیادہ دخیل رہا تھا، کیونکہ اس وقت اکثر سفیر غیر مسلم تھے۔[1]

تعجب کا مقام تو یہ ہے کہ بعض مفسرین اس کے جواز میں مندرجہ ذیل آیت پیش کرتے ہیں[2]

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○ [3]	جن لوگوں نے دین کے بارے میں تم سے جنگ نہیں کی اور نہ ہی تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اللہ تمہیں ان کے ساتھ احسان کرنے اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا، اللہ یقیناً انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

حالانکہ اس آیت کا تعلق غیر مسلم اقلیت کے ساتھ اسلامی سلطنت کے برتاؤ اور عدل و انصاف سے ہے، جب کہ ہماری مورد بحث آیت دشمنوں کو راز دار بنانے اور انہیں امور مملکت میں دخل اندازی کا حق نہ دینے سے متعلق ہے۔

اس کے بعد اغیار کے بارے میں چند ایک اہم نکات کی طرف امت کو متنبہ فرمایا:

۱۔ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا: یہ دشمن تمہارے اندر شر اور فساد پھیلانے میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے۔

---

۱ و ۲ تفسیر المنار: ۴۴:۸ ۳ ۶۰ ممتحنہ: ۸

یعنی تمہاری کسی کمزوری سے فائدہ اٹھانے اور کسی فرصت اور موقع کی تاک میں بیٹھنے میں کوتاہی نہیں کریں گے۔ وہ تمہارے خلاف ہر سازش کے لیے چاک و چوبند رہیں گے۔

۲۔ وَدُّوۡا مَا عَنِتُّمۡ: انہیں وہی باتیں پسند ہیں جن سے تمہیں تکلیف پہنچے۔ لہٰذا وہ ہر اس کام کو بڑی تندہی سے انجام دیں گے جو تمہیں تکلیف دے۔ انسان سوز مظالم کا ارتکاب کر کے لطف اندوز ہونا آج بھی ان کا شیوہ ہے۔

۳۔ قَدۡ بَدَتِ الۡبَغۡضَآءُ مِنۡ اَفۡوَاہِہِمۡ: تم میں اگر فہم و شعور ہے تو ان کی عداوت کا اظہار ان کے منہ سے ہوتا رہتا ہے جو تم کو ہوشیار رکھنے کے لیے کافی ہے۔

۴۔ وَ مَا تُخۡفِیۡ صُدُوۡرُہُمۡ اَکۡبَرُ: ان کی زبان سے مسلمانوں کے بارے میں جس بغض و عداوت کا اظہار ہوتا ہے، وہ اس بغض و عداوت کے مقابلے میں بہت تھوڑی ہے، جو ان کے دلوں میں ہے۔ لہٰذا چاہیے تو یہ تھا کہ ان کی زبان سے جس عداوت کا اظہار ہوتا ہے، اس سے کہیں زیادہ مسلمان ان سے ہوشیار رہیں، لیکن ایسا نہیں ہے۔ اگلی آیت میں کوتاہی کی طرف اشارہ ہے۔

۵۔ قَدۡ بَیَّنَّا لَکُمُ الۡاٰیٰتِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ: اگر تم عقل سے کام لینے والے ہو تو ہم نے تمہیں اپنے خطرناک دشمن سے بچنے کے لیے بروقت آگاہ کیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ کفار کو دوست اور رازدار بنانا قرآنی نصیحتوں کے خلاف ہے۔

۲۔ اسلامی ریاست میں غیروں کو رازدان بنانے کا آغاز عصر خلفاء میں ہوا۔

هٰۤاَنۡتُمۡ اُولَآءِ تُحِبُّوۡنَہُمۡ وَ لَا یُحِبُّوۡنَکُمۡ وَ تُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡکِتٰبِ کُلِّہٖ ۚ وَ اِذَا لَقُوۡکُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۚ٭ۖ وَ اِذَا خَلَوۡا عَضُّوۡا عَلَیۡکُمُ الۡاَنَامِلَ مِنَ الۡغَیۡظِ ؕ قُلۡ مُوۡتُوۡا بِغَیۡظِکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۱۱۹﴾

۱۱۹۔ تم لوگ تو اس طرح کے ہو کہ ان سے محبت رکھتے ہو جب کہ وہ تم سے محبت نہیں رکھتے حالانکہ تم پوری (آسمانی) کتاب کو مانتے ہو (مگر تمہاری کتاب کو نہیں مانتے) اور جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب خلوت میں جاتے ہیں تو تم پر غصے کے مارے انگلیاں کاٹ لیتے ہیں، ان سے کہد یجیے: تم اپنے غصے میں جل مرو، یقیناً اللہ سینوں کے راز خوب جانتا ہے۔

تشریح کلمات

عَضَّ: (ع ض ض) کسی چیز کو دانت سے پکڑ لینا۔ کاٹ لینا۔

غیظ: (غ ی ظ) سخت غصہ۔

تفسیر آیات

۱۔ تُحِبُّوۡنَہُمۡ: اصولی طور پر مسلمانوں کو اہل کتاب سے زیادہ متنفر ہونا چاہیے تھا، کیونکہ مسلمان تو ان کے اعتقادات کا احترام کرتے ہیں، لیکن اہل کتاب مسلمانوں کے اعتقادات کا احترام نہیں کرتے۔ اس کے باوجود کچھ مسلمان ایسے تھے جو ان سے دلی محبت رکھتے تھے۔ لہٰذا اس آیت میں اس نامعقول حرکت کی مذمت کرتے ہوئے ارشاد ہوا کہ تم ان سے محبت کرتے ہو، حالانکہ وہ تم سے محبت نہیں کرتے۔ اس آیت میں جو فرمایا: تُحِبُّوۡنَہُمۡ وَ لَا یُحِبُّوۡنَکُمۡ تم ان سے محبت کرتے ہو، وہ تم سے محبت نہیں کرتے، دلیل ہے اس بات پر کہ مسلمان دوسرے غیر مسلم لوگوں کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے ہیں، نفرت نہیں کرتے، یہ اہل کتاب ہیں جو قدیم سے لے کر آج تک مسلمانوں سے نفرت اور انتہا پسندی کرتے ہیں۔

۲۔ وَ اِذَا لَقُوۡکُمۡ: صرف یہ نہیں کہ وہ تم سے محبت نہیں کرتے، بلکہ وہ تمہارے ساتھ منافقانہ چال چلتے ہیں اور دل میں تمہارے خلاف جو عناد رکھتے ہیں، اس کا اظہار اپنی نجی محفلوں میں کرتے ہیں اور تمہارے خلاف غصے سے اپنی انگلیاں کاٹ لیتے ہیں۔

اس میں ان لوگوں کے اعتراض کا شافی جواب موجود ہے جو مسلمانوں کو شدت پسند یا بنیاد پرست وغیرہ کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں اور اسلامی تعلیمات کی پابندی کو تنگ نظری سے تعبیر کرتے ہیں۔

۳۔ قُلۡ مُوۡتُوۡا بِغَیۡظِکُمۡ: تم اپنے غصے میں جل مرو، اسلام روز بروز پھیل رہا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اہل کتاب مسلمانوں کے ساتھ ہمیشہ منافقانہ روش اپناتے ہیں: وَ اِذَا لَقُوۡکُمۡ ....۔

اِنۡ تَمۡسَسۡکُمۡ حَسَنَۃٌ تَسُؤۡہُمۡ ۫ وَ اِنۡ تُصِبۡکُمۡ سَیِّئَۃٌ یَّفۡرَحُوۡا بِہَا ؕ وَ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا لَا یَضُرُّکُمۡ کَیۡدُہُمۡ شَیۡئًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ مُحِیۡطٌ ﴿۱۲۰﴾

۱۲۰۔ اگر تمہیں آسودگی میسر آتی ہے تو (وہ) انہیں بری لگتی ہے اور اگر تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اس پر خوش ہوتے ہیں اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو ان کی فریب کاری تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی، بیشک اللہ ان کے تمام اعمال پر احاطہ رکھتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنۡ تَمۡسَسۡكُمۡ حَسَنَةٌ: اگر آسودگی نے اے مؤمنو تمہیں مس کیا ہے۔ کوئی معمولی سی آسودگی آ جائے تو وہ ان کو بری لگتی ہے۔ تم کو اللہ کی طرف سے کوئی نعمت ملتی ہے، مسلمان کو فتح و نصرت ملتی ہے، ان میں اتحاد اور وحدت قائم ہوتی ہے تو یہ ان کو بری لگتی ہے۔

۲۔ وَاِنۡ تُصِبۡكُمۡ سَيِّئَةٌ: اگر تم میں اختلاف آ گیا۔ دشمن کے مقابلے میں کہیں پسپائی اختیار کرنا پڑی تو وہ ان کو اچھی لگتی ہے۔

۳۔ وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا: دشمنوں کی اس معاندانہ چال کا مقابلہ کرنے کے لیے تمہیں دو طاقتوں سے کام لینا ہو گا۔ وہ دو طاقتیں صبر اور تقویٰ ہیں۔ صبر کی طاقت سے اس وقت کام لینا ہو گا جب جہاد کا وقت آتا ہے۔ دشمن کی سازشوں کا مقابلہ کرنے کا وقت آئے، اپنے رسولؐ کے حکم کی تعمیل کرنے کا وقت آئے تو تقویٰ یعنی اپنے بچاؤ کے ذریعے، اللہ کی نافرمانی، رسولؐ کی نافرمانی اور تفرقہ بازی سے بچنے کے ساتھ ان کا مقابلہ ہو سکتا ہے۔

۴۔ لَا يَضُرُّكُمۡ كَيۡدُهُمۡ: ان دو عظیم طاقتوں کے استعمال کی صورت میں ان کی سازش اور عناد تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔

اہم نکات

۱۔ دشمن کی فریب کاریوں کو سمجھ کر مناسب اقدامات کے ساتھ ساتھ صبر و تقویٰ کی راہ پر عمل ہو تو کوئی فریب کاری کارگر نہیں ہوتی۔ اسی لیے قرآن دشمن کی سیاہ کاریوں کو بیان کرتا ہے۔

۲۔ دشمن کی سازش صبر آزما ہو گی۔ صبر ہی اس کا حل ہے: وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا ....

وَاِذۡ غَدَوۡتَ مِنۡ اَهۡلِكَ تُبَوِّئُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ مَقَاعِدَ لِلۡقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۱۲۱﴾

۱۲۱۔ اور (اے رسول! وہ وقت یاد کرو) جب آپ صبح سویرے اپنے گھر والوں کے پاس سے نکل کر ایمان والوں کو جنگ کے لیے مختلف مورچوں پر متعین کر رہے تھے اور اللہ خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔

تشریح کلمات

غَدَوۡتَ: (غ د و) غداۃ۔ دن کا ابتدائی حصہ۔ یعنی صبح سویرے۔

تُبَوِّئُ: (ب و ء) بواء۔ وہ جگہ جو بیٹھنے کے لیے سازگار ہو۔ مکان بواء۔ سازگار جگہ۔ بوّأت له مکانا۔ میں نے اس کے لیے جگہ ہموار اور سازگار کی۔

مَقَاعِدَ: (ق ع د) قعود۔ بیٹھنا۔ مقعد۔ بیٹھنے کی جگہ۔ مقعد کی جمع مقاعد ہے۔

تفسیر آیات

رسول اکرم (ص) کی حقانیت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جس ماحول میں آپ (ص) پیدا ہوئے اور جہاں آپ (ص) نے زندگی گزاری، اس میں لوگ صرف اپنی شجاعت و ہمت پر بھروسہ کرتے تھے اور فن حرب سے آگاہی نہیں رکھتے تھے۔ لیکن حضور (ص) جب جنگ کے لیے نکلتے تو حربی اصولوں کے مطابق بذات خود اپنے لشکر کی صف آرائی کرتے تھے۔ چنانچہ اس جنگ میں آپ (ص) نے کوہ احد کو پشت پر رکھا اور قریش کے لشکر کو سامنے رکھا۔ قرآن کے مطابق، مختلف مورچوں پر سپاہیوں کو آپ (ص) خود تعینات فرماتے تھے۔

وَاللّٰہُ سَمِیۡعٌ: اللہ سننے والا ہے کہ تم آپس میں کیا باتیں کر رہے ہو۔ عَلِیۡمٌ جاننے والا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے۔

ان آیات میں جنگ احد میں پیش آنے والے بعض واقعات کی طرف ایک لطیف اشارے کے ساتھ ایک تنبیہ کی گئی ہے۔ ان اشارات و تنبیہات کو سمجھنے کے لیے اصل واقعے کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

ماہ شوال ۳ ہجری کے اوائل میں کفار قریش نے تین ہزار (۳۰۰۰) کے لشکر کے ساتھ مدینے پر حملہ کرنا چاہا۔ یہ لشکر جنگی ساز و سامان سے لیس ہونے کے غرور کے علاوہ بدر کے انتقامی جذبات سے بھی مغمور تھا۔ رسول اکرم (ص) اور بعض دیگر اشخاص کی رائے یہ تھی کہ مدینے ہی میں رہ کر دفاع کیا جائے۔ جذبۂ شہادت سے سرشار بعض جوانوں نے مدینے سے باہر جنگ لڑنے پر اصرار کیا۔ چنانچہ ایک ہزار افراد پر مشتمل لشکر کے ساتھ آپ (ص) نکلے۔ راستے میں عبد اللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر اس بہانے سے الگ ہو گیا کہ محمد (ص) نے بچوں کی بات مان لی اور ہمارے مشورے پر عمل نہیں کیا۔ اس کی اس حرکت سے دل برداشتہ ہو کر بنو سلمہ اور بنو حارثہ کے لوگوں نے بھی واپس جانے کا ارادہ کر لیا لیکن بعض افراد کے سمجھانے پر یہ بے چینی ختم ہو گئی۔ باقی سات سو افراد کے ساتھ رسول اکرم (ص) احد کی پہاڑی کی طرف بڑھے۔ احد مدینے سے تقریباً چار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ حضور (ص) نے اپنے لشکر کی اس طرح صف بندی فرمائی کہ پہاڑ پشت پر تھا اور کفار قریش سامنے تھے۔ ایک جانب ایک درہ تھا، جہاں سے حملے کا خطرہ تھا۔ عبد اللہ بن جبیر کی سربراہی میں پچاس تیر اندازوں کو وہاں متعین کرتے ہوئے آپ (ص) نے تاکید فرمائی کہ خواہ ہم مشرکین کو بھگا کر مکے تک لے جائیں یا مشرکین ہمیں مدینے تک دھکیل دیں، پھر بھی تم نے یہ جگہ نہیں چھوڑنی۔ دوسری طرف ابوسفیان نے خالد بن ولید کی کمان میں دو سو تیر اندازوں کو اس درے کے پیچھے بٹھایا

اور کہا: جب ہم آپس میں لڑنا شروع کریں تو تم پیچھے سے حملہ کر دینا۔ رسول اکرم (ص) نے اپنے لشکر کو صف آراء کیا اور حملہ شروع ہوا۔ ابتدا میں مسلمانوں کا حملہ کامیاب رہا اور کفار میں شکست کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اسے مکمل فتح خیال کرتے ہوئے مسلمان مال غنیمت لوٹنے میں مشغول ہو گئے۔ عبداللہ بن جبیر کے سپاہیوں نے بھی مال غنیمت کے لالچ میں مورچہ چھوڑ دیا اور عبد اللہ بن جبیر کی طرف سے رسول اللہ (ص) کے تاکیدی حکم کی یاد دہانی بھی کوئی فائدہ نہ پہنچا سکی۔

خالد بن ولید نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور درے کے عقب سے حملہ کر دیا۔ عبد اللہ بن جبیر اور ان کے ہمراہ چند ہی ساتھی بچے تھے جو اس حملے کو روک نہ سکے اور یہ لشکر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا۔ دوسری طرف سے بھاگے ہوئے دشمن نے بھی پلٹ کر حملہ کر دیا۔ لشکر اسلام پراگندہ ہوگیا اور اکثریت نے راہ فرار اختیار کی۔ اس وقت یہ افواہ بھی اڑ گئی کہ رسول اللہ (ص) شہید ہوگئے۔ یہ سن کر سب کے حوصلے پست ہوگئے اور رسول اکرم (ص) کے گرد صرف دس بارہ سرفروش رہ گئے۔ کچھ تو فرار ہو کر مدینہ اور کچھ پہاڑ کی چوٹی پر موجود چٹان تک پہنچ گئے۔ رسول اکرم (ص) انہیں پکار رہے تھے: اِلَیَّ عباد اللّٰہ اِلَیَّ عباد اللّٰہ۔ ''اللہ کے بندو میری طرف آؤ۔'' قرآن میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے:

اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ وَ لَا تَلۡوٗنَ عَلٰۤی اَحَدٍ وَّ الرَّسُوۡلُ یَدۡعُوۡکُمۡ فِیۡۤ اُخۡرٰىکُمۡ ۔[1]

(یاد کرو) جب تم چڑھائی کی طرف بھاگے جا رہے تھے اور کسی کو پلٹ کر نہیں دیکھ رہے تھے حالانکہ رسول تمہارے پیچھے تمہیں پکار رہے تھے۔

کفار کے اس حملے میں رسول اکرم (ص) کا چہرہ مبارک زخمی ہو گیا، دندان اطہر شہید ہو گئے اور آپ (ص) جب شدت زخم سے زمین پر گرے تو حضرت علی علیہ السلام نے آپ (ص) کا ہاتھ پکڑا اور طلحہ بن عبد اللہ نے اٹھا لیا۔[2]

اس جنگ میں حضرت انس بن مالک کے چچا انس بن نضر نہیں بھاگے۔ انہوں نے حضرت عمر، طلحہ بن عبد اللہ اور مہاجرین و انصار کی ایک جماعت سے کہا: کیوں بیٹھے ہو؟ کہا: محمد (ص) مارے گئے۔ اس نے کہا: پھر ان کے بعد زندہ رہ کر کیا کرو گے۔[3]

چٹان پر موجود کچھ لوگ کہہ رہے تھے: عبد اللہ بن ابی سے رابطہ ہو جاتا تو ہم اس کے ذریعے ابوسفیان سے امان حاصل کرتے۔ لوگو! محمد (ص) مارے گئے، لہٰذا اپنی قوم کی امان میں واپس چلو، قبل اس کے کہ وہ تمہیں قتل کر ڈالیں۔ انس بن نضر نے کہا: اگر محمد (ص) مارے گئے ہیں تو محمد (ص) کا رب تو نہیں مارا گیا۔ اے اللہ میں ان کی باتوں سے تیری بارگاہ میں معذرت اور ان کے خیالات سے برائت چاہتا ہوں۔[4]

---

[1] ۳ آل عمران: ۱۵۳ [2] تفسیر المنار ۴: ۱۰۱۔ محاسن التاویل ۴: ۱۲۳
[3] تاریخ طبری ۲: ۱۹۹۔ فی ظلال القرآن ۲: ۵۶ [4] طبری ۲: ۲۰۱

ایسے لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِہِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۠ئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِکُمۡ ...[1]

اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو بس رسول ہی ہیں، ان سے پہلے اور بھی رسول گزر چکے ہیں، بھلا اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟

اسلامی لشکر کا علم حضرت علی علیہ السلام کو دیا گیا۔ کفار قریش کا علم طلحہ بن ابی طلحہ العبدی کے پاس تھا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اسے قتل کیا تو اس کے بھائی مسافع نے علم اٹھایا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اسے بھی قتل کر دیا۔ اسی طرح قبیلہ بنی عبد الدار کے ۹ افراد قتل ہو گئے۔ آخر میں اس قبیلے کے حبشی غلام نے علم اٹھایا تو حضرت علی علیہ السلام نے اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا۔ اس نے علم بائیں ہاتھ میں اٹھا لیا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اسے بھی کاٹ دیا۔ اس نے کٹے ہوئے دونوں ہاتھوں سے سینے کے ساتھ علم کو پکڑے رکھا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس کے سر پر تلوار ماری تو وہ مر گیا اور علم زمین پر گرا تو عمرہ بنت علقمہ نامی عورت نے اسے اٹھا لیا۔ قریش اپنا علم بلند دیکھ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔[2] اس کے بعد کا واقعہ تاریخ طبری میں اس طرح مذکور ہے:

> جب حضرت علی ابن ابی طالب علیہما السلام نے کفار کے علم برداروں کو قتل کیا تو رسول خدا (ص) کی نگاہ مشرکین قریش کی ایک جماعت پر پڑی اور آپ (ص) نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: ان پر حملہ کرو۔ حضرت علی (ع) نے حملہ کر کے انہیں منتشر اور عمرہ جحمی کو قتل کر دیا۔
>
> پھر رسول اللہ (ص) کی نگاہ کفار قریش کی ایک اور جماعت پر پڑی۔ آپ (ص) نے حضرت علی (ع) سے فرمایا: ان پر حملہ کرو۔ حضرت علی (ع) نے حملہ کر کے انہیں بھی منتشر اور شیبہ بن مالک کو قتل کر دیا۔ یہ دیکھ کر جبرئیل نے کہا: یا رسول (ص)! یہ ہے مؤاسات۔ رسول اللہ (ص) نے فرمایا:

اِنَّہُ مِنِّیۡ وَ اَنَا مِنۡہُ فَقَالَ جِبۡرَئِیۡلُ وَ اَنَا مِنۡکُمَا قَالَ فَسَمِعُوۡا صَوۡتًا لَا سَیۡفَ اِلا ذُوۡالفِقَار وَ لَا فَتٰی اِلَا عَلِیٌ۔[3]

وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔ جبرئیل نے کہا: میں آپ دونوں سے ہوں۔ پھر یہ آوازیں سنائی دیں: تلوار ہے تو صرف ذوالفقار ہے اور جواں مرد ہے تو صرف علیؑ ہے۔

رسول اکرم (ص) کی خدمت میں صرف ابو دجانہ سماک بن خرشہ اور علی (ع) رہ گئے۔ حضرت علی علیہ

---

[1] ۳ آل عمران: ۱۴۴ [2] مجمع البیان ۲: ۸۲۵ [3] تاریخ طبری ۲: ۱۹۷

السلام رسول اکرم (ص) کی محافظت اور مدافعت فرماتے رہے، یہاں تک کہ آپ (ع) کے جسم پر ستر زخم لگے اور آپ (ع) کی تلوار ٹوٹ گئی۔ رسول خدا (ص) نے اپنی تلوار عنایت فرمائی جو ذوالفقار کے نام سے مشہور تھی۔

لشکر کفار کے ایک شخص جبیر بن مطعم نے اپنے وحشی غلام سے کہا تھا: اگر تو محمد (ص) کو قتل کر دے تو گھوڑوں کی لگامیں تیرے ہاتھ میں ہوں گی۔ اگر علی علیہ السلام کو قتل کر دے تو تجھے ایک سو اونٹ دیے جائیں گے اور اگر حمزہ کو قتل کرے تو تو آزاد ہو جائے گا۔ چنانچہ وحشی غلام نے کمین گاہ میں بیٹھ کر حضرت حمزہؓ کی طرف اپنا وار کیا، جس سے آپ شہید ہو گئے اور کافروں نے آپ کا مثلہ کیا۔ زوجہ ابوسفیان ہندہ نے آپ کا جگر چبانے کی کوشش کی۔ اس کی نسل کو آکلۃ الاکباد یعنی جگرخوروں کی اولاد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حضرت حمزہؓ کی شہادت پر ہندہ نے ایک چٹان پر چڑھ کر یہ اشعار پڑھے:

شفیت نفسی و قضیت نذری
شفیت وحشی غلیل صدری

میں نے اپنے نفس کو آرام پہنچایا اور اپنی نذر پوری کی۔ وحشی نے میرے سینے سے تشنگی دور کر دی۔ یعنی انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔

بنی ہاشم کی ایک خاتون نے جواب دیا:

بکل قطاع حسام یفری
حمزۃ لیثی و علی صقری[1]

ہر قسم کی تیز دھار تلواروں سے چیر پھاڑ دیں گے، میرا شیر حمزہؓ اور میرے شہباز علی (ع)۔

جب مسلمانوں کو پتہ چلا کہ حضور (ص) زندہ ہیں تو ہر طرف سے لوگ واپس آ کر آپ (ص) کے گرد جمع ہو گئے۔ حضرت ابوبکر سب سے پہلے واپس حضور (ص) کی خدمت میں پہنچے۔ ان کا اپنا بیان ہے:

فکنت اول من فاء الی النبی۔[2] نبیؐ کی طرف سب سے پہلے میں واپس آیا تھا۔

اہم نکات

۱۔ قیادت کی اطاعت میں کوتاہی سے جیتی ہوئی جنگ کی کایا پلٹ جاتی ہے۔
۲۔ نصرت الٰہی کے بغیر فتح ممکن نہیں۔
۳۔ مشکلات اور سختیوں میں وفاداروں اور بے وفاؤں میں تمیز ہو جاتی ہے۔
۴۔ علی (ع) نے احد میں اپنے آپ کو رسول اللہ (ص) کے مشن کا سب سے بڑا محافظ ثابت کر دیا۔
۵۔ اسلام کی بقاء علی علیہ السلام کی استقامت کی مرہون منت ہے۔

---

[1] تفسیر قرطبی ۴: ۱۷۷ [2] فی ظلال القرآن ۲: ۵۹۔ تفسیر المنار ۴: ۱۰۳

اِذۡ ہَمَّتۡ طَّآئِفَتٰنِ مِنۡکُمۡ اَنۡ تَفۡشَلَا ۙ وَ اللّٰہُ وَلِیُّہُمَا ؕ وَ عَلَی اللّٰہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۲۲﴾

۱۲۲۔ (یہ اس وقت کی بات ہے) جب تم میں سے دو گروہ بزدلی دکھانے پر آمادہ ہو گئے تھے، حالانکہ اللہ ان کا مددگار تھا اور مومنین کو چاہیے کہ اللہ پر توکل کریں۔

تشریح کلمات

طَائِفَة: (ط و ف) گروہ۔

تَفۡشَلَا: (ف ش ل) کمزوری کے ساتھ بزدلی۔

تفسیر آیات

عبد اللہ بن ابی کی واپسی کے بعد بنوسلمہ اور بنی حارثہ میں بھی بد دلی سرایت کر گئی تھی اور وہ بھی واپس جانے کا سوچ رہے تھے۔ یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

۱۔ اِذۡ ہَمَّتۡ طَّآئِفَتٰنِ: ان دونوں گروہوں کی طرف سے بزدلی دکھانے پر آمادگی کی مذمت ہو رہی ہے کہ انہوں نے بزدلی دکھاتے ہوئے اللہ پر اپنے ایمان اور بھروسے کو کمزور ثابت کیا۔ اللّٰہُ وَلِیُّہُمَا حالانکہ اللہ ان دونوں کی مددگار رہے۔

۲۔ وَ عَلَی اللّٰہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ: ان کی یہ بزدلی اللہ کی نصرت پر تکیہ اور اللہ پر توکل کے منافی تھی۔

وَ لَقَدۡ نَصَرَکُمُ اللّٰہُ بِبَدۡرٍ وَّ اَنۡتُمۡ اَذِلَّۃٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۱۲۳﴾

۱۲۳۔ اور بتحقیق اللہ نے بدر میں تمہاری مدد کی جب تم کمزور تھے، پس اللہ سے ڈرو تاکہ شکرگزار بن جاؤ۔

تشریح کلمات

بَدۡر: (ب د ر) کامل۔ چنانچہ ماہ کامل کو بدر کہتے ہیں۔ بدر ایک شخص کا نام تھا، جس کا ایک کنواں مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام پر واقع تھا۔ اس مناسبت سے یہ علاقہ بدر کے نام سے موسوم ہو گیا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَقَدۡ نَصَرَکُمُ اللّٰہُ: احد کے سات سو افراد پر مشتمل اسلامی لشکر سے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

تم جنگ بدر کو یاد کرو کہ تمہاری تعداد اس وقت صرف ۳۱۳ تھی، تمہارے پاس کوئی ساز و سامان بھی نہ تھا، اس وقت اللہ کی مدد سے فتح تمہیں حاصل ہوئی۔ جب ماضی میں تم کمزور ہونے کے باوجود فاتح رہے ہو تو آئندہ کے لیے بھی ثابت قدم رہو۔

کفر کے ساتھ اسلام کا پہلا اہم مقابلہ ۱۷ رمضان ۲ ہجری کو بدر کے مقام پر ہوا، جسے اسلامی فتوحات کے لیے سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اسے قرآن نے یوم الفرقان کہا ہے۔

۲۔ وَّاَنۡتُمۡ اَذِلَّۃٌ: یہاں ذلت سے مراد کمزوری ہے، عزت کے مقابلے میں جو قوت و غلبہ کے معنوں میں آتا ہے۔ رام ہونے اور قابو میں آنے والوں کو ذلول کہتے ہیں۔ ہموار راستے کو طریق مذلل کہتے ہیں۔

۳۔ فَاتَّقُوا اللّٰہَ: کمزوری اور ذلت سے نکلنے کا راستہ تقویٰ ہے۔ یعنی اللہ اور رسولؐ کی نافرمانی سے بچو۔ اللہ نے جو دستور حیات دیا ہے، اس سے متمسک رہو، سر بلند رہو گے۔

۴۔ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ: تقویٰ سے مقام شکر پر فائز ہو جاتا ہے۔ مقام شکر پر فائز ہونے والے تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ وقلیل من عبادی الشکور۔

اِذۡ تَقُوۡلُ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَلَنۡ یَّکۡفِیَکُمۡ اَنۡ یُّمِدَّکُمۡ رَبُّکُمۡ بِثَلٰثَۃِ اٰلٰفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ مُنۡزَلِیۡنَ ﴿۱۲۴﴾	۱۲۴۔ جب آپ مومنین سے کہ رہے تھے کہ کیا تمہارے لیے کافی نہیں ہے کہ تمہارا پروردگار تین ہزار فرشتے نازل فرما کر تمہاری مدد کرے؟
بَلٰۤی ۙ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا وَ یَاۡتُوۡکُمۡ مِّنۡ فَوۡرِہِمۡ ہٰذَا یُمۡدِدۡکُمۡ رَبُّکُمۡ بِخَمۡسَۃِ اٰلٰفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ مُسَوِّمِیۡنَ ﴿۱۲۵﴾	۱۲۵۔ ہاں اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو دشمن جب بھی تم پر اچانک حملہ کر دے تمہارا رب اسی وقت پانچ ہزار نشان زدہ فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔

تشریح کلمات

یَمُدَّ: (م د د) مد۔ مدد کرنا۔ کمک کرنا۔

فَوۡر: (ف و ر) جوش مارنا۔ آگ بھڑکنا۔ جلدی اور سرعت۔

مُسَوِّمِيْنَ: (س و م) سَوم۔ نشان لگانا۔ مُسَوَّم کی جمع مُسَوَّمِیْنَ ہے۔ یعنی جن پر نشان لگایا گیا ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ اِذۡ تَقُوۡلُ: یہ جنگ بدر کا تذکرہ ہے، جہاں حضور (ص) اپنے مختصر اور بے سر و سامان لشکر کو الٰہی تائید کے ساتھ قوت دے رہے تھے اور فرما رہے تھے: کیا تین ہزار فرشتوں کی امداد تمہاری تقویت قلب، ثابت قدمی اور حوصلہ افزائی کے لیے کافی نہیں ہے؟ یہ اس آیت کے منافی نہیں ہے، جس میں فرمایا:

اِذۡ تَسۡتَغِیۡثُوۡنَ رَبَّکُمۡ فَاسۡتَجَابَ لَکُمۡ اَنِّیۡ مُمِدُّکُمۡ بِاَلۡفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ مُرۡدِفِیۡنَ ۝ [1]

اللہ نے تمہاری سن لی اور فرمایا: میں یکے بعد دیگرے آنے والے ایک ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا۔

یہاں تین ہزار مُنزَلِین کا ذکر ہے، جب کہ سورہ انفال کی مذکورہ آیت میں ایک ہزار مُردِفِین کا ذکر ہے۔ مُردِفِین یعنی دوسرے فرشتوں کو اپنے پیچھے لانے والے۔ گویا یہ ایک ہزار فرشتے ہراول دستے کے طور پر تھے۔

۲۔ بَلٰۤی ۙ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا: مزید غیبی تائید کا ذکر مشروط طور پر یوں فرمایا: اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو اور ناگہانی حالت سے دوچار ہو جاؤ۔ یعنی اگر وہ اچانک تم پر حملہ کر دیں اور غیبی امداد کے علاوہ کوئی سبیل نہ ہو تو اللہ پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد فرما سکتا ہے۔ یہ فرشتے بھی کوئی عام فرشتے نہیں ہوں گے بلکہ خاص نشانیوں والے عظیم المرتبت فرشتے ہوں گے۔

آیت کے اس ٹکڑے سے اس امداد غیبی کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی مادی کمک نہ تھی کہ اس پر مادی سوچ کے تحت سوالات اٹھائے جائیں کہ ان فرشتوں کو ہزاروں کی تعداد میں کس نے دیکھا؟ نیز یہ کہ مقتول مشرکین اور ان کے قاتل مسلمانوں کو سب جانتے تھے کہ کس کو کس نے قتل کیا، پھر فرشتوں نے کن کو مارا؟ نیز کمک کے لیے ایک فرشتہ کافی تھا جو سب کافروں کو تہ و بالا کر دیتا، ہزاروں کی کیا ضرورت تھی؟ اگر فرشتوں نے جنگ میں شرکت کی ہوتی تو کوئی کافر بچ نہ نکلتا وغیرہ، بلکہ یہ غیبی اور غیر مادی کمک تھی۔ فرشتے بھی غیر مادی موجودات ہیں۔ ان کی کمک مسلمانوں کے فرد فرد کو مل سکتی ہے۔ لہٰذا تعداد ضروری ہے اور ہر فرد کو بھی نہیں بلکہ جن میں روحانی رشتہ موجود ہو انہیں مل سکتی ہے۔ وہ رشتہ اس آیت میں مذکور ہے۔ یعنی صبر و تقویٰ۔ ان دو روحانی شرائط کی موجودگی میں روحانی مخلوقات کی کمک کا اہل بن جانا ممکن ہے۔

۳۔ وَ یَاۡتُوۡکُمۡ مِّنۡ فَوۡرِہِمۡ: تیسری شرط اچانک اور ناگہانی حالت سے دوچار ہونا ہے، کیونکہ ایسے حالات میں انسان تمام مادی ذرائع سے ہٹ کر صرف اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

وَ اِذَا غَشِیَہُمۡ مَّوۡجٌ کَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ ... [2]

---

[1] ۸ انفال: ۹ [2] ۳۱ لقمان: ۳۲

اور جب ان پر (سمندر کی) موج سائبان کی طرح چھا جاتی ہے تو وہ عقیدے کو
اسی کے لیے خالص کر کے اللہ کو پکارنے لگتے ہیں۔

ان حالات میں مسلمانوں کے دلوں میں فرشتوں کا نزول ہو سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان روحانی موجودات کے اترنے کے لیے روحانی جائے مستقر درکار ہوتا ہے جو درج بالا شرائط کے تحت فراہم ہو سکتا ہے۔ اس بات کی تائید آنے والی آیت سے ہوتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ غیبی امداد کا اہل بننے کے لیے اپنے اندر استحقاق پیدا کرنا ضروری ہے۔

۲۔ صبر و تقویٰ کے بغیر معنوی و روحانی تکامل ممکن نہیں۔

۳۔ اپنی بساط کے مطابق تیار رہنے کے بعد اگر کوئی بڑی مصیبت اچانک آ پڑے تو اللہ کی نصرت یقیناً شامل حال ہوتی ہے۔

۴۔ روحانی تقویت میسر ہو تو مادی کمزوری موجب شکست نہیں ہو سکتی۔

وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشۡرٰی لَکُمۡ وَ لِتَطۡمَئِنَّ قُلُوۡبُکُمۡ بِهٖ ؕ وَ مَا النَّصۡرُ اِلَّا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ﴿۱۲۶﴾

۱۲۶۔ اور یہ بات اللہ نے صرف تمہاری خوشی اور اطمینان قلب کے لیے کی ہے اور فتح و نصرت صرف اللہ ہی کی جانب سے ہے جو بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

لِیَقۡطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَوۡ یَکۡبِتَهُمۡ فَیَنۡقَلِبُوۡا خَآئِبِیۡنَ ﴿۱۲۷﴾

۱۲۷۔ (اس مدد کا مقصد یہ ہے کہ) کفار کے ایک دستے کو کاٹ دے یا انہیں ذلیل و خوار کر دے تاکہ وہ نامراد پسپا ہو جائیں۔

تشریح کلمات

یَکۡبِتَهُمۡ : (ک ب ت) کبت۔ کسی کو سختی اور ذلت کے ساتھ واپس کر دینا۔

خَآئِبِیۡنَ: (خ ی ب) الخیبة۔ ناکام ہونا۔ امید و توقع کے بعد ناکام ہونے کو خیبة الامل کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشۡرٰی لَکُمۡ وَ لِتَطۡمَئِنَّ قُلُوۡبُکُمۡ: اس جملے سے واضح ہوا کہ فرشتوں کا

نزول روحانی کمک کے لیے تھا۔ یعنی اسلامی سپاہیوں میں جس جس کے دل میں تقویٰ اور صبر کا مایہ موجود تھا، اس دل پر فرشتوں کا نزول ہوا۔ فرشتوں کے نزول سے اس دل میں روحانی طاقت آ گئی اور دشمن کو شکست سے دوچار کر دیا۔ چنانچہ اس آیت میں فرمایا: اس غیبی امداد کا مقصد تمہاری روحانی تقویت اور اطمینان قلب ہے۔

۲۔ وَ مَا النَّصۡرُ اِلَّا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ: نیز یہ باور کرانے کے لیے کہ فتح و نصرت صرف اللہ کی جانب سے ہے۔

۳۔ لِیَقۡطَعَ طَرَفًا: تاکہ اس فتح و نصرت سے کفار کا ایک بازو کٹ جائے یا وہ ذلیل و خوار ہو کر شکست کھا جائیں۔ چنانچہ جنگ بدر میں ایسا ہی ہوا۔ کفار کے ستر (۷۰) سرکردہ افراد مارے گئے اور ستر (۷۰) اسیر ہو گئے اور باقی ذلت و خواری کے ساتھ پسپا ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ کی تائید کی اہلیت حاصل کرنے پر یہ سب کچھ خود مسلمانوں کے ہاتھوں ہوا۔ جیسا کہ سنت الٰہی یہی ہے کہ ارتقا و تکامل کے لیے خود بندوں کو آزمائش میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ورنہ اگر اللہ تعالیٰ اپنی طاقت استعمال کرے تو نہ آزمائش ہو گی اور نہ ہی ارتقا قابل تصور رہے گا، بلکہ عاقل انسان کو مکلف بنانے کا فلسفہ ہی ختم ہو جائے گا۔

اہم نکات

۱۔ غیبی امداد کے حصول کے لیے اہلیت اور استحقاق بنیادی شرط ہے، جب کہ اہلیت و استحقاق کے لیے آزمائش میں کامیابی شرط ہے۔

۲۔ غیبی امداد کا مقصد انسان کی روحانی تقویت اور اطمینان قلب ہے: وَ لِتَطۡمَئِنَّ قُلُوۡبُکُمۡ ...

لَیۡسَ لَکَ مِنَ الۡاَمۡرِ شَیۡءٌ اَوۡ یَتُوۡبَ عَلَیۡہِمۡ اَوۡ یُعَذِّبَہُمۡ فَاِنَّہُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ﴿۱۲۸﴾

۱۲۸۔ (اے رسول) اس بات میں آپ کا کوئی دخل نہیں، چاہے تو اللہ انہیں معاف کرے اور چاہے تو سزا دے کیونکہ یہ لوگ ظالم ہیں۔

وَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۲۹﴾

۱۲۹۔ اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس کا مالک اللہ ہے، اللہ جسے چاہے بخش دے اور جسے چاہے عذاب دے اور اللہ بڑا بخشنے والا، خوب رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ: الامر سے مراد ممکن ہے وہ چار امور ہوں جن کا ذکر ان دو آیتوں میں آیا ہے۔ یعنی کافروں کے دستے کو کاٹنا اور ان کو ذلیل و خوار کرنا یا انہیں معاف کر دینا یا انہیں سزا دینا۔

اس آیت کے شان نزول میں متعدد طرق سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احد کے دن یہ دعا فرمائی: اللهم العن ابا سفيان، اللهم العن الحرث بن هشام، اللهم العن سهيل بن عمر، اللهم العن صفوان بن اميه، فنزلت هذه الاية۔ تمام مصادر میں یہ روایت اس طرح ہے لیکن ابن کثیر ہمیشہ کی طرح اپنی پسند، نا پسند کی بنیاد پر حدیث میں تحریف کرتے ہیں اور ابو سفیان کا نام حذف کر کے اس جگہ فلانا رکھ دیا۔

سلسلہ کلام سابقہ آیت کے ساتھ مربوط ہے۔ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔ دونوں آیتوں کو مربوط کیا جائے تو یہ مطلب نکلتا ہے:

> اے حبیب! اگر مسلمانوں کو شکست ہوئی تو آپ (ص) اس کے ذمہ دار نہیں۔ اسی طرح فتح و نصرت نصیب ہوئی تو یہ صرف آپ (ص) کے حسن تدبیر کی مرہون منت نہیں ہے۔ کوئی کفر اختیار کرتا ہے یا میدان جہاد سے فرار کرتا ہے تو اس پر آپ (ص) جوابدہ نہیں ہیں۔ کفار کو شکست و خواری سے دوچار کرنا یا انہیں کوئی نقصان پہنچانا یا ان میں سے کسی کو عذاب دینا، یہ سب امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

۲۔ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ: کل کائنات اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ وہ اپنی حکیمانہ اور عادلانہ مشیت کے مطابق کسی کو عذاب دیتا ہے اور کسی کو معاف فرماتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ عذاب اور مغفرت صرف اللہ ہی کے اختیار میں ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾

۱۳۰۔ اے ایمان والو! کئی گنا بڑھا چڑھا کر سود نہ کھایا کرو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡۤ اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۱۳۱﴾ ۱۳۱۔ اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا تَاۡکُلُوا الرِّبٰۤوا: یہ آیت بھی سابقہ آیات کے ساتھ مربوط ہے، کیونکہ کلام کا تسلسل جہاد کے بارے میں ہے۔ سابقہ آیات میں جہاد بالسیف کا ذکر ہو رہا تھا۔ چونکہ جہاد بالمال کو بھی جہاد بالسیف کی کامیابی میں بڑا دخل حاصل ہے اور مال ہی کی طمع کی وجہ سے مسلمان احد میں شکست سے دوچار ہوئے تھے۔ اس لیے زر پرستی اور مال کی طمع جیسے عوامل کی اصلاح ضروری ہے۔

کچھ حضرات اس آیت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ قرآن نے جس سود کو حرام قرار دیا ہے، اس سے مراد زمانۂ جاہلیت میں رائج سود مرکب، یعنی سود در سود ہے، جب کہ قرض پر سود اور معاملاتی سود حرام نہیں اور احادیث میں سود کی مؤخر الذکر دو اقسام کے بارے میں جو ممانعت آئی ہے وہ کراہت پر مبنی ہے۔[1]

اس پر دلیل یہ دیتے ہیں کہ نزول آیت کے وقت لوگ کئی گنا زیادہ سود لیتے تھے۔ جب کہ قرض پر سود اور معاملاتی سود میں کئی گنا کا تصور نہیں ہوتا۔

جواب یہ ہے کہ سنت رسول (ص) میں ہر قسم کے سود کی ممانعت جس تاکید اور شدت سے آئی ہے، اسے صرف مکروہ قرار دینا نہایت ہی ناانصافی ہے۔ اگر اس طرح کی ذاتی رائے کا باب کھل جائے تو لوگ بہت سے حرام اور واجب احکام کو کراہت اور مستحب پر محمول کر کے شریعت کو مسخ کر دیں گے۔

ثانیاً آیت میں لفظ اَضۡعَافًا ربا کی صفت ہے، سرمائے کی نہیں اور یہ ضعف کی جمع ہے۔ ضعف سے مراد ہے دوگنا اور اضعاف سے مراد ہے کئی گنا، جس کا کم از کم تین دوگنے (چھ گنا) ہیں۔ پس جب سود چھ گنا ہو جائے تو حرام ہوگا، حالانکہ کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں ہے۔

لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس آیت میں اَضۡعَافًا مُّضٰعَفَۃً کا ذکر اس وجہ سے نہیں کہ سود کی حرمت صرف کئی گنا ہونے سے مشروط ہے، بلکہ ایک امر واقع اور حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ سود کو سرمائے کے ساتھ ملا دیا جائے تو اکثر و بیشتر کئی گنا ہو جاتا ہے۔

۲۔ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ: کامیابی کا راز بھی تقویٰ میں مضمر ہے۔ یعنی ربا کھانے سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ کامیابی اسی میں ہے۔

۳۔ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡۤ: جو آتش کافروں کے لیے آمادہ اور تیار کی گئی ہے۔ سود خوار اسی آگ میں جائے گا۔ لہٰذا تم اس آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ چونکہ سود کھانا خدا اور رسولؐ کے ساتھ جنگ ہے۔ ایسے

---

[1] رشید رضا الربا و المعاملات فی الاسلام ص۵۲۔ کمافی الربا فقهیا و اقتصادیاص۲۹۔

لوگ کافروں کے ساتھ ہوں گے۔

بظاہر سود کے بارے میں یہ آیت، پہلی آیت ہے۔ سود کے بارے میں تفصیل ملاحظہ ہو سورہ بقرہ آیت ۲۷۵۔

اہم نکات

۱۔ سود خوری ایسی معصیت ہے جو ایمان اور تقویٰ کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیتی ہے: لَا تَاۡکُلُوا .. اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ۔

۲۔ تقویٰ کا لازمی نتیجہ دنیا و آخرت کی کامیابی ہے: وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ۔

۳۔ سود خور کے لیے وہی عذاب ہے جو کفار کے لیے ہے: وَاتَّقُوا... لِلۡکٰفِرِیۡنَ۔

وَاَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۱۳۲﴾

۱۳۲۔ اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

وَسَارِعُوۡۤا اِلٰی مَغۡفِرَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ جَنَّۃٍ عَرۡضُہَا السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ ۙ اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۱۳۳﴾

۱۳۳۔ اور اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جانے میں سبقت لو جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، جو اہل تقویٰ کے لیے آمادہ کی گئی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاَطِیۡعُوا اللّٰہَ: پہلی آیت میں ان لوگوں کے لیے تنبیہ ہے جو تمام مسائل کا حل صرف قرآن میں تلاش کرتے ہیں اور سنت کو یا تو قبول ہی نہیں کرتے یا اپنی خواہشات کے مطابق اس کی توجیہ و تاویل کرتے ہیں۔ جیسا کہ ربا کے بارے میں کچھ حضرات نے رسول اللہ (ص) کے تاکیدی حکم میں بھی توجیہ و تاویل سے کام لیا۔ اس آیت کی رو سے رحمت خدا کے شامل حال ہونے کے لیے اللہ کی اطاعت کے ساتھ رسول (ص) کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ اگر اللہ کی اطاعت ہی کافی ہوتی تو اطاعت رسول (ص) کو علیحدہ بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول (ص) کی ذمہ داری صرف آیات کا پڑھ کر سنانا ہی نہیں، بلکہ قرآن کی رو سے رسول (ص) کی تین ذمہ داریاں ہیں: i۔ تلاوت آیات ii۔ تزکیہ نفوس اور iii۔ تعلیم و تربیت:

یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ ...[۱]

انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاکیزہ کرتا اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

---

[۱] ۶۲ جمعہ: ۲

تعلیم کتاب سے مراد لفظی تشریح و تفسیر نہیں ہے، بلکہ قرآن کے کلی احکام کی تفصیل اور مجمل احکام کی وضاحت ہے۔ جیسے اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ میں نماز کی تفصیل اور اٰتُوا الزَّکٰوۃَ میں زکوۃ کی تفصیل، لَا تَاۡکُلُوا الرِّبٰوا میں حرمت ربا کی تفصیل و توضیح وغیرہ۔ اسی طرح رسول (ص) کی اطاعت سے ہی اللہ کی اطاعت ہو سکتی ہے۔ رسول (ص) کی اطاعت، اللہ کی اطاعت سے ہٹ کر کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ چنانچہ فرمایا:

مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ ۔۔۔[1] جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

۲۔ وَسَارِعُوۡۤا: دوسری آیت میں فرمایا: رب کی بخشش اور عفو کی طرف جانے میں سبقت لو۔ مغفرت اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ بندہ اس کی طرف جانے میں سبقت کیسے لے سکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہاں مغفرت سے مراد سبب مغفرت ہے۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

سَارِعُوۡا اِلَی اَدَاءِ الۡفَرَائِضِ۔[2] فرائض کی ادائیگی کی طرف سبقت لو۔

۳۔ وَ جَنَّۃٍ عَرۡضُہَا: جنت کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ کیونکہ انسانی ذہن فقط زمین اور آسمان کی وسعت و عظمت سے مانوس ہے اور اس کے نزدیک ان کے علاوہ اور کوئی چیز اتنی وسعت و عظمت نہیں رکھتی۔ اس لیے یہ جنت کی بے پایانی اور ہمارے تصورات سے بالاتر وسیع و عظیم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

اہم نکات

۱۔ نیک اعمال میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش تقویٰ کی علامت ہے: سَارِعُوۡۤا ... لِلۡمُتَّقِیۡنَ۔

الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ فِی السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ وَ الۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰہُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۳۴﴾

۱۳۴۔ (ان متقین کے لیے) جو خواہ آسودگی میں ہوں یا تنگی میں ہر حال میں خرچ کرتے ہیں اور غصے کو پی جاتے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرتے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

تشریح کلمات

الۡکٰظِمِیۡنَ: (ک ظ م) الکظم۔ سانس کی نالی۔ کظوم سانس رکنے کے معنوں میں آتا ہے۔ کظم السقاء مشک کو پانی سے بھر کر اس کا منہ باندھ دینا۔ اسی لیے غصے سے بھرا ہوا شخص، اپنے

---

[1] ۴ نساء: ۸۰ [2] بحار الانوار ۶۷: ۲۷۰۔ باب الطاعۃ

غصے کو قابو میں رکھے تو اسے کاظم الغیظ کہا جاتا ہے۔

الغَیۡظ: (غ ی ظ) سے مراد جذبہ انتقام اور غضب سے مراد ارادہ انتقام ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ غیظ نہیں بلکہ کلمہ غضب استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

اس آیہ شریفہ میں اہل تقویٰ کے چند اوصاف بیان ہوئے ہیں:

i۔ متقی فیاض ہوتا ہے اور دوسروں کا دکھ درد بانٹنا اس کی فطرت میں شامل ہوتا ہے۔

ii۔ وہ ہر قسم کا انفاق کرتا ہے۔ یہاں یہ بیان نہیں ہوا کہ کیا خرچ کرنا چاہیے۔ لہٰذا اس میں ہر شے کا انفاق شامل ہے۔ مال، دولت، وقت، محنت، علم اور ہنر وغیرہ دوسروں کی طرف منتقل کرنا بھی انفاق میں شامل ہے۔

iii۔ اہل تقویٰ کی اہم علامت یہ ہے کہ وہ ہر حال میں انفاق کرتے ہیں۔ وہ آسودگی میں ہوں تو مال و دولت کی فراوانی اور عیش و عشرت میں بھی خدا کو نہیں بھولتے اور تنگی و مصیبت کے وقت بھی غافل نہیں رہتے۔ وہ زمانے کے ہر نشیب و فراز میں فیاض اور بیدار رہتے ہیں۔ آسودگی میں انفاق کرنا اگرچہ اپنی جگہ فضیلت رکھتا ہے، لیکن تنگی کی حالت میں بھی انفاق کرنا ایک ایثار اور قربانی کا اعلیٰ جذبہ رکھنے کی علامت ہے:

وَ یُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ ....[1] اور اپنی خواہش کے باوجود کھانا کھلاتے ہیں...

یُؤۡثِرُوۡنَ عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ وَ لَوۡ کَانَ بِہِمۡ خَصَاصَۃٌ ....[2] وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود محتاج ہوں....

iv۔ وہ غصے سے مغلوب نہیں ہوتے۔ ان کا نفس ان کی عقل کے اختیار میں ہوتا ہے۔ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ اہل تقویٰ وہ ہیں جنہیں غصہ نہیں آتا، بلکہ فرمایا کہ غصے کی حالت میں ضبط و تحمل سے کام لیتے ہیں۔ لہٰذا انسانی طبیعت کے پیش نظر غم و غصے کا نہ ہونا کمال نہیں ہے، بلکہ اسے قابو میں رکھنا کمال ہے۔

v۔ لوگوں کی غلطیوں سے عفو و درگزر کرتے ہیں۔ یعنی غصہ پی لینے کے بعد دل سے بھی معاف کر دیتے ہیں۔

vi۔ آخر میں مقام احسان پر بھی فائز ہوتے ہیں۔ معاف ہی نہیں کرتے بلکہ اس پر مستزاد احسان بھی کرتے ہیں۔ یہ ہیں اسلام کے نزدیک اخلاقی اقدار اور اسلامی انسان کا مقام و معیار۔

احادیث

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی کنیز آپ (ع) کو وضو کرا رہی تھی کہ برتن

اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور آپ (ع) کے چہرۂ مبارک پر گرا، جس سے چہرۂ مبارک پر خراش آ گئی۔ آپ (ع) نے غصے کی نگاہ سے دیکھا تو کنیز نے یہ آیت پڑھی: وَالۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ ۔ آپ (ع) نے فرمایا: میں نے غصہ پی لیا۔ کنیز نے کہا: وَالۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ ۔ آپ (ع) نے فرمایا: خدا تجھے معاف کرے، میں نے بھی معاف کر دیا۔ کنیز نے کہا: وَ اللّٰہُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ۔ آپ (ع) نے فرمایا: جا! میں نے تجھے آزاد کر دیا۔[1]

اہم نکات

۱۔ غصے کا نہ آنا کمال نہیں بلکہ اسے قابو میں رکھنا کمال ہے: وَالۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ ...۔

۲۔ احسان کرنے سے انسان اللہ کا محبوب بن جاتا ہے: وَ اللّٰہُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ۔

۳۔ متقین کا عفو و درگزر سب لوگوں کے لیے ہوتا ہے: وَالۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ ...۔

وَالَّذِیۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَۃً اَوۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسۡتَغۡفَرُوۡا لِذُنُوۡبِہِمۡ ۟ وَ مَنۡ یَّغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّا اللّٰہُ ۪۟ وَ لَمۡ یُصِرُّوۡا عَلٰی مَا فَعَلُوۡا وَ ہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳۵﴾

۱۳۵۔ اور جن سے کبھی نازیبا حرکت سرزد ہو جائے یا وہ اپنے آپ پر ظلم کر بیٹھیں تو اسی وقت خدا کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں اور اللہ کے سوا گناہوں کا بخشنے والا کون ہے؟ اور وہ جان بوجھ کر اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے ہیں۔

اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ وَ نِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَ ﴿۱۳۶﴾ؕ

۱۳۶۔ ایسے لوگوں کی جزا ان کے رب کی مغفرت اور وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور (نیک) عمل کرنے والوں کے لیے کیا ہی خوب جزا ہے۔

تشریح کلمات

فَاحِشَۃً: (ف ح ش) الفحش۔ وہ قول یا فعل جو قباحت میں حد سے بڑھا ہوا ہو۔

---

[1] الأمالی للصدوق ص ۲۰۱

تفسیر آیات

۱۔ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَۃً: فاحشہ اور فحشاء قرآن میں زنا کے لیے استعمال ہوا ہے:

وَ الّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ ...۔[1] اور تمہاری عورتوں میں جو بدکاری کی مرتکب ہو جاتی ہیں۔

وَلَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً ...۔[2] اور زنا کے قریب بھی نہ جاؤ، یقیناً یہ بڑی بے حیائی ہے۔

اس لیے اکثر نے فَاحِشَۃً سے زنا مراد لیا ہے، لیکن خود آیت میں اس تقیید پر کوئی قرینہ نہیں ہے، لہٰذا اس سے گناہان کبیرہ مراد لینا بہتر ہے۔

۲۔ اَوۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ: ہر گناہ ظلم بہ نفس ہوتا ہے، لہٰذا اس سے گناہان کبیرہ کے علاوہ گناہ مراد لینا مناسب ہے۔

۳۔ ذَکَرُوا اللّٰہَ: گناہ کا ارتکاب کرنے کے بعد اسے اللہ یاد آ جاتا ہے۔ یہ دل کا زندہ ہے۔ گناہ کا احساس ہے، ضمیر بھی بیدار ہے، اس لیے اللہ یاد آتا ہے۔ اللہ کی بندگی کے دائرے میں ہے، اس لیے اللہ کی نافرمانی کا ارتکاب کرنے کے بعد اللہ یاد آتا ہے۔ شرمندہ ہوتا ہے۔

۴۔ فَاسۡتَغۡفَرُوۡا لِذُنُوۡبِہِمۡ: احساس گناہ اس کو استغفار و ندامت کے لیے آمادہ کرتا ہے اور ساتھ اس بات کا ادراک بھی ہے۔ وَمَنۡ یَّغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّا اللّٰہُ۔ اللہ کے سوا ان گناہوں کا معاف کرنے والا کوئی نہیں۔

۵۔ وَ لَمۡ یُصِرُّوۡا عَلٰی مَا فَعَلُوۡا: آیندہ کے لیے، کبھی بھی دانستہ طور پر ارتکاب مکرر نہ کریں۔

۶۔ وَہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ: وہ جان بوجھ کر گناہ پر اصرار نہ کریں اور اگر نہیں جانتے تو گناہ نہیں ہے۔ نہ جاننے کی دو صورتیں ہیں: ایک موضوع کا نہ جاننا۔ دوسری صورت حکم کا نہ جاننا۔ جیسے علم نہ تھا گلاس میں شراب ہے۔ شربت سمجھ کر پی لی۔ گناہ نہیں ہے۔ عورت کے بارے میں علم نہ تھا کہ یہ رضاعی بہن ہے، شادی کر لی گناہ نہیں ہے۔ لیکن اگر شراب کے حرام ہونے کا علم نہ ہو اور رضاعی بہن سے شادی کرنا حرام ہونے کا علم نہ ہو تو اگر علم حاصل کرنے کا کوئی راستہ نہ تھا تو اس کو جاہل قاصر کہتے ہیں، گناہ نہیں ہے، لیکن اگر حکم پر علم حاصل کرنے کا راستہ تھا تو وہ گنہگار ہے۔

۷۔ اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ: ایسے بڑے اور چھوٹے گناہوں کے ارتکاب کرنے والوں کے لیے مغفرت ہے۔ ان کے گناہوں سے درگزری ہے اور جنت کے باغات بھی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں

---

[1] ۴ نساء۔ ۱۵ [2] ۱۷ اسراء۔ ۳۲

گے۔

۸۔ وَ نِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَ: عمل کے بغیر صرف نسبت سے اجر کی توقع رکھنا یہودیوں کا عقیدہ ہے۔

احادیث

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

سَیِّئَۃٌ تَسُوْؤُکَ خَیْرٌ مِنْ حَسَنَۃٍ تُعْجِبُکَ۔[1]

وہ گناہ جو خود تجھے برا لگے، اس نیکی سے بہتر ہے جو تجھے خود پسند بنا دے۔

حضرت امام جعفر صادق (ع) سے منقول ہے:

لَا صَغِیْرَۃَ مَعَ الْاِصْرَارِ وَلَا کَبِیْرَۃَ مَعَ الْاِسْتِغْفَارِ[2]

تکرار کی صورت میں کوئی گناہ صغیرہ نہیں رہتا (یعنی کبیرہ میں بدل جاتا ہے) اور استغفار کی صورت میں کوئی گناہ کبیرہ نہیں رہتا (یعنی بخش دیا جاتا ہے).

حضرت امام جعفر صادق (ع) سے منقول ہے:

لَمَّا نَزَلَتْ ھَذِہِ الْآیَۃُ... صَعِدَ اِبْلِیْسُ جَبَلًا بِمَکَّۃَ یُقَالُ لَہٗ ثَوْرٌ فَصَرَخَ بَاَعْلَی صَوْتِہِ بِعَفَارِیْتِہِ فَاجْتَمَعُوا اِلَیْہِ فَقَالَ: نَزَلَتْ ھَذِہِ الْآیَۃُ فَمَنْ لَھَا فَقَامَ عِفْرِیتٌ مِنَ الشَّیَاطِیْنِ فَقَالَ اَنَا لَھَا بِکَذَا وَ کَذَا فَقَالَ لَسْتَ لَھَا ثُمَّ قَامَ آخَرُ فَقَالَ مِثْلَ ذَلِکَ فَقَالَ لَسْتَ لَھَا فَقَالَ الْوَسْوَاسُ الْخَنَّاسُ اَنَا لَھَا قَالَ بِمَا ذَا قَالَ اَعِدُھُمْ وَ اُمَنِّیھِمْ حَتَّی یُوَاقِعُوا الْخَطِیئَۃَ فَاِذَا وَاقَعُوا الْخَطِیْئَۃَ اَنْسَیْتُھُمْ الْاِسْتِغْفَارَ فَقَالَ اَنْتَ لَھَا فَوَکَّلَہٗ بِھَا اِلَی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ۔[3]

جب یہ آیت... نازل ہوئی تو ابلیس مکہ کی ایک پہاڑی پر چڑھ گیا جسے ثور کہتے ہیں اور اس نے اپنے عفریتوں کو بلایا۔ سب نے پوچھا: اے سردار ہمیں کس لیے بلایا ہے؟ ابلیس نے کہا: یہ آیت نازل ہوئی ہے، بتاؤ اس کا علاج کس کے پاس ہے؟ ایک نے کہا: میں اس کا یہ علاج کروں گا۔ ابلیس نے قبول نہ کیا۔ دوسرے عفریت نے کوئی اورطریقہ بتایا۔ ابلیس نے اسے بھی رد کر دیا۔ آخر میں وسواس خناس نے کہا: میں انہیں وعدوں اور آرزؤں میں مبتلا کر دوں گا تا کہ وہ گناہ میں ملوث ہو جائیں، جب وہ گناہ میں ملوث ہو جائیں گے تو میں استغفار بھلوا دوں گا۔ ابلیس نے کہا: یہی طریقہ درست ہے۔ پھر قیامت تک یہ ذمہ داری اس کے سپرد ہوگئی۔

---

[1] غرر الحکم ص ۳۰۸۔ باب العجب و ذمہ [2] اصول الکافی ۲: ۲۸۸۔ المیزان
[3] وسائل الشیعۃ ۱۶: ۱۶۔ باب وجوب الاستغفار

اہم نکات

۱۔ متقی وہ ہے جو توبہ کے بعد پھر گناہ نہ کرے: وَالَّذِیۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَۃً ... لَمۡ یُصِرُّوۡا عَلٰی مَا فَعَلُوۡا ... ۔

قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ سُنَنٌ ۙ فَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴿۱۳۷﴾

۱۳۷۔ تم سے پہلے مختلف روشیں گزر چکی ہیں پس تم روئے زمین پر چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔

ہٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ وَ ہُدًی وَّ مَوۡعِظَۃٌ لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۱۳۸﴾

۱۳۸۔ یہ (عام) لوگوں کے لیے ایک واضح بیان ہے اور اہل تقویٰ کے لیے ہدایت و نصیحت ہے۔

تشریح کلمات

سُنَنٌ: (س ن ن) سنۃ کی جمع۔ طور طریقے۔ روش۔ مسلک اور آئین وغیرہ۔ اصل میں یہ لفظ سننت الماء "میں نے پانی بہایا" سے ماخوذ ہے۔ کسی چیز کو جاری رکھنا اور یکے بعد دیگرے یعنی تسلسل سے قائم رہنا۔

تفسیر آیات

۱۔ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ: اس آیت میں انسان کو دعوت فکر دی گئی ہے کہ وہ اقوام عالم کی سرگزشت کا مطالعہ کرے اور اس روئے زمین پر پیش آنے والے واقعات کی روشنی میں پوری نسل بنی آدم کی سیرت و کردار پر نظر ڈالے۔ اس صورت میں اسے علم ہو گا کہ حق و باطل، ظلم و انصاف اور نور و ظلمت کے درمیان جنگ کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ پوری تاریخ پر یہ نبرد آزمائی حاکم رہی ہے:

قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ یَّنۡتَہُوۡا یُغۡفَرۡ لَہُمۡ مَّا قَدۡ سَلَفَ ۚ وَ اِنۡ یَّعُوۡدُوۡا فَقَدۡ مَضَتۡ سُنَّتُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿﴾[1]

کفار سے کہد یجیے کہ اگر وہ باز آ جائیں تو جو کچھ پہلے (ان سے سرزد) ہو چکا اسے معاف کر دیا جائے گا اور اگر انہوں نے (پچھلے جرائم کا) اعادہ کیا تو گزشتہ اقوام کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ (ان کے بارے میں بھی) نافذ ہو گا۔

[1] ۸ انفال: ۳۸

قرآن اقوام عالم کی سرگزشت کا مطالعہ کرنے کے لیے سیر فی الارض، زمین کے مطالعاتی سفر کی دعوت دیتا ہے۔ جابر بادشاہوں، ظالم حکمرانوں اور خونخوار فرعونوں کے باقی ماندہ آثار بتلاتے ہیں کہ کسی زمانے میں ان قصور و محلات میں کچھ لوگ انا ربکم الاعلی کے مدعی تھے اور اپنی ہوسرانی میں بدمست ہو کر انسانیت سوز جرائم کا ارتکاب کیا کرتے تھے اور کسی قسم کی اقدار پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ آج انہی لوگوں کے محلات ویرانوں میں بدل گئے ہیں۔ ان کی ہڈیاں خاک ہو چکی ہیں، جو آنے والی نسلوں کے لیے عبرت بن گئی ہیں۔ انہوں نے چند روزہ عیش و نوش میں اپنی ابدی زندگی کو برباد کیا اور آخرکار اس دنیا کی زندگی بھی ہار بیٹھے۔ آج ان ویرانوں سے ان کی بوسیدہ ہڈیاں آواز دے رہی ہیں کہ دیکھو تکذیب کرنے والوں کا کیا انجام ہوا ہے۔

علامہ طباطبائیؒ فرماتے ہیں:

> ان آثار سے عبرت حاصل کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ انہیں محفوظ رکھا جائے اور مزید انکشافات کے لیے کھوج لگایا جائے، کیونکہ یہ تو وہی بت پرستی ہے جو مختلف صورتوں میں نمودار ہوتی رہتی ہے۔

۲۔ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ: ان آیات میں بیان شدہ حقائق کچھ لوگوں کے لیے واضح بیان اور اتمام حجت ہیں اور کچھ لوگوں کے لیے باعث ہدایت و نصیحت ہیں۔ یہ تقسیم بندی اثر قبول کرنے یا نہ کرنے کے حوالے سے ہے۔ ایک ہی بات بعض سمجھنے والوں کے لیے باعث نعمت اور کچھ کے لیے باعث عذاب و نقمت بن جاتی ہے۔

اسی لیے فرمایا: یہ بیان ہونے کے لیے ساتھ ہدایت اور موعظہ بھی ہے۔

اہم نکات

۱۔ عبرت آموزی کے لیے سیر و سیاحت اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ عمل ہے: فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ....۔

۲۔ عروج و زوال اور ہدایت و گمراہی کے کلیے ہر دور میں یکساں رہے ہیں، لہٰذا تاریخ سے درس لینا چاہیے: قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا ....۔

۳۔ تاریخ سے عبرت حاصل کرنے کے لیے تقویٰ کلیدی حیثیت رکھتا ہے: وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾

۱۳۹۔ اور ہمت نہ ہارو اور غم نہ کرو کہ تم ہی غالب رہو گے، بشرطیکہ تم مومن ہو۔

تشریح کلمات

تَهِنُوۡا: (و ہ ن) وھن ۔ کسی معاملے میں جسمانی طور پر کمزور ہونے یا اخلاقی کمزوری ظاہر ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

جنگ احد میں مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور ستر افراد شہید ہوئے اور وہ بھی مسلمانوں کے گھروں کے قریب۔ اس سے مسلمانوں میں طبیعی طور پر بے دلی سی پھیل گئی اور ان کے دلوں میں حزن و ملال چھا گیا۔ اللہ تعالیٰ ان حوصلہ ہارنے والوں کو تسلی دیتے ہوئے فرماتا ہے:

i۔ اپنے عزم و ارادے میں سستی نہ آنے دو۔ وَلَا تَهِنُوۡا...

ii۔ شکست کا زیادہ احساس کر کے اپنے آپ کو حزن و ملال اور غم و اندوہ میں مبتلا نہ کرو۔ وَلَا تَحۡزَنُوۡا....

iii۔ اگر تم نے اپنے ایمان کی پختگی قائم رکھی اور اس کے نتیجے میں صبر و تقویٰ کا دامن تھامے رکھا تو تم ہی غالب رہو گے۔ وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ....

اس آیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ قوموں کی سرنوشت میں ایمان کا کتنا گہرا اثر ہے۔

خلاصہ یہ کہ واقعہ احد سے بد دل ہو کر یہ خیال کرنا درست نہیں ہے کہ تم پر مشرکین غالب آئیں گے بلکہ اگر تم ایمانی اسلحے سے لیس رہے تو تم ہی غالب رہو گے۔

شان نزول کے لحاظ سے اگرچہ اس آیت کے مخاطب زمان نزول قرآن کے مسلمان ہیں، لیکن الفاظ کے عموم میں تمام زمانے کے مسلمان شامل ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کی تاریخ بھی اس آیت کی تفسیر کر رہی ہے کہ جیسے ہی مسلمانوں میں ایمان کی کمزوری آئی، ان کا غلبہ بھی کم ہوتا گیا اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔

اہم نکات

۱۔ احساس کمتری سے دل شکستہ اور غمزدہ رہنا ترقی اور سر بلندی کی راہ میں رکاوٹ ہے: وَلَا تَهِنُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا....

۲۔ غلبۂ اسلام کے لیے مادی طور پر بھی کمزوری کا خاتمہ ضروری ہے: وَلَا تَهِنُوۡا....

۳۔ غلبۂ اسلام میں نظریاتی اور عملی طور پر ایمان کی پختگی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے: وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۔

اِنۡ یَّمۡسَسۡکُمۡ قَرۡحٌ فَقَدۡ مَسَّ الۡقَوۡمَ قَرۡحٌ مِّثۡلُہٗ ؕ وَ تِلۡکَ الۡاَیَّامُ نُدَاوِلُہَا بَیۡنَ النَّاسِ ۚ وَ لِیَعۡلَمَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ یَتَّخِذَ مِنۡکُمۡ شُہَدَآءَ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۴۰﴾

۱۴۰۔ اگر تمہیں کوئی زخم لگا ہے تو تمہارے دشمن کو بھی ویسا ہی زخم لگ چکا ہے اور یہ ہیں وہ ایام جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں اوراس طرح اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ مومن کون ہیں اور چاہتا ہے کہ تم میں سے کچھ کو گواہ کے طور پر لیا جائے، کیونکہ اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔

وَ لِیُمَحِّصَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ یَمۡحَقَ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۱۴۱﴾

۱۴۱۔ نیز اللہ ایمان والوں کو چھانٹنا اور کافروں کو نابود کرنا چاہتا ہے۔

تشریح کلمات

قَرۡحٌ: (ق ر ح) کسی خارجی اثر سے لگنے والا زخم۔

نُدَاوِلُ: (د و ل) دَاوَلَ گردش دینا۔

یُمَحِّصَ: (م ح ص) کسی چیز کو کھوٹ اور عیب سے پاک کرنا۔

تفسیر آیات

اِنۡ یَّمۡسَسۡکُمۡ قَرۡحٌ: مسلمانوں کے اذہان سے احساس شکست کو دور کرنے اور انہیں حوصلہ دینے کا نہایت مناسب طریقہ اس دشمن کے کردار کو سامنے رکھنا ہے، جس کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانی پڑی ہو۔ چنانچہ آیت میں یہی فرمایا: تمہیں احد کی شکست سے بد دل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اگرچہ احد میں تمہیں زخم لگے ہیں لیکن اس سے پہلے تمہارے دشمن کو بھی ایسے ہی زخم لگ چکے ہیں۔ جب وہ ہمت ہارے بغیر دوبارہ تمہارے مقابلے کے لیے نکل آئے ہیں تو تمہیں بھی ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ فلسفہ فتح و شکست کو سمجھنے کے لیے درج ذیل نکات قابل توجہ ہیں:

۱۔ وَ تِلۡکَ الۡاَیَّامُ نُدَاوِلُہَا: سنت الٰہی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ حالات کبھی ایک طرح کے نہیں رہتے۔ یہ ایام ہمیشہ گردش میں رہتے ہیں۔ آج اگر مشرکین کو تم پر وقتی غلبہ حاصل ہوا ہے تو یہ خیال نہ کرنا کہ ہمیشہ ایسے ہی ہو گا۔ فتح و شکست، دکھ سکھ، تکلیف و آسودگی اور خوشی و غم دائمی نہیں، بلکہ یہ سب وقتی اور زوال پذیر ہیں۔

کیونکہ نظام کائنات ان سب پر حاکم ہے۔ یہ تمام چیزیں قانون الٰہی کے تابع ہیں اور سنت الٰہی یہ ہے کہ فتح و شکست علل واسباب کے ساتھ مربوط ہو۔ سابقہ آیت میں قرآن نے مسلمانوں کو بتا دیا تھا کہ ان علل و اسباب میں سے اہم سبب ایمان ہے، جس کے نتیجے میں صبر وتقویٰ وجود میں آتے ہیں اور غلبہ و اقتدار حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا بد دلی اور حزن و ملال کی بجائے اپنی صفوں میں اتفاق و اتحاد پیدا کرو، ثابت قدم رہو اور عزم و ارادے میں پختگی پیدا کرو:

وَاَعِدُّوۡا لَہُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّۃٍ ...[1] اور ان (کفار) کے مقابلے کے لیے تم سے جہاں تک ہو سکے طاقت مہیا کرو....

چنانچہ جنگ احد میں پہلے تو مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا اور مشرکین کا علم تک سرنگوں ہو گیا، جسے اٹھانے کے لیے جب کوئی مرد جرأت نہ کر سکا تو ایک عورت نے اٹھایا۔ بعد میں جب مسلمانوں نے مال دنیا کی طمع میں حکم رسول (ص) کی خلاف ورزی کی تو انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسرے لفظوں میں قرآن ایک اہم نکتے طرف کی مسلمانوں کی توجہ مبذول کرا رہا ہے کہ جنگ بدر کی فتح و نصرت سے یہ نہ سمجھو کہ چونکہ ہم حق پر ہیں، لہٰذا قانون علل و اسباب سے ہٹ کر ہمیشہ فتح و نصرت ہمیں حاصل ہوتی رہے گی۔ ہر قدم پر ہمارے لیے معجزہ رونما ہوگا اور قانون فطرت کی دفعات ہم پر لاگو نہیں ہوں گی۔ جیسا کہ آج کے مسلمان بھی اکثر یہی سوال اٹھاتے ہیں کہ ہم حق پر ہونے کے باوجود بہت سی اقوام عالم سے پیچھے کیوں ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کے اٹل اصولوں سے مسلمان بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اللہ کا وضع کردہ تکوینی و فطری دستور مکمل غیر جانبدار اور سب کے لیے یکساں ہے۔ ایسا نہیں کہ کافر کی تیز دھار تلوار نہ کاٹے اور مسلمان کی کند تلوار کاٹتی رہے۔ قوانین فطرت میں برابری اور تاریخ کے اصولوں میں یکسانیت کی وجہ سے ہی مسلمان امتحان و آزمائش میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اسی امتحان و آزمائش سے انہیں ارتقا و تکامل کے لیے مواقع میسر آتے ہیں۔ اگر قانون فطرت سب کے لیے یکساں نہ ہو اور مسلمان اس سے مستثنیٰ ہوں تو پھر امتحان و آزمائش کے ذریعے ارتقا و تکامل کا حصول ممکن نہیں رہے گا۔ چنانچہ دوسری جگہ اس مطلب کو واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ عَلَی الۡقِتَالِ ؕ اِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ عِشۡرُوۡنَ صٰبِرُوۡنَ یَغۡلِبُوۡا مِائَتَیۡنِ ...[2] اے نبی! مومنوں کو جنگ کی ترغیب دیں، اگر تم میں بیس صابر (جنگجو) ہوں تو وہ دو سو (کافروں) پر غالب آ جائیں گے۔

اس آیت میں ثابت قدمی کی صورت میں دس گنا زیادہ افراد پر فتح و نصرت کی نوید سنائی گئی ہے۔

---

[1] ۸ انفال: ۶۰ [2] ۸ انفال: ۶۵

لیکن ثابت قدمی میں کمزوری واقع ہونے کی صورت میں یہ تناسب کم ہو کر صرف دوگنا تک محدود ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

اَلۡـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰہُ عَنۡکُمۡ وَ عَلِمَ اَنَّ فِیۡکُمۡ ضَعۡفًا ؕ فَاِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ مِّائَۃٌ صَابِرَۃٌ یَّغۡلِبُوۡا مِائَتَیۡنِ ...[1]	اب اللہ نے تم لوگوں سے ہلکا کر دیا ہے اور اللہ کو علم ہے کہ اب تم میں کمزوری آ گئی ہے، لہٰذا اب اگر تم میں سو صابر افراد ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے۔

اسی قانون فطرت اور سنت الٰہی کی عام دفعات کے تحت کامیابی اور فتح کے امکانات دس گنا سے گھٹ کر دوگنا تک آ گئے۔

۲۔ وَلِیَعۡلَمَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ مومن کون ہے اور منافق کون ہے؟ اللہ تعالیٰ زمانے کے نشیب و فراز کو لوگوں کے درمیان گردش دیتا ہے۔ کبھی فتح و نصرت سے نواز کر اور کبھی شکست سے دوچار کر کے لوگوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے تاکہ لوگ میدان عمل میں اتر کر اپنے ایمان کی سچائی ثابت کریں۔ کیونکہ ایمان کے ثبوت کی بہترین دلیل عمل ہے اور بہترین عمل یہ ہے کہ میدان جنگ میں ثابت قدم رہا جائے۔ لہٰذا ایمان اور نفاق میں امتیاز پیدا کرنے کے لیے میدان جنگ ہی بہترین کسوٹی ہے۔

۳۔ وَیَتَّخِذَ مِنۡکُمۡ شُھَدَآءَ: اللہ چاہتا ہے کہ تم میں سے کچھ کو گواہ بنائے کہ کس نے رسول خدا (ص) کے حکم کی نافرمانی کی ہے اور کس نے راہ خدا میں قربانی دی ہے۔ اللہ کی عدالت میں شہادت دینے کے عظیم منصب پر تمام لوگ فائز نہیں ہو سکتے، اسی لیے مِنۡکُمۡ تم میں سے کچھ، کے لفظ استعمال فرمائے۔ اس منصب پر فائز ہونے والوں کو امت وسط فرمایا ہے۔

۴۔ وَلِیُمَحِّصَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: اللہ تعالیٰ مومنوں کو چھانٹ کر انہیں ہر قسم کے کھوٹ اور عیب سے پاک کرنا چاہتا ہے۔ جس طرح سونے کو آگ میں ڈال کر اس کا میل کچیل صاف کیا جاتا ہے۔

اس آیت کی رو سے جنگ کے نتیجے میں مسلمانوں کے چار گروہ سامنے آئے: مومن۔ منافق۔ گواہ اور قابل اصلاح مومن۔

۵۔ وَیَمۡحَقَ الۡکٰفِرِیۡنَ: اس طرح کی آزمائش سے گزرنے کے بعد ہی مسلمان اس قابل ہوں گے کہ وہ کفار کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکیں اور ان کے سارے عزائم خاک میں ملا سکیں۔ کفار کی نابودی سے مراد ان کے برے عزائم کی نابودی ہے۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتے تھے۔

اہم نکات

۱۔ ظاہری فتح و شکست اللہ کے تکوینی قوانین کے تابع ہے۔ لہٰذا ضروری نہیں کہ ظاہری طور پر ہمیشہ

---

[1] ۸ انفال: ۶۶

مسلمان ہی فتحیاب رہیں۔

۲۔ ظاہری شکست سے بد دل ہونا ایمان کی کمزوری کی علامت ہے: اِنۡ یَّمۡسَسۡکُمۡ قَرۡحٌ ... وَ تِلۡکَ الۡاَیَّامُ نُدَاوِلُہَا بَیۡنَ النَّاسِ ۔

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ وَ لَمَّا یَعۡلَمِ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ جٰہَدُوۡا مِنۡکُمۡ وَ یَعۡلَمَ الصّٰبِرِیۡنَ﴿۱۴۲﴾

۱۴۲۔ کیا تم (لوگ) یہ سمجھتے ہو کہ جنت میں یونہی چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے جہاد کرنے والے اور صبر کرنے والے کون ہیں؟

تفسیر آیات

۱۔ اَمۡ حَسِبۡتُمۡ : اس آیت میں بھی ایک ایسی غلط فہمی کا ازالہ ہے جس میں عصر رسول (ص) کے مسلمان بھی اسی طرح مبتلا تھے، جس طرح آج کے کچھ مسلمان مبتلا ہیں کہ حق کے پرچم تلے آنے کے بعد دنیا میں ان پر کوئی غالب آ ہی نہیں سکتا، حق پر ہونا کافی ہے، دیگر کسی چیز کی ضرورت نہیں نیز آخرت میں بھی جنت میں داخل ہونے کے لیے نہ تو کسی عمل کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی امتحان و آزمائش کے مراحل سے گزرنا ضروری ہے۔

۲۔ وَ لَمَّا یَعۡلَمِ اللّٰہُ: اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا کہ صبر و جہاد کے ذریعے اپنے آپ کو استحقاق کی منزل پر فائز کیے بغیر تم جنت میں داخل نہیں ہو سکتے۔ یہ ان خوش فہم مسلمانوں کے لیے تنبیہ ہے جو ابھی تک جہاد کی آزمائش سے گزر کر صبر کے مقام پر فائز نہیں ہوئے، پھر بھی جنت کی امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ یہ آج کے خوش فہم مسلمانوں کے لیے بھی لمحہ فکریہ ہے جو عمل کے بغیر استحقاق کی امید رکھتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی راہ میں مجاہدت اور مشکلات پر ثابت قدمی کے بغیر حصول جنت کی توقع خام خیالی ہے: اَمۡ حَسِبۡتُمۡ ... ۔

وَ لَقَدۡ کُنۡتُمۡ تَمَنَّوۡنَ الۡمَوۡتَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَلۡقَوۡہُ ۪ فَقَدۡ رَاَیۡتُمُوۡہُ وَ اَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ﴿۱۴۳﴾

۱۴۳۔ اور موت کے سامنے آنے سے قبل تو تم مرنے کی تمنا کر رہے تھے، سو اب وہ تمہارے سامنے ہے جسے تم دیکھ رہے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَقَدۡ کُنۡتُمۡ تَمَنَّوۡنَ الۡمَوۡتَ: گزشتہ آیت میں آزمائش و امتحان کا ذکر ہوا۔ اب اس آیت میں یہ فلسفہ بیان ہو رہا ہے کہ امتحان کیوں لیا جاتا ہے۔ یہ اس لیے کہ جنگ سے پہلے جو لوگ زبانی دعویٰ کرتے ہوئے شہادت کی تمنا کرتے ہیں، عملی میدان میں وہ اسی قدر پیچھے ہوتے ہیں، بلکہ جنگ کے میدان سے فرار اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ بعد میں حاضر نہیں تھے، وہ جنگ بدر کے بعد شہادت کی تمنا کرتے تھے لیکن یہی لوگ جنگ احد میں فرار کی راہ اختیار کر گئے۔ اگر امتحان نہ ہوتا تو فرار اور جہاد کرنے والوں میں امتیاز کیسے ہوتا اور ثواب وعقاب کا استحقاق کیسے پیدا ہوتا۔

اہم نکات

۱۔ شوق شہادت کے دعوؤں کی حقیقت تب عیاں ہوتی ہے جب موت سامنے آ جائے۔

۲۔ اگر آزمائش نہ ہوتی تو فرار کرنے اور ثابت قدم رہنے والوں میں امتیاز قائم نہ ہوتا۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِہِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۠ئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِکُمۡ ؕ وَمَنۡ یَّنۡقَلِبۡ عَلٰی عَقِبَیۡہِ فَلَنۡ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیۡئًا ؕ وَ سَیَجۡزِی اللّٰہُ الشّٰکِرِیۡنَ ﴿۱۴۴﴾

۱۴۴۔ اور محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) تو بس رسول ہی ہیں، ان سے پہلے اور بھی رسول گزر چکے ہیں، بھلا اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جو الٹے پاؤں پھر جائے گا وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا اور اللہ عنقریب شکر گزاروں کو جزا دے گا۔

تشریح کلمات

مُحَمَّدٌ: (ح م د) یہ مبارک اسم قرآن مجید میں پہلی مرتبہ آیا ہے۔ مفردات میں راغب اصفہانی لکھتے ہیں: یقال فلان محمد اذا کثرت خصالہ المحمودۃ۔ محمد صرف اسے کہ سکتے ہیں جو شخص بکثرت قابل ستائش خصائل رکھتا ہو۔ یہ نام عربوں میں رائج نہ تھا اور پہلی بار یہ نام رسول مقبول (ص) سے مخصوص کیا گیا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ: مسلمانوں کو جنگ احد میں امتحان کے مراحل سے گزارنے کے بعد

جو نتائج سامنے آئے، ان کا تذکرہ جاری ہے۔ سابقہ آیت میں فرمایا: احد کی شکست کے ذریعے اللہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ مومن کون ہے اور منافق کون؟ اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو رسول کریم (ص) کی شہادت کی افواہ سن کر اپنے ایمان کی دلی کیفیت کو فاش کرتے ہوئے مرتد ہو گئے اور کہنے لگے: اگر محمد (ص) خدا کے رسول ہوتے تو کبھی قتل نہ ہوتے۔ چنانچہ اصحاب صخرہ نے تو ابوسفیان سے امان نامہ حاصل کرنے کے لیے منافقین کے سربراہ عبداللہ بن ابی سے رابطہ قائم کرنے کا تہیہ بھی کر لیا تھا۔

۲۔ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِکُمۡ: قابل توجہ بات یہ ہے کہ کچھ مسلمان دوسری جنگوں، مثلاً حنین اور خیبر میں بھی میدان جنگ سے فرار ہو گئے تھے۔ وہاں ایک مقام پر قرآن نے جنگ سے بھاگنے والوں کے بارے میں کہا:

ثُمَّ وَلَّیۡتُمۡ مُّدۡبِرِیۡنَ[1] — پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

یعنی جنگ سے بھاگنے کا ذکر تو کیا مگر اس فرار کو اسلام سے انحراف اور ارتداد قرار نہیں دیا۔ لیکن احد کی جنگ سے بھاگ جانے والوں کے بارے میں فرمایا: اِنۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِکُمۡ تم الٹے پاؤں پھر گئے، یعنی مرتد ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اِنۡقَلَبۡتُمۡ سے مراد ''فرار'' نہیں بلکہ ''ارتداد'' ہے۔

انقلب، ینقلب، منقلب ہونا، الٹے پاؤں پھر جانا، یعنی مرتد ہونا۔ جیسا کہ تحویل قبلہ کے بارے میں فرمایا:

عَلَیۡہَاۤ اِلَّا لِنَعۡلَمَ مَنۡ یَّتَّبِعُ الرَّسُوۡلَ مِمَّنۡ یَّنۡقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیۡہِ...[2] — تاکہ ہم رسول کی اتباع کرنے والوں کو الٹا پھر جانے والوں سے پہچان لیں۔

جن لوگوں نے انقلب کو فرار کا ہم معنی قرار دیا ہے، انہوں نے سیاق و سباق اور نظائر قرآن سے نہایت ناانصافی کی ہے۔ قرآن مجید کے نظائر سے یہ بات واضح ہے کہ قرآن فرار کے لیے وَلّٰی مُدبرا اور ارتداد کو بیان کرنے کے لیے اِنۡقَلَبَ کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تُطِیۡعُوا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یَرُدُّوۡکُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِکُمۡ فَتَنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِیۡنَ ۝[3] — اے ایمان والو! اگر تم نے کفار کی اطاعت کی تو وہ تمہیں الٹا پھیر دیں گے پھر تم (مرتد ہو کر) بڑے خسارے میں پڑ جاؤ گے۔

البتہ اکثر مفسرین نے انصافاً یہ لکھا ہے کہ یہاں یَّنۡقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیۡہِ سے شکست و فرار نہیں بلکہ دین وعقیدے سے ارتداد مراد ہے۔ اِنۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِکُمۡ یعنی ارتددتم عن دینکم و ارتددتم کفارا عن دینکم۔ اِنۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِکُمۡ سے مراد دین سے مرتد ہونا اور کفر اختیار کرنا ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر، تفسیر قرطبی، تفسیر طبری، فی ظلال القرآن وغیرہ وغیرہ۔

---

[1] ۹ توبہ: ۲۵ [2] ۲ بقرہ: ۱۴۳ [3] ۳ آل عمران: ۱۴۹

۳۔ فَلَنۡ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیۡـًٔا: مرتد ہونے سے اللہ نہیں، خود مرتد ہونے والے ضرر اٹھاتے ہیں اور ابدی عذاب میں اپنے آپ کو مبتلا کرتے ہیں۔

۴۔ سَیَجۡزِی اللّٰہُ الشّٰکِرِیۡنَ: سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتد ہونے والوں کے مقابلے میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو نعمت ایمان پر شاکر اور ثابت قدم رہے۔ البتہ یہ لوگ تھوڑے تھے:

وَ قَلِیۡلٌ مِّنۡ عِبَادِیَ الشَّکُوۡرُ۔[1] اور میرے بندوں میں شکر کرنے والے کم ہیں۔

بعدی کا مسئلہ: تمام انبیاء (ع) کے لیے ایک مسئلہ درپیش رہا ہے۔ وہ مسئلہ انبیاء (ع) کے بعد کا ہے کہ نبی (ع) کی آنکھ بند ہونے کے بعد اس کی امت میں انحراف شروع ہوتا رہا۔ حضرت موسیٰ (ع) تو ابھی دنیا سے گئے بھی نہیں تھے، صرف چالیس دنوں کے لیے غائب ہوئے، امت کی اکثریت نے دین کے اصول سے انحراف کر کے گوسالہ پرستی شروع کر دی: بِئۡسَمَا خَلَفۡتُمُوۡنِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِیۡ...[2] چنانچہ سورہ مریم آیات ۵۸۔ ۵۹ میں فرمایا کہ یہ بات تمام انبیاء (ع) کو اپنے بعد کے لیے درپیش رہی ہے:

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ مِنۡ ذُرِّیَّۃِ اٰدَمَ ٭ وَ مِمَّنۡ حَمَلۡنَا مَعَ نُوۡحٍ ۫ وَّ مِنۡ ذُرِّیَّۃِ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اِسۡرَآءِیۡلَ ۫ وَ مِمَّنۡ ہَدَیۡنَا وَ اجۡتَبَیۡنَا ؕ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتُ الرَّحۡمٰنِ خَرُّوۡا سُجَّدًا وَّ بُکِیًّا ۞ فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَ اتَّبَعُوا الشَّہَوٰتِ فَسَوۡفَ یَلۡقَوۡنَ غَیًّا ۞

یہ وہ انبیاء ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا جو اولاد آدم میں سے ہیں اور ان میں سے جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں اٹھایا اور ابراہیم و اسماعیل کی اولاد میں سے اور ان لوگوں میں سے جنہیں ہم نے ہدایت دی اور برگزیدہ کیا، جب ان پر رحمٰن کی آیات کی تلاوت کی جاتی تو وہ روتے ہوئے سجدے میں گر پڑتے۔ پھر ان کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشات کے پیچھے چل پڑے، پس وہ عنقریب ہلاکت سے دوچار ہوں گے۔

مندرجہ بالا آیات میں تمام انبیاء علیہم السلام کا اجمالی ذکر آیا ہے، چونکہ انبیاء (ع) تین سلسلوں میں آئے ہیں۔ حضرت آدم، حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہم السلام۔ ان کے ساتھ دیگر برگزیدہ ہستیوں کا بھی ذکر آیا، جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے۔ اس جامع ذکر کے بعد فرمایا: فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ خَلۡفٌ۔ پھر ان کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے، جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشات کی پیروی کی۔ عملاً یہ روش ہمیشہ رہی ہے اور امت محمدی (ص) بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے:

سُنَّۃَ اللّٰہِ فِی الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلُ ۚ وَ لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا ۞ [3] جو پہلے گزر چکے ہیں ان کے لیے بھی اللہ کا یہی دستور رہا ہے اور اللہ کے دستور میں آپ کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔

---

[1] ۳۴ سبا: ۱۳
[2] ۷ اعراف: ۱۵۰۔ تم نے میرے بعد بہت بری جانشینی کی۔
[3] ۳۳ احزاب: ۶۲

چنانچہ متعدد احادیث میں بھی آیا ہے کہ جو کچھ گزشتہ امتوں میں پیش آیا ہے وہ اس امت میں بھی پیش آئے گا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے: لَتَرْكَبُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حَذو النَّعْلِ بالنَّعْلِ .... [1] تم سابقہ امتوں کی روش پر قدم بہ قدم چلو گے۔

رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بعد کے لیے فکرمند تھے۔ اس بات کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعدد مقامات پر متعدد تعبیروں میں اظہار فرمایا ہے۔ ذیل میں ہم اس کا اجمالی ذکر کرتے ہیں:

۱۔ لا تَرْجِعُوا بَعْدِيْ كُفَاراً۔ [2] میرے بعد کافر ہو کر پلٹ نہ جاؤ۔

اس حدیث کو بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے اپنی اپنی صحاح میں نقل کیا ہے۔

۲۔ طبقاتی تفاوت: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صراحت سے فرمایا کہ تم میرے بعد ترجیحاتی سلوک کا مشاہدہ کرو گے:

سَتَرَوْنَ بَعْدِیْ اِثْرَةً فَاصْبِرُوْا حَتّٰى تَلْقَوْنِیْ۔ میرے بعد تم ترجیحاتی سلوک کا مشاہدہ کرو گے۔ صبر کرو مجھ سے ملنے تک۔

دوسرے الفاظ میں حضرت ابوذرؓ سے فرمایا:

كَيْفَ اَنْتَ وَ اَئِمَّةٌ مِنْ بَعْدِیْ لَيَسْتَاْثِرُوْنَ بِهٰذَا الْفَیْءِ۔ تمہارا اس وقت کیا حال ہوگا جب اس مال میں ترجیحی سلوک ہوگا۔

ملاحظہ ہو سنن ابی داؤد باب الخوارج، کنز العمال باب الخمس، صحیح بخاری باب قول النبی اصبر حتی تلقونی، سنن الترمذی باب ما جاء فی الاثرۃ ، سنن نسائی، صحیح مسلم باب الامر بالصبر۔

۳۔ حدیث حوض: قیامت کے دن رسول اللہ (ص) کے چند معاصر حوض کوثر سے ہٹا دیے جائیں گے تو رسول اللہ (ص) فرمائیں گے: یہ میرے ساتھی ہیں تو ان سے کہا جائے گا:

اِنَّكَ لَا تَدْرِیْ مَا اَحْدَثُوْا بَعْدَكَ۔

آپ کو کیا معلوم کہ آپ کے بعد ان لوگوں نے کیا تبدیلیاں کی ہیں۔

ملاحظہ ہو صحیح بخاری باب اثبات حوض النبی۔ باب الحوض۔ صحیح مسلم ابواب القیامۃ۔ سنن ابن ماجہ۔

امام مالک نے موطا میں ایک حدیث نقل کی ہے جس میں خطاب کر کے صراحت کے ساتھ فرمایا:

وَلٰكِنْ لَا اَدْرِیْ مَا تُحْدِثُوْنَ بَعْدِیْ۔

---

[1] کنز العمال حدیث ۲۲۰۵۷۔ تفسیر العیاشی ۱: ۳۰۳
[2] الکافی ۷: ۲۷۳

مجھے کیا معلوم کہ تم میرے بعد کیا تبدیلیاں لانے والے ہو۔

ملاحظہ ہو موطا امام مالك، كتاب الجهاد۔

۴۔ اس کے علاوہ دیگر مقامات میں حضور (ص) نے متعدد واقعات کی طرف اشارہ فرمایا۔ مثلاً:

سَتَکُوۡنُ بَعۡدِی ھَنَاتٌ وَ ھَنَاتٌ۔[1] میرے بعد برائیاں اور فسادات رونما ہوں گے۔

۵۔ سَیَلِیۡ اُمُوۡرَکُمۡ بَعۡدِیۡ رِجَالٌ یُطۡفِئُوۡنَ السُّنَّۃَ۔[2] میرے بعد چند ایسے لوگ بھی تمہارے حاکم بن جائیں گے جو سنت کو پامال کریں گے۔

یَکُوۡنُ بَعۡدِیۡ اَئِمَّۃٌ لَا یَھۡتَدُوۡنَ بُھِدَایَ وَلَا یَسۡتَنُّوۡنَ بِسُنَّتِیۡ۔[3] میرے بعد کچھ سربراہ ایسے بھی ہوں گے، جو میری ہدایت کے راستے پر نہیں چلیں گے اور میری سنت کو نہیں اپنائیں گے۔

آخر میں اس روایت پر بحث ختم کرتے ہیں جسے ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اِس آیت کے ذیل میں ذکر کیا ہے:

قال ابو القاسم الطبرانی عن ابن عباس: ان علیاً کان یقول فی حیاة رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه (و آله) و سلم اَفَاۡئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِکُمۡ و اللّٰه لا ننقلب علی اعقابنا بعد اذ هدانا اللّٰه لئن مات او قتل لا قاتلن علی ما قاتل علیه حتی اموت و اللّٰه انی لاخوه و ولیه و ابن عمه و وارثه فمن احق به منی۔

ابو القاسم طبرانی نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ علی (علیہ السلام) رسول اللہ صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم کی زندگی میں فرمایا کرتے تھے: اَفَاۡئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِکُمۡ۔ یعنی اگر رسول وفات پا جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔ قسم بخدا ہم الٹے پاؤں نہیں پھر جائیں گے۔ اگر رسولؐ وفات پا جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو ہم مرنے تک اس بات پر لڑتے رہیں گے، جس بات پر رسول اللہ لڑتے رہے۔ قسم بخدا میں رسولؐ کا بھائی اور ولی، ابن عم اور ان کا وارث ہوں۔ مجھ سے زیادہ سزاوار کون ہے۔

اہم نکات

۱۔ انفرادی مصائب سے دوچار ہونا حق یا باطل پر ہونے کی دلیل نہیں ہے بلکہ اہل حق کو مصائب

---

[1] سنن نسائی باب من فارق الجماعة۔ نیز هنات ای شرور و فساد (السندی)
[2] سنن ابن ماجه باب لا طاعة فی معصیة اللّٰه۔
[3] صحیح مسلم باب ملازمة جماعة المسلمین۔

اور اہل باطل کو ناز و نعمت کے ذریعے آزمائش میں ڈالا جاتا ہے۔

۲۔ رسول (ص) کے وصال کے بعد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات میں تبدیلیاں لائی گئیں۔

۳۔ جنگ احد میں شہادت رسول (ص) کی خبر سن کر بہت سے لوگ مرتد ہو گئے: انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِکُمۡ ....

۴۔ کچھ لوگ ثابت قدم رہے جن کی تعداد کم تھی۔

وَمَا کَانَ لِنَفۡسٍ اَنۡ تَمُوۡتَ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ کِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَ مَنۡ یُّرِدۡ ثَوَابَ الدُّنۡیَا نُؤۡتِہٖ مِنۡہَا ۚ وَمَنۡ یُّرِدۡ ثَوَابَ الۡاٰخِرَۃِ نُؤۡتِہٖ مِنۡہَا ؕ وَسَنَجۡزِی الشّٰکِرِیۡنَ ﴿۱۴۵﴾	۱۴۵۔ اور کوئی جاندار بھی اذن خدا کے بغیر نہیں مر سکتا اس (کی موت) کا وقت مقرر کر کے لکھ رکھا ہے اور جو (شخص اپنے اعمال کا) صلہ دنیا میں چاہے گا، اسے ہم دنیا میں دیں گے اور جو آخرت میں ثواب کا خواہاں ہو، اسے آخرت میں دیں گے اور ہم عنقریب شکرگزاروں کو اچھا صلہ دیں گے۔

تفسیر آیات

ان لوگوں کے خیالات کی تردید ہو رہی ہے جو کہتے ہیں:

لَوۡ کَانَ لَنَا مِنَ الۡاَمۡرِ شَیۡءٌ مَّا قُتِلۡنَا ھٰہُنَا ....[1]	اگر (قیادت میں) ہمارا کچھ دخل ہوتا تو ہم یہاں مارے نہ جاتے۔
لَّوۡ کَانُوۡا عِنۡدَنَا مَا مَاتُوۡا وَ مَا قُتِلُوۡا ....[2]	اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے۔
لَوۡ اَطَاعُوۡنَا مَا قُتِلُوۡا ....[3]	کاش وہ اگر ہماری بات مانتے تو قتل نہ ہوتے۔

۱۔ وَمَا کَانَ لِنَفۡسٍ اَنۡ تَمُوۡتَ: اس قسم کے خیالات کا لازمہ یہ ہے کہ موت و حیات اللہ کے ہاتھ میں نہیں بلکہ ان کی اپنی تدابیر سے مربوط ہے۔ اس آیت میں اس خیال کی نفی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ موت و حیات اللہ کے ہاتھ میں ہے اور ہر ذی روح کے لیے موت کا دن مقرر ہے۔

۲۔ کِتٰبًا مُّؤَجَّلًا: یعنی اللہ نے ہر زندہ کے لیے ایک عمر کا تعین کیا ہے، اس سے نہ کم ہو گی نہ زیادہ۔

---

[1] آل عمران: ۱۵۴ [2] ۳ آل عمران: ۱۵۶ [3] ۳ آل عمران: ۱۶۸

یہاں میدان جنگ سے بھاگنے والوں کو تنبیہ کرنا بھی مقصود ہے کہ جنگ سے فرار کے ذریعے تم اپنی موت کو ٹال نہیں سکتے، لہٰذا موت کے خوف سے فرار اختیار کرنا اس عقیدے کے منافی ہے کہ موت و حیات اللہ کے ہاتھ میں ہے نیز وہ راہ خدا میں قتل ہونے سے بچ کر صرف دنیا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور آخرت کی حیات ابدی کا عقیدہ نہیں رکھتے۔

۳۔ وَمَنۡ یُّرِدۡ ثَوَابَ الدُّنۡیَا: جو صرف دنیا کے مفادات کا خواہشمند ہے، اسے ہم دنیا دے دیتے ہیں یعنی غنیمت، لیکن اس کو آخرت میں کچھ بھی نہیں ملے گا۔

۴۔ وَمَنۡ یُّرِدۡ ثَوَابَ الۡاٰخِرَۃِ: جو جہاد سے آخرت کا خواہاں ہے، اسے آخرت کے ساتھ دنیا بھی مل جاتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ جنگ سے فرار کرنے سے موت نہیں ٹل سکتی۔

۲۔ جنگ سے فرار کمزور عقیدۂ معاد اور دنیا پرستی کی دلیل ہے۔

وَ کَاَیِّنۡ مِّنۡ نَّبِیٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَہٗ رِبِّیُّوۡنَ کَثِیۡرٌ ۚ فَمَا وَہَنُوۡا لِمَاۤ اَصَابَہُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ مَا ضَعُفُوۡا وَ مَا اسۡتَکَانُوۡا ؕ وَ اللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۴۶﴾

۱۴۶۔ اور کتنے ہی ایسے نبی گزرے ہیں جن کی ہمراہی میں بہت سے اللہ والوں نے جنگ لڑی لیکن اللہ کی راہ میں آنے والی مصیبتوں کی وجہ سے نہ وہ بد دل ہوئے نہ انہوں نے کمزوری دکھائی اور نہ وہ خوار ہوئے اور اللہ تو صابروں کو دوست رکھتا ہے۔

تشریح کلمات

رِبِّیُّوۡنَ: (ر ب ی) رِبِّی کی جمع۔ رب کی طرف منسوب یعنی رب والے۔

اَسۡتَکَانُوۡا: (ک و ن) تضرع، تذلل۔

تفسیر آیات

۱۔ وَکَاَیِّنۡ مِّنۡ نَّبِیٍّ: اس آیت میں دیگر اقوام کی سیرت و کردار کی روشنی میں نصیحت بھی ہے

اور ملامت و عتاب بھی کہ انبیاء اللہ کے ساتھ تم سے پہلے بہت سے اصحاب نے جنگیں لڑی ہیں، وہ لوگ رِبِّيُّوْنَ رب والے، اللہ کے عاشق لوگ تھے۔

۲۔ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ : اگرچہ ان مجاہدین نے زخم کھائے (اَصَابَهُمْ)، لیکن چونکہ انہوں نے یہ زخم فی سبیل اللہ کھائے تھے، اس لیے وہ ان زخموں کو کھلے دل سے تحمل کر رہے تھے۔ اس امت کے رِبِّی حضرت علی علیہ السلام کو جنگ احد میں اسّی (۸۰) ایسے زخم لگے، جن کے ایک طرف پٹی کر دی جاتی تو دوسری طرف نکل جاتی تھی۔ روایات میں آیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپؑ کی عیادت کے لیے گئے تو و هو مثل المضغة علی نطع دیکھا، وہ ایسے لیٹے ہوئے تھے جیسے چمڑے پر خون کا لوتھڑا پڑا ہوا ہے۔ (البرھان)

۳۔ وَمَا ضَعُفُوْا: نہ ہی ان رِبِّيُّوْنَ نے کمزوری دکھائی۔ روح المعانی میں آیا ہے:

ماعراهم ضعف فی الدین بان تغیر اعتقادهم لعدم النصر.

ان میں اپنے دین کے بارے میں کوئی کمزوری نہیں آئی کہ کامیابی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے ان کے دینی عقیدے میں کوئی تغیر آیا ہو۔

۴۔ وَمَا اسْتَكَانُوْا: وہ اپنے دشمن کے سامنے خوار و ذلیل نہ ہوئے۔ یعنی آخری دم تک مردانہ مقابلہ کیا۔ یہ وہ تین نکات تھے، جن سے احد کی جنگ میں کچھ لوگ دوچار ہوئے۔

اس آیت میں دیگر اقوام کی سیرت و کردار کی روشنی میں نصیحت بھی ہے اور ملامت و عتاب بھی کہ انبیاء کے ساتھ بہت سے لڑنے والے ایسے تھے جو مصائب میں نہ بد دل ہوئے، نہ کمزوری دکھائی اور وہ خوار و رسوا بھی نہیں ہوئے۔ یعنی وہ تمہاری طرح نہیں تھے۔ کیونکہ تم نے جنگ میں کمزوری دکھائی اور بددل ہو کر ہمت ہار دی، جس کے نتیجے میں تم رسوا ہو گئے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ والے نہ تو فرار ہوتے ہیں اور نہ ہی کمزوری دکھاتے ہیں۔ لہٰذا خوار بھی نہیں ہوتے۔

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

۱۴۷۔ اور ان کی دعا صرف یہ تھی: ہمارے پروردگار! ہمارے گناہوں سے اوران زیادتیوں سے درگزر فرما جو ہم نے اپنے معاملات میں کی ہیں اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنۡيَا وَحُسۡنَ ثَوَابِ الۡاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۱۴۸﴾	۱۴۸۔ چنانچہ اللہ نے انہیں دنیا کا ثواب بھی دیا اور آخرت کا بہتر ثواب بھی عطا کیا اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَا كَانَ قَوۡلَهُمۡ :دیگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھی مجاہدین اپنی عملی قربانی کے ساتھ اپنے گفتار کے ذریعے ایمان وعقیدے کی پختگی کا اظہار اس طرح کرتے تھے: جہاد میں سرخ روئی کے ساتھ نکلنے پر اترانے کی جگہ اپنے گناہوں کے لیے معافی طلب کرتے ہیں۔ ذُنُوۡبَنَا سے گناہان صغیرہ اور اِسۡرَافَنَا سے گناہان کبیرہ مراد ہو سکتے ہیں۔

۲۔ وَثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا: تیرے دشمن کے خلاف جہاد میں ہمیں ثابت قدم رکھ۔ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ثابت قدمی اور نصرت، ایمان اور ایمان اللہ کی طرف سے عنایت ہوتا ہے۔

۴۔ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنۡيَا: ان کی ثابت قدمی اور ایمان کی پختگی کی وجہ سے اللہ نے انہیں دنیا کا ثواب بھی فتح ونصرت کی شکل میں دیا۔

۵۔ وَحُسۡنَ ثَوَابِ الۡاٰخِرَةِ: اور آخرت کا ثواب بہتر طریقے سے دیا۔ یعنی آخرت کا ثواب دنیا کے ثواب سے کہیں بہتر دیا گیا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تُطِيۡعُوا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يَرُدُّوۡكُمۡ عَلٰۤى اَعۡقَابِكُمۡ فَتَنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِيۡنَ ﴿۱۴۹﴾	۱۴۹۔ اے ایمان والو! اگر تم نے کفار کی اطاعت کی تو وہ تمہیں الٹا پھیر دیں گے پھر تم بڑے خسارے میں پڑ جاؤ گے۔
بَلِ اللّٰهُ مَوۡلٰىكُمۡ ۚ وَهُوَ خَيۡرُ النّٰصِرِيۡنَ ﴿۱۵۰﴾	۱۵۰۔ دراصل اللہ ہی تمہارا کارساز ہے اور وہی بہترین مددگار ہے۔

تفسیر آیات

ابوسفیان اور کچھ دیگر منافقوں نے جنگ احد کی شکست کے وقت کہا تھا: ان محمدا قد قتل فارجعوا الی عشائرکم۔ محمد (ص) مارے گئے، پس اپنے قبیلوں کی طرف رجوع کرو۔ جنگ احد کے بعد بھی کفار مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے میں مصروف رہے۔ وہ مسلمانوں کو بدظن کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

قرآن اس قسم کی سازشوں کو بروقت بے نقاب کرتا ہے تا کہ مسلمان کفار کے برے عزائم سے آگاہ رہیں۔

۱۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا: اس خطاب میں بھی ایک تنبیہ ہے کہ اے ایمان والو! اپنے ایمان کے تقاضے پورے کرو۔

۲۔ اِنۡ تُطِیۡعُوا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: کافر سے مراد یا تو منافقین ہیں جو شکست سے دوچار ہونے کے بعد کہ رہے تھے:

ارجعوا الی اخوانکم و ادخلوا فی دینهم۔[۱]　　اپنی برادری کی طرف لوٹ جاؤ اور ان کے دین میں داخل ہو جاؤ۔

بعض کے نزدیک اس سے مراد ابو سفیان اور اس کے ساتھی ہیں۔ تاہم حکم عام ہے۔ ہر دور کے کفار اس میں شامل ہیں۔

۳۔ یَرُدُّوۡکُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِکُمۡ: وہ کافر تم کو اپنے دین کی طرف لوٹا دیں گے۔

وَدُّوۡا لَوۡ تَکۡفُرُوۡنَ کَمَا کَفَرُوۡا فَتَکُوۡنُوۡنَ سَوَآءً ....[۲]　　وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ویسے ہی کافر ہو جاؤ جیسے کافر وہ خود ہیں۔

۴۔ فَتَنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِیۡنَ: اگر تم ایمان کی دولت سے محروم ہو گئے تو تم نہایت خسارے میں ہو گے، دنیا و آخرت دونوں میں۔

۵۔ بَلِ اللّٰهُ مَوۡلٰىکُمۡ: کفار کی اطاعت کی جگہ اللہ کی اطاعت کرو۔ وہی تمہارا کارساز ہے اور نصرت بھی اسی کی طرف سے ہے چونکہ اِنۡ یَّنۡصُرۡکُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَکُمۡ ....[۳] (مسلمانو!) اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو پھر کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا۔

سَنُلۡقِیۡ فِیۡ قُلُوۡبِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوا الرُّعۡبَ بِمَاۤ اَشۡرَکُوۡا بِاللّٰهِ مَا لَمۡ یُنَزِّلۡ بِهٖ سُلۡطٰنًا ۚ وَمَاۡوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَبِئۡسَ مَثۡوَی الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۵۱﴾

۱۵۱۔ ہم عنقریب کفار کے دلوں میں رعب بٹھائیں گے کیونکہ یہ اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں جس کی اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ ظالموں کے لیے برا ٹھکانا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ سَنُلۡقِیۡ: روایت ہے کہ ابو سفیان و دیگر مشرکین احد کی جنگ کے بعد واپس مکہ جاتے ہوئے

---

۱ بحار ۲۰: ۴۸　　۲ نساء۔ ۸۹　　۳ آل عمران۔ ۱۶۰

اس بات پر ندامت کرنے لگے کہ ہم نے شکست خوردہ لشکر کو کیوں چھوڑا، واپس جا کر اس کا خاتمہ کرتے ہیں۔ یہ خبر رسول اللہؐ کو ملی تو لشکر اسلام ان کے تعاقب میں نکلا تو یہ آیت نازل ہوئی جس میں یہ نوید سنائی گئی کہ ہم مشرکین کے دلوں میں رعب بٹھائیں گے۔ اس روایت کی بنا پر سَنُلۡقِیۡ میں سین مستقبل کے لیے ہے۔ بعض نے کہا ہے یہ سین تاکید کے لیے ہے۔

۲۔ بِمَاۤ اَشۡرَکُوۡا: ان کے دلوں میں رعب بیٹھنے کے پیچھے ان کے مشرکانہ عقائد کارفرما ہیں کہ وہ اپنے خود ساختہ توہمات کو حقائق کا مقام دیتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ شرک کا عقیدہ عدم تحفظ کے احساس کا باعث بنتا ہے: بِمَاۤ اَشۡرَکُوۡا۔

۲۔ ایمان باللہ تقویت قلب کا باعث ہے۔

وَ لَقَدۡ صَدَقَکُمُ اللّٰہُ وَعۡدَہٗۤ اِذۡ تَحُسُّوۡنَہُمۡ بِاِذۡنِہٖ ۚ حَتّٰۤی اِذَا فَشِلۡتُمۡ وَ تَنَازَعۡتُمۡ فِی الۡاَمۡرِ وَ عَصَیۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَرٰىکُمۡ مَّا تُحِبُّوۡنَ ؕ مِنۡکُمۡ مَّنۡ یُّرِیۡدُ الدُّنۡیَا وَ مِنۡکُمۡ مَّنۡ یُّرِیۡدُ الۡاٰخِرَۃَ ۚ ثُمَّ صَرَفَکُمۡ عَنۡہُمۡ لِیَبۡتَلِیَکُمۡ ۚ وَ لَقَدۡ عَفَا عَنۡکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۵۲﴾

۱۵۲۔ اور بے شک اللہ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا جب تم اللہ کے حکم سے کفار کو قتل کر رہے تھے یہاں تک کہ تم خود کمزور پڑ گئے اور امر (رسول) میں تم نے باہم اختلاف کیا اور اس کی نافرمانی کی جب کہ اللہ نے تمہاری پسند کی بات (فتح و نصرت) بھی تمہیں دکھا دی تھی، تم میں سے کچھ طالب دنیا تھے اور کچھ آخرت کے خواہاں، پھر اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا تاکہ تمہارا امتحان لے اور اللہ نے تمہارا قصور معاف کر دیا اور اللہ ایمان والوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔

تشریح کلمات

تَحُسُّوۡنَہُمۡ: (ح س س) الحاسّۃ۔ حس کی قوت کو کہتے ہیں اور کسی حاسّہ پر مارنے کو بھی کہتے ہیں جس سے کبھی انسان قتل ہو جاتا ہے۔ اس لیے حَسَسۡتُ بمعنی قَتَلۡتُ آ جاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعۡدَهٗۤ: جنگ احد کی ابتدا میں مسلمان غالب آ گئے تھے اور کفار کو قتل کر رہے تھے۔

۲۔ حَتّٰۤی اِذَا فَشِلۡتُمۡ وَ تَنَازَعۡتُمۡ: مال غنیمت کے لالچ کی وجہ سے تم میں کمزوری آ گئی اور عبد اللہ بن جبیر کے ساتھیوں نے اختلاف کیا اور اپنے کمانڈر کی بات نہ مانی۔

۳۔ وَعَصَیۡتُمۡ: اور تم نے اس وقت رسول (ص) کے حکم کی نافرمانی کی، جب کہ اللہ نے تمہیں فتح و نصرت سے نوازا تھا اور تم اپنی واضح فتح کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ چنانچہ رسول (ص) کی نافرمانی کی وجہ سے تمہیں ہزیمت کا منہ بھی دیکھنا پڑا۔

۴۔ مِنۡکُمۡ مَّنۡ یُّرِیۡدُ الدُّنۡیَا: تم میں کچھ طالب دنیا تھے کہ مال غنیمت کی طمع سے تمہارا یہ راز بھی فاش ہو گیا۔

عبد اللہ مسعود راوی ہے:

> میرا یہ خیال نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے اصحاب میں کوئی طالب دنیا ہو گا، لیکن جب احد کے دن ہمارے بارے میں مِنۡکُمۡ مَّنۡ یُّرِیۡدُ الدُّنۡیَا نازل ہوئی تو معلوم ہوا کہ ہم میں طالب دنیا موجود ہیں۔[۱]

۵۔ ثُمَّ صَرَفَکُمۡ عَنۡهُمۡ: پھر اللہ نے تمہیں کفار کے مقابلے میں پسپا کر دیا۔ اگرچہ یہ پسپائی خود مسلمانوں کی کوتاہیوں کی وجہ سے رونما ہوئی، تاہم اس میں ایک مصلحت ضمناً ظاہر ہو گئی اور وہ تھی مسلمانوں کی آزمائش و امتحان۔

۶۔ لِیَبۡتَلِیَکُمۡ: تاکہ تمہارا امتحان لے۔ چنانچہ اس شکست سے بہت سے لوگوں کے ایمان کی پختگی کا برملا امتحان ہو گیا اور بہت سے لوگ اس میدان میں فاش ہو گئے۔

تفسیر ابن کثیر میں آیا ہے:

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف نو (۹) افراد رہ گئے۔ ان میں سات انصار تھے۔ دو قریش کے تھے۔[۲] انصار کے ساتوں افراد شہید ہو گئے تو رسول اللہ (ص) نے اپنے دو ساتھیوں سے کہا: لا ما انصفنا اصحابنا۔ ہمارے ساتھیوں نے ہمارے ساتھ انصاف نہیں کیا۔[۳]

۱۔ مجمع الزوائد حدیث ۱۰۹۰۴

۲۔ قریش کے ان دو افراد کا نام لینا ان کے لیے گوارا نہ ہوا۔

۳۔ تفسیر ابن کثیر۔ اسی آیت کے ذیل میں

وَلَقَدۡ عَفَا عَنۡکُمۡ : اللہ نے تم سے درگزر کیا۔ ابن جریح کہتے ہیں کہ عفو کے معنی ہیں لم یَسۡتَأۡ صِلۡکُمۡ تم کو جڑ سے نہیں اکھاڑا۔ یعنی اللہ نے تم سے درگزر کیا اور تم کو کافروں کے ہاتھوں تباہ نہیں ہونے دیا۔

اہم نکات

۱۔ نافرمانی کا نتیجہ ناکامی ہے: صَرَفَکُمۡ عَنۡہُمۡ ۔

اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ وَلَا تَلۡوٗنَ عَلٰۤی اَحَدٍ وَّ الرَّسُوۡلُ یَدۡعُوۡکُمۡ فِیۡۤ اُخۡرٰىکُمۡ فَاَثَابَکُمۡ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّکَیۡلَا تَحۡزَنُوۡا عَلٰی مَا فَاتَکُمۡ وَلَا مَاۤ اَصَابَکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵۳﴾

۱۵۳۔ (یاد کرو) جب تم چڑھائی کی طرف بھاگے جا رہے تھے اور کسی کو پلٹ کر نہیں دیکھ رہے تھے، حالانکہ رسول تمہارے پیچھے تمہیں پکار رہے تھے، نتیجے کے طور پر اللہ نے تمہیں غم (رسول) کی پاداش میں غم دیا تاکہ جو چیز تمہارے ہاتھ سے جائے اور جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر تمہیں دکھ نہ ہو اور اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے۔

تشریح کلمات

تُصۡعِدُوۡنَ :(ص ع د) اصعاد چڑھائی کی سمت جانا۔ منہ اٹھا کر دور تک بھاگنا۔

تَلۡوٗنَ : (ل و ی) لا یلوی الی احد۔ وہ کسی کی طرف گردن موڑ کر نہیں دیکھتا۔

غَمَّ: (غ م م) اس کا بنیادی معنی کسی چیز کو چھپانا ہے۔ بادل کو اس لیے غمام کہتے ہیں کہ وہ سورج کی روشنی کو ڈھانپ لیتا ہے۔ حزن و کرب کو اس لیے غم کہا جاتا ہے کہ وہ خوشی کو چھپا لیتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ : جب تم چڑھائی کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ شکست کی نہایت واضح تصویر کشی ہے، جس میں کسی قسم کی تاویل و توجیہ کی گنجائش نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت اس واقعے کو قرآن مجید میں واضح الفاظ میں ثبت کر کے اسے ابدی بنا رہا ہے۔ فی ظلال القرآن میں اس آیت کے ذیل میں

شکست کی واضح تصویر کشی کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے:

تا کہ اس واقعے کا اثر ان کے حواس میں راسخ ہو جائے اور راہ فرار اختیار کرنے اور جن اسباب و علل کی وجہ سے کمزوری، نزاع اور نافرمانی وجود میں آئی، ان پر انہیں شرم دلائے۔ اس آیت میں مختصر الفاظ میں ان کے ظاہری اور نفسیاتی عمل کی تصویر کشی ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ پہاڑ کی طرف چڑھتے وقت اضطراب، رعب اور دہشت کی حالت میں بھاگ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کی طرف پلٹ کر دیکھتے بھی نہ تھے اور کسی پکارنے والے کی بات سن بھی نہیں رہے تھے، حالانکہ خود رسول اکرم (ص) انہیں پکار رہے تھے اور اطمینان دلا رہے تھے کہ میں زندہ ہوں۔

۲۔ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰۤی اَحَدٍ: اللّی کا معنی مہربانی اور رحم سے کیا گیا ہے۔ یعنی تم اس طرح بھاگ رہے تھے کہ تم کسی پر رحم نہیں کر رہے تھے۔ یہ بھاگنے میں تیزی کو بتانے کے لیے ایک محاورہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے بھاگنے کے راستے میں آ جائے تو وہ اسے بھی روند ڈالے۔ یہ معنی التحریر و التنویر میں کیے گئے ہیں۔

۳۔ وَّالرَّسُوۡلُ یَدۡعُوۡکُمۡ فِیۡۤ اُخۡرٰىکُمۡ: حالانکہ رسول (ص) تمہارے پیچھے تمہیں پکار رہے تھے۔ اس واقعے کا سب سے زیادہ المناک پہلو یہ ہے کہ بھاگنے والوں نے رسول (ص) کی آواز پر لبیک کہنے کی بجائے اسے نظر انداز کر دیا جو ان الفاظ میں انہیں بلا رہے تھے:

اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ اَنَا رَسُوۡلُ اللّٰہِ مَنۡ یَکِرُّ فَلَہٗ الجَنَّۃُ۔ [1]	اللہ کے بندو! میری طرف آؤ، اللہ کے بندو میری طرف آؤ، میں رسول اللہ (ص) ہوں، جو واپس آئے گا اس کے لیے جنت ہے۔

رسول اللہ (ص) کی اس ملکوتی آواز کو سننے کے باوجود فرار جاری رہا۔ اگر وہ رسول (ص) کی آواز نہ سنتے یا آواز نہ پہچانتے تو اس صورت میں یَدۡعُوۡکُمۡ کہنا درست نہیں تھا۔ چنانچہ تفسیر المنار میں اس جملے کے ذیل میں لکھا ہے:

و انتم لا تسمعون و لا تنظرون و کان یجب ان یکون لکم اسوۃ حسنۃ فی الرسول فتقتدوا بہ فی صبرہ و ثباتہ و لکن اکثرکم لم یفعل۔ [2]	اور تم نے نہ ان کی آواز سنی اور نہ پلٹ کر دیکھا۔ جب کہ تمہارا فرض تو یہ تھا کہ تم رسول (ص) کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے اور ان کے صبر و استقامت کی پیروی کرتے، لیکن تم میں سے اکثر نے ایسا نہ کیا۔

۱۔ تفسیر المنار ۴: ۱۸۴　　۲۔ تفسیر المنار ۴: ۱۸۴

۴۔ فَاَثَابَكُمۡ غَمًّۢا بِغَمٍّ : نافرمانی اور عصیان کے ذریعے رسول خدا (ص) کو دکھ دینے کے بدلے میں اللہ نے تمہیں شکست کی خفت سے دوچار کر کے غم و اندوہ میں مبتلا کر دیا۔

۵۔ لِّكَيۡلَا تَحۡزَنُوۡا عَلٰى مَا فَاتَكُمۡ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمۡ : تا کہ مال غنیمت سے محروم رہنے کا دکھ اور جانی نقصانات کا تحمل تمہارے لیے آسان ہو جائے اور صرف رسول اللہ (ص) کی مخالف کا غم باقی رہے چونکہ یہ ناقابل تلافی ہے۔

۶۔ وَاللّٰهُ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ : اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔ عذر مت تراشو اور اپنے آپ کو فریب مت دو۔ جو خدا تمہارے اعمال سے باخبر اور تم پر احاطہ رکھتا ہے، اس سے کوئی شے پوشیدہ نہیں ہے۔ تمہارے عذر اور توجیہات نہیں، بلکہ اس کا علم و خبر بنیاد ہے۔[1]

اہم نکات

۱۔ قیادت پر عدم ایمان اور نافرمانی قوم کو شکست سے دوچار کرتی ہے۔

ثُمَّ اَنۡزَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ الۡغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغۡشٰى طَآئِفَةً مِّنۡكُمۡ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدۡ اَهَمَّتۡهُمۡ اَنۡفُسُهُمۡ يَظُنُّوۡنَ بِاللّٰهِ غَيۡرَ الۡحَقِّ ظَنَّ الۡجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوۡلُوۡنَ هَلۡ لَّنَا مِنَ الۡاَمۡرِ مِنۡ شَىۡءٍ ؕ قُلۡ اِنَّ الۡاَمۡرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخۡفُوۡنَ فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ مَّا لَا يُبۡدُوۡنَ لَكَ ؕ يَقُوۡلُوۡنَ لَوۡ كَانَ لَنَا مِنَ الۡاَمۡرِ شَىۡءٌ مَّا قُتِلۡنَا هٰهُنَا ؕ قُلۡ لَّوۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ بُيُوۡتِكُمۡ لَبَرَزَ الَّذِيۡنَ كُتِبَ عَلَيۡهِمُ الۡقَتۡلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمۡ ۚ وَلِيَبۡتَلِىَ اللّٰهُ

۱۵۴۔ پھر جب اس غم کے بعد تم پر امن و سکون نازل فرمایا تو تم میں سے ایک گروہ تو اونگھنے لگا، جب کہ دوسرے گروہ کو اپنی جانوں کی پڑی ہوئی تھی، وہ ناحق اللہ پر زمانہ جاہلیت والی بدگمانیاں کر رہے تھے، کہ رہے تھے: کیا اس امر میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے؟ کہد یجیے: سارا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے، یہ لوگ جو بات اپنے اندر چھپائے رکھتے ہیں اسے آپ پر ظاہر نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں: اگر (قیادت میں) ہمارا کچھ دخل ہوتا تو ہم یہاں مارے نہ جاتے، کہد یجیے: اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو بھی جن کے مقدر میں قتل ہونا لکھا ہے وہ خود اپنے مقتل کی طرف نکل پڑتے اور یہ (جو کچھ ہوا وہ اس لیے تھا) کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اللہ اسے

---
[1] تفسیر المنار ۴ : ۱۸۵

مَا فِیۡ صُدُوۡرِکُمۡ وَ لِیُمَحِّصَ مَا فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۱۵۴﴾

آزمائے اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے چھانٹ کر واضح کر دے اور اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔

تشریح کلمات

اَمَنَۃً: (ا م ن) امن۔

نُعَاس: (ن ع س) اونگھ، ہلکی نیند۔

مَضَاجِعُ: (ض ج ع) قتل کی جگہ مراد ہے۔

تفسیر آیات

معرکہ جنگ کے بعد لوگوں کی تقسیم بندی: ۱۔ اَنۡزَلَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ الۡغَمِّ اَمَنَۃً: لشکر اسلام کے کچھ سپاہی حضور (ص) کی خدمت میں واپس آ گئے۔ وہ اپنے کیے پر اظہار ندامت کر رہے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ اس وقت واپس آئے جب مشرکین منتشر ہو چکے تھے اور حضور (ص) غار میں آ گئے تھے اور واپس آنے والوں کو یہ علم ہو گیا تھا کہ حضور (ص) زندہ ہیں۔ تاہم اللہ نے انہیں معاف کر دیا اور ان کی توبہ قبول کر لی اور انہیں اطمینان قلب سے نوازا: مِّنۡۢ بَعۡدِ الۡغَمِّ ....

۲۔ وَ طَآئِفَۃٌ قَدۡ اَہَمَّتۡہُمۡ: دوسرے وہ لوگ تھے جنہیں اپنی جانوں کی پڑی ہوئی تھی۔ یعنی اپنی جان بچانے کے علاوہ کوئی اور فکر ان کے ذہنوں پر سوار نہ تھی۔ وہ دین و مذہب کی فکر میں نہ تھے۔ دین کو وہ صرف اس صورت میں چاہتے تھے جب یہ دین ان کے مفادات کو تحفظ دے، فتح و نصرت ہو، غنیمت کے اموال ہاتھ آئیں وغیرہ۔

۳۔ یَظُنُّوۡنَ بِاللّٰہِ غَیۡرَ الۡحَقِّ: چنانچہ ان کی یہ توقعات پوری نہ ہوئیں تو ان کے ایمان میں اس شکست کے باعث تزلزل آیا۔ طرح طرح کے خیالات ان کے اذہان میں آ رہے تھے کہ اگر یہ دین حق ہوتا تو شکست سے دوچار نہ ہوتا اور ہمارے لوگ اس جنگ میں کثرت سے مارے نہ جاتے۔

۴۔ ظَنَّ الۡجَاہِلِیَّۃِ: جاہلانہ خیالات پر مبنی یہ کافرانہ خیالات اس وجہ سے دلوں میں پیدا ہو رہے تھے کہ وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ دین حق، ظاہری شکست نہیں کھا سکتا اور علل و اسباب اور حالات کچھ بھی ہوں، حق کی فتح ضروری ہے، جب کہ فتح و نصرت کی نوید سنائی جا چکی تھی۔ اب چونکہ فتح نصیب نہیں ہوئی، لہٰذا اس دین کا مبنی برحق ہونا محل شک قرار پا گیا۔ آیت میں انہی کافرانہ خیالات کو "ظن جاہلیت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۵۔ جن خیالات کا وہ اظہار کرتے تھے، وہ سوالیہ انداز میں تھے: هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ کیا اس امر میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے؟ کیا فتح و نصرت ہمارا مذہبی حق نہیں ہے؟ جس کے جواب میں فرمایا: قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ۔ ''کہد یجیے: سارا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔'' یعنی اس کے وضع کردہ نظام علل و اسباب کے تحت ہی فتح یا شکست ہوتی ہے۔

۶۔ جن خیالات کا وہ اظہار نہیں کرتے تھے: یُخْفُوْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ یعنی اپنے دلوں میں چھپائے رکھتے تھے، وہ یہ تھے: لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا۔ ''اگر اس امر میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہوتا تو ہم یہاں مارے نہ جاتے۔'' یعنی ہمارے ساتھ کیا ہوا وعدۂ فتح درست ہوتا تو ہم یہاں مارے نہ جاتے۔ یہ اسی قسم کی کافرانہ بات تھی جیسے جنگ احزاب میں کہا گیا: مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا۔۔[۱] اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھا۔

تفسیر التحریر میں آیا ہے کہ یہ لَوْ كَانَ لَنَا کا یہ جملہ معتب بن قیشر نے کہا تھا۔ زبیر بن عوام کہتے ہیں مجھے اونگھ آ رہی تھی۔ اس وقت معتب کو یہ بات کہتے سنا۔ قرآن نے اس کو سب کی طرف اسی لیے نسبت دی کہ سب اسی بات پر راضی تھے۔ یہ بات پہلے سے زیادہ بدتر ہے، کیونکہ اس جملے میں دین کے برحق نہ ہونے پر استدلال کیا گیا ہے۔

۷۔ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِكُمْ: اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا: تمہارا قتل ہو جانا دین کے حق پر نہ ہونے کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس قتل کے اپنے محرک اور علل و اسباب ہیں۔

ان علل و اسباب کے تحت فتح و شکست ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم حربی اصولوں کی خلاف ورزی اور جنگ سے فرار کرو اور اس کے نتیجے میں فتح و نصرت تمہیں نصیب ہو۔ لہٰذا نافرمانی اور بزدلی دکھانے والوں کا مقدر قتل ہے، خواہ وہ اپنے گھروں میں بیٹھے ہوں۔

۸۔ وَلِیَبْتَلِیَ: اس شکست پر مترتب ہونے والا دیگر نتیجہ یہ ہے کہ اس سے تمہارے دلوں کے حال ظاہر اور تمہارے ضمیر فاش ہو گئے۔

۹۔ وَلِیُمَحِّصَ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ: اس شکست کی وجہ سے تمہارے دلوں میں موجود ساری باتیں چھن کر باہر آ گئیں۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ ان آیات میں ان مسلمانوں کا ذکر ہے، جن کے ایمان میں تزلزل آیا اور شکست کی وجہ سے ایمان کے بعد وہ شک میں مبتلا ہوئے۔ یہ منافقین کا ذکر نہیں ہے۔ کیونکہ منافقین تو عبد اللہ بن ابی کی سربراہی میں راستے سے واپس چلے گئے تھے اور جنگ میں شریک نہیں تھے۔ چنانچہ صاحب تفسیر المنار لکھتے ہیں:

---

[۱] ۳۳ الاحزاب: ۱۲

فهذه الطائفة من المومنين الضعفاء و لا حاجة الى جعلها فى المنافقين۔

یہ آیت ضعیف الایمان مسلمانوں کے ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اسے منافقین سے منسلک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

چنانچہ قرآن ضعیف الایمان لوگوں کا منافقین کے ساتھ ذکر فرماتا ہے:

اِذۡ یَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ غَرَّ ہٰۤؤُلَآءِ دِیۡنُہُمۡ ..[1]

جب منافقین اور جن کے دلوں میں بیماری تھی کہہ رہے تھے: انہیں تو ان کے دین نے دھوکہ دے رکھا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ضعیف الایمان لوگ ظاہری شکست کی بنا پر دین میں شک کرتے ہیں اور ظاہری فتح کو دین کی حقانیت کی دلیل سمجھتے ہیں۔

۲۔ مشکل وقت میں جوہر کھلتا ہے یا ضمیر فاش ہو جاتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَلَّوۡا مِنۡکُمۡ یَوۡمَ الۡتَقَی الۡجَمۡعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسۡتَزَلَّہُمُ الشَّیۡطٰنُ بِبَعۡضِ مَا کَسَبُوۡا ۚ وَلَقَدۡ عَفَا اللّٰہُ عَنۡہُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ حَلِیۡمٌ ﴿۱۵۵﴾

۱۵۵۔ دونوں فریقوں کے مقابلے کے روز تم میں سے جو لوگ پیٹھ پھیر گئے تھے بلاشبہ ان کی اپنی بعض کرتوتوں کی وجہ سے شیطان نے انہیں پھسلا دیا تھا، تاہم اللہ نے انہیں معاف کر دیا، یقیناً اللہ بڑا درگزر کرنے والا، بردبار ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَلَّوۡا: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ سے فرار کا ارتکاب کسی سابقہ گناہ کا ایک طبعی اور لازمی نتیجہ تھا، جس کی وجہ سے شیطان کو لغزش پیدا کرنے کا موقع ملا: اِنَّمَا اسۡتَزَلَّہُمُ الشَّیۡطٰنُ بِبَعۡضِ مَا کَسَبُوۡا .... جنگ سے فرار کے گناہ عظیم کا ارتکاب اس لیے کیا کہ شیطان کو ان فراریوں کے بعض سابقہ گناہوں سے اس گناہ کی طرف لے جانے کا راستہ مل گیا تھا۔ مثلاً خواہشات پرستی ایک ایسا گناہ ہے جو بہت سے گناہوں کا سرچشمہ ہے اور اسی وجہ سے وہ لوگ ذلت و خواری میں مبتلا ہوئے۔

----

[1] انفال: ۴۹

۲۔ وَلَقَدۡ عَفَا اللّٰہُ عَنۡہُمۡ : معاف اور درگزر کا تذکرہ دو مقامات پر آیا ہے۔پہلی دفعہ شفقت بھرے لہجے میں فرمایا:

وَلَقَدۡ عَفَا عَنۡکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۵۲﴾ ۱؎ — اور اللہ نے تمہارا قصور معاف کر دیا اور اللہ مومنین پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔

دوسری دفعہ اس آیت میں غائب کا صیغہ استعمال فرمایا اور لہجہ بھی پہلے سے مختلف ہے۔اس سے علامہ طباطبائی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سابقہ عفو ان لوگوں کے بارے میں ہے جن پر امن وسکون نازل کیا گیا اور موجودہ عفو ایسے افراد سے متعلق ہے جنہیں اپنی جانوں کی پڑی ہوئی تھی اور اللہ کے ساتھ جاہلیت والی کافرانہ بدگمانی کر رہے تھے۔ان سے عفو کا مطلب یہ ہے کہ ان پر عذاب نازل کرنے میں عجلت سے کام نہیں لیا گیا۔اس کے ساتھ اللہ کے غَفُوۡرٌ حَلِیۡمٌ ہونے کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے گناہوں سے چشم پوشی کی گئی ہے، جب کہ ناراضگی برقرار ہے۔ ۲؎

اہم نکات

۱۔ بھاگنے والوں کے سابقہ گناہوں کا اثر تھا کہ شیطان انہیں فرار پر اکسانے میں کامیاب ہوا۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ قَالُوۡا لِاِخۡوَانِہِمۡ اِذَا ضَرَبُوۡا فِی الۡاَرۡضِ اَوۡ کَانُوۡا غُزًّی لَّوۡ کَانُوۡا عِنۡدَنَا مَا مَاتُوۡا وَ مَا قُتِلُوۡا ۚ لِیَجۡعَلَ اللّٰہُ ذٰلِکَ حَسۡرَۃً فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ ؕ وَ اللّٰہُ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۱۵۶﴾

۱۵۶۔ اے ایمان والو! کافروں کی طرح نہ ہونا جو اپنے عزیز و اقارب سے، جب وہ سفر یا جنگ پر جاتے ہیں تو کہتے ہیں: اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے، اللہ ایسی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت پیدا کرنے کے لیے سبب بنا دیتا ہے، ورنہ حقیقتاً مارنے اور جلانے والا تو اللہ ہی ہے اور ساتھ تمہارے اعمال کا خوب مشاہدہ کرنے والا بھی اللہ ہی ہے۔

۱؎ ۳ آل عمران: ۱۵۲

۲؎ جنگ سے بھاگنے والوں کے بارے میں معلومات کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر طبری ۴: ۹۶۔ درمنثور ۲: ۷۷ و ۸۹ اور تفسیر فخر الدین رازی ۹: ۵۰

تفسیر آیات

۱۔ لَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا: اہل ایمان کے لیےاس بات کی ممانعت ہو رہی ہے کہ کفار جیسا عقیدہ نہ رکھو۔ آگے کافرانہ عقیدے کا ذکر۔

۲۔ وَ قَالُوۡا لِاِخۡوَانِهِمۡ: وہ اپنی مذہبی برادری، اپنے ہم مذہب اور ہم مسلک لوگوں سے کہتے ہیں۔ جب وہ تجارت وغیرہ کے لیے سفر یا جنگ پر نکلتے ہیں تو وہ اس جنگ اور سفر کو مستقل سبب گردانتے ہوئے کہتے ہیں:

۳۔ لَّوۡ كَانُوۡا عِنۡدَنَا مَا مَاتُوۡا وَمَا قُتِلُوۡا: اگر وہ سفر پر نہ نکلتے اور جنگ نہ کرتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے۔ اہل ایمان سے فرمایا: تم بھی کافروں کی طرح سفر اور جنگ کو مستقل سبب نہ سمجھو۔ یہ عقیدہ ایمان بخدا کے منافی ہے۔

۵۔ لِيَجۡعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسۡرَةً فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ: کافر چونکہ سفر اور جنگ کو موت اور قتل کا مستقل سبب سمجھتے ہیں، اس لیے ان کے دل میں یہ حسرت رہ جاتی ہے کہ سفر پر نہ نکلتا اور جنگ میں شریک نہ ہوتا تو مارا نہ جاتا۔ ایمان والوں کے لیے ایسی حسرت کی گنجائش نہیں ہے۔

۶۔ وَاللّٰهُ يُحۡىٖ وَيُمِيۡتُ: ایمان والوں کا تو ایمان اسی سے عبارت ہے کہ موت و حیات اللہ کے ہاتھ میں ہے، سفر اور جنگ موت و حیات کے لیے مستقل سبب نہیں ہے۔

واضح رہے جنگ احد میں منافقین کی کوئی شرکت نہ تھی۔ عبد اللہ بن ابی اپنے تین سو افراد کے ساتھ جنگ سے پیچھے ہٹ گیا تھا، لہٰذا یہ آیت منافقین سے مربوط نہیں ہے۔ ثانیاً اس آیت میں خطاب يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا کہہ کر اہل ایمان سے ہے، لہٰذا یہ ماننے کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ یہ آیت کمزور ایمان والے مسلمانوں کے بارے میں ہے۔

وَلَئِنۡ قُتِلۡتُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَوۡ مُتُّمۡ لَمَغۡفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحۡمَةٌ خَيۡرٌ مِّمَّا يَجۡمَعُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾

۱۵۷۔ اور اگر تم راہ خدا میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی طرف سے جو بخشش اور رحمت تمہیں نصیب ہو گی وہ ان سب سے بہت بہتر ہے جو وہ لوگ جمع کرتے ہیں۔

وَلَئِنۡ مُّتُّمۡ اَوۡ قُتِلۡتُمۡ لَاِلَى اللّٰهِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۱۵۸﴾

۱۵۸۔ اور اگر تم مر جاؤ یا مارے جاؤ آخرکار اللہ کی بارگاہ میں اکٹھے کیے جاؤ گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَئِنۡ قُتِلۡتُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَوۡ مُتُّمۡ : راہ خدا میں زندگی قتل کے ذریعے ختم ہو جائے یا طبیعی موت ہو، دونوں صورتوں میں مغفرت اور رحمت ہے۔ راہ خدا میں موت کا مقصد یہ ہوسکتا ہے کہ اپنی زندگی برائے خدا گزارے۔

۲۔ وَلَئِنۡ مُّتُّمۡ اَوۡ قُتِلۡتُمۡ : موت اور قتل، دونوں صورتوں میں اللہ کی بارگاہ میں جانا ہے۔ لٰہذا مہربان رب کے پاس جانا ہے تو رب کی مرضی لے کر جانا ہوگا۔

کافرانہ سوچ کے مقابلے میں مومنانہ سوچ بیان ہو رہی ہے کہ راہ خدا میں مارا جانا نہ صرف داغ حسرت نہیں، بلکہ کفار کے دنیاوی مال و متاع سے کہیں بہتر ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی راہ میں مرنا صاحبان ایمان کے لیے باعث حسرت نہیں بلکہ رحمت و مغفرت کا سبب ہے۔

۲۔ راہ خدا میں مرنا دنیاوی مال و متاع سے کہیں بہتر ہے: خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ۔

فَبِمَا رَحۡمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ لِنۡتَ لَہُمۡ ۚ وَلَوۡ کُنۡتَ فَظًّا غَلِیۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِکَ ۪ فَاعۡفُ عَنۡہُمۡ وَاسۡتَغۡفِرۡ لَہُمۡ وَشَاوِرۡہُمۡ فِی الۡاَمۡرِ ۚ فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُتَوَکِّلِیۡنَ ﴿۱۵۹﴾

۱۵۹۔ (اے رسول) یہ مہر الٰہی ہے کہ آپ ان کے لیے نرم مزاج واقع ہوئے اور اگر آپ تندخو اور سنگدل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے، پس ان سے درگزر کریں اور ان کے لیے مغفرت طلب کریں اور معاملات میں ان سے مشورہ کر لیا کریں پھر جب آپ عزم کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کریں، بیشک اللہ بھروسا کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

تشریح کلمات

فَظًّا: (ف ظ ظ) بدمزاج۔

غَلِیۡظ : (غ ل ظ) موٹا اور گاڑھا، جو اجسام کا وصف ہوتا ہے لیکن بطور استعارہ معافی اور سخت مزاجی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

اَنۡفَضُّوۡا: (ف ض ض) الفض۔ کسی چیز کو توڑنا اور ریزہ ریزہ کرنا۔ بطور استعارہ متفرق اور منتشر ہونے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

شَاوِرۡ : (ش و ر) شرت العسل۔ چھتے سے تازہ شہد نکالنا۔ اسی مناسبت سے ذہنی چھتے سے رائے اخذ کرنے کو مشورہ کہا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَبِمَا رَحۡمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ لِنۡتَ لَہُمۡ : اس جنگ میں سب سے زیادہ صدمہ رسول اللہ (ص) کو پہنچا۔ دشمن سے جنگ کے بارے میں مدینے میں اختلاف شروع ہوا۔ ایک تہائی لشکر راستے سے واپس چلا گیا۔ ایک گروہ نے غنیمت کے لالچ میں رسول (ص) کی نافرمانی کی۔ حضرت حمزہؓ و دیگر شہداء کی قربانی دینا پڑی۔ حضور (ص) کے دندان مبارک شہید ہوئے۔ چند افراد کے علاوہ باقی مسلمان آپ (ص) کو میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ انہوں نے آپؐ کی آواز پر بھی لبیک نہیں کہا اور پلٹ کر دیکھا تک نہیں۔ آپ (ص) کے قتل کی خبر سن کر دین سے برگشتہ ہوگئے اور آبائی دین اختیار کرنے کی باتیں کرنے لگے، وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام باتوں کے باوجود حضور (ص) کا رویہ نرم رہا اور آپ (ص) نے خدائی اخلاق کا مظاہرہ فرمایا۔ رحمت الٰہی کا مظاہرہ ہوا اور تمام گستاخیوں کے باوجود نہ کسی کو راندۂ درگاہ کیا، نہ کسی کی ایسی سرزنش کی کہ وہ آپ (ص) سے متنفر ہو جائے۔

۲۔ وَلَوۡ کُنۡتَ فَظًّا غَلِیۡظَ الۡقَلۡبِ : اگر اپنے ساتھیوں کی ان ناشائستہ حربی جرائم پر سرزنش کرتے، اپنے حسن خلق کا مظاہرہ نہ کرتے تو وہ آپؐ کو چھوڑ جاتے۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حربی جرائم سے درگزر فرماتے تھے جو دنیا میں قابل معافی نہیں ہوتے تو دوسری لغزشوں بلکہ سازشوں سے درگزر فرمانا تعجب کی بات نہیں ہے۔ چنانچہ جنگ تبوک سے واپسی کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنے کی سازش کو فاش نہیں فرمایا۔

۳۔ خلق عظیم کے اس مظاہرے کے باوجود مزید حکم ہو رہا ہے: فَاعۡفُ عَنۡہُمۡ یعنی ان سے درگزر کریں اور ان کی لغزشوں پر کوئی اثر مترتب نہ کریں۔ ان کے اس عظیم گناہ کے لیے دعائے مغفرت کریں۔

۴۔ وَشَاوِرۡہُمۡ فِی الۡاَمۡرِ : معاملات میں بدستور ان سے مشاورت کریں اور سابقہ روش میں تبدیلی نہ لائیں جیسا کہ احد کی جنگ سے پہلے آپ (ص) نے لوگوں سے مشورہ فرمایا تھا۔

ولایت و مشاورت: رسول اللہ (ص) بحیثیت رسول احکام شرع میں کسی سے مشورہ نہیں فرماتے

بلکہ احکام شرع تابع وحی ہوتے ہیں۔

لیکن بحیثیت حاکم اور ولی الامر، تدبیر امور اور مقام نفاذ و اجرا، انتظامی اور عملی میدانوں میں رسول اللہ (ص) کو مشورہ کی سنت قائم کرنے کا حکم ہے۔ قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ یہ حکم اسلامی قیادت کو مل رہا ہے کہ اپنے امور مملکت کے نفاذ کی کیا صورت ہونی چاہیے۔ اس پر باہمی مشورہ کرو۔ اس باہمی مشورے میں خود مسئلہ ''قیادت'' شامل نہیں، نہ خود ''امر'' شامل ہے بلکہ قیادت اور امر کا تعین اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔

۵۔ فَاِذَا عَزَمۡتَ : مشورے کے بعد فیصلہ، عزم اور نفاذ، اسلامی قیادت کو کرنا ہے۔

اہم نکات

۱۔ سخت مزاجی لوگوں کو داعیان حق سے دور کر دیتی ہے اور نرم مزاجی انہیں نزدیک رکھتی ہے۔

۲۔ توکل، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے کا نام نہیں بلکہ مستحکم ارادے اور جہد مسلسل کے ساتھ نتائج کو اللہ پر چھوڑ نا توکل کہلاتا ہے: فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَکَّلۡ ....

۳۔ مشورے کی صورت میں بھی فیصلہ اسلامی قیادت کو ہی کرنا ہے: فَاِذَا عَزَمۡتَ ....

اِنۡ یَّنۡصُرۡکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمۡ ۚ وَ اِنۡ یَّخۡذُلۡکُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَنۡصُرُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِہٖ ؕ وَ عَلَی اللّٰہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۶۰﴾

۱۶۰۔ (مسلمانو!) اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو پھر کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا اور اللہ تمہارا ساتھ چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کو پہنچے، لہٰذا ایمان والوں کو چاہیے کہ وہ صرف اللہ پر بھروسا کریں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنۡ یَّنۡصُرۡکُمُ اللّٰہُ : سابقہ آیات میں بتایا گیا کہ کن حالات میں اللہ کی نصرت شامل حال ہو سکتی ہے۔ اللہ کے عطا کردہ دستور پر عمل کرنے کی صورت میں ہی اس کی نصرت کے اہل اور مستحق قرار پا سکتے ہیں۔ یعنی اس کے وضع کردہ نظام وسنن اور طبیعیاتی وتکوینی قوانین کی دفعات پر عمل، پھر طاقت کے اصل سرچشمے اللہ کی ذات پر بھروسا کرنے کی صورت میں نصرت الٰہی مومنین کے شامل حال ہوسکتی ہے۔

ایسا ممکن نہیں ہے کہ ادھر رسول (ص) کی نافرمانی کریں اور جنگ سے فرار ہوں، ادھر فتح و نصرت ان کے قدم چومے۔

۲۔ فَلَا غَالِبَ لَکُمۡ : اگر تم اللہ کی نصرت کے لیے اہل ٹھہرو تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔ بھلا

اللہ کی نصرت کے مقابلے میں کون سی طاقت غالب آ سکتی ہے۔

۳۔ وَاِنۡ یَّخۡذُلۡکُمۡ: اور اگر اللہ تمہاری نصرت نہ کرے۔ یعنی اگر تم اللہ کی نصرت کے لیے اہل نہ بنو۔ واضح رہے اللہ نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کر دیا ہے: کَتَبَ رَبُّکُمۡ عَلٰی نَفۡسِہِ الرَّحۡمَۃَ ...[۱] لیکن اگر کوئی رحمت الٰہی کے لیے اہل نہیں ہے تو رحمت الٰہی اس کو شامل نہ ہو گی۔

۴۔ فَمَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَنۡصُرُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِہٖ: سوال ہے کہ پھر اللہ کے بعد تمہیں کہاں سے نصرت میسر آئے گی؟ ظاہر ہے نصرت کا کوئی اور منبع نہیں ہے۔

وَ مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنۡ یَّغُلَّ ؕ وَ مَنۡ یَّغۡلُلۡ یَاۡتِ بِمَا غَلَّ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفۡسٍ مَّا کَسَبَتۡ وَ ہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۱۶۱﴾

۱۶۱۔ اور کسی نبی سے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ خیانت کرے اور جو کوئی خیانت کرتا ہے وہ قیامت کے دن اپنی خیانت کی ہوئی چیز کو (اللہ کے سامنے) حاضر کرے گا، پھر ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

تشریح کلمات

غَلَّ: (غ ل ل) خیانت کرنا۔ کسی چیز کے درمیان گھسنا۔ اسی لیے درختوں کے درمیان چلنے والے پانی کو غلل کہتے ہیں۔ طوق کو بھی غل کہا جاتا ہے کیونکہ اس سے کسی کے اعضاء کو جکڑ کر وسط میں باندھ دیا جاتا ہے۔ غل کی جمع اغلال ہے۔ الغلول۔ خیانت۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنۡ یَّغُلَّ: روایت میں آیا ہے کہ جنگ بدر کے بعد جب غنیمت کا مال تقسیم ہو رہا تھا تو ایک سرخ جبہ غائب ہو گیا۔ اس پر کسی نے کہا: رسول اللہ (ص) نے ہی اسے لیا ہو گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اتنے میں ایک شخص رسول اللہ (ص) کی خدمت میں آیا اور کہا: فلاں شخص نے سرخ جبہ زمین میں دبایا ہے۔ رسول اللہ (ص) نے اس جگہ کو کھودنے کا حکم دیا تو جبہ نکل آیا۔[۲]

بعض دیگر روایات کے مطابق یہ آیت احد کی جنگ میں ان تیر اندازوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہیں رسول اللہ (ص) نے عقب لشکر کی حفاظت کے لیے درے پر بٹھایا تھا اور انہوں نے اس بدگمانی اور عدم اطمینان کی بنا پر کہ کہیں بعد میں ان کے ساتھ خیانت ہو اور غنیمت میں برابر کا حصہ نہ ملے، رسول اللہ (ص) کی

۱؎ ۶ انعام: ۵۴ ۲؎ شرح نہج البلاغۃ ۱۴: ۱۶۷

نافرمانی کی اور جگہ چھوڑ دی۔ آیت میں ان لوگوں کی سرزنش کی جا رہی ہے کہ کسی نبی سے اس قسم کی خیانت سرزد نہیں ہو سکتی۔

۲۔ وَ مَنۡ یَّغۡلُلۡ: جو خیانت کرے گا، اسے قیامت کے دن اس چیز کو پیش کرنا پڑے گا جس کی خیانت کی ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

فان الغلول عار و نار شنار علی اهله یوم القیامة.[1] خیانت قیامت کے دن عار و ننگ اور بڑا عیب شمار ہو گی۔

۳۔ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفۡسٍ مَّا کَسَبَتۡ: ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے۔ وَ ہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ان کے ساتھ ظلم نہ ہو گا۔ ان کے عمل سے کم ثواب نہیں دیا جائے اور ان کے گناہ سے زیادہ عذاب بھی نہیں دیا جائے گا۔

شیخ طوسی فرماتے ہیں:

> آیت کا یہ حصہ " ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور اس پر ظلم نہیں کیا جائے گا"، اس نظریۂ جبر کو باطل ثابت کرتا ہے جس کے مطابق اگر اللہ تعالیٰ انبیاء اور مومنین کو عذاب دے تو یہ ظلم نہیں ہو گا۔

وَ وَجَدُوۡا مَا عَمِلُوۡا حَاضِرًا ؕ وَ لَا یَظۡلِمُ رَبُّکَ اَحَدًا ﴿﴾[2] اور جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ ان سب کو حاضر پائیں گے اور آپ کا رب تو کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

یعنی ہر شخص کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ نہ دینا ظلم ہے اور ظلم اللہ سے صادر نہیں ہو گا۔

اہم نکات

۱۔ خیانت کار آخرت کے مؤاخذے سے بچ نہیں سکے گا: یَاۡتِ بِمَا غَلَّ ۔

۲۔ کسی شخص کے عمل کے مطابق جزا نہ دینے کو ظلم کہا گیا ہے۔ جس سے عقیدۂ جبر کی تردید ہوتی ہے۔

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَ اللّٰہِ کَمَنۡۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ مَاۡوٰىہُ جَہَنَّمُ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۱۶۲﴾

۱۶۲۔ کیا جو شخص اللہ کی خوشنودی کا تابع ہو، وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو اللہ کے غضب میں گرفتار ہو اور جس کا ٹھکانا جہنم ہو؟ اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔

ہُمۡ دَرَجٰتٌ عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ وَ اللّٰہُ بَصِیۡرٌۢ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۶۳﴾

۱۶۳۔ اللہ کے نزدیک ان کے لیے (مختلف) درجات ہیں اور اللہ ان کے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے۔

---

[1] مجمع البیان۔ بحار الانوار ۲۱: ۱۷۴ باب ۲۸ غزوۃ حنین ....

[2] ۱۸ کہف: ۴۹

تفسیر آیات

۱۔ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَ اللّٰهِ: گفتگو جنگ احد کے بارے میں ہو رہی ہے کہ اس جنگ میں شرکت کر کے جان نثاری کرنے والے، ان لوگوں کی طرح تو نہیں ہو سکتے، جنہوں نے جنگ میں شرکت نہ کر کے غضب الٰہی کو دعوت دی ہے۔

هُمۡ دَرَجٰتٌ: یعنی هم ذووا درجات۔ دونوں کے درجات ہوں گے۔ یعنی دونوں کے طبقات ہوں گے۔ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے والے بلند درجات میں اور غضب الٰہی کے سزاوار پست درجات میں ہوں گے۔ یعنی پست طبقے میں ہوں گے۔ اس پستی کے طبقات کو تغلیباً درجات کہا ہے۔ ورنہ پست طبقات کو ''درکات'' کہتے ہیں۔ پھر اہل جنت کے درجات بھی مختلف ہوں گے۔

حدیث

ان اهل الجنة ليرون اهل عليين كما يرى النجم فی افق السماء۔[1]

اہل جنت علیین والوں کو اس طرح دیکھیں گے جیسے آسمان میں ستارے دیکھے جاتے ہیں۔

لَقَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذۡ بَعَثَ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ ۚ وَاِنۡ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۱۶۴﴾

۱۶۴۔ ایمان والوں پر اللہ نے بڑا احسان کیا کہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاکیزہ کرتا اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے جب کہ اس سے پہلے یہ لوگ صریح گمراہی میں مبتلا تھے۔

تفسیر آیات

رسول (ص) کی ہدایت سے مومنین نے ہی فائدہ اٹھایا۔ لہٰذا ان پر یہ عظیم احسان ہے کہ رسول (ص) نے انہیں جاہلیت کی ذلت، حقارت اور تنگدستی سے نکال کر اقوام عالم کی قیادت و رہبری کا اہل بنایا۔[2]

اہم نکات

۱۔ ہدایت، تزکیۂ نفس اور علم و حکمت، اللہ کے عظیم احسانات ہیں۔

---

[1] مجمع البیان [2] تلاوت آیات، تزکیۂ نفوس، اور تعلیم کتاب و حکمت کی توضیح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ بقرہ آیات ۱۲۹۔ ۱۵۱

اَوَلَمَّاۤ اَصَابَتۡکُمۡ مُّصِیۡبَۃٌ قَدۡ اَصَبۡتُمۡ مِّثۡلَیۡہَا ۙ قُلۡتُمۡ اَنّٰی ہٰذَا ؕ قُلۡ ہُوَ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۶۵﴾

۱۶۵۔ (مسلمانو!) جب تم پر ایک مصیبت پڑی تو تم کہنے لگے: یہ کہاں سے آئی؟ جب کہ اس سے دگنی مصیبت تم (فریق مخالف پر) ڈال چکے ہو، کہد یجیے: یہ خود تمہاری اپنی لائی ہوئی مصیبت ہے، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَوَلَمَّاۤ اَصَابَتۡکُمۡ: اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۱۴۰ میں ذکر ہوا ہے کہ مسلمانوں کا خیال یہ تھا کہ حق پر ہونے کی وجہ سے وہ علل و اسباب سے بالاتر ہیں۔

۲۔ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِکُمۡ: اس آیت میں اس غلط فہمی کا ازالہ ہے کہ یہ خود تمہاری اپنی لائی ہوئی مصیبت ہے۔ یہ قانون فطرت اور سنت تاریخ ہے، جس کے تحت تمہیں شکست کی مصیبت اٹھانا پڑی۔ تمہاری خیانت اور اپنے قائد کی نافرمانی نے تمہیں شکست سے دوچار کیا ہے۔ اللہ کے نظام علل و اسباب میں یہ نہیں ہوسکتا کہ تم خیانت کرو اور اس کا نتیجہ فتح و نصرت ہو نیز تم اپنی قیادت کی نافرمانی کرو اور اس کا نتیجہ عزت و سر بلندی ہو۔

۳۔ قَدۡ اَصَبۡتُمۡ مِّثۡلَیۡہَا: اس کے باوجود اس صدمے میں تخفیف کی خاطر جنگ احد کا جنگ بدر سے موازنہ ہو رہا ہے کہ وہاں تم نے ان کے ستر مارے اور ستر اسیر بنائے اور آج تمہارے ستر افراد شہید ہوئے ہیں اور کسی کو اسیر نہیں بنایا۔

اہم نکات

۱۔ نتائج اسباب و علل کے تابع ہوتے ہیں۔
۲۔ جیسا کروگے ویسا بھروگے: ہُوَ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِکُمۡ ....
۳۔ قیادت کی نافرمانی کا نتیجہ شکست، مصیبت اور رسوائی ہے۔

وَ مَاۤ اَصَابَکُمۡ یَوۡمَ الۡتَقَی الۡجَمۡعٰنِ فَبِاِذۡنِ اللّٰہِ وَ لِیَعۡلَمَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۶۶﴾

۱۶۶۔ اور دونوں فریقوں کے درمیان مقابلے کے روز تمہیں جو مصیبت پہنچی وہ اللہ کے اذن سے تھی اور (اس لیے بھی کہ) اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ مومن کون ہیں۔

وَ لِيَعۡلَمَ الَّذِيۡنَ نَافَقُوۡا ۚۖ وَ قِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا قَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَوِ ادۡفَعُوۡا ؕ قَالُوۡا لَوۡ نَعۡلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعۡنٰكُمۡ ؕ هُمۡ لِلۡكُفۡرِ يَوۡمَئِذٍ اَقۡرَبُ مِنۡهُمۡ لِلۡاِيۡمَانِ ۚ يَقُوۡلُوۡنَ بِاَفۡوَاهِهِمۡ مَّا لَيۡسَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ وَ اللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا يَكۡتُمُوۡنَ ﴿۱۶۷﴾

۱۶۷۔ اور یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ نفاق کرنے والے کون ہیں، جب ان سے کہا گیا: آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا دفاع کرو تو وہ کہنے لگے: اگر ہمیں علم ہوتا کہ (طریقے کی) جنگ ہو رہی ہے تو ہم ضرور تمہارے پیچھے ہو لیتے، اس دن یہ لوگ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب ہو چکے تھے، وہ اپنے منہ سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتی اور جو کچھ یہ لوگ چھپاتے ہیں اللہ اس سے خوب آگاہ ہے۔

اَلَّذِيۡنَ قَالُوۡا لِاِخۡوَانِهِمۡ وَ قَعَدُوۡا لَوۡ اَطَاعُوۡنَا مَا قُتِلُوۡا ؕ قُلۡ فَادۡرَءُوۡا عَنۡ اَنۡفُسِكُمُ الۡمَوۡتَ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۱۶۸﴾

۱۶۸۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خود (پیچھے) بیٹھے رہے اور اپنے بھائیوں کے بارے میں کہنے لگے: کاش! اگر وہ ہماری بات مانتے تو قتل نہ ہوتے، ان سے کہدیجیے: اگر تم سچے ہو تو موت کو اپنے سے ٹال دو۔

تفسیر آیات

۱۔ فَبِاِذۡنِ اللّٰهِ: یعنی تم اس جنگ میں اذن خدا سے شکست سے دوچار ہوئے۔ اذن خدا کا مطلب یہ ہے کہ علل و اسباب کے تحت جو نتیجہ مرتب ہونا ہے اس میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے اور ہونے دیا جائے۔ اس ''رکاوٹ نہ ڈالنے'' اور ''ہونے دینے'' کو اذن کہتے ہیں:

مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ...[1]
مصائب میں سے کوئی مصیبت اللہ کے اذن کے بغیر نازل نہیں ہوتی۔

اس جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی اور جنگ سے فرار ہونے کا نتیجہ شکست کی صورت میں سامنے آنا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس نتیجے کے سامنے رکاوٹ نہیں ڈالی اور مسلمانوں کو شکست سے دوچار ہونے دیا تا کہ مؤمن اور منافق میں امتیاز ہو جائے۔

۲۔ وَ لِيَعۡلَمَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ: دوسری وجہ اس ہونے دینے کی یہ تھی کہ اس شکست سے مؤمن اور منافق

---
[1] ۶۴ تغابن: ۱۱

میں امتیاز آ گیا یا یوں کہنا چاہیے، اس جنگ سے مؤمن اور منافق میں امتیاز آ گیا۔ چونکہ آگے گفتگو جنگ سے پہلے اور بعد کے واقعات کے بارے میں ہے اور منافقین کا تو فتح وشکست میں حصہ نہیں، کیونکہ منافقین نے جنگ میں شرکت ہی نہیں کی۔

۳۔ وَقِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا: منافقین سے کہا گیا کہ آؤ راہ خدا میں جہاد کریں یا مسلمانوں کے ساتھ رہو۔

۴۔ اَوِادۡفَعُوۡا: یعنی اگر تم جنگ میں شرکت نہیں کرتے تو کم از کم لشکر اسلام کے ساتھ رہو تا کہ اس سے لشکر کو تقویت ملے اور مسلمانوں کا دفاع ہو سکے۔ منافقین نے یہ تجویز بھی مسترد کر دی۔ ممکن ہے کہ اَوِادۡفَعُوۡا سے مراد یہ ہو کہ اگر جنگ نہیں لڑتے تو کم از کم اپنے شہر اور آبادی کا دفاع تو کرو۔

۵۔ قَالُوۡا لَوۡ نَعۡلَمُ قِتَالًا: شہر سے باہر لڑنا کوئی جنگ ہوتی تو ہم شرکت کرتے۔ منافقین مسلمانوں سے کہتے تھے کہ تمہارا یہ طریقۂ جنگ خودکشی کے مترادف ہے۔ اگر تم صحیح جنگ لڑتے تو ہم بھی شرکت کرتے۔

۶۔ هُمۡ لِلۡكُفۡرِ يَوۡمَئِذٍ اَقۡرَبُ: کفر کے قریب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ باطن میں تو تھے ہی کافر، لیکن اب کھل کر کافرانہ حرکات کرنے لگے۔

۷۔ يَقُوۡلُوۡنَ بِاَفۡوَاهِهِمۡ: وہ منہ سے کہتے تو یہ ہیں کہ تم شہر سے باہر لڑ رہے ہو، اس لیے ہم اس جنگ میں شرکت نہیں کرتے، جب کہ ان کے دلوں میں جو بات ہے، وہ یہ ہے کہ ہر صورت میں اللہ کے رسولؐ کے ساتھ جنگ میں شرکت نہیں کرنا ہے۔

۸۔ اَلَّذِيۡنَ قَالُوۡا لِاِخۡوَانِهِمۡ: یہاں برادری سے مراد دینی و نظریاتی نہیں بلکہ قبیلے کی برادری مراد ہے۔ یعنی یہ منافقین اپنے ہر قبیلہ کے افراد کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر یہ لوگ ہماری بات مان لیتے تو قتل نہ ہوتے۔

۹۔ قُلۡ فَادۡرَءُوۡا: جواب میں ان منافقین سے کہہ دیجیے کہ جنگ میں شرکت نہ کرنے سے موت ٹل جاتی ہے تو تم اپنے سے موت کو ٹال دو۔ پہلے ذکر ہوا جنگ کو موت کے لیے مستقل سبب قرار دینا کافرانہ سوچ ہے۔

اہم نکات

۱۔ فتح و شکست اپنے مخصوص علل و اسباب کا نتیجہ ہے، جو اللہ کے وضع کردہ قانون علیت کے تابع ہیں: فَبِاِذۡنِ اللّٰہِ ....

۲۔ جنگی حالات میں مومنین اور مجاہدین کا ساتھ نہ دینا اور لاتعلق رہنا، نفاق اور کفر سے قربت کی علامت ہے: هُمۡ لِلۡكُفۡرِ يَوۡمَئِذٍ اَقۡرَبُ مِنۡهُمۡ لِلۡاِيۡمَانِ ....

۳۔ منافقین ہی اہل ایمان کی پالیسیوں کو اپنی تخریبی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں: لَوۡ نَعۡلَمُ قِتَالًا ....۔

۴۔ منافق موت و حیات کو اللہ کے قبضۂ قدرت میں نہیں، بلکہ حوادث روزگار کا نتیجہ قرار دیتا ہے: لَوۡ اَطَاعُوۡنَا مَا قُتِلُوۡا ....۔

وَ لَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ ﴿۱۶۹﴾

۱۶۹۔ اور جو لوگ راہ خدا میں مارے گئے ہیں قطعاً انہیں مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس سے رزق پا رہے ہیں۔

فَرِحِیۡنَ بِمَاۤ اٰتٰہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ۙ وَ یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِالَّذِیۡنَ لَمۡ یَلۡحَقُوۡا بِہِمۡ مِّنۡ خَلۡفِہِمۡ ۙ اَلَّا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۱۷۰﴾

۱۷۰۔ اللہ نے اپنے فضل سے جو کچھ انہیں دیا ہے اس پر وہ خوش ہیں اور جو لوگ ابھی ان کے پیچھے ان سے نہیں جا ملے ان کے بارے میں بھی خوش ہیں کہ انہیں (قیامت کے روز) نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ محزون ہوں گے۔

یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِنِعۡمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ فَضۡلٍ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۷۱﴾

۱۷۱۔ وہ اللہ کی عطا کردہ نعمت اور اس کے فضل پر خوش ہیں اور اس بات پر بھی کہ اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا: موت شعور سلب ہونے سے عبارت ہے۔ شہید چونکہ رزق پاتے ہیں، لہٰذا وہ شعور کی زندگی گزار رہے ہیں اور خوشی بھی شعور کی علامت ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ آخرت میں مومنین کے لیے جو ثواب مہیا کر رکھا ہے، وہ ان کی موت سے پہلے ہی اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

۲۔ بَلۡ اَحۡیَآءٌ: اللہ سے رزق حاصل کرنے کا ایک لازمہ یہ ہے کہ اس رزق کے بعد نہ خوف رہتا ہے نہ حزن و ملال۔ کیونکہ جب کسی موجود اور میسر خوبی و آسائش کے سلب ہونے کا خطرہ ہو تو خوف لاحق ہوتا ہے اور اگر کوئی چیز سلب ہو جائے تو حزن و ملال ہوتا ہے۔ اخروی زندگی میں رب کی بارگاہ سے رزق پانے

کے بعد اس کے سلب ہونے کا کوئی خطرہ قابل تصور نہیں ہے۔ لہٰذا کسی قسم کے خوف کا بھی وہاں تصور نہیں ہے نیز یہ رزق ابدی ہے، لہٰذا اس کے چھن جانے کی نوبت نہیں آ سکتی، اس لیے حزن بھی قابل تصور نہیں ہے۔[1]

۳۔ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ : اپنے رب کے پاس زندہ ہیں۔ اس سے ان کی حیات کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حیات دنیوی حیات کی طرح بھی نہیں ہے اور باقی ارواح کی حیات کی طرح بھی نہیں ہے، بلکہ ایک خاص حیات ہے۔

اس آیت میں شہیدوں کی حیات کے چند آثار بیان ہوئے ہیں:

i۔ اللہ کے پاس سے رزق پاتے ہیں۔ ظاہر ہے رزق سے لذت پاتے ہیں، محظوظ ہوتے ہیں۔

ii۔ فَرِحِيۡنَ: اللہ نے اپنے فضل سے جو کچھ دیا ہے اس پر خوش ہیں۔ جس رزق کا پہلے ذکر ہوا ہے، یہ اس پر مزید فضل و کرم کا ذکر ہے۔

iii۔ وَ يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ : جو زندگی شہیدوں کو مل رہی ہے، وہ اس قدر کیف و سرور کی زندگی ہے کہ وہ اپنے آنے والے دوستوں کے لیے بھی اس زندگی کے ملنے کی خوشی سے محظوظ ہو رہے ہیں۔

iv۔ اس پر مزید نعمت و فضل الٰہی پر خوش ہیں: بِنِعۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضۡلٍ ۔

v۔ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ: یہ مکمل ادراک کہ اللہ کے ہاں اہل ایمان کا اجر ضائع نہیں جاتا، یہاں ناقدری نہیں ہوتی۔ یہ ادراک خود اپنی جگہ ایک بہت بڑی نعمت ہے، اللہ تعالیٰ کی صفات کے ادراک سے بھی کیف و سرور حاصل ہو گا۔

اہم نکات

۱۔ ہر نعمت کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے: بِنِعۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضۡلٍ ۔

۲۔ شہیدوں کو خوف اور غم سے پاک زندگی ملے گی۔

اَلَّذِيۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِلّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الۡقَرۡحُ ۛؕ لِلَّذِيۡنَ اَحۡسَنُوۡا مِنۡهُمۡ وَ اتَّقَوۡا اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۷۲﴾

۱۷۲۔ جنہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کے حکم کی تعمیل کی، ان میں سے جو لوگ نیکی کرنے والے اور تقویٰ والے ہیں ان کے لیے اجر عظیم ہے۔

---

[1] شہداء کی حیات کے بارے میں مزید تفسیر کے لیے ملاحظہ فرمائیں بقرہ: ۱۵۴

تفسیر آیات

۱۔ اَلَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا: جنگ احد کے بعد مشرکین واپس جا رہے تھے کہ راستے میں انہیں خیال آیا کہ مسلمانوں کی شکست سے ہم نے بھرپور فائدہ نہیں اٹھایا۔ چنانچہ انہوں نے ایک جگہ توقف کیا اور آپس میں مشورہ کیا کہ مدینہ پر دوبارہ حملہ کر دیا جائے لیکن وہ جرأت نہ کر سکے اور مکہ چلے گئے۔ دوسری طرف جنگ احد کے دوسرے دن رسول اکرم (ص) نے بھی اس خطرے کے پیش نظر کہ کفار واپس پلٹ کر دوبارہ حملہ نہ کر دیں، مسلمانوں کو کفار کے تعاقب میں چلنے کا حکم دیا۔ بعض لوگوں نے رسول (ص) کی اس دعوت پر یہ بہانہ بنا کر لبیک نہیں کہی کہ ہمارے جسم پر زخم ہیں۔ بعض دیگر مجاہدین نے زخموں کے باوجود رسول (ص) کی دعوت پر لبیک کہی۔ چنانچہ حمراء الاسد نامی جگہ تک جو مدینے سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے، تعاقب کیا گیا۔

۲۔ لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا: اس آیت میں نہایت قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اجر عظیم کا وعدہ سب لبیک کہنے والوں کے لیے نہیں، بلکہ ان میں سے نیکی کرنے والوں اور تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لیے ہے۔ کیونکہ بظاہر لبیک کہنے کے اور بھی عوامل ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ دوسری جنگوں میں رونما ہونے والی صورت حال شاہد ہے کہ لشکر اسلام میں مختلف قسم کے لوگ ہوتے تھے جو بظاہر سب ہی جنگ میں حاضر ہونے کے لیے اللہ اور رسول (ص) کی آواز پر لبیک کہتے تھے، لیکن اَحۡسَنُوۡا اور اتَّقَوۡا کے مقام پر فائز نہ تھے۔

اہم نکات

۱۔ اجر عظیم کا مستحق ہونے کے لیے ضروری امور: i۔ تقویٰ: اتَّقَوۡا...۔ ii۔ احسان: اَحۡسَنُوۡا...۔ iii۔ مشکلات کا سہنا: مِنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَصَابَہُمُ الۡقَرۡحُ...۔ iv۔ اللہ اور رسول (ص) کے ہر حکم کی تعمیل: اسۡتَجَابُوۡا لِلّٰہِ وَ الرَّسُوۡلِ...۔

۲۔ عصر رسول (ص) کے مجاہدین میں سے صرف بعض لوگ تقویٰ اور احسان سے متصف تھے: لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا مِنۡہُمۡ وَ اتَّقَوۡا...۔

اَلَّذِیۡنَ قَالَ لَہُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُوۡا لَکُمۡ فَاخۡشَوۡہُمۡ فَزَادَہُمۡ اِیۡمَانًا ٭ۖ وَّ قَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰہُ وَ نِعۡمَ الۡوَکِیۡلُ ﴿۱۷۳﴾

۱۷۳۔ جب کچھ لوگوں نے ان (مومنین) سے کہا: لوگ تمہارے خلاف جمع ہوئے ہیں پس ان سے ڈرو تو (یہ سن کر) ان کے ایمان میں اور اضافہ ہوا اور وہ کہنے لگے: ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔

فَانۡقَلَبُوۡا بِنِعۡمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ فَضۡلٍ لَّمۡ یَمۡسَسۡہُمۡ سُوۡٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوۡا رِضۡوَانَ اللّٰہِ ؕ وَ اللّٰہُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۷۴﴾

۱۷۴۔ چنانچہ وہ اللہ کی عطا کردہ نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹ کر آئے اور انہیں کسی قسم کی تکلیف بھی نہیں ہوئی اور وہ اللہ کی خوشنودی کے تابع رہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

تشریح کلمات

حَسۡبُنَا: (ح س ب)۔ حَسۡبُنَا ہمارے لیے کافی ہے۔ جیسے عَطَآءً حِسَابًا [1] میں حِسَابًا کافی ہونا کے معنوں میں آیا ہے۔ یہ لفظ حساب سے ہی ہے اور کافی ہونا ضرورت کے حساب سے ہے۔ لہٰذا اس لفظ کا مطلب یہ بنتا ہے کہ اللہ ہماری ضروریات کا حساب جاننے والا ہے کہ ہمیں کس قدر تائید و نصرت کی ضرورت ہے۔ اس کا لازمہ یہ ہے کہ بس وہی کافی ہے۔

الۡوَکِیۡلُ: (و ك ل) کارساز۔ ذمہ دار۔ اعتماد۔ بھروسا۔

تفسیر آیات

اس آیت کے شان نزول میں بعض مفسرین کا خیال یہ ہے کہ یہ آیت واقعۂ حمراء الاسد کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ حمراء الاسد وہ جگہ ہے، جہاں تک لشکر اسلام نے جنگ احد کے بعد مشرکین کا تعاقب کیا تھا۔ مشرکین میں دوبارہ مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ رہی اور وہ مکہ چلے گئے۔ لشکر اسلام بغیر کسی تکلیف کے سلامتی کے ساتھ واپس آ گیا۔

بعض کا خیال یہ ہے کہ یہ آیت بدر صغریٰ کے بارے میں نازل ہوئی۔ چونکہ ابوسفیان نے احد سے واپس جاتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ آئندہ سال بدر میں مسلمانوں کا مقابلہ کرے گا۔ چنانچہ رسول اللہ (ص) مقررہ وقت پر اپنے لشکر کے ساتھ بدر پہنچ گئے، لیکن ابوسفیان کا لشکر راستے سے واپس چلا گیا اور مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ کی۔ لشکر اسلام آٹھ روز تک قیام کرنے کے بعد عافیت کے ساتھ واپس آ گیا۔ لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ یہ آیت جنگ احد کے بعد واقعۂ حمراء الاسد کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ سلسلۂ کلام جنگ احد کے بارے میں جاری ہے۔

۱۔ اَلَّذِیۡنَ قَالَ لَہُمُ النَّاسُ: اللہ اور رسول کو لبیک کہنے والوں کے بارے فرمایا: یہ وہی لوگ ہیں جن سے کچھ لوگوں نے کہا۔ قَالَ لَہُمُ النَّاسُ۔ روایات میں آتا ہے اس جگہ النَّاسُ سے مراد نعیم بن مسعود ہے، جس نے یہ خبر دی تھی کہ ابوسفیان کا لشکر دوبارہ مدینے پر حملہ کرنے والا ہے۔

----

[1] ۷۸ نبا: ۳۶

۲۔ فَاخۡشَوۡهُمۡ : اس خبر دینے والے نے کہا: ابوسفیان کے لشکر سے خوف کرو تو خوف کرنے کی جگہ ان مؤمنین کے ایمان میں اضافہ ہوا۔

۳۔ فَزَادَهُمۡ اِیۡمَانًا : یعنی اس خبر سے خوف کی جگہ جہاد کرنے کے عزم و ارادے میں اضافہ ہوا۔ اسلام کے لیے حمیت و غیرت میں اضافہ ہوا، جو ایمان کے آثار ہیں۔ آثار میں اضافے سے ایمان میں اضافہ کا علم ہوتا ہے۔

۴۔ وَّ قَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ : اس ایمان کا اظہار انہوں نے ان الفاظ میں کیا: ان مشرکین کے مقابلے میں ہمارے لیے اللہ کافی ہے۔

۵۔ وَنِعۡمَ الۡوَکِیۡلُ : وہ بہترین ذات ہے، جس پر توکل اور بھروسا کیا جاتا ہے۔

۶۔ فَانۡقَلَبُوۡا بِنِعۡمَۃٍ مِّنَ اللّٰهِ : چنانچہ ابوسفیان کے لشکر نے مسلمانوں پر حملہ کرنے کی جرات نہیں کی۔ لشکر اسلام سلامتی کے ساتھ واپس ہوا۔ اس واپسی میں چند چیزیں ان کے نصیب میں آئیں: دشمن کو مرعوب کیا۔ وَفَضۡلٍ ....۔ تجارت میں منافع کے ساتھ لَّمۡ یَمۡسَسۡهُمۡ سُوۡٓءٌ ... دشمن سے کوئی گزند نہیں پہنچی۔ وَّ اتَّبَعُوۡا رِضۡوَانَ ... سب سے بڑی بات یہ کہ اللہ کی خوشنودی کی اتباع کا شرف نصیب ہوا۔

اہم نکات

۱۔ باطل اکثریت کی مادی طاقت اور دھمکیوں سے متقی مسلمان مرعوب نہیں ہوتے بلکہ ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے: اَلَّذِیۡنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ ... اِیۡمَانًا۔

۲۔ اللہ کی طرف سے اہل ایمان کی مکمل اور بہترین سرپرستی پر مومنین کو یقین ہے: قَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ وَنِعۡمَ الۡوَکِیۡلُ۔

۳۔ حمراء الاسد میں بلا مشقت کامیابی کا راز یہ تھا کہ اس دفعہ کوئی غیر مخلص مسلمان، مجاہدین کے ساتھ نہیں تھا: فَانۡقَلَبُوۡا ... وَّ اتَّبَعُوۡا رِضۡوَانَ ....۔

اِنَّمَا ذٰلِکُمُ الشَّیۡطٰنُ یُخَوِّفُ اَوۡلِیَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوۡهُمۡ وَ خَافُوۡنِ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۷۵﴾

۱۷۵۔ یہ (خبر دینے والا) شیطان ہے جو اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے، لہٰذا اگر تم مومن ہو تو ان لوگوں سے نہیں مجھ سے ڈرو۔

تفسیر آیات

کسی نے مسلمانوں میں یہ خبر پھیلا دی کہ ابوسفیان کا لشکر دوبارہ مدینے پر حملہ کرنے والا ہے۔ اس

خبر کو پھیلانے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان مرعوب ہو جائیں، جب کہ وہ مرعوب نہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ ان کا خوف نہ کرو۔ دشمن کے حملے سے خوفزدہ ہونے کی بجائے، اللہ کی نافرمانی کے نتیجے میں پیش آنے والے برے نتائج کا خوف کرو، جیسا کہ احد کے تجربے سے ظاہر ہوا۔

اس آیت میں افواہ پھیلانے والے انسان کو شیطان کہا گیا۔ چنانچہ قرآن متعدد مقامات پر انسان اور جن دونوں کے لیے لفظ شیطان استعمال کرتا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيۡنَ الۡاِنۡسِ وَالۡجِنِّ ...[1]

اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے جن و انس کے شیطانوں کو دشمن قرار دیا ہے ...۔

وَ اِذَا خَلَوۡا اِلٰى شَيٰطِيۡنِهِمۡ ....[2]

اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ تخلیے میں ہوتے ہیں۔

پس شیطان سے مراد کوئی خاص شخص نہیں بلکہ قرآنی اصطلاح میں ہر وہ انسان یا جن شیطان ہے جو انسانوں کو گمراہ کرے اور اسلام و مسلمین کے خلاف سازش کا حصہ بنے۔

اہم نکات

۱۔ مسلمانوں کو ڈرانے کے لیے افواہ پھیلانا شیطانی عمل ہے: اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيۡطٰنُ يُخَوِّفُ اَوۡلِيَآءَهٗ ... ۔

۲۔ بے ایمان لوگ ہی شیطانی افواہوں سے متاثر ہوتے ہیں: يُخَوِّفُ اَوۡلِيَآءَهٗ ...۔

۳۔ اہل ایمان صرف اللہ کا خوف رکھتے ہیں: فَلَا تَخَافُوۡهُمۡ ... مُّؤۡمِنِيۡنَ ۔

وَلَا يَحۡزُنۡكَ الَّذِيۡنَ يُسَارِعُوۡنَ فِى الۡكُفۡرِ ۚ اِنَّهُمۡ لَنۡ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيۡـًٔا ؕ يُرِيۡدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجۡعَلَ لَهُمۡ حَظًّا فِى الۡاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۷۶﴾

۱۷۶۔ اور (اے رسول) جو لوگ کفر میں سبقت لے جاتے ہیں (ان کی وجہ سے) آپ آزردہ خاطر نہ ہوں، یہ لوگ اللہ کو کچھ بھی ضرر نہیں دے سکیں گے، اللہ چاہتا ہے کہ آخرت میں ان کے نصیب میں ان کا کوئی حصہ نہ رکھے اور ان کے لیے تو بڑا عذاب ہے۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ اشۡتَرَوُا الۡكُفۡرَ بِالۡاِيۡمَانِ لَنۡ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيۡـًٔا ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۱۷۷﴾

۱۷۷۔ جنہوں نے ایمان کے مقابلے میں کفر خرید لیا ہے وہ بھی اللہ کو کوئی ضرر نہیں دے سکیں گے اور خود ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

---

[1] ۶ انعام: ۱۱۲ [2] ۲ بقرہ: ۱۴

تفسیر آیات

۱۔ لَا یَحۡزُنۡکَ : آنحضرت (ص) کی تسکین کے لیے فرمایا: لوگوں کی کفر میں سبقت سے اللہ کے دین کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ انہیں کفر اختیار کرنے کے لیے ڈھیل دی گئی ہے، جو خود ان کے لیے عذاب عظیم کا پیش خیمہ ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہ ہو۔ لہٰذا اس میں حزن و ملال کی کوئی بات نہیں ہے۔

۲۔ یُرِیۡدُ اللّٰہُ : جو لوگ کفر میں پیش قدم ہیں، ان کو ڈھیل دے کر اللہ یہ سزا دینا چاہتا ہے کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہ ہو اور عذاب عظیم ہی ان کا حصہ ہو۔

۳۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا الۡکُفۡرَ : کفر میں پیش قدم لوگوں کی طرح وہ لوگ بھی ہیں، جو ایمان کا سرمایہ دے کر کفر خریدتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کو کیا ضرر پہنچا سکیں گے، خود عذاب الیم کا ضرر اٹھاتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ کفار کا ہراول دستہ اور مفاد پرست ٹولہ اسلام کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا: الَّذِیۡنَ یُسَارِعُوۡنَ فِی الۡکُفۡرِ اِنَّہُمۡ لَنۡ یَّضُرُّوا اللّٰہَ ....

وَ لَا یَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّمَا نُمۡلِیۡ لَہُمۡ خَیۡرٌ لِّاَنۡفُسِہِمۡ ؕ اِنَّمَا نُمۡلِیۡ لَہُمۡ لِیَزۡدَادُوۡۤا اِثۡمًا ۚ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ ﴿۱۷۸﴾

۱۷۸۔ اور کافر لوگ یہ گمان نہ کریں کہ ہم انہیں جو ڈھیل دے رہے ہیں وہ ان کے لیے بہتر ہے، ہم تو انہیں صرف اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں تاکہ یہ لوگ اپنے گناہوں میں اور اضافہ کر لیں اور آخرکار ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔

تشریح کلمات

نُمۡلِیۡ: (م ل ی) الاملاء۔ ڈھیل دینا۔ مہلت دینا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَا یَحۡسَبَنَّ : یہ آیت ذہنوں میں اٹھنے والے ایک سوال کا جواب دیتی اور ایک اشتباہ کو دور کرتی ہے۔ وہ یہ کہ جو لوگ حق کا ساتھ نہیں دیتے، بلکہ عیش و نوش میں لگے رہتے اور ظلم و ستم کے ارتکاب کو اپنا وطیرہ بناتے ہیں، وہی مال و دولت سے مالامال ہوتے ہیں نیز جن کے ہاتھ مظلوموں کے خون میں رنگے

ہوتے ہیں وہی ہاتھ مزید لمبے ہوتے جاتے ہیں۔ جو دوسروں کا مال ناحق غصب کرتے ہیں، انہی کی دولت پھلتی پھولتی ہے۔ کیا نظام قدرت حق و ناحق میں فرق کا قائل نہیں ہے؟ ظلم کرنے والے کے ہاتھ شل کیوں نہیں ہوتے؟ غریبوں کا استحصال کرنے والوں کا پیٹ چاک کیوں نہیں ہوتا؟

۲۔ اَنَّمَا نُمۡلِیۡ لَہُمۡ: اس آیت میں ان سوالات کا خلاصۃً جواب یہ ہے کہ ڈھیل دینا ایک امتحان اور آزمائش ہے۔ اس دوران کافر اپنے بار گناہ میں اضافہ کرتا ہے اور مومن اپنی نیکیوں میں اضافہ کرتا ہے۔ لہٰذا یہی مہلت کافر کے خلاف اور مومن کے حق میں ہے۔

جناب سیدہ زینب بنت علی علیہا السلام نے یزید کو اسی آیت سے جواب دیا، جب اس نے اہل بیت اطہار علیہم السلام کو طنز کرتے ہوئے آیہ تُؤۡتِی الۡمُلۡکَ مَنۡ تَشَآءُ وَ تَنۡزِعُ الۡمُلۡکَ مِمَّنۡ تَشَآءُ ۫ وَ تُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ ... [1] کی تلاوت کی۔

اہم نکات

۱۔ کفر کو ملنے والی ڈھیل اس کی سب سے بڑی سزا ہے: وَلَا یَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّمَا نُمۡلِیۡ لَہُمۡ خَیۡرٌ لِّاَنۡفُسِہِمۡ ....

مَا کَانَ اللّٰہُ لِیَذَرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ عَلٰی مَاۤ اَنۡتُمۡ عَلَیۡہِ حَتّٰی یَمِیۡزَ الۡخَبِیۡثَ مِنَ الطَّیِّبِ ؕ وَ مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُطۡلِعَکُمۡ عَلَی الۡغَیۡبِ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یَجۡتَبِیۡ مِنۡ رُّسُلِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ۪ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ ۚ وَ اِنۡ تُؤۡمِنُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَلَکُمۡ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۷۹﴾

۱۷۹۔ اللہ مومنوں کو اس حال میں رہنے نہیں دے گا جس حالت میں اب تم لوگ ہو اور یہاں تک کہ پاک (لوگوں) کو ناپاک (لوگوں) سے الگ کر دے اور اللہ تمہیں غیب کی باتوں پر مطلع نہیں کرے گا بلکہ (اس مقصد کے لیے) اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے پس تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آؤ، اگر تم ایمان لے آؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو تمہیں اجر عظیم ملے گا۔

---

[1] ۳ آل عمران: ۲۶۔ تو جسے چاہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہے حکومت چھین لیتا ہے اور تو جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل کر دیتا ہے۔

تفسیر آیات

اس آیت کو سمجھنے کے لیے درج ذیل تین اہم نکات کی طرف توجہ ضروری ہے:

i۔ لِیَذَرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ: اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ موجودہ صورت حال کو برقرار نہیں رکھے گا، جس میں مومن اور منافق کی کوئی پہچان نہیں ہے بلکہ وہ آزمائش اور امتحان کے ذریعے انسانوں کو ارتقائی و آزمائشی مراحل سے گزارتا ہے، جس سے مومن و منافق نیز پاک اور ناپاک لوگوں کا فرق سامنے آجاتا ہے۔ جیسا کہ جنگ احد کی آزمائش سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ مومن کون ہے اور منافق کون ہے اور جو مومن ہیں، ان میں کامل الایمان اور ضعیف الایمان کون ہیں؟

ii۔ وَ مَا کَانَ اللّٰہُ: جب اس فرق کو واضح کرنا ضروری ہے تو کیا اس کی دوسری اور آسان صورت یہ نہیں ہوسکتی کہ اللہ کڑی آزمائش سے گزارنے کی بجائے علم غیب کے ذریعے سب کو بتا دے کہ مومن کون ہے اور منافق کون، صادق الایمان کون ہے اور ضعیف الایمان کون؟

اس سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اللہ یہ کام علم غیب سے آگاہی کے ذریعے انجام نہیں دیتا، کیونکہ ایمان و نفاق اور پاک و ناپاک کا تعین عمل اور کردار کے ذریعے ہونا چاہیے اور اس کے لیے عملی آزمائش ضروری ہے۔

iii۔ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یَجۡتَبِیۡ: البتہ بعض موارد میں اللہ اپنے برگزیدہ رسولوں کو وحی کے ذریعے غیب کی باتوں سے مطلع فرماتا ہے تاکہ منافقین کو اہل ایمان کے خلاف بہانہ جوئی کا موقع نہ ملے۔

iv۔ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ: خطاب اہل ایمان سے ہی ہوسکتا ہے کہ اے ایمان والو! اللہ کی طرف سے اس بیان کردہ حکمت عملی پر ایمان رکھو اور اس امتحان کے لیے اپنے اندر آمادگی پیدا کرو۔

v۔ وَ اِنۡ تُؤۡمِنُوۡا وَ تَتَّقُوۡا: اللہ کی طرف سے آنے والے ہر حکم پر ایمان لانے اور خلاف ورزی سے پرہیز کرنے کی صورت میں ہی طیب اور خبیث میں امتیاز آتا ہے اور اجر عظیم کا مستحق بن جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ پاکیزہ ہستیوں اور ناپاک افراد کی تشخیص ضروری ہے: یَمِیۡزَ الۡخَبِیۡثَ مِنَ الطَّیِّبِ ....

۲۔ تشخیص کا یہ عمل امتحان کے ذریعے ہو، نہ کہ وحی کے ذریعے: وَ مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُطۡلِعَکُمۡ عَلَی الۡغَیۡبِ ....

۳۔ ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالرسل بھی ضروری ہے: فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ ....

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۸۰

۱۸۰۔اور جو لوگ اللہ کے عطا کردہ فضل میں بخل سے کام لیتے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے لیے بہتر ہے بلکہ یہ ان کے حق میں برا ہے، جس چیز میں وہ بخل کرتے تھے وہ قیامت کے دن گلے کا طوق بن جائے گی اور آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے اور اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے۔

۱۔ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ: یہ آیت مالی واجبات ، جیسے زکوٰۃ، ادا نہ کرنے والوں کے بارے میں ہے۔جیسا کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس مال و دولت کا فضل ہوا ہے، اس کو اسی کی راہ میں خرچ نہ کرنا ایک نہایت بری خصلت ہے۔حدیث میں آیا ہے:

اَلْبُخْلُ جَامِعٌ لِمَسَاوِیِ الْعُیُوبِ وَ هُوَ زِمَامٌ یُقَادُ بِهِ اِلَی کُلِّ سُوءٍ.[۱]

بخل تمام برائیوں کا مجموعہ ہے۔ وہ ایسی لگام ہے جو ہر برائی کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے۔

۲۔ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا: وہ مال جس کے بارے میں دنیا میں بخل کیا تھا۔ آخرت میں اس بخیل کی گردن میں طوق بنے گا۔ یعنی جو لوگ زکوۃ ادا نہیں کرتے، قیامت کے دن ان کے گلے میں طوق بنے گا۔

ایمانی تطہیر کے ذکر کے بعد بخل کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بخیل کا حال بھی ان لوگوں سے مختلف نہیں جنہیں ڈھیل دی جاتی ہے اور یہ ڈھیل ان کے حق میں بہتر نہیں ہے نیز مال کو فضل خدا قرار دینے سے بخل کی برائی مزید واضح ہوجاتی ہے کہ جب مال اللہ کی طرف سے فضل و کرم ہے تو اسے اسی کی راہ میں خرچ نہ کرنا، نہایت بیوقوفی اور حماقت ہے۔

۳۔ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے یہ بات ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ تم اس مال کے امین ہو، مالک نہیں ہو۔ حقیقی مالک تو وہ ہے جو کل آسمانوں اور زمین کا وارث ہے۔

---

[۱] نہج البلاغۃ ۔ کلمات قصار۔ حکمت: ۳۷۸

اہم نکات

۱۔ مال انسان کے پاس اللہ کی امانت ہے: بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ... لِلّٰهِ مِيۡرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ

۲۔ بخل کو اپنے حق میں بہتر سمجھنا گناہ اور ایک قسم کی خود فریبی ہے: وَلَا يَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ يَبۡخَلُوۡنَ . . . خَيۡرًا لَّهُمۡ ؕ بَلۡ هُوَ شَرٌّ لَّهُمۡ ....

۳۔ بخل سے بچایا ہوا مال آخرت میں گلے کا طوق بن جائے گا: سَيُطَوَّقُوۡنَ مَا بَخِلُوۡا بِهٖ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ۔

لَقَدۡ سَمِعَ اللّٰهُ قَوۡلَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيۡرٌ وَّ نَحۡنُ اَغۡنِيَآءُ ۘ سَنَكۡتُبُ مَا قَالُوۡا وَقَتۡلَهُمُ الۡاَنۡۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوۡلُ ذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِيۡقِ ﴿۱۸۱﴾

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ ﴿۱۸۲﴾

۱۸۱۔ بتحقیق اللہ نے ان لوگوں کی سن لی ہے جو کہتے ہیں: بے شک اللہ محتاج اور ہم بے نیاز ہیں، ان کی یہ بات اور ان کا انبیاء کو ناحق قتل کرنا بھی ہم ثبت کریں گے اور (روز قیامت) ہم ان سے کہیں گے: لو اب جلانے والے عذاب کا ذائقہ چکھو۔

۱۸۲۔ یہ خود تمہارے اپنے کیے کا نتیجہ ہے اور بے شک اللہ تو اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَقَدۡ سَمِعَ اللّٰهُ: جب یہ آیت نازل ہوئی: مَنۡ ذَا الَّذِيۡ يُقۡرِضُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا ...[1] تو یہودیوں نے اس کا مذاق اڑایا اور کہا: اللہ مفلس و محتاج ہو گیا، جو اپنے بندوں سے قرض مانگ رہا ہے۔

۲۔ سَنَكۡتُبُ مَا قَالُوۡا: یہودیوں کے اس کافرانہ قول اور انبیاء کے ناحق قتل کو ثبت کرنے سے مراد شاید یہ ہو کہ ان کا قول و فعل بذات خود ثبت اور محفوظ ہو نیز ممکن ہے کہ اللہ کی طرف سے مقرر شدہ فرشتوں کے ذریعے ثبت اور محفوظ کر لیا جاتا ہو۔

۳۔ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتۡ: دوسری آیت میں ارشاد فرمایا کہ یہودیوں کو عذاب جہنم سے خود ان کے اعمال

---

[1] ۲ بقرہ: ۲۴۵۔ کوئی ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے۔

نے دوچار کیا ہے، جو انہوں نے اپنے اختیار سے انجام دیے۔ ورنہ اللہ تو بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ یعنی اگر یہ خود اپنے اختیار و ارادے سے ان جرائم کا ارتکاب نہ کرتے تو انہیں سزا دینا ظلم ہوتا۔ اس سے امامیہ کا نظریہ لا جبر و لا تفویض درست ثابت ہوجاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان کا ہر قول و فعل اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ محفوظ ہو رہا ہے: سَنَكۡتُبُ مَا قَالُوۡا ....

۲۔ اللہ کی طرف عیب و نقص کی نسبت دینا ناقابل معافی گناہ اور انسان کے جہنمی ہونے کا سبب ہے: قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيۡرٌ ... وَّنَقُوۡلُ ذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِيۡقِ۔

اَلَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيۡنَاۤ اَلَّا نُؤۡمِنَ لِرَسُوۡلٍ حَتّٰى يَاۡتِيَنَا بِقُرۡبَانٍ تَاۡكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلۡ قَدۡ جَآءَكُمۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِىۡ بِالۡبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِىۡ قُلۡتُمۡ فَلِمَ قَتَلۡتُمُوۡهُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۱۸۳﴾

۱۸۳۔ جو لوگ کہتے ہیں: ہمیں اللہ نے حکم دیا ہے کہ جب تک کوئی رسول ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ لائے جس کو آگ آ کر کھا جائے، ہم اس پر ایمان نہ لائیں کہدیجیے: مجھ سے پہلے بھی رسول روشن دلیل کے ساتھ تمہارے پاس آئے اور جس کا تم ذکر کرتے ہو وہ بھی لائے تو اگر تم سچے ہو تو تم لوگوں نے انہیں قتل کیوں کیا؟

شان نزول

۱۔ اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيۡنَاۤ: یہودیوں نے آنحضرت (ص) سے مطالبہ کیا کہ ہمارے سامنے ایک جانور کی قربانی پیش کریں جسے غیبی آگ آ کر کھا لے، تب ہم آپ (ص) کی نبوت کو تسلیم کریں گے۔

یہودیوں کا یہ مطالبہ رسالتمآب (ص) کی نبوت کے انکار کے لیے ایک بہانہ تھا۔ قرآن اس بہانہ سازی کو فاش کرتا ہے اور تاریخی شواہد سے ثابت کرتا ہے کہ ان کا یہ مطالبہ طلب حق کے لیے نہیں، جس کے لیے معجزہ دکھانا ضروری ہو، بلکہ صرف حیلہ سازی ہے۔ چنانچہ بائبل سلاطین باب ۱۸۔ ۱۹ میں ہے کہ حضرت الیاس (ع) نے عیناً یہی معجزہ دکھایا، لیکن یہودی بادشاہ انہیں قتل کرنے پر مصر رہا۔

چنانچہ توریت سفر لاوی ۹: ۲۴ میں اس بات کی صراحت ہے کہ حضرت موسیٰ و ہارون کے لیے یہ

معجزہ ہوا تھا، آسمان سے آ کر آگ نے اس قربانی کو کھا لیا۔ حضرت داود و حضرت سلیمان اور حضرت ایلیا علیہم السلام کے لیے اسی قسم کے معجزات کا ذکر توریت کے مختلف ابواب میں ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر آلاء الرحمٰن ا: ۳۷۷۔

لہٰذا صاحب المنار کا ہمیشہ کی طرح اس معجزے کی یہ توجیہ کرنا کہ یہ آگ آسمان سے بطور معجزہ نہیں آئی بلکہ خود آگ میں جلایا کرتے تھے، خلاف صریح آیت و خلاف صریح توریت ہے۔ چونکہ آیت میں تَاۡکُلُہُ النَّارُ آگ آ کر کھا لے کو بینات روشن دلیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ قربانی کو خود اپنے ہاتھوں سے آگ میں جلانا کسی حق کے اثبات کے لیے دلیل نہیں بن سکتا۔

۲۔ فَلِمَ قَتَلۡتُمُوۡہُمۡ : یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاصر یہودیوں سے ہے۔ ان لوگوں نے اگرچہ کسی نبی کو قتل نہیں کیا، تاہم یہ لوگ اس قتل پر راضی تھے۔ اس لیے یہ لوگ بھی اس قتل میں شریک ہیں۔

اہم نکات

۱۔ معجزہ دکھانا اس وقت لازم ہے جب اس کا مطالبہ بہانہ تراشی کی بنا پر نہ ہو بلکہ حقیقت کو جاننے اور تصدیق حق کی خاطر ہو۔

۲۔ قومی اور نظریاتی سطح پر انجام پانے والے امور کی ذمہ داری پوری قوم پر عائد ہوتی ہے: فَلِمَ قَتَلۡتُمُوۡہُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ۔

فَاِنۡ کَذَّبُوۡکَ فَقَدۡ کُذِّبَ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِکَ جَآءُوۡ بِالۡبَیِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ الۡکِتٰبِ الۡمُنِیۡرِ ﴿۱۸۴﴾

۱۸۴۔ (اے رسول) اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کرتے ہیں تو (یہ کوئی نئی بات نہیں کیونکہ) آپ سے پہلے بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں جو معجزات، صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے تھے۔

تشریح کلمات

وَ الزُّبُرِ: (ز ب ر) زبور کی جمع ہے۔ ہر وہ کتاب جو جلی اور گاڑھے خط میں لکھی ہوئی ہو۔ یہ نام حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب سے مخصوص ہے۔ بقول بعض، مواعظ اور تنبیہات پر مشتمل کتاب کو زبور کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

اس آیت میں رسالتمآب (ص) کے لیے سامان تسکین ہے اور اس الٰہی دعوت کی راہ میں داعیان حق

کو پیش آنے والے ایک بنیادی مسئلے، یعنی تکذیب کا ذکر ہے کہ ہر نبی کو اس کا مقابلہ کرنا پڑا، لیکن اس کے باوجود کسی نبی کی کامیابی کی راہ میں تکذیب رکاوٹ نہیں بنی۔

حالانکہ وہ انبیاء بینات واضح دلیل، الزُّبُرِ وعظ و نصائح پر مشتمل تعلیمات، الۡکِتٰبِ الۡمُنِیۡرِ راہ نجات روشن کرنے والی کتابیں لے کر آئے تھے، لہٰذا آپؐ کی تکذیب اس لیے نہیں کر رہے ہیں کہ آپؐ کے پاس مذکورہ میراث انبیاء نہیں ہے، بلکہ یہ صرف عناد کی وجہ سے تکذیب کر رہے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ باطل قوتیں ہمیشہ حق کو غلط ثابت کر کے اپنے اہداف تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہیں۔

کُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَۃُ الۡمَوۡتِ ؕ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوۡنَ اُجُوۡرَکُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ فَمَنۡ زُحۡزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدۡخِلَ الۡجَنَّۃَ فَقَدۡ فَازَ ؕ وَ مَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الۡغُرُوۡرِ ﴿۱۸۵﴾

۱۸۵۔ ہر جاندار کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور تمہیں تو قیامت کے دن یقیناً پورا اجر ملے گا (درحقیقت) کامیاب وہ ہے جسے آتش جہنم سے بچا کر جنت میں داخل کر دیا جائے (ورنہ) دنیاوی زندگی تو صرف فریب کا سامان ہے۔

تفسیر آیات

احد میں پیش آنے والے واقعات پر چند ایک تنبیہی تبصروں کے بعد دعوت حق کو پیش آنے والی مشکلات کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ فرمایا۔ اس کے بعد کلام کا رخ براہ راست مسلمانوں کی طرف ہو گیا اور ان اقدار کی طرف اشارہ فرمایا جنہیں اپنی زندگی کا مقصد قرار دینا چاہیے، جن کے لیے جہاد کرنا چاہیے اور جن کی راہ میں مشکلات پر صبر کرنا چاہیے اور پھر کامیابی کا تصور کرنا چاہیے۔ اسی تناظر میں ارشاد ہو رہا ہے:

۱۔ کُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَۃُ الۡمَوۡتِ: یہ ارضی زندگی عارضی ہے۔ اس نے گزر جانا ہے۔ اس وقتی زندگی کو کامیابی اور ناکامی کا معیار نہیں بنانا چاہیے۔ یہاں کسی کو فراوان نعمتیں دی گئی ہیں، کوئی جاہ و جلالت کی کرسی پر متمکن ہے تو کوئی مصائب و مشکلات میں مبتلا ہے۔ یہ امور حق و باطل اور کامیابی و ناکامی کے حتمی نتائج نہیں ہیں۔ احد میں اگر کچھ لوگ قتل ہو گئے ہیں، یہ بات ذہن نشین کر لی جائے، ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ اگر نہ مرنے والا مر جاتا تو افسوس کا مقام ہوتا، مرنے والے نے موت کا ذائقہ چکھا ہے اور راہ خدا میں شہادت کے مقام پر فائز ہو کر چکھا ہے، جو شہد سے بھی زیادہ شیرین ہے۔

۲۔ وَاِنَّمَا تُوَفَّوۡنَ اُجُوۡرَکُمۡ : یہ عام موت کی طرح بھی نہیں ہے۔ اس موت کے پیچھے اجر عظیم ہے، جو تمہیں پورا ملے گا۔

۳۔ فَمَنۡ زُحۡزِحَ عَنِ النَّارِ : کامیابی وہ ہے جو ابدی ہو، لازوال ہو۔ وہ آتش جہنم سے نجات اور جنت میں داخل ہونے میں ہے۔

۴۔ وَمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَاۤ : اس تصور کے تحت اس وقتی زندگی کو نہیں، بلکہ حیات ابدی کو کامیابی کا معیار بنانا چاہیے۔ چنانچہ اس آیت میں فرمایا: دنیاوی زندگی تو ایک فریب ہے۔ کامیاب وہ ہے جو عذاب جہنم سے نجات حاصل کر کے جوار رحمت میں جگہ حاصل کر سکے۔

۵۔ اس آزمائشی اور وقتی زندگی میں اجر و ثواب کی توقع نہ رکھو۔ یہ دار عمل ہے، دار ثواب نہیں ہے۔ اس لیے روز قیامت سارے کا سارا اجر و ثواب پاؤ گے۔

لَتُبۡلَوُنَّ فِیۡۤ اَمۡوَالِکُمۡ وَ اَنۡفُسِکُمۡ ۟ وَلَتَسۡمَعُنَّ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ وَ مِنَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡۤا اَذًی کَثِیۡرًا ؕ وَ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ﴿۱۸۶﴾

۱۸۶۔ (مسلمانو!) تمہیں ضرور اپنے مال و جان کی آزمائشوں کا سامنا کرنا ہوگا اور تم ضرور اہل کتاب اور مشرکین سے دل آزاری کی باتیں کثرت سے سنو گے اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ معاملات میں عزم راسخ (کی علامت) ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَتُبۡلَوُنَّ : اموال و انفس میں نقصان کے ذریعے آزمائش و امتحان کے مراحل سے گزرنا ہر دعوت اور تحریک کے لیے ایک ناگزیر عمل ہے۔

۲۔ وَلَتَسۡمَعُنَّ : مذکورہ حقیقت کے ذکر کے ساتھ ایک نفسیاتی تکلیف کی پیشگوئی بھی فرمائی کہ مسلمانوں کو مستقبل میں یہودیوں اور دیگر مذاہب کی طرف سے طعن و تشنیع الزامات اور تہمتوں کا بھی مقابلہ کرنا ہوگا۔ چنانچہ آج تک مسلمان ان کے نامعقول اور نامربوط الزامات کا نشانہ بن رہے ہیں۔ جہاں اسلامی تحریک چلی یا زمین کے کسی خطے میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا مسئلہ پیش آیا تو ان کی طرف سے طنز و تشنیع اور الزامات کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ خود ہماری معاصر تاریخ میں جب اسلامی تعزیرات کے نفاذ کا مسئلہ پیش آیا تو یہودی پنجوں میں جکڑے ہوئے مغربی ذرائع ابلاغ نے الزامات اور تہمتوں کا طوفان اٹھایا اور طعن و تشنیع اور

بدکلامی سے مسلمانوں کو ایذا پہنچانے کی کوشش کی، جس کی بدترین مثال رشدی کی کتاب ''شیطانی آیات'' ہے۔ اس قرآنی آیت کی پیشگوئی کے مطابق آیندہ بھی ذرائع ابلاغ میں تبدیلی اور ترقی کے ساتھ ساتھ ہر ذریعے سے وہ مسلمانوں کو ایذا پہنچانے میں کوتاہی نہیں کریں گے۔

۳۔ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا: دشمن کے اس حربے کے سامنے قرآن صبر و تقویٰ کا حکم دیتا ہے، جس سے دشمن کی تمام سازشیں اکارت ہو جائیں گی۔ ورنہ اگر دشمن کے بہتان کی وجہ سے اضطراب و تزلزل آ جائے تو یہ اپنے عقائد و نظریات پر بے ثباتی کی علامت ہے نیز اس جگہ تقویٰ کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ دشمن کی بدکلامی انسان کو اخلاق کی حدود سے تجاوز کرنے کا باعث بنتی ہے۔

۴۔ فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ: صبر اور تقویٰ، مضبوط قوت ارادہ، بصیرت اور ثابت قدمی کے نتیجے میں وجود میں آ سکتے ہیں۔ صبر کے لیے علم اور عقل ایمان کی پختگی لازم ہوتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ ارتقائی مراحل طے کرنے کے لیے آزمائش ایک ناگزیر عمل ہے۔

۲۔ دشمن کی بہتان تراشی کا جواب بدکلامی نہیں ہے، بلکہ صبر و استقامت اور تقویٰ ہے۔

وَ اِذۡ اَخَذَ اللّٰہُ مِیۡثَاقَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّہٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَکۡتُمُوۡنَہٗ ۫ فَنَبَذُوۡہُ وَرَآءَ ظُہُوۡرِہِمۡ وَ اشۡتَرَوۡا بِہٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ؕ فَبِئۡسَ مَا یَشۡتَرُوۡنَ ﴿۱۸۷﴾

۱۸۷۔ اور (یاد کرنے کی بات ہے کہ) جب اللہ نے اہل کتاب سے یہ عہد لیا تھا کہ تمہیں یہ کتاب لوگوں میں بیان کرنا ہو گی اور اسے پوشیدہ نہیں رکھنا ہو گا، لیکن انہوں نے یہ عہد پس پشت ڈال دیا اور تھوڑی قیمت پر اسے بیچ ڈالا پس ان کا یہ بیچنا کتنا برا معاملہ ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَتُبَیِّنُنَّہٗ لِلنَّاسِ: تعبیر میں تاکید ہے کہ کتب آسمانی میں موجود حقائق کو من و عن لوگوں کے لیے بیان کرنا ہے۔

۲۔ وَلَا تَکۡتُمُوۡنَہٗ: اسے چھپانا نہیں ہے۔ یعنی جہاں کوئی حکم خدا تمہارے دنیاوی مفادات کے خلاف دکھائی دے، اسے چھپانا نہیں۔

۳۔ وَاشۡتَرَوۡا بِہٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا: لیکن اہل کتاب نے اس عہد کو پس پشت ڈال دیا اور اپنی اخروی

ابدی زندگی کو دنیا کے چند حقیر مفادات کے عوض بیچ دیا۔ دنیاوی مفادات خواہ کتنے زیادہ ہوں، آخرت کے مفادات کے مقابلے میں نہایت قلیل ہیں۔

۴۔ فَبِئۡسَ مَا یَشۡتَرُوۡنَ: ابدی زندگی کو دو دن کے تھوڑے مفادات کے عوض فروخت کرنا کتنا برا سودا ہے۔

اہل کتاب کی عہد شکنی کو قرآن امت مسلمہ کے اذہان میں اس تاکید اور وضاحت و صراحت کے ساتھ راسخ کرنا چاہتا ہے، گویا اس امت کو سب سے زیادہ پیش آنے والا مسئلہ یہی ہو گا اور سب سے زیادہ بنیادی نوعیت کا مسئلہ بھی یہی رہے گا۔ تعجب اس بات پر ہے کہ قرآن کی اس تاکید و اصرار کے باوجود مسلمانوں نے اس حکم کو پس پشت ڈال دیا ہے اور ان عہد شکنوں کے ساتھ معاہدے کر رہے ہیں۔ وہ ہزارہا تجربات کے باوجود بھی انہی ناپائیدار معاہدوں پر بھروسا کرتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ کتاب اللہ اور احکام شریعت کو دنیا کے سامنے بہتر انداز میں پیش کرنا وفائے عہد ہے۔ لہٰذا الٰہی اقدار پر ثابت قدم رہتے ہوئے اپنے بچاؤ کی ہر ممکنہ تدبیر کرنا مسلمانوں کی اہم ذمہ داری ہے۔

۲۔ اہل کتاب سے عہد و میثاق قرآنی تعلیمات کی تضحیک ہے۔

لَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ یَفۡرَحُوۡنَ بِمَاۤ اَتَوۡا وَّ یُحِبُّوۡنَ اَنۡ یُّحۡمَدُوۡا بِمَا لَمۡ یَفۡعَلُوۡا فَلَا تَحۡسَبَنَّہُمۡ بِمَفَازَۃٍ مِّنَ الۡعَذَابِ ۚ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۱۸۸﴾

۱۸۸۔ جو لوگ اپنے کیے پر خوش ہیں اور ان کاموں پر اپنی تعریفیں سننا چاہتے ہیں جو انہوں نے نہیں کیے لہٰذا آپ انہیں عذاب سے محفوظ نہ سمجھیں بلکہ ان کے لیے دردناک عذاب ہو گا۔

وَ لِلّٰہِ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۸۹﴾

۱۸۹۔ اور (وہ بچ کر کہاں جائیں گے) زمین و آسمان اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

تشریح کلمات

مَفَازَۃ: (ف و ز) نجات۔

تفسیر آیات

اس آیت کا شان نزول بعض مفسرین کے نزدیک یہود ہیں اور بعض کے نزدیک منافقین۔

۱۔ لَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ یَفۡرَحُوۡنَ بِمَاۤ اَتَوۡا: جو لوگ کتمان حق اور مفاد پرستی جیسے جرائم کا ارتکاب کر کے اس پر خوش بھی ہیں، ان کے لیے نجات کا گمان تک نہ کرو۔

واضح رہے گناہ کے مرتکب کی دو حالتیں ہیں: ایک یہ کہ وہ اس کو گناہ تصور کرتا ہے۔ احساس گناہ ہے۔ اس شخص کا گناہ قابل عفو ہے۔ دوسری حالت یہ ہے کہ وہ اس کو گناہ ہی نہیں سمجھتا، احساس گناہ نہیں ہے۔ اس شخص کا گناہ قابل عفو نہیں ہے، مگر یہ کہ کسی مرحلے میں اس کا اپنے سارے گناہوں کے بارے میں احساس زندہ ہو جائے۔

۲۔ وَّ یُحِبُّوۡنَ اَنۡ یُّحۡمَدُوۡا: الفاظ کے عموم کے تحت ہر وہ شخص اس آیت کا مصداق ہے جو اپنے حق میں اس قسم کی تعریفیں سننا چاہتا ہے، جن کا وہ مستحق نہیں ہے اور جن پر اس نے عمل ہی نہیں کیا۔ مثلاً یہ کہ فلاں صاحب نے ملک کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اور ان کے عہد میں ملک نے بے انتہا ترقی کی ہے، جب کہ اس نے ملک کو نقصان پہنچایا اور لوٹا ہو یا یہ کہ جناب بہت بڑے علامہ، مجتہد، دیانتدار، مخلص اور متقی ہیں، جب کہ وہ اندر سے اس کے برعکس ہوں۔ اپنے ہر قول و فعل پر نازاں اور ناکردہ خوبیوں کی تعریف سننے کے مشتاق لوگ دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ کوئی انہیں اس المناک عقاب سے نجات نہیں دے سکتا، کیونکہ آسمانوں اور زمین کی حکمرانی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جب اللہ ہی اسے عذاب میں مبتلا کرے تو کون بچائے گا؟

۳۔ فَلَا تَحۡسَبَنَّہُمۡ بِمَفَازَۃٍ: اس قسم کے خلق و خو کے مالک لوگ راہ راست پر نہیں آئیں گے اور وہ عذاب سے محفوظ نہ ہوں گے۔

اہم نکات

۱۔ کسی ناکردہ عمل پر تعریف و تمجید کی توقع رکھنا ایسی سرشت ہے جس کے ہوتے ہوئے عذاب سے محفوظ نہیں ہو سکے گا۔

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۰﴾	۱۹۰۔ بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے بدلنے میں صاحبان عقل کے لیے نشانیاں ہیں۔
الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ	۱۹۱۔ جو اٹھتے بیٹھتے اور اپنی کروٹوں پر لیٹتے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین

خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾

کی خلقت میں غور و فکر کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) ہمارے پروردگار! یہ سب کچھ تو نے بے حکمت نہیں بنایا، تیری ذات (ہر عبث سے) پاک ہے، پس ہمیں عذاب جہنم سے بچا لے۔

رَبَّنَاۤ اِنَّکَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَہٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۱۹۲﴾

۱۹۲۔ ہمارے پروردگار! تو نے جسے جہنم میں ڈالا اسے رسوا کیا، پھر ظالموں کا کوئی مددگار بھی نہ ہوگا۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ: آسمانوں اور زمین کی خلقت نیز شب و روز کی آمد و رفت کے بارے میں سورہ بقرہ آیت ۱۶۴ کی تفسیر میں قدرے تفصیل سے ذکر ہو چکا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں: الکوثر فی تفسیر القرآن جلد اول صفحہ ۴۵۲۔

۲۔ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ: دوسری آیت میں ارشاد ہو رہا ہے کہ صاحبان عقل پر جب اللہ کی نشانیاں واضح ہو جاتی ہیں تو درج ذیل نتائج مترتب ہوتے ہیں:

i۔ ان کے قلب و ضمیر میں ذکر خدا رچ بس جاتا ہے جو ایمان و ایقان کا لازمہ ہے۔ ہر حال میں ان کے ذہن و شعور میں یاد خدا حاوی رہتی ہے۔ ان میں تین حالتوں کا ذکر ہے، جن سے انسان خالی نہیں ہوتا۔

الف: قِیٰمًا: چل رہا ہو یا ویسے کھڑا ہو یا کام کاج کر رہا ہو۔

ب: قُعُوۡدًا: بیٹھا ہوا ہو، جس کام میں مشغول ہو، کوئی معاملہ کر رہا ہو، اللہ کو نہ بھولے۔ یعنی حکم خدا کے خلاف قدم نہ اٹھائے۔

ج: وَّ عَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ: اگر لیٹا ہوا ہو تو کروٹوں پر بھی یاد خدا کرے۔ کروٹ بدلتے ہوئے یا رحمن، یا رحیم کہدے۔

ہر حال میں نماز: الکافی ۳: ۴۱۱ میں اس آیت کے ذیل میں روایت ہے:

الصحیح یصلی قائماً و قعوداً المریض یصلی جالساً و علی جنوبھم الذی یکون اضعف من المریض الذی یصلی جالساً۔

صحیح سالم شخص اٹھ کر اور بیٹھ کر نماز پڑھے گا، مریض بیٹھ کر نماز پڑھے گا اور جو بیٹھ کر نماز پڑھنے والے مریض سے بھی زیادہ کمزور ہو وہ لیٹ کر نماز پڑھے گا.

ii۔ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ: آسمانوں اور زمین کی خلقت کے بارے میں غور و فکر کا عمل جاری رہتا ہے اور وہ ہر شے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ یعنی وہ صاحبان ذکر وفکر بن جاتے ہیں۔ امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

فکرۃ ساعۃ خیر من عبادۃ سنۃ۔[1] ایک گھڑی کی فکر سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

چونکہ ایک گھڑی کی فکر انسان کی پوری زندگی کا رخ درست کرتی ہے۔

iii۔ صاحبان عقل اللہ کی اس کائنات کے علاوہ خود انسان کی خلقت کے راز کو بھی سمجھ لیتے ہیں۔ وہ درک کرتے ہیں کہ اس عقل وشعور کے مالک انسان کو اللہ نے بے مقصد اور فضول خلق نہیں فرمایا کہ وہ کھائے، پیے، بلا وجہ دکھ درد اٹھائے اور بالآخر کسی نامعلوم منزل کی طرف بے مقصد حرکت کرتے ہوئے نیست و نابود ہو جائے۔ اللہ کی کائنات میں موجود اسرار و رموز کے انکشاف پر اقرار باللسان کرتے ہوئے وہ اس بات کا اعلان کرتے ہیں: سُبۡحٰنَکَ ۔ اے اللہ! تیری ذات اس قسم کی عبث اور فضول باتوں سے پاک ومنزہ ہے۔ اس کائنات کی کوئی شے بے مقصد، فضول اور عبث خلق نہیں ہوئی۔

اس فہم و ادراک کا لازمہ یہ ہے کہ انسان مٹنے والا نہیں ہے۔ وہ ایک ابدی حیات گزارنے کے لیے آیا ہے، جس میں کامیابی کے لیے جہنم سے نجات اور ابدی فلاح ایک نہایت اہم مسئلہ ہے۔ چنانچہ صاحبان عقل اللہ کی بارگاہ میں یہی دعا کرتے ہیں: فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۔

اِنَّکَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَہٗ: جس کو تو نے آتش جہنم میں ڈال دیا اسے رسوا کر دیا۔ قیامت کے دن آتش میں جسمانی عذاب سے، اللہ کے حضور اور لوگوں کے درمیان رسوائی زیادہ کربناک عذاب ہوگا۔ جو ظالمین کی صف میں ہوگا اس کی مدد یا سفارش کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ البتہ جو لوگ سفارش اور شفاعت کے اہل ہیں، ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت ملے گی۔

اہم نکات

۱۔ حکیم و دانا کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

۲۔ کائنات کی ہر شے اللہ کی واضح نشانی ہے۔

رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیۡ لِلۡاِیۡمَانِ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِرَبِّکُمۡ فَاٰمَنَّا ٭

۱۹۳۔ اے ہمارے رب! ہم نے ایک ندا دینے والے کو سنا جو ایمان کی دعوت دے رہا تھا: اپنے پروردگار پر ایمان لے آؤ تو ہم ایمان

---

[1] مصباح الشریعۃ ص۱۱۳

رَبَّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَ کَفِّرۡ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ ﴿۱۹۳﴾

لے آئے تو اے ہمارے رب! ہمارے گناہوں سے درگزر فرما اور ہماری خطاؤں کو دور فرما اور نیک لوگوں کے ساتھ ہمارا خاتمہ فرما۔

تفسیر آیات

۱۔ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِیًا: صاحبان عقل جو ذکر و فکر کی دولت سے سرشار ہوتے اور مقصد تخلیق سے آگاہی حاصل کر لیتے ہیں، وہ شعور کی اس منزل پر فائز ہوتے ہیں کہ ایمان کے منادی کی آواز سن سکتے ہیں۔ یعنی حق کے منادی نے فطرت کے کان میں ایمان کی جو اذان دی ہے، اس آواز کو صاحبان عقل پہچان لیتے ہیں اور اس لا محدود سفر کے لیے ایک رہنما اور ہادی کی ضرورت کا ادراک کرتے اور مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہادیان برحق نے اس زندگی کے لیے جو راستہ بتایا ہے اور جو نظام حیات عنایت کیا ہے، وہ حق پر مبنی وہی اذان ہے جو خالق فطرت نے ابتدا میں دی تھی۔

۲۔ فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا: عقل و شعور کی اس منزل پر آنے کے بعد انسان کو اپنی کوتاہیوں کا بھی ادراک ہو جاتا ہے۔ منصب کی عظمت کے ادراک سے فوراً اپنی کم لیاقتی کا احساس ہوتا ہے۔ سفر کی طوالت کے علم سے توشۂ راہ کی کمی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس لیے درگاہ الٰہی میں فوراً عفو و درگزر کی درخواست کرتا ہے۔

۳۔ وَ تَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ: ابرار کے ساتھ ہمارا خاتمہ فرما۔ یہ دعا اس فہم و شعور کا نتیجہ ہے، جس کے تحت مؤمن اپنے انجام کے لیے فکر مند رہتا ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد ہے:

فاز و اللّٰہ الابرار و خسر الاشرار، اتدری من الابرار؟ ھم الذین خافوہ و اتقوہ و قربوہ بالاعمال الصالحۃ و خشوہ فی امرھم و علانیتھم[۱]

ابرار کامیاب اور اشرار گھاٹے میں ہیں۔ تجھے معلوم ہے ابرار کون لوگ ہیں؟ ابرار وہ لوگ ہیں جو اللہ سے خوف کرتے ہیں، اس کی نافرمانی سے بچتے ہیں اور نیک اعمال کے ذریعے اس کی قربت حاصل کرتے ہیں اور اپنے راز اور علانیہ میں خوف خدا دل میں رکھتے ہیں۔

واضح رہے ائمہ اطہار علیہم السلام ابرار کی فرد اکمل ہیں۔ دوسری حدیث میں آیا ہے:

حب الابرار ثواب الابرار، و حب الفجار فضیلۃ للابرار و بغض الفجار

نیک لوگوں کی نیک لوگوں سے محبت، نیک لوگوں کے لیے ثواب ہے۔ برے لوگوں کی نیک لوگوں سے محبت نیک لوگوں کے لیے فضیلت ہے۔ برے لوگوں

---

۱ مستدرک الوسائل ۱۱: ۲۲۳

الابرار زین للابرار و بغض الابرار للفجار خزی علی الفجار۔[1]

کی نیک لوگوں سے عداوت نیک لوگوں کے زیب و زینت ہے۔ نیک لوگوں کی برے لوگوں سے عداوت برے لوگوں کے لیے رسوائی ہے۔

اہم نکات

۱۔ ابرار کی معیت ایک الٰہی انسان کے ارفع مقاصد میں سے ایک ہے۔

۲۔ حسن استماع ہدایت پانے کی بنیادی شرط ہے۔

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ﴿۱۹۴﴾

۱۹۴۔ پروردگارا! تو نے اپنے رسولوں کی معرفت ہم سے جو وعدہ کیا ہے وہ ہمیں عطا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کرنا، بے شک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

تفسیر آیات

۱۔ رَبَّنَا وَاٰتِنَا: مومن ہمیشہ خوف و امید اور بیم و رجا کے درمیان رہتا ہے۔ اپنے گناہوں کے خوف سے اللہ کی پناہ میں آنے کے بعد امید و رجا کی منزل آتی ہے۔ اللہ نے اپنے انبیاء (ع) کے ذریعے نصرت، عزت اور نجات کا جو وعدہ کر رکھا ہے، اس کی امید کے ساتھ اس کی بارگاہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ وہ بھی اس ایمان و ایقان کے ساتھ کہ اللہ کبھی بھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ ایسی ذات کی بارگاہ سے امید رکھنے میں جو کیف و سرور ہے، وہ ذوق عبودیت رکھنے والے ہی جان سکتے ہیں۔

۲۔ وَلَا تُخْزِنَا: قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کرنا۔ یعنی اگر ہم اپنے گناہوں کے ساتھ محشور ہوں گے تو ہم ان لوگوں کے درمیان رسواء ہوں گے جن کے گناہ تو نے بخش دیے ہیں یا تیرے نیک بندوں کے درمیان ہم رسوا ہوں گے لہٰذا ہم کو نجات دے کہ ہم رسواء نہ ہوں۔

احادیث

گزشتہ پانچ آیات کے بارے میں بہت سی احادیث منقول ہیں جن سے ان آیات کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو مجمع البیان۔ تفسیر نور الثقلین وغیرہ۔

اہم نکات

۱۔ خوف و رجاء ارتقا و تکامل کے دو اہم عناصر ہیں۔

----

[1] الکافی ۲: ۶۴۰

فَاسۡتَجَابَ لَہُمۡ رَبُّہُمۡ اَنِّیۡ لَاۤ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی ۚ بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ فَالَّذِیۡنَ ہَاجَرُوۡا وَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِہِمۡ وَ اُوۡذُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ وَ قٰتَلُوۡا وَ قُتِلُوۡا لَاُکَفِّرَنَّ عَنۡہُمۡ سَیِّاٰتِہِمۡ وَ لَاُدۡخِلَنَّہُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ؕ وَ اللّٰہُ عِنۡدَہٗ حُسۡنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾

۱۹۵۔ پس ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول کر لی (اور فرمایا:) میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کروں گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم ایک دوسرے کا حصہ ہو، جن لوگوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے نیز جو لڑے اور مارے گئے، ان سب کے گناہ ضرور بالضرور دور کروں گا اور انہیں ایسے باغات میں ضرور بالضرور داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی، یہ ہے اللہ کی طرف سے جزا اور اللہ ہی کے پاس بہترین جزا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاسۡتَجَابَ لَہُمۡ رَبُّہُمۡ : صاحبان عقل نے ذکر وفکر کے بعد راز زندگی اور حیات اخروی کو سمجھ لیا۔ وہ رسولوں پر ایمان لے آئے۔ اپنے قصور کا اعتراف کرنے کی منزل پر فائز ہونے کے بعد ان کی دعاؤں کو اللہ نے قبول فرمایا۔

۲۔ لَاۤ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡکُمۡ : اس کے بعد نہایت لطیف انداز میں فرمایا کہ قبولیت اعمال میں عمل اور عمل کنندہ میں کوئی تفریق نہ ہوگی۔ وہ مرد ہو یا عورت، اللہ کے نزدیک سب کو یکساں حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ یہ دونوں مخلوق خدا، انسان اور بندۂ خدا ہونے میں یکساں ہیں اور پھر مرد و زن میں سے ہر ایک، دوسرے سے کسی صورت میں جدا نہیں ہے۔ تخلیق و تربیت وغیرہ کے عمل میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ دونوں اولاد آدم ہیں۔ مرد، عورت اور عورت، مرد سے پیدا ہوتے ہیں: بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۔

۳۔ عورت کا مقام: عورت کے بارے میں قرآنی تعبیر بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ تم ایک دوسرے کا حصہ ہو۔ عورت کے مرد کی طرح انسانی قدروں کا مالک ہونے کے بارے میں قرآن کا کھلا مؤقف ہے، جبکہ نزول قرآن کے زمانے میں بہت سی تہذیبیں عورت کو مرد کے مساوی انسانی مقام دینے کے لیے آمادہ نہ تھیں:

اکثر قدیم قوموں کا یہ نظریہ تھا کہ عورت کا عمل اللہ کے پاس قابل قبول نہیں

ہے۔ یونانی عورت کو شیطانی نجاست سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ بعض رومیوں اور یونانیوں کا خیال تھا کہ عورت نفس کی مالک نہیں ہے، جب کہ مرد غیر مادی نفس انسانی کے مالک ہیں۔ فرانس کے ادارہ تحقیقات نے سنہ ۶۸۵ عیسوی میں طویل بحث وتمحیص کے بعد فیصلہ کیا کہ عورت بھی انسان ہے، تاہم اسے مرد کی خدمت کے لیے خلق کیا گیا ہے۔ ایک سو سال قبل تک انگلستان میں بھی عورت کو انسانی معاشرے کا حصہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔[1]

اس آیت میں بعض اہم نکات کی طرف اشارہ ہے:

۴۔ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا: عمل صالح کی تفصیلات کا ذکر ہے کہ جن اعمال کو اللہ ضائع نہیں فرمائے گا وہ ہیں ہجرت، گھروں سے بے دخلی، راہ خدا میں اذیت کا تحمل۔ اور راہ خدا میں قتال اور قتل ہو جانا۔

۵۔ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ: اللہ کے پاس ایسے نیک عمل انجام دینے والوں کے لیے جو حسن ثواب ہے یعنی ایسے بہترین ثواب ہے جو کسی وصف و بیان میں نہیں آتا نہ کسی نے دیکھا نہ سنا ہوگا نہ ہی کسی کے تصور میں آیا ہوگا۔

امامیہ روایات میں آیا ہے کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی، جب آپ (ع) نے فواطم (چند فاطمہ) کے ہمراہ ہجرت فرمائی۔ فاطمہ بنت اسد، فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور فاطمہ بنت زبیر کے ہمراہ۔[2]

اہم نکات

۱۔ بعض فطری خصوصیات میں مختلف ہونے کے باوجود مرد اور عورت کے درمیان حصول کمال میں کوئی فرق نہیں۔

۲۔ طبیعی تقاضوں میں اختلاف رکھنا نقص نہیں بلکہ حسن تخلیق کی علامت ہے۔

۳ گناہوں اور آلودگیوں سے پاک ہوئے بغیر جنت کے پاکیزہ ماحول میں داخل ہونا ممکن نہیں۔

۴۔ اسلام حقوق نسواں کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾

۱۹۶۔ (اے رسول!) مختلف علاقوں میں کافروں کی آمد ورفت آپ کو کسی دھوکے میں نہ ڈالے.

مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ

۱۹۷۔ یہ چند روزہ عیش ونوش ہے پھر ان کا ٹھکانا

---

[1] المیزان ۴: ۸۹۔۹۰ [2] امالی الطوسی ص ۴۷۶

جَهَنَّمُ ۭ وَبِئۡسَ الۡمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾

جہنم ہوگا جو بدترین جائے قرار ہے۔

لٰکِنِ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّہُمۡ لَہُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا نُزُلًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ؕ وَمَا عِنۡدَ اللّٰہِ خَیۡرٌ لِّلۡاَبۡرَارِ ﴿۱۹۸﴾

۱۹۸۔ لیکن (اس کے برعکس) جو لوگ اپنے رب کا خوف رکھتے ہیں ان کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، یہ اللہ کی طرف سے (ان کے لیے) ضیافت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے نیک لوگوں کے لیے وہ سب سے بہتر ہے۔

تفسیر آیات

سابقہ آیت سے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ مومن کے حصے میں ہجرت، جلا وطنی، قتال کرنا اور قتل ہو جانا ہے، جب کہ کفار کے لیے تمام سامان عیش و نوش اور نعمتوں کی فراوانی ہے۔ کیا اللہ کا یہ نظام حق و باطل کی پہچان نہیں رکھتا کہ باطل پر کرم کرتا ہے اور حق والوں کے ساتھ ناانصافی کرتا ہے؟ اس آیت میں خطاب اگرچہ رسول (ص) سے ہے لیکن تمام مسلمان مقصود کلام ہیں، جنہیں یہ باور کرانا ہے کہ انسان اگر دنیا و آخرت کی مجموعی زندگی کو سامنے رکھے تو یہ چند روزہ زندگی اسے حقیر نظر آئے گی اور اسے فقط وہی لوگ خوشحال نظر آئیں گے جن کی ابدی زندگی آباد و شاد ہوگی اور وہ اللہ تعالیٰ کی ضیافت میں ہوں گے۔

۱۔ لَا یَغُرَّنَّکَ: مختلف علاقوں میں کفار کی آمد و رفت سے مراد ان کی تجارتی سرگرمی اور مال و ثروت کی فراوانی ہے۔ چونکہ مکہ کے مشرکین کی دولت و ثروت کا انحصار تجارت پر تھا اور مدینہ کے یہودی تجارت و زراعت کے ذریعہ دولت بناتے تھے۔

۲۔ مَتَاعٌ قَلِیۡلٌ: جہنم کا عذاب جو ان کے کافروں کے انتظار میں ہے، اس کے ساتھ تقابل کرو تو یہ متاع زندگی نہایت حقیر لگے گی۔

۳۔ لٰکِنِ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا: مگر اہل تقویٰ جو اس دنیا کی رعنائیوں سے محروم ہیں، جو جنت کی نہریں اور نعمتیں ان کے انتظار میں ہیں، ان کے ساتھ تقابل کیا جائے تو یہ محرومیت خود اپنی جگہ ایک نعمت لگے گی۔ چونکہ اگر دین کو دنیوی نعمتوں کی فراوانی اور زندگی کی رعنائیوں میں رکھا جاتا تو لوگ دین کے لیے نہیں، ان نعمتوں کے لیے دین کو اختیار کرتے۔ اس طرح مؤمن اور مفاد پرستوں میں امتیاز نہ رہتا۔ لہٰذا یہ محرومیت ایک امتیاز ہے، جو عظیم نعمت ہے۔

۴۔ نُزُلًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ: جنت کی نعمتوں کی کیفیت اور قیمت کا اندازہ اس جملے سے ہوتا ہے، جس میں فرمایا: یہ سب اللہ کی طرف سے ضیافت کے طور پر ہے۔ ضیافت کی تعبیر کس قدر شیرین ہے اور وہ بھی اللہ

کی ضیافت ہو۔ چونکہ ضیافت میں اکرام و احترام، پیار و محبت، امن و سکون کی فضا ہوتی ہے۔

۵۔ وَمَا عِنۡدَ اللّٰہِ خَیۡرٌ لِّلۡاَبۡرَارِ: نیکی کرنے والوں کے لیے اللہ کے پاس موجود ضیافت کا دنیاوی نعمتوں کے ساتھ موازنہ کبھی نہیں ہو سکتا۔

اہم نکات

۱۔ کفار کی نقل و حرکت اور پر تعیش زندگی سے مؤمن کو دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔

۲۔ حقیقی زندگی اخروی زندگی ہے اور اخروی کامیابی ہی حقیقی کامیابی ہے۔

وَ اِنَّ مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ لَمَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِمۡ خٰشِعِیۡنَ لِلّٰہِ ۙ لَا یَشۡتَرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ؕ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾

۱۹۹۔اور اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ تم پر نازل کیا گیا ہے اور جو کچھ ان پر نازل کیا گیا ہے سب پر اللہ کے لیے خشوع کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی نشانیوں کو تھوڑی قیمت پر فروخت نہیں کرتے، انہی لوگوں کے لیے ان کے رب کے پاس اجر و ثواب ہے، بیشک اللہ بہت جلد حساب چکانے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِنَّ مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ: اہل ایمان کے اجر و ثواب کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ آخرت کی ابدی سعادت کسی خاص جنس یا نژاد یا جغرافیائی حدود تک محدود نہیں بلکہ ہر مومن کے لیے یہ ایک عمومی سعادت ہے۔ چنانچہ اہل کتاب کے لیے یہ دروازہ بند نہیں ہے۔ ان میں سے جو صاحبان ایمان ہیں، انہیں بھی وہی اجر و ثواب اور وہی سعادت میسر ہو گی۔

۲۔ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ: یہ اہل کتاب اس قرآن پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور اپنی غیر محرف توریت و انجیل پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ یعنی اسلامی تعلیمات کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔

۲۔ خٰشِعِیۡنَ لِلّٰہِ: وہ اللہ کے احکام کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ بقول اہل کتاب، ایک امی نبی کو تسلیم کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے بلکہ اللہ کا رسول سمجھ کر اللہ کے سامنے خشوع کرتے ہیں۔

۳۔ لَا یَشۡتَرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ: وہ اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے ابدی سعادت کے مقابلے میں تھوڑی

قیمت نہیں لیتے۔

۴۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ: ایسے مؤمن اہل کتاب کے لیے اللہ کے پاس جو ثواب ہے، وہ اس چیز سے بہت بہتر ہوگا، جو انہوں نے دنیا میں حق کو بیچ کر نہیں لیا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اصۡبِرُوۡا وَصَابِرُوۡا وَرَابِطُوۡا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۲۰۰﴾	۲۰۰۔ اے ایمان والو! صبر سے کام لو استقامت کا مظاہرہ کرو اور مورچہ بند رہو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم کامیابی حاصل کر سکو۔

تشریح کلمات

رَابِطُوۡا: (ر ب ط) المرابطة۔ سرحدوں کے دفاع کے لیے پہرہ دینا۔ مورچہ بند رہنا۔ جہاں حفاظتی دستے متعین رہتے ہوں، اسے رباط کہا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

سورۂ مبارکہ کے آخر میں امت مومنہ کے لیے اس خدائی تحریک کی کامیابی اور جہاد کے چار ارکان کا ذکر ہو رہا ہے:

۱۔ اصۡبِرُوۡا: صبر و تحمل ہر تحریک کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے، لیکن امت مسلمہ نے ایک جامع نظام حیات کی تحریک چلانی ہے۔ یہ راستہ خون کی ندیوں، مخالف آندھیوں، مصائب کے پہاڑوں اور دوستوں کی لاشوں پر سے گزرتا ہے۔ ساتھ دینے والوں کی قلت، دشمنوں کی کثرت، قریبیوں کی بے وفائی اور دشمنوں کی چالاکی، ساتھیوں کی سہل انگاری اور مدمقابل کی نیرنگی جیسے کٹھن مراحل طے کرنے پڑتے ہیں، لہٰذا اس کے اراکین کے صبر و تحمل کا دائرہ بھی جامع اور وسیع ہونا چاہیے۔

اللہ کی نافرمانی سے بچنے کے لیے بھی صبر درکار ہے۔ بھوک اور ناداری میں بھی مال حرام سے اجتناب، غیظ و غضب، جذبۂ انتقام اور قوت کے باوجود تجاوز اور ظلم سے پرہیز اور دیگر ہر قسم کی خواہشات کا مقابلہ بھی صبر و تحمل کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اطاعت و فرمانبرداری کی بنیاد بھی صبر ہے۔ جب تک صبر و حوصلہ نہ ہو، اطاعت رب کا بوجھ اٹھانا ممکن نہ ہوگا۔ خود نماز کے بارے میں ارشاد ہوا:

وَاسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوۃِ ؕ وَ اِنَّہَا لَکَبِیۡرَۃٌ اِلَّا عَلَی الۡخٰشِعِیۡنَ ۙ[1] | اور صبر اور نماز کا سہارا لو اور یہ (نماز) بارگراں ہے، مگر خشوع رکھنے والوں پر نہیں۔

۲۔ وَصَابِرُوۡا: کفار کے مقابلے میں استقامت اور پامردی کا مظاہرہ کرو۔ صبر وتحمل کا مقابلہ صبر و تحمل سے، استقامت کا مقابلہ استقامت سے اور جدوجہد کا مقابلہ جدوجہد سے کرو بلکہ اگر اہل باطل اپنے باطل پر صبر کرتے ہیں تو مسلمانوں کو چاہیے کہ حق کی خاطر زیادہ صبر و استقامت کے ساتھ ان کا مقابلہ کریں۔

۳۔ وَرَابِطُوۡا: دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے مستعد اور مورچہ بند رہو اور اسلام کی جغرافیائی ونظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لیے ہر وقت آمادہ رہو۔ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَ اَعِدُّوۡا لَہُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّۃٍ وَّ مِنۡ رِّبَاطِ الۡخَیۡلِ ...[2] | اور ان (کفار) کے مقابلے کے لیے تم سے جہاں تک ہو سکے طاقت مہیا کرو اور پلے ہوئے گھوڑوں کو (مستعد) رکھو....

قرآن کے اس حکم سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل کو ہر عصر میں عیار دشمنوں سے خطرہ لاحق رہے گا، لہٰذا ہر عصر کے تقاضوں کے مطابق اسلحہ، سامان حرب و دفاع کی تیاری اور فراہمی دینی فرائض میں شامل ہے۔

مرابطہ کے وسیع مفہوم کے مطابق نظریاتی سرحدوں کی حفاظت بھی اس حکم میں شامل ہے۔ چنانچہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نظریاتی محافظین بھی اس آیت میں شامل ہیں۔

احادیث

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

اِصۡبِرُوۡا عَلَی الۡمَصَائِبِ، وَ صَابِرُوۡا عَلَی عَدُوِّکُمۡ و رَابِطُوۡا عَدُوَّکُمۡ ۔[3] | مصیبتوں پر صبر کرو اور اپنے دشمن کے مقابلے میں صبر وتحمل دکھاؤ اور دشمن کے خلاف مورچہ بند رہو۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

عُلَمَاءُ شِیۡعَتِنَا مُرَابِطُوۡنَ فِی الثَّغۡرِ ۔[4] | ہمارے شیعہ علماء سرحدوں کے محافظ ہیں۔

۴۔ وَاتَّقُوا اللّٰہَ: تقویٰ مومن کی زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے۔ حتیٰ کہ ایک مورچہ بند سپاہی کے لیے بھی تقویٰ ایک طاقتور اسلحہ ہے یا یوں کہیے کہ ایک محفوظ مورچہ ہے۔

۱؎ ۲بقرہ:۴۵ ۲؎ ۸انفال:۶۰ ۳؎ مستدرک الوسائل ۱۱: ۲۷۔ التبیان ۴؎ احتجاج ۱:۱۷

اہم نکات

۱۔ اسلامی معاشرے کے افراد دشمنوں کے مقابلے میں سیسہ پلائی دیوار کی طرح باہم مربوط، منظم، ثابت قدم، صابر اور متحمل مزاج ہوتے ہیں۔

۲۔ نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کو ناقابل تسخیر بنانا مسلمانوں کا اجتماعی اور ریاستی فریضہ ہے۔

سُورَةُ النِّسَاءِ

ترتیب نزولی کے اعتبار سے یہ سورہ، سورۂ ممتحنہ کے بعد نازل ہوا۔ صرف آیت نمبر ۵۸ مکہ میں نازل ہوئی، باقی سورہ مدینہ میں نازل ہوا۔

مضامین اور مباحث

اس سورۂ مبارکہ میں اسلامی معاشرے کی تشکیل کے اہم مراحل نظر آتے ہیں کہ دور جاہلیت کے پست ترین معاشرے کو اعلیٰ ترین انسانی معاشرہ بنانے کے لیے بتدریج کس قسم کی حیرت انگیز حکمت عملی اختیار کی گئی اور دور جاہلیت کے آثار پر مشتمل کثیف ملبے کو ہٹا کر اس کی جگہ ایک جامع اور انسان ساز معاشرے کی بنیاد کس طرح رکھی گئی۔ اس راہ میں انتہائی تکلیف دہ مشکلات پیش آئیں اور بے شمار معرکے سر کرنے پڑے:

i۔ جس معاشرے میں خون انسان کی حرمت کا کوئی قائل نہ تھا، اس میں مال مسلم کو بھی خون مسلم کے برابر حرمت مل گئی:

حرمة مال المسلم کحرمة دمه ۔[1]　مسلمان کے مال کو وہی حرمت حاصل ہے جو اس کے خون کو ہے۔

چنانچہ یتیم کے مال اور دیگر ناجائز طریقوں سے لوگوں کے اموال میں تجاوز و تصرف کو ممنوع قرار دیا گیا۔

ii۔ جاہلانہ معاشرے میں وراثت کی تقسیم میں طاقتور کو بڑا اختیار حاصل تھا اور کمزور کو محروم رکھا جاتا تھا۔ اسلام نے عدل و انصاف کی بنیاد پر میراث کی تقسیم کو انسانی تقاضوں کے عین مطابق بنایا۔

iii۔ قرآن نے عدل و انصاف اور احترام آدمیت پر مبنی نظام قائم کرنے کے لیے مرد و زن کی تفریق کے پرانے فرسودہ تصورات کو بہ یک جنبش قلم مسترد کرتے ہوئے مرد و زن کو ایک تنے کی دو شاخیں قرار دیا، کیونکہ دونوں نفس واحدہ سے خلق ہوئے ہیں۔

---

[1] بحار الانوار ۲۹: ۷-۴۰، الجامع الصغیر للسیوطی حرف الحاء حدیث ۷: ۳۷

iv۔ ایک عادلانہ نظام کے قیام کے لیے بے لچک قوانین کی تدوین کا تصور پیش کیا:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ...[1] یقیناً اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

حتیٰ کہ ایک سازشی یہودی کے ساتھ بے عدالتی کو بھی قرآن نے بہتان اور گناہ عظیم قرار دیا ہے۔

v۔ اس سورۂ مبارکہ کے ذریعے مسلمانوں میں قیادت کی اطاعت کا شعور پیدا کیا گیا اور جماعتی نظم ونسق قائم کرنے کے لیے ایک دستور فراہم کیا گیا۔ (اطاعت اولی الامر)

vi۔ اس سورے میں احد کی شکست کے بعد پیش آنے والے نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں کو بیدار رہنے کی تلقین بھی موجود ہے۔

vii۔ اس سورے میں عائلی نظام کی تشکیل و تنظیم کے لیے رہنما اصول اور ازدواجی قوانین نہایت جامع صورت میں پیش کیے گئے ہیں۔

viii۔ اسلامی اخلاقیات کا ایک قابل توجہ حصہ اس سورۂ مبارکہ میں مذکور ہے۔

ix۔ معاشی مسائل پر بھی توجہ دی گئی ہے۔

x۔ تعزیری قوانین کا ایک معتد بہ حصہ بھی اس سورے میں موجود ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بنام خدائے رحمن رحیم

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ خَلَقَ مِنۡہَا زَوۡجَہَا وَ بَثَّ مِنۡہُمَا رِجَالًا کَثِیۡرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِہٖ وَ الۡاَرۡحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیۡکُمۡ رَقِیۡبًا ①

۱۔ اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بکثرت مرد و عورت (روئے زمین پر) پھیلا دیے اور اس اللہ کا خوف کرو جس کا نام لے کر ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور قرابتداروں کے بارے میں بھی (پرہیز کرو)، بے شک تم پر اللہ نگران ہے.

تشریح کلمات

نَّفۡسٍ: (ن ف س) کسی شے کی ذات کو نفس کہا جاتا ہے۔ جس سے انسان کی ذات تشکیل پاتی ہے

---

[1] ۱۶ النحل: ۹۰

وہ انسان کا نفس ہے۔ یعنی روح و جسم کا مجموعہ۔ البتہ صرف روح کے لیے بھی نَفس کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔

بَث: (ب ث ث) متفرق، منتشر، پراگندہ کرنا۔

زَوج: (ز و ج) جن چیزوں میں نر و مادہ پایا جاتا ہے، ان میں سے ہر ایک، دوسرے کا زوج کہلاتا ہے۔

اَرحام: (ر ح م) رحم کی جمع۔ عورت کا رحم بطور استعارہ قرابت اور رشتہ داری کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ تمام اقرباء ایک رحم سے پیدا ہوتے ہیں۔

رَقیب: (ر ق ب) نگران۔

تفسیر آیات

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ : یہ خطاب تمام انسانوں سے ہے، جن کا تعلق ایک ہی رب سے ہے۔ تمام انسانوں کا ارتقا و تکامل اور ان کی تربیت، مقام ربوبیت سے مربوط ہے۔

خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ : تمام انسانوں کا تعلق ایک ہی اصل اور ایک ہی حقیقت سے ہے۔ بقول سعدی:

بنی آدم اعضائے یکدیگرند
که در آفرینش ز یك گوهرند

بنی نوع انسان کو یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ ان کا رب ایک ہے اور ان کی اصل حقیقت بھی ایک ہی ہے۔ ربوبیت کا حق یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کیا جائے۔ وحدت آدمیت کا حق صلہ رحمی اور باہمی محبت و برادری اور برابری ہے۔

تمام افراد بشر کا تعلق نفس واحدہ سے ہے۔ یہ تصور ان بہت سے قدیم و جدید المیوں کا حل پیش کرتا ہے جو طبقاتی، نژادی، علاقائی، لسانی اور رنگ و نسل کی تفریق کے باعث انسانیت کو درپیش رہے ہیں۔ چنانچہ ہمارے عہد میں بھی جدید جاہلیت نے ان تفرقوں کی بنیاد پر ظلم و بربریت کی وہ داستانیں رقم کی ہیں جن کی وجہ سے قدیم جاہلیت کا سر بھی شرم سے جھک گیا ہے۔

وَّخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا : یعنی جوڑا بھی اسی نفس سے پیدا کیا، کسی اور نوع یا جنس سے نہیں۔ مِنۡهَا کی ضمیر نَفۡس کی طرف جاتی ہے۔ مقصود وہی نفس واحدہ ہے، جس سے تمام انسان پیدا ہوئے ہیں۔ جب کہ دوسری جگہ فرمایا:

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا ...[1]	اور اللہ نے تمہارے لیے تمہاری جنس سے بیویاں بنائیں۔

----

[1] ۱۶ نحل: ۷۲

لٰہذا اس آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت حوا حضرت آدم (ع) سے پیدا ہوئی ہیں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت حوا کو حضرت آدم (ع) کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے۔

قرآن نے عورت اور مرد کو اصل واحد کے ساتھ مربوط کر کے عورت کو اس کے فطری اور طبیعی حقوق دے کر:

الف: قدیم جاہلیت کے اس فرسودہ تصور کو رد کر دیا جس کے تحت عورت سے اس کی انسانیت سلب کی گئی تھی اور اسے نجس اور شر محض قرار دیا گیا تھا۔

ب: جدید جاہلیت کے اس ناپاک تصور کو بھی مسترد فرما دیا جس کے تحت عورت سے اس کی نسوانیت سلب کر کے اسے مردوں کی شبیہ قرار دیا گیا۔

ج: قرآن عورت سے نہ تو اس کی انسانیت سلب کرتا ہے اور نہ ہی نسوانیت بلکہ اسے مرد کا زوج قرار دیتا ہے، کیونکہ انسان ہونے کے لحاظ سے یہ دونوں برابر ہیں، لیکن زوجین ہونے کے ناطے دونوں کے اپنے اپنے تقاضے ہیں۔

وَ بَثَّ مِنۡہُمَا رِجَالًا کَثِیۡرًا وَّ نِسَآءً : انسانی نسل کو متعدد خاندانوں کے ذریعے نہیں پھیلایا، بلکہ آدم (ع) و حوا پر مشتمل ایک ہی خاندان سے افزائش نسل ہوئی۔ اسی لیے تمام انسانوں کے فطری اور طبیعی تقاضے ایک جیسے ہیں۔ بنا برایں نظام حیات اور قانون زندگی بھی ایک ہی ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ حضرت آدم (ع) و حوا سے نسل انسانی کس طرح پھیلی؟ تو اس کی وضاحت قرآن میں نہیں ہے اور نہ ہی ہمارے لیے اس تفصیل کا سمجھنا ضروری اور مفید ہے۔

وَ اتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِہٖ وَ الۡاَرۡحَامَ: اس آیت میں تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دوبارہ آیا ہے لیکن اس کے باوجود تکرار مکرر لازم نہیں آتا۔ کیونکہ آیت کی ابتدا میں مقام ربوبیت کے لحاظ سے تقویٰ کا حکم دیا تھا اور یہاں مقام خالقیت کے نقطہ نظر سے تقویٰ کا حکم ہے۔

آیت کا ربط کچھ اس طرح سے ہے: اس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تمہیں نفس واحدہ سے خلق کیا اور عورتوں کو بھی اسی نفس سے خلق فرمایا۔ تمہاری کثرت بھی ایک ہی خاندان سے وجود میں آئی۔ اس تمہید کے بعد فرمایا: اللہ کے بارے میں تقویٰ اختیار کرتے ہوئے حقوق اللہ ادا کرو اور قرابتداروں کے بارے میں تقویٰ اختیار کرتے ہوئے حقوق الناس ادا کیا کرو۔

صلہ رحمی: یعنی رشتہ داروں اور قرابتداروں سے اچھے روابط رکھو۔ ان کے دکھ درد میں شریک رہو۔ اس کی ضد قطع رحمی ہے۔ بنا برایں صلہ رحمی کے حکم کا دوسرا رخ یہ ہے کہ رشتہ داروں سے قطع تعلق انتہائی سنگین جرم ہے۔

اسلام اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت اور رحمت ہے۔ یہ رحمت فرد، امت اور معاشرے سب کو یکساں

شامل ہے۔ اسلام کے جامع نظام حیات میں کوئی ایسا گوشہ نہیں ملتا جسے اس کا مناسب مقام نہ ملا ہو۔ نہایت قابل توجہ بات ہے کہ صلہ رحمی کو اللہ تعالیٰ نے یہ مقام اور اہمیت دی ہے کہ خود اپنی ذات کا تقویٰ اختیار کرنے کے حکم کے فوراً بعد صلہ رحمی کا حکم صادر فرمایا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک تمام انسانوں کے عمومی تعلقات اور قریبی رشتہ داروں کے خصوصی تعلقات کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔

توجہ طلب نکتہ: جن کے دلوں میں آل محمد صلوات اللہ علیہ وعلیہم اجمعین کی عداوت موجزن ہے، ان کے تعصب اور عناد کے اثرات عربی ادب میں نمایاں نظر آتے ہیں بلکہ قواعد عربیہ میں بھی سرایت کر گئے ہیں۔ چنانچہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجنے کے سلسلے میں و آلہ کو علیہ پر عطف کرنے کو عربی قواعد کے خلاف اور سنی اور شیعہ کے درمیان وجہ امتیاز قرار دیتے ہیں۔ جب کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ حرف جر کے اعادے کے بغیر مجرور ضمیر پر اسم ظاہر کا عطف کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ یعنی صلی اللّٰہ علیہ و آلہ کہنا درست ہے یا نہیں؟ اہل بصرہ ایسے عطف کو حرف جر کے اعادے کے بغیر صحیح نہیں سمجھتے۔ جب کہ اہل کوفہ یونس، اخفش، زجاج وغیرہ اسے جائز اور صحیح قرار دیتے ہیں او ر اس پر مورد بحث آیت سے استشہاد بھی کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس، حضرت عبد اللہ بن مسعود، قاسم، مجاہد، قتادہ اور دیگر مشاہیر نے اس آیت میں وَ الۡاَرۡحَام کی میم کی قرائت جر کے ساتھ کی ہے اور مشہور قراء سبعہ میں سے حضرت حمزہ کی قرائت بالجر ہے۔ یعنی حرف جر ''باء'' کے اعادے کے بغیر الارحام کو بہ کی ضمیر پر عطف کر کے یوں قرائت کی ہے: تَسَآءَلُوۡنَ بِہٖ وَ الۡاَرۡحَامِ ۔

اگر اصحاب و تابعین کی قرائت نیز مسلّم اور متواتر قراء سبعہ کی قرائت سے عربیت ثابت نہیں ہوتی تو قرائت اور عربیت ثابت کرنے کا کوئی اور ذریعہ موجود ہی نہیں ہے، بلکہ جمہور اہل سنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سات قرائتوں میں سے کسی ایک قرائت کے ساتھ نماز پڑھنا صحیح ہے۔ بنا برایں جو بات صحت نماز کے لیے کافی ثابت ہو، کیا وہ صحت عربیت کے لیے کافی نہیں ہے؟ مزید وضاحت کے لیے غرائب القرآن نیشاپوری ج ۴ ص ۱۷۹، تفسیر قرطبی ج ۵ ص ۴۵ اور تفسیر کبیر فخر الدین رازی ج ۹ ص ۱۶۳ ملاحظہ فرمائیں۔

اسی طرح آیہ : قُلۡ قِتَالٌ فِیۡہِ کَبِیۡرٌ ؕ وَ صَدٌّ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ کُفۡرٌۢ بِہٖ وَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ۔۔۔۔[1] کے بارے میں ایک مؤقف یہ ہے کہ المسجد الحرام کا کلمہ بہ کی ضمیر پر عطف نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں و کفر بہ کا فاصلہ لازم آتا ہے جو درست نہیں ہے۔ جب کہ ابن مالک نے شواہد التوضیح صفحہ ۵۴ میں، ابو حیان نے اپنی تفسیر ج ۲ ص ۱۴۷ میں اور فراء نے المسجد الحرام کو بہ پر عطف قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ اس مطلب پر متعدد آیات، احادیث اور عربی اشعار سے بھی استشہاد کیا جاتا ہے، جن میں سے ہم فقط ایک مشہور حدیث نبوی (ص) کو بطور شاہد پیش کرتے ہیں:

---

[1] ۲ بقرہ: ۲۱۷۔ کہد یجئے: اس میں لڑنا سنگین برائی ہے لیکن راہ خدا سے روکنا، اللہ سے کفر کرنا، مسجد الحرام کا راستہ روکنا ....۔

المسلم من سلم المسلمون من لسانه و یده۔[1]

مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمانوں کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

موجودہ نسل: اس کرۂ ارض پر موجود انسانی نسل اولین ارضی مخلوق نہیں ہے، جیسا کہ عام خیال کیا جاتا ہے، بلکہ اس سے پہلے بے شمار نسلیں گزر چکی ہیں۔ موجودہ نسل کی عمر تقریباً آٹھ یا دس ہزار سال سے زیادہ نہیں ہے، جب کہ اب تک ایک لاکھ سال پرانی انسانی مخلوق کا کھوج لگایا جا چکا ہے۔

احادیث

جناب رسول اکرم (ص) سے روایت ہے کہ آپ (ص) نے فرمایا:

قال اللّٰہ تعالیٰ: اَنَا الرَّحۡمَنُ خَلَقۡتُ الرَّحِمَ وَ شَقَقۡتُ لَهَا اسۡماً مِنۡ اَسۡمَائِی فَمَنۡ وَ صَلَهَا وَ صَلۡتُهُ وَ مَنۡ قَطَعَهَا قَطَعۡتُهُ۔[2]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں رحمٰن ہوں اور میں نے رحم کو خلق کیا اور اپنے نام سے اس کا نام بنایا۔ لہٰذا جو صلہ رحمی رکھے گا میں بھی اس سے صلہ رکھوں گا اور جو قطع رحمی کرے گا میں بھی اس سے قطع تعلق کروں گا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

لعلك ترى ان اللّٰه لم يخلق بشراً غيركم؟ بلى و اللّٰه لقد خلق الف الف عالم و الف الف آدم، انت فی آخر تلك العوالم و اولئك الآدميين۔[3]

شاید تمہارا خیال یہ ہے کہ اللہ نے تمہارے سوا کسی بشر کو خلق نہیں فرمایا، قسم بخدا اللہ نے تم سے پہلے دس لاکھ عالم اور دس لاکھ آدم پیدا کیے ہیں جن میں تم سب سے آخری عالم اور آخری آدم کی نسل ہو۔

اہم نکات

۱۔ قدیم جاہلیت نے عورت سے اس کی انسانیت جب کہ جدید جاہلیت نے عورت سے اس کی نسوانیت سلب کی ہے۔

۲۔ تقوائے الٰہی کے ساتھ صلہ رحمی کا ذکر اس کی اہمیت کی واضح دلیل ہے۔

وَ اٰتُوا الۡیَتٰمٰۤی اَمۡوَالَهُمۡ وَ لَا تَتَبَدَّلُوا الۡخَبِیۡثَ بِالطَّیِّبِ ۪ وَ لَا

۲۔ اور یتیموں کا مال ان کے حوالے کرو اور پاکیزہ مال کو برے مال سے نہ بدلو اور ان کا مال اپنے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان۔ اصول الکافی ۲ : ۲۳۳۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے۔
[2] مستدرك الوسائل ۱۵ : ۲۴۲۔ مجمع البیان
[3] بحار الانوار ۲۵: ۲۵

تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَہُمۡ اِلٰۤی اَمۡوَالِکُمۡ ؕ اِنَّہٗ کَانَ حُوۡبًا کَبِیۡرًا ② مال کے ساتھ ملا کر نہ کھایا کرو، ایسا کرنا یقیناً بہت بڑا گناہ ہے۔

تشریح کلمات

الیَتٰمٰی: (ی ت م) یتیم کی جمع ہے۔ یتیم وہ نابالغ بچہ ہے جو شفقت پدری سے محروم ہو جائے۔ مجازاً ہر یکتا اور بے مثل چیز کو یتیم کہا جاتا ہے۔ اسی لیے گوہر یکتا کو درۃ یتیمة کہتے ہیں۔

حُوب: (ح و ب) جرم کا ارتکاب کرنا۔

تفسیر آیات

وَاٰتُوا الۡیَتٰمٰۤی اَمۡوَالَہُمۡ: یتیم جب نابالغ ہوں تو ان کا مال ان پر خرچ کرو اور جب بالغ ہو جائیں تو ان کا مال انہیں واپس کر دو۔

وَلَا تَتَبَدَّلُوا: یتیموں کے عمدہ اور اچھے مال کو اپنے برے اور ناقص مال سے نہ بدلو۔

وَلَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَہُمۡ: یتیم کا مال یتیم پر خرچ کرو اور اپنا مال علیحدہ کھاؤ۔ دونوں کو ملا کر کھانے سے پر زیادتی کا احتمال باقی رہتا ہے۔ اگر ملانے میں یتیم کے لیے کوئی ضرر نہیں ہے تو ملانا جائز ہے۔

وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی فَانۡکِحُوۡا مَا طَابَ لَکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَۃً اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ ؕ ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَلَّا تَعُوۡلُوۡا ③

۳۔ اور اگر تم لوگ اس بات سے خائف ہو کہ یتیم (لڑکیوں) کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو جو دوسری عورتیں تمہیں پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین یا چار چار سے نکاح کر لو، پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ ان میں عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی عورت یا لونڈی جس کے تم مالک ہو کافی ہے، یہ ناانصافی (اور ظلم) سے بچنے کی قریب ترین صورت ہے۔

تشریح کلمات

تَعُوۡلُوۡا: (ع و ل) عول۔ ظلم و جور۔ حاکم جب ظلم کرتا ہے تو کہتے ہیں: عال الحاکم۔

تفسیر آیات

زمانہ جاہلیت میں قبائلی اور دیگر جنگوں کی وجہ سے اکثر بچے یتیم ہوجاتے تھے۔ ان میں سے جو یتیم بچیاں لوگوں کی سرپرستی میں آ جاتی تھیں، وہ ان کے مال و دولت یا حسن و جمال کی وجہ سے ان سے شادیاں کر لیتے اور ان کے مال و دولت پر قابض ہوجاتے تھے، پھر انہیں طلاق دے کر گھر سے نکال دیتے تھے کہ اب یہ نہ تو نکاح کے قابل ہیں، نہ ان کے پاس مال و دولت باقی ہے اور نہ ہی ان کا کوئی حامی و ناصر ہے۔

قرآن نے اس جاہلانہ رسم و رواج اور یتیموں پر روا رکھے جانے والے ان مظالم کے خلاف سخت لہجے میں آواز اٹھائی اور مال یتیم کھانے کو دوزخ کی آگ سے پیٹ بھرنے سے تشبیہ دی۔ اس آیۂ شریفہ میں اسی سلسلے کا حکم دیا جا رہا ہے:

☆ یتیموں کا مال ان کے حوالے کر دو۔

☆ ان کے عمدہ مال کو اپنے ناقص مال سے نہ بدلو۔

☆ ان کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ۔ یہاں تک کہ اگر بے انصافی کا خوف ہے تو ان یتیموں سے شادی کرنے سے بھی پرہیز کرو۔

☆ ان کی جگہ دوسری عورتوں سے نکاح کر سکتے ہو۔ دو دو، تین تین اور چار چار تک سے۔ ان عورتوں کے درمیان بھی عدل و انصاف شرط ہے۔ اگر انصاف نہیں کر سکتے تو صرف ایک ہی پر اکتفا کرو۔

مَثۡنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ: اس سے تعدد زوجات کی حدبندی ہوگئی کہ زمان جاہلیت کی طرح بیشمار بیویاں نہیں رکھ سکتے اور نہ ہی دیگر نظریات کی طرح صرف ایک ہی کی پابندی ہے، بلکہ چار تک کی مشروط اجازت ہے کہ بیویوں میں عدل و انصاف قائم کرسکو تو اجازت ہے، ورنہ نہیں۔

شیعہ امامیہ کے ہاں اس پر اجماع قائم ہے کہ عقد دائمی میں چار زوجات سے زیادہ جائز نہیں ہے۔ حتیٰ اگر چوتھی زوجہ کو طلاق ہوگئی ہے تو اس کی عدت میں کسی عورت سے عقد جائز نہیں ہے۔ اہل سنت کے ہاں بھی یہ مسئلہ تقریباً اجماعی ہے۔ صرف شوکانی، قنوجی[1] اور دیگر چند لوگوں نے چار سے زیادہ کو جائز قرار دیا ہے۔[2]

تعدد زوجات اور عدل و انصاف: قرآن تعدد ازواج کی اجازت کو عدل سے مشروط کرتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص تعدد زوجات کی اجازت سے فائدہ اٹھا کر ایک سے زیادہ بیویاں رکھے اور عدل کی شرط پوری نہ کرے تو اس سے یہ اجازت واپس لے لی جائے گی اور شرعی عدالت اس فیصلے کی مجاز ہے۔

۱؎ حاشیہ مراتب الاجماع ابن تیمیۃ ص۶۳ ۲؎ ملاحظہ ہو شرح فتح القدیر جلد دوم ص۳۷۹

ایک اعتراض: قرآن نے پہلے تعدد زوجات کے لیے عدل کی شرط لگائی، پھر دوسری جگہ فرمایا: بیویوں کے ساتھ پورا عدل و انصاف کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ اجازت عملاً منسوخ ہے اور اسلام میں تعدد زوجات جائز نہیں ہے۔

جواب: ممکن ہے کہ انسان اپنے قلبی رجحان میں مساوات قائم نہ رکھ سکتا ہو، لیکن عملی سلوک میں انصاف فراہم کر سکتا ہے۔ آیت پہلی بات کی نفی کرتی ہے، لیکن دوسری بات کا مطالبہ کرتی ہے۔ چنانچہ سورہ نساء میں فرمایا:

وَلَنۡ تَسۡتَطِيۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَيۡنَ النِّسَآءِ	اور تم بیویوں کے درمیان پورا عدل قائم نہ کر سکو گے
وَلَوۡ حَرَصۡتُمۡ فَلَا تَمِيۡلُوۡا كُلَّ الۡمَيۡلِ	خواہ تم کتنا ہی چاہو، لیکن ایک طرف اتنے نہ جھک
فَتَذَرُوۡهَا كَالۡمُعَلَّقَةِ ....[1]	جاؤ کہ (دوسری کو) معلق کی طرح چھوڑ دو ....

یعنی اگر کوئی شخص اپنی چہیتی بیوی کے لیے جو وقت دیتا ہے یا جو وسائل فراہم کرتا ہے، عملاً دوسری کو اس سے محروم نہ رکھے تو یہی عدل ہے۔

ایک سے زیادہ بیویوں میں عدالت ممکن نہ ہونے کی صورت میں دو حل پیش کیے گئے ہیں:

الف: صرف ایک ہی بیوی پر اکتفا کی جائے۔

ب: اگر ایک پر اکتفا کرنا ممکن نہ ہو تو لونڈیوں کے ذریعے مسئلے کو حل کیا جائے۔ کیونکہ لونڈیوں میں بعض ایسی سہولتیں موجود ہیں جن سے کسی پر ظلم و زیادتی لازم نہیں آتی (لونڈیوں سے نکاح کرنے کا حکم آیندہ بیان ہو گا)۔

تعدد زوجات: اسلام نے تعدد زوجات کی اجازت مخصوص حالات اور خاص شرائط و حدود کے تحت دی ہے، جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔

۲۴۷
فطری تقاضے: فطری طور پر مرد اور عورت کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ مساوات یہ ہے کہ ان تقاضوں کے مطابق حقوق دیے جائیں۔ اگر ان تقاضوں کو مدنظر رکھے بغیر برابر اور مشابہ حقوق دیے جائیں تو یہ ناانصافی ہو گی۔ مثلاً خود انسانوں میں بوڑھوں، بچوں اور جوانوں کے حقوق یکساں نہیں ہوتے۔ مساوات یہ ہے کہ ان طبقوں میں سے ہر ایک کو اس کے تقاضوں کے مطابق حقوق دیے جائیں۔

چنانچہ مرد و زن میں مرد، طلب و نیاز رکھتا ہے اور عورت محبت و ناز۔ مرد بندۂ شہوت ہے اور عورت اسیر محبت۔ مرد جنگجو ہوتے ہیں اور عورت پناہ جو۔ البتہ عورت جنگجو مرد کو پسند کرتی ہے۔ مرد جہانگیر ہوتا ہے اور عورت مردگیر۔ مرد مقام و شخصیت کا خواہاں ہوتا ہے اور عورت مرد کے دل میں نفوذ کرنے کی خواہاں ہوتی ہے۔ عورت کی فطرت میں یہ خواہش ودیعت ہوتی ہے کہ اسے کسی مرد کی سرپرستی میسر ہو، جب کہ سرپرستی کرنا

---

[1] ۴ نساء: ۱۲۹

مرد کی سرشت میں ودیعت کیا گیا ہے۔

ماہرین کہتے ہیں کہ عورت ایسے مرد کو زیادہ پسند کرتی ہے جو متعدد عورتوں سے عاشقانہ تعلقات رکھتا ہو، جب کہ مرد ایسی عورت سے نفرت کرتا ہے جو بیک وقت کئی مردوں سے عاشقانہ تعلقات رکھتی ہو۔ علاوہ ازیں جنسی آمیزش کے وقت مرد کروڑوں جرثومے خارج کرتا ہے، جب کہ عورت صرف ایک تخم پیدا کرتی ہے۔ ماہرین کے بقول مرد کی طبیعت میں تنوع پرستی موجود ہے، جب کہ عورت تنوع پرستی سے بیزار ہوتی ہے۔

اعتراض: تعدد زوجات میں عورتوں کے جذبات مجروح ہوتے اور انتقام جوئی کے جذبات ابھرتے ہیں جن سے عائلی نظام درہم برہم ہوجاتا ہے۔

جواب: جذبات ماحول اور تربیت کے تابع ہوتے ہیں۔ جو معاشرہ تعدد زوجات کا فلسفہ قبول کرتا اور اس کی ضرورت کا احساس کرتا ہے، اس میں کسی کے جذبات مجروح نہیں ہوتے۔ البتہ عورت کے لیے سب سے اہم مسئلہ مرد کا دل جیتنا ہے۔ جب مرد کسی اور عورت کو دل دیتا ہے تو عورت کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی شکست نہیں ہوتی کہ وہ مرد کا دل جیت نہ سکی اور کسی دوسری عورت نے اس مرد کے دل پر شبخون مارا۔ اس احساس شکست کے نتیجے میں انتقام اور کینے کے جذبات کا دل میں ابھرنا ایک طبیعی امر ہے۔

لیکن اگر مرد عورت سے بے وفائی کیے بغیر ایک جواز کے تحت دوسری عورت سے شادی کرے تو پہلی عورت کو احساس شکست نہیں ہو گا بلکہ تجربات شاہد ہیں کہ جب عورت کو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ شوہر دوسری عورت کی احتیاج رکھتا ہے تو خود اس کے لیے خواستگاری کا کام انجام دیتی ہے۔ اعتراض کرنے والوں کے اپنے معاشرے میں مردوں کی جنسی بے راہ روی خصوصاً ہم جنس بازی سے کیا ان کی اپنی عورتوں کے جذبات مجروح نہیں ہوتے؟

اعتراض: تعدد زوجات طبیعی تقاضوں کے خلاف ہے۔ مختلف اقوام و قبائل کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں پیدائش کے اعتبار سے مردوں اور عورتوں کی تعداد مساوی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فطرت نے بھی ایک مرد کے لیے ایک عورت تجویز کی ہے۔

جواب: ازدواجی زندگی صرف اعداد و شمار سے ہی مربوط نہیں ہے بلکہ یہاں چند دیگر وجوہات بھی قابل توجہ ہیں:

i۔ عورتیں مردوں کی نسبت زیادہ عمر پاتی ہیں۔

ii۔ مرد عموماً جنگوں اور دیگر حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں اور بہت سی عورتیں بے سرپرست رہ جاتی ہیں۔

iii۔ مردوں کی تولیدی طاقت عورتوں سے دوگنی ہوتی ہے۔ یعنی عورتیں پچاس سال میں بانجھ ہو جاتی ہیں، جب کہ مرد سو سال تک قابل تولید رہتے ہیں۔ اگر تعدد زوجات کی اجازت نہ ہوتو مرد کو صرف نصف عمر تک تولید نسل کا حق ملتا ہے۔

iv۔ لڑکیاں لڑکوں سے پہلے نکاح کے قابل ہو جاتی ہیں۔ مغربی دنیا شاہد ہے کہ وہاں قانونی بلوغت کو پہنچنے تک شاذ و نادر ہی کوئی لڑکی کنواری رہتی ہے اور کنواری دلہن کا حصول جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

v۔ اسلام نے تعدد زوجات کو واجب قرار نہیں دیا بلکہ اس قانون پر چند ضرورت مند لوگ ہی عمل کرتے ہیں۔

vi۔ اعداد و شمار کے مطابق مردوں اور عورتوں کی تعداد پیدائش کے وقت برابر ہونے کے باوجود یکساں عرصے میں ازدواج کے قابل مردوں کی نسبت ازدواج کے قابل عورتوں کی تعداد کہیں زیادہ ہو جاتی ہے۔

اعتراض: تعدد زوجات کی اجازت سے مردوں کی ہوسرانی کو کھلی اجازت مل جاتی ہے۔

جواب: درحقیقت تعدد زوجات کی اجازت سے مرد کی ہوسرانی کو جائز حدود میں پابند کیا گیا ہے۔ کیونکہ اولاً مردوں میں جنسی خواہشات عورتوں کی نسبت بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ دوسری طرف عورت اپنے اوقات میں سے صرف ایک تہائی وقت میں جنسی تعلقات کے قابل رہتی ہے۔ مثلاً ایام حیض، ایام حمل، ایام ولادت، ایام رضاعت اور ایام بیماری وغیرہ میں وہ جنسی تعلقات کے قابل نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ جن معاشروں میں تعدد زوجات کی اجازت نہیں ہے، وہاں آئے دن ہوسرانی کی بدترین وارداتیں پیش آتی رہتی ہیں۔

بعض مغربی مفکرین نے اعتراف کیا ہے کہ مسیحی معاشروں میں زنا کو عام کرنے کا سب سے بڑا محرک چرچ کی طرف سے تعدد زوجات پر پابندی عائد کرنا ہے۔[1]

اعتراض: تعدد زوجات کی اجازت سے عورت کا وقار مجروح ہوتا ہے اور مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی قدر و قیمت ایک چوتھائی رہ جاتی ہے۔ یہ اسلامی اقدار کے مطابق بھی درست نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام نے میراث و شہادت میں ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتیں رکھی ہیں۔

جواب: ازدواج میراث، شہادت، مرد و عورت کے وقار اور قدر و قیمت سے مربوط نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اسلام عورت کے لیے ہر جگہ ایک جیسی قیمت کا تعین کرتا، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ مثلاً مرنے والے کی ماں کو میراث میں باپ کے برابر حصہ ملتا ہے، جب کہ اس کی لڑکی

---

[1] المیزان ۴: ۹۔

کو باپ سے زیادہ حصہ ملتا ہے نیز یہ ایک واضح غلط فہمی ہے کہ تعدد زوجات کو مردوں کے ساتھ رعائت خیال کیا جاتا ہے، جب کہ درحقیقت یہ عورتوں کے ساتھ رعایت اور ان کے انسانی حقوق کی پاسداری ہے۔ اسلام اگر مرد کو رعایت دیتا تو مغرب والوں کی طرح مردوں کو یہ اجازت دیتا کہ وہ عورتوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنائیں اور اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے انہیں کھلونا بنائے رکھیں۔ مرد کے لیے زوجات کے عنوان سے عورتوں کو پالنے، انہیں انسانی حقوق دینے اور اپنے زیر سایہ رکھنے سے ہزار درجہ آسان ہے کہ وہ بغیر کسی زحمت کے عورتوں سے اپنی ہوس پوری کریں، جس کے لیے کسی قانون زوجیت کی ضرورت نہیں رہتی۔ خواہ مرد ہو یا عورت، ازدواجی زندگی ایک انسانی حق ہے لیکن عورت اس حق کی زیادہ محتاج ہے۔ کیونکہ ازدواجی زندگی میں مرد کے مادی اور جنسی تقاضے زیادہ اور انسانی تقاضے کم ہوتے ہیں، جب کہ عورت کے انسانی تقاضے زیادہ اور مادی تقاضے کم ہوتے ہیں۔ مرد ازدواجی زندگی سے محروم ہونے کی صورت میں بھی اپنے مادی تقاضے ناجائز ذرائع سے پورے کر سکتا ہے، جب کہ عورت ازدواجی زندگی سے محروم ہونے کی صورت میں اپنے فطری اور انسانی تقاضے ناجائز ذرائع سے پورے نہیں کر سکتی۔ لہٰذا شوہر داری کرنا، مرد کے زیر سایہ رہنا، جائز اور قانونی بچوں کی ماں بننا اور ایک عائلی نظام سے منسلک رہنا، عورت کے انسانی حقوق میں ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اعداد و شمار کے مطابق اگرچہ پیدائش کے اعتبار سے مرد و زن برابر ہوتے ہیں، لیکن جب یہی مرد و زن سن بلوغت کو پہنچتے ہیں، یعنی ازدواجی زندگی کے قابل ہوتے ہیں تو ازدواج کے قابل مردوں سے، ازدواج کے قابل عورتیں کہیں زیادہ ہوتی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ازدواج کے قابل عورتوں کو جو تعداد میں ازداج کے قابل مردوں سے زیادہ ہیں، ان کے انسانی حقوق تعدد زوجات کے علاوہ کس طرح پورے ہو سکتے ہیں؟

ایک عجیب تجویز: برٹرینڈ رسل یہاں ایک عجیب تجویز دیتا ہے:

> تعدد زوجات ممنوع ہونے کی صورت میں بہت سی عورتیں بے شوہر اور بے اولاد رہ جاتی ہیں، ان کے لیے تجویز یہ ہے کہ وہ مردوں کو شکار کریں اور اپنے لیے اولاد پیدا کریں۔

اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان بے سرپرست ماؤں اور بے پدر بچوں کی سرپرستی کون کرے گا؟ برٹرنڈ رسل تجویز دیتا ہے:

> حکومت شوہر اور باپ کی جگہ پر کرے۔[1]

---

[1] نظام حقوق زن ص ۳۸۱

دیکھا آپ نے مغربی ذہن کے صف اول کا مفکر ایک نہایت ہی اہم انسانی حق کے لیے کیا حل پیش کرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے مغربی انسان، مہر پدر اور شوہر کے سایے میں موجود امن و سکون سے آشنا ہی نہیں ہے؟

ایک اور حل: برطانیہ نے برٹرینڈرسل کی تجویز کی جگہ ایک متبادل حل پیش کیا ہے۔ چنانچہ وہاں کی پارلیمنٹ نے ایک قانون کی منظوری دی، جس کے تحت غیر فطری جنسی روابط (ہم جنس بازی) کو قانونی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اب برطانیہ میں چند عورتوں کے عنوان سے تعدد زوجات ممنوع ہے۔ ہاں اگر جنسی تسکین کے لیے ہم جنسوں کا اضافہ کر لیا جائے تو جائز ہے۔ بالفاظ دیگر تعدد زوجات ممنوع ہے، لیکن تعدد ناجائز تعلقات جائز ہے۔

درحقیقت مغرب کا انسان قانونی زوجہ، خواہ وہ ایک ہی کیوں نہ ہو، کا متحمل نہیں ہے۔ وہ شروط و قیود سے آزاد ہو کر اپنی جنسی خواہشات پوری کرنا چاہتا ہے۔

اصلاح تعدد زوجات: اسلام نے تعدد زوجات کا تصور ایجاد نہیں کیا بلکہ یہ قانون، اسلام سے صدیوں پہلے سے رائج تھا۔ البتہ اسلام نے اسے مکمل طور پر ختم بھی نہیں کیا بلکہ اس کی اصلاح کر کے اسے چار تک محدود کر دیا، کیونکہ اس میں بہت سی مشکلات کا حل ہے۔

حد بندی: اسلام سے پہلے تعدد زوجات میں کوئی حد بندی نہ تھی۔ ایک شخص بیک وقت سینکڑوں عورتوں سے شادی کر سکتا تھا۔ اسلام نے زوجات کی تعداد کو چار تک محدود کر دیا۔

عدالت: تعدد زوجات کے سلسلے میں تمام ممکنہ خرابیوں کے تدارک کے لیے اسلام نے عدالت کی شرط لگائی۔ اگر عدالت اور انصاف میسر ہو تو متعدد بیویاں برابری کے ساتھ پرسکون زندگی گزار سکتی ہیں اور نظام خانہ درہم برہم نہیں ہوتا۔ خاتون اول میں نہ تو احساس شکست پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی دوسری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن اگر انصاف اور عدالت میسر نہیں تو اسلام نے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت نہیں دی۔

دیگر حقوق: ان حقوق میں مالی حقوق بھی ہیں کہ مرد اگر ایک سے زیادہ عورت کے مصارف برداشت نہیں کر سکتا تو تعدد زوجات جائز نہیں ہے۔ اسی طرح اگر حق ہمبستری ادا کرنے کے قابل نہیں ہے تو بھی تعدد کی اجازت نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ اسلام عائلی مسائل کا بہترین حل پیش کرتا ہے۔

۲۔ نظریہ تعدد زوجات، مرد کی جنسی خواہشات کو جائز حدود میں محدود کرتا ہے۔

۳۔ تعدد زوجات سے عورت کی حق تلفی نہیں ہوتی بلکہ اس کے فطری حقوق کا تحفظ ہوتا ہے۔

۴۔ اسلامی قوانین کی بنیاد و اساس عدالت پر استوار ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحۡلَةً ؕ فَاِنۡ طِبۡنَ لَكُمۡ عَنۡ شَیۡءٍ مِّنۡهُ نَفۡسًا فَكُلُوۡهُ هَنِیۡٓـًٔا مَّرِیۡٓـًٔا ۝۴

۴۔ اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دیا کرو، ہاں! اگر وہ کچھ حصہ اپنی خوشی سے معاف کر دیں تو اسے خوشگواری کے ساتھ بلا کراہت کھا سکتے ہو۔

تشریح کلمات

صدقات: (ص د ق) حق مہر۔

نِحۡلَةً: (ن ح ل) نحل۔ شہد کی مکھی۔ لہٰذا اس کے معنی میں شیرینی کا عنصر موجود ہے۔ اسی لیے عطیہ اور ہبہ کو نحلۃ کہا جاتا ہے اور جو چیز خوش دلی سے دی جائے، اسے بھی نحلۃ کہتے ہیں۔

الھنییء: (ہ ن ی) بغیر مشقت جو چیز حاصل ہو جائے اور نتائج کے اعتبار سے بھی خوش کن ہو۔ یہ لفظ عام طور پر طعام کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔ هنیی الطعام یعنی خوشگوار کھانا۔

المریء: (م ر ی) اس نالی کو کہتے ہیں جو معدے کے سرے سے حلق تک ملی ہوئی ہوتی ہے۔ اسی سے کھانا خوشگوار ہونے اور طبیعت کے موافق ہونے کو مریئا کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

مہر کو قرآن نے صدقۃ کہا ہے۔ یعنی صدق وسچائی۔ اس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ یہ مال رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کو صادق اور سچا بنانے کے لیے ایک علامت ہے۔

ایام جاہلیت میں حق مہر خود عورتوں کو نہیں دیتے تھے، بلکہ دوسرے لوگ اسے وصول کرتے تھے۔ قرآن نے فرمایا: یہ عورتوں کا حق ہے، انہی کو دیا کرو۔ یعنی اسلام نے عورتوں کو اقتصادی امور میں استقلال دیا کہ عورت اپنے مال کی خود مالک ہے۔ مردوں کو اس میں دخل دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔ مغرب نے بیسویں صدی میں داخل ہونے تک عورت کو اقتصادی امور میں استقلال نہیں دیا۔

نِحۡلَةً: یعنی اس حق مہر کو مہر و محبت کا عنوان بنا کر از روئے ہدیہ وعطیہ نہایت خوشدلی سے دیا کرو۔

اعتراض: مہر کا تعین عورت کو خریدنے اور اس کی قیمت لگانے کے مترادف ہے اور یہ مقام زن کی توہین ہے۔

جواب: اولاً اوپر بیان کیا گیا کہ یہ عورت کی قیمت نہیں ہے۔ حق مہر کے ذریعے عورت خریدی نہیں

جاتی بلکہ یہ خواستگاری کی صداقت اور باہمی رشتہ ازدواج میں عورت کی عفت کا اعتراف ہے۔
مہر سے عورت کی شخصیت کو اہمیت مل جاتی ہے۔ جس میں مادی سے زیادہ انسانی اور نسوانی اقدار کا پہلو زیادہ اہم ہے۔ مہر ادا کرنے کی وجہ سے مرد، عورت یا اس کے کسی عمل کا مالک نہیں بنتا۔ اگر عورت کمائی کرے تو اس کی مالک خود عورت ہے۔ مہر ادا کرنے کی وجہ سے مرد عورت سے کام نہیں لے سکتا۔ عورت ازدواجی حقوق کے علاوہ مرد کے کسی کام کاج کی ذمہ دار نہیں ہے بلکہ وہ ایک مستقل انسان ہے اور مرد کے مقابلے میں زوج، جفت کا مقام رکھتی ہے۔ نہ محکوم ہے نہ خادمہ۔

درحقیقت مرد وزن میں ایک توازن برقرار رکھنے کے لیے قدرت نے مختلف خصوصیات ان دونوں میں ودیعت فرمائی ہیں۔ اگر مرد، اعصاب و بدن کے اعتبار سے عورت سے زیادہ طاقتور ہے تو بے نیازی، جمال اور غرور میں عورت زیادہ طاقتور ہے۔ اسی لیے خواستگاری ہمیشہ مرد کی طرف سے ہوتی ہے اور یہ تقریباً ایک کائناتی اور آفاقی دستور ہے کہ مادہ نر کو اپنی طرف جذب کرتی ہے اور نر مادہ کے پیچھے جاتا ہے۔ مادہ کے لیے عار و ننگ ہے کہ وہ نر کے پیچھے جائے۔ مہر بھی اسی سے ہے کہ نر بعنوان ہدیہ و خواستگاری مہر دیتا ہے۔ عورت کے لیے ننگ ہے کہ وہ اس سلسلے میں مرد کو کچھ دے۔ عورت کا وقار، اس کی شخصیت اور اس کے ناموس کی عزت و احترام اسی میں ہے کہ وہ مفت اپنے آپ کو مرد کے حوالے نہ کرے۔ اس سلسلے میں مرد کو اپنی خواہش اور خواستگاری کا ثبوت فراہم کرنا ہوگا اور وہ ہے مہر کی ادائیگی۔

اہم نکات

۱۔ حق مہر ازدواجی زندگی میں مہر و محبت، عورت کی شخصیت و وقار اور احترام کا ثبوت ہے۔
۲۔ اسلام نہ مرد کو ظلم کا حق دیتا ہے، نہ عورت کو، بلکہ حق کو بالادستی حاصل ہوتی ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَ اكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۝	۵۔ اور اپنے وہ مال جن پر اللہ نے تمہارا نظام زندگی قائم کر رکھا ہے بیوقوفوں کے حوالے نہ کرو (البتہ) ان میں سے انہیں کھلاؤ اور پہناؤ اور ان سے اچھے پیرائے میں گفتگو کرو۔

تفسیر آیات

اس آیہ شریفہ سے مال کے متعلق اسلام کا درج ذیل تصور سامنے آتا ہے:

i۔ مالک حقیقی اللہ ہے۔

ii۔ جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمۡ قِیٰمًا: اللہ نے مال کو پورے معاشرے کے نظام معیشت کے قیام کا ذریعہ بنایا۔جس کے بغیر کوئی امت اپنا استقلال برقرار نہیں رکھ سکتی اور اقتصادی بدحالی میں کوئی قوم اپنی کمر سیدھی اور سر اونچا نہیں رکھ سکتی۔

iii۔ مال کو اجتماعی ملکیت سے خصوصی ملکیت میں منتقل کرنے کے لیے اسلام نے قانون وضع کیے۔ مثلاً:

الف۔ ایجاد ملکیت، صرف محنت کے ذریعے ہی شخصی ملکیت میں منتقل ہو سکتی ہے۔

ب: انتقال ملکیت ہو تو وراثت، تجارت اور ھبہ وغیرہ سے ہو سکتی ہے۔

ج: خصوصی ملکیت کے حقوق دینے کے لیے شرط ہے کہ اس سے اجتماعی حقوق متاثر نہ ہوتے ہوں، ورنہ یہ حقوق یا تو کلی طور پر سلب ہوں گے، حدیث رسولؐ ہے:

لا ضرر و لا ضرار فی الاسلام۔[1] اسلام کے کسی قانون میں ضرر کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔

یا جزئی طور پر سلب ہوں گے اور پوری امت کو ان حقوق وضوابط کی نظارت کرنا ہو گی۔

اس سلسلے میں اس آیہ شریفہ میں پورے معاشرے کو مخاطب کر کے فرمایا: اپنے اموال کو بے وقوف اور کم عقلوں کے ہاتھ میں نہ دو۔ یہاں چونکہ مال کے ضیاع کا خوف تھا، اس لیے جزئی طور پر کم عقلوں سے شخصی اور خصوصی تصرف کا حق سلب کیا جاتا ہے اور صرف ان کے کھانے اور پہننے کی چیزیں انہیں فراہم کی جاتی ہیں۔ یہاں تولیت اور نظارت کا حق ان کے باپ دادا کو ملتا ہے۔ باپ دادا نہ ہونے کی صورت میں شرعی حکومت کو یا عادل مومنین کو نظارت کرنا ہو گی۔ سفیہ، دیوانہ اور یتیم وغیرہ ان لوگوں میں سے ہیں جو مجور ہیں۔ یعنی مسلوب التصرف ہیں۔

وَّ قُوۡلُوۡا لَہُمۡ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا: ان سے اچھے اخلاق کے دائرے میں رہ کر بات کرو۔ اگرچہ یہ لوگ کم عقل ہیں لیکن پھر بھی احترام آدمیت کے تحت ان کی تحقیر جائز نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ مال معاشرے کے لیے ستون کی حیثیت رکھتا ہے: لَکُمۡ قِیٰمًا ....

۲۔ شخصی اموال کی حفاظت پورے معاشرے کی ذمہ داری ہے: لَا تُؤۡتُوا ....

۳۔ کم عقل لوگ بھی احترام آدمیت کا حق رکھتے ہیں: قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا ....

---

[1] الوسائل ۲۶: ۱۴ باب ان الکافر لا یرث

وَ ابۡتَلُوا الۡیَتٰمٰی حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ ۚ فَاِنۡ اٰنَسۡتُمۡ مِّنۡہُمۡ رُشۡدًا فَادۡفَعُوۡۤا اِلَیۡہِمۡ اَمۡوَالَہُمۡ ۚ وَ لَا تَاۡکُلُوۡہَاۤ اِسۡرَافًا وَّ بِدَارًا اَنۡ یَّکۡبَرُوۡا ؕ وَ مَنۡ کَانَ غَنِیًّا فَلۡیَسۡتَعۡفِفۡ ۚ وَ مَنۡ کَانَ فَقِیۡرًا فَلۡیَاۡکُلۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ فَاِذَا دَفَعۡتُمۡ اِلَیۡہِمۡ اَمۡوَالَہُمۡ فَاَشۡہِدُوۡا عَلَیۡہِمۡ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیۡبًا ﴿۶﴾

۶۔اور یتیموں کو آزماتے رہو یہاں تک کہ یہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں، پھر اگر تم ان میں رشد عقلی پاؤ تو ان کے اموال ان کے حوالے کر دو اور اس خوف سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے (اور مال کا مطالبہ کریں گے) فضول اور جلدی میں ان کا مال کھا نہ جانا اور اگر (یتیم کا سرپرست) مالدار ہے تو وہ (کچھ کھانے سے) سے اجتناب کرے اور اگر غریب ہے تو معمول کے مطابق کھا سکتا ہے، پھر جب تم ان کے اموال ان کے حوالے کرو تو اس پر گواہ ٹھہرایا کرو اور حقیقت میں حساب کے لیے تو اللہ ہی کافی ہے۔

تشریح کلمات

اٰنَسۡتُمۡ: (ء ن س) انس۔ آنس۔ کسی چیز سے انس پانا یا اس کا مشاہدہ کرنا۔ جو بہت زیادہ مانوس ہو اسے انسیؑ کہتے ہیں۔

رُشۡد: (ر ش د) ہدایت، صلاحیت۔

بِدَار: (ب د ر) جلدی کرنا۔

تفسیر آیات

اس آیہ شریفہ میں درج ذیل نکات قابل توجہ ہیں:

۱۔ وَ ابۡتَلُوا الۡیَتٰمٰی: یتیموں کے سرپرستوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ یتیموں کو مال واپس کرنے سے پہلے یہ دیکھیں کہ کیا وہ مالکانہ تصرف کے اہل ہوئے ہیں یا نہیں؟ یہاں مال ان کے حوالے کرنے کے لیے دو شرائط عائد کی گئی ہیں: ایک بلوغ اور دوسری رشد۔

الف۔ بلوغ: بچہ جب سن بلوغ کو پہنچ جاتا ہے تو اس پر کچھ شرعی ذمے داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ مثلاً نماز، روزہ، حدود و دیات وغیرہ۔ کیونکہ ان تکالیف کی فہم زیادہ سوجھ بوجھ کی محتاج نہیں ہے۔ مثلاً حدود و تعزیرات میں جرائم کی برائی کا ادراک نسبتاً آسان ہے۔

ب۔ رشد: فَاِنۡ اٰنَسۡتُمۡ مِّنۡہُمۡ رُشۡدًا ۔ مالکانہ تصرف کے نافذ ہونے کے لیے بلوغ کے علاوہ رشد کا ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ یہاں اگر رشد نہ ہو تو مالی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور مفاد پرست لوگ اس کم فہم اور سوجھ بوجھ نہ رکھنے والے نادان کو آسانی سے دھوکہ دے سکتے ہیں۔ اسی لیے اس آیت میں بلوغ کے ساتھ رشد کی بھی شرط عائد کی ہے۔

ابو حنیفہ کے نزدیک بلوغ کے بعد رشد نہ ہو تو یتیم کا ولی سات سال اور انتظار کرے گا۔ اس کے بعد خواہ رشد ہو یا نہ ہو، مال اس کے حوالے کیا جائے گا۔ امامیہ کے نزدیک رشد کا ہونا ہر حال میں ضروری ہے۔ یعنی اگر وہ مالکانہ تصرف کے اہل نہیں ہے تو یہ مال اس کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ شافعی کا نظریہ بھی یہی ہے۔

۲۔ وَلَا تَاۡکُلُوۡہَاۤ اِسۡرَافًا: مال یتیم کے خرچ کے سلسلے میں اسراف اور بدار نہ کرو۔ اسراف یعنی ضرورت سے زیادہ خرچ نہ کرو۔ بدار یعنی مال یتیم کے ساتھ کسی قسم کا معاملہ کرنے میں اس وجہ سے جلد بازی نہ کرو کہ یتیم کے بالغ اور رشید ہونے کی صورت اس کے راضی نہ ہونے کا خطرہ ہے۔ مثلاً سرپرست اپنی منشا کے مطابق اجرت وصول کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً وہ ایک عمدہ نسل کا گھوڑا اجرت میں لینا چاہتا ہے اور ساتھ یہ خوف ہے کہ اگر بچہ بلوغ و رشد کو پہنچ گیا تو وہ یہ گھوڑا مجھے نہیں دے گا، اس لیے جلدی میں وہ یہ گھوڑا لے لیتا ہے۔

۳۔ وَمَنۡ کَانَ غَنِیًّا: ولی اور سرپرست اگر مالدار ہے تو وہ یتیم کے مال سے اجرت لینے سے اجتناب کرے اور اگر فقیر ہے تو معمول کے مطابق اجرت لے سکتا ہے۔

۴۔ فَاِذَا دَفَعۡتُمۡ اِلَیۡہِمۡ جب یتیم رشد کو پہنچ جائے تو سرپرست پر واجب ہے کہ اس کا مال اس کے حوالے کر دے۔ اس عمل کے لیے گواہ رکھنا چاہیے تاکہ یتیم اور سرپرست کے درمیان نزاع کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

۵۔ وَکَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیۡبًا: اگر ولی اور گواہ سب نے مل کر یتیم کے حقوق ادا نہ کیے یا ادا کرنے کے باوجود ناحق ولی اور سرپرست پر دعویٰ ہو جائے تو ان حالات میں حساب لینے والا اللہ ہے۔ یہ اسلامی تربیت ہے۔ اگر یہ مطلب انسان کے ذہن میں جاگزیں ہو تو اس صورت میں کوئی نزاع واقع نہ ہو گا۔

اہم نکات

۱۔ ملکیت کے بارے میں اسلامی تصور اس طرح ہے:

الف۔ حقیقی مالک اللہ ہے۔

ب۔ اللہ کی طرف سے مال معاشرے کے سپرد ہوتا ہے۔

ج۔ معاشرہ اہلیت کی بنیاد پر یہ مال فرد کے حوالہ کرتا ہے۔ اٰنَسۡتُمۡ مِّنۡہُمۡ رُشۡدًا ....

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝

۷۔ جو مال ماں باپ اور قریبی رشتے دار چھوڑ جائیں اس میں مردوں کا ایک حصہ ہے اور (ایسا ہی) جو مال ماں باپ اور قریبی رشتے دار چھوڑ جائیں اس میں تھوڑا ہو یا بہت، عورتوں کا بھی ایک حصہ ہے، یہ حصہ ایک طے شدہ امر ہے۔

تشریح کلمات

نَصِيْبٌ: (ن ص ب) اصل میں یہ لفظ اس پتھر کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی مقام پر بطور نشان گاڑ دیا جاتا ہے۔ چونکہ حصہ الگ کر کے اس پر نشانی لگائی جاتی ہے، اسی لیے حصے کو بھی نَصِيْب کہا گیا۔

مَفْرُوض: (ف ر ض) فرض۔ کسی سخت اور ٹھوس چیز کو کاٹ کر الگ الگ کر دینے کو کہتے ہیں۔ واجب کو فرض اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی بجا آوری کو باقی چیزوں سے جدا کر کے لازم گردانا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

اس آیت میں درج ذیل قوانین موجود ہیں:

۱۔ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ: والدین اور قرابتداروں میں سے کوئی بھی ارث سے محروم نہ رہے گا، جیسا کہ دور جاہلیت میں یہ فلسفہ پیش کیا جاتا تھا کہ بچے چونکہ دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور دفاع میں حصہ نہیں لے سکتے، اس لیے چھوٹے بچوں کو ارث نہیں دیا جاتا۔ مگر اسلام بچوں کی دفاعی اعتبار سے قیمت نہیں لگاتا بلکہ ان کے انسانی مقام کے اعتبار سے انہیں وقعت دیتا ہے۔

۲۔ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ: میراث صرف مردوں کا حق نہیں بلکہ میراث میں عورتوں کا بھی حصہ ہے۔ لہٰذا اگر کوئی عورت مرد کے ساتھ ایک ہی طبقے میں ہو تو کوئی عورت ارث سے محروم نہیں رہتی ہے۔ مثلاً بیٹے کے ساتھ بیٹی کو، بھائی کے ساتھ بہن کو، چچا کے ساتھ پھوپھی کو حسب مراتب ارث ملے گا۔

۳۔ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ: میراث کتنی ہی کم ہو، تقسیم ہونی چاہیے۔ مال متروکہ تھوڑا ہونے کی وجہ سے جواز نہیں بنتا کہ اسے تقسیم نہ کیا جائے۔

میراث کے یہ قوانین عرب جاہلیت کے اعتبار سے بالکل غیر مانوس تھے اور قرابتداروں میں سے کئی ایک کو میراث سے محروم رکھنا ان کے ہاں ایک عام سی بات تھی۔ اسلام نے یکسر ان غیر انسانی قوانین کو بدل

دیا۔

۴۔ اس آیہ شریفہ کی عمومیت میں رسالتمآب (ص) کا ترکہ شامل نہ ہونے پر کوئی قرآنی شواہد نہیں ہیں، نہ سنت رسولؐ میں کوئی قطعی دلیل ہے۔ صرف خبر واحد ہے جو نص قرآنی کے مقابلے کی نہیں۔ مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو۔ سورہ النمل آیت ۱۶۔

وَ اِذَا حَضَرَ الۡقِسۡمَۃَ اُولُوا الۡقُرۡبٰی وَ الۡیَتٰمٰی وَ الۡمَسٰکِیۡنُ فَارۡزُقُوۡہُمۡ مِّنۡہُ وَ قُوۡلُوۡا لَہُمۡ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا ﴿۸﴾

۸۔ اور جب (میراث) کی تقسیم کے وقت قریب ترین رشتے دار، یتیم اور مسکین موجود ہوں تو اس (میراث) میں سے انہیں بھی کچھ دے دیا کرو اور ان سے اچھے انداز میں بات کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِذَا حَضَرَ الۡقِسۡمَۃَ: یہاں خطاب میت کے ولی اور ورثاء سے ہے کہ میراث کی تقسیم کے وقت جو رشتہ دار اور غریب و مسکین اور یتیم بچے موجود ہوں تو اگرچہ از روئے قانون میراث میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے، لیکن از روئے شفقت تم خود اپنی طرف سے انہیں کچھ دے دیا کرو۔

۲۔ وَ قُوۡلُوۡا لَہُمۡ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا: اور مال و میراث سے محرومی کے ساتھ تم ان سے دل شکنی کی باتیں نہ کیا کرو۔ مال سے محرومیت کی صورت میں معمولی سی بدکلامی دل میں کینہ اور عداوت پیدا کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ اس ممکنہ فساد کی روک تھام کے لیے کچھ مال دینے اور اچھے انداز میں بات کرنے کا حکم دیا۔

یہ آیت منسوخ نہیں بلکہ محکم ہے[1] اور حکم واجب ہے یا مستحب اپنے مرجع تقلید کے فتویٰ کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ جہاں مال دینے کا حکم آتا ہے وہاں احترام آدمیت ملحوظ رکھنے کا بھی حکم ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ اس لیے ہو کہ اس جگہ انسان کا وقار مجروح ہونے کا زیادہ امکان رہتا ہے۔

وَ لۡیَخۡشَ الَّذِیۡنَ لَوۡ تَرَکُوۡا مِنۡ خَلۡفِہِمۡ ذُرِّیَّۃً ضِعٰفًا خَافُوۡا

۹۔ اور لوگوں کو اس بات سے خوف لاحق رہنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد

---

[1] التبیان ۳: ۱۲۲

عَلَيۡهِمۡ ۠ فَلۡيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلۡيَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِيۡدًا ۝۹

چھوڑ جاتے جن کے بارے میں فکر لاحق ہوتی (کہ ان کا کیا بنے گا) تو انہیں چاہیے کہ اللہ سے ڈریں اور سنجیدہ باتیں کریں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لۡيَخۡشَ الَّذِيۡنَ: یتیموں پر ظلم کرنے سے باز رکھنے کے لیے خود لوگوں کی پدرانہ شفقت اور اولاد سے فطری محبت کی حس سے کام لیا جا رہا ہے اور فرمایا جا رہا ہے کہ اگر خود تمہارے بچوں کا یہی حال ہو کہ وہ بے پدر اور بے سہارا ہو جائیں تو تم کیا توقع رکھتے ہو کہ دوسرے تمہارے بچوں سے کیسا سلوک کریں۔ یہی سلوک قولاً و عملاً ان یتیموں کے ساتھ رکھو۔ یعنی اگر تم نے یتیموں پر ظلم کیا تو مکافات عمل کی بنیاد پر خود تمہاری اولاد کے ساتھ یہی حشر ہوگا۔ قرآن کی مختلف آیات سے اچھے اور برے اعمال کا دنیا میں مکافات عمل ہونا ثابت ہے اور یہ مسئلہ بھی اسی میں سے ہے۔

اس آیت کی دوسری تفسیر یہ کی گئی ہے کہ دنیا سے جاتے ہوئے انسان کو اپنے وارثین کا بھی خیال کرنا چاہیے۔ اگر ان میں بے بس بچے ہوں کہ سارا مال کسی کو ہبہ کر کے یا وصیت کر کے نہ جائیں۔ حدیث میں ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ فرمایا ہے کہ ایک تہائی بھی زیادہ ہے۔ (مجمع البیان)

۲۔ فَلۡيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلۡيَقُوۡلُوۡا: یتیموں پر ظلم کرنے سے پرہیز کرو اور ان بچوں کو شفقت کی ضرورت ہے، ان سے سنجیدہ باتیں کرو۔ یعنی اچھی باتیں کرو کہ وہ احساس محرومیت نہ کریں۔

اہم نکات

۱۔ مکافات عمل ایک الٰہی قانون اور یتامیٰ پر ظلم کرنے والوں کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ يَاۡكُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡيَتٰمٰى ظُلۡمًا اِنَّمَا يَاۡكُلُوۡنَ فِىۡ بُطُوۡنِهِمۡ نَارًا ؕ وَسَيَصۡلَوۡنَ سَعِيۡرًا ۝۱۰

۱۰۔ جو لوگ ناحق یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں بس آگ بھرتے ہیں اور وہ جلد ہی جہنم کی بھڑکتی آگ میں تپائے جائیں گے۔

تفسیر آیات

سابقہ آیت میں انسان کے اپنے وجود کے اندر موجود فطری عوامل سے یتیموں پر ظلم کرنے سے باز رہنے کی بات ہوئی۔ اس آیت میں بیرونی عوامل سے خوف دلایا جا رہا ہے کہ یتیم کا مال کھانا درحقیقت اپنے

پیٹ میں آگ بھرنے کے مترادف ہے۔

یتیم کا مال کھانا پیٹ میں آگ بھرنا ہے۔ اس تعبیر سے دو باتیں سامنے آتی ہیں:

i۔ اعمال کی سزا اور جزا قراردادی نہیں بلکہ طبیعی ہے۔ یعنی گناہ کا ایک طبیعی نتیجہ ہوتا ہے جو ارتکاب کرنے والے کے لیے عذاب پر منتج ہوتا ہے۔ چنانچہ یتیم کا مال کھانے کا طبیعی نتیجہ آگ ہے۔

ii۔ اعمال مجسم ہو کر سامنے آئیں گے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا کہ انسان کے اعمال قیامت کے دن بذات خود مجسم ہو کر سامنے آئیں گے۔ چنانچہ توانائی کے مادے میں تبدیل ہونے کے اصول کے مطابق عین ممکن ہے کہ یتیم کا مال کھانے کا عمل آگ کی شکل اختیار کر کے کھانے والے کو جلا دے۔

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اس آیت کی کسی قسم کی تاویل کی ضرورت نہیں ہے کہ مال یتیم کو مجازاً آگ کہا گیا ہے وغیرہ۔

اہم نکات

ا۔ قیامت کے دن برے اعمال خود سزا بن کر سامنے آئیں گے۔

يُوۡصِيۡكُمُ اللّٰهُ فِيۡۤ اَوۡلَادِكُمۡ ۚ لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ ۚ فَاِنۡ كُنَّ نِسَآءً فَوۡقَ اثۡنَتَيۡنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنۡ كَانَتۡ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصۡفُ ؕ وَلِاَبَوَيۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنۡ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنۡ كَانَ لَهٗۤ اِخۡوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِيۡ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ ؕ اٰبَآؤُكُمۡ وَ

۱۱۔ اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تمہیں ہدایت فرماتا ہے، ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، پس اگر لڑکیاں دو سے زائد ہوں تو ترکے کا دو تہائی ان کا حق ہے اور اگر صرف ایک لڑکی ہے تو نصف (ترکہ) اس کا ہے اور میت کی اولاد ہونے کی صورت میں والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملے گا اور اگر میت کی اولاد نہ ہو بلکہ صرف ماں باپ اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کو تیسرا حصہ ملے گا، پس اگر میت کے بھائی ہوں تو ماں کو چھٹا حصہ ملے گا، یہ تقسیم میت کی وصیت پر عمل کرنے اور اس کے قرض کی ادائیگی کے بعد ہوگی، تمہیں نہیں معلوم تمہارے

اَبۡنَآؤُکُمۡ لَا تَدۡرُوۡنَ اَیُّہُمۡ اَقۡرَبُ لَکُمۡ نَفۡعًا ؕ فَرِیۡضَۃً مِّنَ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ﴿۱۱﴾	والدین اور تمہاری اولاد میں فائدے کے حوالے سے کون تمہارے زیادہ قریب ہے، یہ حصے اللہ کے مقرر کردہ ہیں، یقیناً اللہ بڑا جاننے والا، باحکمت ہے۔

تشریح کلمات

یُوۡصِیۡکُمۡ:(و ص ی) وصیة۔ واقعہ پیش آنے سے قبل ناصحانہ انداز میں کسی کو ہدایت کرنا۔

اَوۡلَاد: (و ل د) جو جنا گیا ہو اسے ولد کہتے ہیں۔ اس کی جمع اولاد ہے۔ یہ لفظ بیٹے اور بیٹی دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

جاہلیت کے زمانے میں ارث کے تین اسباب ہوا کرتے تھے۔ نسب، منہ بولا بیٹا اور حلیف۔ اسلام نے میراث کے لیے بنیادی طور پر دو اسباب متعین کیے: نسب اور سبب۔

سبب کی دو قسمیں ہیں:

الف۔ زوجیت۔

ب۔ ولاء۔

نسب کے تین طبقے ہیں:

الف۔ اولاد اور والدین۔

ب۔ دادا، دادی، بہن، بھائی اور ان کی اولاد۔

ج۔ چچا، پھوپھی، ماموں، خالہ اور ان کی اولاد۔

طبقہ اول (اولاد اور والدین): اس آیہ شریفہ میں طبقۂ اول کی میراث کا حکم بیان ہوا ہے۔ طبقۂ اول میں وہ لوگ شامل ہیں جو میت سے بلا واسطہ نسبت رکھتے ہیں اور وہ اولاد اور والدین ہیں۔

i۔ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصوں کے برابر ہے۔ اس میں لڑکیوں کے حصے کو اصل اور بنیاد قرار دیا اور مسلمہ امر فرض کیا گیا ہے۔ اس کے بعد لڑکوں کا حصہ اس پر متفرع فرمایا۔ یہ جاہلیت کے اس ظالمانہ رواج اور دستور کی رد ہے، جس کے تحت وہ لڑکیوں کو میراث سے محروم رکھتے تھے۔

ii۔ اگر میت کی اولاد میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہیں تو لڑکوں کو دو حصے اور لڑکیوں کو ایک حصہ دیا

جائے گا۔

iii۔ مرنے والے کی اولاد میں دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو ان کو کل ترکے کا دو تہائی (۲/۳) حصہ ملے گا۔ باقی رداً ملے گا۔

iv۔ مرنے والے کی اولاد میں صرف دو لڑکیاں ہوں تو ان دونوں کو کل ترکے کا دو تہائی (۲/۳) حصہ ملے گا۔ اس کا ذکر اگرچہ اس آیت میں صراحتاً نہیں ہے لیکن آیت کی ابتدا میں دو لڑکیوں کے حصے کا ذکر آ گیا کہ ''ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے۔''

v۔ اگر مرنے والے کی وارث صرف ایک ہی لڑکی ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے۔ باقی آدھا بھی اسی کو رداً ملے گا۔

vi۔ اولاد ہونے کی صورت میں ماں باپ میں سے ہر ایک کو کل ترکے کا چھٹا (۱/۶) حصہ ملے گا۔

vii۔ اولاد نہ ہونے کی صورت میں ماں کو ایک تہائی (۱/۳) حصہ ملے گا۔ یہاں باپ کا ذکر نہیں ہے، تاہم اسے دو تہائی (۲/۳) حصہ ملے گا۔

viii۔ اگر مرنے والے کے پسماندگان میں والدین کے ساتھ اس کے پدری و مادری یا صرف پدری بھائی موجود ہوں تو اس صورت میں ماں کا حصہ ایک تہائی (۱/۳) سے گھٹ کر چھٹا (۱/۶) ہو جائے گا۔ اگرچہ بھائی یہاں میراث نہیں لیں گے، چونکہ بھائی طبقۂ دوم کے وارث ہیں، لیکن یہ ماں کے لیے حاجب (رکاوٹ) بنتے ہیں۔ اگر صرف مادری ہوں تو حاجب نہیں بنتے۔

مباحث و مسائل قرض: میت کے ذمے اگر کوئی قرض ہے تو اسے ترکہ تقسیم کرنے سے پہلے ادا کیا جائے گا۔

وصیت: اگر میت نے وصیت کی ہو تو قرض کی ادائیگی کے بعد اس وصیت پر عمل کیا جائے گا۔

قرض اور وصیت میں سے قرض مقدم ہے۔ یعنی پہلے قرض ادا کیا جائے گا پھر وصیت پوری کی جائے گی۔ اس کے بعد وراثت تقسیم کی جائے گی۔

وصیت کے احکام کے تحت مرنے والے کے اپنے کل ترکے میں سے صرف ایک تہائی (۱/۳) کی حد تک وصیت نافذ ہے، باقی دو تہائی (۲/۳) حصے پر اس کی وصیت نافذ نہیں ہوتی۔ یعنی انسان اپنے ان نادار غریب اور مسکین رشتے داروں کے حق میں کچھ وصیت کرنا چاہتا ہے جنہیں قانون وراثت کی رو سے میراث میں سے کچھ نہیں ملتا یا رفاہ عام کے لیے کچھ وصیت کر کے دینا چاہتا ہے تو یہ وصیت کل ترکے کے ایک تہائی (۱/۳) حصے میں سے پوری کی جائے گی۔ اگر ایک تہائی (۱/۳) حصے سے زیادہ کی وصیت کی گئی ہو تو زائد میں وصیت نافذ نہیں ہو گی، کیونکہ انسان اپنے ترکے میں سے صرف ایک تہائی (۱/۳) میں اپنی صوابدید پر عمل کر سکتا ہے۔ باقی ترکہ ورثاء میں تقسیم کرنا ہو گا۔

اَیُّھُمۡ اَقۡرَبُ: میراث کے کلی احکام بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا: تمہیں نہیں معلوم تمہارے ماں باپ اور اولاد میں سے کون بلحاظ فائدہ قریب تر ہے۔ یعنی وراثت میں مختلف ورثاء کے مختلف حصے قرار دینے میں کیا راز ہے، اسے تم نہیں جانتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے احکام، فطرت اور مصالح و مفاسد کے تقاضوں کے مطابق ہوتے ہیں۔

اس آیہ شریفہ میں طبقۂ اول کی میراث کا ذکر آیا۔ اس میں بعض وراثتوں کا ذکر صراحتاً اور بعض کا اشارتاً آیا ہے۔

عمومیت: جمع کا صیغہ جب اضافہ ہوتا ہے تو عموم کے معنی دیتا ہے۔ جیسے اموالکم کی تعبیر میں تمام قسم کے اموال شامل ہوتے ہیں۔ آیت میں اولادکم اولاد جمع کا صیغہ، کم کی طرف اضافہ ہوا ہے جو عمومیت کا معنی دیتا ہے۔ اس آیہ کی عمومیت کے تحت وارث بنانے میں نبی اور غیر نبی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جیسا کہ سابقہ آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔

فَرِیۡضَۃً مِّنَ اللّٰہِ: فَرِیۡضَۃً مفعول مطلق ہے۔ اس سے پہلے ایک فعل نیت میں ہوتا ہے، جیسے الزموا فریضۃ یا فرض فریضۃ۔ یہ تعبیر انتہائی تاکید کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

قابل توجہ نکتہ: یہ بات بالاجماع ثابت ہے کہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا نے اپنے پدر بزرگوار (ص) کی میراث کا مطالبہ فرمایا، بلکہ اس مطالبے کے مسترد ہونے پر ناراض رہیں۔

دوسری یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ [1] کے تحت رسول کریم (ص) پر واجب ہے کہ وہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو احکام کی تبلیغ و انذار کریں۔ لہٰذا یقیناً حضور (ص) نے حضرت زہراء سلام اللہ علیہا سے ضرور فرمایا ہوگا کہ وہ وارث بنتی ہیں یا نہیں۔ اگر حضور (ص) نے انہیں بتایا تھا کہ آپ (س) میری جائداد کی وارث نہیں بنتیں، پھر بھی طہارت و پاکیزگی کی مالکہ بنت رسول (ص) نے حکومت سے اپنے باپ کی میراث کا مطالبہ کیا تو اس سے لازم آتا ہے کہ معاذ اللہ جناب سیدہ (س) نے حکم خدا و رسول (ص) کو ٹھکرایا۔ بصورت دیگر جناب سیدہ (س) کا مطالبہ حق بجانب ثابت ہوتا ہے۔

وَ لَکُمۡ نِصۡفُ مَا تَرَکَ اَزۡوَاجُکُمۡ اِنۡ لَّمۡ یَکُنۡ لَّھُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنۡ کَانَ لَھُنَّ وَلَدٌ فَلَکُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَکۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِیَّۃٍ یُّوۡصِیۡنَ بِھَاۤ اَوۡ دَیۡنٍ ؕ وَ لَھُنَّ	۱۲۔ اور تمہیں اپنی بیویوں کے ترکے میں سے اگر ان کی اولاد نہ ہو نصف حصہ ملے گا اور اگر ان کی اولاد ہو تو ان کے ترکے میں سے چوتھائی تمہارا ہوگا، یہ تقسیم میت کی وصیت پر عمل کرنے اور قرض ادا کرنے کے بعد ہوگی، اگر

[1] ۲۶ شعراء: ۲۱۴۔ اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو تنبیہ کیجیے۔

الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَ اِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِى الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾

تمہاری اولاد نہ ہو تو انہیں تمہارے ترکے میں سے چوتھائی ملے گا اور اگر تمہاری اولاد ہو تو انہیں تمہارے ترکے میں سے آٹھواں حصہ ملے گا، یہ تقسیم تمہاری وصیت پر عمل کرنے اور قرض ادا کرنے کے بعد ہو گی اور اگر کوئی مرد یا عورت بے اولاد ہو اور والدین بھی زندہ نہ ہوں اور اس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو بھائی اور بہن میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا، پس اگر بہن بھائی ایک سے زیادہ ہوں تو سب ایک تہائی حصے میں شریک ہوں گے، یہ تقسیم وصیت پر عمل کرنے اور قرض ادا کرنے کے بعد ہو گی، بشرطیکہ ضرر رساں نہ ہو، یہ نصیحت اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ بڑا دانا، بردبار ہے۔

تشریح کلمات

كَلٰلَة: (ك ل ل) باپ اور اولاد کے علاوہ جو وارث ہو وہ کلالۃ ہے۔

تفسیر آیات

صحیح السند روایت کے مطابق حضرت عمر نے رسول اکرم (ص) سے کلالہ کے بارے میں سوال کیا۔ آپ (ص) نے فرمایا:

> اللہ نے اسے واضح طور پر بیان فرمایا ہے۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: وَ اِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً۔ گویا حضرت عمر سمجھ نہ سکے۔ پھر دوسری آیت نازل ہوئی: يَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِى الْكَلٰلَةِ[1] تو بھی حضرت عمر سمجھ نہ سکے۔ حضرت

---

[1] نساء۴: ۱۷۶۔ لوگ آپ سے (کلالہ کے بارے میں) دریافت کرتے ہیں۔ ان سے کہدیجئے: اللہ کلالہ کے بارے میں تمہیں یہ حکم دیتا ہے۔

عمر نے حفصہ سے کہا کہ جب رسول اللہ (ص) خوش مزاجی کی حالت میں ہوں تو کلالہ کے بارے میں پوچھ لینا۔ حفصہ نے پوچھا تو حضور (ص) نے فرمایا: تمہارے باپ نے پوچھنے کے لیے کہا تھا؟ما اری اباك یعلمها ابدا۔ لگتا ہے کہ تمہارا باپ کبھی بھی اس مسئلے کو نہیں جان سکے گا۔[1]

صاحب المنار فرماتے ہیں:

یہ مسئلہ اس قدر واضح ہے کہ حضرت عمر سے بھی کمتر لوگوں کے لیے اس کا سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ و للّٰہ فی البشر شؤون۔

:وَ لَکُمۡ نِصۡفُ مَا تَرَکَ اَزۡوَاجُکُمۡ : **زوجین کا حصہ۔** اس آیہ شریفہ میں پہلے زوجین کی وراثت بیان فرمائی۔ اس میں درج ذیل مسائل ہیں:

i۔ زوجین کی میراث تمام طبقات میں موجود ہوتی ہے۔

ii۔ زوجہ کی اولاد نہ ہو تو شوہر زوجہ کے ترکے کا نصف (۲/۱) حصہ لے گا اور اگر اولاد ہو تو ایک چوتھائی (۴/۱) حصہ لے گا۔

iii۔ شوہر کی اولاد نہ ہو تو زوجہ شوہر کے ترکے کا ایک چوتھائی (۴/۱) حصہ لے گی اور اگر اولاد ہو تو آٹھواں (۸/۱) حصہ لے گی۔

iv۔ شوہر بیوی کے ترکے میں سے منقولات اور غیر منقولات سب میں سے حصہ لے گا۔ جب کہ بیوی شوہر کے ترکے میں سے صرف منقولات میں سے حصہ لے گی۔ غیر منقولات اگر زمین میں نصب شدہ چیزیں ہیں، جیسے مکان، درخت وغیرہ تو ان کی قیمت میں سے حصہ لے گی اور زمین میں سے حصہ نہیں دیا جائے گا۔

v۔ تُوۡرَثُ کَلٰلَۃً : طبقہ دوم (بھائی، بہنیں اور اجداد)۔ میت نے اگر اپنے پسماندگان میں ایک مادری بہن یا ایک مادری بھائی چھوڑا ہو تو اسے کل ترکے میں سے چھٹا (۶/۱) حصہ ملے گا۔

vi۔ فَاِنۡ کَانُوۡۤا اَکۡثَرَ مِنۡ ذٰلِکَ : اگر ایک سے زائد بہن بھائی ہوں تو یہ سب کل ترکے کے ایک تہائی (۳/۱) حصے میں شریک ہوں گے۔ یعنی بہن بھائی سب برابر تقسیم کریں گے۔ یہاں مرد و عورت کا کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ فقہاء نے (ماں شریک) بہن بھائی کے بارے میں بتلایا ہے، اگرچہ آیت میں اس کی صراحت نہیں ہے لیکن یہ ایک اجماعی مسئلہ ہے۔

vii۔ مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِیَّۃٍ تُوۡصُوۡنَ بِہَاۤ اَوۡ دَیۡنٍ : یہ تقسیم وصیت پر عمل کرنے اور قرض کی ادائیگی کے بعد ہوگی۔ قرض اور وصیت میں سے قرض مقدم ہے۔ یعنی قرض کی ادائیگی کے بعد اگر کچھ بچتا

---

[1] تفسیر المنار ۴: ۴۲۳

ہے تو اس کے ایک تہائی میں وصیت نافذ ہو گی، باقی دو تہائی وارثوں میں تقسیم ہو گا۔

وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ: در اصل یوصیکم وصیة من اللّٰہ ہے۔ یعنی یہ نصیحت اللہ کی طرف سے تاکیدی نصیحت ہے، جس میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کی اجازت نہیں ہے۔

غَيۡرَ مُضَآرٍّ سے یہ سمجھانا مطلوب ہے کہ انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وصیت کے ذریعے حقیقی ورثاء کو ضرر پہنچائے۔ یعنی ایک ثلث (۱/۳) سے زائد پر وصیت کرنا ورثاء پر ظلم ہے جو شرعاً نافذ بھی نہیں ہے نیز وصیت کے ذریعے قرض پر بھی اثر انداز ہونا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ قرض بہرحال مقدم ہے۔

تعصیب کی شرعی حیثیت: آیت میں اس بات پر کوئی صراحت موجود نہیں ہے کہ کل ترکہ حصوں سے زائد آنے کی صورت میں کسے دینا ہے۔ مثلاً صرف ایک لڑکی وارث ہونے کی صورت میں قرآن نے یہ تو بتا دیا کہ کل ترکے کا نصف (۱/۲) حصہ لڑکی کو ملے گا لیکن باقی نصف (۱/۲) حصے کے بارے میں کوئی صراحت نہیں ہے کہ یہ کس کا حصہ ہے؟ لہٰذا اس زائد مقدار کے بارے میں کوئی مؤقف اختیار کرنے کے لیے اس آیت کے علاوہ دیگر دلائل کی ضرورت ہے۔

تعصیب کا مؤقف: اس مؤقف کے مطابق نصف سے زائد حصہ دوسرے طبقے کے وارثوں کا ہو گا۔ مثلا بھائی، بہن، چچا، بھانجا اور بھتیجا وغیرہ۔

فقہ جعفری کا مؤقف: اس مؤقف کے مطابق باقی نصف (۱/۲) حصہ بھی اسی لڑکی کا ہے۔ لہٰذا لڑکی کو آدھا (۱/۲) حصہ فرضاً ملے گا اور دوسرا آدھا (۱/۲) حصہ رداً ملے گا۔ اس طرح لڑکی کل ترکے کی وارث بن جائے گی۔

تعصیب کی دلیل: اس سلسلے میں درج ذیل دو احادیث پیش کی جاتی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ زائد حصہ دوسرے طبقے کے وارثوں کا ہو گا۔

۱۔ طاؤس کی ایک مرسلہ روایت اور ابن عباس کی روایت، جس میں کہا گیا ہے:

الحقوا الفرائض باھلھا فما بقی فھو لاولی رجل ذکر۔	فرائض ان کے صاحبان کو دے دو۔ جو بچ جائے وہ اس مرد کا ہو گا جو میت کی طرف زیادہ قریب ہے۔

جواب: اولاً یہ حدیث عبد اللہ بن طاؤس کی وجہ سے ضعیف ہے۔ کیونکہ ابن طاؤس اموی خلیفہ کا خیر خواہ اور اہل بیت (ع) کا دشمن تھا۔ اس لیے علمائے رجال اس کی روایت کو مخدوش قرار دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو العتب الجمیل ۱۰۳۔ الکامل ج ۵ ص ۴۴ ۔ تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۶۸۔

ثانیاً خود ابن عباس اور طاؤس نے انکار کیا ہے کہ ہم نے اس مضمون کی کوئی روایت بیان نہیں کی۔ ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۶۸۔ ان کتب میں یہ شبہ ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ روایت طاؤس کے بیٹے عبد اللہ کی ساختہ اور بافتہ ہو گی۔ کیونکہ یہ بنی ہاشم کا سخت ترین دشمن اور بنی امیہ کا خیر خواہ تھا۔

۲۔ حضرت جابر بن عبد اللہ کی روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضور (ص) نے سعد بن ربیع کی دو بیٹیوں کو دو تہائی (۲/۳) حصہ دیا۔ ان کی ماں کو آٹھواں (۱/۸) حصہ اور باقی ان کے چچا کو دے دیا۔

جواب: یہ حدیث اس کے ایک راوی عبد اللہ بن محمد بن عقیل کی وجہ سے ضعیف ہے۔ اصحاب رجال نے اس کی حدیث سے اجتناب کرنے کی سفارش کی ہے اور اس پر حافظے کے فقدان کا الزام لگایا ہے۔ ملاحظہ ہو المجروحین من المحدثین ج ۲ ص ۴۱، الجرح و التعدیل ج ۲ ص ۱۵۴۔ تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۱۳۔ ۱۵ نیز ترمذی کی سند میں موجود عبید اللہ بن عمر کے بارے میں علمائے رجال کہتے ہیں: یہ زیادہ لغزش کار ہے۔ ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۴۱۔

فقہ جعفری کا مؤقف: فقہ جعفری اپنے مؤقف پر قرآن اور سنت سے استدلال کرتی ہے۔

۱۔ قرآن میں ارشاد ہے:

وَاُولُوا الۡاَرۡحَامِ بَعۡضُہُمۡ اَوۡلٰی بِبَعۡضٍ فِیۡ کِتٰبِ اللّٰہِ ...۔[۱]	اور اللہ کی کتاب میں خونی رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔

اس آیت میں قانون وراثت کا ایک اہم اصول بیان فرمایا گیا ہے جس کے تحت بعید سے زیادہ قریبی حقدار ثابت ہوتا ہے۔ علماء نے اس آیت کے تحت ایک کلیہ بھی وضع کیا ہے: الاقرب یمنع الابعد۔ یعنی دور کے رشتہ داروں کے وارث بننے میں قریبی رشتہ دار مانع ہیں۔ لہٰذا طبقۂ اول کے وارث، طبقۂ دوم کے لیے مانع ہیں۔ اسی لیے امامیہ کا مؤقف یہ ہے کہ بیٹی کے ہوتے ہوئے دوسرے رشتے دار، مثلا بھائی، بھتیجہ، چچا کا لڑکا وغیرہ وارث نہیں بن سکتا۔

دوسری آیت:

اِنِ امۡرُؤٌا ہَلَکَ لَیۡسَ لَہٗ وَلَدٌ وَّلَہٗۤ اُخۡتٌ فَلَہَا نِصۡفُ مَا تَرَکَ ۚ وَ ہُوَ یَرِثُہَاۤ اِنۡ لَّمۡ یَکُنۡ لَّہَا وَلَدٌ ...۔[۲]	اگر کوئی مرد مر جائے اور اس کی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن ہو تو اسے (بھائی کے) ترکے سے نصف حصہ ملے گا اور اگر بہن (مر جائے اور اس) کی کوئی اولاد نہ ہو تو بھائی کو بہن کا پورا ترکہ ملے گا۔

اس ایک آیت میں امامیہ مؤقف کے حق میں دو دلائل موجود ہیں:

الف: آیت کی رو سے بے اولاد بہن کا وارث بھائی ہوتا ہے، لیکن اگر بہن لا ولد نہیں ہے اور اس کے ہاں بیٹی موجود ہے تو بھائی وارث نہیں ہوتا بلکہ بیٹی وارث ہوتی ہے۔

ب: بے اولاد بھائی کی وارث بہن ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر بھائی لا ولد نہیں ہے اور اس کے ہاں بیٹی موجود ہے تو بہن کو نصف حصہ نہیں ملتا بلکہ بیٹی وارث ہوتی ہے۔

۱۔ ۸ انفال: ۷۵ ۲۔ ۴ نساء: ۱۷۶

واضح رہے آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص لا ولد مر جائے۔ وَلَد کا لفظ بیٹا اور بیٹی دونوں پر بولا جاتا ہے۔ دلیل عرف کے علاوہ یہ ہے کہ وَلَدکی جمع اولاد ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے: اِنَّمَاۤ اَمۡوَالُکُمۡ وَاَوۡلَادُکُمۡ فِتۡنَۃٌ [1] اور وَالۡوَالِدٰتُ یُرۡضِعۡنَ اَوۡلَادَھُنَّ حَوۡلَیۡنِ کَامِلَیۡنِ [2] میں اولاد میں بیٹا اور بیٹی دونوں شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ جمع اسی معنی کی تکثیر کے لیے آتی ہے جو مفرد میں مراد لیا جاتا ہے۔ لٰہذا جس طرح اَوۡلَاد بیٹوں اور بیٹیوں کے لیے بولا جاتا ہے اسی طرح وَلَد بھی دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: یُوۡصِیۡکُمُ اللّٰہُ فِیۡۤ اَوۡلَادِکُمۡ اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تمہیں ہدایت فرماتا ہے۔ بعد میں اولاد کی تشریح فرمائی۔ لِلذَّکَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَیَیۡنِ اس جگہ ذَکَر اور اُنثٰی اولاد کی تفصیل میں ہے۔ اس کے علاوہ خود لفظ کلالۃ اس بات پر دلیل ہے کہ بیٹی کی موجودگی میں بہن، بھائی وارث نہیں بن سکتے۔ کیونکہ کلالۃ اس وارث کو کہتے ہیں جو والدین اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں ارث لیتا ہو۔ اگر بیٹی موجود ہے تو کلالۃ کی نوبت نہیں آتی۔ عرب کہتے ہیں لم یرثہ کلالۃ یعنی یہ میراث معروضی حالت نہیں، بلکہ قرابتداری کی وجہ سے ہے۔

تیسری آیت:

لِلرِّجَالِ نَصِیۡبٌ مِّمَّا تَرَکَ الۡوَالِدٰنِ وَالۡاَقۡرَبُوۡنَ ۪ وَلِلنِّسَآءِ نَصِیۡبٌ مِّمَّا تَرَکَ الۡوَالِدٰنِ وَالۡاَقۡرَبُوۡنَ مِمَّا قَلَّ مِنۡہُ اَوۡ کَثُرَ ؕ نَصِیۡبًا مَّفۡرُوۡضًا ○ [3]

جو مال ماں باپ اور قریبی رشتے دار چھوڑ جائیں اس میں مردوں کا ایک حصہ ہے اور (ایسا ہی) جو مال ماں باپ اور قریبی رشتے دار چھوڑ جائیں اس میں تھوڑا ہو یا بہت، عورتوں کا بھی ایک حصہ ہے، یہ حصہ ایک طے شدہ امر ہے۔

اس آیت میں صراحت سے بیان فرمایا ہے کہ عورت کو کسی صورت میں بھی ارث سے محروم نہیں رکھا گیا۔ جب کہ تعصیب کے تحت صرف میت کے مرد رشتہ داروں کو وارث بنایا جاتا ہے، جو اطلاق آیت کے خلاف ہے۔ آئندہ ہم بیان کریں گے کہ سنت میں بھی کوئی ایسی حجت موجود نہیں ہے جو اس آیت کے اطلاق کو مقید کر دے۔ یہ وہی رسم جاہلیت ہے کہ عورت کو محض عورت ہونے کی بنا پر ارث سے محروم رکھا گیا ہے۔

۲۔ سنت از طریق اہل سنت: واثلۃ بن اسقع راوی ہے کہ رسول اکرم (ص) نے فرمایا:

المرأۃ تحوز ثلاث مواریث، عتیقھا، لقیطھا، و ولدھا الذی تلاعن علیہ [4]

عورت تین ترکے لے گی۔ ایک اپنی آزاد کردہ لونڈی کا، دوسرا اس بچے کا جسے راہ میں پا کر پرورش کرے اور تیسرا اس بچے کا جس پر اپنا خاوند لعان کرے۔

---

[1] ۶۴ تغابن: ۱۵۔ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد بس یقیناً آزمائش ہیں۔

[2] ۲ بقرہ: ۲۳۳۔ اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔ [3] ۴ نساء: ۷

[4] ملاحظہ ہو المسند ۳: ۴۹۰۔ ابن ماجہ باب تحوز المرأۃ ثلاث مواریث

ملاعنت شدہ بچے کا باپ اس کا وارث نہیں ہوسکتا تو یہ ارث ماں کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ حالانکہ ماں کا حصہ قرآن میں متعین ہے، اس کے باوجود اس بچے کے باپ کا حصہ ماں کی طرف لوٹ جاتا ہے، جو عیناً فقہ جعفری کا مؤقف ہے۔

ایک لڑکی، ایک زوجہ اور ایک غلام میں تقسیم ترکہ کے بارے میں سوید بن غفلة سے روایت کی ہے:

قال: كان علي(عليه السلام) يعطى الا بنة النصف والمرء ة الثمن و يرد ما بقي على الا بنة۔[1]	حضرت علی علیہ السلام بیٹی کو آدھا (۱/۲) حصہ دیتے اور زوجہ کو آٹھواں (۱/۸) حصہ دیتے اور باقی پھر بیٹی کو لوٹا دیتے تھے۔

از طریق ائمہ اہل البیت علیہم السلام: امامیہ کی کتب احادیث میں ائمہ اہل البیت علیہم السلام کی روایات تواتر سے موجود ہیں کہ تعصیب باطل ہے اور جو مقدار کل حصوں سے زائد آئے، وہ انہی وارثوں کو لوٹا دینی چاہیے۔ چنانچہ ابن عباس اور ابن زبیر بیٹی کو پوری وراثت دینے کے قائل تھے۔[2]

کیا مرد کو ارث میں برتری حاصل ہے؟: خاندان کی تشکیل کے لیے مرد اور عورت میں سے ہر ایک پر اپنی فطری استعداد اور تقاضوں کے مطابق ایک ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور ان میں سے ہر ایک اس خاندانی نظام میں ایک منصب رکھتا ہے۔ اس منصب کے مطابق اس خاندان پر آثار مرتب ہوتے ہیں اور ہرمنصب بدلنے سے اس پر مرتب ہونے والے اثرات بدلتے ہیں۔ مثلاً اس خاندانی نظام میں زید، بیٹے کے منصب پر فائز ہے۔ باپ کے بعد خاندانی نظام کا سرپرست اعلیٰ یہی ہو گا۔ اس منصب کے مطابق باپ کے ترکے میں سے اسے زیادہ حصہ ملے گا۔ یہی زید دوسرے وقت میں بیٹے کے نہیں، مرنے والے کے باپ کے منصب پر فائز ہے اور اس کے ساتھ مرنے والے کی اولاد بھی ہے، خواہ وہ بیٹی ہو، تو اس صورت میں اس خاندانی تشکیل و تنظیم میں وہ بیٹی باپ سے زیادہ مسئولیت رکھتی ہے، لہٰذا یہاں باپ (مرد) کو کم اور بیٹی (عورت) کو زیادہ حصہ ملے گا۔ اگر مرد و زن اس خاندان کی تنظیم میں برابر کی اہمیت رکھتے ہیں تو حصے برابر ہو سکتے ہیں۔ جیسے مرنے والے کے پسماندگان میں بیٹا اور والدین ہیں تو ماں باپ دونوں کو برابر یعنی ہر ایک کو چھٹا (۱/۶) حصہ ملتا ہے۔ اسی طرح اگر مرنے والے کے ایک سے زائد بہن، بھائی ہوں تو کل ترکہ ان میں برابر تقسیم ہو گا۔ یہاں مرد و عورت مساوی ہیں۔

اگر میراث کی تقسیم مرد و زن کی قدر و قیمت کے اعتبار سے ہوتی ہو تو ہر جگہ عورت کی ایک جیسی حیثیت ہونی چاہیے اور ہمیشہ مرد کو عورت کے دو برابر حصہ ملنا چاہیے۔

قابل توجہ: اگرچہ بعض اوقات مرد کا حصہ عورت کے حصے سے دوگنا ہوتا ہے لیکن اس کے مقابلے

---

[1] ملاحظہ ہو کنز العمال ۱۱: ۷۔ بیهقی السنن الكبرىٰ [2] تفسیر ابن كثير

میں عورت کے اخراجات کا پورا کرنا مرد کی ذمہ داری ہے۔ مثلاً ارث میں مرد کو دو ہزار اور عورت کو ایک ہزار روپے ملے ہیں تو مرد ایک ہزار اپنے اوپر اور ایک ہزار عورت پر خرچ کرے گا۔ لہٰذا خرچ کے لیے مرد کے پاس صرف ایک ہزار ہے، جب کہ عورت کے پاس دو ہزار۔ ایک ہزار شوہر کی طرف سے اور ایک ہزار اپنی ارث کا حصہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے سرپرستی کے اعتبار سے مال کا دو تہائی (۲/۳) حصہ مرد کی سرپرستی میں دیا ہے اور ایک تہائی (۱/۳) حصہ عورت کی سرپرستی میں، جب کہ خرچ کے اعتبار سے مال کا ایک تہائی (۱/۳) حصہ مرد اور دو تہائی (۲/۳) حصہ عورت کے اختیار میں دیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ میراث کی تقسیم عائلی نظام میں حاصل مقام کے مطابق ہوتی ہے۔

۲۔ بعض مقامات پر مرد کا دگنا حق، اس کی برتری کی وجہ سے نہیں، بلکہ یہ حسن تقسیم پر مبنی ہے۔

۳۔ سرپرستی کے لحاظ سے مرد کو دگنا جب کہ مخارج کے لحاظ سے عورت کو دگنا حصہ دیا گیا ہے۔

تِلۡکَ حُدُوۡدُ اللّٰہِ ؕ وَ مَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ یُدۡخِلۡہُ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ وَ ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اللہ اسے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی تو بڑی کامیابی ہے۔

وَ مَنۡ یَّعۡصِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ یَتَعَدَّ حُدُوۡدَہٗ یُدۡخِلۡہُ نَارًا خَالِدًا فِیۡہَا ۪ وَ لَہٗ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کی حدود سے تجاوز کرتا ہے اللہ اسے داخل جہنم کرے گا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے ذلت آمیز سزا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ تِلۡکَ حُدُوۡدُ اللّٰہِ: یہ احکام وہ حد فاصل ہیں جنہیں قبول کرنے اور ان پر عمل کرنے سے انسان فوز عظیم کی منزل پر فائز ہو جاتا ہے اور ان حدود کو توڑنے کی جسارت کرنے والا اللہ کے خلاف کھلی بغاوت کرنے والوں کی طرح ہوتا ہے۔ حدود توڑنے کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ کی طرف سے مقررشدہ قانون وارثت کو تبدیل کر کے کسی اور قانون پر عمل کرنا، جو اللہ کے قانون کی توہین ہے۔ مثلاً اہل مغرب کی تقلید میں

اسلامی قانون وراثت کی جگہ ان کے قانون کو اپنانا حدود اللہ سے بغاوت ہے، جو انکار شریعت کے مترادف ہے۔ جس کی وجہ سے عذاب الٰہی کا مستحق بن جاتا ہے۔

۲۔ وَیَتَعَدَّ حُدُوۡدَہٗ: یہاں حدود اللہ سے تجاوز کرنے والوں کو جہنم میں ہمیشہ رہنے کی سزا سنائی ہے۔ کلمہ گو اہل قبلہ اگر ناصبی نہیں ہے تو وہ جہنم میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔ لہٰذا یہاں حدود اللہ سے تجاوز سے مراد وہ لوگ لینا ہوگا جو حدود اللہ کے منکر ہیں۔ انکار سے وہ کافر ہو جاتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ حدود اللہ کی پاسداری ہی کا نام اطاعت ہے۔

۲۔ قانون سازی میں دخل دینا ہی حدود اللہ کی خلاف ورزی ہے۔

وَالّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ فَاسۡتَشۡہِدُوۡا عَلَیۡہِنَّ اَرۡبَعَۃً مِّنۡکُمۡ ۚ فَاِنۡ شَہِدُوۡا فَاَمۡسِکُوۡہُنَّ فِی الۡبُیُوۡتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰہُنَّ الۡمَوۡتُ اَوۡ یَجۡعَلَ اللّٰہُ لَہُنَّ سَبِیۡلًا ﴿۱۵﴾

۱۵۔ اور تمہاری عورتوں میں جو بدکاری کی مرتکب ہوجاتی ہیں ان پر اپنے (مسلمانوں) میں سے چار افراد کی گواہی لو پھر اگر وہ گواہی دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ موت انہیں انجام تک پہنچا دے یا اللہ ان کے لیے کوئی اور سبیل پیدا کر دے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَالّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ: اس آیت میں زانیہ عورتوں کی سزا بیان کی گئی ہے۔ چار مردوں کی گواہی سے زنا ثابت ہونے کی صورت میں عمر قید کی سزا دی جائے۔ ساتھ ہی اس حکم کے موقت ہونے کی طرف اشارہ فرمایا: یا اللہ ان کے لیے کوئی اور سبیل پیدا کر دے۔ چار گواہ نہ ہونے کی صورت میں یہ حکم نہیں ہے، خواہ دیگر ذرائع سے علم اور یقین آ جائے۔

چنانچہ اس آیت میں موجود عمر قید کی سزا سورہ نور کی اس آیت سے منسوخ ہوگئی، جس میں مرد اور عورت دونوں کے لیے سو (۱۰۰) سو (۱۰۰) کوڑوں کی سزا متعین کی گئی۔ بعض مفسرین نے نِّسَآئِکُمۡ سے ''تمہاری بیویاں'' مراد لیا ہے۔ اس صورت میں یہ آیت منکوحہ عورتوں سے مربوط ہو جاتی ہے۔ بعد میں آیۂ رجم سے یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

احادیث

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے: عمر قید کا حکم آیہ فَاجْلِدُوْا سے منسوخ ہے۔[1]

اہم نکات

۱۔ چار گواہوں کی شرط اس لیے ہے کہ ہر کوئی لوگوں کی ناموس و عزت سے نہ کھیلے۔

۲۔ اگرچہ اس سنگین گناہ کی سزا عمر قید سے کم نہیں تھی، مگر خدا نے رحم کرتے ہوئے اس آیت کو منسوخ کر دیا اور کوڑوں کی سزا سبیل کے طور پر معین فرمائی۔

وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِہَا مِنۡکُمۡ فَاٰذُوۡہُمَا ۚ فَاِنۡ تَابَا وَ اَصۡلَحَا فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡہُمَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۶﴾

۱۶۔ اور اگر تم میں سے دو اشخاص بدکاری کا ارتکاب کریں تو ان دونوں کو اذیت دو پھر اگر وہ دونوں توبہ کریں اور اپنی اصلاح کر لیں تو ان کا پیچھا چھوڑ دو، بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَالَّذٰنِ: اگر مرد اور عورت دونوں بدکاری کے مرتکب ہوجائیں تو اس وقت ان دونوں کے لیے ابتداء میں یہ سزا تجویز کی گئی کہ ان دونوں کو اذیت دی جائے۔ اس آیت میں زنا کی سزا پہلی صورت سے مختلف ہے۔ اس لیے لازمی طور پر اس زنا کی نوعیت بھی مختلف ہونی چاہیے۔ اسی وجہ سے بعض مفسرین اس آیت کو غیر شادی شدہ مرد و عورت کے زنا پر محمول کرتے ہیں۔ بہرحال بعض کے نزدیک یہ آیت بھی منسوخ ہے اور سورہ نور میں زنا کی سزا سو (۱۰۰) کوڑے مارنا معین ہوئی ہے۔ لیکن بعض کا نظریہ قرین واقع معلوم ہوتا ہے کہ اذیت دینے کا حکم منسوخ نہیں ہوا بلکہ ۱۰۰ کوڑوں سے اس کی وضاحت ہوگئی۔

۲۔ فَاِنۡ تَابَا: اگر یہ دونوں ارتکاب زنا کے بعد توبہ کریں اور احساس ندامت کریں، دوبارہ عفت و پاکدامنی کی طرف رجوع کریں۔

۳۔ وَ اَصۡلَحَا: اور اصلاح کر لیں۔ یعنی آیندہ کی زندگی کو اس قسم کی آلودگی پاک رکھیں۔ اصلاح کے بغیر صرف اظہار توبہ ایک بہانہ بھی ہوسکتا ہے۔

---

[1] الوسائل ۲۸: ۶۷

۴۔ فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡهُمَا: ان کا پیچھا چھوڑ دو، ان پر یہ حد جاری نہ کرو۔ چونکہ توبہ سے حد ساقط ہو جاتی ہے۔

اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَی اللّٰهِ لِلَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ یَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِیۡبٍ فَاُولٰٓئِكَ یَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلَیۡهِمۡ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیۡمًا حَكِیۡمًا ﴿۱۷﴾

۱۷۔ اللہ کے ذمے صرف ان لوگوں کی توبہ (قبول کرنا) ہے جو نادانی میں گناہ کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں، اللہ ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور اللہ بڑا دانا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

تَوۡبَة رجوع کرنے، پلٹنے اور متوجہ ہونے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ گناہوں سے توبہ کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کی نافرمانی کر کے منہ پھیرنے کے بعد اپنے کیے پر پشیمانی کی حالت میں اپنے رب کی طرف دوبارہ رجوع کرتا ہے۔

توبہ دو عناصر سے مرکب ہے: ایک اپنے کیے پر نادم ہونا اور دوسرا دوبارہ عدم ارتکاب کا عہد کرنا۔ یعنی توبہ ضمیر کی بیداری اور نئی زندگی کا عہد ہے۔

عَلَی اللّٰهِ: توبہ قبول کرنا اللہ کے ذمے ہے، یعنی لازم ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی نے اللہ کے ذمے لازم قرار دیا ہے، بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اور توبہ کو پسند فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیۡنَ ...[1]	بے شک خدا توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ۔[2]	یقیناً اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شرائط کی موجودگی میں توبہ قبول کرنا لازمی امر ہے۔

بِجَهَالَةٍ: جہالت کا ایک استعمال علم اور دوسرا استعمال عناد اور ضد کے مقابلے میں ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ یہ غلطی ضد اور انا کی وجہ سے نہیں بلکہ جہالت کی وجہ سے نادانی میں سرزد ہوئی ہے۔ یعنی غفلةً سرزد ہوئی ہے۔ لہٰذا غلط کار کو عرف میں نادان کہا جاتا ہے۔ آیہ شریفہ میں جہالت سے مراد وہ حالت ہے جب انسان پر خواہشات اور غضب کا غلبہ ہوتا ہے۔ یہاں اگرچہ انسان کو گناہ کا علم ہوتا ہے، لیکن شہوت و غضب انسان کو ایسی غفلت میں ڈال دیتے ہیں گویا عقل و شعور سلب ہو جاتے ہیں۔ اس حالت کو جہالت کہا

---

[1] ۲ بقرہ: ۲۲۲	[2] ۱۳ رعد: ۳۱

گیا ہے۔ لہٰذا جہالۃً گناہ سرزد ہونے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ انسان گناہ کا ارتکاب اللہ کے ساتھ عناد اور ضد کی حالت میں نہیں کرتا۔ مثلاً نافرمانی کرتے ہوئے اس کا خیال یہ نہیں ہوتا کہ چلو میں زنا کرتا ہوں اللہ میرا کیا بگاڑ سکتا ہے، بلکہ وہ اس عمل کو مولا کی نافرمانی خیال کرتا ہے، لیکن جہالۃً یعنی خواہشات کی وجہ سے غفلۃً اس سے یہ گناہ سرزد ہو جاتا ہے۔ جہالت کے دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ انسان گناہ کے انجام بد اور ناراضگی رب اور عذاب اخروی سے غافل ہو جاتا ہے۔

مِنۡ قَرِیۡبٍ: یعنی جہالت ختم ہوتے ہی، شہوت و غضب فرو ہوتے ہی بلا فاصلہ پشیمانی ہوتی ہے تو توبہ ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں وارد شدہ احادیث کی روشنی میں مفسرین قَرِیۡب سے مراد پوری زندگی لیتے ہیں. یعنی موت قریب ہی ہوتی ہے، اس لیے موت سے پہلے توبہ کر لے۔ فرصت ہاتھ سے جانے سے قبل توبہ کر لے۔ اس پر دلیل اس کے بعد آنے والی آیت ہے جس میں ارشاد فرمایا ہے کہ ان لوگوں کی توبہ قبول نہ ہوگی جو زندگی بھر گناہ کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں:

حَتّٰۤی اِذَا حَضَرَ اَحَدَہُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ اِنِّیۡ تُبۡتُ الۡـٰٔنَ ....[1] یہاں تک کہ ان میں سے کسی کی موت کا وقت آ پہنچتا ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے: اب میں نے توبہ کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ موت سامنے آنے سے پہلے توبہ کی گنجائش رہتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ توبہ رجوع اختیاری اور بیداریٔ ضمیر و تجدید عہد کا نام ہے۔ یہ صورت انسان کی زندگی میں ممکن ہے۔ موت یقینی ہونے کی صورت میں رجوع صادق نہیں آتا اور نہ تجدید عہد صادق آتا ہے۔

توبہ انسانی زندگی پر محیط ہو تو قبول ہے۔ ماضی کے عمل بد پر ندامت مستقبل کے لیے تجدید عہد اور نئی زندگی کا آغاز، مستقبل میں ارتکاب گناہ سے دور رہنے کا عزم و ارادہ۔ ندامت اور ارادہ دونوں باطنی عمل ہیں، جن کا نتیجہ کردار سے ظاہر ہوتا ہے۔ لہٰذا توبہ میں ندامت اور ارادے کا ہونا ضروری ہے۔ جس کی موت حاضر ہے، اس کے لیے ندامت تو ممکن ہے لیکن اس کے پاس مستقبل نہیں، جس کے لیے وہ عزم و ارادہ کرے:

وَاَسَرُّوا النَّدَامَۃَ لَمَّا رَاَوُا الۡعَذَابَ ...[2] جب وہ عذاب کو دیکھ لیں گے تو دل میں ندامت لیے بیٹھیں گے۔

احادیث

رسالتمآب (ص) سے روایت ہے کہ آپ (ص) نے فرمایا:

لما هبط ابليس قال و عزتك و جلالك وعظمتك لا افارق ابن آدم حتى تفارق روحه جسده فقال الله سبحانه: وعزتي و جلالي و عظمتي

ابلیس نے جب زمین پر نزول کیا تو کہا: تیری عزت و جلال و عظمت کی قسم، میں ابن آدم کی روح جسم سے خارج ہونے تک نہیں چھوڑوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے میری عزت و جلال و عظمت کی قسم

---

[1] ۴ نساء: ۱۸ [2] ۳۴ سبا: ۳۳

لا احجب التوبة عن عبدی حتی یغرغر بھا۔[1]

ہے کہ میں اپنے بندے کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا رکھوں گا جب تک اس پر نزع روح کا غرغرہ طاری نہ ہو جائے۔

وَ لَیۡسَتِ التَّوۡبَۃُ لِلَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ السَّیِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤی اِذَا حَضَرَ اَحَدَہُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ اِنِّیۡ تُبۡتُ الۡـٰٔنَ وَ لَا الَّذِیۡنَ یَمُوۡتُوۡنَ وَ ہُمۡ کُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِکَ اَعۡتَدۡنَا لَہُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ﴿۱۸﴾

۱۸۔اور ایسے لوگوں کی توبہ (حقیقت میں توبہ ہی) نہیں جو برے کاموں کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان میں سے کسی کی موت کا وقت آ پہنچتا ہے تو وہ کہ اٹھتا ہے: اب میں نے توبہ کی اور نہ ہی ان لوگوں کی (توبہ قبول ہے) جو مرتے دم تک کافر رہتے ہیں، ایسے لوگوں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَیۡسَتِ التَّوۡبَۃُ: یہاں ندامت کا محرک ضمیر کی بیداری، احساس گناہ اور تجدید عہد کا عزم و ارادہ نہیں ہے کہ اللہ اس پر مہربانی فرمائے، بلکہ یہاں ندامت کا محرک زندگی سے ناامیدی اور عذاب آخرت کا مشاہدہ ہے۔ لہٰذا دراصل یہ توبہ ہے ہی نہیں۔ یعنی رجوع اختیاری نہیں، بلکہ یہ ندامت اضطراری ہے۔

۲۔ وَ لَا الَّذِیۡنَ یَمُوۡتُوۡنَ: جو لوگ حالت کفر میں مرتے ہیں، ان کی زندگی میں تو کوئی توبہ نہیں ہوتی، مگر یہ کہ موت سامنے آ جاتی ہے تو پردے ہٹ جاتے ہیں، حقائق سامنے آجاتے ہیں تو کافر کو بھی قبل از مرگ ندامت ہو جاتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ موت نظر آنے تک عملاً گناہ میں مگن رہنے والوں کی توبہ قبول نہیں۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا یَحِلُّ لَکُمۡ اَنۡ تَرِثُوا النِّسَآءَ کَرۡہًا ؕ وَ لَا تَعۡضُلُوۡہُنَّ لِتَذۡہَبُوۡا بِبَعۡضِ

۱۹۔ اے ایمان والو! تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم عورتوں کے جبراً وارث بنو اور اس نیت سے انہیں قید نہ رکھو کہ تم نے جو کچھ انہیں دیا

---

[1] بحار الانوار ۶: ۱۶ ۔ البیان ۴: ۱۴۷

مَاۤ اٰتَیۡتُمُوۡہُنَّ اِلَّاۤ اَنۡ یَّاۡتِیۡنَ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ ۚ وَ عَاشِرُوۡہُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ۚ فَاِنۡ کَرِہۡتُمُوۡہُنَّ فَعَسٰۤی اَنۡ تَکۡرَہُوۡا شَیۡئًا وَّ یَجۡعَلَ اللّٰہُ فِیۡہِ خَیۡرًا کَثِیۡرًا ﴿۱۹﴾

ہے اس میں سے کچھ حصہ واپس لے لو مگر یہ کہ وہ مبینہ بدکاری کی مرتکب ہوں اور ان کے ساتھ اچھے انداز میں زندگی بسر کرو، اگر وہ تمہیں ناپسند ہیں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں تو ناپسند ہو مگر اللہ اس میں بہت سی خوبیاں پیدا کر دے۔

تشریح کلمات

تَعۡضُلُوۡہُنَّ: (ع ض ل) العضل ۔ روکنا۔ تشدد کرنا اور عرصہ حیات تنگ کرنا۔

تفسیر آیات

اس آیہ شریفہ میں درج ذیل مباحث و مسائل مذکور ہیں:

i۔ لَا یَحِلُّ لَکُمۡ: عرب جاہلیت میں ایک رسم یہ تھی کہ شوہر کے مرنے کے بعد اس کے مال و مویشی کی طرح اس کی بیویاں بھی ورثاء کی طرف منتقل ہو جاتی تھیں۔ ورثاء میں سے جو جس بیوہ پر اپنی چادر ڈال دیتا تھا، وہ اس کا مال شمار ہوتی تھی۔ اس آیت میں واضح طور پر فرمایا کہ عورت متروکہ جائیداد نہیں، بلکہ شوہر کے مرنے کے بعد وہ آزاد ہے کہ ایام عدت گزارنے کے بعد وہ جس سے چاہے نکاح کر لے۔

ii۔ وَ لَا تَعۡضُلُوۡہُنَّ: وہ دوسری زیادتی یہ کرتے تھے کہ ان عورتوں کو دوسری جگہ نکاح کرنے نہیں دیتے تھے، یہاں تک کہ وہ وہیں مر جائیں اور ان کا مال اپنے تصرف میں لے آتے۔ قرآن نے اس مکروہ رسم کو بھی یکسر ختم کر دیا۔

iii۔ صریحاً بدکاری کے ارتکاب کی صورت میں شوہر کو یہ حق دیا کہ بیوی کو حق مہر کے طور پر دیا ہوا اپنا مال واپس لے، یعنی خلع لے کر اسے طلاق دے۔

iv۔ وَ عَاشِرُوۡہُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ: عورتوں کے ساتھ بہترین انداز میں زندگی گزارو۔ یہ خطاب شوہروں سے ہے کہ عورتوں سے اچھا سلوک کریں۔ انہیں معاشرے کا ایک رکن تصور کریں اور بقول قرآن مرد اور عورت اصل واحد کی دو شاخیں ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی کسی کا حاکم یا محکوم نہیں۔ کسی کو کسی پر مطلق بالا دستی نہیں ہے۔ البتہ مرد اور عورت میں بعض ایسی مختلف خاصیتیں ضرور ہیں جن کی وجہ سے ان کی ذمہ داریوں میں فرق آ جاتا ہے۔ جیسے دیگر مختلف طبقات میں

فرق آ جا تا ہے۔ مثلا نابالغ، بیمار، بوڑھے، معذور، عالم اور جاہل وغیرہ میں ذمہ داریوں کے اعتبار سے فرق ہے، لیکن انسان ہونے کے ناطے سب برابر اور احترام آدمیت کے مستحق ہیں۔

v۔ فَاِنۡ کَرِہۡتُمُوۡہُنَّ: عورت میں اخلاقی فساد، کردار کی خرابی نہ ہونے کی صورت میں، محض اپنے مزاج کے موافق نہ ہونے کی وجہ سے اس سے کراہت کرنا درست نہیں ہے۔ اپنے وقتی ذوق کی تسکین نہ بھی ہو، ممکن ہے عقل و فطرت کے اعتبار سے اس عورت میں خیر کثیر ہو۔ اس میں ایک الٰہی وعدہ مضمر ہے کہ جو لوگ ظاہری شکل و صورت کی جگہ باطنی طہارت کو ترجیح دیتے ہیں، ان کے لیے عورتیں خیر کثیر کا سرچشمہ ہوا کرتی ہیں۔ قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ وہ عورت جسے دوسرے ادیان ''شر محض'' کہتے ہیں، قرآن نے اسے ''خیر کثیر'' سے تعبیر کیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ عورت مال و متاع نہیں، جیسا کہ دیگر ادیان کا تصور ہے، بلکہ یہ ایک انسان ہے۔

۲۔ عورت اگر بدکردار نہیں ہے تو اس پر کوئی ناروا پابندی نہیں لگائی جا سکتی: اِلَّاۤ اَنۡ یَّاۡتِیۡنَ بِفَاحِشَۃٍ.

۳۔ عورت بقول دیگر ادیان شر محض ہے، جب کہ بقول قرآن اس میں خیر کثیر بھی ہو سکتا ہے: خَیۡرًا کَثِیۡرًا۔

وَ اِنۡ اَرَدۡتُّمُ اسۡتِبۡدَالَ زَوۡجٍ مَّکَانَ زَوۡجٍ ۙ وَّ اٰتَیۡتُمۡ اِحۡدٰہُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡہُ شَیۡئًا ؕ اَتَاۡخُذُوۡنَہٗ بُہۡتَانًا وَّ اِثۡمًا مُّبِیۡنًا ﴿۲۰﴾

۲۰۔ اور اگر تم لوگ ایک زوجہ کی جگہ دوسری زوجہ لینا چاہو اور ایک کو بہت سا مال بھی دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لینا، کیا تم بہتان اور صریح گناہ کے ذریعے مال لینا چاہتے ہو؟

وَ کَیۡفَ تَاۡخُذُوۡنَہٗ وَ قَدۡ اَفۡضٰی بَعۡضُکُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ وَّ اَخَذۡنَ مِنۡکُمۡ مِّیۡثَاقًا غَلِیۡظًا ﴿۲۱﴾

۲۱۔ اور دیا ہوا مال تم کیسے واپس لے سکتے ہو؟ جب کہ تم ایک دوسرے سے مباشرت کر چکے ہو اور وہ تم سے شدید عہد و قرار لے چکی ہیں۔

تشریح کلمات

بُہۡتَانًا: (ب ہ ت) بہت۔ حیران و ششدر رہ جانا۔ بہتان ایسا الزام ہے جسے سن کر انسان حیران اور ششدر رہ جائے۔

اَفۡضٰی: (ف ض و) مباشرت کرنا۔ قریبی اتصال رکھنا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِنۡ اَرَدۡتُّمُ: اگرکوئی شخص محض اپنی خواہشات کی بنا پر موجودہ بیوی کو طلاق دے کر دوسری شادی کرنا چاہتا ہے اور ایک معتد بہ مال اس بیوی کو حق مہر کے طور پر دے چکا ہے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ یہ پورا مال یا اس میں سے کچھ حصہ طلاق کے معاوضے میں واپس لے لے۔ اسے دیا ہوا مال واپس لینے کا مطلب خود بخود یہ نکلتا ہے کہ شوہر بیوی پر بدکاری کا الزام عائد کر رہا ہے، ورنہ حق مہر ادا نہ کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے، جب کہ اللہ کے نزدیک یہ عظیم گناہ ہے۔

۲۔ دوسری آیت میں دو باتیں اور بیان فرمائی گئی ہیں:

i۔ وَقَدۡ اَفۡضٰی: اول یہ کہ دیا ہوا مہر واپس لینے کی کوئی جائز صورت اس لیے بھی نہیں ہے کہ تم آپس میں ازدواجی مباشرت کر چکے ہو۔ یعنی عورت اپنے وجود کو تمہارے حوالے کر چکی ہے، جس کے بعد مہر کی رقم تمہارے ذمے واجب الادا ہو چکی ہے۔

ii۔ مِّیۡثَاقًا غَلِیۡظًا: دوسری بات یہ ہے کہ تم نے عقد نکاح کے ذریعے عہد و میثاق باندھا ہے، جس کی وجہ سے عورت نے اپنے آپ کو تمہارے حوالے کیا ہے۔ مہر کی ادائیگی بھی اس عہد و میثاق میں شامل ہے۔

اہم نکات

۱۔ مالکیت اور معاہدوں میں عورت کا بھی مرد کی طرح احترام کیا جائے گا۔

وَ لَا تَنۡکِحُوۡا مَا نَکَحَ اٰبَآؤُکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ ؕ اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً وَّ مَقۡتًا ؕ وَ سَآءَ سَبِیۡلًا ﴿۲۲﴾

۲۲۔ اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں مگر جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا، یہ ایک کھلی بے حیائی اور ناپسندیدہ عمل اور برا طریقہ ہے۔

تشریح کلمات

مَقۡتًا: (م ق ت) مقت۔ کسی شخص کو فعل قبیح کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھ کر اس سے بغض رکھنا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَا تَنۡکِحُوۡا مَا نَکَحَ اٰبَآؤُکُمۡ: زمانہ جاہلیت میں کچھ لوگ سوتیلی ماؤں سے شادیاں کر لیا کرتے

تھے۔ گو کہ یہ عمل اس وقت بھی لوگوں کی نظر میں مبغوض تھا۔ چنانچہ اسے نکاح المقت کہتے تھے۔

۲۔ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ سے نزول حکم سے قبل کا حکم بیان فرمایا کہ اس سے پہلے جو اس قسم کی شادیاں ہو چکی ہیں، ان سے درگزر کیا جاتا ہے۔ باپ کی منکوحہ سے شادی کرنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔ خواہ باپ نے اس عورت سے مباشرت کی ہو یا نہ کی ہو۔ لہٰذا اگر باپ نے کسی عورت سے صرف عقد ہی کیا ہے اور مباشرت نہیں کی تو بھی وہ عورت بیٹے پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر باپ نے کسی عورت سے ناجائز تعلق قائم کیا ہو اور حرام طور پر مقاربت کی ہو تو وہ عورت بھی اس کے بیٹے پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔

حُرِّمَتۡ عَلَیۡکُمۡ اُمَّهٰتُکُمۡ وَ بَنٰتُکُمۡ وَ اَخَوٰتُکُمۡ وَ عَمّٰتُکُمۡ وَ خٰلٰتُکُمۡ وَ بَنٰتُ الۡاَخِ وَ بَنٰتُ الۡاُخۡتِ وَ اُمَّهٰتُکُمُ الّٰتِیۡۤ اَرۡضَعۡنَکُمۡ وَ اَخَوٰتُکُمۡ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ اُمَّهٰتُ نِسَآئِکُمۡ وَ رَبَآئِبُکُمُ الّٰتِیۡ فِیۡ حُجُوۡرِکُمۡ مِّنۡ نِّسَآئِکُمُ الّٰتِیۡ دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ ۫ فَاِنۡ لَّمۡ تَکُوۡنُوۡا دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ ۫ وَ حَلَآئِلُ اَبۡنَآئِکُمُ الَّذِیۡنَ مِنۡ اَصۡلَابِکُمۡ ۙ وَ اَنۡ تَجۡمَعُوۡا بَیۡنَ الۡاُخۡتَیۡنِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۲۳﴾

۲۳۔ تم پر حرام کر دی گئی ہیں تمہاری مائیں تمہاری بیٹیاں تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیاں تمہاری خالائیں، تمہاری بھتیجیاں، تمہاری بھانجیاں، تمہاری وہ مائیں جو تمہیں دودھ پلا چکی ہوں اور تمہاری دودھ شریک بہنیں، تمہاری بیویوں کی مائیں اور جن بیویوں سے تم مقاربت کر چکے ہو ان کی وہ بیٹیاں جو تمہاری پرورش میں رہی ہوں، لیکن اگر ان بیویوں سے (صرف عقد ہوا ہو) مقاربت نہ ہوئی ہو تو کوئی حرج نہیں ہے نیز تمہارے صلبی بیٹوں کی بیویاں اور دو بہنوں کا باہم جمع کرنا، مگر جو پہلے ہو چکا سو ہو چکا، بے شک اللہ بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

محرمات نسبی: وہ نسب جن سے نکاح حرام ہے، سات ہیں:

i۔ ماں۔ اس کا اطلاق سگی اور سوتیلی سب ماؤں پر ہوتا ہے نیز اس کا اطلاق باپ کی ماں یعنی دادی

اور ماں کی ماں یعنی نانی پر بھی ہوتا ہے۔

ii۔ بیٹی۔اس میں اپنی صلبی بیٹی، بیٹی کی بیٹی اور بیٹے کی بیٹی سب شامل ہیں۔

iii۔ بہن۔اس میں سگی بہن، باپ شریک بہن اور ماں شریک بہن سب کا حکم یکساں ہے۔

iv۔ پھوپھی۔یعنی اپنے باپ کی حقیقی بہن، ماں شریک بہن اور باپ شریک بہن، سب اس حکم میں یکساں ہیں۔

v۔ خالہ۔اپنی ماں کی حقیقی بہن، ماں شریک بہن اور باپ شریک بہن، سب کا ایک ہی حکم ہے۔

vi۔ بھتیجی۔ بھائی کی حقیقی بیٹی، ماں شریک اور باپ شریک بھائی کی بیٹیاں، سب اس حکم میں شامل ہیں۔

vii۔ بھانجی، بہن کی حقیقی بیٹی، ماں شریک اور باپ شریک بہن کی بیٹیاں، سب اس حکم میں یکساں ہیں۔

محرمات رضاعی: دودھ پینے سے بننے والے وہ رشتے جن سے نکاح حرام ہو جاتا ہے:

i۔ رضاعی مائیں۔

ii۔ رضاعی بہنیں۔

آیت میں صرف انہی دونوں کا ذکر ہے، لیکن یہ مسئلہ اپنی جگہ بالاجماع ثابت ہے کہ وہ تمام رشتے جو حقیقی والدین کے تعلق سے حرام ہوتے ہیں، رضاعی والدین کے تعلق سے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ فریقین نے رسول اکرم (ص) کا یہ فرمان اس حکم کا ماخذ قرار دیا ہے:

اَنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی حَرَّمَ مِنَ الرَّضَاعَۃِ مَا حَرَّمَ مِنَ النَّسَبِ۔[1] اللہ تعالیٰ نے رضاعت کے سبب وہ تمام رشتے حرام کیے ہیں جو رشتے نسب کے سبب حرام کیے ہیں۔

لہٰذا اگر کسی بچے نے کسی عورت کا دودھ پیا ہو تو وہ عورت اس بچے کی ماں، اس کا شوہر اس بچے کا باپ، اس کی اولاد اس بچے کے بہن بھائی، اس کی بہنیں اس بچے کی خالائیں بن جاتی ہیں اور اس کے شوہر کی بہنیں اس بچے کی پھوپھیاں بن جاتی ہیں۔

یہاں چند ایک مسائل قابل توجہ ہیں:

مدت رضاعت: اس میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ کس عمر کا بچہ کسی عورت کا دودھ پی لے تو حرمت ثابت ہوتی ہے؟ فقہ حنفی کے مطابق مدت رضاعت ڈھائی سال ہے۔ اگر بچہ اس عمر کے اثنا میں دودھ پیئے تو حرمت ثابت ہوگی۔ بعض فقہاء کے نزدیک عمر کی قید نہیں، جوان اور بوڑھا شخص بھی کسی عورت کا دودھ پیئے تو حرمت ثابت ہوگی ۔حضرت عائشہ کا بھی یہی نظریہ ہے۔

---

[1] مستدرک الوسائل ۱۴: ۳۵۶

امامیہ کے نزدیک یہ مدت دو سال ہے۔ کیونکہ قرآن نے مدت رضاعت دو سال قرار دی ہے:

وَالۡوَالِدٰتُ یُرۡضِعۡنَ اَوۡلَادَهُنَّ حَوۡلَیۡنِ کَامِلَیۡنِ ۔۔۔۔[1]	اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔

اور حدیث نبوی ہے:

لَا رَضَاعَ بَعْدَ فِطَامٍ ۔[2]	دودھ چھڑانے کے بعد کی رضاعت کا کوئی اثر نہیں۔

امام شافعی اور امام احمد کا بھی یہی نظریہ ہے۔

مقدار رضاعت: کس قدر دودھ پینے سے حرمت ثابت ہوتی ہے؟ فقہ حنفی اور مالکی کے مطابق جتنی مقدار سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اتنی مقدار دودھ پی لے تو حرمت ثابت ہوجائے گی۔ امام احمد کے نزدیک تین مرتبہ دودھ پینے سے، شافعی کے نزدیک پانچ مرتبہ دودھ پینے سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔

جب کہ امامیہ کے نزدیک ایک دن رات بچہ ایک عورت کا دودھ پیئے اور اس اثنا میں کسی اور عورت کا دودھ نہ پیئے یا پندرہ مرتبہ ایک ہی عورت کا دودھ پیئے اور اس اثنا میں کسی اورعورت کا دودھ نہ پیئے تو حرمت ثابت ہوتی ہے۔

مسلم نسائی ابن ماجہ نے ام الفضل سے روایت کی ہے:

لا تحرم الا ملاجة و لا الاملا جتان	ایک بار یا دو بار دودھ پینے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی.

مسلم، نسائی اور ابن ماجہ کی روایت ہے۔

لا تحرم المصة و لا المصتان	ایک بار یا دو بار چوسنے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔

محرمات مصاہرہ۔ بیویوں کی مائیں: خواہ بیوی کے ساتھ مقاربت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ یعنی محض نکاح سے منکوحہ کی ماں حرام ہو جاتی ہے۔ چنانچہ آیت میں بھی یہاں مقاربت کی قید نہیں ہے، جیسا کہ بیوی کی بیٹی حرام ہونے کے لیے شرط ہے۔ اس حکم میں بیویوں کی نانیاں، دادیاں، نسبی ہوں یا رضاعی، سب شامل ہیں۔

بیویوں کی بیٹیاں: ان میں بیوی کی پوتیاں اور نواسیاں بھی شامل ہیں۔ یہاں پر پرورش میں رہنے کا ذکر بطور قید نہیں، بلکہ ایک امر واقع کے طور پر ذکر کیا ہے۔ البتہ یہاں منکوحہ سے مقاربت شرط ہے۔ اگر عقد کے بعد منکوحہ سے مقاربت نہ ہوئی ہو تو اس عورت کی بیٹی حرام نہیں ہوتی۔

بیٹے کی بیوی: بشرطیکہ بیٹا حقیقی یعنی صلبی ہو۔ لہٰذا لے پالک بیٹے اس میں شامل نہیں ہیں۔ البتہ پوتے اور نواسے کی بیویاں اور رضاعی بیٹوں کی بیویاں بھی اس میں شامل ہیں۔

دو بہنوں سے بیک وقت نکاح: دو بہنوں سے بیک وقت نکاح کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ یعنی جب تک زوجہ زندہ اور حبالۂ عقد میں باقی ہے، اس وقت تک زوجہ کی بہن سے عقد نہیں ہوسکتا۔ البتہ زوجہ کی

---

[1] ۲ بقرہ: ۲۳۳ [2] الکافی ۵: ۴۴۳

وفات یا طلاق کے بعد اس کی بہن سے نکاح ہو سکتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ بَنٰتُکُمۡ کے ذریعے بیٹی کی بیٹی کو بھی قانوناً اولاد میں شامل کیا گیا ہے۔

وَّ الۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ ۚ کِتٰبَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ ۚ وَ اُحِلَّ لَکُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمۡ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا بِاَمۡوَالِکُمۡ مُّحۡصِنِیۡنَ غَیۡرَ مُسٰفِحِیۡنَ ؕ فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِہٖ مِنۡہُنَّ فَاٰتُوۡہُنَّ اُجُوۡرَہُنَّ فَرِیۡضَۃً ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ فِیۡمَا تَرٰضَیۡتُمۡ بِہٖ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡفَرِیۡضَۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ﴿۲۴﴾

۲۴۔ اور شوہر دار عورتیں بھی (تم پر حرام ہیں) مگر جو تمہاری ملکیت میں آ جائیں، (یہ) تم پر اللہ کا فرض ہے اور ان کے علاوہ باقی عورتیں تم پر حلال ہیں، ان عورتوں کو تم مال خرچ کر کے اپنے عقد میں لا سکتے ہو بشرطیکہ (نکاح کا مقصد) عفت قائم رکھنا ہو بے عفتی نہ ہو، پھر جن عورتوں سے تم نے متعہ کیا ہے ان کا طے شدہ مہر بطور فرض ادا کرو، البتہ طے کرنے کے بعد آپس کی رضا مندی سے (مہر میں کمی بیشی) کرو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، یقیناً اللہ بڑا جاننے والا، حکمت والا ہے۔

تشریح کلمات

الۡمُحۡصَنٰتُ: (ح ص ن) الحصن سے ہے، جس کا معنی ہے محفوظ قلعہ۔ اسی سے عفیفہ عورت کو حصان کہتے ہیں۔ عورت نکاح کے حصار میں آنے کے بعد محصنہ کہلاتی ہے۔

السفاح: (س ف ح) مُسٰفِحِیۡنَ: زنا، بدکاری۔

تفسیر آیات

۱۔ وَّ الۡمُحۡصَنٰتُ: اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے کہ سابقہ آیت میں مذکور عورتوں کے علاوہ شوہر دار عورتیں بھی تم پر حرام ہیں۔ ایک عورت کا ایک ہی شوہر ہو سکتا ہے۔

۲۔ اِلَّا مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ: اس سے وہ شوہر دار کافر عورتیں مستثنیٰ ہیں جو اسیر ہو کر مسلمانوں

کے قبضے میں آ جاتی ہیں کہ اگر ان کے شوہر دار الحرب میں موجود ہوں تو ان کے نکاح ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس صورت میں حکومت ان کنیزوں کو اگر آزاد کر دے یا ان سے فدیہ لے یا انہیں مسلم قیدیوں کے تبادلے میں آزاد کر دے تو بھی درست ہے اور اگر ان کنیزوں کو سپاہیوں میں تقسیم کر دے تو اس صورت میں یہ سپاہی اس کنیز کا مالک بن جاتا ہے۔ اس صورت میں مالک اپنی کنیز کے ساتھ بعنوان مملوکہ مقاربت کر سکتا ہے، جیسا کہ دوسری عورتوں سے بعنوان عقد نکاح مقاربت کر سکتا ہے۔

اس کے علاوہ عورتیں حلال ہیں۔ لیکن بطور حصان حلال ہیں، بطور سفاح حلال نہیں ہیں۔

مُّحۡصِنِیۡنَ: جب کوئی عورت کسی مرد کے عقد میں آ جاتی ہے تو وہ عورت دوسرے مردوں کے لیے حرام ہو جاتی ہے، چونکہ اب یہ عورت اپنے شوہر کے حصار حصان میں محفوظ ہو گئی ہے۔ عورت جب مرد کے نکاح میں آ جاتی ہے تو اس کی عفت کو تحفظ مل جاتا ہے۔ زن و شوہر کے تعلقات کو قانونی حیثیت مل جاتی ہے، اس سے نسوانی عفت و آبرو کو تحفظ مل جاتا ہے۔ یہ تعلقات ایک عہد و پیمان اور ذمہ داری و مسئولیت کی بنا پر قائم ہوئے ہیں نیز ان تعلقات کے نتیجے میں جو اولاد پیدا ہو گی، اسے بھی حسب و نسب کے حوالے سے تحفظ حاصل ہو گا۔ لہٰذا بعض معاصر حضرات کا یہ کہنا کہ متعہ میں تحفظ نہیں ہے، لہٰذا حصان کی شرط سے متعہ کی نفی ہوتی ہے''[1] محض عصبیت پر مبنی تفسیر بالرائے ہے کیونکہ متعہ میں بھی:

i۔ جب عورت کسی مرد کے عقد میں ہوتی ہے تو دوسرے مردوں پر حرام ہوتی ہے۔

ii۔ آپس کے تعلقات کو قانونی عہد و پیمان کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

iii۔ ان تعلقات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اولاد کو بھی حسب و نسب کے حوالے سے تحفظ حاصل ہوتا ہے۔

iv۔ اس عقد میں مال یعنی حق مہر کا ذکر بھی ضروری ہے۔

بہتر ہے کہ عقد متعہ اور عقد دائمی میں مشترکہ امور پر ایک نظر ڈالیں:

عقد متعہ اور عقد دائمی کے مشترکہ امور: ۱۔ عقد ۲۔ حق مہر ۳۔ حق حصانت ۴۔ نشر حرمت ۵۔ عدت[2] ۶۔ عقد کے لیے سببی و نسبی مانع نہ ہونا۔ ۷۔ اولاد کا وارث بن جانا۔[3] ۸۔ ولی کی اجازت کی

---

[1] تدبر قرآن ۲: ۲۷۸

[2] تعجب کا مقام ہے کہ بعض معاصر حضرات نے نہایت غیر ذمہ داری سے لکھا ہے کہ متعہ میں عدت نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو تفہیم القرآن سورہ مومنون و ڈاکٹر وھبہ الزحیلی تفسیر منیر ۵: ۱۳۰ میں۔ بھلا کوئی ایسا حکم ہو سکتا ہے جس میں تطہیر رحم کے بغیر اختلاط نسل کی اجازت دی گئی ہو یا کسی شخص نے آج تک ایسا فتویٰ دیا ہے؟

حضرت امام خوئی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ اس جگہ ارشاد فرماتے ہیں: سبحانك اللّٰھم۔ بار الہا! گواہ رہنا کہ شیعوں پر یہ کتنا بڑا الزام ہے۔ متقدمین اور متاخرین شیعہ فقہاء کی کتب قارئین کے سامنے ہیں۔ آج تک کسی شیعہ فقیہ کی طرف یہ قول منسوب نہیں ہے۔ یہ فتویٰ شاذ و نادر کے طور پر بھی فقہی کتب میں موجود نہیں، چہ جائیکہ یہ کوئی اجماعی مسئلہ ہو۔ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب شیعہ پر الزام لگانے والے دادگاہ الٰہی میں پیش ہوں گے۔ و ھنا لك یخسر المبطلون۔

[3] عقد متعہ کی ان حدود و قیود کو دارمی نے اپنی سنن ۲: ۱۴۰، طبری نے اپنی تفسیر ۵: ۹ خازن نے اپنی تفسیر ۱: ۲۵۷ اور مسلم نے اپنی صحیح باب المتعہ میں ذکر کیا ہے۔ یہ وہی تحفظ ہے جو دائمی عقد نکاح میں حاصل ہوتا ہے۔

ضرورت: فَانۡکِحُوۡہُنَّ بِاِذۡنِ اَہۡلِہِنَّ ۔۔۔۔[1]

عقد متعہ اور عقد دائمی میں فرق: i۔ مدت کا تعین ii۔ طلاق کی جگہ ابراء مدت یا مدت کا ختم ہو جانا iii۔ زوجین میراث نہیں لیتے۔

خلاصہ یہ کہ عورتیں اس صورت میں حلال ہیں کہ جب ان سے عہد و پیمان کریں اور ازدواجی تحفظ اور حقوق فراہم کریں۔ جس میں خاندان، گھر، بچوں، عزت و آبرو اور عصمت و عفت کا تحفظ ہے۔

سفاح۔ غَیۡرَ مُسٰفِحِیۡنَ: مرد و عورت میں ایسے تعلقات کو سفاح کہتے ہیں، جس میں ایک دوسرے پر کوئی ذمہ داری اور مسئولیت عاید نہیں ہوتی۔ صرف اور صرف شہوت رانی، وہ بھی غیر ذمہ دارانہ طریقے سے۔ اس تعلق کے قائم ہونے سے پہلے کوئی عہد و پیمان ہے، نہ بعد میں۔ جس میں نہ تو عورت کی عفت و عصمت کی کوئی قیمت اور قدر ہے اور نہ اس تعلق کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اولاد کی کوئی ضمانت و کفالت ہے۔

فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِہٖ مِنۡہُنَّ:

الف: یہ آیت، متعہ سے متعلق مشہور ہے، جس میں متعہ کی تشریع کا نہیں، بلکہ پہلے سے تشریع شدہ متعہ کے مہر کا حکم بیان ہو رہا ہے۔

ب: حرام عورتوں کے ذکر کے بعد فرمایا: ان کے علاوہ باقی عورتیں تم پر حلال ہیں۔ ان عورتوں کو تم مال خرچ کر کے اپنے عقد میں لا سکتے ہو، بشرطیکہ عقد کا مقصد عفت قائم رکھنا ہو، بے عفتی نہ ہو۔ اس پر ایک فرع، یعنی متعہ کا ذکر فرمایا: پس جن عورتوں سے تم نے متعہ کیا ہے، ان کا طے شدہ مہر بطور فرض ادا کرو۔

ج: عقد دائمی کے حق مہر کا ذکر سورہ بقرہ آیت ۲۳۷ میں آ چکا ہے۔ اس آیت میں عقد متعہ کے طے شدہ مہر کا ہی ذکر ہے۔

د: ان آیات کا نزول ہجرت کے بعد مدنی زندگی کے اوائل میں ہوا ہے۔ چنانچہ جنگ احد کے بعد میراث کے احکام نازل ہوئے اور سنہ چار ہجری میں بنی نضیر کا اخراج عمل میں آیا اور پانچ ہجری میں تیمّم کا حکم آیا۔ لہٰذا لازمی طور پر یہ آیت بھی مدنی ہے۔

ھ: جنسی خواہش ایک فطری اور انسانی ضرورت ہے۔ یہ کوئی نامناسب عمل نہیں ہے، جیسا کہ عیسائیت کے ہاں تصور ہے۔ اسلام نے اسے ایک پاکیزہ عمل قرار دیا ہے اور اس کے لیے قوانین، احکام اور آداب بیان کیے ہیں۔

یہ بیالوجیکل اعتبار سے بھی جسم کی ایک اہم ضرورت ہے، جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسے بیرونی دباؤ کے ذریعے روکنا صحت اور فکری اعتبار سے بہت سے مضرات کا سبب بن جاتا ہے۔ اسے دبانے سے مسئلہ

---

[1] نساء: ۲۵

حل نہیں ہوتا بلکہ معاشرے میں بہت سے مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔

حضرت ابن عباس نے درست فرمایا:

ما کانت المتعة ال ارحمة من اللّٰه رحم بھا امة محمد لو لا نھی عمر مازنی الاشقی۔[1]	امت محمد (ص) کے لیے متعہ اللہ کی طرف سے ایک رحمت تھا۔ اگر حضرت عمر اسے ممنوع قرار نہ دیتے تو شقی کے سوا کوئی زنا نہ کرتا۔

عقد متعہ سے منکوحہ عورت، زوجہ شمار ہوتی ہے۔ چنانچہ رسالت مآب (ص) کے عہد میں جب متعہ جائز اور رائج تھا تو اس کا ذکر زوجہ کے مقابلے میں نہیں ہوتا تھا، جیسا کہ مملوکہ کنیز کا ذکر آتا ہے، بلکہ اسے ازواج میں شامل رکھا گیا۔ چنانچہ مکہ میں نازل ہونے والے سورۂ مومنون میں فرمایا:

اِلَّا عَلٰۤی اَزۡوَاجِھِمۡ اَوۡمَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُھُمۡ ....۔[2]	سوائے اپنی بیویوں اور ان کنیزوں کے جو ان کی ملکیت ہوتی ہیں ....

ظاہر ہے کہ متعہ کی عورت کنیز یقیناً نہیں ہے، تو اگر زوجہ بھی نہیں ہے تو یہ تیسری قسم کی عورت ہوگئی جس سے زمان رسالت مآب (ص) اور بالخصوص مکی زندگی میں (بعض کے نزدیک جنگ خیبر تک اور بعض کے نزدیک فتح مکہ تک) جنسی تعلقات استوار کرنا جائز اور رائج تھا، لہٰذا اس کا ذکر آیت میں ضرور آتا۔ چنانچہ امام زمخشری نے کشاف ۳: ۲۶ میں تسلیم کیا ہے کہ متعہ ازواج میں شامل ہے۔ قرطبی نے اپنی تفسیر ۵: ۱۳۲ میں لکھا ہے:

لم یختلف العلماء من السلف و الخلف ان المتعة نکاح الی اجل لا میراث فیه۔	قدیم اور بعد کے تمام علماء نے اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کیا ہے کہ متعہ، نکاح کی ایک قسم ہے جو معین مدت کے لیے ہوتا ہے، جس میں میراث نہیں ہے۔

مقام تعجب تو یہ ہے کہ اہل سنت کے معتدبہ مفسرین نے کہا ہے کہ سورۂ مومنون کی اس آیت سے متعہ کا حکم منسوخ ہو گیا ہے۔ یعنی وہ حکم جو فتح خیبر یا فتح مکہ تک جائز اور رائج رہا، وہ بہت پہلے مکہ میں نازل ہونے والی ایک آیت کے ذریعے منسوخ ہو گیا ہوا تھا، تو اب بتائیں کہ کیا رسالتمآب (ص) اللہ کی منشا کے خلاف حرمت متعہ کے خلاف تھے؟ جنہوں نے متعہ کو منسوخ ہونے کے باوجود رائج رکھا یا یہ مفسرین اللہ اور رسول (ص) کی منشا کے خلاف حلیت متعہ کے خلاف ہیں؟

اصحاب رسول (ص) کی ایک معتدبہ تعداد نے روایت کی ہے کہ یہ آیت، متعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے:

i۔ ابن عباس۔ تفسیر طبری ۵: ۹۔ احکام القرآن جصاص ۲: ۱۷۸۔

---

[1] نهاية المجتهد ۲: ۵۷۔ تفسیر قرطبی ۵: ۱۳۰۔ تفسیر سمرقندی ۱: ۳۴۶
[2] ۲۳ مومنون: ۶

ii۔ عمران بن حصین ۔ مسند احمد ۴: ۴۳۶۔ صحیح بخاری ج ۲

iii۔ ابی بن کعب۔ احکام القرآن جصاص ۲: ۱۷۸

iv۔ عبد اللہ بن مسعود۔ شرح صحیح مسلم نووی ۹: ۸۱

تابعین میں سعید بن جبیر، قتادہ، مجاہد، سدی الحکم، شعبہ اور ابو ثابت حلیت متعہ کے قائل تھے اور اس آیت سے استدلال کرتے تھے۔ رہا یہ سوال کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد متعہ کے بارے میں کیا موقف تھا؟ اس سلسلے میں ہم قدرے تفصیل سے وہ مراحل بیان کریں گے، جن سے یہ مسئلہ گزرا ہے:

اصحاب رسول بعد از وفات رسول (ص): اس مرحلے میں آپ مطالعہ فرمائیں گے کہ امت محمدیہ میں حلیت متعہ کے بارے میں کوئی اختلاف نہ تھا اور سب اس کی حلیت کے قائل تھے۔ جن اصحاب کے اسمائے گرامی ہم تک پہنچے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

i۔ امیر المومنین علیہ السلام کا یہ فرمان مشہور ہے: اگر عمر نے متعہ کو ممنوع قرار نہ دیا ہوتا تو شقی کے سوا کوئی زنا نہ کرتا۔ ملاحظہ ہو کنز العمال ۸: ۲۹۴۔ البحر المحیط ۳: ۵۸۹۔

ii۔ ابن عباس: احکام القرآن جصاص، زاد المیعاد ابن قیم وغیرہ۔ صحیح مسلم ۱: ۴۶۷ میں آیا ہے:

كان ابن عباس يأمر بالمتعة	ابن عباس متعہ کے حکم دیا کرتے تھے۔

کنز العمال میں عروۃ بن زبیر کی روایت میں آیا ہے کہ ابن عباس نے کہا:

الا للعجب انی احدثه عن رسول الله و يحدثني عن ابی بكر و عمر.	تعجب کا مقام ہے کہ حلیت متعہ کے بارے میں، میں رسول اللہ (ص) کی حدیث بیان کرتا ہوں، یہ لوگ ابوبکر و عمر کی باتیں سناتے ہیں۔

نیز عطا نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے تھے:

ما كانت المتعة الا رحمة رحم بها هذه الامة لو لا نهى عمر عنها ما زنى الا شقي۔[1]	امت محمد (ص) کے لیے متعہ اللہ کی طرف سے ایک رحمت تھا۔ اگر (حضرت) عمر اسے ممنوع قرار نہ دیتے تو شقی کے سوا کوئی زنا نہ کرتا۔

iii۔ عمران بن حصین خزاعی: ہم نے رسول خدا (ص) کے زمانے میں متعہ کیا۔ پھر قرآن میں اس کے بارے میں کوئی اور حکم نازل نہیں ہوا۔ ایک شخص نے اپنی ذاتی رائے سے جو جی میں آیا کہہ دیا۔ ملاحظہ ہو صحیح بخاری ۲: ۱۷۶۔ صحیح مسلم ۲: ۹۰۰۔ سنن بیہقی ۵: ۲۰۔

iv۔ جابر بن عبد اللہ انصاری: صحیح مسلم ۲: ۱۰۲۲۔

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر سمرقندی ۱: ۳۴۶

v۔ عبد اللہ بن مسعود: صحیح مسلم ۲: ۱۰۲۲۔ صحیح بخاری ۸: ۷۔ کتاب النکاح۔

vi۔ عبداللہ بن عمر: قسم خدا کی ہم عہد رسالت میں زنا کرنے والے تھے اور نہ بے عفتی کرنے والے۔ یعنی متعہ جائز نکاح ہے۔ ملاحظہ ہو مسند احمد ۲: ۹۵۔

vii۔ ابوسعید خدری: ہم نے خلافت عمر کی نصف مدت تک متعہ کیا۔ عمدۃ القاری عینی ۸: ۳۱۰

viii۔ ابی بن کعب: تفسیر طبری ۵: ۹۔

ix۔ ابوذر الغفاری: زاد المعاد ابن قیم ۱: ۲۰۷۔ صحیح مسلم ۲: ۸۹۷۔

x۔ زبیر بن عوام: عبد اللہ بن زبیر نے ابن عباس کو حلیت متعہ کا طعنہ دیا تو ابن عباس نے کہا: تم اپنی والدہ سے پوچھو۔ چنانچہ پوچھنے پر اس کی والدہ اسماء بنت ابی بکر نے کہا:

ما ولدتك الا في المتعة۔ تجھے میں نے عقد متعہ ہی سے جنا ہے۔

عقد الفرید ۲: ۱۳۹۔

xi۔ اسماء بنت ابی بکر: سند ابو داؤد طیالسی صفحہ ۲۲۷۔ عقد الفرید ۲: ۱۳۹۔

xii۔ سمرۃ ابن جندب یا سمیر بن جندب: الاصابۃ ۲: ۸۱۔

xiii۔ معاویہ بن ابی سفیان: ابن حزم نے المعلی میں اور زرقانی نے شرح موطا میں ذکر کیا ہے۔

xiv۔ سلمہ بنت امیہ: الاصابۃ ۲: ۶۳۔

xv۔ معبد بن امیہ: زرقانی شرح موطا۔

xvi۔ خالد بن مہاجر مخزومی: صحیح مسلم ۱ ۳۹۶

xvii۔ ربیعہ بن امیہ: موطا امام مالک ص ۳۶۹۔ امام شافعی کتاب الأم ۷: ۲۱۹۔ بیہقی ۷: ۲۱۶

تابعین:

xviii۔ سعید بن جبیر: تفسیر شوکانی ۱: ۴۷۴۔

xix۔ طاؤس یمانی: ابن حزم المعلی۔

xx۔ عطا مدنی: صحیح مسلم ۲: ۱۰۲۳۔

xxi۔ سدی: تفسیر ابن کثیر ۱: ۴۷۴۔

xxii۔ مجاہد: تفسیر ابن کثیر ۱: ۴۷۴۔

xxiii۔ زفر بن اوس مدنی: البحر الرائق لابن نجم۔

xxiv۔ حکم: تفسیر طبری ۵: ۹۔

xxv۔ عمرو بن حریث قرشی: کنز العمال ۸: ۲۹۳۔

مذاہب اربع میں سے امام مالک بھی بنا بر قولے متعہ کی حلیت کے قائل تھے۔ ملاحظہ ہو تبیان الحقائق شرح کنز الدقائق۔ مجمع الانہر ۱: ۲۷۱۔ المبسوط سرخسی۔ فتاویٰ الفرغانی۔ الکافی فی الفروع الحنفیہ۔ العنایہ فی شرح الھدایہ۔ الھدایہ فی شرح البدایہ و غیرھا۔

ان کے علاوہ ابن جریح فقیہ مکہ نے خود ۹۰ عورتوں سے متعہ کیا۔ تہذیب التہذیب ۶: ۴۱۶۔

عبد الملک بن عبد العزیز مکی۔ فقہائے مکہ۔ اصحاب ابن عباس اہل مکہ و اہل یمن۔ ملاحظہ ہو تفسیر قرطبی ۵: ۱۳۲۔ الاستیعاب۔

ابو حیان اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: اہل بیت (ع) اور تابعین کی ایک جماعت حلیت متعہ کی قائل رہی ہے۔ البحر المحیط ۳: ۵۸۹۔ امام احمد بن حنبل اضطراری حالت میں متعہ کو جائز کہتے ہیں۔ تفسیر ابن کثیر ۱: ۴۷۴۔

آیت متعہ کی ایک قراءت الی اجل مسمی: درج ذیل اصحاب و معلمین قرآن نے اس آیت کی یہ قراءت اختیار کی ہے جس سے اس آیت سے حکم متعہ اور واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ وہ قرآئت یہ ہے:

فما استمتعتم به منهن۔ الی اجل مسمی فاتوهن اجورهن۔	پھر جن عورتوں سے تم نے (ایک مقررہ مدت تک) متعہ کیا ہے ان کا طے شدہ مہر بطور فرض ادا کرو۔

اس قرائت کے مطابق الی اجل مسمی. ”ایک مقررہ مدت تک“ آیت کا حصہ ہے۔

اس قرائت کو حضرت ابن عباس، ابی بن کعب، حبیب بن ثابت، سعید بن جبیر، سدی، عبد اللہ بن مسعود نے اختیار کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو روح المعانی ۵: ۵۔ تفسیر طبری ۵: ۹۔ بیھقی۔ کشاف۔ تفسیر قرطبی۔ نووی ۔ شرح صحیح مسلم ۹: ۱۸۱ و غیرہ۔

اسے قرائت شاذہ کر کے مسترد کرتے ہیں، جب کہ حضرت ابن عباس، ابی بن کعب، عبد اللہ بن مسعود جیسے معلمین قرآن کی اختیار کردہ قرائت کو شاذہ قرار دینا بھی نہایت ناانصافی ہے۔

ان تمام شواہد کا مطالعہ کرنے کے بعد تدبر قرآن ج ۲ ص ۲۷۸ کے مؤلف کی اس عبارت کو پڑھ لیجیے:

> اگر کوئی شخص کسی عورت سے ایک وقتی اور عارضی تعلق پیدا کرتا ہے تو گو اس کے لیے اس نے نکاح کی رسم بھی پوری کی ہو اور اسے مال بھی دیا ہو لیکن یہ احصان نہیں ہوا۔ یہ محض پیشاب کرنے کے لیے ایک پیشاب خانہ تلاش کیا گیا ہے، جس سے مقصود محض وقتی طور پر مثانے کے بوجھ کو ہلکا کر لینا ہے۔ قرآن نے یہ شرط لگا کر متعہ کے اس مکروہ رواج کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جو جاہلیت میں رائج تھا۔

دیکھ لیجیے! یہ لوگ اسلامی تعلیمات کے بیان میں کس قدر امین ہیں۔ متعہ کو جاہلیت کے مکروہ رواج بتا کر اپنی امانت پر کس احسن انداز میں ضرب لگائی ہے۔ کیا امت قرآن ایسے امینوں سے کسی اصلاحی تحریر کی امید رکھ سکتی ہے؟

جابر نقل کرتے ہیں: تمام اصحاب رسول (ص)، رسول اللہ (ص) اور حضرت ابوبکر کی زندگی میں اور حضرت عمر کی خلافت کے آخری دنوں تک متعہ کو حلال کہتے تھے۔ (ابن حزم المحلی)۔

نسخ: اس بات پر تو تقریباً سب کا اتفاق ہے کہ عصر رسالت (ص) میں متعہ حلال اور رائج تھا اور اس آیہ میں استمتاع سے مراد نکاح متعہ ہے اور حضرت عمر کی طرف سے ممنوع ہونے کے بعد یہ دعویٰ شروع ہو گیا کہ آیت متعہ منسوخ ہو گئی اور اس سلسلے میں آنے والے متضاد اقوال کی تعداد ۲۲ اقوال تک پہنچ چکی ہے: خیبر کے روز منسوخ ہوا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر منسوخ ہوا۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر۔ اوطاس کے موقع پر۔ فتح مکہ کے موقع پر۔ تین مرتبہ حلال کیا گیا اور تین مرتبہ حرام گردانا گیا۔ سات مرتبہ حلال کیا اور سات مرتبہ حرام گردانا گیا۔ عصر رسالتؐ میں متعہ حلال اور رائج ہونا مسلمہ ہونے کے باوجود ہمارے کچھ معاصر اہل قلم نے تو یہاں تک جسارت کر دی کہ یہ جاہلیت کی ایک رسم ہے۔ محض زنا ہے[1]۔ اسلام نے اس مکروہ رواج کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا وغیرہ۔[2] شنشنة أعرفها من احزم

نسخ متعہ ایک امر واقع نہ ہونے کی وجہ سے اس میں تضاد اور اضطراب واقع ہونا ایک طبعی امر ہے۔ وَ لَوۡ کَانَ مِنۡ عِنۡدِ غَیۡرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوۡا فِیۡہِ اخۡتِلَافًا کَثِیۡرًا[3] خلاصہ یہ کہ نسخ متعہ کے لیے قرآنی آیات اور احادیث کی نہایت ناقابل قبول توجیہ پیش کرنے کی دانستہ سعی کی گئی۔ مثلاً:

i۔ آیہ اِلَّا عَلٰۤی اَزۡوَاجِہِمۡ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُہُمۡ[4] سے متعہ کا حکم منسوخ ہو گیا، کیونکہ متعہ کی عورت منکوحہ زوجہ نہیں ہے۔

جواب: پہلے بھی ذکر ہوا کہ اس آیت کو ناسخ کے طور پر پیش کرنے والے یہ بھول گئے کہ یہ آیت بالاجماع مکی ہے، جب کہ مخالف بھی معترف ہے متعہ کم از کم فتح خیبر تک جائز اور رائج رہا ہے،[5] بلکہ اس آیت سے تو بطور قطع و یقین ثابت ہوتا ہے کہ متعہ کی منکوحہ عورت ازدواج میں

۱۔ نہ مصادر تشریع کا علم، نہ اپنے فقہی قواعد سے آگاہ۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک اگر کوئی شخص اپنی محارم ماں، بیٹی اور بہن کے ساتھ عقد کر کے ہمبستری کرے تو یہ زنا نہیں ہے، اس پر حد جاری نہیں ہو گی۔ دلیل یہ پیش کرتے ہیں: لان صورة العقد شبهة، کیونکہ عقد کی وجہ سے شبہ لاحق ہو گیا۔ ملاحظہ ہو: المغنی ۱۰: ۴۹۔ المبسوط ۹: ۸۵۔ فتح القدیر ۵: ۳۵۔

متعہ نہ محارم ماں بیٹی کے ساتھ (نعوذ باللّٰه) عقد ہے، نہ زنا کے لیے کرایہ کی عورت کے ساتھ ہمبستری ہے، بلکہ جن عورتوں کے ساتھ نکاح جائز ہے، ان عورتوں کے ساتھ ایجاب و قبول، مدت اور حق مہر کے تعین کے ساتھ ہونے والا ایک کامل عقد ہے۔

۲۔ تدبر القرآن ۲: ۲۷۸

۳۔ ۴ نساء: ۸۲۔ اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں بڑا اختلاف پاتے۔

۴۔ ۲۳ مومنون: ۶

۵۔ مولانا مودودی تفہیم القرآن ۳: ۲۶۶ سورہ مومنون کے ذیل میں لکھتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعہ کی حرمت کا آخری اور قطعی حکم فتح مکہ کے سال دیا ہے۔ اس سے پہلے اجازت کے ثبوت صحیح احادیث میں پائے جاتے ہیں۔

داخل ہے، کیونکہ نزول آیت کے موقع پر متعہ جائز اور رائج تھا اور آیت نے اسے ازواج میں شامل رکھا۔

ii۔ آیۂ میراث سے متعہ کا حکم منسوخ ہو گیا، کیونکہ نکاح متعہ سے زوجین وارث نہیں بنتے۔

جواب: یہ آیت ارث سے مخصوص ہے۔ اس آیت کا عقد متعہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

iii۔ طلاق سے متعہ کا حکم منسوخ ہو گیا، کیونکہ عقد متعہ میں طلاق نہیں ہوتی۔

جواب: آیۂ طلاق، محل طلاق بیان نہیں کرتی کہ طلاق کہاں واقع ہوتی ہے اور کہاں واقع نہیں ہوتی.

iv۔ سنت سے حکم متعہ منسوخ ہو گیا ہے۔ اس بارے میں چند روایات صحاح و غیر صحاح میں موجود ہیں۔

جواب: اولاً: خبر واحد سے حکم قرآن منسوخ نہیں ہو سکتا۔

ثانیاً: یہ روایات ان کثیر روایات کے ساتھ متصادم ہیں جو کہتی ہیں کہ متعہ خلافت عمر تک جائز اور رائج رہا۔ چنانچہ جابر بن عبد اللہ کی روایت، صحیح مسلم باب نکاح متعہ، مسند احمد بن حنبل، سنن بیہقی جلد ہفتم باب نکاح متعہ میں موجود ہے۔

صحیح مسلم میں عمران بن حصین سے روایت ہے:

قال نزلت اية المتعة فی كتاب اللّٰه تبارك و تعالىٰ و عملنا بها مع رسول اللّٰه فلم تنزل اية تنسخها و لم ينه النبی عنها حتى مات ثم قال رجل برأيه ماشاء.

آیت متعہ کتاب اللہ تبارک و تعالیٰ میں نازل ہوئی ہے اور ہم نے رسول اللہؐ کے ساتھ اس پر عمل بھی کیا۔ اس کے بعد نہ تو کوئی ایسی آیت نازل ہوئی جو متعہ کو منسوخ کرے، نہ ہی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سے منع فرمایا، یہاں تک کہ آپؐ کا وصال ہو گیا۔ بعد میں ایک شخص نے اپنی مرضی سے جو چاہا کہدیا۔

عبد اللہ بن عباس کی روایت۔ احکام القرآن جصاص ۲: ۱۴۷۔

عمران بن حصین کی روایت۔ مسند احمد بن حنبل ۳ : ۳۸۰۔

خود حضرت عمر کی روایت: متعتان كانتا على عهد رسول اللّٰه انا احرمهما۔ عہد رسالت میں دو متعہ حلال تھے، میں انہیں حرام کر رہا ہوں۔ احکام القرآن ۲: ۱۵۲۔

حضرت علی علیہ السلام کا فرمان: اگر عمر متعہ کو ممنوع قرار نہ دیتا تو شقی کے سوا کوئی زنا نہ کرتا۔ کنز العمال ۸: ۲۹۴۔

کیا رسول اللہ (ص) جائز الخطا مجتہد ہیں؟ (معاذ اللہ): قوشجی حضرت عمر کے اس عمل کو تسلیم کرتے ہوئے اسے اجتہادی اختلاف قرار دیتے ہیں اور یہ نظریہ قائم کرتے ہیں کہ رسول اللہ (ص) کے

ساتھ اجتہادی اختلافات ہو سکتے ہیں۔ شرح تجرید باب الامامه میں لکھتے ہیں:

رسول اللہ(ص) کے خلاف حضرت عمر کا فتویٰ کوئی قابل اعتراض بات نہیں، کیونکہ اجتہادی مسائل میں مجتہدین کا باہمی اختلاف کوئی نئی بات نہیں۔

یعنی ایک مجتہد (عمر) کے دوسرے مجتہد (رسول اللہؐ) سے اختلاف میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس جگہ علامہ سید مرتضی عسکری لکھتے ہیں:

یا ناعی الاسلام قم فانعه — اے اسلام کے مرثیہ خواں اٹھ اسلام کا مرثیہ پڑھ۔

حالانکہ شیعہ سنی دونوں کا یہ متفقہ مؤقف ہے۔

لا اجتهاد عند ظهور النص — نص کی موجودگی میں اجتہاد جائز نہیں۔

اس کے باوجود امت کے ایک فرد کا مقابلہ وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی[1] کے ساتھ ہو رہا ہے۔ یعنی امت بذریعہ اجتہاد اپنے رسول(ص) کے خلاف جا سکتی ہے اور وہ بھی حلال و حرام اور تشریع احکام میں۔ اس طرح رسول (ص) ایک عام مجتہد کی طرح جائز الخطا غیر معصوم (معاذ اللہ) ہو کر رہ جاتا ہے۔ جی ہاں! یہاں صراحتاً کہا گیا ہے کہ رسول (ص) سے اجتہادی غلطی ہو سکتی ہے۔ اگر علامہ آمدی کی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام ۴: ۲۲۲ میں اس بات کی صراحت موجود نہ ہوتی تو اپنے معصوم رسول (ص) کی طرف اس ناپاک نسبت پر یقین نہ آتا۔

اسی طرح جب یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں اموال کی تقسیم مساویانہ ہوتی تھی، لیکن حضرت عمر تقسیم اموال میں امتیاز کی روش اختیار کر کے مراعات یافتہ طبقہ وجود میں لائے، جس سے اسلامی معاشرہ بھی طبقاتی معاشرہ ہو گیا، تو یہی جواب دیا جاتا ہے۔ اجتہادی مسائل میں مجتہدین کا باہمی اختلاف کوئی نئی بات نہیں۔[2] واضح رہے شیعہ اپنے اماموں کو معصوم سمجھتے ہیں، مگر ان کو رسول اللہؐ کے خلاف حکم دینے کا حق نہیں دیتے، بلکہ رسول اللہ (ص) کے بیان کردہ احکام کو بیان کرنے میں معصوم سمجھتے ہیں۔ یعنی ان سے بیان احکام میں غلطی نہیں ہوتی۔

ابن حزم المحلی میں لکھتے ہیں:

لا خلاف بين احد من الامة فی ان عبدالرحمن بن ملجم لم يقتل عليا الامتأ ولاً مجتهداً مقدرا انه على صواب۔

امت کے کسی فرد کو اس بات میں اختلاف نہیں ہے کہ عبدالرحمٰن بن ملجم نے حضرت علیؑ کو تاویل و اجتہاد کے تحت یہ سمجھتے ہوئے قتل کیا کہ وہ اس اجتہاد میں صائب الرائے ہے۔

---

[1] ۵۳ نجم: ۳

[2] ملاحظہ ہو قوسجی۔ شرح التجرید ص ۴۰۸۔

اور الفصل بین الملل و النحل میں یہی ابن حزم لکھتے ہیں:

قاتل عمار ابو الغادیة متأول مجتهد مخطی باغ علیه ماجور اجراً واحداً، و لیس هذا کقتلة عثمان لانهم لامجال لهم للاجتهاد فی قتله۔

ابو الغاویہ عمار کا قاتل مجتہد ہے، اجتہاد میں غلطی کی، عمار کے خلاف بغاوت کا ارتکاب کیا، تاہم اس کو ایک اجر ملے گا۔ مگر عثمان کے قاتلین ایسے نہیں ہیں کیونکہ ان کے لیے قتل عثمان میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

شیخ احمد وائلی اپنی کتاب من فقه الجنس میں اس جگہ لکھتے ہیں:

> ہم ابن حزم سے پوچھتے ہیں: وہ کون سی بات ہے جس نے ابن ملجم اور ابو الغاویہ کو اجتہاد کا حق دیا اور ایک اجر بھی مل گیا۔ یعنی ابن ملجم کو حضرت علی علیہ السلام کے قتل کرنے کا ایک ثواب مل گیا اور ابو الغاویہ کو حضرت عمار کے قتل کرنے کا ایک ثواب مل گیا اور ان اصحاب کو اجتھاد کا حق نہ دیا جنہوں نے حضرت عثمان کو قتل کیا ہے۔ اس امتیاز کا سبب کیا ہے؟ جبکہ حضرت عثمان کے قاتلین تو وہ اصحاب رسول ہیں جن کے گرد قداست کی ایک فصیل موجود ہے جسے کوئی پھلانگ نہیں سکتا۔ ان میں اصحاب بدر بھی ہیں۔ ان کو اجتہاد کی اجازت نہیں ہے، جب کہ حضرت علی علیہ السلام اور عمار کے قاتل ایسے بے حیثیت لوگ ہیں جن کو حق کی معرفت کے سلسلے میں کوئی مقام حاصل نہیں ہے، مگر انہیں اجتہاد کا حق کیسے مل گیا!

یہ کہنا: "حضرت عمر منع متعہ کے موجد نہیں تھے بلکہ شائع اور نافذ کرنے والے تھے"[1] درست نہیں ہے، کیونکہ یہ نہایت نامعقول ہے کہ حکم خدا و رسول (ص) پر عمل اور نافذ کرنا، عہد عمر کی نصف مدت تک مؤخر کر دیا گیا ہو۔

بعض اہل قلم حضرات اس بات کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ متعہ عہد رسالت میں رائج رہا اور متعہ کی حرمت کا آخری اور قطعی حکم فتح مکہ کے سال دیا گیا ہے اور اس سے پہلے اجازت کے ثبوت صحیح احادیث میں پائے جاتے ہیں۔[1] اس تسلیم اور اعتراف کے باوجود لکھتے ہیں:

> اس کے معنی یہ ہوئے کہ جواز کے لیے زنان بازاری کی طرح عورتوں کا ایک ادنیٰ طبقہ معاشرے میں موجود رہنا چاہیے جس سے تمتع کرنے کا دروازہ کھلا رہے یا یہ کہ متعہ صرف غریب لوگوں کی بیٹیوں اور بہنوں کے لیے ہو اور اس سے

---

[1] تفہیم القرآن ۳: ۲۶۶

فائدہ اٹھانا خوشحال طبقے کے مردوں کا حق ہو۔ کیا خدا و رسول (ص) کی شریعت سے اس طرح کے غیر منصفانہ قوانین کی توقع کی جا سکتی ہے؟ اور کیا خدا اور اس کے رسول (ص) سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی ایسے فعل کو مباح کر دیں گے جسے ہر شریف عورت اپنے لیے بے عزتی بھی سمجھے اور بے حیائی بھی۔[1]

تو کیا خدا اور رسول (ص) نے معاذ اللہ عہد رسالت (ص) میں بقول خود معترض، فتح مکہ تک ان غیر منصفانہ قوانین کو جاری و ساری رکھا؟ کیا رسول اللہ (ص) کے عہد زرین کے معاشرے میں زنان بازاری کی طرح عورتوں کا ایک ادنیٰ طبقہ موجود تھا، جس سے تمتع کرنے کا دروازہ کھلا رہے؟ آپ نے خدا اور اس کے رسول(ص) سے یہ امید کی، بلکہ مشاہدہ کیا کہ انہوں نے اپنے عہد میں ایسے فعل کو مباح کر دیا ہو جسے ہر شریف عورت اپنے لیے بے عزتی بھی سمجھے اور بے حیائی بھی؟ اِنۡ عِنۡدَکُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍۭ بِہٰذَا ؕ اَتَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿﴾[2]

اس مقام پر ہم تفہیم القرآن کی وہ عبارت نقل کرتے ہیں جو لونڈیوں سے شادی کرنے کے بارے میں حاصل آزادی پر ذہنوں میں پیدا ہونے والے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے لکھی گئی ہے۔ اس میں اس اعتراض کا جواب موجود ہے جو متعہ کے بارے میں تفہیم القرآن نے اٹھایا ہے۔ عربی محاورہ ہے: من فمك ادينك ۔ تیرے منہ سے تجھے رد کرتا ہوں۔

یہ آیت اس امر کی صراحت کر رہی ہے کہ منکوحہ بیویوں کے علاوہ مملوکہ عورتوں سے بھی تمتع کی اجازت ہے اور ان کے لیے تعداد کی کوئی قید نہیں ہے۔ اسی مضمون کی تصریح سورۂ نساء آیت ۳، سورۂ مومنون آیت ۶ اور سورۂ معارج آیت ۳۰ میں بھی کی گئی ہے۔ ان تمام آیات میں مملوکہ عورتوں کو منکوحہ ازواج کے بالمقابل ایک الگ صنف کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے اور پھر ان کے ساتھ ازدواجی تعلق کو جائز قرار دیا گیا ہے نیز سورۂ نساء کی آیت ۳ منکوحہ بیویوں کے لیے چار کی حد مقرر کرتی ہے، مگر نہ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے مملوکہ عورتوں کے لیے تعداد کی حد مقرر کی ہے اور نہ دوسری متعلقہ آیات میں ایسی کسی حد کی طرف اشارہ فرمایا ہے بلکہ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ آپؐ کے لیے اس کے بعد دوسری عورتوں سے نکاح کرنا یا موجودہ بیویوں میں سے کسی کو طلاق دے کر دوسری بیوی لانا تو حلال نہیں ہے، البتہ مملوکہ عورتیں

---

[1] حوالہ سابق

[2] ۱۰ یونس: ۶۸. کیا تمہارے پاس اس بات پر کوئی دلیل بھی ہے؟ کیا تم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہو جو تمہارے علم میں نہیں؟

حلال ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مملوکہ عورتوں کے معاملے میں کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا کی شریعت یہ گنجائش مالدار لوگوں کو بے حساب لونڈیاں خرید خرید کر عیاشی کرنے کے لیے دیتی ہے۔ دراصل یہ تو ایک بے جا فائدہ ہے جو نفس پرست لوگوں نے قانون سے اٹھایا ہے۔ قانون بجائے خود انسانوں کی سہولت کے لیے بنایا گیا تھا، اس لیے نہیں بنایا گیا تھا کہ لوگ اس سے یہ فائدہ اٹھائیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے شریعت ایک مرد کو چار تک بیویاں کرنے کی اجازت دیتی ہے اور اسے یہ حق بھی دیتی ہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر دوسری بیوی لے آئے۔ یہ قانون انسانی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر بنایا گیا تھا۔ اب اگر کوئی شخص محض عیاشی کی خاطر یہ طریقہ اختیار کرے کہ چار بیویوں کو کچھ مدت رکھ کر طلاق دیتا اور پھر ان کی جگہ بیویوں کی دوسری کھیپ لاتا چلا جائے تو یہ قانون کی گنجائشوں سے ناروا فائدہ اٹھانا ہے، جس کی ذمہ داری خود اسی شخص پر عائد ہوگی نہ کہ خدا کی شریعت پر۔[1]

حرمت متعہ کی روایت حضرت علی (ع) کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ یہ نسبت یقیناً غلط ہے۔ کیونکہ اول تو روایات صحیحہ سے ثابت ہے کہ متعہ خلافت عمر تک رائج اور جائز تھا، ورنہ فتح مکہ تک صحیح احادیث سے ثابت ہے، پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ حضرت علی (ع) خیبر کے موقع پر حرمت متعہ کے قائل ہوں۔

نیز ابن عباس کے رجوع کا مسئلہ تو اس سے بھی واضح البطلان ہے۔ کیونکہ ان کا رجوع آیہ اِلَّا عَلٰۤی اَزۡوَاجِہِمۡ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُہُمۡ کے ذریعے منسوخ ہونے کے ساتھ مربوط گردانا گیا ہے اور ابن عباس کا حلیت متعہ کا مؤقف یقیناً اس آیت کے نزول کے بعد بلکہ عصر رسالت (ص) کے بھی بعد عہد عمر میں سب کے لیے مشہور رہا ہے۔

یہ روایت بھی قابل قبول نہیں کہ فتح مکہ کے موقع پر متعہ کو حرام کیا گیا۔ کیونکہ اس روایت میں کہا گیا ہے: رسول کریم (ص) نے رکن اور در خانہ کعبہ کے درمیان کھڑے ہو کر حرمت متعہ کا اعلان فرمایا۔ جب کہ اس کا راوی صرف ایک ہی آدمی ہے۔ یعنی اسے صرف سبرہ نے روایت کیا ہے تو نامعقول بات ہے کہ رسول خدا (ص) ایک حکم کا اعلان خانہ کعبہ کے بڑے اجتماع میں فرمائیں اور صرف سبرہ ہی سن سکا جب کہ ہزاروں میں سے کسی ایک نے بھی نہیں سنا۔

اہل سنت کے ہاں موقت نکاح صحیح ہے: ڈاکٹر احمد وائلی نے اپنی کتاب من فقه الجنس میں یہ عنوان باندھا ہے۔ اس کا خلاصہ یہاں پیش کرتے ہیں:

---

[1] تفہیم القرآن ج۳ ص ۱۱۹ حاشیہ ۹۴

بعض فقہائے اہل سنت عقد موقت کو صحیح سمجھتے ہیں، متعہ کے نام سے نہیں، بلکہ کسی اور عنوان کے تحت.

ابن تیمیہ کہتے ہیں: امام احمد بن حنبل کے اصول و نصوص کے تحت شرط مقدم شرط مقارن کی طرح ہے، یعنی عقد معاملہ سے پہلے جو شرط لگائی جاتی ہے وہ بالکل اس شرط کی طرح ہے جو معاملہ کے ساتھ لگائی جاتی ہے۔ کہتے ہیں: ان الشرط المقدم کالشرط المقارن۔

ابن قیم جوزیہ بھی فرماتے ہیں: لا فرق بین الشرط المقدم و الشرط المقارن۔

اس کلیہ کی روشنی میں درج ذیل فتاویٰ ملاحظہ ہوں۔

۱۔ ابن قدامۃ المغنی میں لکھتے ہیں:

و ان تزوجھا بغیر شرط الا ان فی نیتہ طلاقھا بعد شھر او اذا انقضت حاجتہ فی ھذا البلد فالنکاح صحیح فی قول عامۃ اھل العلم الا الاوزاعی قال: انہ نکاح متعۃ و الصحیح انہ لابأس بہ ولا تضر نیّتہ۔[۱]

اگر عورت سے بغیر شرط کے شادی کرے اور اس کی نیت میں یہ ہو کہ اسے ایک ماہ بعد طلاق دی جائے گی یا جب اس مہینے میں اس عورت کی ضرورت نہ رہے تو طلاق دے دوں گا تو نکاح تمام اہل علم کے نزدیک صحیح ہے سوائے اوزاعی کے۔ انہوں نے کہا ہے: یہ نکاح متعہ ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ نکاح صحیح ہے اور نیت میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۲۔ الباجی الاندلسی المالکی اپنی کتاب المنتقی میں لکھتے ہیں:

من تزوج امرأۃ لا یرید امساکھا و انما یرید ان یستمتع بھامدۃ ثم یفارقھا فقد روی محمد عن الامام مالك ان ذلك جائز وان لم یکن من الجمیل۔

کسی عورت سے ازدواج کر لیا جائے، جس کو ہمیشہ رکھنا نہیں چاہتا بلکہ صرف ایک مدت اس سے تلذذ حاصل کر کے اس سے جدا ہونا چاہتا ہے تو محمد نے امام مالک سے روایت کی ہے، یہ عقد جائز ہے اگرچہ یہ زیبا نہیں ہے۔

۳۔ عبدالرحمٰن الجزیری اپنی کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ میں فقہ مالکی کا مؤقف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ولا یتحقق نکاح المتعۃ الا اذا اشتمل علی ذکر الاجل صراحۃ للولی او للمرأۃ اولھما فان لم یذکر

نکاح متعہ اس وقت تک وقوع پزیر نہیں ہوتا جب تک مدت کا ذکر صراحت کے ساتھ نہ ہو۔ یہ صراحت ولی کے سامنے کرے یا عورت کے یا دونوں کے اور

---

[۱] المغنی ۶: ۶۴۵

قبل العقد اولم یشترط فی العقد لفظا ولکن قصده الزوج فی نفسه فانه لایضر ولوفهمت المرأة او ولیها ذلك۔	اگر عقد سے پہلے مدت کا ذکر نہ ہو اور نہ ہی عقد کے اندر لفظوں میں اس کا ذکر ہو بلکہ شوہر اپنے ذہن میں مدت کے تعین کا قصد کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں اگرچہ عورت یا اس کے ولی کو اس کا علم ہو جائے۔

اس مسئلے پر احناف کی رائے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اذانوی معاشرتها مدة و لم یصرح بذلك فان العقد صحیح۔[1]	اگر عورت سے ایک مدت کے لیے مباشرت کرنے کی نیت کر لے اور اس کی صراحت نہ کرے تو عقد صحیح ہے۔

ڈاکٹر عبد العزیز اپنی کتاب الانکحۃ الفاسدہ (۲:۶۴۴) میں اس عنوان کے تحت ''موقت نکاح اس وقت صحیح ہے اگر وقت کا تعین نیت میں ہو، لفظوں میں نہ ہو'' لکھتے ہیں:

و علی ذلك فان النكاح بصیغته الصحیحة المشروعة وبلفظه الظاهر المطلق انها یقع صحیحا وان كان المتعا قدان اواحدهما یقصد بالزواج مدة معینة او مجرد الاستمتاع الی اجل من الآجال یخفیه فی نفسه۔	پس بنا بریں عقد نکاح اپنے صحیح اور شرعی صیغے اور اپنے ظاہری اطلاق کے ساتھ صحیح واقع ہو جاتا ہے۔ اگرچہ عقد کے طرفین یا ایک طرف اس عقد میں ایک معین مدت کا قصد کریں یا ایسی کوئی مدت تک لذت حاصل کرنا مقصود ہو جس کو وہ اپنے دل میں چھپائے رکھتا ہے۔

ڈاکٹر عبد العزیز صاحب نے اس فتویٰ کو درج ذیل کتابوں سے نقل کیا ہے۔

شوکانی: نیل الاوطار ۶:۱۵۴ ط مصر

شیخ عیش: فتح العلی صفحہ ۴۱۵ ط مصر

ابن قدامۃ: المغنی ۶:۶۴۵ ط دار الکتب

الشافعی: الأم ۵:۷۱ ط بیروت

آگے وہ اس مسئلے پر قاضی عیاض کا فتویٰ نقل کرتے ہیں:

> اگر کوئی شخص کسی شہر میں وارد ہو جائے اور وہاں کسی عورت کے ساتھ نکاح کرنا چاہے اور دونوں کی یہ نیت ہو کہ یہ نکاح صرف اس شہر میں قیام کی مدت تک کے لیے ہو یا ہفتہ دو ہفتے کے لیے ہو یا اس سے زیادہ تو نکاح ثابت ہے۔[2]

نکاح اجارہ: بعض اہل سنت کے فقہاء میں ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ لفظ اجارہ کے ساتھ عقد نکاح ہوسکتا ہے۔ اس مؤقف پر دلیل یہ دی جاتی ہے کہ قرآن میں عورت کے حق مہر کو اُجرت کہا گیا ہے: فَاٰتُوۡہُنَّ

---

[1] الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ۴:۹۴ [2] الانکحۃ الفاسدۃ ۲:۶۴۵

اُجُوۡرَهُنَّ ۔ ظاہر ہے اجرت اجارے کے لیے کہا جاتا ہے، جیسا کہ بیع میں قیمت کہا جاتا ہے۔

چنانچہ اس نظریے کو علامہ کرخی حنفی، ابن خویز مالکی نے اختیار کیا ہے اور ابن العربی نے بھی اس نظریے کی طرف رجحان کا اظہار کیا ہے۔[1]

ابوبکر رازی نے یہ کہکر اس نظریے کو رد کیا کہ اجارہ ایک موقت معاملہ ہے، جب کہ نکاح ہمیشہ کے لیے ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ دونوں ایک دوسرے کے منافی ہیں۔

ابوبکر رازی کا رد بتاتا ہے نکاح اجارہ عیناً نکاح موقت ہے۔

اخیراً مصر کے اخوان المسلمین کے بانی حسن البنا کے حقیقی بھائی جمال البنا نے اپنی کتاب مسئولیة فشل الدولة الاسلامیة میں متعہ کو جائز اور مسلم اقلیتوں کے لیے اس کو ضروری قرار دیا ہے۔ کیونکہ ان ملکوں میں طلاق کی صورت میں عورت مرد کی دولت میں شریک ہو جاتی ہے اور متعہ نہ کرنے کی صورت میں زنا میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ متعہ جو صدر اسلام میں حضرت عمر کے دور تک حلال تھا، رائج ہونا چاہیے۔ البتہ الازہر نے اس کتاب کو ضبط کرنے کا حکم دیا ہے۔[2]

وَ مَنۡ لَّمۡ یَسۡتَطِعۡ مِنۡکُمۡ طَوۡلًا اَنۡ یَّنۡکِحَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ فَمِنۡ مَّا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ مِّنۡ فَتَیٰتِکُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِاِیۡمَانِکُمۡ ؕ بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ فَانۡکِحُوۡہُنَّ بِاِذۡنِ اَہۡلِہِنَّ وَ اٰتُوۡہُنَّ اُجُوۡرَہُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ مُحۡصَنٰتٍ غَیۡرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخۡدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحۡصِنَّ فَاِنۡ اَتَیۡنَ بِفَاحِشَۃٍ فَعَلَیۡہِنَّ

۲۵۔ اور اگر تم میں سے کوئی مالی رکاوٹ کی وجہ سے آزاد مسلم عورتوں سے نکاح کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو (اسے چاہیے کہ) وہ تمہاری مملوکہ مسلمان لونڈی سے نکاح کرے اور اللہ تمہارے ایمان کو اچھی طرح جانتا ہے، تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کا حصہ ہو لہٰذا ان کے سرپرستوں کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح کرو اور شائستہ طریقے سے ان کے مہر ادا کرو وہ نکاح کے تحفظ میں رہنے والی ہوں بدچلنی کا ارتکاب کرنے والی نہ ہوں اور درپردہ آشنا رکھنے والی نہ ہوں، پھر جب وہ (کنیزیں) نکاح میں آنے کے بعد بدکاری کا ارتکاب کریں تو ان کے لیے اس سزا کا نصف

[1] تفسیر القرطبی ۱۳: ۲۷۳

[2] ہفت روزہ بینات بیروت عدد ۷۷۔ ۳۷، اگست ۲۰۰۴

ہے جو آزاد عورتوں کے لیے مقرر ہے، یہ اجازت اسے حاصل ہے جسے (شادی نہ کرنے سے) تکلیف اور مشقت کا خطرہ لاحق ہو، لیکن صبر کرنا تمہارے حق میں زیادہ اچھا ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔	نِصۡفُ مَا عَلَی الۡمُحۡصَنٰتِ مِنَ الۡعَذَابِ ؕ ذٰلِکَ لِمَنۡ خَشِیَ الۡعَنَتَ مِنۡکُمۡ ؕ وَ اَنۡ تَصۡبِرُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۲۵﴾

تشریح کلمات

طَوۡلًا: (ط و ل) فضل واحسان۔ اولو الطول خوشحال طبقہ۔ یہاں اس مال سے کنایہ ہے جو عورت کو مہر اور نان ونفقہ میں دینا پڑتا ہے۔

اَخۡدَانٍ: (خ د ن) مفرد الخدن۔ عورت کے آشنا۔

العَنَتَ: (ع ن ت) ہلاکت میں پڑنا۔ تکلیف پہنچنا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَنۡ لَّمۡ یَسۡتَطِعۡ: خالق فطرت نے انسانی فطری خواہشات، اس کے مالی امکانات اور اس کے نفسیاتی حالات کے مطابق قانون وضع کیا ہے کہ جسے جنسی مسائل میں مشقت و تکلیف کا سامنا ہے اور مالی مشکلات کی وجہ سے آزاد عورتوں سے شادی نہیں کر سکتا تو اسے چاہیے کہ وہ لونڈیوں سے ان کے مالکوں کی اجازت سے شادی کرے۔

۲۔ وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِاِیۡمَانِکُمۡ: لونڈیوں سے شادی کرنا معاشرے میں عار و ننگ اور عزت و وقار کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا ان غیر اسلامی توہمات کا خاتمہ کرنے کے لیے فرمایا: معیارِ فضیلت و وقار، ایمان ہے۔ وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِاِیۡمَانِکُمۡ اور اللہ تمہارے ایمان کو بہتر جانتا ہے، تم میں سے کس کا ایمان محکم ہے۔ عین ممکن ہے کہ لونڈی کا ایمان آزاد عورت سے بہتر ہو۔

۳۔ بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ: دوسری بات یہ کہ تم انسان ہونے کے اعتبار سے یکساں ہو۔ انسانی پہلوؤں سے بھی ایک دوسرے پر کوئی امتیاز نہیں ہے۔ لہٰذا لونڈیوں سے شادی کرنے میں انسانی اخلاق اور اسلامی اقدار کے مطابق کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ بات نظر میں رہے کہ آزاد عورتوں سے مالی مشکلات کی وجہ سے نکاح کرنے کی قدرت نہ رکھنے کی صورت میں لونڈیوں سے شادی کرنے کا حکم ایک امر واقع اور طبعی تربیت کے مطابق ہے، ورنہ آزاد عورتوں سے شادی ممکن ہونے کی صورت میں بھی لونڈیوں سے شادی کرنا جائز ہے۔

۴۔ فَانۡکِحُوۡہُنَّ بِاِذۡنِ اَہۡلِہِنَّ: لونڈیوں سے شادی ان کے مالکوں کی اجازت سے ہی جائز ہوگی۔

۵۔ وَاٰتُوۡہُنَّ اُجُوۡرَہُنَّ: مہر ان کے مالکوں کو دیا جاتا ہے کیونکہ کنیز خود مملوک ہونے کی وجہ سے کسی

مال کی مالک نہیں بن سکتی۔ بعض کے نزدیک آیت کے ظہور پر عمل کرتے ہوئے اس مہر کی خود کنیز مالک بن جاتی ہے۔ چونکہ قرآن نے اُجُوۡرَهُنَّ ان کنیزوں کا حق کہا ہے۔

۶۔ مُحۡصَنٰتٍ: پاکدامن رہیں۔ یعنی یہ کنیزیں ازدواج کے بعد پاکدامن رہیں اور غَیۡرَ مُسٰفِحٰتٍ بے عفتی کا ارتکاب نہ کریں۔ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخۡدَانٍ یا در پردہ آشنائی رکھنے والی نہ ہوں۔ جاہلیت قدیم میں بھی آشنا رکھنا خاص کر کنیزوں میں عام تھا۔ جدید جاہلیت نے تو اس کو اپنی تہذیب وتمدن کا حصہ بنا دیا اور بے عفتی کو ایک ثقافت کے طور پر اپنا کر اس عار و ننگ کو فخر و مباہات اور اس رذیل کثافت اور بے حیائی کو روشن خیالی کا لباس پہنا کر بدکاری کے تصور ہی کو ذہنوں سے صاف کرنے کی کوشش کی ہے۔

۷۔ فَاِذَاۤ اُحۡصِنَّ فَاِنۡ اَتَیۡنَ بِفَاحِشَۃٍ: اگر یہ زوجیت کے تحفظ میں آنے کے بعد بے عفتی کا ارتکاب کریں تو آزاد عورتوں کی سزا کی نصف سزا ان کنیزوں کو دی جائے گی۔ یعنی اگر آزاد اونچے خاندان کی عورتیں بے عفتی کریں تو سو کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔ اگر کنیزیں اسی جرم کا ارتکاب کریں تو سزا نصف ہو جائے گی۔ واضح رہے مَا عَلَی الۡمُحۡصَنٰتِ میں مراد غیر شادی شدہ آزاد عورتیں ہیں، جن کی سزا ۱۰۰ کوڑے ہیں۔ یہاں الۡمُحۡصَنٰتِ سے مراد شادی شدہ عورتیں نہیں ہیں۔ چنانچہ یہاں الۡمُحۡصَنٰتِ کا لفظ لونڈی کے بالمقابل آزاد عورتوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ شادی شدہ عورت زنا کرے تو اس کی سزا رجم ہے اور رجم کے نصف کا تصور ممکن نہیں ہے۔

قابل توجہ ہے کہ غیر اسلامی معاشروں میں، تعزیراتی قوانین میں طبقاتی تفاوت نمایاں طور پر موجود ہے۔ برہمن کی سزا کم، اچھوت کی سزا زیادہ۔ مراعات یافتہ لوگ سزا سے بچ جاتے ہیں۔ غریب طبقہ پر ہی سزائیں نافذ ہوتی ہیں۔ مگر اسلام غریب اور محکوم طبقہ کو مراعات دیتا ہے۔

۸۔ ذٰلِکَ لِمَنۡ خَشِیَ الۡعَنَتَ مِنۡکُمۡ: کنیزوں کے ساتھ شادی کی سہولت ان لوگوں کے لیے مناسب اور قابل عمل ہے جن کو شادی نہ کرنے کی وجہ سے تکلیف و مشقت، یعنی گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو۔ اگرچہ لونڈیوں کے ساتھ شادی کرنا دوسرے لوگوں کے لیے بھی جائز ہے۔

۹۔ وَاَنۡ تَصۡبِرُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ: شادی نہ ہونے کی صورت میں خواہشات کو ضبط کرنے میں جو تکلیف اٹھانے پڑتی ہے، اگر اس پر صبر کرو، اس صبر میں تمہاری بھلائی ہے۔ وَاصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ [1]

یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُبَیِّنَ لَکُمۡ وَیَہۡدِیَکُمۡ سُنَنَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ وَیَتُوۡبَ عَلَیۡکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لیے (اپنے احکام) کھول کھول کر بیان کرے اور تمہیں گزشتہ اقوام کے طریقوں پر چلائے نیز تمہاری طرف توجہ کرے اور اللہ بڑا جاننے والا، حکمت والا ہے۔

---

[1] ۱۱ ہود: ۱۱۵

تفسیر آیات

۱۔ یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُبَیِّنَ لَکُمۡ : اللہ چاہتا ہے تمہارے لیے کھول کر بیان کرے۔

۲۔ وَ یَہۡدِیَکُمۡ : اور ہدایت و راہنمائی کرنا چاہتا ہے؟ اگلے جملے میں اس چیز کا بیان ہے۔

۳۔ سُنَنَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ : گزشتہ اقوام کے طریقوں اور دستور حیات کا بیان اور راہنمائی چاہتا ہے۔ یعنی گزشتہ اقوام کو جو دستور حیات عنایت ہوا ہے، اس کے کلی قوانین، فطرت انسانی کے مطابق ایک ہی ہیں۔ بعض جزئی قانون منسوخ ہیں۔

۴۔ وَ یَتُوۡبَ عَلَیۡکُمۡ : یعنی اس بیان اور اس ہدایت کے ذریعے اللہ تم پر احسان کرنا چاہتا ہے اور تم کو دنیا و آخرت کی سعادت دینا چاہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ انسانی فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق احکام بیان فرمانے کے بعد یہ باور کراتا ہے کہ یہی سلف صالح انبیاء و مرسلین کا طریقہ حیات اور طرز زندگی ہے، جس پر چل کر توجہات الٰہی کے سزاوار بن سکتے ہیں۔

وَ اللّٰہُ یُرِیۡدُ اَنۡ یَّتُوۡبَ عَلَیۡکُمۡ ۟ وَ یُرِیۡدُ الَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الشَّہَوٰتِ اَنۡ تَمِیۡلُوۡا مَیۡلًا عَظِیۡمًا ﴿۲۷﴾

۲۷۔ اور اللہ (اپنی رحمتوں کے ساتھ) تم پر توجہ کرنا چاہتا ہے اور جو لوگ اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم بڑی بے راہروی میں پڑ جاؤ۔

یُرِیۡدُ اللّٰہُ اَنۡ یُّخَفِّفَ عَنۡکُمۡ ۚ وَ خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِیۡفًا ﴿۲۸﴾

۲۸۔ اور اللہ تمہارا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہے کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اللّٰہُ یُرِیۡدُ اَنۡ یَّتُوۡبَ عَلَیۡکُمۡ : سابقہ آیت میں جس توجہ اور مہربانی (یَّتُوۡبَ) کا ذکر ہے، اس کا دوبارہ ذکر اس لیے فرمایا تاکہ اس مہربانی کی مخالف قوتوں کی نشاندہی کی جائے۔

۲۔ وَ یُرِیۡدُ الَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الشَّہَوٰتِ : وہ مخالف قوتیں خواہشات پرستی کے مرتکب لوگ ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو دستور حیات عنایت فرمایا ہے۔ اس میں خواہشات پر کلی پابندی بھی نہیں اور کلی آزادی بھی نہیں ہے۔ مثلاً اسلام، شادی کی ترغیب کرتا ہے۔ بے عفتی پر پابندی عائد کرتا ہے۔ خواہش پرست عناصر ہر قسم کی پابندی کے سامنے بند باندھتے ہیں۔ رحمانی قوت کو اس شیطانی قوت کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ شیطانی قوتیں چاہتی ہیں کہ تم میں عظیم انحراف آ جائے، اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں سے انحراف ہو۔ اَنۡ تَمِیۡلُوۡا مَیۡلًا عَظِیۡمًا۔

۳۔ یُرِیۡدُ اللّٰہُ اَنۡ یُّخَفِّفَ عَنۡکُمۡ : اللہ تم پر پابندیوں کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔ مذکورہ احکام اور پابندیاں بوجھ نہیں ہیں لیکن ان سے تمہارا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ یعنی قانون اور انسانی قدروں کے اندر رہ کر اپنی خواہشات پوری کرنا اور اس کے لیے لونڈیوں، متعہ اور تعدد ازدواج کا جواز، آسان ذرائع فراہم کرنا، تخفیف ہے۔

مَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیَجۡعَلَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ حَرَجٍ وَّ لٰکِنۡ یُّرِیۡدُ لِیُطَہِّرَکُمۡ ...[1] — اللہ تمہیں مشقت میں نہیں ڈالنا چاہتا بلکہ وہ تمہیں پاک کرنا چاہتا ہے۔

۴۔ خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِیۡفًا: خواہشات پر کنٹرول کرنے پر صبر نہیں کر سکتا، خصوصاً جنسی خواہشات پر کنٹرول کرنا بہت مشکل ہے، اسی لیے اللہ نے اسی سلسلے میں آسانیاں فراہم کی ہیں:

اہم نکات

۱۔ شریعت انسان کے لیے زندگی کو آسان بنا دیتی ہے۔

۲۔ انسان کی کمزوریوں کو مدنظر رکھ کر شریعت بنائی گئی ہے۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَکُمۡ بَیۡنَکُمۡ بِالۡبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنۡ تَکُوۡنَ تِجَارَۃً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡکُمۡ ۟ وَ لَا تَقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُمۡ رَحِیۡمًا ﴿۲۹﴾

۲۹۔ اے ایمان والو! تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طریقے سے نہ کھایا کرو مگر یہ کہ آپس کی رضامندی سے تجارت کرو (تو کوئی حرج نہیں ہے) اور تم اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو، بے شک اللہ تم پر بڑا رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَکُمۡ بَیۡنَکُمۡ بِالۡبَاطِلِ: شریعت کی نظر میں باطل اس عمل کو کہتے ہیں جس میں کوئی معقول مفاد نہ ہو۔ جس عمل میں فرد اور معاشرے کے لیے اصولاً مصلحت نہ ہو، وہ باطل ہے۔ باطل طریقے سے مال کھانے سے مراد یہ ہے کہ جائز معاوضے کے بغیر کسی کا مال ہتھیا لیا جائے۔ مثلاً سود، قمار بازی وغیرہ، جن میں کسی دوسرے کا مال معقول معاوضے کے بغیر ہتھیا لیا جاتا ہے۔ مثلاً کتے کی قیمت لینا ناجائز ہے، البتہ اگر کتا کسی معقول اور مفید مقصد میں استعمال ہو سکتا ہے، مثلاً شکار، حفاظت وغیرہ میں تو اس کی قیمت جائز ہو جاتی ہے۔ اسلام کے کسی قانون میں مالی و جانی ضرر کا پہلو نہیں ہوتا، بلکہ اگر کسی قانون میں ضرر کا پہلو آ جائے تو یہ قانون موقوف ہو جاتا ہے۔ مثلاً اسلام نے ملکیت کا حق دیا ہے، لیکن اس میں اگر کسی

---

[1] ۵ مائدہ: ۶

دوسرے کو ضرر ہو تو یہ حق سلب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انسان اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے درخت کا مالک ہے، لیکن اگر اس درخت کی جڑیں یا شاخیں دوسرے شخص کو ضرر پہنچاتی ہیں تو یہ حق سلب ہو جاتا ہے۔

قرآن نے یہاں پر ایک کلی حکم بیان فرمایا ہے کہ باطل طریقوں سے ایک دوسرے کا مال مت کھاؤ اور باطل طریقے کیا ہیں؟ اس کی تفصیل سنت رسول (ص) میں بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ انتقال ملکیت کے لیے جو عناوین شریعت میں متعین ہیں، ان میں سے کسی عنوان کے تحت آتا ہے، مثلاً خرید و فروخت، ہبہ، وراثت، اجرت، حق مہر، جعالہ وغیرہ تو یہ انتقال ملکیت جائز ہے، ورنہ نہیں۔

۲۔ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ ۔ **تجارت:** اس آیت میں ایک دوسرے کا مال کھانے کی ممانعت سے آپس کی رضامندی سے واقع ہونے والی تجارت کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ کیونکہ اگر مال کے مقابلے میں مال ہے اور آپس کی رضامندی بھی ہے تو یہ تجارت ہے اور جائز ہے اور اگر مال کے مقابلے میں مال نہ ہو تو یہ باطل ہے۔ مال کے مقابلے میں مال ہو لیکن آپس میں رضامندی نہ ہو تو یہ فاسد ہے۔

۳۔ وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ : احترام مال کے حکم کے بعد احترام جان کا ذکر ہے جو کہ اسلام کا ایک زرین اصول ہے: حرمة مال المسلم کحرمة دمه۔[1] مال مسلم کو وہی حرمت حاصل ہے جو خون مسلم کو حاصل ہے۔ تمام مؤمنین کو نفس واحدہ قرار دے کر فرمایا کہ تم اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو۔

اس آیت کے عموم میں خودکشی اور دوسروں کا قتل بھی شامل ہے بلکہ بنا بر بعض روایات ضرر بہ نفس بھی شامل ہے، جو کہ رحمت الٰہی کا مظہر ہے۔

وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ عُدۡوَانًا وَّ ظُلۡمًا فَسَوۡفَ نُصۡلِیۡهِ نَارًا ؕ وَ کَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیۡرًا ﴿۳۰﴾	۳۰۔ اور جو شخص ظلم و زیادتی سے ایسا کرے گا ہم اسے (جہنم کی) آگ میں جھلسا دیں گے اور یہ کام اللہ کے لیے آسان ہے۔

تشریح کلمات

نُصۡلِیۡهِ: (ص ل ی) الاصلاء ۔ آگ میں جلانا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ : اس جملے میں ذٰلِکَ بعض کے نزدیک حرام مال کھانے اور قتل کی طرف اشارہ ہے اور بعض کے نزدیک اس سورہ میں مذکور تمام محرمات کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ عُدۡوَانًا وَّ ظُلۡمًا: عدوان حدود اللہ سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں۔ جب کہ ظلم خود یا کسی کے ساتھ زیادتی کرنے کو کہتے ہیں۔ لہٰذا عدوان کا مفہوم ظلم سے زیادہ وسیع ہے۔

۳۔ یَسِیۡرًا: آسان اور مشکل غیر اللہ کے لیے، جو علل و اسباب کو تسخیر کرنے کا محتاج ہے، مفہوم رکھتے ہیں، لیکن اللہ کے لیے آسانی کا مفہوم نہیں، اس کے لیے سب یکساں ہے۔ یہاں مخاطبین کو سمجھانے کے لیے فرمایا: ظلم اور زیادتی کرنے والوں کو جہنم کی آگ میں جلانا، اللہ کے لیے آسان کام ہے۔

اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا کَبَآئِرَ مَا تُنۡہَوۡنَ عَنۡہُ نُکَفِّرۡ عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ وَ نُدۡخِلۡکُمۡ مُّدۡخَلًا کَرِیۡمًا ﴿۳۱﴾

۳۱۔ اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے اجتناب کرو جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے تو ہم تمہارے (چھوٹے چھوٹے) گناہ معاف کر دیں گے اور تمہیں عزت کے مقام میں داخل کر دیں گے۔

تشریح کلمات

تَجۡتَنِبُوۡا: (ج ن ب) جنب سے ہے جو پہلو کے معنی میں ہے۔ کسی چیز سے پرہیز کرنے کے لیے یہ بطور استعارہ استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ کسی چیز سے پرہیز کرنا ہو تو اس سے پہلو پھیر لیتے ہیں۔

نُکَفِّرۡ: (ك ف ر) کفر۔ چھپانا۔ قرآن میں یہ لفظ عفو و درگزر کے معنوں میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔

تفسیر آیات

اس آیت سے معلوم ہوا کہ گناہوں کی دو اقسام ہیں:

i۔ گناہان کبیرہ

ii۔ گناہان صغیرہ

اللہ کی نافرمانی اور گستاخی کے اعتبار سے تو ہر گناہ بڑا ہے، لیکن گناہ اور گناہ کی نسبت چھوٹے بڑے گناہ ہو سکتے ہیں۔

گناہ کبیرہ کی تعریف: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اَلۡکَبَائِرُ الَّتِی اَوۡجَبَ اللّٰہُ عَزَّ وَ جَلَّ عَلَیۡھَا النَّارَ۔ [۲]

گناہ کبیرہ وہ ہے جس کا ارتکاب کرنے والے کے لیے اللہ نے جہنم کی سزا مقرر کی ہو۔

---

[۱] بحار الانوار ۲۹: ۴۰۷ [۲] اصول الکافی ۲: ۲۷۶

ان میں سرفہرست شرک ہے۔ اس کے بعد ناحق قتل، زنا، سودخوری، جنگ سے فرار، عقوقِ والدین، ولایت اہل بیت علیہم السلام کا انکار اور دیگر گناہان کبیرہ کی تعداد بعض روایات میں ستر تک پہنچ جاتی ہے۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں کبائر یعنی گناہان کبیرہ کے مقابلے میں سئیات کا ذکر آیا ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سئیات سے مراد چھوٹے چھوٹے گناہ ہیں۔ ان چھوٹے گناہوں ہی کے بارے میں دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡهِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ...[1]		بے شک نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔

ان دونوں آیات سے یہ مطلب سامنے آتا ہے کہ اگر بڑے گناہوں سے اجتناب کیا جائے تو چھوٹے گناہوں کو اللہ خود عفو و درگزر یا نیکیوں کے ذریعے مٹا دیتا ہے، لیکن اگر گناہ بڑے ہوں تو ان سے درگزر کے لیے توبہ کی ضرورت ہے۔

گناہ کے بڑا ہونے کی صورت میں یہ دیکھنا چاہیے کہ ارتکاب گناہ کی نوعیت کیا ہے؟ کیا ارتکاب نادانی کی وجہ سے ہوا ہے یا بارگاہ الٰہی میں جرأت اور گستاخی کی وجہ سے ہوا ہے یا خواہشات پر قابو نہ رکھنے کی وجہ یا گناہ کو خفیف سمجھنے کی وجہ سے ہوا ہے؟ پھر گناہ کبیرہ کے بھی مدارج ہیں۔ کچھ کبیرہ ہیں اور کچھ بہت زیادہ کبیرہ ہیں۔ مثلاً زنا کبیرہ ہے۔ اگر یہ مسجد میں ہو تو زیادہ کبیرہ ہے۔ شادی شدہ عورت کے ساتھ ہو تو اور زیادہ کبیرہ ہے۔ یہ شادی شدہ عورت ہمسائے کی عورت ہو تو اور زیادہ کبیرہ ہے۔ یہ عورت اگر محرموں میں سے ہو تو اور زیادہ کبیرہ ہے۔

یہاں سے یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ روایات میں گناہان کبیرہ کی تعداد میں اختلاف کیوں ہے۔

سوال: کیا اس سے چھوٹے گناہوں کے ارتکاب کی تشویق نہیں ہوتی؟

جواب: اولاً اگر گناہ کو خفیف اور ناچیز سمجھے تو اس سے گناہ چھوٹا نہیں رہتا، بڑا ہو جاتا ہے۔ ثانیاً یہ کہ گناہ صغیرہ کا ارتکاب بار بار ہو تو بھی صغیرہ نہیں رہتا، کبیرہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہؐ سے روایت ہے:

لَا کَبِیۡرَ مَعَ اۡلِاسۡتِغۡفَارِ وَ لَا صَغِیۡرَ مَعَ اۡلِاِصۡرَارِ۔[2]		استغفار کے ساتھ کوئی گناہ، کبیرہ نہیں رہتا اور بار بار ارتکاب کی صورت میں کوئی گناہ، صغیرہ نہیں رہتا۔

لہٰذا گناہ صغیرہ کی تشویق کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

احادیث

حضرت علی (ع) سے روایت ہے:

اَشَدُّ الذُّنُوبِ مَا اسۡتَهَانَ بِهٖ صَاحِبُهٗ.[3]		سب سے بھاری گناہ وہ ہے جس کا ارتکاب کرنے والا اسے سبک سمجھے۔

---

[1] ۱۱ ہود: ۱۱۴		[2] الوسائل ۱۵: ۳۳۵ باب صحة التوبة

[3] نہج البلاغة حکمت: ۳۴۸۔ص ۸۸۳۔طبع امامیہ کتب خانہ۔ لاہور۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

لَا صَغِیرَۃَ مَعَ الْاِصْرَارِ۔[1] بار بار گناہ کے ارتکاب سے گناہ، صغیرہ نہیں رہتا۔

وَلَا تَتَمَنَّوۡا مَا فَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعۡضَکُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِیۡبٌ مِّمَّا اکۡتَسَبُوۡا ؕ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِیۡبٌ مِّمَّا اکۡتَسَبۡنَ ؕ وَ سۡـَٔلُوا اللّٰہَ مِنۡ فَضۡلِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمًا ﴿۳۲﴾

۳۲۔ اور جس چیز میں اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے ان کی تمنا نہ کیا کرو، مردوں کو اپنی کمائی کا حصہ مل جائے گا اور عورتوں کو اپنی کمائی کا حصہ مل جائے گا اور اللہ سے اس کا فضل مانگتے رہو، یقیناً اللہ ہر چیز کا خوب علم رکھتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَا تَتَمَنَّوۡا: اس آیت کی ایک تفسیر یہ ہو سکتی ہے کہ بعض امور میں مردوں کو عورتوں پر فضیلت دی گئی ہے اور بعض دیگر چیزوں میں مردوں پر عورتوں کو فضیلت دی گئی ہے تو اس کی آرزو اور تمنا نہ کیا کرو، بلکہ اللہ کی تقسیم پر راضی برضا رہو۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ عورتوں پر جہاد کیوں واجب نہیں ہے اور مردوں کو زیادہ میراث کیوں ملتی ہے؟

۲۔ لِلرِّجَالِ نَصِیۡبٌ: مرد اور عورت میں حقیقی فضیلت اور کمال وہ ہے جو اپنے عمل اور کوششوں سے حاصل کردہ ہے۔ لہٰذا اللہ سے اس کے فضل و کرم کا سوال کرو۔ یعنی حصول کمال و فضیلت کے لیے دوسروں پر نگاہ نہ رکھو، بلکہ اللہ کی طرف رجوع کرو۔ وہاں سے تمہیں فضل و کمال میسر آئے گا۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ نظام کائنات علل و اسباب کا نظام ہونے کی وجہ سے تمام انسان یکساں نہیں ہو سکتے، بلکہ یہاں مختلف حیثیتوں میں بے شمار فرق اور تفاوت موجود ہے۔ شکل و شمائل میں، علوم و کمالات میں، مال و دولت اور جاہ و جلالت میں، قابلیت و استعداد میں، طاقت و قوت میں، حالات کی سازگاری و ناسازگاری میں بڑا فرق اور تفاوت موجود ہے۔ شاید اس نظام میں ایسا ہونا ضروری ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس تفاوت کے عالم میں صرف تمنا اور آرزو سے بات نہیں بنے گی۔ عالم پر نظام علل و اسباب حاکم ہے جس کے تحت مرد و زن دونوں کے لیے یکساں قانون ہے۔ وہ یہ کہ اپنی کوششوں، کمائی اور عمل کا نتیجہ اور صلہ ملا کرے گا، لیکن ساتھ اللہ کے فضل و احسان کی شمولیت بھی ضروری ہے۔ جس کا تمہیں مستحق بننا ہوگا۔

---

[1] من لا یحضرہ الفقیہ ۴: ۱۷

۳۔ وَسۡـَٔلُوا اللّٰہَ: لہٰذا یہ مسئلہ کسب و کوشش سے مربوط ہے، تمنا و آرزو سے نہیں۔ یہ آرزو و حسد اور کینے کا منبع ہوا کرتی ہے اور معاشرے میں بہت سے فسادات کے لیے بنیاد ہے۔
میرے نزدیک دوسری تفسیر زیادہ صائب ہے، کیونکہ آیت میں نصیب کو کسب کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ مرد ہو یا عورت ہر ایک کو اپنی محنت کا پھل ملے گا۔ نَصِیۡبٌ مِّمَّا...۔

وَ لِکُلٍّ جَعَلۡنَا مَوَالِیَ مِمَّا تَرَکَ الۡوَالِدٰنِ وَ الۡاَقۡرَبُوۡنَ ؕ وَ الَّذِیۡنَ عَقَدَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ فَاٰتُوۡہُمۡ نَصِیۡبَہُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدًا ﴿۳۳﴾

۳۳۔ اور ہم نے ان سب کے ترکوں کے وارث مقرر کیے ہیں جو ماں باپ اور رشتے دار چھوڑ جاتے ہیں اور جن سے تم نے معاہدہ کیا ہے انہیں بھی ان کے حق دے دو، بے شک اللہ ہر چیز پر حاظر و ناظر ہے۔

تشریح کلمات:

مَوَالِیَ: (و ل ی) مولیٰ کے معانی میں سے ایک معنی وارث ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لِکُلٍّ جَعَلۡنَا مَوَالِیَ: اس آیت میں احکام میراث کی جامعیت کی طرف اشارہ ہے۔ طبعی تقاضوں کے مطابق ہر شخص کا وارث مقرر ہوا ہے۔ اس کے خلاف تمنا کرنا درست نہیں ہے۔

۲۔ مِمَّا تَرَکَ الۡوَالِدٰنِ وَ الۡاَقۡرَبُوۡنَ: جو ماں باپ اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جاتے ہیں۔ اس میں والدین اور تمام رشتہ دار شامل ہیں۔ جیسے چچا، ماموں، پھوپھا، دادا دادی وغیرھم۔

وَ الَّذِیۡنَ عَقَدَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ: آیت کے دوسرے حصے میں باہمی معاہدے کی بنا پر وراثت لینے کا حکم بیان ہوا ہے جو ابتدائے اسلام میں اس طرح رائج تھا اور معاہدے کے ذریعے وراثت لینے کی کئی صورتیں تھیں۔

i۔ زمان جاہلیت میں کوئی شخص کسی سے جنگ و امن میں ایک دوسرے سے وراثت کا معاہدہ کرتا تھا تو اس معاہدے کے تحت چھٹا حصہ وراثت میں مل جاتا تھا۔

ii۔ مہاجرین و انصار کے درمیان مؤاخات کا معاہدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قائم کیا تھا، اس

معاہدے کے تحت ایک دوسرے کے وارث بنتے تھے۔ اس قسم کی وراثتیں آیہ:

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ [1] اور کتاب اللہ کی رو سے رشتے دار آپس میں مومنین اور مہاجرین سے زیادہ حقدار ہیں ....

کے ذریعے منسوخ ہو گئیں۔

iii۔ بعض مفسرین باہمی معاہدے سے ازدواجی وراثت مراد لیتے ہیں، جو سیاق وسباق آیت کے مطابق معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ قرآن نے کسی جگہ ازواج کے لیے یہ تعبیر استعمال نہیں کی۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۭ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۭ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ۝۳۴

۳۴۔ مرد عورتوں پر نگہبان ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس لیے کہ مردوں نے اپنا مال خرچ کیا ہے، پس جو نیک عورتیں ہیں وہ فرمانبردار ہوتی ہیں، اللہ نے جن چیزوں (مال اور آبرو) کا تحفظ چاہا ہے، (خاوند کی) غیر حاضری میں ان کی محافظت کرتی ہیں اور جن عورتوں کی سرکشی کا تمہیں خوف ہو انہیں نصیحت کرو (اگر باز نہ آئیں تو) خواب گاہ الگ کر دو اور (پھر بھی باز نہ آئیں تو) انہیں مارو، پھر اگر وہ تمہاری فرمانبردار ہو جائیں تو ان کے خلاف بہانہ تلاش نہ کرو، یقیناً اللہ بالاتر اور بڑا ہے.

تفسیر کلمات

قَوّٰمُوْنَ: (ق و م) قوم۔ راغب المفردات میں لکھتے ہیں: قوام کسی چیز کی حفاظت اور مراعات کے معنوں میں ہے۔

[1] ۳۳ احزاب: ۶

قٰنِتٰتٌ: 　(ق ن ت) قنوت۔ خضوع کے ساتھ اطاعت کا التزام کرنا۔

نُشُوۡز: 　(ن ش ز) سرکشی کرنا۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَی النِّسَآءِ: مرد عورتوں کے محافظ اور نگہبان ہیں۔اَیْ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ فِی الْاَدَب۔[1] آداب میں مرد عورتوں کے قوّام ہیں۔یعنی عائلی نظام میں مرد کو قیومیت اور ستون کا مقام حاصل ہے۔ چنانچہ قوام اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی معاملے یا نظام کو چلانے اور اس کی محافظت کا ذمہ دار ہو۔ مرد کے قوام ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ عورت محکوم ہے اور اس سے ہر قسم کے استقلال اور انفرادی عمل و ارادے کا اختیار سلب ہو جاتا ہے، بلکہ عورت اپنے انفرادی امور میں خود فیصلہ کرنے کا پورا پورا حق رکھتی ہے:

فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ فِیۡمَا فَعَلۡنَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ...۔[2]	دستور کے مطابق اپنے بارے میں جو فیصلہ کریں اس کا تم پر کچھ گناہ نہیں ...

وہ اپنے بارے میں فیصلے خود کر سکتی ہیں، بلکہ مرد بعض امور میں عورت سے مشورہ لے سکتا ہے:

فَاِنۡ اَرَادَا فِصَالًا عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡہُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡہِمَا ...۔[3]	پھر اگر طرفین باہمی رضامندی اور مشورے سے بچے کا دودھ چھڑانا چاہتے ہیں تو اس میں ان پر کوئی مضائقہ نہیں ہے۔
وَ لِلنِّسَآءِ نَصِیۡبٌ مِّمَّا اکۡتَسَبۡنَ ...۔[4]	اور عورتوں کو اپنی کمائی کا حصہ مل جائے گا۔

چنانچہ انہیں انفرادی ملکیت وغیرہ کا مکمل حق حاصل ہے۔ ذمہ داریاں مرد و زن کے اپنے اپنے مقام پر ہیں، جنہیں قدرت نے ان دونوں کے فطری تقاضوں کے مطابق تقسیم کیا ہے۔ چنانچہ:

☆ عورت مہر و محبت کے ذریعے بچوں کو نفسیاتی غذا بہم پہنچاتی ہے۔

☆ مرد طاقت و قوت کے ذریعے جسمانی غذا فراہم کرتا ہے۔

☆ عورت بچوں کی دیکھ بھال میں راتیں جاگتی ہے۔

☆ مرد حصول رزق کے لیے دن رات ایک کرتا ہے۔

☆ عورت بچوں کو داخلی خطرات سے بچاتی ہے۔

☆ مرد بیرونی دشمن کا مقابلہ کرتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ عورت کو انسانی زندگی سے مربوط داخلی امور کی ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں، جب کہ مرد کو بیرونی امور کی ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں۔

---

[1] مستدرک الوسائل ۱۴: ۲۵۹　[2] ۲ بقرہ: ۲۳۴　[3] بقرہ: ۲۳۳　[4] ۴ نساء: ۳۲

یہ بات مرد و زن کی جسمانی ساخت و بافت اور نفسیاتی خصوصیات سے بھی عیاں ہے۔

عورت ضعیف النفس، نازک مزاج، حساس ہوتی ہے اور اس کے ہر عمل پر جذبات غالب ہوتے ہیں، جب کہ مرد طاقتور، جفاکش اور اس کے ہر عمل پر عقل وفکر حاکم ہوتی ہے۔

۲۔ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ: مرد کو عورت پر قوام اور نگہبان اس لیے بنایا کہ مرد کی شخصیت میں اللہ نے کچھ خصوصیات ودیعت فرمائی ہیں اور بعض انتظامی امور میں برتری دی ہے۔ یہ برتری عند اللہ قرب و منزلت کے معنوں میں نہیں ہے۔ عند اللہ منزلت حاصل کرنے کے لیے جو معیار ہے، اس میں مرد و زن مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی مقام عبدیت میں دونوں مساوی ہیں، بلکہ یہ برتری جسمانی طاقت، دماغی صلاحیت، ارادے کی مضبوطی اور اعصاب کے استحکام اور عقل وفکر کی پختگی سے مربوط ہے۔ اسی بنا پر عائلی نظام میں انتظامی ذمہ داری دی ہے۔ جیسا کہ اسی عائلی نظام میں باپ چھوٹے بچوں کا سرپرست، نگہبان اور محافظ ہوتا ہے اور بچوں پر باپ کی اطاعت ضروری ہے۔ چنانچہ عورت کو قدرتی طور پر شوہر کے سائے میں تحفظ ملتا ہے اور شوہر کو عورت سے تسکین نفس حاصل ہوتی ہے۔

۳۔ وَ بِمَاۤ اَنۡفَقُوۡا مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ: یہ مادی ذمہ داری اور تحفظ کا ذکر ہے۔ دوسرے الفاظ میں بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ میں طبعی برتری کا ذکر ہوا اور بِمَاۤ اَنۡفَقُوۡا میں قانونی ذمہ داری کا ذکر ہوا ہے کہ مرد پر عورت کا مہر اور نفقہ واجب ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ کسب معاش اور ضروریات زندگی فراہم کرنا مردوں پر فرض ہے۔ یعنی اگر مرد کو طبعی طور پر کچھ زیادہ برتری دی ہے تو اس کے مقابلے میں مرد پر زیادہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔

۴۔ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ: قانون کے ذکر کے بعد اس پر عمل داری اور اس کی فضیلت کا ذکر ہے کہ صالح اور نیک عورت وہ ہے جو اللہ کے اس وضع کردہ نظام کی پاسداری کرتے ہوئے فرمانبرداری کرے۔ جملہ قٰنِتٰتٌ سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مرد سرپرستی اور نگہبانی کے منصب پر فائز ہے اور عورت پر اطاعت واجب ہے۔ یعنی ازدواجی اور زن و شوہر کے مسائل میں اطاعت واجب ہے۔

۵۔ حٰفِظٰتٌ لِّلۡغَیۡبِ: دوسری ذمہ داری عورت پر یہ عائد ہوئی ہے کہ وہ مرد کی غیر حاضری میں اپنے نفس، آبرو اور شوہر کے مال کی حفاظت کرے۔ اس سے دو باتیں سامنے آتی ہیں: ایک یہ کہ مرد کو تلاش معاش میں غیر حاضر رہنا پڑتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ آبرو کے ساتھ شوہر کا مال بھی عورت کے اختیار میں ہوتا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ بہترین عورت وہ ہے جو شوہر کی غیر حاضری میں شوہر کے مال اور اپنے نفس کی حفاظت کرے۔

۶۔ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ: مال اور آبرو کو اللہ تعالیٰ نے قانوناً تحفظ دیا ہے۔ عورت کو چاہیے کہ اس مال و آبرو کو عملاً تحفظ دے۔

۷۔ وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَهُنَّ: اس عائلی نظام کو وضع کرنے اور اس نظام میں اطاعت اور حفاظت کو ضروری قرار دینے کے بعد اس قانون سے سرکشی ہونے کی صورت کے علاج کا بیان ہے کہ اگر عورت اس نظام سے سرکشی اختیار کرے، جذبات و احساسات کی محکوم، ضعیف المزاج عورت کو راہ راست پر لانے کے لیے درج ذیل وسائل بروئے کار لانے ہوں گے:

الف: فَعِظُوۡهُنَّ: سرپرست اور محافظ کی سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ نصیحت کرے۔ یعنی سرکشی کی صورت میں قیم کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ عورت کی شخصیت پر دست درازی کرے اور اس کے وقار کو مجروح کرے، بلکہ مہذب انداز میں نصیحت کرے، نفع و نقصان سے آگاہ کرے اور اس کی حساس مزاجی کا لحاظ رکھے۔

ب: وَاهۡجُرُوۡهُنَّ: اگر نصیحت کارگر ثابت نہیں ہوتی تو دوسرا مرحلہ یہ ہو گا کہ خواب گاہ الگ کر دی جائے اور ہمبستری منقطع کی جائے۔ اس سے سرکش عورت کو تنبیہ ممکن ہے۔ کیونکہ عورت مرد کی خواہش پرستی کی کمزوری سے بخوبی واقف ہے، جس سے سرکش عورت خوب فائدہ اٹھاتی ہے۔ اگر وہ اس کمزوری پر قابو پا لے اور عورت کے نزدیک جانا ترک کر دے تو سرکش عورت کے ہاتھ سے یہ ہتھیار نکل جائے گا اور گھر کا نظام پرسکون ہو جائے گا۔

ج: وَاضۡرِبُوۡهُنَّ: اگر عورت کی سرکشی کا یہ عالم ہو کہ نہ نصیحت اس پر اثر کرتی اور نہ ہی ترک مباشرت سے اسے تنبیہ ہوتی ہے تو علاج کی آخری صورت زد و کوب کرنا ہے۔ مگر اس کا محرک انتقام لینا یا اہانت کرنا نہ ہو، بلکہ یہ زد و کوب ایسا ہو جیسا کہ ایک مربی اپنے زیر تربیت افراد کے ساتھ کرتا ہے، یا شفیق باپ اولاد کو زد و کوب کرتا ہے، جس کے پیچھے ایک پاک جذبہ، ایک ہمدردی کارفرما ہوتی ہے۔ اسی لیے حکم یہ ہے کہ زد و کوب نہایت ہلکا ہو۔ مثلاً مسواک جیسی ہلکی چیز سے ہو۔

یہ سب سرکشی کی صورت میں ہے، لیکن اگر عورت نے اطاعت کا راستہ اختیار کر لیا تو اس صورت میں قرآن فرماتا ہے: فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَیۡهِنَّ سَبِیۡلًا ۔ ان کے خلاف بہانہ تلاش نہ کرو۔

احادیث

مروی ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام عورت کو مارنے کے بارے میں فرماتے ہیں:

... و الضرب بالسواك۔[1] اور زد و کوب مسواک جیسی چیز سے ہو۔

اہم نکات

۱۔ عورت کو مرد کی نگہبانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

---

[1] من لا یحضره الفقیه ۳ : ۵۲۱

۲۔ مرد کو عورت پر فزیکلی برتری حاصل ہوتی ہے۔
۳۔ عورت پر فرمانبرداری اور عفت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔
۴۔ سرکشی کی صورت میں عورت کی تنبیہ کی جاتی ہے۔

وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَیۡنِہِمَا فَابۡعَثُوۡا حَکَمًا مِّنۡ اَہۡلِہٖ وَ حَکَمًا مِّنۡ اَہۡلِہَا ۚ اِنۡ یُّرِیۡدَاۤ اِصۡلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیۡنَہُمَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیۡمًا خَبِیۡرًا ﴿۳۵﴾

۳۵۔ اور اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان ناچاقی کا اندیشہ ہو تو ایک منصف مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک منصف عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو اگر وہ دونوں اصلاح کی کوشش کریں تو اللہ ان کے درمیان اتفاق پیدا کرے گا، یقیناً اللہ بڑا علم رکھنے والا، باخبر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ : خطاب حکومت سے ہے، جس کے پاس مسئلہ پیش ہوا ہو کہ وہ طرفین سے ایسے منصف کے تقرر کا فریضہ انجام دے کہ جن کا مطمح نظر میاں بیوی میں اصلاح کرنے کا پختہ عزم ہو۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ان دونوں منصفوں کا دائرۂ اختیار اصلاح ہونا چاہیے۔ اصلاح ممکن نہ ہونے کی صورت میں طلاق جاری کرنے کے مجاز نہ ہوں گے۔

۲۔ فَابۡعَثُوۡا حَکَمًا : عدالت کی ذمہ داریوں میں سے اہم ذمے داری یہ ہے کہ خاندانوں کے مسائل، ان کے اپنے اندر سے مقرر شدہ ثالثوں کے ذریعے حل کرنے کے لیے طرفین میں سے ثالث کا تقرر کرے اور خاندانی راز کو اپنے ہی خاندان کی راز داری تک محدود رہنے دیا جائے، کیونکہ زن و شوہر کے تعلقات اور اس میں ناچاقی بعض ایسی باتوں پر مشتمل ہو سکتی ہے جس کا افشا ہونا خاندانی وقار کے منافی ہو نیز خاندانی حالات کا قریب سے علم ہونے کی وجہ سے فیصلہ صائب اور سریع ہو سکتا ہے۔

۳۔ اِنۡ یُّرِیۡدَاۤ اِصۡلَاحًا : اگر یہ اصلاح کا ارادہ کر لیں تو اللہ ان کے درمیان اتفاق پیدا کر دے گا۔ زوجین کے باہمی اور مصالحت کی کامیابی کے لیے عزم مصمم شرط ہے۔ ''دونوں'' سے مراد بعض کے نزدیک دونوں منصف ہیں کہ ان دونوں میں مصالحت کی کوشش میں اگر عزم و ارادہ مضبوط ہے تو مصالحت ہو جائے گی۔ بعض دیگر مفسرین کے نزدیک ''دونوں'' سے مراد زوجین ہیں کہ اگر دونوں مصالحت چاہیں تو اللہ ان میں اتفاق پیدا کر دے گا۔

احادیث

رسول اکرم (ص) سے مروی ہے:

أ يَضْرِبُ اَحَدُكُمُ الْمَرْأَةَ ثُمَّ يَظَلُّ مُعَانِقَهَا۔[1] — کیا تم عورت کو زد و کوب کرتے ہو، پھر اس سے معانقہ کرتے ہو۔

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام سے روایت ہے:

جِهَادُ الْمَرْأَةِ حُسْنُ التَّبَعُّلِ۔[2] — عورت کا جہاد اچھی شوہر داری ہے۔

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام سے روایت ہے:

... فَاِنَّ الْمِرْأَةَ رَيْحَانَةٌ وَ لَيْسَتْ بِقَهْرَمَانَةٍ۔[3] — ...کیونکہ عورت ایک پھول ہے، وہ کارفرما و حکمران نہیں ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ﴿۳۶﴾

۳۶۔ اور تم لوگ اللہ ہی کی بندگی کرو اور کسی چیز کو اس کا شریک قرار نہ دو اور ماں باپ، قریب ترین رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں، قریب ترین رشتہ دار پڑوسی، اجنبی پڑوسی، پاس بیٹھنے والے رفیقوں، مسافروں اور جو (غلام و کنیز) تمہارے قبضے میں ہیں سب کے ساتھ احسان کرو، بے شک اللہ کو غرور کرنے والا، (اپنی بڑائی پر) فخر کرنے والا پسند نہیں۔

تشریح کلمات

الجُنُبِ: اجنبی۔

مختال: غرور و تکبر کرنے والا۔

---

[1] اصول الکافی ۵: ۵۱۰ [2] اصول الکافی ۵: ۹

[3] نہج البلاغۃ وصیت امام حسن ع ص ۶۸۰ ۔ ترجمہ مفتی جعفر حسینؒ ۔ طبع امامیہ کتب خانہ۔ لاہور

تفسیر آیات

اس آیۂ کریمہ میں گیارہ نکات پر مشتمل تعلیمات ہیں:

i۔ سب سے پہلے تصور کائنات کے بارے میں اپنا مؤقف درست کرو اور اس کائنات میں خدائے واحد کی عبودیت کو تسلیم کر کے ہر قسم کے شرک سے اجتناب کرو۔

ii۔ خدائے واحد کی پرستش کے بعد والدین پر احسان اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ قرآن کی متعدد آیات میں توحید کے بعد والدین پر احسان کا ذکر ملتا ہے۔ اگر چہ والدین کو بھی حکم ہے کہ وہ اولاد پر احسان کریں، لیکن والدین اولاد کے ساتھ از روئے جبلت محبت کرتے ہیں۔ اولاد چونکہ آنے والی نسل کا تسلسل ہے، اس کے لیے قدرت نے فطرت ہی میں تقاضے پورے کیے ہیں کہ والدین اولاد پر ہر صورت میں احسان ہی کریں گے۔ والدین تو اس دنیا سے کوچ کرنے کی طرف رخ کیے ہوئے ہوتے ہیں، لہٰذا طبعًا ان کی بقا اور ان کا وجود اولاد کے لیے اس قدر عزیز نہیں ہوتا جس قدر والدین کے لیے اولاد کی بقا اور وجود عزیز ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کمی کو اللہ تعالیٰ قانون کے ذریعے پورا کرنے کے لیے والدین پر احسان کی تاکید فرماتا ہے۔

iii۔ قرابتداروں پر احسان کے سلسلے میں بھی متعدد آیات میں تاکید ہے اور احادیث میں صلۂ رحمی کے عنوان سے بے شمار احادیث وارد ہوئی ہیں جن میں قرابتداروں کے حقوق بیان کیے گئے ہیں۔

iv۔ یتیموں پر احسان کے فضائل بھی بے شمار ہیں۔ اس کے لیے اتنا کافی ہے کہ یتیم کی کفالت کرنے والے جنت میں حضور اکرم (ص) کے جوار میں ہوں گے۔

v۔ مساکین، حاجتمندوں کی فریاد رسی کرنا فطرتاً ایک احسن عمل ہے، جس کے انجام دینے سے انسان داخلی طور پر کیف و سرور کا احساس کرتا ہے۔ اگر چہ یہ اللہ کی طرف سے بھی مطلوب ہے نیز اس میں رضائے رب بھی ہو تو یہ عمل اور زیادہ موجب کیف و سرور ہوگا۔

vi۔ وَ الۡجَارِ ذِی الۡقُرۡبٰی: اس سے بعض نے قریبی رشتہ دار ہمسایہ مراد لیا ہے اور بعض کے نزدیک قریبی ہمسایہ مراد ہے اور یہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اول تو رشتے داروں پر احسان کا ذکر پہلے آ گیا ہے۔ ثانیاً اس کے بعد دور کے ہمسایوں کا ذکر آیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قریبی ہمسائے مراد ہیں۔

vii۔ وَ الۡجَارِ الۡجُنُبِ: اجنبی، یعنی دور کے ہمسایے پر احسان کرو۔ روایات کے مطابق چالیس ہاتھ کے فاصلے تک ہمسائے کے حقوق آئے ہیں اور بعض روایات کے مطابق چالیس گھروں تک کا ذکر ہے۔ شاید دور کے ہمسایوں کی حدبندی چالیس گھروں تک ہو۔

viii۔ وَالصَّاحِبِ بِالۡجَنۡۢبِ ہ: یعنی ہم نشین، ساتھی، رفیق، خواہ رفیق راہ ہو یا رفیق کار۔
ix۔ وَابۡنِ السَّبِیۡلِ: راہ ماندہ مسافر۔ خواہ اپنے وطن میں مالدار اور بے نیاز ہی کیوں نہ ہو۔
x۔ اپنے زیر قبضہ غلاموں اور کنیزوں پر نیکی کرنے کا حکم ہے کہ ان کے ساتھ حسن سلوک کریں۔ اس میں نوکر اور اپنے ماتحت افراد بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ لوگ وَ الصَّاحِبِ بِالۡجَنۡۢبِ ہم نشینوں میں شامل ہو جائیں۔
xi۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ: اس کے بعد تکبر و غرور کے ذکر سے پتہ چلتا ہے کہ متواضع اور منکسر المزاج انسان ہی منبع خیر و برکات ہوتے ہیں اور متکبر لوگوں کا معاشرے میں کوئی کردار نہیں ہوتا۔ اس لیے تکبر کی مذمت میں بے شمار احادیث موجود ہیں۔

احادیث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے روایت ہے:

وما زال جبرئیل یوصینی بالجار حتی ظننت ثیورثہ۔

جبرئیل نے مجھ سے ہمسایوں کے بارے میں اس وقت سفارش کی کہ مجھے ان کے وارث بننے کا گمان ہونے لگا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

صِلَۃُ الرَّحِمِ وَ حُسۡنُ الۡجِوَارِ یَعۡمُرَانِ الدِّیَارَ وَ یَزِیۡدَانِ فِی الۡاَعۡمَارِ۔[1]

صلہ رحمی اور اچھی ہمسائیگی سے گھر آباد اور عمریں دراز ہوتی ہیں۔

الَّذِیۡنَ یَبۡخَلُوۡنَ وَ یَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبُخۡلِ وَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اٰتٰہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ؕ وَ اَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابًا مُّہِیۡنًا ﴿ۚ۳۷﴾

۳۷۔ (وہ لوگ بھی اللہ کو پسند نہیں) جو خود بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل کی تلقین کرتے ہیں اور اللہ نے جو کچھ اپنے فضل سے انہیں عطا کیا ہے اسے چھپاتے ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے ذلت آمیز سزا مہیا کر رکھی ہے۔

تفسیر آیات

خود بینی اور فخر کرنے والے کے بعد اللہ کو بخل کرنے والا ناپسند ہے۔ فیاضی ایک آفاقی اور فطری عمل ہے۔ سورج، زمین، آب اور ہوا نے اپنی فیاضی سے کائنات کو پر رونق بنایا ہے۔ اس کے خلاف بخل کرنا ایک نہایت گھٹیا عمل ہے۔ جو شخص بخل کر کے دولت جمع کرتا ہے اور وہ اس عمل سے دوسروں کو بھی بخل کی تعلیم

---

[1] الامالی للصدوق المجلس ۷۷۔ صحیح البخاری کتاب الادب ۷: ۷۸

دیتا ہے کہ مال و دولت بخل سے ہی بن سکتی ہے نیز بخیل اپنی بود و باش میں فقیروں کی طرح زندگی گزارتا ہے اور اس طرح اللہ کے فضل و کرم کو وہ عملاً چھپاتا ہے۔

وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ: اس جگہ کافر سے مراد اللہ کی نعمتوں کو چھپانے والے مراد ہو سکتے ہیں۔ چونکہ کفر چھپانے کے معنوں میں ہوتا ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اِذَا اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَی عَبۡدِہٖ بِنِعۡمَۃٍ اَحَبَّ اَنۡ یَرَاھَا عَلَیۡہِ۔[1]

اللہ تعالیٰ جب کسی کو نعمت دیتا ہے تو وہ یہ پسند کرتا ہے کہ اس نعمت کے آثار بندے پر ظاہر ہوں۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

اَلۡبُخۡلُ عَارٌ وَالۡجُبۡنُ مَنۡقَصَۃٌ۔[2]

بخل عار وننگ ہے اور بزدلی نقص و عیب ہے۔

نیز آپ علیہ السلام سے روایت ہے:

البُخۡلُ جَامِعٌ لِمَسَاوِیِ الۡعُیُوبِ وَ ھُوَ زِمَامٌ یُقَادُ بِہٖ اِلَی کُلِّ سُوءٍ۔[3]

بخل تمام عیوب کی برائیوں کا مجموعہ ہے اور یہ وہ لگام ہے جو ہر برائی کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے۔

حضرت امام حسن علیہ السلام سے بخل کے بارے میں روایت ہے:

البُخۡلُ اَنۡ یَرَی الرَّجُلُ مَا اَنۡفَقَہُ تَلَفاً وَ مَا اَمۡسَکَہُ شَرَفاً۔[4]

بخل یہ ہے کہ انسان یہ سمجھے کہ خرچ کرنا تلف کرنا ہے اور خرچ نہ کرنا شرف ہے۔

وَالَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَہُمۡ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ وَمَنۡ یَّکُنِ الشَّیۡطٰنُ لَہٗ قَرِیۡنًا فَسَآءَ قَرِیۡنًا ﴿۳۸﴾

۳۸۔اور (وہ لوگ بھی اللہ کو پسند نہیں) جو اپنا مال صرف لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور وہ نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ روز آخرت پر اور (بات یہ ہے کہ) شیطان جس کا رفیق ہو جائے تو وہ بہت ہی برا رفیق ہے۔

تفسیر آیات

ا۔وَالَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ: اگر وہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے تو مال خرچ کرتے ہوئے ریاکاری کی ضرورت نہ تھی۔ وہ رضائے خدا اور زاد آخرت کے لیے مال خرچ کر کے مال سے خوب فائدہ اٹھا سکتے تھے، لیکن چونکہ اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور صرف اسی چند روزہ زندگی پر ایمان رکھتے ہیں، لہٰذا مال

---

[1] الکافی ۶: ۴۳۸ [2] مستدرک الوسائل ۷: ۲۸ [3] مستدرک الوسائل ۷: ۲۹ باب ترحیم البخل [4] مستدرک الوسائل ۷: ۲۳۸

وہ ایسی جگہ خرچ کریں گے، جہاں ان کے خیال خام میں دنیاوی فائدہ ہے۔

۲۔ وَمَنۡ یَّکُنِ الشَّیۡطٰنُ: ریا کاری ایک شیطانی خصلت ہے۔ لہٰذا ریا کار کو شیطان کی رفاقت حاصل ہے۔ چنانچہ یہ خصلت اس نے شیطان سے اخذ کی ہے۔

اہم نکات

۱۔ ریا کاری اللہ اور قیامت پر عدم ایمان کا نتیجہ ہے۔

۲۔ ریا کار شیطان کا رفیق ہوتا ہے۔

وَمَاذَا عَلَیۡہِمۡ لَوۡ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَاَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقَہُمُ اللّٰہُ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ بِہِمۡ عَلِیۡمًا ﴿۳۹﴾

۳۹۔ اور اگر یہ لوگ اللہ اور روز آخرت پر ایمان لاتے اور اللہ کی عطا کردہ روزی میں سے خرچ کرتے تو اس میں انہیں کوئی نقصان نہ تھا اور اللہ تو ان کا حال اچھی طرح جانتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَاذَا عَلَیۡہِمۡ: حالانکہ اگر وہ ایمان باللہ کے ساتھ اپنا مال رضائے رب کے لیے خرچ کرتے تو اس میں ان کا کوئی نقصان نہ تھا۔ عدم انفاق ایک ایسا عمل ہے، جو اللہ پر ایمان نہ ہونے پر عملی دلیل ہے۔

۲۔ کَانَ اللّٰہُ بِہِمۡ عَلِیۡمًا: اللہ تعالیٰ پر ان کا قصد و ارادہ پوشیدہ نہیں ہے۔ اگر وہ اللہ کے لیے کچھ خرچ کرتے تو فائدہ میں رہتے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظۡلِمُ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ ۚ وَ اِنۡ تَکُ حَسَنَۃً یُّضٰعِفۡہَا وَ یُؤۡتِ مِنۡ لَّدُنۡہُ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۴۰﴾

۴۰۔ یقیناً اللہ (کسی پر) ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور اگر (کسی کی) ایک نیکی ہو تو (اللہ) اسے دوگنا کر دیتا ہے اور اپنے ہاں سے اسے اجر عظیم عطا فرماتا ہے۔

تشریح کلمات

مِثۡقَال: (ث ق ل) وزن کو کہتے ہیں۔

ذَرَّۃٍ: چھوٹی چیونٹی یا چھوٹے ذرے

تفسیر آیات

راہ خدا میں مال خرچ کرنے سے نقصان اس لیے نہیں ہوتا کہ اللہ ذرہ برابر بھی کسی پر ظلم نہیں کرتا اور

ان کے خرچ کردہ مال کی جزا دیتا ہے، بلکہ ان کی نیکیوں میں مزید اضافہ کرتا ہے اور اجر عظیم عنایت فرماتا ہے۔

وَ اِنۡ تَکُ حَسَنَۃً : اگر یہ زرہ برابر نیکی ہے تو اللہ اسے کئی گنا کر دے گا۔ زرہ برابر نیکی پر بھی اجر عظیم دے سکتا ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ آیت ۱۶۱ میں فرمایا: راہ خدا میں ایک دانہ خرچ کرنے کا ثواب سات سو گنا مل سکتا ہے۔ پھر فرمایا: خدا جس کو چاہتا ہے دوگنا کر دیتا ہے۔ یعنی خرچ کرنے والے کی خلوص نیت کے مطابق اسے ثواب دیا جاتا ہے۔

چنانچہ عمل کنندہ کے باطنی حسن کے مطابق، عمل میں حسن آتا ہے۔

فَکَیۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ کُلِّ اُمَّۃٍۭ بِشَہِیۡدٍ وَّ جِئۡنَا بِکَ عَلٰی ہٰۤؤُلَآءِ شَہِیۡدًا ﴿۴۱﴾

۴۱۔ پس (اس دن) کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور (اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کو ان لوگوں پر بطور گواہ پیش کریں گے۔

یَوۡمَئِذٍ یَّوَدُّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ عَصَوُا الرَّسُوۡلَ لَوۡ تُسَوّٰی بِہِمُ الۡاَرۡضُ ؕ وَ لَا یَکۡتُمُوۡنَ اللّٰہَ حَدِیۡثًا ﴿۴۲﴾

۴۲۔ اس روز کافر اور جو لوگ رسول کی نافرمانی کرتے رہے، تمنا کریں گے کہ کاش (زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں دفن ہو کر) زمین کے برابر ہو جائیں اور وہ اللہ سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَکَیۡفَ اِذَا جِئۡنَا : یعنی ہر زمانے کے رسول اپنی امت پر اللہ کی عدالت گاہ میں گواہ ہوں گے کہ پیغام الٰہی کو ان لوگوں تک پہنچا دیا۔ ان لوگوں نے اس پر عمل کیا ہو یا عصیان کیا ہو، دونوں صورتوں میں گواہی دیں گے۔

چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

و کنت علیھم شھیداً ما دمتُ فیھم.[۱]　میں ان پر گواہ تھا، جب تک میں ان میں تھا۔

اس سے تو معلوم ہوتا ہے انبیاء اپنے معاصر لوگوں کے اعمال پر گواہ ہوں گے۔ ممکن ہے انبیاء کے بعد ان کے اوصیاء بھی گواہ ہوں۔

۲۔ عَلٰی ہٰۤؤُلَآءِ : ان لوگوں پر۔ اس سے مراد امت ہے تو اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ جس طرح ہر

---

[۱] بحار الانوار ۱۴: ۳۳۸

نبی اپنی امت کے اعمال پر گواہ ہے، اے رسول (ص) آپ ان لوگوں یعنی اس امت پر گواہ ہیں۔

بعض کے نزدیک ہٰۤؤُلَاۤءِ سے مراد ہر امت کا شہید ہے۔ اس صورت میں رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام امتوں کے گواہوں پر گواہ ہوں گے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام سے روایت ہے:

مَا دَخَلْتُ عَلَی اَبِی قَطُّ اِلَّا وَجَدته بَاکِیاً وَقَالَ اِنَّ النَّبِی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بَکیٰ حِیْنَ وَصَلَ فِی قِرَاءَ تِہِ فَکَیْفَ اِذَا جِئنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ بشھید و جئنا بك علی ھؤلاء شھیداً۔ فانْظُرُوُا اِلَی الشاہَد کَیْفَ یَبْکی وَ المَشھودُ عَلَیھِم یَضْحَکُوْنَ[1]

میں اپنے والد گرامی کی خدمت میں جب بھی حاضر ہوا، ان کو روتے ہوئے پایا اور فرمایا: نبی کریم (ص) جب اس آیت تک پہنچ جاتے تو گریہ فرمایا کرتے تھے۔ دیکھو گواہ گریہ کرتے ہیں، جب کہ وہ لوگ گریہ نہیں کر رہے ہیں جن پر آپ (ص) گواہ ہیں۔

اعمال امت پر رسول اکرم (ص) کے شاہد ہونے کے سلسلے میں مزید تشریح کے لیے سورہ بقرہ آیت ۱۴۳ ملاحظہ فرمائیں۔

۳۔ یَوۡمَئِذٍ یَّوَدُّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا اور رسول کی نافرمانی کی، وہ خواہش کریں گے کہ وہ نابود ہو جائیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

یَقُوۡلُ الۡکٰفِرُ یٰلَیۡتَنِیۡ کُنۡتُ تُرٰبًا ۔[2] ...کافر کہ اٹھے گا: اے کاش! میں خاک ہوتا۔

۴۔ عَصَوُا الرَّسُوۡلَ: رسولؐ کی نافرمانی سے المیزان نے رسولؐ کی ولایت کی نافرمانی مراد لیا ہے، شریعت کی نہیں۔ چنانچہ اگر رسولؐ کسی کو بلائیں اور وہ اس بلانے پر رسولؐ کی خدمت میں حاضر نہ ہو تو یہ رسولؐ کی بطور حاکم نافرمانی ہے۔

۵۔ وَلَا یَکۡتُمُوۡنَ اللّٰہَ حَدِیۡثًا: کافر قیامت کے دن کوئی جرم نہیں چھپا سکیں گے۔ خود اللہ جانتا ہے۔ اس کے اپنے اعضا گواہی دیں گے اور وقت کے رسول بھی گواہی دیں گے۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقۡرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنۡتُمۡ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعۡلَمُوۡا مَا تَقُوۡلُوۡنَ وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیۡ سَبِیۡلٍ حَتّٰی تَغۡتَسِلُوۡا ؕ وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ

۴۳۔ اے ایمان والو! نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جایا کرو یہاں تک کہ تم جان لو کہ تم کیا کہ رہے ہو اور جنابت کی حالت میں بھی، یہاں تک کہ غسل کر لو مگر یہ کہ کسی راستے سے

---

[1] ارشاد القلوب ۱: ۹۷ باب ۲۳ [2] ۷۸ نباء: ۴۰

مَّرۡضٰۤی اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡکُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً فَتَیَمَّمُوۡا صَعِیۡدًا طَیِّبًا فَامۡسَحُوۡا بِوُجُوۡہِکُمۡ وَ اَیۡدِیۡکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا غَفُوۡرًا ﴿۴۳﴾	گزر رہے ہو اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی رفع حاجت کر آیا ہو یا تم نے عورتوں سے ہمبستری کی ہو اور تمہیں پانی میسر نہ آئے تو پاک مٹی پر تیمّم کرو، چنانچہ اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں کا مسح کرو، بے شک اللہ بڑا معاف کرنے والا، بخشنے والا ہے۔

تشریح کلمات

سُکٰرٰی: (س ك ر) سکر۔ بند کرنا۔ نشے سے عقل ماند پڑ جاتی ہے، اس لیے اسے سکر کہا گیا ہے۔

جنب: (ج ن ب) دور رہنا۔ اسی سے اجتناب، پرہیز ہے۔ جنابت اس لیے کہا گیا کہ شرعاً نماز سے دور رہنے کا سبب بنتی ہے۔

الغَآئِطِ: (غ ی ط) نیچی جگہ۔ عموماً رفع حاجت کے لیے لوگ نیچی جگہوں پر جاتے ہیں، اس لیے نشیبی جگہ سے رفع حاجت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

تیمموا: تیمم۔ قصد۔

صَعِیۡد: (ص ع د) خالص مٹی۔ آیت کا لفظی ترجمہ تو یہ بنتا ہے: اگر پانی میسر نہ آئے تو پاک مٹی کا قصد کرو۔ یعنی تیمّم کرو۔

تفسیر آیات

حرمت شراب کا حکم بتدریج نافذ ہوا۔ پہلے مرحلے میں سورۂ نحل میں، جو مکہ میں نازل ہوا، فرمایا:

وَ مِنۡ ثَمَرٰتِ النَّخِیۡلِ وَ الۡاَعۡنَابِ تَتَّخِذُوۡنَ مِنۡہُ سَکَرًا وَّ رِزۡقًا حَسَنًا ۔[1]	اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم نشے کی چیزیں بناتے ہو اور پاک رزق بھی بنا لیتے ہو....

اس آیت میں نشے کو رزق حسن کے مقابلے میں ذکر فرمایا، جس سے واضح ہوتا ہے کہ نشہ رزق حسن نہیں ہے۔

دوسرے مرحلے میں اعراف کی آیت میں تمام فحشاؤں کی حرمت کی طرف اشارہ فرمایا:

قُلۡ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الۡفَوَاحِشَ مَا ظَہَرَ مِنۡہَا وَ مَا بَطَنَ وَ الۡاِثۡمَ ...[2]	کہدیجیے: میرے رب نے علانیہ اور پوشیدہ بے حیائی (کے ارتکاب) اور گناہ کو حرام قرار دیا ہے ....

صریحاً شراب کا نام نہیں لیا، لیکن اثم کہا۔ تیسرے مرحلے میں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۹ نازل ہوئی جس میں

شراب نوشی کو گناہ قرار دیا گیا ہے۔ چوتھے مرحلے میں زیر بحث آیت نازل ہوئی، جس میں نشے کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں، پہلے نشے کی حالت میں نماز پڑھنے سے روکا گیا اور بعد میں سورۂ بقرہ کی آیت نازل ہوئی، جس میں شراب نوشی کو گناہ قرار دیا گیا۔ آخر میں سورۂ مائدہ آیت ۹۱ میں حرمت شراب کا قطعی اور صریح حکم آیا۔

۱۔ لَاتَقۡرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنۡتُمۡ سُکٰرٰی: نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ، جب تک کہ تم جان نہ لو کہ کیا کہ رہے ہو۔ کیونکہ نماز عبد اور معبود کے درمیان راز و نیاز ہے۔ اس میں آ گاہی و شعور ضروری ہے۔

۲۔ وَلَاجُنُبًا: حالت جنابت میں بھی نماز کے قریب جانے سے روکا گیا ہے، جب تک غسل نہ کیا جائے۔

اِلَّا عَابِرِیۡ سَبِیۡلٍ: مگر یہ کہ راستے سے گزر رہے ہو۔ اس تعبیر سے نماز کے ساتھ لطیف اشارے میں مسجد کا ذکر آیا کہ جنب کی حالت میں مسجد کے قریب نہ جاؤ، مگر یہ کہ راستے سے گزر رہے ہو۔ اس طرح آیت کا مطلب یہ بنتا ہے:

جنابت کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ اور ساتھ مسجد کے، مگر یہ کہ راستے سے گزر رہے ہو۔

چونکہ تمام اصحاب کے مکانات مسجد کے اطراف میں بنے ہوئے تھے اور سب کے دروازے مسجد کی طرف کھلتے تھے اور مسجد کو عبور کرنا پڑتا تھا، اس آیت میں عبور کرنے کی اجازت مل گئی، البتہ مسجد میں بیٹھنے سے منع کیا گیا۔ صرف حضرت علی علیہ السلام و اہل بیت ع کو اجازت حاصل رہی۔

چنانچہ رسول اکرم (ص) نے مسجد کی طرف کھلنے والے تمام اصحاب کے دروازے بند کرنے کا حکم دیا۔ صرف حضرت علی علیہ السلام کو اجازت دی گئی کہ دروازہ کھلا رہے۔ یہ بات حضرت علی علیہ السلام کے فضائل میں نمایاں طور پر متعدد اصحاب رسول (ص) سے منقول ہے۔ ان میں زید بن ارقم، عبد اللہ بن عمر، براء بن عاذب، حضرت عمر بن خطاب، عبد اللہ بن عباس، ابو سعید خدری، ابو حازم اشجعی، جابر بن عبد اللہ، جابر بن سمرہ، سعد بن ابی وقاص، انس بن مالک، بریدہ اسلمی اور خود حضرت علی علیہ السلام شامل ہیں۔ ان روایات کو بالترتیب احمد بن حنبل نے اپنی مسند ۴: ۳۶۹ و ۲: ۲۶ میں اور تاریخ ابن کثیر ۷: ۳۴۲، مستدرک حاکم ۳: ۱۲۵ صحیح ترمذی ۲: ۲۱۴، المستدرک حاکم ۳: ۱۱۷، خصائص سیوطی ۲: ۲۴۳، تاریخ بغداد ۷: ۲۰۵، فتح الباری ۷: ۱۲، مسند احمد بن حنبل ۱: ۱۷۵ وغیرہ نے ذکر کیا ہے نیز حضرت علی علیہ السلام، حضرت فاطمہ، حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہم السلام کو بھی اجازت تھی کہ وہ حالت جنابت میں بھی مسجد میں بیٹھ سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو سنن بیہقی

۱۔ نحل ۱۶: ۶۷ ۲۔ ۷ اعراف: ۳۳

۷: ۶۵ وغیرہ۔ وجہ یہ ہے کہ یہ ذوات مقدسہ ہر حالت میں پاک ہیں۔ ان صحیح السند متواتر حدیث کے مقابلے میں حدیث خوخہ بھی کتب احادیث میں کثرت سے ملتی ہے، جس کے بارے میں ابن ابی الحدید کا تبصرہ قابل مطالعہ ہے۔ ملاحظہ ہو شرح نہج البلاغہ ۳: ۱۷۔

بعض مفسرین نے لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ اور عَابِرِیۡ سَبِیۡلٍ سے مسافر مراد لیا ہے، جو درست معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ:

اولاً: مسافر کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

ثانیاً: قرآن نے مسافر کے لیے عَابِرِیۡ سَبِیۡلٍ کی تعبیر کبھی اختیار نہیں فرمائی۔ اس کے لیے لفظ سفر استعمال فرمایا ہے۔

ثالثاً: اس آیت کا موضوع کلام غسل اور تیمّم ہے، جو نماز سے مربوط ہے، مسافر سے نہیں۔

رابعاً: صلٰوۃ کا لفظ مسجد کے لیے استعمال کرنا مجاز ہے۔ بلا ضرورت مجاز پر محمول کرنا درست نہیں ہے۔

تیمّم کے موارد

اول: وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مَّرۡضٰۤی: مراد یہ ہے کہ مرض کی حالت میں ہو اور پانی استعمال کرنے میں ضرر اور غیر معمولی زحمت اور تکلیف ہوتی ہو تو تیمّم کرنا چاہیے۔

دوم: اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ: یا اگر سفر کی حالت میں ہو اور پانی موجود نہ ہو تو بھی تیمّم کرو، کیونکہ سفر میں اکثر پانی میسر نہیں آتا۔

سوم: اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡکُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ: رفع حاجت کے بعد وضو کرنے کے لیے پانی میسر نہ ہو تو تیمّم کرنا چاہیے۔

چہارم: اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ: عورتوں سے مباشرت کی ہو اور پانی میسر نہ آئے تو غسل کی جگہ تیمّم کرنا ہو گا۔

صَعِیۡدًا طَیِّبًا: پاک مٹی۔ صعید خالص مٹی کو کہتے ہیں۔ باین معنی کہ مٹی اپنی اصلی حالت میں ہو۔ چونا، سیمنٹ کی طرح تغیر نہ آیا ہو۔

تیمّم کرنے کا طریقہ: فَامۡسَحُوۡا: دونوں ہتھیلیاں ایک ساتھ مٹی پر مار کر پوری پیشانی پر دونوں ہتھیلیوں کو پھیر لے۔ پھر بائیں ہتھیلی کو دائیں ہاتھ کی تمام پشت پر، اس کے بعد دائیں ہتھیلی کو بائیں کی تمام پشت پر پھیر لے۔ اکثر فقہائے امامیہ کا نظریہ ہے کہ وضو کی بجائے تیمّم ہو تو ایک دفعہ ہتھیلیوں کو مٹی پر مارنا کافی ہے، جب کہ غسل کی بجائے تیمّم ہو تو ہتھیلیوں کو دو مرتبہ مٹی پر ہاتھ مارا جائے گا۔ ایک دفعہ پیشانی کے لیے اور ایک مرتبہ ہاتھوں کے لیے۔ تاہم سب کے نزدیک احتیاط اس میں ہے کہ ایک مرتبہ ہتھیلیوں کو

مٹی پر مار کر پیشانی اور ہاتھوں پر پھیر لیا جائے اور دوسری مرتبہ ہتھیلیوں کو مٹی پر مار کر صرف ہاتھوں پر پھیر لیا جائے۔

اہم نکات

۱۔ نماز میں حضور قلب ہونا چاہیے کہ انسان کو علم ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ تَعۡلَمُوۡا مَا تَقُوۡلُوۡنَ ....

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ یَشۡتَرُوۡنَ الضَّلٰلَۃَ وَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَضِلُّوا السَّبِیۡلَ ﴿۴۴﴾ وَ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِاَعۡدَآئِکُمۡ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَلِیًّا ٞ۫ وَّ کَفٰی بِاللّٰہِ نَصِیۡرًا ﴿۴۵﴾

۴۴۔ کیا آپ نے ان لوگوں کا حال نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا تھا، (لیکن) وہ ضلالت خریدتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم (بھی) گمراہ ہو جاؤ۔

۴۵۔ اور اللہ تمہارے دشمنوں کو بہتر جانتا ہے اور تمہاری سرپرستی کے لیے اللہ کافی ہے اور تمہاری مدد کے لیے بھی اللہ کافی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلَمۡ تَرَ: یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس کتاب کا کچھ حصہ موجود ہے۔ اکثر حصہ یا تو ان سے گم ہو گیا ہے یا تحریف کر کے بدل دیا گیا ہے۔

سیاق آیت سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اہل کتاب مسلمانوں کے ساتھ حسن سلوک اور محبت کا اظہار کر کے یہ عندیہ دینے کی کوشش کرتے تھے کہ ہم مسلمانوں کے بہی خواہ، ہمدرد ہیں اور مسلمانوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔

۲۔ وَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَضِلُّوا: چنانچہ آج کل کے اہل کتاب بھی دوستی اور امداد کے پیچھے اپنے برے عزائم پورے کرتے ہیں۔ قرآن ہمیشہ امت مسلمہ کو اس کے دشمن کی مکاریوں سے آگاہ رکھتا ہے اور بار بار اس بات کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ تمہارا مددگار اللہ ہی ہو سکتا ہے، اس پر بھروسا کرو۔ ان دشمنوں پر ہرگز بھروسا نہ کرو۔

۳۔ وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِاَعۡدَآئِکُمۡ: اللہ تمہارے دشمنوں کو بہتر جانتا ہے۔ لہٰذا تم ان کے پرکشش جھوٹے نعروں سے متاثر نہ ہوں۔ وہ کبھی بھی تمہارے ہمدرد نہیں ہو سکتے۔

۴۔ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا: تمہاری حمایت کے لیے اللہ کافی ہے۔ اللہ کو چھوڑ کر کیا تم ان لوگوں سے اپنی امیدیں وابستہ کرتے ہو، جو تم کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔

مِنَ الَّذِیۡنَ ہَادُوۡا یُحَرِّفُوۡنَ الۡکَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِہٖ وَ یَقُوۡلُوۡنَ سَمِعۡنَا وَ عَصَیۡنَا وَ اسۡمَعۡ غَیۡرَ مُسۡمَعٍ وَّ رَاعِنَا لَیًّۢا بِاَلۡسِنَتِہِمۡ وَ طَعۡنًا فِی الدِّیۡنِ ؕ وَ لَوۡ اَنَّہُمۡ قَالُوۡا سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا وَ اسۡمَعۡ وَ انۡظُرۡنَا لَکَانَ خَیۡرًا لَّہُمۡ وَ اَقۡوَمَ ۙ وَ لٰکِنۡ لَّعَنَہُمُ اللّٰہُ بِکُفۡرِہِمۡ فَلَا یُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۴۶﴾

۴۶۔ یہودیوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کلمات کو ان کی جگہ سے بدل دیتے ہیں اور کہتے ہیں: ہم نے سنا اور نہ مانا اور سنو (لیکن) تیری بات نہ سنی جائے اور اپنی زبانوں کو مروڑ کر دین پر طعن کرتے ہوئے کہتے ہیں: رَاعِنَا اور اگر وہ کہتے: ہم نے سنا اور مان لیا اور سنیے ہم پر نظر کیجیے تو یہ ان کے حق میں بہتر اور درست ہوتا لیکن اللہ نے ان کے کفر کے سبب ان پر لعنت کر رکھی ہے اس لیے سوائے تھوڑے لوگوں کے وہ ایمان نہیں لاتے۔

تفسیر آیات

۱۔ مِنَ الَّذِیۡنَ ہَادُوۡا: یہودیوں میں سے کچھ لوگ کلمات کے تلفظ اور معانی میں تحریف کرتے ہیں۔ یعنی کلمات کو توڑ مروڑ کر تبدیل کرتے ہیں اور دین کا مذاق اڑاتے ہیں، جیسا کہ اس آیت میں بیان ہوا۔

۲۔ سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا: ہم نے سنا اور مانا، کی جگہ سَمِعۡنَا وَ عَصَیۡنَا ہم نے سنا اور نہ مانا کہہ دیتے ہیں۔

۳۔ وَ اسۡمَعۡ ''سنو'' کی جگہ وَ اسۡمَعۡ غَیۡرَ مُسۡمَعٍ ''سنو، سنا نہ جائے'' کہتے ہیں۔ یعنی وہ تمسخر و توہین کے طور پر ''سنو تجھے کوئی بات سنائی نہ دے'' کہتے ہیں۔

۴۔ انۡظُرۡنَا: ہمیں مہلت دیں یا ہمارا انتظار کیجیے، ہم آپ کی بات اچھی طرح سمجھ لیں کی جگہ وہ رَاعِنَا کہتے تھے اور اس لفظ کو مروڑ کر راعینو کہتے تھے، جس کے عبرانی زبان میں معنی ''ہمارا شریر'' بنتے ہیں۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ بقرہ آیت ۱۰۴۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ اٰمِنُوۡا بِمَا نَزَّلۡنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّطۡمِسَ وُجُوۡهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدۡبَارِهَاۤ اَوۡ نَلۡعَنَهُمۡ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصۡحٰبَ السَّبۡتِ ؕ وَكَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ مَفۡعُوۡلًا ﴿۴۷﴾

۴۷۔ اے وہ لوگو جنہیں کتاب دی گئی تھی، اس پر ایمان لے آؤ جسے ہم نے نازل کیا ہے، جو تمہارے پاس موجود کتاب کی بھی تصدیق کرتا ہے، قبل اس کے کہ ہم بہت سے چہروں کو بگاڑ کر ان کی پیٹھ کی طرف پھیر دیں یا ہم ان پر اسی طرح لعنت کریں جس طرح ہم نے ہفتہ (کے دن) والوں پر لعنت کی اور اللہ کا حکم تو ہو کر رہتا ہے۔

تشریح کلمات

طمس: (ط م س) کسی چیز کی نشانی تک مٹا دینا۔

السَّبۡتِ: ہفتہ کا دن۔

تفسیر آیات

۱۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ: اہل کتاب کو اس کتاب یعنی قرآن پر ایمان لانے کی دعوت ہے۔ ساتھ ایک دعوت فکر بھی ہے۔

۲۔ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمۡ: یہ قرآن اس کتاب کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے ساتھ ہے۔ یعنی توریت کے من اللہ ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔

۳۔ نَّطۡمِسَ وُجُوۡهًا: ایمان لے آؤ، قبل اس کے کہ ہم بہت سے چہروں کو بگاڑ کر ان کی پیٹھ کی طرف کر دیں۔ چہروں کی نشانیاں مٹانے سے مراد ممکن ہے کہ بروز قیامت چہروں کا مسخ شدہ حالت میں ہونا ہو یا ممکن ہے کہ چہرے سے مراد مقام و عزت ہو اور بگاڑنے سے مراد یہ ہو کہ انہیں ذلیل و خوار کیا جائے۔

۴۔ فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدۡبَارِهَاۤ: یعنی ان کے چہرے پیٹھ کی طرف پھیر دیں گے۔ ان کے مسخ شدہ چہرے جسم کے سامنے کی طرف نہیں، پیٹھ کی طرف ہوں گے۔ اس سے ان کی شکل اور ہیکل ذلت آمیز ہو جائے گی۔

مِنۡ قَبۡلِ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صورت حال قیامت کے دن کی ہے۔

اَوۡ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ سزا متعین نہیں ہے بلکہ یا تو یہی سزا ملے گی یا اصحاب سبت کی سزا۔

اصحاب سبت کی تشریح کے لیے سورۂ بقرہ آیت ۶۵ ملاحظہ فرمائیں۔

۵۔ وَكَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ مَفۡعُوۡلًا: یہ اللہ تعالیٰ کا اٹل قانون ہے، جو عدل و انصاف پر مبنی ہے۔ ورنہ مجرم

اور غیر مجرم کا برابر ہونا لازم آئے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا ۝۴۸

۴۸۔ اللہ اس بات کو یقیناً معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ (کسی کو) شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے علاوہ دیگر گناہوں کو جس کے بارے میں وہ چاہے گا معاف کر دے گا اور جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا اس نے تو عظیم گناہ کا بہتان باندھا۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ: اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ شرک کے علاوہ باقی گناہوں کے ارتکاب میں کوئی حرج نہیں، بلکہ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ شرک اتنا بڑا گناہ ہے کہ اللہ کی رحمت و مغفرت ہر گناہ سے زیادہ وسیع ہونے کے باوجود شرک اس کے دائرہ رحمت و مغفرت میں نہیں آتا۔

دوسرا شرک ناقابل معافی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان جب شرک اور کفر کی حالت میں ہوتا ہے اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک گردانتے سے باز نہیں آتا تو یہ قابل درگزر نہیں ہے، کیونکہ شرک کی حالت میں انسان اللہ کی بندگی میں داخل ہو ہی نہیں سکتا، بلکہ یہ اللہ کی شان میں گستاخی ہے اور بندگی کے منافی ہے۔ لہٰذا جو شرک کے جرم میں ارتکاب کی حالت میں ہوگا، اللہ اسے معاف نہیں کرے گا۔ ہاں اگر شرک کو چھوڑ کر توحید کی طرف آ جائے تو معاف ہوگا۔

۲۔ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ: یہ آیت ان آیات میں سے ہے جن سے مومن اطمینان حاصل کرتا ہے کہ اللہ شرک کے علاوہ باقی گناہوں کو معاف کر دے گا۔

صاحب مجمع البیان فرماتے ہیں:

> اللہ نے موحد مؤمنوں کو بیم و امید اور عدل خدا و فضل خدا کے درمیان کھڑا کیا ہے اور یہی مؤمن کی صفت ہے۔

يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ۔ شرک کے علاوہ گناہوں کو معاف کر دے گا، مگر ہر ایک کو نہیں، لِمَنْ يَّشَآءُ جس کو وہ چاہے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص حالت شرک میں مر جائے اس کے لیے معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہے، لیکن اگر موحد گناہ گار مر جائے تو اس کے لیے معافی کی گنجائش ہے۔ اس کی شفاعت ہو سکتی ہے۔ خود اللہ معاف کر سکتا ہے۔

احادیث

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

لو وزن رجاء المؤمن و خوفه لاعتدلا۔[1]

اگر مؤمن کی امید اور خوف کا وزن کیا جائے تو برابر ہو جائے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

مافی القران آیة ارجی عندی من هذه الآیة۔[2]

میرے نزدیک اس آیت سے زیادہ امید افزا آیت قرآن میں نہیں ہے۔

دوسری جگہ آپؑ سے مروی ہے۔

مَا فِی الْقُرآنِ اٰیَۃٌ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ قَوْلِہٖ عَزَّ وَ جَلَّ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ۔[3]

قرآن میں کوئی آیت ایسی نہیں جو اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ سے زیادہ مجھے پسند ہو۔

اہم نکات

۱۔ شرک کے علاوہ گناہوں کو اللہ معاف فرمائے گا، مگر اس کے لیے بندے کو لِمَنْ یَّشَآءُ شامل ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یُزَکُّوْنَ اَنْفُسَھُمْ ؕ بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ وَ لَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ﴿۴۹﴾

۴۹۔ کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو پاکباز خیال کرتے ہیں، (نہیں) بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاکیزہ کرتا ہے اور ان پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں ہو گا۔

اُنْظُرْ کَیْفَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ ؕ وَ کَفٰی بِہٖۤ اِثْمًا مُّبِیْنًا ﴿۵۰﴾

۵۰۔ دیکھ لیجیے: یہ لوگ اللہ پر کیسے جھوٹ باندھتے ہیں اور صریح گناہ کے لیے یہی کافی ہے۔

تشریح کلمات

فَتِیْلًا: (ف ت ل) فتل، رسی کو بل دینا۔ کھجور کی گٹھلی کے شگاف میں جو باریک سا ڈورا ہوتا ہے

---

[1] جامع الاخبار صفحہ ۹۷۔ [2] مجمع البیان ذیل آیہ [3] التوحید صفحہ ۴۰۹ باب الامر و النہی۔

اسے فتیل کہتے ہیں۔ آئمہ اہل بیت (ع) سے منقول روایات کے مطابق گٹھلی پر موجود نقطے کو فتیل کہتے ہیں۔ بہرحال یہ حقیر شے کے لیے ضرب المثل ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یُزَکُّوۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ : اہل کتاب کی ایک نہایت خطرناک اور ناپاک خصلت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو پاکیزہ نسل اور برگزیدہ قوم تصور کرتے ہیں۔ یہود کہتے ہیں: نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰہِ وَ اَحِبَّآؤُہٗ ...[۱] ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔ اس تصور کا لازمی نتیجہ تکبر ہے اور تکبر کا لازمی نتیجہ دوسری قوموں کا استحصال ہے۔ اہل کتاب اپنے برگزیدہ قوم ہونے کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، جس کی رد میں فرمایا کہ یہ ایک صریح افترا ہے۔

قرآنی تعلیمات کے مطابق مسلمانوں کے لیے بھی یہ نہایت مذموم صفت ہے کہ انسان اپنے آپ کو پاکیزہ، بہت نیک تصور کرے۔ یہ خود بینی ہے جو آداب بندگی کے خلاف ہے۔ چنانچہ سورہ نجم آیت ۳۲ میں فرمایا:

فَلَا تُزَکُّوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ ؕ ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی ....۔

اپنے نفس کی پاکیزگی نہ جتاؤ، اللہ پرہیزگار کو خوب جانتا ہے۔

حدیث ہے:

کفی بالمرء جھلا ان یرضی عن نفسہ۔[۲]

انسان کی جہالت کے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ اپنے آپ سے راضی رہے۔ یعنی خود پسند رہے۔

مَنْ رَضِیَ عَنْ نَفْسِہِ کَثُرَ السَّاخِطُ عَلَیْہِ۔[۳]

جو اپنے آپ کو پسند کرتا ہے، اس کو ناپسند کرنے والے زیادہ ہوں گے۔

یہ انفرادی خود پسندی ہے۔ اجتماعی خود پسندی یہ ہے کہ ایک نسل اور نژاد اپنے آپ کو دوسری نسلوں سے بہتر سمجھے۔

۲۔ بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیۡ مَنۡ یَّشَآءُ : کسی کی پاکیزگی کی گواہی اللہ دے سکتا ہے، جو لوگوں کے باطن سے باخبر ہے، ارادوں اور ارادوں کے اصل محرکات کو جانتا ہے۔

۳۔ وَ لَا یُظۡلَمُوۡنَ فَتِیۡلًا : اللہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔ جس تعریف کا کوئی حقدار ہوگا، اس کی تعریف و تحسین ہوگی اور تزکیہ ہوگا۔

۱۔ ۵ مائدہ: ۱۸ ۲۔ غرر الحکم حکمت ۷۰۶۵۔ ص ۳۰۷ باب سبب الرضا عن النفس ۳۔ نہج البلاغۃ۔ حکمت ۶

اہم نکات

۱۔ اپنے آپ کو تقدس مآب سمجھنا آداب بندگی کے خلاف ہے۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡجِبۡتِ وَ الطَّاغُوۡتِ وَ یَقُوۡلُوۡنَ لِلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ہٰۤؤُلَآءِ اَہۡدٰی مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا سَبِیۡلًا ﴿۵۱﴾

۵۱۔ کیا آپ نے ان لوگوں کا حال نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ہے؟ جو غیر اللہ معبود اور طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں اور کافروں کے بارے میں کہتے ہیں: یہ لوگ تو اہل ایمان سے بھی زیادہ راہ راست پر ہیں۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ ؕ وَ مَنۡ یَّلۡعَنِ اللّٰہُ فَلَنۡ تَجِدَ لَہٗ نَصِیۡرًا ﴿۵۲﴾

۵۲۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت کرے اس کے لیے آپ کوئی مددگار نہیں پائیں گے۔

تفسیر کلمات

الجبت　(ج ب ت) بے اصل یا ہر وہ چیز جس میں کوئی بھلائی نہ ہو یا ہر وہ چیز، اللہ کے سوا جس کی پرستش کی جائے۔

الطَّاغُوۡت: اس کی تشریح سورہ بقرہ آیت ۲۵۶ میں ہو چکی ہے۔

تفسیر آیات

شان نزول: کفار قریش نے یہود کی ایک جماعت سے پوچھا کہ تم اہل کتاب ہو، بتاؤ ہمارا دین برحق ہے یا محمد (ص) کا دین؟ یہود کی اس جماعت نے کہا: تمہارا دین زیادہ ہدایت یافتہ اور راہ راست پر ہے۔

۱۔ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ: اگرچہ ان لوگوں کو کتاب کا حصہ مل سکا ہے اور تحریف کی نذر ہونے کی وجہ سے پوری کتاب نہیں مل سکی، تاہم یہ لوگ وحی، کتاب و آخرت کو مانتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ لوگ اسلام دشمنی کی وجہ سے اس مذہب کو مانتے ہیں، جس کی ان کے ساتھ کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔

۲۔ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡجِبۡتِ: یہ لوگ جبت پر ایمان لاتے ہیں۔ جبت پر ایمان کے بارے میں مختلف اقوال ہیں، لیکن اگر جبت کا مطلب بے اصل اور بے بنیاد چیز لیا جائے تو تمام اقوال میں کچھ چیزیں قدر

مشترک کے طور پر سامنے آتی ہیں، جن میں بت، سحر، شیطان، اوہام پرستی اور بدشگونی وغیرہ، یعنی وہ چیزیں جو حقیقت پر مبنی نہیں، شامل ہیں۔

طاغوت سے مراد وہ قوتیں ہیں جو حدود اللہ اور احکام شریعت کے مقابلے میں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ آیت میں جبت اور طاغوت پر ایمان لانے والوں اور کافروں کو اہل ایمان سے زیادہ ہدایت یافتہ قرار دینے والوں کو لعنت کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

۳۔ وَیَقُوۡلُوۡنَ لِلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: یہ وحی اور رسالت کے ماننے والے لوگ، ان مشرکین کو اَهۡدٰی زیادہ ہدایت یافتہ قرار دیتے ہیں، جو وحی اور رسالت کو نہیں مانتے۔

۴۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ: جو لوگ حق کو چھپاتے ہیں اور عناد و دشمنی کی وجہ سے حقیقت پر پردہ ڈالتے ہیں۔ یہ بہت بڑا جرم ہے۔ قرآن و حدیث دونوں میں ایسے لوگوں پر پرزور الفاظ میں لعنت بھیجی گئی ہے۔

۵۔ وَمَنۡ یَّلۡعَنِ اللّٰہُ فَلَنۡ تَجِدَ لَہٗ نَصِیۡرًا: لعنت کے نتیجے میں جب یہ اللہ کی رحمت سے دور ہو جائے گا تو رحمت کا کوئی اور منبع ہے نہیں، جہاں سے ان کو کمک میسر آئے۔

اہم نکات

۱۔ فتوؤں کا سہارا لینا، ان لوگوں کی قدیم روایت ہے، جو دلیل و منطق نہیں رکھتے۔

اَمۡ لَہُمۡ نَصِیۡبٌ مِّنَ الۡمُلۡکِ فَاِذًا لَّا یُؤۡتُوۡنَ النَّاسَ نَقِیۡرًا ﴿۵۳﴾

۵۳۔ کیا حکومت میں ان کا کوئی حصہ ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو یہ (دوسرے) لوگوں کو کوڑی برابر بھی نہ دیتے۔

تشریح کلمات

نَقِیۡرًا: کھجور کی گٹھلی کے گڑھے کو کہتے ہیں اور نہایت حقیر چیز کے لیے ضرب المثل ہے۔

تفسیر آیات

یہ لوگ جو فیصلہ سنا رہے ہیں کہ کون ہدایت پر ہے، انہیں یہ فیصلہ سنانے کا حق اور اختیار کس نے دیا ہے؟ اگر اس قسم کے فیصلے کا حق اور اختیار ان کے پاس ہوتا تو یہ اس قدر کم ظرف اور تنگ نظر ہیں کہ کسی دوسرے کو ذرہ برابر بھی انصاف نہ دیتے۔

اہم نکات

۱۔ صدق اللّٰہ العلی العظیم۔ ہر دور میں یہود سرشت اور تنگ نظر موجود ہوتے ہیں۔

اَمۡ یَحۡسُدُوۡنَ النَّاسَ عَلٰی مَاۤ اٰتٰہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ۚ فَقَدۡ اٰتَیۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ اٰتَیۡنٰہُمۡ مُّلۡکًا عَظِیۡمًا ﴿۵۴﴾

۵۴۔ کیا یہ (دوسرے) لوگوں سے اس لیے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نوازا ہے؟ (اگر ایسا ہے) تو ہم نے آل ابراہیم کو کتاب و حکمت عطا کی اور انہیں عظیم سلطنت عنایت کی۔

تشریح کلمات

حسد (ح س د) کسی مستحق نعمت سے اس نعمت کے زائل ہونے کی تمنا کرنے کا نام حسد ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ الْحَسَدَ لَیَأْکُلُ الْاِیْمَانَ کَمَا تَأْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ۔[1] حسد ایمان کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

تفسیر آیات

اہل کتاب کا یہ فیصلہ کہ مسلمانوں سے کافر زیادہ ہدایت یافتہ ہیں، اس حسد پر مبنی ہے جو وہ آل اسماعیل سے بالعموم اور محمد عربی (ص) سے بالخصوص رکھتے ہیں۔ اس آیت میں ان کے اس حسد کو مزید ناامیدی میں بدلنے کے لیے فرمایا: ہم نے آل ابراہیم (ع) کو کتاب و حکمت عنایت کی ہے۔ اس سے یہود ناامید ہو جاتے ہیں کہ اگرچہ وہ بھی آل ابراہیم (ع) میں سے ہیں لیکن کتاب و نبوت آل ابراہیم میں سے صرف آل اسماعیل کو مل رہی ہے۔

مُّلۡکًا عَظِیۡمًا: اس کے بعد فرمایا: ہم نے انہیں ملک عظیم عطا کیا۔ جس حکومت و امامت کو اللہ نے عظیم کہا ہے، وہ اپنی وسعت زمانی اور وسعت معنوی کے اعتبار سے نہایت عظیم ہو گی۔ یعنی اقوام عالم کی قیادت کے ساتھ نبوت الٰہی اور ولایت حقیقی کا دائرہ پوری کائنات تک پھیلا ہوا ہے: لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرَا ۔[2]

---

[1] اصول الکافی ۲: ۳۰۶ [2] ۲۵ فرقان: ۱

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

نحن الناس المحسودون۔[1] — وہ ناس جس سے یہود حسد کرتے ہیں، ہم ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے معاویہ کے نام ایک خط میں یہ جملہ بھی مرقوم فرمایا:

نحن آل ابراھیم المحسودون و انت الحاسد لنا۔[2] — ہم آل ابراہیم ہیں جن سے حسد کیا گیا ہے اور تو ہم سے حسد کرنے والا ہے۔

یہ روایات شیعہ مصادر میں تو نہایت کثرت سے ملتی ہیں نیز مصادر اہل سنت میں بھی یہ روایت موجود ہے۔ ملاحظہ ہو مناقب مغازلی۔

طبرانی اور منذر نے حضرت ابن عباس سے روایت کی کہ الناس سے مراد حضرت رسول اکرم (ص) ہیں۔ ملاحظہ ہو درمنثور۔

واضح رہے کہ اس بات میں کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درود بھیجنے کا یہ طریقہ بیان فرمایا:

اللّٰھم صلی علی محمد و علی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم انك حمید مجید۔

آل محمد (ص) کے تعین کے لیے آل ابراہیمؑ پر نص قرآن، قطعی دلیل ہے۔ لہٰذا آل ابراہیمؑ کے تناظر میں آل محمد (ص) کا تعین ہو جاتا ہے، لیکن تعجب کا مقام ہے کہ قرآن و سنت کی طرف سے آل محمد (ص) کے اس واضح تعین سے توجہ ہٹانے کے لیے آل کی تعریف کرتے ہوئے آل فرعون کو مثال میں لاتے ہیں، آل ابراہیمؑ کو نہیں۔

اہم نکات

۱۔ آل ابراہیمؑ کے حاسدین سے کوئی زمانہ خالی نہیں ہے۔

فَمِنۡہُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ بِہٖ وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ صَدَّ عَنۡہُ ؕ وَ کَفٰی بِجَہَنَّمَ سَعِیۡرًا ﴿۵۵﴾

۵۵۔ پس ان میں سے کچھ اس پر ایمان لے آئے اور کچھ نے روگردانی کی اور (ان کے لیے) جہنم کی بھڑکتی آگ ہی کافی ہے۔

تشریح کلمات

صَدّ: (ص د د) خود رکنے اور دوسرے کو روکنے دونوں معنوں میں آتا ہے۔ ملاحظہ ہو العین و لسان

---

[1] اصول الکافی ۱: ۲۰۵
[2] ابراھیم الثقفی متوفی ۲۸۳، الغارات ۱: ۱۱۵

العرب مادہ ص د د۔

تفسیر آیات

اہل کتاب میں سے کچھ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آئے ہیں، کچھ نے روگردانی کی۔ دوسری تفسیر یہ کی گئی ہے کہ کچھ لوگ ابراہیم پر ایمان لے آئے، کچھ نے روگردانی کی۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِنَا سَوۡفَ نُصۡلِیۡہِمۡ نَارًا ؕ کُلَّمَا نَضِجَتۡ جُلُوۡدُہُمۡ بَدَّلۡنٰہُمۡ جُلُوۡدًا غَیۡرَہَا لِیَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَزِیۡزًا حَکِیۡمًا ﴿۵۶﴾

۵۶۔ جنہوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا ہے، یقیناً انہیں ہم عنقریب آگ میں جھلسا دیں گے، جب بھی ان کی کھالیں گل جائیں گی (ان کی جگہ) ہم دوسری کھالیں پیدا کریں گے تاکہ یہ لوگ عذاب چکھتے رہیں، بے شک اللہ غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

کھال گل جانے کی صورت میں دوبارہ تجدید کرنا عذاب کے دائمی ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ دنیاوی قانون طبیعت کے مطابق پیدا ہونے والے ایک واہمے کا ازالہ ہے کہ جہنم میں جل کر راکھ ہونے کے بعد عذاب کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔

واضح رہے کہ درحقیقت انسان کی روح عذاب کا ادراک کرتی ہے۔ جسم اور کھال تو عذاب کو روح کی طرف منتقل کرنے کا صرف ذریعہ ہیں۔

یہ حقیقت بھی اب واضح ہو چکی ہے کہ جلد ہی احساسات کو منتقل کرنے کا ذریعہ ہے۔

احادیث

مادہ پرست ابن ابی العوجاء نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا کہ نئی کھال کا کیا گناہ ہے؟ امام علیہ السلام نے فرمایا:

ھی ھی و ھی غیرھا۔ یہ وہی پرانی کھال ہے اور دوسری بھی۔ ابن ابی العوجاء نے کہا: کوئی مثال دیجیے۔ فرمایا:

أ رأيت لو ان رجلا اخذ لبنة فكسرها ثم ردها فی ملبنها، فهی هی و هی غيرها۔[1]

کیا تو نے دیکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اینٹ کو توڑ دیتا ہے اور دوبارہ سانچے میں ڈال دیتا ہے تو یہ نئی اینٹ، وہی پہلی اینٹ ہے اور ساتھ دوسری اینٹ بھی۔

اہم نکات

۱۔ جہنم کا عذاب کافروں کے لیے دائمی ہے۔

۲۔ عذاب کا حس جسم کی جلد کی ذریعہ ہوتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿۵۷﴾

۵۷۔اور جو ایمان لائے اور نیک اعمال بجا لائے ہیں، انہیں ہم جلد ہی ایسی جنتوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جن میں وہ ابد تک رہیں گے، جن میں ان کے لیے پاکیزہ بیویاں ہیں اور ہم انہیں گھنے سایوں میں داخل کریں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: پہلی آیت میں ہر آن کھال تبدیل کر کے عذاب کو دوام دینے کے ذکر کے بعد فرمایا: اس کے مقابلے میں اہل ایمان جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہاں کی زندگی بھی دائمی ہے۔

۲۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا: خلود ہمیشہ رہنے کو کہتے ہیں۔اس پر مزید تاکید کے لیے اَبَدًا کا ذکر فرمایا کہ جنت کی زندگی ابدی ہے۔

اس دنیا کی زندگی پرآشوب ہونے کے باوجود انسان زندہ رہنا چاہتا۔ لہٰذا انسان کی فطرت میں ایک چیز کا ہونا اس بات کے لیے دلیل ہے کہ ایسی دوامی اور ابدی زندگی موجود ہے۔ یہ دنیا میں نہیں تو آخرت میں ضرور ہے۔ چنانچہ پیاس کا ہونا دلیل ہے کہ اس کو بجھانے کے لیے پانی موجود ہے۔ اگر پانی نہ ہوتا تو پیاس ہرگز موجود نہ ہوتی۔

---

[1] الاحتجاج ۲: ۳۵۴

۲۔ لَهُمۡ فِيۡهَاۤ اَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ : زوجہ انسان کے لیے سب سے زیادہ قریب اور سب زیادہ مانوس چیز ہے۔

۳۔ وَّنُدۡخِلُهُمۡ ظِلًّا ظَلِيۡلًا: سایہ کا مطلب یہ ہے کہ روشنی اور اس روشنی کی حرارت کی وجہ سے اذیت بھی نہیں ہے۔ چنانچہ جنت کے اوصاف میں فرمایا:

لَا يَرَوۡنَ فِيۡهَا شَمۡسًا وَّ لَا زَمۡهَرِيۡرًا۔[1]

(جنت میں) نہ دھوپ کی گرمی دیکھنے کا اتفاق ہوگا اور نہ سردی کی شدت۔

اہم نکات

۱۔ اہل ایمان کے لیے جنت کی زندگی دائمی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاۡمُرُكُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهۡلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمۡتُمۡ بَيۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡكُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمۡ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيۡعًۢا بَصِيۡرًا ﴿۵۸﴾

۵۸۔ بے شک اللہ تم لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے اہل کے سپرد کر دو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل و انصاف کے ساتھ کرو، اللہ تمہیں مناسب ترین نصیحت کرتا ہے، یقیناً اللہ تو ہر بات کو خوب سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

تفسیر آیات

الۡاَمٰنٰت: عربی زبان میں جمع کے لفظ پر ال داخل ہو جانے سے لفظ عموم کے معنی دیتا ہے۔ لہٰذا اس آیت میں یہ حکم ملتا ہے کہ تم امانتوں کو ان کے اہل کے سپرد کرو۔ اس حکم میں امانت کے لوٹانے کا حکم عام ہے۔ خواہ وہ مالی امانت ہو یا غیر مالی۔ امین، حاکم ہوں یا رعایا۔ جس کی امانت ہے، وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ ادائے امانت انسانی حقوق میں سرفہرست ہے۔ یہ امت مسلمہ کی ہادیانہ ذمہ داری ہے، امت قرآن کی قائدانہ مسئولیت ہے اور امت محمدیہ کا اخلاقی دستور ہے۔ یہ شریعت اسلامیہ کا حقوق انسانی کا دستور ہے۔ امانت کی ادئیگی حفظ نظام کی ضمانت، انسانی فلاح و کامیابی کے لیے اساس، نوع انسانی کی سعادت کا راز ہے۔ اس کے مقابلے میں خیانت ایک غیر انسانی عمل، اجتماعی نظام کے لیے ایک ناقابل تلافی خلل، فساد معاشرہ کی اساس اور انسانیت کے لیے بدبختی کا سامان ہے۔ قدیم اور جدید جاہلیت کا مشترکہ دستور عمل، خیانت اور بدعہدی

---

[1] ۷۶ دھر: ۱۳

ہے۔ حکمرانوں میں امانت کے فقدان سے مسلم امہ اغیار کی غلامی میں مبتلا ہے، جب کہ علماء میں امانت کے فقدان سے امت مسلمہ بدعملی کا شکار ہے۔ اس طرح معاشرے میں امانت کے فقدان سے فساد عام ہے اور پسماندگی کا سبب بنا ہوا ہے۔

اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ: دوسرا اہم دستور جو اس آیت میں تاکیداً دیا گیا ہے، وہ فیصلوں میں عدل و انصاف ہے۔ یہ انصاف بین الناس یعنی سب انسانوں کے لیے فراہم کرنے کا حکم ہے، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ یہ بھی انسانی حقوق کا اہم حصہ ہے کہ امت مسلمہ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ تمام انسانوں کے لیے یہ حق ادا کیا جائے۔

انسانی حقوق کی دو اہم دفعات امانت و عدالت ہیں، جن پر نوع انسانی کی سعادت، صلح و آشتی اور امن وسکون موقوف ہے۔

دو اہم نکتے:

i۔ اس آیت میں ادائے امانت اور عدل و انصاف کے لیے اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ ''اللہ تمہیں حکم دیتا ہے'' کی نہایت تاکیدی تعبیر اختیار فرمائی۔ ورنہ یوں بھی کہا جا سکتا تھا: و ان ادّوا الامانات. ''اور امانتوں کو ادا کرو۔''

ii۔ اس آیت کے آخر میں فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمۡ بِہٖ اللہ تمہیں مناسب ترین نصیحت کرتا ہے۔ یعنی امانت اور عدل و انصاف سے زیادہ اہم اور مناسب دستور حیات ہو ہی نہیں سکتا۔

احادیث

روایت کے مطابق امانت میں ہر وہ بات شامل ہے جس میں انسان کو امین بنایا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ کی امانت، اوامر و نواہی ہیں۔ عباد اللہ کی امانت، جس مال و غیر مال کا امین بنایا جائے۔ روایات میں آیا ہے: دو بچوں نے امام حسن علیہ السلام سے کہا: ہم دونوں میں سے کس کا خط اچھا ہے؟ آپؑ فیصلہ دیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے یہ دیکھ کر فرمایا:

یا بنی انظر کیف نحکم فان ھذا حکم واللہ سائلک عنہ یوم القیمۃ۔[1]	دیکھو بیٹا! کس طرح فیصلہ دیتے ہو۔ یہ بھی ایک فیصلہ ہے اور اللہ قیامت کے دن تجھ سے اس فیصلے کے بارے میں پوچھے گا۔

رسول اکرم (ص) سے روایت ہے:

عَلَامَۃُ الۡمُنَافِقِ ثَلَاثٌ اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ، وَ اِذَا وَعَدَ اَخۡلَفَ، وَ اِذَا ائۡتُمِنَ خَانَ۔[2]	منافق کی تین علامات ہیں: جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، جب وعدہ کرتا ہے تو پورا نہیں کرتا اور جب اس کو امین بنایا جاتا ہے تو خیانت کرتا ہے۔

---

[1] تفسیر روح المعانی ۵: ۶۴۔ تفسیر مجمع البیان ۳: ۱۱۳ [2] مستدرک المسائل ۱۴: ۱۳

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

العدل حیاة[1]	عدل و انصاف زندگی ہے۔

نیز آپ علیہ السلام سے روایت ہے:

لا یکون العمران حیث یجور السلطان۔[2]	جہاں حکمران ظالم ہوں وہاں ملک کی تعمیر و ترقی ناممکن ہے۔

نیز آپ (ع) سے روایت ہے:

امام عادل خیر من مطر وابل[3]	عادل حکمران موسلادھار بارش سے بھی بہتر ہے۔

اہم نکات

۱۔ اسلامی تعلیمات میں ادائے امانت اور عدالت کا قیام انسانی حقوق میں سے ہیں۔ اس میں مسلم غیرمسلم سب برابر ہیں۔ ادائے امانت کے لیے اِلٰۤی اَهۡلِهَا اور عدالت کے لیے بَیۡنَ النَّاسِ کی عمومیت اس پر شاہد ہے۔

۲۔ امانت و عدالت کی پابندی کا حکم اللہ کے نزدیک مناسب ترین نصیحت ہے۔ نِعِمَّا یَعِظُکُمۡ بِهٖ ...

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَ اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ ۚ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوۡلِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ ذٰلِکَ خَیۡرٌ وَّ اَحۡسَنُ تَاۡوِیۡلًا ﴿۵۹﴾	۵۹۔ اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور تم میں سے جو صاحبان امر ہیں ان کی اطاعت کرو، پھر اگر تمہارے درمیان کسی بات میں نزاع ہو جائے تو اس سلسلے میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو اور اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہی بھلائی ہے اور اس کا انجام بھی بہتر ہو گا۔

تشریح کلمات

الۡاَمۡر: (ء م ر) یہ لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے: حکم اور معاملات۔ حکم کے معنی میں استعمال ہو گا تو اس کی جمع اوامر ہو گی۔ جب معاملات کے معنی میں استعمال ہو گا تو اس کی جمع امور ہو گی۔

---

[1] غرر الحکم حکمت: ۱۶۹۹۔ باب الثالث العدل [2] حوالہ سابق۔ حکمت ۸۰۵۰۔ آثار الحکومۃ الجائرہ۔
[3] حوالہ سابق۔ حکمت: ۷۷۳۱۔ الفصل الاول

تفسیر آیات

اس آیت میں اسلامی نظام سیاست اور دستور ریاست کی اہم ترین دفعات کا ذکر ہے اور وہ درج ذیل اصول کے مطابق ہیں:

i۔ اَطِيۡعُوا اللّٰهَ: اس نظام میں طاقت اور اقتدار کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے اور دوسرے تمام احکام کا اسی کی ذات پر منتہی ہونا ضروری ہے، ورنہ وہ طاغوت کے احکام و دستور شمار ہوں گے:

وَاِلَيۡهِ يُرۡجَعُ الۡاَمۡرُ كُلُّهٗ ....[1] اور سارے امور کا رجوع اسی کی طرف ہے۔

ii۔ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ: اللہ کی اطاعت اور بندگی کا واحد ذریعہ اور سند رسول کریم (ص) کی ذات ہے، جس کے بغیر نہ تو حکم خدا کا علم ہو سکتا ہے اور نہ ہی اطاعت ہو سکتی ہے:

مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ ...[2] جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی.

چنانچہ رسول (ص) کی اطاعت کے بغیر اللہ کی اطاعت ناممکن ہے۔ اس سلسلے میں قرآن میں فرمایا:

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ... [3] اور ہم نے جو بھی رسول بھیجا اس لیے بھیجا ہے کہ باذن خدا اس کی اطاعت کی جائے۔

iii۔ وَاُولِي الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ: تیسری اطاعت اولی الامر کی اطاعت ہے۔ یہ اطاعت، رسول اللہ (ص) کی اطاعت کے ساتھ منسلک ہے۔ اسی لیے اس اطاعت کو رسول (ص) کی اطاعت پر عطف کیا ہے۔

اولی الامر سے مراد کون ہے؟: اس سلسلے میں جو اقوال و نظریات غیر امامیہ مصادر میں ہیں، ان پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں:

لکھتے ہیں کہ ابو ہریرہ امیر لشکر کو، ابی بن کعب سلاطین کو، جابر بن عبد اللہ صاحبان فقہ و خیر کو، مجاہد فقیہ اصحاب کو، ابو العالیہ اہل علم کو، ابن ابی حاتم اصحاب محمد (ص) میں راویان و داعیان کو، عکرمہ ابوبکر و عمر کو، کلبی ابوبکر و عمر و عثمان و علی (ع) اور ابن مسعود کو،[3] امام مالک اہل قرآن کو، ابن کیسان صاحبان عقل و رائے کو اولی الامر جانتے ہیں۔ بعض جدید مفسرین تو سرداران لشکر اور سربراہان کے ساتھ تاجروں، صنعت کاروں، کسانوں اور مزدوروں کے سربراہوں اور جرائد کے ایڈیٹرز حضرات کو بھی اولی الامر جانتے ہیں۔ تفسیر المنار نے کمپنیوں کے ڈائریکٹرز، جماعتوں کے سربراہان، ڈاکٹروں اور وکلاء حضرات کو بھی اولی الامر میں شامل کیا ہے۔[4]

---

[1] ۱۱ ہود: ۱۲۳ [2] ۴ نساء: ۸۰ [3] ۴ نساء: ۶۴ [3] تفسیر المراغی ۵: ۷۳ [4] المنار ۵: ۱۹۹

بعض اردو اہل قلم اس بارے میں لکھتے ہیں:

اولی الامر کے مفہوم میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے سربراہ ہوں۔ خواہ ذہنی وفکری رہنمائی کرنے والے علماء ہوں یا سیاسی رہنمائی کرنے والے سربراہ یا ملکی انتظام کرنے والے حکام یا عدالتی فیصلے کرنے والے جج یا تمدنی و معاشرتی امور میں قبیلوں، بستیوں اور محلوں کی سربراہی کرنے والے شیوخ اور سردار، غرض جو جس حیثیت سے بھی مسلمانوں کا صاحب الامر ہے، وہ اطاعت کا مستحق ہے۔[1]

فخر الدین رازی اور صاحب تفسیر المنار کہتے ہیں: امت کا اجماع ہی اولی الامر ہے اور اجماع امت معصوم ہے۔ کیونکہ اس آیت میں اطاعت مطلق کا حکم ہے اور اطاعت مطلق صرف معصوم ہی کی ہوسکتی ہے۔

تفسیر المنار کے الفاظ یہ ہیں:

و یصح ان یقال منهم معصومون فی هذا الاجماع و کذالك اطلق الامر بطاعتهم۔[2]

اور یہ کہنا درست ہوگا کہ امت اپنے اس اجماع میں معصوم ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی اطاعت کا حکم مطلق رکھا ہے۔

۱۔ اولی الامر کے تعین میں یہ اختلاف و اضطراب اپنی جگہ، لیکن اگر ہم ان نظریات کی روشنی میں مسلم معاشرے کے اہل حل وعقد اور اہل علم کے اجماع کو اولی الامر کی مشروعیت حاصل ہونے کے نتائج و آثار کا گہرا مطالعہ کریں تو اس اطاعت کے بھیانک اثرات صفحۂ تاریخ پر ثبت نظر آتے ہیں۔

اولی الامر کے منصب پر فائز ارباب حل وعقد نے یزید کی خلافت پر مہر تصدیق ثبت کر دی اور انہی اولی الامر کے ہاتھوں مدینۃ الرسول (ص) کو تاراج کیا گیا اور ایک ہی رات میں انصار و مہاجرین اصحاب رسول (ص) کی ہزاروں خواتین کی عصمتیں لوٹ لی گئیں۔ اس کے بعد اموی اور عباسی اولی الامر کے ہاتھوں کتنی عصمتیں لٹیں۔ کس قدر انسانیت کا خون ہوا، کس قدر خیانتیں ہوئیں، کس قدر احکام و حدود پامال ہوئے۔ ایک اموی اولی الامر عبد الملک بن مروان نے کہا:

من قال لی ان اتق اللّٰه ضربت عنقه۔[3]

اگر کوئی مجھ سے یہ کہے کہ اللہ کا خوف کرو، میں اس کی گردن مار دوں گا۔

اس طرح ارباب حل وعقد اور سلاطین و امراء کے ہاتھوں رونما ہونے والے جرائم اور فساد فی الارض سے تاریخ کے صفحات سیاہ ہیں۔ کیا ان سب کی خلافت پر اس امت کے ارباب حل وعقد نے اجماع نہیں کیا تھا؟

۲۔ اگر پوری امت معصوم عن الخطا اور اولی الامر کے منصب عصمت مآب پر فائز ہوتی تو

---

[1] مودودی۔ تفہیم القرآن ۱: ۳۶۴ [2] المنار ۵: ۱۸۱ [3] المنار ۳: ۶۰

خود امت کو اس کا علم ہوتا اور عصر رسالت (ص) اور عصر خلفاء میں اس کا ذکر ہوتا۔ اس امت کے پیشتاز اصحاب و تابعین کو اس کی حدود و قیود اور تفصیل کا علم ہوتا، اپنے اختلافات و اجماعات میں اس کا ذکر کرتے اور اس سے استدلال کرتے۔ جب کہ اصحاب و تابعین نے کہیں بھی اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ صرف ساتویں صدی میں فخر الدین رازی نے یہ مسئلہ اٹھایا ہے۔

علامہ محمد عبدہ المنار میں کہتے ہیں:

> میرا خیال تھا کہ مجھ سے پہلے کسی مفسر نے اولی الامر کی تفسیر ارباب حل و عقد کے ساتھ نہیں کی ہے، لیکن میں نے یہ بات بعد میں تفسیر نیشاپوری میں بھی دیکھی۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ امام محمد عبدہ یا نیشاپوری سے پہلے کسی شخص کو یہ علم نہ ہو سکا کہ اہل و عقد اولی الامر ہیں۔ نتیجۃً اس وقت تک اولی الامر کی اطاعت بھی نہیں ہوئی۔ اس عظیم انکشاف کے بعد کس حد تک اولی الامر یعنی ارباب حل وعقد کے اجماع کی اطاعت ہوئی؟ اسے ہم سب جانتے ہیں۔

رہی یہ حدیث: لا تجتمع امتی علی خطا۔ ''میری امت خطا پر اتفاق نہیں کرے گی۔'' سو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ امت نے جن جن مسائل میں اجماع کیا ہے، وہ خطا نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خطا پر امت کا اجماع وقوع پذیر ہو گا ہی نہیں۔ چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ کبھی بھی اس امت نے کسی خطا پر اجماع نہیں کیا۔ اگر اکثریت نے ایک رائے پر اتفاق کیا بھی ہے تو ایک جماعت ہمیشہ ایسی رہی ہے جس نے اختلاف کیا ہے۔ بفرض تسلیم حدیث: اختلاف امتی رحمۃ۔ شاید رحمت کی ایک توجیہ یہی صورت ہو۔

۳۔ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَ اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ: میں رسول (ص) اور اولی الامر کو ایک تعبیر میں جمع اور ایک ہی اطاعت میں شریک رکھا ہے۔ لہٰذا جب رسول (ص) کی اطاعت معصوم کی اطاعت ہے تو اولی الامر کی اطاعت بھی معصوم ہی کی اطاعت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ فخر الدین رازی نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ فقط یہ کہ وہ امت کے اجماع کو معصوم قرار دیتے ہیں۔

۴۔ اطاعت اس کی ہوتی ہے جس کے پاس امر کرنے کا اختیار ہو۔ چنانچہ قرآن نے متعدد آیات میں امر و اطاعت کے اختیار کو متعدد طبقوں سے سلب کیا ہے۔ چنانچہ عصر رسالت (ص) کے اصحاب سے فرمایا:

وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ فِیۡکُمۡ رَسُوۡلَ اللّٰہِ ؕ لَوۡ یُطِیۡعُکُمۡ فِیۡ کَثِیۡرٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ لَعَنِتُّمۡ ...[1]	اور تمہیں علم ہونا چاہیے کہ اللہ کے رسول تمہارے درمیان موجود ہیں، اگر بہت سے معاملات میں وہ تمہاری بات مان لیں تو تم خود مشکل میں پڑ جاؤ گے۔

نیز فرمایا:

وَ لَا تُطِیۡعُوۡۤا اَمۡرَ الۡمُسۡرِفِیۡنَ ۔[2]	اور حد سے تجاوز کرنے والوں کی اطاعت نہ کرو۔

---

[1] ۴۹ حجرات: ۷ [2] ۲۶ شعراء: ۱۵۱

وَلَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَہٗ عَنۡ ذِکۡرِنَا ....[1]
آپ اس شخص کی اطاعت نہ کریں جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے ....

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت سے لوگ مشکلات سے دوچار نہ ہوں گے۔ اولی الامر مسرف اور ذکر خدا سے غافل نہیں ہوں گے۔

امامیہ کا مؤقف یہ ہے کہ اولی الامر سے مرا د ائمہ اہل البیت علیہم السلام ہیں۔ خدا و رسول (ص) کے بعد ان کی اطاعت واجب ہے۔ جیسا کہ رسول (ص) کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ کیونکہ رسول (ص) معصوم ہیں۔ وہ جو بات کرتے ہیں وحی الٰہی کے مطابق کرتے ہیں۔ اسی طرح اولی الامر کی اطاعت رسول (ص) کی اطاعت ہے، کیونکہ ان کے فرامین سے سنت نبوی (ص) ثابت ہوتی ہے۔

امامیہ کا مؤقف یہ ہے کہ اللہ اور رسول (ص) کی اطاعت کے ساتھ ایک تیسری اطاعت بھی واجب ہے۔ یہ تیسری اطاعت رسول (ص) کی اطاعت پر منتہی ہوتی ہے، جیسے رسول (ص) کی اطاعت اللہ کی اطاعت پر منتہی ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق (ع) سے روایت ہے:

حدیثی حدیث ابی و حدیث ابی حدیث جدی و حدیث جدی حدیث الحسین و حدیث الحسین حدیث الحسن و حدیث الحسن حدیث امیرالمؤمنین و حدیث امیر المؤمنین حدیث رسول اللّٰہ و حدیث رسول اللّٰہ قول اللّٰہ عز و جل۔[2]

میری حدیث میرے پدر بزرگوار کی حدیث ہے، ان کی حدیث میرے جد بزرگوار کی حدیث ہے، ان کی حدیث حضرت حسین (ع) کی حدیث ہے، ان کی حدیث حضرت حسن (ع) کی حدیث ہے، ان کی حدیث امیرالمومنین (ع) کی حدیث ہے اور ان کی حدیث رسول خدا (ص) کی حدیث ہے۔رسول خدا (ص) کی حدیث اللہ کا کلام ہے۔

دوسری روایت میں فرمایا:

مہما اجبتك فیه لشیء فهو عن رسول اللّٰہ (ص)، لسنا نقول برأینا من شیء۔[3]

میں نے جو کچھ بھی تمہیں بتایا ہے وہ سب رسول خدا (ص) کی طرف سے ہے، ہم اپنی رائے سے کچھ بھی بیان نہیں کرتے۔

حضرت محمد باقر (ع) سے روایت ہے:

و لکنا نحدثکم باحادیث نکنزها

ہم تم سے رسول خدا (ص) کی احادیث بیان کرتے

---

[1] ۱۸ کہف: ۲۸

[2] الکافی ۱: ۵۳ باب روایة الکتب۔ الوسائل ۲۷: ۸۳ باب وجوب العمل باحادیث النبی۔ [3] بصائر الدرجات ص ۳۰۱

عن رسول اللّٰہ ص کما یکنز ھولاء ذھبھم و فضتھم۔[1]

ہیں جنہیں ہم اس طرح ذخیرہ کر کے رکھتے ہیں جیسے وہ سونے اور چاندی کو ذخیرہ کر کے رکھتے ہیں۔

ائمہ اہل البیت علیہم السلام **کے اولی الامر ہونے پر درج ذیل سوال اٹھایا گیا ہے:**

اگر اولی الامر ائمہ اہل البیت (ع) ہیں تو خدا و رسول (ص) صریح لفظوں میں بیان کرتے، پھر کسی کو اختلاف بھی نہ ہوتا۔

جواب: خدا و رسول (ص) نے آیہ تطہیر[2] اور آیہ اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ ... [3] **میں صریح الفاظ میں بیان فرمایا ہے، جن کی تفسیر ہم ان کے مقامات پر بیان کریں گے۔**

الف۔ حدیث سفینہ: جس میں رسول کریم (ص) نے فرمایا:

انما مثل اھل بیتی کمثل سفینۃ نوح من رکبھا نجا و من تخلف عنھا غرق ۔[4]

اس حدیث کو حضرت علی علیہ السلام**، حضرت ابوذر، ابو سعید خدری، ابن عباس اور انس ابن مالک و دیگر اصحاب نے روایت کیا ہے۔**[5]

ب۔ حدیث ثقلین: جس میں رسول کریم (ص) نے فرمایا:

اِنِّی تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا لَنْ تَضِلُّوا کِتَابَ اللّٰہِ وَ عِتْرَتِی اَھْلَ بَیْتِی وَ اِنَّھُمَا لَنْ یَفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ ۔[6]

اس حدیث کو حضور (ص) نے ایک مرتبہ میدان عرفہ میں اعلان فرمایا اور ایک بار غدیر خم میں۔

اس حدیث کو حضرت علی ابن ابی طالب، حسن بن علی، فاطمۃ الزھراء علیھم السلام، جابر بن عبد اللّٰہ انصاری، ابو سعید خدری، زید بن ارقم، حذیفہ بن اسید، زید بن ثابت، سلمان فارسی، ابوذر، ابن عباس، ابوالھیثم، ابو رافع، حذیفہ بن یمان، حزیمۃ بن ثابت، ابو ھریرہ، عبد اللّٰہ بن حنطب، جبیر بن مطعم، البراء بن عازب، انس بن مالك، طلحہ بن عبد اللّٰہ تیمی، عبد الرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، عمرو بن عاص، سھل بن سعد انصاری، عدی بن حاتم، ابو ایوب انصاری، ابو شریح خزاعی، عقبہ بن عامر، ابو قدامہ انصاری، ابو لیلیٰ انصاری، ضمیرہ اسلمی، عامر بن لیلیٰ، ام سلمہ **اور** امہ ھانی **نے رسول کریم** صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم **سے روایت کیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو عبقات الانوار جلد اول و دوم۔**

---

[1] حوالہ سابق ص ۲۹۹ [2] ۳۳ احزاب ۳۳ [3] ۵ مائدہ: ۵۵ [4] الاحتجاج ۲ : ۳۸۰۔

[5] تحقیق کے لیے ملاحظہ ہو مستدرك الحاکم۲: ۳۴۳ اور۳: ۱۵۰، تاریخ البغداد۱۲ : ۱۹۔ حلیۃ الاولیاء۴ : ۳۰۶۔ مجمع الزوائد ۹ : ۱۶۸، کنز العمال ۶ : ۱۵۳۔۲۱۶۔

[6] صحیح الترمذی ۵: ۶۲۱۔ مسند احمد ۵: ۱۸۱۔ صحیح مسلم ۷: ۱۲۲

حدیث کا تقابل: اس حدیث کے مقابلے میں ایک حدیث اس طرح پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ترکت فیکم امرین کتاب اللّٰہ و سنة نبیّه۔ مگر اس حدیث کے مضمون اور سند کے بارے میں چند حقائق کا بیان ضروری ہے:

i۔ بعض روایات میں اس حدیث کو خطبۂ حجۃ الوداع میں شامل کیا گیا ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ خطبۂ حجۃ الوداع میں اعتصام بالسنة کا ذکر ثابت نہیں ہے۔ جو ثابت ہے وہ اعتصام بالعترة ہے۔[1]

ii۔ کسی حدیث کا صحیحین میں نہ ہونا اہل سنت کے اعلام کے نزدیک اس حدیث کی کمزوری کی علامت ہے۔ یہ حدیث صحیحین میں نہیں ہے۔

iii۔ یہ حدیث صرف موطا امام مالك میں موجود ہے، مگر امام مالک مراسیل کو بھی صحیح تصور کرتے ہیں۔[2]

ابن حزم نے کتاب مراتب الدیانة میں کہا ہے:

> میں نے موطا امام مالك کی احادیث کو شمار کیا تو پانچ سو کچھ احادیث مسند اور تین سو کچھ احادیث مرسل ہیں اور ستر سے زائد احادیث پر خود امام مالک نے عمل کرنا چھوڑ دیا ہے اور ان میں کچھ کمزور احادیث بھی ہیں جن کو جمہور علماء نے بے اعتبار قرار دیا ہے۔[3]

سند: اس حدیث کی کوئی سند قابل اعتبار نہیں۔ ذیل میں ہم اس پر ایک مختصر سا تبصرہ کریں گے:

i۔ مالک بن انس نے سند کے بغیر یہ حدیث نقل کی ہے۔

ii۔ ابن ہشام نے خطبہ حجۃ الوداع کے ضمن میں روایت کی ہے بغیر سند کے۔

iii۔ حاکم نے دو سندوں سے روایت کی ہے۔ ایک ابن عباس سے دوسری ابو ہریرہ سے۔ پہلی روایت کی سند میں اسماعیل بن ابی اویس ہے جو مجروح ہے۔ نسائی ابن عدی کہتے ہیں: ابن معین، ابن حزم نے ان کو ضعیف نا قابل قبول اور جعل حدیث کا مرتکب قرار دیا ہے۔[4] دوسری سند میں صالح بن موسیٰ طلحی کوفی ہے۔ ابن معین کہتے ہیں: لیس بشیء۔ بخاری کہتے ہیں: یہ منکر الحدیث ہے۔ نسائی کہتے: ضعیف ہے۔ عقیلی کہتے ہیں: اس کی کوئی حدیث قابل قبول نہیں ہے۔[5]

iv۔ بیہقی کی روایت میں بھی کوئی نئی سند نہیں ہے، وہی حاکم کی دونوں سندیں ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو مستدرک حاکم [2] کشف الظنون ۲: ۱۹۰۸ [3] تنویر الحوالك ۱:۹
[4] تہذیب التہذیب ۱: ۲۷۱۔ [5] حوالہ سابق ۴: ۳۵۴

v۔ التمهيد میں ابن عبدالبر کی ایک مسند تو حاکم کی سند ہے، دوسری سند میں کثیر بن عبداللہ موجود ہے۔ امام احمد بن حنبل نے اس کو بے اعتبار قرار دیا ہے۔ ابن عبد البر کہتے ہیں: اہل رجال کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ شخص ضعیف الروایہ ہے۔ ابن حیان کہتے ہیں: یہ شخص جو روایات اپنے باپ اور اپنے دادا سے نقل کرتا ہے وہ ایک ایسے نسخہ سے نقل کرتا ہے جو جعلی ہے۔ اس کو کسی کتاب کے شمار میں لانا مناسب نہیں ہے۔[1]

vi۔ قاضی عیاض نے یہ روایت ابوسعید خدری سے نقل کی ہے۔ اس سند میں شعیب بن ابراہیم اور سیف بن عمر جیسے ضعفاء ہیں۔ خصوصاً سیف بن عمر کے بے اعتبار ہونے پر تمام اہل رجال متفق ہیں۔[2]

vii۔ متقی ہندی نے کنز العمال میں اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: یہ حدیث ناقابل تائید ہے۔[3]

viii۔ حسن بن علی سفاف شافعی کہتے ہیں: مجھ سے سوال ہوا: حدیث ثقلین كتاب الله و عترتی اهل بیتی کے الفاظ صحیح ہیں یا كتاب الله و سنتی؟ جواب یہ ہے: صحیح اور ثابت كتاب الله و عترتی اهل بیتی کے الفاظ کے ساتھ ہے اور كتاب الله و سنتی سند اور متن کے اعتبار سے باطل ہے۔ چنانچہ كتاب الله و عترتی کے الفاظ کی مسلم اور ترمذی اور دوسرے حضرات نے صحیح سند کے ساتھ روایت کی ہے اور كتاب الله و سنتی سند کے کمزور ہونے کی وجہ سے جعلی ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ اس حدیث کے جعل میں بنی امیہ کا ہاتھ ہے۔[4]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

ix۔ حدیث ترکت فیکم ما ان تمسکتم بهما لن تضلوا بعدی ابداً كتاب الله و سنتی جو کہ زبان زد عام ہے اور خطیب حضرات بھی منبروں سے بیان کرتے ہیں، ایک جعل اور جھوٹ پر مبنی ہے، جسے بنی امیہ اور ان کے پیروکاروں نے جعل کیا ہے تاکہ لوگوں کی توجہ صحیح حدیث كتاب الله و عترتی سے ہٹ جائے۔[5]

ج۔ حدیث اثنا عشر خليفة جس میں رسول اللہ (ص) فرمایا:

ان هذا الامر لا ینقضی حتی یمضی فیهم اثنا عشر خليفة کلهم من قریش۔

اس حدیث کو مختلف الفاظ میں جابر بن سمره، سمرة العدوی، عبد الله بن مسعود، عبد الله بن عمر، انس بن مالك، ابو سعید خدری، سلمان فارسی، حذیفه، عبد الله بن عباس

---

[1] حوالہ سابق ۸: ۳۷۷ [2] حوالہ سابق ۴: ۲۵۹ [3] کنز العمال ۲ باب دوم الاعتصام بالكتاب و السنة۔
[4] صحیح صفة صلوٰة النبی صفحہ ۲۸۹۔۲۹۲ [5] صحیح شرح عقیده الطحاوية صفحہ ۶۵۴

وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

امام احمد بن حنبل نے اس حدیث کو ۳۴ طرق سے روایت کیا ہے اور علامہ حمیدی نے جامع میں، صحیح بخاری اور صحیح مسلم نے ۶ طرق سے یہ روایت نقل کی ہے۔ علامہ ابن حجر نے تو یہ بھی کہدیا کہ اس حدیث کی صحت پر اجماع قائم ہے۔[1]

اسلامی مصادر کے علاوہ توریت میں آیا ہے:

و یجعل من ذریتی اثنی عشر عظیما۔[2]	حضرت ابراہیم (ع) کو یہ بشارت دی گئی ہے کہ اسماعیل کی اولاد سے بارہ عظیم ہستیاں ہوں گی ۔

اس حدیث کے ذیل میں علمائے حدیث کو بارہ خلیفہ یا بارہ امیر کی توجیہ پیش کرنے میں جو اضطراب لاحق ہوا ہے، وہ قابل مطالعہ ہے۔ علامہ ابن عربی شرح صحیح ترمذی میں خلفاء کی تعداد ۲۷ تک ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: و لم اعلم للحدیث معنی۔ مجھے اس حدیث کا مطلب سمجھ نہیں آیا۔ سچ کہا: چونکہ جب اس حدیث کے اصل مصادیق کو نظرانداز کیا جائے تو اس حدیث کے معنی نہ صرف علامہ ابن عربی کے لیے ناقابل فہم ہیں بلکہ اضطراب اقوال بتاتے ہیں کہ یہ سب کے لیے ناقابل فہم ہے۔

فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ: اگر تمہارے درمیان کسی بات میں نزاع ہو جائے تو اس میں اللہ اور رسول (ص) کی طرف رجوع کرو۔

۱۔ اس جملے میں بھی خطاب چونکہ مومنین سے ہے، لہٰذا اس نزاع کی بات ہے جو مومنین میں آپس میں واقع ہو جاتا ہے۔

۲۔ نزاع کی حالت میں رجوع اللہ اور رسول (ص) کی طرف ہی کرنا ہے، چونکہ مصدر تشریع، قرآن وسنت ہے، اولی الامر ان کے محافظ ہیں۔

چنانچہ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

اعرفوا اللّٰہ باللّٰہ والرسول بالرسالۃ۔ واولی الامر بالامر بالمعروف و العدل و الاحسان۔[3]	اللہ کو خود اللہ سے پہچانو، رسول کو رسالت سے اور اولوالامر کو امر بالمعروف اور عدل و احسان سے پہچانو۔

اہم نکات

۱۔ جب رسولؐ کی اطاعت کے بغیر اللہ کی اطاعت نہیں ہو سکتی تو اولی الامر کی اطاعت کے بغیر بھی رسولؐ

---

[1] اس حدیث پر مزید تحقیق کے لیے ملاحظہ ہو صحیح بخاری کتاب الاحکام، صحیح مسلم کتاب الامارۃ، صحیح ترمذی ابواب فتن، مسند احمد بن حنبل جلد ۵ و دیگر مصادر۔

[2] ملاحظہ ہو سفر تکوین اصحاح ۱۷: ۱۸۔۲۰

[3] الکافی ۱: ۸۵

کی اطاعت نہیں ہو سکتی۔

۲۔ نزاع کی صورت میں گروہی تعصب سے ہٹ کر اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرنا ایمان کی نشانی ہے: فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ ... اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یَزۡعُمُوۡنَ اَنَّہُمۡ اٰمَنُوۡا بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَحَاکَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ وَ قَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ یَّکۡفُرُوۡا بِہٖ ؕ وَ یُرِیۡدُ الشَّیۡطٰنُ اَنۡ یُّضِلَّہُمۡ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا﴿۶۰﴾

۶۰۔ کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ جو کتاب آپ پر نازل ہوئی اور جو کچھ آپ سے پہلے نازل کیا گیا ہے، (سب) پر ایمان لائے ہیں مگر اپنے فیصلوں کے لیے طاغوت کی طرف رجوع کرنا چاہتے ہیں حالانکہ انہیں طاغوت کا انکار کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور شیطان انہیں گمراہ کر کے راہ حق سے دور لے جانا چاہتا ہے۔

تشریح کلمات

یَزۡعُمُوۡنَ: زعم۔ ایسی بات نقل کرنا جس میں جھوٹ کا احتمال ہو۔ اسی لیے قرآن میں یہ لفظ مذمت کے موقع پر استعمال ہوا کرتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ: گزشتہ آیت میں ارشاد ہوا خدا، رسول (ص) اور اولی الامر کی اطاعت کرو اور باہمی نزاع کی صورت میں اللہ اور رسول (ص) کی طرف رجوع کرو۔ یعنی مسئلے کا مثبت پہلو بیان ہوا۔ اس آیت میں اسی مسئلے کے منفی پہلو کا بیان ہے۔

۲۔ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَحَاکَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ: وہ باہمی نزاع کی صورت میں اپنے فیصلے اللہ اور رسول (ص) کی طرف لے جانے کی بجائے طاغوت کی طرف لے جاتے ہیں۔ طاغوت یعنی ہر وہ طاقت جو اللہ اور رسول (ص) کے فیصلوں کے مقابلے میں اپنا فیصلہ رکھتی ہو۔

۳۔ وَ قَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ یَّکۡفُرُوۡا بِہٖ: اللہ نے طاغوت سے کفر و انکار کرنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ و رسول (ص) یعنی قرآن و سنت کی پیروی کے لیے اولی الامر کی اطاعت کو واجب قرار دیا ہے۔ ہمارے زمانے میں غیر شرعی عدالتیں اکثر طاغوت کے مصداق میں آتی ہیں۔ چونکہ ان عدالتوں میں قرآن و سنت کے خلاف فیصلے

ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو اپنے فیصلے غیر شرعی عدالتوں میں لے جاتے ہیں، ان پر یہ بات واضح رہے۔ یہ اللہ کی حاکمیت اعلا کے خلاف ایمان بالطاغوت ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اولی الامر وہ ہیں جن کی اطاعت میں اللہ اور رسول (ص) کے فیصلوں پر عمل ہو۔ لہٰذا تفہیم القرآن کے اولی الامر یعنی سیاسی رہنمائی کرنے والے رہنما، ملکی انتظام کرنے والے حکام، عدالتی فیصلے کرنے والے جج اور شیوخ و سردار یا صاحب تفسیر مراغی کے اولی الامر یعنی جرائد کے ایڈیٹر حضرات، اولی الامر کے مقابلے میں طاغوت کی صف میں تو آ سکتے ہیں، جیسا کہ پوری تاریخ گواہ ہے، لیکن قرآن و سنت یعنی اللہ اور رسول (ص) کی طرف رجوع کرنے کی ضمانت فراہم نہیں کر سکتے۔

اہم نکات

۱۔ ایمان کی کسوٹی یہ ہے کہ کس کا فیصلہ قبول ہے؟ جس پر ایمان رکھتا ہے، فیصلہ اسی سے لیا جاتا ہے۔

وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰی مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَ اِلَی الرَّسُوۡلِ رَاَیۡتَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡکَ صُدُوۡدًا ﴿۶۱﴾

۶۱۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو حکم اللہ نے نازل فرمایا ہے اس کی طرف اور رسول کی طرف آ جاؤ تو آپ ان منافقین کو دیکھتے ہیں کہ آپ کی طرف آنے سے کتراتے ہوئے ٹال مٹول کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

سلسلۂ کلام اطاعت کے بارے میں ہے کہ مذکورہ اطاعتوں سے ہی ایمان و نفاق کا امتیاز واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ مومن ہر حال میں اللہ کی طرف سے تعیین کردہ اطاعتوں کے دائرے میں رہ کر اپنے نزاعی مسئلے میں فیصلے لیتے ہیں اور منافق یہ دیکھتے ہیں کہ فیصلے کس کے حق میں ہونے کی توقع ہے۔ اگر رسول (ص) کا فیصلہ ان کے حق میں ہونے کی توقع ہو تو ان کی طرف اور اگر طاغوت کا فیصلہ ان کے حق میں ہونے کی توقع ہو تو ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ ایمان و نفاق کا امتیاز نزاعی مسائل میں فیصلے کے وقت سامنے آتا ہے۔

فَکَیۡفَ اِذَاۤ اَصَابَتۡہُمۡ مُّصِیۡبَۃٌۢ ۶۲۔ پھر ان کا کیا حال ہو گا جب ان پر اپنے

بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ یَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِیْقًا ﴿۶۲﴾

ہاتھوں لائی ہوئی مصیبت آ پڑے گی؟ پھر وہ آپ کے پاس اللہ کی قسمیں کھاتے آئیں گے (اور کہیں گے) قسم بخدا ہم تو خیرخواہ تھے اور باہمی توافق چاہتے تھے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ ۗ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِیْغًا ﴿۶۳﴾

۶۳۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں کیا ہے، آپ انہیں خاطر میں نہ لائیے اور انہیں نصیحت کیجیے اور ان سے ان کے بارے میں ایسی باتیں کیجیے جو مؤثر ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَكَیْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ: طاغوت کی طرف رجوع کرنے کی صورت میں جب انہیں متوقع فائدہ حاصل نہ ہوا تو مسلمانوں کو اس کا علم ہوا۔ پھر بازپرسی اور سزا ملنے کا خوف لاحق ہوا تو یہ منافقین اپنی کافرانہ حرکت کی توجیہ کرنے لگے۔

۲۔ اِحْسَانًا وَّتَوْفِیْقًا: ہم تو خیرخواہ تھے اور باہمی اتفاق و ہم آہنگی کی خاطر ہم نے یہ کام کیا تھا۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ وہ ان کے دلوں کا حال جانتا ہے کہ ان کے دل کافرانہ خیالات سے پر ہیں۔ لیکن حضور (ص) کو یہ حکم ہے کہ جب تک یہ لوگ اپنے کافرانہ خیالات کا برملا اظہار نہ کریں، آپ (ص) ان کے اس داخلی کفر کو اعتنا میں نہ لائیں۔ لہٰذا رسول اسلام (ص) ہمیشہ ان کے داخلی کفر کو اعتنا میں نہ لاتے تھے، بلکہ ان کے جنازوں میں شرکت فرماتے، ان پر نماز پڑھتے اور ان کے ساتھ وہی سلوک فرماتے جو حقیقی مومن کے ساتھ فرمایا کرتے تھے۔

۳۔ وَقُلْ لَّهُمْ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِیْغًا: یعنی ان منافقوں کے ساتھ ایسا کلام کرو کہ ان کے وجود کے اندر اُتر جائے۔ بعض کے نزدیک ترتیب کلام یہ ہے: و قل لهم قولاً بلیغا فی انفسهم۔

اہم نکات

۱۔ دلوں میں نفاق رکھنے والوں پر بظاہر اسلام کے احکام جاری کیے جاتے ہیں: وَعِظْهُمْ ...۔

۲۔ رسول (ص) منافقین کو دائرۂ اسلام سے نکالے بغیر ان کی نصیحت کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَلَوۡ اَنَّہُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ جَآءُوۡکَ فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰہَ وَاسۡتَغۡفَرَ لَہُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُوا اللّٰہَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًا ﴿۶۴﴾

۶۴۔ اور ہم نے جو بھی رسول بھیجا، اس لیے بھیجا ہے کہ باذن خدا اس کی اطاعت کی جائے اور جب یہ لوگ اپنے آپ پر ظلم کر بیٹھتے تھے تو اگر آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اللہ سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتے تو وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا پاتے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا: آیت کی ابتداء میں ایک کلیہ بیان فرمایا کہ اللہ نے جو رسول بھی بھیجا ہے، وہ اس لیے بھیجا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ لہٰذا رسول پر ایمان لانے کا لازمی نتیجہ اطاعت ہے۔ اللہ نے رسولوں کو اس لیے نہیں بھیجا کہ لوگ ان کے نام کو تقدس دیں، تعویز بنا کر گلے میں لٹکائیں اور بظاہر عشق رسول (ص) کا اظہار کریں اور عملی زندگی میں سیرتِ رسول (ص) کا کوئی دخل نہ ہو۔

۲۔ بِاِذۡنِ اللّٰہِ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اطاعت کا سلسلہ بالآخر اللہ کی ذات پر منتہی ہوتا ہے۔

۳۔ جَآءُوۡکَ: بارگاہ رسالت میں حاضر ہونا اور اسے اپنا وسیلہ اور واسطہ بنانا بارگاہ الٰہی میں اثر رکھتا ہے اور یہ عمل شرک نہیں ہے، بلکہ آیت کی رو سے یہ ایک مستحسن عمل ہے۔ اس طرح قبر رسول (ص) پر حاضری دینا بھی اسی حکم میں ہے۔

تفسیر قرطبی میں اسی آیت کے ذیل میں آیا ہے: ابو صادق نے حضرت علی (ع) سے روایت کی ہے: رسول اللہ (ص) کی تدفین کے تین دن بعد ایک عرب صحرانشین آیا اور اس نے اپنے آپ کو قبر رسول پر گرا دیا اور قبر کی مٹی اپنے سر پر ڈالنے لگا اور کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ جو بھی بات کرتے ہم سن لیتے اور آپؐ اللہ سے سمجھ لیتے اور آپ پر یہ آیت نازل کی: وَلَوۡ اَنَّہُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ جَآءُوۡکَ اور میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور آپؐ کے پاس آیا ہوں، آپ میرے لیے استغفار کریں۔ چنانچہ قبر سے ندا آئی: تیری مغفرت ہوگئی۔

نیز تفسیر ابن کثیر میں اسی آیت کی ذیل میں آیا ہے۔ شیخ ابو منصور الصباغ اپنی کتاب ال شامل میں العتبی کا یہ مشہور واقعہ بیان کرتے ہیں۔ عتبی کہتے ہیں: میں قبر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھا تھا، ایک عرب صحرائی آیا اور کہا: السلام علیك یا رسول اللّٰہ میں نے اللہ کا یہ کلام سنا ہے: وَلَوۡ اَنَّہُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ جَآءُوۡکَ .... میں آپؐ کے پاس استغفار کے لیے آیا ہوں اور اپنے رب کے پاس آپ کو شفیع بناتا

ہوں۔ پھر یہ شعر کہا:

نفسی الفداء لقبر انت ساکنه	میری جان نثار ہو اس قبر پر جس میں آپؐ رہتے
فیه العفاف و فیه الجود والکرم.	ہیں، جس میں عفو ہے جود و کرم ہے۔

اعرابی چلا گیا۔ میری آنکھ لگ گئی خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھتا ہوں، فرمایا: اے عتبی! اس اعرابی کے پاس جاؤ اور اسے بشارت دو، اللہ نے اسے معاف کر دیا ہے۔

۴۔ وَاسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ الرَّسُوۡلُ: رسولؐ بھی ان کی مغفرت کے لیے دعا کرتے ہیں۔ اس سے رسول خدا (ص) کی شفاعت اور رسالت کے عظیم منصب اور عند اللہ ان کے احترام کا اظہار ہوتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ہادیان برحق صرف اس لیے آتے ہیں کہ جو دستور حیات ان کے ساتھ ہے، اس کی اطاعت کی جائے۔

۲۔ وفات کے بعد بھی اللہ تک پہنچنے کے لیے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی طرح وسیلہ ہیں جس طرح حیات میں تھے۔

فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوۡکَ فِیۡمَا شَجَرَ بَیۡنَہُمۡ ثُمَّ لَا یَجِدُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیۡتَ وَ یُسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا ﴿۶۵﴾

۶۵۔ (اے رسول) تمہارے رب کی قسم یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے باہمی تنازعات میں آپ کو منصف نہ بنائیں پھر آپ کے فیصلے پر ان کے دلوں میں کوئی رنجش نہ آئے بلکہ وہ (اسے) بخوشی تسلیم کریں۔

تشریح کلمات

شَجَرَ: (ش ج ر) تنازعات۔ الجھنا۔ درخت کو شجر اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی ٹہنیاں باہم الجھی ہوئی ہوتی ہیں۔

حَکَمۡ: (ح ک م) فیصلہ سنانے والا۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَا وَ رَبِّکَ: ایمان کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ اللہ اور اس کے رسول (ص) کے فیصلے کو انسان اپنی خواہشات پر مقدم سمجھے گا اور ہر اختلاف میں رسول (ص) کو حَکَمۡ اور منصف تسلیم کرے گا۔ بصورت دیگر اللہ

اپنی ذات کی قسم کھا کر نہایت تاکیدی الفاظ میں فرماتا ہے کہ ایسا شخص مومن نہیں ہے۔

تنازعات کی صورت میں اس آیت میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے:

ا۔ باہمی تنازعات میں رسول (ص) کو حَکَمُ بنایا جائے۔ یہ ایمان ظاہری ہے۔

۲۔ رسول (ص) کے فیصلے کو دل سے قبول کیا جائے اور کوئی رنجش نہ آئے۔ یہ ایمان باطنی ہے۔

۲۔ ثُمَّ لَا یَجِدُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ : اس آیت میں ایمان کو ان دو باتوں سے مشروط کیا ہے: اللہ اور رسول (ص) کے حکم کو بالا دست قانون کے طور پر عملاً تسلیم کیا جائے اور قلباً اس فیصلے پر اطمینان قلب حاصل ہو اور کوئی رنجش باقی نہ رہے۔

جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا:

وَ مَا کَانَ لِمُؤۡمِنٍ وَّ لَا مُؤۡمِنَۃٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗۤ اَمۡرًا اَنۡ یَّکُوۡنَ لَہُمُ الۡخِیَرَۃُ مِنۡ اَمۡرِہِمۡ ؕ وَ مَنۡ یَّعۡصِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیۡنًا ؕ[1]	۳۶۔ اور کسی مؤمن اور مومنہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ جب اللہ اور اس کے رسول کسی معاملے میں فیصلہ کریں تو انہیں اپنے معاملے کا اختیار حاصل رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ صریح گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

ان دو آیات میں ان لوگوں کی صریح رد موجود ہے جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ (ص) کے ساتھ اجتہادی اختلاف ہوسکتا ہے۔

سلسلہ کلام اگرچہ منافقین کے بارے میں ہے کہ وہ بظاہر ایمان کا اظہار کرتے ہیں لیکن وہ اپنے فیصلے طاغوت کے پاس لے جاتے ہیں یا رسول (ص) کے فیصلے کو دل سے قبول نہیں کرتے۔ تاہم اس آیت کی عمومیت میں سب لوگ شامل ہیں اور صرف حیات رسول (ص) ہی میں انہیں حَکَمُ بنانا نہیں بلکہ حیات رسولؐ کے بعد ان کی سنت اور سنت کے محافظین کو حَکَمْ بنانا بھی ایمان کی علامت ہے۔

اہم نکات

ا۔ یہ آیت ان مدعیان اسلام و ایمان کے لیے لمحۂ فکریہ ہے جو اپنے فیصلوں کو غیر شرعی عدالتوں میں لے جاتے ہیں۔

وَ لَوۡ اَنَّا کَتَبۡنَا عَلَیۡہِمۡ اَنِ اقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ اَوِ اخۡرُجُوۡا مِنۡ	٦٦۔ اور اگر ہم ان پر اپنے آپ کو ہلاک کرنا اور اپنے گھروں کو خیرباد کہنا واجب قرار دے دیتے

---

[1] ۳۳ احزاب: ۳۶

دِیَارِکُمۡ مَّا فَعَلُوۡہُ اِلَّا قَلِیۡلٌ مِّنۡہُمۡ ؕ وَ لَوۡ اَنَّہُمۡ فَعَلُوۡا مَا یُوۡعَظُوۡنَ بِہٖ لَکَانَ خَیۡرًا لَّہُمۡ وَ اَشَدَّ تَثۡبِیۡتًا ﴿ۙ۶۶﴾

تو ان میں سے کم لوگ ہی اس پرعمل کرتے حالانکہ اگر یہ لوگ انہیں کی جانے والی نصیحتوں پرعمل کرتے تو یہ ان کے حق میں بہتر اور ثابت قدمی کا موجب ہوتا۔

وَّ اِذًا لَّاٰتَیۡنٰہُمۡ مِّنۡ لَّدُنَّاۤ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿ۙ۶۷﴾

۶۷۔ اور اس صورت میں ہم انہیں اپنی طرف سے اجرعظیم عطا کرتے۔

وَّ لَہَدَیۡنٰہُمۡ صِرَاطًا مُّسۡتَقِیۡمًا ﴿۶۸﴾

۶۸۔اور ہم انہیں سیدھے راستے کی رہنمائی (بھی) کرتے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَوۡ اَنَّا کَتَبۡنَا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر ہم ان پر اپنی قوم کے افراد کو قتل کرنے یا ان کو اپنے گھروں سے نکلنے کا حکم دیتے جو ان کی ذاتی خواہشات کے خلاف پرمشقت کام ہے تو یہ اس حکم کی تعمیل نہ کرتے۔ حکم صرف ان کے اپنے مفاد کے مطابق ہو تو یہ ایمان کا اظہار کرتے ہیں۔ جان دینے یا گھر بار چھوڑنے کا حکم ہو تو راہ فرار اختیار کرتے ہیں۔ جیسے بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی کی سزا میں حکم دیا تھا کہ اپنے ہی لوگوں کو قتل کرو۔

۲۔ وَلَوۡ اَنَّہُمۡ .... تَثۡبِیۡتًا: اگر یہ لوگ نصیحتوں پرعمل کرتے تو ان کے حق میں بہتر اور ثابت قدمی کا موجب بنتا۔ اس سے معلوم ہوا، اللہ کے احکام کی تعمیل سے نفسیاتی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ احکام الٰہی کی تعمیل سے نفس میں اعتماد بحق بحال ہوتا ہے، ورنہ اضطراب کا شکار رہتا ہے۔

۳۔ وَّ اِذًا لَّاٰتَیۡنٰہُمۡ: اگر وہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل پیرا ہوتے تو ہم انہیں اجر عظیم دیتے۔ جس اجر کو اللہ نے عظیم قرار دیا ہے، وہ قابل وصف و بیان کی حدود سے خارج ہے۔

۴۔ وَّ لَہَدَیۡنٰہُمۡ: احکام الٰہی کی تعمیل کا دوسرا اثر ہدایت میں اضافہ ہے۔ چنانچہ برائی، برائی کو جنم دیتی ہے اور گناہ موجب ضلالت ہوتا ہے۔ اسی طرح نیکی، نیکی کو جنم دیتی ہے اور موجب ہدایت بن جاتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ احکام خدا کی تعمیل سے شخصیت میں ثبات آتا ہے۔

وَمَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیۡقِیۡنَ وَالشُّہَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیۡنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیۡقًا ﴿۶۹﴾	۶۹۔اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے، وہ انبیاء، صدیقین، گواہوں اور صالحین کے ساتھ ہو گا جن پر اللہ نے انعام کیا ہے اور یہ لوگ کیا ہی اچھے رفیق ہیں۔
ذٰلِکَ الۡفَضۡلُ مِنَ اللّٰہِ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰہِ عَلِیۡمًا ﴿۷۰﴾	۷۰۔ یہ فضل اللہ کی طرف سے (ملتا) ہے اور علم و آگاہی کے لیے تو اللہ ہی کافی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ: اطاعت گزاروں کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ یہ خود گواہ، صدیق اور صالح ہوں گے، بلکہ فرمایا اطاعت گزار ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے۔ یعنی درجات میں فرق کے باوجود صحبت حاصل رہے گی۔

۲۔ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ: جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں سے نوازا ہے، وہی لوگ ہیں جو صراط مستقیم پر ہیں۔ آگے ان کا تفصیلی ذکر ہوتا ہے:

الف۔ النَّبِیّٖنَ: انبیائے کرام علیہم السلام ان ذوات مقدسہ کو کہتے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔

ب۔ الصِّدِّیۡقِیۡنَ: جن کا قول و فعل دونوں سچائی پر مبنی ہوں۔ یعنی ان کا کوئی عمل اور کوئی قول ان کے ایمان کے خلاف نہ ہو۔ وہ اپنے ہر قول اور ہر عمل میں سچے ہوں۔ کیونکہ کوئی اگر اپنے ایمان وعقیدے کے خلاف عمل کرتا ہے تو اس کا یہ عمل اس کے ایمان کی تصدیق نہیں کرتا، چونکہ یہ ایمان کے منافی ہے، جسے عصیان اور گناہ کہتے ہیں۔ صدیقین وہ ہیں جن کا قول و فعل ان کے ایمان کی تصدیق کرے۔

ج۔ الشُّہَدَآءِ: جن کا قول اور فعل ان کے ایمان کی گواہی دے۔ راہ حق میں شہید ہونے والے شاید اسی وجہ سے شہید کہلاتے ہیں کہ ان کا راہ خدا میں جان دینا ان کے پختہ ایمان پر گواہ ہے نیز گواہ سے مراد وہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو اعمال عباد پر گواہ ہیں، جس کا سورۂ بقرہ آیت ۱۴۳ میں ذکر ہوا ہے۔ علامہ طباطبائی کا مؤقف یہ ہے کہ شہداء سے مراد گواہ ہیں۔ یعنی جو ہستیاں

اعمال عباد پر گواہ ہیں، ان کو قرآن شہید کہتا ہے۔ راہ خدا میں مارے جانے والوں کے لیے شہید کہنے کی اصطلاح قرآنی نہیں ہے، بعد کی اصطلاح ہے۔

د۔ الصّٰلِحِيْنَ: نیکی پر عمل جاری رکھنے والے صالحین ہیں۔ چنانچہ قرآن میں عمل کے ساتھ ہمیشہ صالح کا لفظ آیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ [1]	وہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے، نیک کاموں کا حکم دیتے، برائیوں سے روکتے اور بھلائی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور یہی صالح لوگوں میں سے ہیں۔

۳۔ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ: یعنی اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کی صورت میں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ قرار دینا، یہ اللہ کے فضل و کرم سے ہے۔ ورنہ بندہ خود صرف اپنے عمل کے ذریعے اس مقام کو حاصل نہیں کر سکتا۔

۴۔ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا: آگاہی کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔ اس جملے میں اس بات کی ضمانت آ گئی کہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کی صورت میں جو ثواب مقرر ہے، اس میں لاعلمی کی وجہ سے فرق نہیں آئے گا چونکہ ثواب دینے والا علیم ہے۔

احادیث

امالی شیخ میں مذکور ہے:

> انصار کا ایک صحابی رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہؐ! میں آپؐ کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا، جب میں گھر جاتا ہوں اور آپؐ کو یاد کرتا ہوں تو میں اپنا کاروبار چھوڑ کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں اور محبت بھری نگاہوں سے آپؐ کا دیدار کرتا ہوں۔ مجھے خیال آیا کہ قیامت کے دن آپؐ جنت کے اعلا علیون میں ہوں گے تو اس وقت میں آپؐ کی زیارت کیسے کر سکوں گا؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور رسول اللہ (ص) نے اس شخص کو بلا کر یہ بشارت سنائی۔ [1]

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

> مومن دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ جنہوں نے اللہ کی طرف سے عائد کردہ

---

[1] ۳ آل عمران ۱۱۴

تمام شرائط پوری کر دیں، یہ مومن انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوں گے، جو بہترین رفیق ہیں۔ یہ مومن دوسروں کی شفاعت کریں گے، خود شفاعت کے محتاج نہ ہوں گے۔ انہیں دنیا و آخرت دونوں میں کسی خوف و ہراس سے دوچار ہونے کی نوبت نہیں آئے گی۔ دوسرے وہ جن کے قدموں میں لغزش آئی ہو گی، وہ سبز پودے کی طرح ہوا کے جھونکے کے ساتھ اِدھر اُدھر ہوتے رہتے ہیں۔ یہ دنیا و آخرت میں خوف و ہراس سے دوچار ہوں گے، انہیں شفاعت نصیب ہو گی تو ان کی عاقبت بخیر ہو گی۔

اہم نکات

۱۔ درجات میں نمایاں فرق کے باوجود انبیاءؑ کی صحبت ملنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جنت میں زمان و مکان کا وہ تصور نہ ہو گا جو اس دنیا میں ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ۝

۷۱۔ اے ایمان والو! اپنے بچاؤ کا سامان اٹھا لو پھر دستہ دستہ یا سب مل کر نکل پڑو۔

تشریح کلمات

انفروا: (ن ف ر) نفر الی الحرب۔ جنگ کے لیے نکلنا۔

ثُبَات: (ث ب ت) مفرد ثبۃ۔ جماعت۔

حِذْرَ: (ح ذ ر) حذر کے لفظی معنی بچاؤ کے ہیں۔ یہاں اسلحہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

تفسیر آیات

مذکورہ آیت اور اس کے بعد کی چند آیات زمانۂ رسالتؐ کے نہایت ہی نازک ترین دور سے مربوط ہیں۔ جس میں اسلام دشمن طاقتیں متحد ہو کر اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے اپنی قوتوں کو مجتمع کر رہی تھیں۔ یہودی، قریش مکہ اور گرد و پیش کے مختلف یہود قبائل کو اکساتے تھے کہ تم حق پر ہو اور یہ جدید مذہب باطل ہے۔ تم اپنے قدیم مذہب کا دفاع کرو، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ احد میں مسلمانوں کی شکست کے بعد ان کی ہمتیں بڑھ گئیں۔ منافقین نے بھی ان دنوں میں اپنی صفوں کو مربوط کیا۔ چنانچہ جنگ احد سے سب کو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی تعداد کی تقریباً نصف منافق یا منافقین کی ہمنوا ہے۔ آنے والی آیات سے معلوم ہوتا ہے

۱؎ امالی الشیخ طوسی ص ۶۲۱

کہ رسالت مآب (ص) کو درج ذیل افراد سے واسطہ پڑ رہا تھا:

i۔ کچھ تو دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ ہی نہ تھے۔

ii۔ کچھ لوگ افواہ سازی کر کے مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پھیلاتے تھے۔

iii۔ کچھ لوگ اس بات میں شکوک و شبہات پیدا کرتے تھے کہ حکم جہاد اللہ کی طرف سے ہے۔

iv۔ کچھ لوگ ایسے تھے جو جہاد کے لیے حضورؐ کے سامنے لبیک کہتے تھے، مگر پیچھے ان کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔

v۔ کچھ لوگ منافقین کے بہکاوے میں آ کر ان کے مؤقف کی حمایت کرتے تھے۔ اس طرح مسلمانوں کی صفوں میں ایسے لوگوں کی خاصی تعداد موجود تھی جو یا تو منافق تھے یا منافقین کے ہمنوا تھے۔

خُذُوۡا حِذۡرَکُمۡ: یعنی اپنے بچاؤ کا سامان فراہم کرو۔ بچاؤ کے سامان کا تعین دشمن کی طاقت سے ہوتا ہے کہ دشمن جیسے آلات حرب رکھتا ہے، مادی و عسکری طاقت و تدبیر رکھتا ہے، مسلمانوں کے لیے حکم ہے کہ وہ بھی اپنے لیے بچاؤ کا ویسا ہی سامان فراہم رکھیں۔

فَانۡفِرُوۡا ثُبَاتٍ: بچاؤ کی ایک صورت یہ ہے کہ تم دستہ دستہ ہو کر جہاد کے لیے نکلو۔ اگر تعداد زیادہ ہے اور حالات کا تقاضا یہی ہو۔

اَوِ انۡفِرُوۡا جَمِیۡعًا: اگر حالات کا تقاضا ایک ساتھ، ایک لشکر کی شکل میں نکلنا ہے تو ایک ساتھ نکلو۔

اہم نکات

۱۔ اس آیت اور دوسری چند ایک آیات کی رو سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر عصر کی عسکری تکنیک حاصل کرنا اور فوجی طاقت کے حصول کے لیے ہر وہ ذریعہ حاصل کرنا مسلمانوں پر واجب ہے جو مدمقابل کے پاس ہے۔

وَ اِنَّ مِنۡکُمۡ لَمَنۡ لَّیُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنۡ اَصَابَتۡکُمۡ مُّصِیۡبَۃٌ قَالَ قَدۡ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیَّ اِذۡ لَمۡ اَکُنۡ مَّعَہُمۡ	۷۲۔ البتہ تم میں کوئی ایسا بھی ہے جو (جہاد سے) ضرور کتراتا ہے، پھر اگر تم پر کوئی مصیبت آ پڑے تو کہتا ہے: اللہ نے مجھ پر (خاص) فضل

شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾ کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ حاضر نہ تھا۔

وَ لَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾

۷۳۔ اور اگر تم پر اللہ کی طرف سے فضل ہو جائے تو وہ اس طرح کہ گویا تم میں اور اس میں کوئی دوستی نہ تھی، ضرور کہے گا: کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو میں بھی بڑی کامیابی حاصل کرتا۔

تشریح کلمات

لَيُبَطِّئَنَّ　(ب ط و) البطوء۔ دیر لگانا۔ سستی کرنا۔ راغب اصفہانی کے مطابق یہ لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب دیر لگانے کا عادی ہو جائے۔ باب افعال سے اِبْطاء دیر لگوانے کے معنوں میں ہے۔ یعنی خود بھی جہاد سے کتراتا ہے اور دوسروں کو بھی روکتا ہے۔

فوز:　(ف و ز) سلامتی کے ساتھ خیر حاصل کر لینا۔ کامیابی حاصل کر لینا۔

تفسیر آیات

سابقہ آیات میں جنہیں يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے ساتھ خطاب کیا ہے، اس آیت میں مِنْكُمْ کا خطاب بھی انہی سے ہے اور جہاد سے پیچھے رہ جانے والوں کا یہ کہنا: قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ ، اللہ نے مجھ پر خاص کرم کیا، بھی اس پر دلیل ہے کہ یہ خطاب منافقین کے لیے نہیں، جیسا کہ بعض حضرات کا خیال ہے۔

ایسے ضعیف الایمان لوگ بے ثباتی اور اضطراب کا شکار رہتے ہیں کہ اگر جہاد میں شرکت کرنے والوں کو کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو وہ مسرت کا اظہار کرتے ہیں اور اگر مجاہدین کو فتح و نصرت حاصل ہوتی ہے تو اس طرح اظہار تاسف و حسرت کرتے ہیں کہ گویا ایک اجنبی دوسرے اجنبی کے بارے میں کہتا ہے: کاش میں ان لوگوں کا ساتھی ہوتا تو بڑی کامیابی نصیب ہوتی۔ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ ۔ اس کا یہ اظہار حسرت ایسا ہے جیسے ایک غیر مؤمن آدمی کہتا ہے کہ کاش میں بھی ان مومنین کا ساتھی ہوتا۔ حالانکہ وہ اجنبی اور لاتعلق شخص نہ تھا، اس نے جہاد سے پہلو تہی کر کے اپنے آپ کو اس فضل و کرم سے محروم رکھا۔

كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ کی عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مومنین ہی کے گروہ کے لوگ تھے۔ صرف یہ کہ ضعیف الایمان تھے۔

اہم نکات

ا۔　مسلمانوں کی صفوں میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جن کے ایمان کی بنیاد بدلتے حالات کے تابع تھی۔

فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيلِ اللهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۷۴

۷۴۔ اب ان لوگوں کو اللہ کی راہ میں لڑنا چاہیے جو اپنی دنیاوی زندگی کو آخرت کی زندگی کے بدلے فروخت کرتے ہیں اور جو راہ خدا میں لڑتا ہے وہ مارا جائے یا غالب آئے (دونوں صورتوں میں) ہم اسے عنقریب اجر عظیم دیں گے۔

تشریح کلمات

يَشْرُوْنَ:　(ش ر ی) فروخت کرنے اور خریدنے، دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں فروخت کے معنوں میں آیا ہے۔

تفسیر آیات

راہ خدا میں لڑنے سے پہلے اللہ کے ساتھ اپنی جانوں کا سودا کرنا ہوتا ہے۔ اس صورت میں راہ خدا میں لڑنے والوں کی اس آیت میں دو صورتیں بتائی گئی ہیں کہ وہ یا تو شہید ہو جاتے ہیں یا فتح و غلبہ حاصل کرتے ہیں۔ ان کے لیے تیسری صورت یعنی شکست و فرار قابل تصور نہیں ہے۔ اگر کوئی جہاد سے راہ فرار اختیار کرتا ہے تو یہ عمل قتال فی سبیل اللّٰہ کے منافی ہے۔ یعنی جنگ سے بھاگتا وہ ہے جو سرے سے راہ خدا میں لڑ ہی نہ رہا ہو۔ چونکہ لڑنا تو ان لوگوں نے تھا، جنہوں نے اپنی زندگی آخرت کے بدلے فروخت کی ہے۔

اہم نکات

ا۔　راہ خدا میں قتال کا مطلب اپنی جان کا اللہ کے ساتھ سودا کرنا ہے۔

۲۔　راہ خدا میں قتال میں فرار و ناکامی کا تصور نہیں ہے۔ اس میں فتح یا شہادت میں سے ایک کامیابی ضرور حاصل ہوتی ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ

۷۵۔ آخر تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ

اللّٰہِ وَالۡمُسۡتَضۡعَفِیۡنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالۡوِلۡدَانِ الَّذِیۡنَ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اَخۡرِجۡنَا مِنۡ ہٰذِہِ الۡقَرۡیَۃِ الظَّالِمِ اَہۡلُہَا ۚ وَاجۡعَلۡ لَّنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ وَلِیًّا ۚ وَّ اجۡعَلۡ لَّنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ نَصِیۡرًا ﴿۷۵﴾

میں اور ان بے بس کیے گئے مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو پکارتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال جس کے باشندے بڑے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا سرپرست بنا دے اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارے لیے مددگار بنا دے.

تشریح کلمات

الۡمُسۡتَضۡعَفِیۡنَ: (ض ع ف) جنہیں بے بس بنا دیا گیا ہو، نہ کہ وہ خود بے بس اور کمزور ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَا لَکُمۡ لَا تُقَاتِلُوۡنَ: خطاب مومنین سے ہے کہ ان میں سے جو لوگ راسخ الایمان ہیں، انہیں راہ خدا میں جہاد کرنا چاہیے اور جو لوگ ضعیف الایمان ہیں، انہیں اپنے عزیزوں کے بارے میں کچھ حمیت آنی چاہیے۔ کیونکہ ہجرت کے بعد مسلمانوں کے عزیزوں میں سے بچوں، عورتوں اور ناتواں مردوں کی ایک خاصی تعداد اسلام قبول کر چکی تھی اور یہ سب مکہ میں رہ رہے تھے اور قریش کے ظلم و تشدد کا نشانہ بن رہے تھے۔ اسلام کی نظر میں اگرچہ قومی اور نژادی عصبیت مردود ہے، تاہم ایمان کے بعد برادری اور قومی حمیت، جو ایک فطری عمل ہے، کو بھی مد نظر رکھنا ممنوع نہیں ہے، بلکہ اس آیت میں اسی قومی حمیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

۲۔ وَالۡمُسۡتَضۡعَفِیۡنَ: فی سبیل اللہ کے بعد مستضعفین کے ذکر کا مطلب یہ ہوا: پسے ہوئے اور ظلم و ستم میں مبتلا لوگوں کو ظلم سے چھڑانا قتال فی سبیل اللہ کی طرح ہے۔

۳۔ وَالۡوِلۡدَانِ: بچوں کا ذکر اس لیے فرمایا، چونکہ مشرکین مسلمانوں کے بچوں پر بھی ظلم اور تشدد کرتے تھے۔ ورنہ یہ بچے ابھی مکلّف نہیں تھے اور شرک میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہ تھا۔

۴۔ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ: وہ اللہ کی بارگاہ میں اس ظلم سے خلاصی کے لیے دعا کرتے۔

۵۔ وَاجۡعَلۡ لَّنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ وَلِیًّا: ان کی دعا میں جملے ہوتے تھے: ہمارا رب اپنے پاس سے ایک ولی بھیج جو ان کو نجات دلانے کا کام اپنے ذمے لے۔

۶۔ وَّ اجۡعَلۡ لَّنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ نَصِیۡرًا: اپنی طرف سے کسی کو ہمارے لیے مددگار بنا دے۔ یہاں مدد

کی پکار کے لیے اللہ سے خطاب ہے۔ یہ اپنی فریاد لوگوں سے نہیں کرتے۔

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۚ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ الطَّاغُوۡتِ فَقَاتِلُوۡۤا اَوۡلِیَآءَ الشَّیۡطٰنِ ۚ اِنَّ کَیۡدَ الشَّیۡطٰنِ کَانَ ضَعِیۡفًا ﴿۷۶﴾

۷۶۔ ایمان لانے والے اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور کفار طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں، پس تم شیطان کے حامیوں سے لڑو، (مطمئن رہو کہ) شیطان کی عیاریاں یقیناً ناپائیدار ہیں۔

تفسیر آیات

کفر و ایمان کے تقابل کے ساتھ اللہ اور طاغوت کا بھی تقابل ہے۔ طاغوت کی راہ میں لڑنے والوں کو شیطان کے حامی قرار دینے کے بعد ایک کلیہ بیان فرمایا کہ ان کے پیچھے شیطان کی عیاریاں کارفرما ہوتی ہیں، لیکن ایمان باللہ کے حقائق کے مقابلے میں یہ بے حقیقت عیاریاں کارآمد نہیں ہو سکتیں۔

۱۔ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ: ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کیا جائے۔ جس طرح کافر طاغوت کی راہ میں قتال کرتے ہیں۔

۲۔ فَقَاتِلُوۡۤا اَوۡلِیَآءَ الشَّیۡطٰنِ: شیطان کے حامیوں سے لڑو۔ چونکہ شیطان ایمان اور مؤمنوں سے ان کا حق چھیننا چاہتا ہے، لہٰذا فساد کا راستہ روکنے کے لیے لڑو۔ ان کو مؤمن بنانے کے لیے لڑنے کا حکم نہیں، جیسا کہ اسلام کے دشمنوں کا الزام ہے۔

۳۔ اِنَّ کَیۡدَ الشَّیۡطٰنِ کَانَ ضَعِیۡفًا: شیطان کی عیاریاں، جو اہل ایمان سے ایمان چھیننا چاہتی ہیں، ناپائیدار ہیں۔

اہم نکات

۱۔ مؤمنین کو اپنے بے حقیقت دشمن سے خوف نہیں کھانا چاہیے۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ قِیۡلَ لَہُمۡ کُفُّوۡۤا اَیۡدِیَکُمۡ وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا

۷۷۔ کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا تھا: اپنا ہاتھ روکے رکھو، نماز قائم

الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ؕ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۟ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۷﴾

کرو اور زکوٰۃ دیا کرو؟ پھر جب ان پر جہاد فرض کیا گیا تو ان میں سے کچھ تو لوگوں سے اس طرح ڈرنے لگے جیسے اللہ سے ڈرا جاتا ہے یا اس سے بھی بڑھ کر اور کہنے لگے: ہمارے پروردگار! تو نے ہم پر جہاد کیوں فرض کیا؟ ہمیں تھوڑی مہلت کیوں نہ دی؟ ان سے کہدیجیے: دنیا کا سرمایہ بہت تھوڑا ہے اور متقی (انسان کے) لیے نجات اخروی زیادہ بہتر ہے اور تم پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْۤا اَيْدِيَكُمْ : مسلمانوں سے خطاب کا سلسلہ جاری ہے اور ذکر ان ضعیف الایمان لوگوں کا ہے جو مکہ میں مشرکین کے ظلم وستم سے تنگ آ کر جہاد کی اجازت کا مطالبہ کرتے اور کہتے تھے: یا رسول اللہ (ص)! جب ہم مشرک تھے تو ہم معزز اور محترم تھے۔ جب ہم ایمان لائے تو ذلیل ہوگئے۔ ہمیں جہاد و قتال کی اجازت دیجیے۔ جواب میں آپ (ص) نے فرمایا: امرت بالعفو فلا تقاتلوا القوم۔[1] مجھے عفو و درگزر کا حکم دیا گیا ہے، لہٰذا ان لوگوں کے ساتھ ابھی جنگ نہ کرو۔ یہ دور نماز و زکوٰۃ کا ہے، جہاد و قتال کا دور نہیں ہے۔

۲۔ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ: جب مدینہ میں جہاد و قتال کا دور آیا اور حکم جہاد دیا گیا تو انہی لوگوں میں سے ایک گروہ نے جہاد سے کترانا شروع کر دیا، بلکہ اللہ کے اس حکم پر صریحاً اعتراض کیا: رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ؟ ہمارے پروردگار! تونے ہم پر جہاد کیوں فرض کیا؟ یہ اعتراض انہی مسلمانوں نے کیا جو مکہ میں جہاد کی اجازت کا مطالبہ کر رہے تھے۔ لہٰذا بعض مفسرین کی یہ خوش فہمی ہے کہ یہ اعتراض منافقوں کی طرف سے تھا۔ حالانکہ یہ درست نہیں ہے، مسلمانوں کی صفوں میں کچے مسلمانوں کا وجود قابل انکار نہیں ہے۔ چنانچہ قرطبی نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے۔

۳۔ لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ: ہمیں تھوڑی مہلت کیوں نہ دی۔ تھوڑی مہلت سے مراد موت ہے۔ طبعی موت تک مہلت کیوں نہ دی یعنی اگر وہ جہاد میں قتل نہ ہوں اور طبعی موت مر جائیں تو یہ ایک مختصر

---

[1] تفسیر ابن کثیر ذیل آیہ

وقفہ ہو گا۔ قُلۡ مَتَاعُ الدُّنۡيَا قَلِيۡلٌ اسی مختصر وقفے کو متاع قلیل سے تعبیر فرمایا ہے۔

۴۔ وَالۡاٰخِرَۃُ خَيۡرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى: متقی انسان کے لیے دنیا زندان ہے اور آخرت بہتر ہے، جہاں ابدی زندگی ملے گی۔

۵۔ وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ فَتِيۡلًا: تقویٰ کی صورت میں ثواب ہو گا۔ جنگ سے فرار عذاب کا موجب ہے، جسے تم نے خود اختیار کیا ہے۔ اللہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔

اہم نکات

۱۔ عصر رسولؐ کے تمام مسلمان ایمان کے درجات میں ایک جیسے نہیں ہوتے تھے۔

اَيۡنَ مَا تَكُوۡنُوۡا يُدۡرِكْكُّمُ الۡمَوۡتُ وَ لَوۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ بُرُوۡجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ حَسَنَةٌ يَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ يَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِكَ ؕ قُلۡ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الۡقَوۡمِ لَا يَكَادُوۡنَ يَفۡقَهُوۡنَ حَدِيۡثًا ۝۸۷	۷۸۔(تمہیں موت کا خوف ہے) تم جہاں کہیں بھی ہو، خواہ تم مضبوط قلعوں میں بند رہو، موت تمہیں آ لے گی اور انہیں اگر کوئی سکھ پہنچے تو کہتے ہیں: یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر انہیں کوئی دکھ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں: یہ آپ کی وجہ سے ہے، کہد یجیے: سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے، پھر انہیں کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتی؟

تشریح کلمات

بُرُوۡجٍ: (ب ر ج) مضبوط قصر اور محلات کو کہتے ہیں اور ستاروں کی مخصوص منازل کو بھی بروج کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

جہاد سے کترانے والوں کا مؤقف اور ان کے لیے نصیحت بیان ہو رہی ہے:

i۔ اَيۡنَ مَا تَكُوۡنُوۡا: ترک جہاد، موت سے خوف کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔ اس شبہ کا ازالہ فرمایا کہ تم ترک جہاد کے ذریعے موت سے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ موت نے تو تمہیں تمہارے مقررہ وقت میں آ لینا ہے۔ خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہی بند کیوں نہ ہو۔

ii۔ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ حَسَنَةٌ: دوسری بات ایک اہم مسئلے کے بارے میں ان کی ایک غلط فہمی کا ازالہ ہے۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کو جب فتح ونصرت ملتی تو وہ اسے اللہ کی طرف نسبت دیتے تھے کہ اللہ نے ہمیں فتح ونصرت سے نوازا، لیکن جب کبھی ہزیمت اٹھانا پڑتی تو یہ لوگ اسے رسول (ص) کی طرف نسبت دیتے تھے۔ اس نسبت کے بارے میں دو تفسیریں موجود ہیں:

ایک یہ کہ وہ اس ہزیمت اور شکست کو رسول (ص) کی بے تدبیری کا نتیجہ قرار دیتے تھے، جیسا کہ بعض جنگوں میں لوگوں نے جنگی حکمت عملی میں رسول اللہ (ص) سے اختلاف کیا۔ البتہ یہ اختلاف وہ اس وقت کرتے تھے جب وہ رسول (ص) سے پوچھتے تھے کہ یہ حکمت عملی اللہ کی طرف سے ہے یا آپ (ص) کی اپنی طرف سے؟ تو رسول اللہ (ص) فرماتے تھے کہ یہ میری اپنی طرف سے ہے۔ اس تفسیر کے مطابق ممکن ہے کہ ایسا نظریہ رکھنے والے لوگ ضعیف الایمان مسلمان ہوں۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ لوگ اس ہزیمت اور شکست کو رسول کریم (ص) کی (معاذ اللہ) نحوست سمجھتے تھے، جیسا کہ قوم موسیٰ (ع) کے بارے میں ہے:

وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوۡا بِمُوۡسٰى وَمَنۡ مَّعَهٗ ...۔[1] اور اگر برا زمانہ آتا تو اسے موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی بدشگونی ٹھہراتے ....

اس تفسیر کے مطابق ایسا نظریہ رکھنے والے منافقین ہی ہو سکتے ہیں۔ قُلۡ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ اے رسولؐ ان سے کہد یجیے: یہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ جب کہ یہ فتح وشکست اللہ کے وضع کردہ نظام یعنی نظام علل و اسباب کا لازمی حصہ ہے۔ لہٰذا نظام طبیعیت میں رونما ہونے والے تمام واقعات اللہ کے وضع کردہ قانون طبیعیت کے مطابق وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا:

مَاۤ اَصَابَكَ مِنۡ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَ مَاۤ اَصَابَكَ مِنۡ سَيِّئَةٍ فَمِنۡ نَّفۡسِكَ ؕ وَاَرۡسَلۡنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوۡلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيۡدًا ۝۷۹

۷۹۔ تمہیں جو سکھ پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو دکھ پہنچے وہ خود تمہاری اپنی طرف سے ہے اور ہم نے آپ کو لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے اور (اس پر) گواہی کے لیے اللہ کافی ہے۔

تفسیر آیات

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سابقہ آیت میں فرمایا کہ دکھ سکھ سب اللہ کی طرف سے ہے اور اس

----

[1] ۷ اعراف: ۱۳۱

آیت میں ارشاد ہو رہا ہے کہ سکھ تو اللہ کی طرف سے ضرور ہے، لیکن دکھ خود تمہاری طرف سے ہے۔ اس میں بادی النظر میں ایک تضاد بیانی دکھائی دیتی ہے۔

جواب: اس کائنات میں سب پر اللہ کا فیض جاری ہے۔ البتہ ظرف میں گنجائش اور لیاقت ضروری ہے کہ وہ اس قابل ہو جائے کہ اللہ کا فیض حاصل کر سکے۔ اگر ظرف میں فیض الٰہی کے لیے گنجائش اور قابلیت موجود ہے تو یہ سکھ ہے، جو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر ظرف میں گنجائش اور قابلیت نہیں ہے تو اللہ کا فیض حاصل نہیں ہو سکتا، یہ دکھ ہے۔ اس کا مسئول و ذمہ دار خود ظرف ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ...[1]

ایسا اس لیے ہوا کہ اللہ جو نعمت کسی قوم کو عنایت فرماتا ہے، اس وقت تک اسے نہیں بدلتا جب تک وہ خود اسے نہیں بدلتے۔

لہٰذا یہ بات بھی درست ہے کہ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے کہ ظرف میں قابلیت نہ ہونے کی وجہ سے اللہ فیض بند کرتا ہے۔ یہ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ کے تحت ہے اور ظرفیت میں گنجائش پیدا نہ کرنا خود بندے کی اپنی کوتاہی ہے۔ یہ مِنْ نَفْسِكَ کے تحت ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اسباب وسائل کی طرف دیکھو تو سب اللہ کی طرف سے ہیں۔ قاتل کے بازو میں طاقت، تلوار میں روانی وغیرہ اللہ کی طرف سے، لیکن ان اسباب و وسائل کا استعمال بندے کی طرف سے ہے کہ اس نے اپنے بازو کی قوت اور تلوار کی روانی کو ایک بے گناہ کے قتل میں استعمال کیا ہے۔ لہٰذا فراہمی وسائل کے تحت كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ہے اور استعمال و اختیار کے تحت مِن نَفسِكَ ہے۔

اہم نکات

۱۔ اس آیت میں مومن کو یہ بتایا گیا ہے کہ جہاں اس کائنات میں صرف اللہ ہی کی حاکمیت ہے، وہاں انسان کو درپیش مسائل میں بھی کامیابی و ناکامی کی ذمہ داری خود انسان پر عائد ہوتی ہے۔ عقیدۂ جبر کے ماننے والوں کی طرح ناکامیوں کو تقدیر کے ذمے ڈال کر خود کو فارغ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ مومن انسان اپنے اعمال کا خود ذمے دار ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿۸۰﴾

۸۰۔ جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے منہ پھیر لیا تو ہم نے آپ کو ان کا نگہبان بنا کر تو نہیں بھیجا۔

---
[1] ۸ انفال: ۵۳

تشریح کلمات

حفیظ:　نگہبان

تفسیر آیات

۱۔ مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ: خوشدلی کے ساتھ تابعداری کرنے کو اطاعت کہتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں کرہ آتا ہے، جس کے معنی ناگواری اور کراہت قلبی کے ساتھ ایک کام کو سرانجام دینے کے ہیں۔ لہٰذا جو رسول (ص) کی اطاعت کرے گا، وہ کسی جبر وقہر کی وجہ سے نہ ہوگی بلکہ دل سے ہوگی۔ رسول (ص) کی اطاعت دل سے اس وقت ہو سکتی ہے جب ان (ص) کے تمام فرامین کو اللہ کی جانب سے مان لے۔ اسی وجہ سے رسول (ص) کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ اگر کوئی دل سے رسولؐ کی اطاعت نہیں کرتا تو اسلام تعقل و تفکر کا دین ہے، فَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ حَفِیۡظًا، یہاں کسی قسم کے جبر و اکراہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا رسول (ص) صرف اللہ کا پیغام پہنچانے کے ذمے دار ہیں۔ اس پیغام کو طاقت کے ذریعے منوانے کے ذمے دار نہیں ہیں، کیونکہ اسلام ایمان قلبی اور منطق عقلی سے مربوط ہے، جبر اور طاقت سے نہیں۔

اہم نکات

۱۔ رسولؐ کی اطاعت سے ہی اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ رسولؐ سے اختلاف کر کے اللہ کی اطاعت ممکن نہیں ہے۔

وَ یَقُوۡلُوۡنَ طَاعَۃٌ ۫ فَاِذَا بَرَزُوۡا مِنۡ عِنۡدِکَ بَیَّتَ طَآئِفَۃٌ مِّنۡہُمۡ غَیۡرَ الَّذِیۡ تَقُوۡلُ ؕ وَ اللّٰہُ یَکۡتُبُ مَا یُبَیِّتُوۡنَ ۚ فَاَعۡرِضۡ عَنۡہُمۡ وَ تَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیۡلًا ﴿۸۱﴾

۸۱۔ اور یہ لوگ (منہ پر تو) کہتے ہیں: اطاعت کے لیے حاضر (ہیں) لیکن جب آپ کے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ آپ کی باتوں کے خلاف رات کو مشورہ کرتا ہے، یہ لوگ راتوں کو جو مشورہ کرتے ہیں اللہ اسے لکھ رہا ہے، پس (اے رسول) آپ ان کی پرواہ نہ کریں اور اللہ پر بھروسا کریں اور کارسازی کے لیے اللہ کافی ہے۔

تشریح کلمات

بَیَّتَ:　رات کے وقت کسی کام کی تدبیر سوچنا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَيَقُوۡلُوۡنَ طَاعَةٌ: سلسلۂ کلام ضعیف الایمان افراد کے بارے میں جاری ہے کہ ان میں سے ایک گروہ دو رخی سے کام لیتے ہوئے حضور (ص) کے سامنے ان کے ہر امر پر لبیک کہتا ہے، لیکن وہ راتوں کو اپنی خصوصی محافل میں حکم رسول (ص) کے خلاف سرگوشیاں کرتے ہیں۔

۲۔ فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ: رسول (ص) کے لیے حکم ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اس قسم کے لوگوں کو عیاں نہ کریں بلکہ انہیں نظر انداز کریں۔ یعنی ان کے اس عمل کو خاطر میں نہ لائیں، ان کی ان خفیہ سازشوں اور سرگوشیوں پر اثر مرتب کر کے انہیں اپنی صفوں سے دور نہ کیا جائے یا ان کے اس اندرونی راز کو فاش کر کے معاشرے میں رسوا نہ کیا جائے، بلکہ ان سے تغافل برتیں اور ان کو مسلمانوں کی صفوں میں محفوظ رکھیں۔

یہ آیت ضعیف الایمان مسلمانوں کے بارے میں ہے۔ جیسا کہ صاحب تفسیر المنار نے بھی یہی مؤقف اختیار کیا ہے۔ لہٰذا فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ سے مراد منافقین نہیں ہیں کہ جَاهِدِ الۡكُفَّارَ وَالۡمُنٰفِقِيۡنَ [1] کے ذریعے اس آیت کو منسوخ سمجھا جائے۔

اہم نکات

۱۔ عصر رسالت (ص) کے مسلمانوں کے حالات اور ان کے درجات ایمان بیان کرنے میں آنے والی نسلوں کے لیے درسہائے عبرت ہے۔

۲۔ رسول اسلام منافقوں کو بھی اپنی صفوں سے نہیں نکالتے تھے۔ ضعیف الایمان کو تو ہر صورت میں ساتھ رکھتے تھے: فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ ....

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ وَلَوۡ كَانَ مِنۡ عِنۡدِ غَيۡرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوۡا فِيۡهِ اخۡتِلَافًا كَثِيۡرًا ﴿۸۲﴾

۸۲۔ کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے؟ اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں بڑا اختلاف پاتے۔

تشریح کلمات

یتدبر: تدبر عاقبت اندیشی کو کہتے ہیں۔

---

[1] ۹ توبہ: ۷۳ و ۶۶ تحریم: ۹۔ کفار اور منافقین سے لڑو۔

تفسیر آیات

۱۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ: یہ لوگ جو رسول خدا (ص) کے احکام پر توجہ نہیں دیتے اور ان کے فرامین کے خلاف رات کو سرگوشیاں کرتے ہیں، اگر قرآن کے بیان کردہ حقائق میں غور کرتے تو ان کا ایمان پختہ ہو جاتا اور حکم رسول (ص) کی دل سے اطاعت کرتے۔ وہ یہ تو غور کریں:

۲۔ وَلَوۡ کَانَ مِنۡ عِنۡدِ غَیۡرِ اللّٰہِ:

- اگر یہ قرآن محمد (ص) کی طرف سے ہوتا تو اس میں بیان کردہ ماضی کی داستانوں اور آنے والے حالات کی پیشگوئیوں میں فرق ہوتا۔

- اصول، عقائد اور فروعی احکام میں فرق ہوتا۔
- آداب و اخلاق اور اجتماعی و سیاسی مسائل میں اختلاف آتا۔

- آسمانوں، زمین اور کائنات کے بارے میں بیان کردہ حقائق میں تضاد بیانی ہوتی۔
- احوال آخرت، حساب و کتاب، ثواب و عقاب، جہنم و جنت کے بارے میں بیانات میں یکسوئی نہ ہوتی۔

- ۲۳ سالوں پر محیط مختلف حالات میں پیش کردہ اقوال و سیرت میں ناہم آہنگی ہوتی۔
- حالت امن، حالت جنگ، حالت سفر اور حالت تنگی و حالت فراخی میں بیان کردہ دستورات میں اضطراب ہوتا۔
- مکی و مدنی، قدیم و جدید، محکم و متشابہ، اجمال و تفصیل، اجتماعی و انفرادی قوانین میں تضادات پیش آتے۔
- کسی جگہ بشری کمزوری نظر آتی۔

- رائے میں تبدیلی آتی، نظر ثانی اور اصلاح کی ضرورت پیش آتی، جیسا کہ تمام شعراء اور مفکرین کو پیش آتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ قرآن خود اپنی حقانیت پر دلیل ہے۔

وَ اِذَا جَآءَهُمۡ اَمۡرٌ مِّنَ الۡاَمۡنِ اَوِ الۡخَوۡفِ اَذَاعُوۡا بِهٖ ؕ وَ لَوۡ رَدُّوۡهُ اِلَی

۸۳۔ اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی خبر پہنچتی ہے تو وہ اسے خوب پھیلاتے ہیں اور

الرَّسُوۡلِ وَ اِلٰۤی اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡهُمۡ لَعَلِمَهُ الَّذِیۡنَ یَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ مِنۡهُمۡ ؕ وَ لَوۡ لَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَیۡکُمۡ وَ رَحۡمَتُهٗ لَاتَّبَعۡتُمُ الشَّیۡطٰنَ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۸۳﴾

اگر وہ اس خبر کو رسول اور اپنے میں سے صاحبان امر تک پہنچا دیتے تو ان میں سے اہل تحقیق اس خبر کی حقیقت کو جان لیتے اور اگر تم پر اللہ کا فضل نہ ہوتا اوراس کی رحمت نہ ہوتی تو چند ایک افراد کے سوا باقی تم سب شیطان کے پیروکار بن جاتے۔

تشریح کلمات

یستنبط (ن ب ط) استنباط، استخراج۔ دراصل کنواں کھودنے کے بعد پہلی دفعہ جو پانی نکالا جاتا ہے اسے نبط کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

یہ آیت بھی اکثر حضرات کے نزدیک ضعیف الایمان مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ تفسیر المنار نے یہی مؤقف اختیار کیا ہے۔

یہ لوگ اسلامی مرکز میں رونما ہونے والے عسکری اسرار و رموز سے مربوط ہر بات کو پھیلا دیتے تھے۔ جس سے بہت سے راز فاش ہو جاتے اور مسلمانوں کی صفوں میں اس افواہ سازی کے نتیجہ میں بدامنی پھیلتی تھی۔ اس آیت میں ان کے لیے حکم آیا کہ وہ اس قسم کی خبروں کے بارے میں مرکز کی طرف رجوع کیا کریں اور اس کے بارے میں مرکز سے ہدایات لے لیا کریں۔ چونکہ مرکز یعنی رسول (ص) اور صاحبان امر اس خبر کے پس منظر اور حقائق سے آگاہ ہیں۔

یہاں آیہ اَطِیۡعُوا کی طرح اللہ کی طرف رجوع کرنے کا حکم نہیں، کیونکہ یہاں تشریعی احکام کی بات نہیں ہو رہی، بلکہ انتظامی اور سیاسی و اجتماعی امور کا ذکر ہے۔

ان انتظامی امور میں رسول (ص) اور صاحبان امر ہی ایسی خبروں کے حقائق اور پس منظر سے آگاہ ہیں، وہی ان خبروں کے بارے میں بہتر بتا سکتے ہیں، لہٰذا یہاں صاحبان امر سے مراد وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اسلامی عسکری و سیاسی نظام کے محور میں ہوں اور یہ مقام وحی اور اس کی نزدیک ترین ہستیاں ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ آیہ اَطِیۡعُوا میں اس کی تفصیل کا ذکر ہو چکا ہے۔

وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ کی آیت کے ہر جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت منافقین کے بارے نہیں ہے کیونکہ منافقین اللہ کے فضل و رحمت سے مستفید نہیں ہو سکتے۔

استنباط کا لفظ فقہا کی جدید اصطلاح ہے، جو شرعی دلائل سے احکام کا استخراج کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ عصر نزول قرآن میں یہ لفظ انہی فقہی اصطلاحی معنوں میں ہرگز استعمال نہیں ہوتا تھا۔

تعجب کا مقام یہ ہے کہ اہل سنت کے قدیم و جدید اکثر مفسرین نے اس آیت سے قیاس کی حجیت پر استدلال کیا ہے کہ جہاں قرآن وسنت میں دلیل نہ ملے تو ذاتی رائے قیاس کے ذریعے استنباط (استخراج) احکام واجب ہے اور ساتھ یہ مؤقف بھی اختیار کیا کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریم (ص) بھی اجتہاد سے کام لینے پر مکلّف تھے۔ ملاحظہ ہو احکام القرآن جصاص و تفسیر رازی۔ اس طرح ہر نئی اصطلاح سے قرآن کی تفسیر کرنے سے قرآنی تعلیمات کا ایک معتدبہ حصہ ان حضرات کی غلط فہمی کا شکار ہو گیا۔ چنانچہ صاحب تفسیر المنار بھی اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

هذا شاهد من افصح الشواهد على ما بينا من سبب غلط المفسرين و بعدهم عن فهم كثير منايات الكتاب المبين بتفسيره بالاصطلاحات المستحدثة۔[1]

یہ بات یعنی جدید اصطلاحات سے قرآن کی تفسیر مفسرین کی غلطی اور قرآن کی بہت سی آیات کی فہم سے ان کی دوری پر واضح ترین گواہ ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ صاحب المنار خود بھی جدید سائنسی علوم سے بہت زیادہ متاثر ہیں اور بہت سے معجزات کی مادی توجیہ و تفسیر کرتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ مرحلۂ نفاذ و عمل میں رسولؐ اور اولوالامر کی طرف رجوع کرنا لازم ہے۔

۲۔ اس آیت سے قیاس پر استدلال سے معلوم ہوا کہ قیاس (ذاتی رائے) پر دلیل بھی ذاتی رائے ہے۔

۳۔ حق کے خلاف منفی پروپگنڈا باطل کا ہمیشہ وطیرہ رہا ہے۔ اَذَاعُوۡا بِہٖ...

فَقَاتِلۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۚ لَا تُکَلَّفُ اِلَّا نَفۡسَکَ وَ حَرِّضِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۚ عَسَی اللّٰہُ اَنۡ یَّکُفَّ بَاۡسَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ؕ وَ اللّٰہُ اَشَدُّ بَاۡسًا وَّ اَشَدُّ تَنۡکِیۡلًا ﴿۸۴﴾

۸۴۔ (اے رسول) راہ خدا میں قتال کیجیے، آپ پر صرف اپنی ذات کی ذمے داری ڈالی جاتی ہے اور آپ مومنین کو ترغیب دیں، عین ممکن ہے کہ اللہ کفار کا زور روک دے اور اللہ بڑا طاقت والا اور سخت سزا دینے والا ہے۔

---

[1] المنار ۵: ۳۰۱

تشریح کلمات

حَرِّضِ: تحریض۔ کسی چیز سے خرابی اور بگاڑ کو دور کر دینا۔

تفسیر آیات

گزشتہ آیات سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ جس مشکل دور سے رسول خدا (ص) گزر رہے تھے، اس وقت مسلمانوں کی صفوں میں ایسے لوگوں کی خاصی تعداد موجود تھی جو یا تو منافق تھے یا ضعیف الایمان اور منافقین کے ہمنوا تھے۔ صرف راسخ الایمان مومنین کی ایک جماعت جہاد کے لیے آمادہ تھی۔ اندریں حالات رسول خدا (ص) کے لیے یہ حکم نازل ہوتا ہے کہ قتال کے لیے بنفس نفیس آمادہ ہو جائیں۔

۱۔ فَقَاتِلۡ: یعنی لوگوں کی طرف سے جہاد کے لیے آمادگی نہ ہونے کے پیش نظر خود رسول اللہؐ کو قتال کا حکم ملتا ہے کہ اور کوئی آمادۂ جہاد نہ ہو، آپ خود قتال کے لیے نکلیں۔

چنانچہ اس آیت کے نزول کے بعد ہر جنگ میں رسول خدا (ص) خود جنگ کی قیادت فرماتے تھے۔

۲۔ وَحَرِّضِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ: آپ مومنوں کو جہاد کی ترغیب دیں۔ جہاد کی فضیلت بیان کر کے جہاد نہ کرنے والوں کا انجام بیان فرما کر، حَرِّضِ کے بعد جس چیز کی ترغیب دینا ہے، اس کا ذکر نہیں کیا۔ وَحَرِّضِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کے بعد علی القتال نہیں فرمایا۔ چونکہ یہ بات سیاق سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔

۳۔ عَسَی اللّٰہُ اَنۡ یَّکُفَّ بَاۡسَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: لفظ عَسَی کے معنی ''امید ہے''، ''ممکن ہے'' ہیں۔ اللہ کی طرف امید کا اظہار اس کے واقع ہونے کی ضمانت ہے۔ چنانچہ بدر صغریٰ میں یہ وعدہ پورا ہوگیا۔ ابوسفیان کے لشکر نے مقابلے کے لیے نکلنے کی جرات نہیں کی۔

احادیث

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ اللّٰہَ کَلَّفَ رَسُوۡلَ اللّٰہِ (صلی اللّٰہ علیہ و آلہ و سلّم) مَا لَمۡ یَکَلِّفۡہُ اَحَداً مِنۡ خَلۡقِہِ، کَلَّفَہُ اَنۡ یَخۡرُجَ عَلَی النَّاسِ کُلِّھِمۡ وَحۡدَہُ بِنَفۡسِہِ اِنۡ لَمۡ یَجِدۡ فِئَۃً تُقَاتِلُ مَعَہُ۔[1]

بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ایسی ذمہ داری دی ہے جو اپنی مخلوق میں سے کسی کو نہ دی۔ پھر تمام لوگوں کے مقابلے میں تنہا (رسول کو) بنفس نفیس جہاد کے لیے نکلنے کا حکم دیا خواہ ساتھ لڑنے والا کوئی نہ ہو۔

اہم نکات

۱۔ صرف رسول اللہ (ص) کو بنفس نفیس قتال کا حکم ملتا ہے۔

---

[1] اصول الکافی ۴ : ۲۷

مَنۡ یَّشۡفَعۡ شَفَاعَۃً حَسَنَۃً یَّکُنۡ لَّہٗ نَصِیۡبٌ مِّنۡہَا ۚ وَ مَنۡ یَّشۡفَعۡ شَفَاعَۃً سَیِّئَۃً یَّکُنۡ لَّہٗ کِفۡلٌ مِّنۡہَا ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ مُّقِیۡتًا ﴿۸۵﴾	۸۵۔ جو شخص اچھی بات کی حمایت اور سفارش کرتا ہے وہ اس میں سے حصہ پائے گا اور جو بری بات کی حمایت اور سفارش کرتا ہے وہ بھی اس میں سے کچھ حصہ پائے گا اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

تشریح کلمات

شَفَاعَۃً: (ش ف ع) دوسرے کے ساتھ اس کی مدد یا سفارش کرتے ہوئے مل جانے کو کہتے ہیں۔

کفیل: (ك ف ل) نصیب۔ حصہ۔

مقیت: (م ق ت) قادر اور مقتدر۔

تفسیر آیات

اس آیت میں جنگ کے لیے لوگوں کو آمادہ کرنے کے لیے فضا سازی کی ترغیب ہے۔ جب رسول خدا (ص) کو بنفس نفیس قتال کا حکم دے دیا تو اس کے بعد فرمایا کہ جو کارہائے خیر میں مدد دیتا ہے یا مدد کی سفارش کرتا ہے، وہ بھی اس کار خیر میں حصے دار ہے۔ اسی طرح برائی میں مدد دینے والا بھی اس میں شریک اور حصے دار ہے۔

اس آیت کی ایک تفسیر یہ ہے کہ شفاعت سے مراد کمک رسانی ہے اور اصحاب رسول (ص) کو سمجھانا مقصود ہے کہ رسول (ص) کو تنہا لڑنے کا حکم مل چکا ہے، اب جو ان کے ساتھ مدد کرے گا، اسے بھی جہاد فی سبیل اللہ کے ثواب کا حصہ ملے گا اور جو مشرکین کی مدد کرے گا، اسے گناہ میں حصہ ملے گا۔

آیت کے عموم میں اچھی باتوں کی حمایت کرنے اور بری باتوں کی حمایت نہ کرنے کی ترغیب ہے۔

اہم نکات

۱۔ ابلاغ عامہ کو جنگوں میں اہم کردار حاصل ہے۔

وَ اِذَا حُیِّیۡتُمۡ بِتَحِیَّۃٍ فَحَیُّوۡا بِاَحۡسَنَ مِنۡہَاۤ اَوۡ رُدُّوۡہَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ حَسِیۡبًا ﴿۸۶﴾	۸۶۔ اور جب تمہیں سلام کیا جائے تو تم اس سے بہتر سلام کرو یا انہی الفاظ سے جواب دو، اللہ یقیناً ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَیَجۡمَعَنَّکُمۡ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ لَا رَیۡبَ فِیۡهِ ؕ وَ مَنۡ اَصۡدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِیۡثًا ﴿۸۷﴾	۸۷۔ اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تم سب کو بروز قیامت جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ضرور جمع کرے گا اور اللہ سے بڑھ کر سچی بات کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟

تشریح کلمات

تحیة (ح ی ی) حیاۃ کا مصدر ہے۔ اس کے معنی کسی کو حیاك اللّٰہ کہنے کے ہیں۔ یعنی اللہ تجھے زندہ رکھے۔ کیونکہ تحیۃ حیات سے مشتق ہے، جو دعائے حیات کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ (راغب)

تفسیر آیات

ربط آیات اس طرح بنتا ہے کہ سلسلۂ کلام جہاد کے بارے میں ہے اور مسلمان ہر طرف سے دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں اور کشیدگی بڑھ رہی ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں کو مبلغ اور داعی کی حیثیت سے ایک اخلاق اور شائستگی کا درس دیا جا رہا ہے کہ اگر کوئی تمہیں سلام و تحیت پیش کرے تو بد اخلاقی کے ساتھ پیش نہ آؤ، بلکہ اس سلام و تحیۃ کا بہتر شائستگی کے ساتھ جواب دو:

فَاصۡفَحۡ عَنۡهُمۡ وَ قُلۡ سَلٰمٌ ...۔[1] پس ان سے درگزر کیجیے اور سلام کہد یجیے۔

تحیۃ و سلام کی رسم تو ہر قوم و ملت میں موجود ہے، لیکن دیگر اقوام میں سلام کا مفہوم یہ ہے کہ ایک حقیر شخص کسی کی بڑائی کے سامنے جھک جائے اور اس کی تعظیم کرے۔ لہٰذا ان اقوام میں کم درجہ رکھنے والوں پر فرض بنتا ہے کہ وہ بڑا درجہ رکھنے والوں کو سلام کریں اور یہی لوگ سلام میں پہل کریں۔

اسلام نے تحیۃ و تسلیم کے آداب میں اس قسم کی تمام تفریق کو مٹا کر اسے امن و سلامتی، صلح و آشتی اور مساوات و مؤاسات کا شعار قرار دیا۔ مثلاً کسی گھر میں داخل ہوتے وقت سلام کرنے کے بلا تفریق درجات آداب بتائے:

فَاِذَا دَخَلۡتُمۡ بُیُوۡتًا فَسَلِّمُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ تَحِیَّۃً مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ مُبٰرَکَۃً طَیِّبَۃً ...۔[2]	اور جب تم کسی گھر میں داخل ہو تو اپنے آپ پر سلام کیا کرو اللہ کی طرف سے بابرکت اور پاکیزہ تحیت کے طور پر۔

خود سرور کائنات کے لیے یہ دستور ملا:

وَ اِذَا جَآءَکَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰیٰتِنَا فَقُلۡ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ ...۔[3]	اور جب آپ کے پاس ہماری آیات پر ایمان لانے والے لوگ آ جائیں تو ان سے کہیے: سلام علیکم ....

---
[1] ۴۳ زخرف: ۸۹ [2] ۲۴ نور: ۶۱ [3] ۶ انعام: ۵۴

چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ سلام کرنے میں رسالتمآب (ص) پر کوئی سبقت نہیں لے سکتا تھا۔

اس آیت میں آداب سلام یہ بتایا ہے کہ اگر کوئی سلام کرے تو جواب سلام بہتر انداز میں دو۔ مثلاً سلام کرنے والا السلام علیکم کہدے تو جواب میں و علیکم السلام و رحمة اللّٰه و برکاته کہو اور انہی الفاظ میں جواب دینا تو واجب ہے۔

سلام کرنا مستحب ہے۔ سلام کا جواب دینا واجب ہے۔ جب کہ بہتر انداز میں جواب دینا مستحسن ہے۔ کسی نے اگر حالت نماز میں سلام کیا تو بھی جواب سلام واجب ہے۔ البتہ اس صورت میں ایک ایسی آیت پڑھے جس میں لفظ سلام موجود ہو۔ مثلاً سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ طِبۡتُمۡ ...۔[1] اگر کوئی نماز میں مشغول ہو، اس کو سلام نہیں کرنا چاہیے۔

احادیث

رسول اللہ (ص) سے روایت ہے:

السَّلَامُ تَطَوُّعٌ وَ الرَّدُّ فَرِيضَةٌ۔[2]

سلام کرنا مستحب ہے اور جواب واجب ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

يُسَلِّمُ الصَّغِيرُ عَلَى الْكَبِيرِ وَ الْمَارُّ عَلَى الْقَاعِدِ، وَ الْقَلِيلُ عَلَى الْكَثِيرِ۔[3]

چھوٹے بڑوں کو، راہ گیر بیٹھے ہوئے لوگوں کو اور تھوڑے لوگ زیادہ لوگوں کو سلام کریں۔

دوسری روایت میں فرمایا:

يُسَلِّمُ الرَّاكِبُ عَلَى الْمَاشِي وَ الْمَاشِي عَلَى الْقَاعِدِ وَ إِذَا لَقِيَتْ جَمَاعَةٌ جَمَاعَةً سَلَّمَ الْأَقَلُّ عَلَى الْأَكْثَرِ وَ إِذَا لَقِيَ وَاحِدٌ جَمَاعَةً سَلَّمَ الْوَاحِدُ عَلَى الْجَمَاعَةِ۔[4]

سوار پیدل کو، چلنے والا بیٹھے ہوئے کو، اگر ایک جماعت دوسری جماعت سے ملاقات کرے تو تھوڑے زیادہ کو اور ایک شخص جماعت کو سلام کرے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک اور روایت میں آیا ہے:

لِلْمُسْلِمِ عَلَى أَخِيهِ مِنَ الْحَقِّ أَنْ يُسَلِّمَ عَلَيْهِ إِذَا لَقِيَهُ وَ يَعُودَهُ إِذَا مَرِضَ وَ يَنْصَحَ لَهُ إِذَا غَابَ وَ يُسَمِّتَهُ إِذَا عَطَسَ يَقُولَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَ يَقُولَ لَهُ يَرْحَمُكَ اللَّهُ...۔[5]

مسلمان کے لیے اپنے بھائی کے ذمے حق عائد ہوتا کہ وہ ملاقات کے وقت اس پر سلام کرے، بیماری کی صورت میں عیادت کرے، غیر حاضری میں بھی مخلص رہے، جب چھینک آئے تو اس کو دعا دے (خود چھینکنے والا) الحمد اللّٰه رب العالمین کہے اور دوسرا یرحمك اللّٰه کہے۔

---

[1] ۳۹ زمر: ۷۳۔ تم پر سلام ہو، تم خوب رہے۔
[2] اصول الکافی ۲: ۶۴۴
[3] حوالہ سابق ۲: ۶۴۶
[4] حوالہ سابق ۲: ۶۴۷
[5] حوالہ سابق ۲: ۶۵۳ باب العطاس و التسمیت۔

دوسری روایت میں ہے کہ یغفرك اللہ کہدے۔

اہم نکات

۱۔ سلام یعنی امن و سلامتی کی دعا دینا اسلامی ثقافت کا اہم حصہ ہے۔

۲۔ سلام کرنا مستحب، جواب سلام واجب ہے۔

فَمَا لَكُمۡ فِی الۡمُنٰفِقِیۡنَ فِئَتَیۡنِ وَاللّٰهُ اَرۡكَسَهُمۡ بِمَا كَسَبُوۡا ؕ اَتُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَهۡدُوۡا مَنۡ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَلَنۡ تَجِدَ لَهٗ سَبِیۡلًا ﴿۸۸﴾

۸۸۔ پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم منافقین کے بارے میں دو گروہ ہو گئے ہو؟ اور اللہ نے ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے انہیں اوندھا کر دیا ہے، کیا تم لوگ اللہ کے گمراہ کردہ کو ہدایت دینا چاہتے ہو؟ حالانکہ جسے اللہ گمراہ کر دے اس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پاؤ گے۔

تشریح کلمات

ارکس: (ر ك س) کسی چیز کو اس کے سر پر الٹا کر دینا۔ کسی مصیبت سے رہائی کے بعد دوبارہ اس میں پھنس جانا۔

تفسیر آیات

۱۔ فَمَا لَكُمۡ: یہاں سے آگے منافقین کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور ربط آیت اس طرح ہے کہ جب اچھی بات کی مدد اور سفارش کرنے والے کو نیکی میں حصہ اور بری بات کی سفارش کرنے والے کو گناہ میں حصہ مل جاتا ہے تو پھر تم منافقین کے بارے میں دو گروہ کیوں ہو گئے ہو۔

۲۔ وَاللّٰهُ اَرۡكَسَهُمۡ: ان کی اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں دوبارہ کفر و ضلالت کی اتھاہ گہرائی میں اوندھا کر دیا۔ جب اللہ نہیں چاہتا تو تم کیسے ان کی ہدایت کر سکتے ہو۔

شان نزول: حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

> کچھ لوگ مکہ سے مدینہ آئے اور یہ ظاہر کیا کہ ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ پھر مکہ واپس چلے گئے، کیونکہ انہیں مدینہ راس نہ آیا۔ پھر مشرکین کا سامان لے کر یمامہ چلے گئے تو مسلمانوں نے ان پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ آپس میں

اختلاف ہوا۔ کچھ لوگوں نے کہا یہ لوگ مسلمان ہیں، جب کہ کچھ لوگوں نے کہا یہ لوگ مشرکین ہیں۔ اس اختلاف پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1]

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾

۸۹۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ویسے ہی کافر ہو جاؤ جیسے کافر وہ خود ہیں تاکہ تم سب یکساں ہو جاؤ، لہٰذا ان میں سے کسی کو اپنا حامی نہ بناؤ جب تک وہ راہ خدا میں ہجرت نہ کریں، اگر وہ (ہجرت سے) منہ موڑ لیں تو انہیں پکڑ لو اور جہاں پاؤ قتل کر دو اور ان میں سے کسی کو اپنا حامی اور مددگار نہ بناؤ۔

تفسیر آیات

۱۔ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ: جن لوگوں کے بارے میں تمہارے درمیان دو مؤقف وجود میں آ گئے، وہ نہ صرف اہل ایمان نہیں ہیں، بلکہ وہ تمہارے ایمان کے بھی خلاف ہیں۔

فَلَا تَتَّخِذُوْا: ان میں کسی کو اپنا حامی و ناصر نہ بناؤ، جب تک وہ راہ خدا میں ہجرت نہ کرے۔ یعنی یہ لوگ اگر کفر چھوڑ کر ایمان لے آتے ہیں تو ان سے رشتہ نصرت و حمایت قائم نہیں ہو سکتا، جب تک وہ ایمان کے بعد ہجرت نہ کریں۔ چنانچہ سورۃ انفال آیت ۷۲ میں فرمایا:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ....

اور جو لوگ ایمان تو لائے مگر انہوں نے ہجرت نہیں کی تو ان کی ولایت سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک وہ ہجرت نہ کریں ....[2]

ہجرت کے بعد ایمانی رشتہ قائم ہوتا ہے اور صلح و جنگ ایک ہو جاتی ہے۔ ایک دوسرے کے حامی و ناصر ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے۔ جن لوگوں نے فتح مکہ سے پہلے ہجرت نہیں کی، ان کے ساتھ باقی مؤمنین کا رشتہ ولایت قائم نہیں ہے۔

۲۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا: اگر یہ لوگ ہجرت کرنے سے منہ موڑ لیں۔ بعض کے نزدیک اگر وہ ایمان کی طرف

---

[1] مجمع البیان [2] تفصیل سورۃ انفال آیت ۷۲ میں ملاحظہ فرمائیں۔

کرنے سے منہ موڑ لیں تو ان کو جہاں پاؤ پکڑ لو اور قتل کرو۔

۳۔ وَ لَا تَتَّخِذُوۡا مِنۡہُمۡ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیۡرًا: ان کو اپنا حامی اور ناصر مت بناؤ۔ کیونکہ ہجرت نہ کرنے کی صورت یہ لوگ میں امت مسلمہ کے ممبر نہیں ہوتے۔

اِلَّا الَّذِیۡنَ یَصِلُوۡنَ اِلٰی قَوۡمٍۭ بَیۡنَکُمۡ وَ بَیۡنَہُمۡ مِّیۡثَاقٌ اَوۡ جَآءُوۡکُمۡ حَصِرَتۡ صُدُوۡرُہُمۡ اَنۡ یُّقَاتِلُوۡکُمۡ اَوۡ یُقَاتِلُوۡا قَوۡمَہُمۡ ؕ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَسَلَّطَہُمۡ عَلَیۡکُمۡ فَلَقٰتَلُوۡکُمۡ ۚ فَاِنِ اعۡتَزَلُوۡکُمۡ فَلَمۡ یُقَاتِلُوۡکُمۡ وَ اَلۡقَوۡا اِلَیۡکُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمۡ عَلَیۡہِمۡ سَبِیۡلًا ﴿۹۰﴾

۹۰۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایسے لوگوں سے جا ملیں جن کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو یا وہ اس بات سے دل تنگ ہو کر تمہارے پاس آ جائیں کہ تم سے لڑیں یا اپنی قوم سے لڑیں اور اگر اللہ چاہتا تو انہیں تم پر مسلط کر دیتا اور وہ تم سے ضرور لڑتے لہٰذا اگر وہ تم سے الگ رہیں اور تم سے جنگ نہ کریں اور تمہاری طرف صلح کا پیغام بھیجیں تو اللہ نے تمہارے لیے ان پر بالادستی کی کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ دو قسم کے منافقین کو اللہ نے اس حکم قتل سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

i۔ یَصِلُوۡنَ اِلٰی قَوۡمٍۭ: وہ منافق، جو ایسی قوم سے جا ملتے ہیں جس کے اور مسلمانوں کے درمیان معاہدہ ہے۔

ii۔ اَوۡ جَآءُوۡکُمۡ: وہ غیر جانبدار منافق، جو نہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور نہ ہی مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کرتے ہیں، بلکہ وہ امن و آشتی کا پیغام دیتے ہیں۔ ان دو صورتوں میں منافقین کا قتل جائز نہ ہو گا۔

۲۔ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰہُ: اگر اللہ چاہتا تو اس غیر جانبدار قوم کو بھی تم پر مسلط کر دیتا لیکن اللہ نے ان کو تم سے لڑنے نہیں دیا۔

۳۔ فَاِنِ اعۡتَزَلُوۡکُمۡ : اگر وہ تم سے الگ رہیں، تم سے جنگ نہ کریں اور صلح کا پیغام دیں تو اللہ نے تم کو ان پر بالا دستی نہیں دی ہے۔ یعنی جب کافر تم سے لڑنا نہیں چاہتے تو تم کو ان سے لڑنے کا حق نہیں ہے۔ آیت کے اس جملے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے کس قسم کی جنگ لڑی ہے۔ یعنی اسلام سے جنگ نہ کرنے والوں سے جنگ نہیں لڑی، صرف دفاعی جنگ لڑی ہے۔

اہم نکات

۱۔ اسلام امن کے ساتھ رہنے والے کافر اور منافقین کو امن دیتا ہے۔

سَتَجِدُوۡنَ اٰخَرِیۡنَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّاۡمَنُوۡکُمۡ وَ یَاۡمَنُوۡا قَوۡمَہُمۡ ؕ کُلَّمَا رُدُّوۡۤا اِلَی الۡفِتۡنَۃِ اُرۡکِسُوۡا فِیۡہَا ۚ فَاِنۡ لَّمۡ یَعۡتَزِلُوۡکُمۡ وَ یُلۡقُوۡۤا اِلَیۡکُمُ السَّلَمَ وَ یَکُفُّوۡۤا اَیۡدِیَہُمۡ فَخُذُوۡہُمۡ وَ اقۡتُلُوۡہُمۡ حَیۡثُ ثَقِفۡتُمُوۡہُمۡ ؕ وَ اُولٰٓئِکُمۡ جَعَلۡنَا لَکُمۡ عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنًا مُّبِیۡنًا ﴿۹۱﴾

۹۱۔ عنقریب تم دوسری قسم کے ایسے (منافق) لوگوں کو پاؤ گے جو تم سے بھی امن میں رہنا چاہتے ہیں اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہنا چاہتے ہیں لیکن اگر فتنہ انگیزی کا موقع ملے تو اس میں اوندھے منہ کود پڑتے ہیں، ایسے لوگ اگر تم لوگوں سے جنگ کرنے سے باز نہ آئیں اور تمہاری طرف صلح کا پیغام نہ دیں اور دست درازی سے بھی باز نہ آئیں تو جہاں کہیں وہ ملیں انہیں پکڑو اور قتل کرو اور ان پر ہم نے تمہیں واضح بالادستی دی ہے۔

تشریح کلمات

اُرۡکِسُوۡا: (ر ک س) کسی چیز کو اس کے سر پر الٹا کر دینا۔

تفسیر آیات

۱۔ سَتَجِدُوۡنَ اٰخَرِیۡنَ: دوسری قسم کے منافقین بھی ملیں گے۔ یہ منافقین بظاہر سابقہ منافقین کی طرح لگتے ہیں۔ وہ اظہار تو یہ کرتے ہیں ہم امن چاہتے ہیں لیکن ان کا ارادہ امن کا نہیں ہے بلکہ اس آیت میں ایسے موقع پرست گروہ کی نشاندہی ہے کہ مسلمانوں سے لڑنا ان کے مفاد میں نہیں ہے تو وہ نہیں لڑتے۔

۲۔ کُلَّمَا رُدُّوْۤا اِلَی الْفِتْنَۃِ: لیکن اگر موقع ہاتھ آ جائے تو جنگ میں اوندھے منہ کود جاتے ہیں۔ یہ لوگ پہلے مذکور منافقین کی طرح غیر جانبدار نہیں ہیں۔ وہ تم سے جنگ کرنے کے لیے موقع کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کو جہاں پاؤ قتل کرو۔

۳۔ فَاِنۡ لَّمۡ یَعۡتَزِلُوۡکُمۡ: یعنی یہ لوگ اگر تم سے الگ نہ رہیں یُلۡقُوۡۤا اِلَیۡکُمُ السَّلَمَ اور صلح کا پیغام نہ دیں وَیَکُفُّوۡۤا اَیۡدِیَہُمۡ اور دست درازی سے باز نہ آئیں، فَخُذُوۡہُمۡ ان کو گرفتار کرو وَاقۡتُلُوۡہُمۡ اور ان کو قتل کر دو۔

دیکھیے اسلامی جنگوں کی نوعیت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ اگر کافر اور مشرک مسلمانوں کے درپے ہوں، صلح نہ چاہتے ہوں اور دست درازی کرنے سے بھی باز نہ آئیں تو اس آتش فتنہ کو بجھا دو۔

۴۔ وَاُولٰٓئِکُمۡ جَعَلۡنَا لَکُمۡ عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنًا: مذکورہ بالا حالات میں جنگ لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے۔

وَمَا کَانَ لِمُؤۡمِنٍ اَنۡ یَّقۡتُلَ مُؤۡمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنۡ قَتَلَ مُؤۡمِنًا خَطَـًٔا فَتَحۡرِیۡرُ رَقَبَۃٍ مُّؤۡمِنَۃٍ وَّ دِیَۃٌ مُّسَلَّمَۃٌ اِلٰۤی اَہۡلِہٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ یَّصَّدَّقُوۡا ؕ فَاِنۡ کَانَ مِنۡ قَوۡمٍ عَدُوٍّ لَّکُمۡ وَ ہُوَ مُؤۡمِنٌ فَتَحۡرِیۡرُ رَقَبَۃٍ مُّؤۡمِنَۃٍ ؕ وَاِنۡ کَانَ مِنۡ قَوۡمٍۭ بَیۡنَکُمۡ وَ بَیۡنَہُمۡ مِّیۡثَاقٌ فَدِیَۃٌ مُّسَلَّمَۃٌ اِلٰۤی اَہۡلِہٖ وَتَحۡرِیۡرُ رَقَبَۃٍ مُّؤۡمِنَۃٍ ۚ فَمَنۡ لَّمۡ یَجِدۡ فَصِیَامُ شَہۡرَیۡنِ مُتَتَابِعَیۡنِ ۫ تَوۡبَۃً مِّنَ اللّٰہِ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ﴿۹۲﴾	۹۲۔ اور کسی مومن کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی دوسرے مومن کو قتل کر دے مگر غلطی سے اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے وہ ایک مومن غلام آزاد کرے اور مقتول کے ورثاء کو خونبہا ادا کرے مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں، پس اگر وہ مومن مقتول تمہاری دشمن قوم سے تھا تو (قاتل) ایک مومن غلام آزاد کرے اور اگر وہ مقتول ایسی قوم سے تعلق رکھتا تھا جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو تو اس کے ورثاء کو خونبہا دیا جائے اور ایک غلام آزاد کیا جائے اور جسے غلام میسر نہیں وہ دو ماہ متواتر روزے رکھے، یہ ہے اللہ کی طرف سے توبہ اور اللہ بڑا علم والا، حکمت والا ہے۔

تشریح کلمات

خَطَأً: (خ ط ء) غلطی۔ یہاں خطاء سے مراد غیر ارادی غلطی ہے، کیونکہ اس کے مقابلے میں عمداً کا لفظ آیا ہے۔

تفسیر آیات

اس آیہ شریفہ میں درج ذیل تعلیمات کا بیان ہے:

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ: مومن جب ایمان کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے تو اپنے برادر مؤمن کا قتل جائز نہیں ہے۔ البتہ یہ قتل اگر غیر ارادی طور پر غلطی سے سرزد ہوا ہو تو اس کا حکم درج ذیل صورتوں میں ہو گا:

i۔ وَمَنۡ قَتَلَ مُؤۡمِنًا خَطَـًٔا: اگر یہ قتل غیرارادی طور پر غلطی سے ہوا ہے تو ایک مومن کو غلامی سے آزاد کرنا ہو گا اور دیت یعنی خونبہا ادا کرنا ہو گا۔ ہاں اگر وارث معاف کر دے تو دیت دینا واجب نہیں ہے۔

ii۔ فَاِنۡ كَانَ مِنۡ قَوۡمٍ عَدُوٍّ لَّكُمۡ: اگر یہ مقتول کسی دشمن اسلام یعنی کافر قوم کا ایک مومن فرد تھا تو مومن غلام آزاد کرنا واجب ہے، مگر دیت دینا واجب نہیں ہے۔ کیونکہ دیت یعنی خونبہا وارث کو دینا ہوتا ہے، یہاں وارث کافر ہے اور کافر مومن کا وارث نہیں بن سکتا۔

iii۔ وَاِنۡ كَانَ مِنۡ قَوۡمٍۭ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهُمۡ مِّيۡثَاقٌ فَدِيَةٌ: اگر مقتول اس قوم کا فرد ہو جس کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ ہے تو اس صورت میں غلام آزاد کرنا ہو گا اور ساتھ خون بہا بھی دینا ہو گا۔ واضح رہے کہ یہاں خونبہا کی مقدار وہی ہو گی جو معاہدے میں طے ہے۔

iv۔ جو غلام آزاد کرنے پر قادر نہ ہو، وہ دو ماہ بلا فاصلہ روزے رکھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قتل کی تین قسمیں بنتی ہیں:

i۔ قتل عمد: جان بوجھ کر مومن کی جان لینا۔ اس کی سزا آخرت میں جہنم اور دنیا میں قصاص یا دیت ہے۔

ii۔ شبہ عمد: ضرب تو مثلاً جان بوجھ کر لگائی، مگر قتل کرنے کا ارادہ نہیں تھا اور وہ اسی ضرب سے اتفاقاً مر گیا۔ اس کی سزا دیت ہے اور قصاص نہیں ہے اور دیت بھی خود قاتل ادا کرے گا۔

iii۔ قتل خطاء: قتل کا ارادہ قطعاً نہیں تھا، اچانک زد میں آ گیا اور قتل ہو گیا۔ اس کی سزا بھی دیت ہے، مگر یہ دیت قاتل کے باپ کے قرابتداروں کے ذمے آئے گی کہ وہ ادا کریں۔

وَ مَنۡ يَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا ۹۳۔ اور جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کر دے تو اس

فَجَزَاۗؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اوراس کی لعنت ہو گی اور ایسے شخص کے لیے اس نے ایک بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تفسیر آیات

کسی مومن کو جان بوجھ کر جان سے مار دینے کی دوصورتیں ہوسکتی ہیں:

i۔ اگر مومن ہونے کی وجہ سے اس کا خون حلال سمجھ کر قتل کرتا ہے تو اس صورت میں قاتل ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ اس پر خدا کا غضب ہو گا اور وہ اس کی رحمت سے بھی دور ہو گا اور اس کی توبہ قبول نہیں ہو گی، جیسا کہ ہمارے زمانے (۱۴۲۵ھ) میں کچھ نام نہاد مسلمان، شیعوں کو شیعہ ہونے کے جرم میں قتل کر رہے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اس سے ان کو جنت ملے گی۔

ii۔ قتل کا محرک مقتول کا مومن ہونا نہ ہو اور نہ ہی اسے جائز القتل اور اس کا خون حلال سمجھ کر قتل کیا ہو تو اس صورت میں کیا اس قاتل کی توبہ قبول ہو گی یا نہیں؟ چند اقوال ہیں۔ اہل تحقیق کے نزدیک اس کی توبہ قابل قبول ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ...[1]

اللہ اس بات کو یقیناً معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ (کسی کو) شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے علاوہ دیگر گناہوں کو جس کے بارے میں وہ چاہے گا معاف کر دے گا۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ...[2]

یقیناً اللہ تمام گناہوں کو معاف فرماتا ہے....

ممکن ہے کہ یہ آیات مذکورہ آیت کے لیے مقید ثابت ہوں اور یہ گناہ قابل توبہ و مغفرت ہو۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

ان للّٰہ فی الارض حرمات حرمة کتاب اللّٰہ و حرمة رسول اللّٰہ و حرمة اهل البیت و حرمة الکعبة و حرمة المسلم و حرمة المسلم و حرمة المسلم۔[3]

اللہ کے لیے زمین میں چند ایک حرمتیں ہیں۔ کتاب اللہ کی حرمت، رسول اللہ کی حرمت، اہل البیت کی حرمت، کعبہ کی حرمت، مسلمان کی حرمت، مسلمان کی حرمت۔ مسلمان کی حرمت۔ (تین بار دہرایا)

اہم نکات

۱۔ ایمان کے جرم میں مومن کے قتل سے قاتل ابدی جہنمی بن جاتا ہے۔

---

[1] ۴ نساء: ۴۸　[2] ۳۹ زمر: ۵۳　[3] الاهوازی۔ المومن ص ۷۳

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا ضَرَبۡتُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوۡا وَلَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ اَلۡقٰۤى اِلَيۡكُمُ السَّلٰمَ لَسۡتَ مُؤۡمِنًا‌ ۚ تَبۡتَغُوۡنَ عَرَضَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا فَعِنۡدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيۡرَةٌ‌ ؕ كَذٰلِكَ كُنۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيۡكُمۡ فَتَبَيَّنُوۡا‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا ﴿۹۴﴾

۹۴۔ اے ایمان والو! جب تم راہ خدا میں (جہاد کے لیے) نکلو تو تحقیق سے کام لیا کرو اور جو شخص تمہیں سلام کرے، اس سے یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو، تم دنیاوی مفاد کے طالب ہو، جب کہ اللہ کے پاس غنیمتیں بہت ہیں، پہلے خود تم بھی تو ایسی حالت میں مبتلا تھے، پھر اللہ نے تم پر احسان کیا، لہٰذا تحقیق سے کام لو، یقیناً اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے۔

تشریح کلمات

ضَرَبۡتُمۡ: (ض ر ب) زمین میں چلنا۔ سفر کرنا۔

عَرَضَ: (ع ر ض) مال و دولت۔

تفسیر آیات

اس آیت کی شان نزول میں روایت ہے کہ رسول خدا (ص) نے جہاد کے لیے ایک چھوٹے سے لشکر کو روانہ کیا۔ لشکر والوں نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے پاس کافی مال ہے، اس مال کے لالچ میں اسے قتل کرنا چاہا۔ اس نے سلام کی اسلامی رسم بھی ادا کی اور کلمہ بھی زبان پر جاری کیا، لیکن مسلمانوں نے پھر بھی اسے قتل کر دیا۔ رسول اللہ (ص) کی جانب سے سرزنش پر عذر پیش کیا گیا کہ اس نے جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھ دیا تھا۔ آپ (ص) نے فرمایا: تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا کہ وہ دل سے کلمہ نہیں پڑھ رہا۔

شان نزول اگرچہ ایک واقعے سے مربوط ہے لیکن قرآن کی تعبیر اور الفاظ عمومیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا اس آیت سے درج ذیل احکام اور تاریخی حقائق سامنے آتے ہیں:

۱۔ فَتَبَيَّنُوۡا: مسلمانوں کے لیے حکم ہو رہا ہے کہ وہ کوئی کام بغیر تحقیق کے محض ظن و گمان کی بنیاد پر نہ کریں۔ سفر کا ذکر اس لیے کیا کہ دوسرے علاقوں میں انسان زیادہ تحقیق کی ضرورت محسوس کرتا ہے، ورنہ اپنے علاقے میں تو سب کی حقیقت حال کا عموماً سب کو علم ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ غیر سفر میں تحقیق کی ہمیشہ ضرورت نہیں ہوتی۔ فَتَبَيَّنُوۡا کے حکم میں ان لوگوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے، جو شیعوں کے

عقائد ونظریات پر تحقیق کیے بغیر ان کے خون سے ہاتھ رنگین کرتے ہیں۔

۲۔ وَلَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ اَلۡقٰۤی اِلَیۡکُمُ السَّلٰمَ لَسۡتَ مُؤۡمِنًا: تکفیر مسلم۔ اور جو شخص تمہیں سلام پیش کرے اس سے یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو۔ ابتدا میں سلام کرنا مسلمانوں کا شعار تھا، جس سے ایک دوسرے کو یہ اشارہ دیا کرتے تھے کہ میں بھی تمہارا ہم مذہب ہوں۔ لہٰذا آیت کا مفہوم یہ بنتا ہے: جو شخص اپنے آپ کو مسلمان بتائے، تم اسے مسلمان سمجھو اور اس بات میں نہ پڑو کہ وہ دل سے مسلمان ہوا ہے یا نہیں۔

اس آیت سے صریحاً ثابت ہوتا ہے کہ کلمہ گو اور اہل قبلہ تو بجائے خود، اسلامی آداب و شعائر کا اظہار کرنے والے پر بھی اسلامی احکام جاری ہوتے ہیں اور اس کا مال و جان محفوظ ہو جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہ کا نظریہ بھی یہی ہے کہ لا نکفر اهل القبلة بذنب۔ ہم اہل قبلہ کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہیں کہتے۔

صاحب تفسیر المنار جاہل اور تنگ نظر ملاؤں کے بارے میں درست فرماتے ہیں:

> کہاں یہ بات اور کہاں ان لوگوں کا کردار، جو نہ اپنے اسلام میں، نہ اپنے اعمال میں کتاب اللہ سے ہدایت حاصل کرتے ہیں اور اپنی خواہشات سے ذرا سا اختلاف کرنے والے اہل قبلہ کو کافر قرار دینے کے بڑے شوقین ہوتے ہیں، بلکہ صحیح اہل علم اور کتاب خدا و سنت رسول (ص) کی طرف صحیح دعوت دینے والوں کی بھی تکفیر کرتے ہیں۔ فليعتبر المعتبرون۔[1]

۳۔ عَرَضَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا: دنیاوی مفاد۔ اس آیہ شریفہ میں تکفیر مسلم کے پیچھے محرک، دنیاوی مفاد کو قرار دیا ہے۔ یعنی لوگ اہل قبلہ کو اس لیے کافر قرار دیتے ہیں کہ اسے قتل کر کے اس کے مال پر قبضہ کیا جائے یا اس تکفیری عمل سے عوام کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی جائے۔

۴۔ فَعِنۡدَ اللّٰہِ مَغَانِمُ کَثِیۡرَۃٌ: اللہ کے پاس غنیمتیں بہت ہیں کا مفہوم یہ ہے کہ دنیاوی مفاد اٹھانے والے کو اللہ کے پاس موجود غنائم سے محروم ہونا پڑے گا۔ یہاں لفظ غنیمت غیر جنگی فوائد کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔ تفصیل سورہ انفال آیت ۴۱ کے ذیل میں آئے گی۔

۵۔ کَذٰلِکَ کُنۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ: پہلے خود تم بھی ایسی حالت میں مبتلا تھے۔ یعنی شروع میں جب تم نے اسلام قبول کیا تو خود تمہیں بھی اسی کلمہ توحید کے اظہار کی بنا پر مسلمان سمجھا گیا اور تمہارا مال و جان محفوظ رہا۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ تم بھی شروع میں ضعیف الایمان تھے، صرف زبانی کلامی مسلمان تھے، بعد میں اللہ نے تم پر احسان کیا کہ تمہارے دلوں میں اسلام راسخ ہو گیا۔

۶۔ فَمَنَّ اللّٰہُ عَلَیۡکُمۡ فَتَبَیَّنُوۡا: اللہ نے تم پر احسان کیا ہے کہ ایمان تمہارے دلوں میں اتر چکا ہے۔ فَتَبَیَّنُوۡا پس تحقیق کرو۔ یہاں تحقیق کے حکم کو دو بار دہرایا۔ جس سے اس تحقیق کی اہمیت کا اندازہ ہوتا

---

[1] المنار ۵: ۳۴۹

ہے۔

وضاحت: تمام اہل قبلہ اور ہر کلمہ گو پر احکام اسلام جاری ہوتے ہیں۔ یعنی اس کے ساتھ مناکحہ کرنا، اس کے مال و جان کو محفوظ قرار دینا وغیرہ اسلام کے ظاہری احکام ہیں جو ہر کلمہ گو پر جاری ہوتے ہیں۔ رہا اس کا ایمان و عمل، اس کا یہ معاملہ اپنے اللہ کے ساتھ ہے، جس کا اسے بروز قیامت اللہ کے سامنے جوابدہ ہونا ہے۔ قبولیت اعمال ایمان پر مترتب ہوتی ہے۔ اسلام قبول کرنے پر، ظاہری احکامِ اسلام اس پر جاری ہو جاتے ہیں۔

اہم نکات

ا۔ صرف عقائد نہیں، اسلامی شعائر کا اظہار کرنے والے کو بھی کافر نہیں کہہ سکتے: لَا تَقُوۡلُوۡا...۔

لَا یَسۡتَوِی الۡقٰعِدُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ غَیۡرُ اُولِی الضَّرَرِ وَالۡمُجٰہِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِاَمۡوَالِہِمۡ وَاَنۡفُسِہِمۡ ؕ فَضَّلَ اللّٰہُ الۡمُجٰہِدِیۡنَ بِاَمۡوَالِہِمۡ وَاَنۡفُسِہِمۡ عَلَی الۡقٰعِدِیۡنَ دَرَجَۃً ؕ وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الۡحُسۡنٰی ؕ وَفَضَّلَ اللّٰہُ الۡمُجٰہِدِیۡنَ عَلَی الۡقٰعِدِیۡنَ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿ۙ۹۵﴾

۹۵۔ بغیر کسی معذوری کے گھر میں بیٹھنے والے مومنین اور راہ خدا میں جان و مال سے جہاد کرنے والے یکساں نہیں ہو سکتے، اللہ نے بیٹھے رہنے والوں کے مقابلے میں جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ زیادہ رکھا ہے، گو اللہ نے سب کے لیے نیک وعدہ فرمایا ہے مگر بیٹھنے والوں کی نسبت جہاد کرنے والوں کو اجر عظیم کی فضیلت بخشی ہے۔

دَرَجٰتٍ مِّنۡہُ وَمَغۡفِرَۃً وَّرَحۡمَۃً ؕ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۹۶﴾

۹۶۔ (ان کے لیے) یہ درجات اور مغفرت اور رحمت اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ بڑا معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

جہاد: اپنی بقاء کی جنگ ہر ذی روح لڑتا ہے۔ چونکہ یہ اس کا فطری حق ہے کہ اس کی زندگی اور زندگی کے لوازمات کی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کے ساتھ مزاحمت کرے۔

اگر کوئی طاقت کسی انسان کی زندگی کے درپے اس لیے ہو جائے کہ وہ اللہ پر ایمان لاتا ہے تو ایسی طاقت کے ساتھ مزاحمت کرنے کو جہاد کہتے ہیں۔

لہٰذا جہاد فی سبیل اللہ اپنی بقا کی جنگ بھی ہے اور اس بقا کو راہ خدا میں کرنے کی بھی سعی ہے، جس میں فرد امت کی بقا پر قربان ہو جاتا ہے۔

رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جہاد کرنے والوں نے اپنے جہاد سے ایک امت کو زندگی دی۔ یہ زندگی قیامت تک جاری رہے گی۔ اس امت کی رگوں میں قیامت تک جو خون گردش کرتا رہے گا، اس خون کو عصر رسولؐ کے مجاہدوں نے دوڑا دیا تھا۔

اسی لیے اس آیت میں رسولؐ کے ساتھ جہاد کرنے والے مجاہدین کی دوسروں پر فضیلت کا ذکر تین بار تکرار کیا گیا۔ لہٰذا قرآن کی رو سے یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ رسول اللہؐ کے ساتھ جس کا جہاد زیادہ ہے، اس کی فضیلت سب سے زیادہ ہے۔

دَرَجٰتٍ مِّنۡہُ: یعنی یہ تفضیل، یہ برتری اللہ کے نزدیک درجات کے لحاظ سے ہے۔ اس سے اس بات کی بھی صراحت آگئی کہ یہ برتری اور تفضیل کس اعتبار سے ہے اور جہاد چونکہ اس امت کے لیے ایک تقدیر ساز مسئلہ ہے، اس لیے جس قدر اس کی فضیلت زیادہ ہے، اس قدر اس سے فرار کرنا بڑا جرم ہے اور سات بڑے گناہوں میں شمار ہوتا ہے۔

احادیث

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

الجھاد باب من ابواب الجنة.[1]　　جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے.

حضرت امام جعفر صادق (ع) سے روایت ہے کہ آپؑ نے علی ابن عبد العزیز سے فرمایا: کیا میں تجھے اسلام کی بنیاد اور اس کی شاخوں اور اس کی چوٹی کے بارے میں بتا دوں؟ عرض کیا فرمائیے۔ فرمایا:

اَصْلُهُ الصَّلَاةُ وَ فَرْعُهُ الزَّكَاةُ وَ ذِرْوَتُهُ وَ سَنَامُهُ الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ اَلَا اُخْبِرُكَ بِاَبْوَابِ الْخَيْرِ الصَّوْمُ جُنَّةٌ مِنَ النَّارِ۔[2]

اسلام کی بنیاد نماز، اس کی شاخیں زکوٰۃ اور اس کی چوٹی جہاد فی سبیل اللہ ہے اور میں تجھے بھلائی کے دروازوں کے بارے میں بتاؤں؟ روزہ آتش کے لیے سپر ہے۔

اہم نکات

۱۔ فضیلت کا پیمانہ جہاد ہے۔ رسول اللہؐ کے ساتھ جس کا جہاد زیادہ، اس کی فضیلت زیادہ ہے۔ دَرَجٰتٍ مِّنۡہُ ....۔

---

[1] الکافی ۵: ۴۔ باب فضل الجہاد　　[2] الفقیہ ۲: ۷۵

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۹۷﴾	۹۷۔ وہ لوگ جو اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہوتے ہیں جب فرشتے ان کی روحیں قبض کرتے ہیں تو ان سے پوچھتے ہیں: تم کس حال میں مبتلا تھے؟ وہ کہتے ہیں: ہم اس سرزمین میں بےبس تھے، فرشتے کہتے ہیں: کیا اللہ کی سرزمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ پس ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔

تفسیر آیات

ظلم سے مراد دین حق سے انحراف کر کے اپنے آپ پر ظلم کرنا ہے۔

اس آیت میں مرنے کے بعد سوال قبر کی طرف اشارہ ہے۔ فرشتوں کا سوال مرنے والے کے دین کے بارے میں ہوگا کہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ مرنے والا جواب دے گا کہ جس سرزمین میں، میں زندگی گزار رہا تھا، وہاں دین پر عمل پیرا رہنا ممکن نہ تھا۔ فرشتے کہیں گے کہ اگر تم کفار کی سرزمین پر اپنے دین اور مذہب کا تحفظ نہیں کر سکتے تھے تو اللہ کی سرزمین تو وسیع تھی اور ایسی سرزمین بھی موجود تھی، جہاں دین حق کی فضا قائم تھی، تم نے وہاں ہجرت کیوں نہ کی؟ اور دار الاسلام میں تمہیں بہتر زندگی بھی میسر تھی۔ چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ...[1]	اور جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بہت سی پناہ گاہیں اور کشائش پائے گا۔

ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ : جملہ حالیہ ہے۔ اس لحاظ سے ممکن ہے حالت موت میں گفتگو عمل میں آئی ہو۔ چنانچہ سورۃ نحل کی آیت ۲۱ اور ۳۲ سے یہی مطلب اخذ کر سکتے ہیں۔

شان نزول: یہ آیت مکہ کے ان ضعیف الایمان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو مشرکین کے دباؤ میں آ کر بدر میں مسلمانوں کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے اور کچھ لوگ مارے گئے۔

اہم نکات

ا۔ یہ آیت خاص کر ان مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے جو دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف

---

[1] ۴ نساء : ۱۰۰

اپنے دین کی حفاظت کے لیے نہ صرف ہجرت نہیں کرتے، بلکہ مال و متاع دنیا کے لیے دار الاسلام سے دار الکفر کی طرف ترک وطن کر جاتے ہیں اور خود کو اور اپنی نسلوں کو دین سے بے بہرہ کرتے ہیں۔

اِلَّا الۡمُسۡتَضۡعَفِیۡنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالۡوِلۡدَانِ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ حِیۡلَۃً وَّلَا یَہۡتَدُوۡنَ سَبِیۡلًا ﴿۹۸﴾

۹۸۔ بجز ان بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کے جو نہ کوئی چارہ کر سکتے ہیں اور نہ کوئی راہ پاتے ہیں۔

فَاُولٰٓئِکَ عَسَی اللّٰہُ اَنۡ یَّعۡفُوَ عَنۡہُمۡ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَفُوًّا غَفُوۡرًا ﴿۹۹﴾

۹۹۔ عین ممکن ہے اللہ انہیں معاف کر دے اور اللہ بڑا معاف کرنے والا بخشنے والا ہے۔

تشریح کلمات

حِیۡلَۃً: (ح و ل) اس تدبیر کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز تک پوشیدہ طور سے پہنچا جا سکے۔ عام طور پر اس کا استعمال بری تدبیر کے لیے ہوتا ہے لیکن کبھی ایسی تدبیر کے متعلق بھی ہوتا ہے، جس میں حکمت اور مصلحت ہوتی ہے۔ (مفردات راغب)

تفسیر آیات

سابقہ آیات میں ان لوگوں کا ذکر تھا جو حقیقتاً بے بس اور مجبور نہ تھے۔ وہ اپنے دین کی خاطر ہجرت کرنے پر قادر تھے۔ اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو واقعی بے بس اور مجبور تھے اور ہجرت کرنے کا کوئی وسیلہ نہیں تھا اور کوئی قابل عمل تدبیر کارگر ثابت نہیں ہوتی تھی۔

مستضعف کون ہیں؟: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ دینی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا ممکن نہ ہو اور اس میں انسان کی اپنی کسی کوتاہی کو دخل نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرماتا ہے۔ علامہ طباطبائیؒ نے اس کی متعدد صورتیں بیان کی ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے:

- ایسی سرزمین میں زندگی بسر کرتا ہو، جہاں کوئی عالم دین میسر نہ آنے کی وجہ سے دینی تعلیمات پر عمل کرنا ممکن نہ ہو۔
- یا دینی تعلیمات پر عمل کرنے کے لیے اس قدر شدید عذاب اٹھانا پڑتا ہے جو ناقابل تحمل ہو اور وہاں سے ہجرت کرنے کا کوئی وسیلہ اور ذریعہ بھی نہ ہو۔
- حق تک رسائی حاصل نہ کر سکے اور مختلف غیر اختیاری عوامل کی وجہ سے اس سے حق پوشیدہ رہے،

ورنہ اگر اسے حق کا علم ہو جاتا تو وہ اس کے ساتھ عناد اور دشمنی نہ کرتا، بلکہ اسے قبول کر لیتا۔ یہ اس صورت کی بات ہے جب انسان غیر اختیاری طور پر غفلت کا شکار ہو جاتا ہے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ اس غفلت یا عدم رسائی میں مکلّف کے عمل کو کوئی دخل نہ ہو، یعنی جان بوجھ کر نہ تو اس کی کوتاہی اور نہ ہی غفلت کو دخل ہو۔

علامہ طباطبائی کے نزدیک یہ غفلت غیر اختیاری ہے۔ فرماتے ہیں:

و لا قدرة مع الغفلة اور غیر اختیار ہونے کی صورت میں لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا ... [1] کے تحت یہ شخص حق کا مکلّف اور ذمہ دار نہیں رہتا۔ و اللّٰہ اعلم بالصواب۔

لہٰذا خلاصہ یہ کہ جو بغیر کوتاہی کے حق تک رسائی حاصل نہ کر سکے، وہ مستضعف ہے۔

احادیث

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

لَا یَقَعُ اِسۡمُ الۡاِسۡتِضۡعَافِ عَلَی مَنۡ بَلَغَتۡہُ الۡحُجَّۃُ فَسَمِعَتۡھَا اُذُنُہٗ وَ وَعَاھَا قَلۡبُہٗ۔ [2]

مستضعف اس شخص کو نہیں کہا جاتا جس تک حجت پہنچ گئی، اس کے کانوں نے اسے سنا اور دل سے اسے سمجھ لیا۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے روایت ہے:

اَلضَّعِیۡفُ مَنۡ لَمۡ تُرۡفَعۡ اِلَیۡہِ حُجَّۃٌ وَ لَمۡ یَعۡرِفِ الۡاِخۡتِلَافَ فَاِذَا عَرَفَ الۡاِخۡتِلَافَ فَلَیۡسَ بِمُسۡتَضۡعَفٍ [3]

مستضعف وہ ہے جس تک حجت نہ پہنچے اور اسے اختلاف کا علم نہ ہو، جب اختلاف کا علم ہو جائے تو وہ مستضعف نہیں ہے۔

وَ مَنۡ یُّہَاجِرۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ یَجِدۡ فِی الۡاَرۡضِ مُرٰغَمًا کَثِیۡرًا وَّ سَعَۃً ؕ وَ مَنۡ یَّخۡرُجۡ مِنۡۢ بَیۡتِہٖ مُہَاجِرًا اِلَی اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ثُمَّ یُدۡرِکۡہُ

۱۰۰۔ اور جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بہت سی پناہ گاہیں اور کشائش پائے گا اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کی غرض سے نکلے پھر (راستے میں) اسے موت آ جائے تو اس کا اجر اللہ

---

[1] ۲ بقرہ: ۲۸۶۔ اللہ کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمے داری نہیں ڈالتا۔

[2] نہج البلاغۃ۔ بحار الانوار ۶۶: ۲۲۷

[3] اصول الکافی ۲: ۴۰۶۔ باب المستضعف

الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۰﴾

کے ذمے ہو گیا اور اللہ بڑا معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تشریح کلمات

مُرٰغَمًا: (ر غ م) پناہ گاہ۔ بقول راغب رغمت الیه سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں: کسی کے پاس چلے جانا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَنْ يُّهَاجِرْ: ہجرت سے انسان ارتقائی منازل آسانی سے طے کر لیتا ہے اور ہجرت میں طبعی طور پر برکت بھی ہے اور اگر یہ ہجرت دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف ہو تو قرآن فرماتا ہے: مُرٰغَمًا كَثِيْرًا اسے زندگی کے لیے بہت پناہ گاہیں ملیں گی۔ اگر ایک جگہ رہنے نہ دیا تو دوسری جگہ، نہیں تو تیسری جگہ، جو کہ زمین خدا کے وسیع ہونے کا لازمی نتیجہ ہے نیز فرمایا: وَسَعَةً۔ بسر اوقات میں کشائش آئے گی۔ یعنی اگر وہ دار الکفر میں تنگی میں تھا تو ہجرت کے بعد کشائش آئے گی۔ چنانچہ دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ...[1]

اور جنہوں نے ظلم کا نشانہ بننے کے بعد اللہ کے لیے ہجرت کی، انہیں ہم دنیا ہی میں ضرور اچھا مقام دیں گے۔

۲۔ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ: ہجرت کی اہمیت اور فضیلت کا اندازہ آیت کے دوسرے حصے سے ہوتا ہے، جس میں ارشاد فرمایا: اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسولؐ کی طرف ہجرت کی غرض سے نکلے، پھر راستے میں اسے موت آ جائے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہو گیا۔ وہ اجر و ثواب کس قدر عظیم ہو گا، جسے اللہ نے اپنے ذمے واجب قرار دیا ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ طلب علم کے لیے ہجرت کرنے والا اگر پردیس میں مر جائے تو اس کا بھی یہی ثواب ہے۔

اہم نکات

۱۔ ہجرت میں دنیا و آخرت کی کامیابی ہے۔

۲۔ راہ خدا میں ہجرت کا اجر اس قدر عظیم ہے کہ اس کو غیر خدا بیان بھی نہیں کر سکتا۔

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ

۱۰۱۔ اور جب تم زمین میں سفر کے لیے نکلو تو اگر تمہیں کافروں کے حملے کا خوف ہو تو تمہارے

---

[1] ۱۶ نحل: ۴۱

الصَّلٰوةِ ۖ اِنۡ خِفۡتُمۡ اَنۡ يَّفۡتِنَكُمُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ؕ اِنَّ الۡكٰفِرِيۡنَ كَانُوۡا لَكُمۡ عَدُوًّا مُّبِيۡنًا ﴿۱۰۱﴾

لیے نماز قصر پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں، یہ کافر لوگ یقیناً تمہارے صریح دشمن ہیں۔

تفسیر آیات

سفر اور خوف کی حالت میں نماز قصر پڑھنے کے بارے میں یہ ابتدائی حکم ہے، جس میں سفر میں نماز قصر پڑھنے کو خوف کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ بعد میں رسول اکرم (ص) نے سفر میں ہر حالت میں نماز قصر پڑھنے کا حکم دیا۔

فَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ : سفر میں نماز قصر پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں، کی تعبیر سے تشریعی مقام پر وجوب ثابت ہوتا ہے۔ جیسا کہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کے بارے میں بھی یہی تعبیر اختیار کی گئی تھی۔ چونکہ ابتدا میں ممکن تھا کہ یہاں نماز کو کم کر کے پڑھنے میں لوگوں کو تردد پیش آئے۔

سفر میں نماز قصر پڑھنا رخصت نہیں، عزیمت ہے۔ یعنی صرف اجازت نہیں بلکہ واجب ہے۔ فقہ جعفری کے مطابق سفر میں پوری نماز پڑھی جائے تو کافی نہیں ہے۔ اسی طرح سفر میں روزہ بھی نہیں رکھا جا سکتا۔ رمضان میں اگر سفر کیا جائے تو دوسرے دنوں ان روزوں کی قضا، ادا کرنا ہو گی۔

واضح رہے کہ سفر میں نماز اور روزوں کے قصر کی شرائط درج ذیل ہیں:

۱۔ سفر حرام نہ ہو۔

۲۔ مسافت پوری ہو۔

۳۔ سفر میں ایک جگہ دس دن یا اس سے زیادہ قیام کرنے کا ارادہ نہ ہو۔

احادیث

روایت ہے کہ رسول اللہ (ص) نے سفر میں نماز قصر پڑھنے کے بارے میں فرمایا:

تلك صدقة تصدق اللّٰه بها عليكم فاقبلوا صدقته۔[1] یہ اللہ کا تحفہ ہے اسے قبول کرو۔

صحیح مسلم، سنن بیہقی، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور ابن جریر وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔

روایت ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے ایک سوال کے جواب میں اس آیت کی تلاوت فرمانے کے بعد فرمایا:

---

[1] عوالی اللآلی ۲: ۶۱

فَصَارَ التَّقْصِيرُ فِي السَّفَرِ وَاجِبًا كَوُجُوبِ التَّمَامِ فِي الْحَضَرِ۔[1]

اس آیت سے سفر میں نماز کا قصر پڑھنا اسی طرح واجب ہو گیا جس طرح غیر سفر میں پوری نماز پڑھنا واجب ہے۔

اس روایت میں یہ بھی سوال ہوا کہ اگر کوئی شخص سفر میں چار رکعت نماز پڑھ لے تو اسے دوبارہ نماز پڑھنا پڑے گی؟ آپ (ع) سے روایت ہے:

اِنْ كَانَ قَدْ قُرِئَتْ عَلَيْهِ آيَةُ التَّقْصِيرُ وَ فُسِّرَتْ لَهُ فَصَلَّى اَرْبَعًا اَعَادَ وَ اِنْ لَمْ يَكُنْ قُرِئَتْ عَلَيْهِ وَ لَمْ يَعْلَمْهَا فَلَا اِعَادَةَ عَلَيْهِ[2]

اگر اسے آیہ قصر پڑھ کر سنائی گئی اور اس کی تفسیر بھی بتائی گئی ہے پھر بھی اس نے چار رکعت پڑھی ہے تو دوبارہ پڑھے اور اگر اسے آیہ نہ سنائی گئی ہو اور اسے علم نہ ہو تو دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ ان معدودے چند موارد میں سے ہے جہاں علم نہ ہونے کا عذر قابل قبول ہے۔

المبسوط باب القصر میں لکھا ہے۔ عبد اللہ بن عمر نے کہا:

صلوه المسافر رکعتان من خالف السنة فقد کفر۔

مسافر کی نماز دو رکعت ہے۔ جو سنت کی مخالفت کرے وہ کافر ہے۔

وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۟ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۪ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ

۱۰۲۔ اور (اے رسول) جب آپ خود ان کے درمیان موجود ہوں اور آپ خود ان کے لیے نماز قائم کریں تو ان میں سے ایک گروہ آپ کے ساتھ مسلح ہو کر نماز پڑھے پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو انہیں تمہارے پیچھے ہونا چاہیے اور دوسرا گروہ جس نے نماز نہیں پڑھی ان کی جگہ آئے اور آپ کے ساتھ نماز پڑھے اور اپنے بچاؤ کا سامان اور اسلحہ لیے رہیں کیونکہ کفار اس تاک میں ہیں کہ تم ذرا اپنے ہتھیاروں اور سامان سے غافل ہو جاؤ تو تم پر یکبارگی

---

[1] الفقیہ ۱: ۴۳۴ باب الصلوۃ فی السفر [2] من لا یحضرہ الفقیہ ۱: ۴۳۴

اِنۡ کَانَ بِکُمۡ اَذًی مِّنۡ مَّطَرٍ اَوۡ کُنۡتُمۡ مَّرۡضٰۤی اَنۡ تَضَعُوۡۤا اَسۡلِحَتَکُمۡ ۚ وَ خُذُوۡا حِذۡرَکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ اَعَدَّ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابًا مُّہِیۡنًا﴿۱۰۲﴾

حملہ کر دیں اور اگر تم بارش کی وجہ سے تکلیف میں ہو یا تم بیمار ہو تو اسلحہ اتار رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں مگر اپنے بچاؤ کا سامان لیے رہو، بیشک اللہ نے کافروں کے لیے تو ذلت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تفسیر آیات

وَ اِذَا کُنۡتَ: یہ حکم رسول اللہ (ص) کی موجودگی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ قرآن نے متعدد مقامات پر یہ اسلوب بیان اختیار کیا ہے کہ خطاب نبی سے اور حکم عام ہوتا ہے۔

نماز خوف کا طریقہ: لشکر کا ایک حصہ امام کی اقتداء میں ایک رکعت پڑھے اور امام جب دوسری رکعت کے لیے کھڑا ہو تو مقتدی انفرادی طور پر دوسری رکعت پڑھ کر نماز پوری کریں اور جنگ کا محاذ سنبھالیں اور امام دوسری رکعت کو اس قدر طول دے کہ لشکر کا دوسرا حصہ اپنی نماز کی پہلی رکعت امام کی دوسری رکعت کے ساتھ پڑھ سکے۔ امام دوسری رکعت کا سلام پھیر دے اور مقتدی اپنی دوسری رکعت بجا لائیں۔

یہی طریقہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے اور فقہ جعفری میں یہی طریقہ فقہاء میں زیادہ مشہور ہے۔ چنانچہ امام شافعی اور امام مالک نے بھی تھوڑے اختلاف کے ساتھ اسی طریقے کو اختیار کیا ہے۔

نماز خوف رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیبیہ اور غزوہ ذات الرقاع میں، حضرت علی علیہ السلام نے اپنی جنگوں میں اور حضرت امام حسین علیہ السلام نے عصر عاشور پڑھی ہے۔[1]

اس حکم سے اہل ایمان کو بخوبی اندازہ ہونا چاہیے کہ نماز کی کیا اہمیت ہے۔ ہر کام اور ہر عمل کو نماز کی خاطر چھوڑا جا سکتا ہے، لیکن نماز کسی بھی عمل کی خاطر نہیں چھوڑی جا سکتی۔ حدیث میں آیا ہے:

خَمۡسُ صَلَوَاتٍ لا تُتۡرَکُ عَلَی کُلِّ حَالٍ۔[2]　　پانچ نمازیں کسی صورت میں بھی چھوڑی نہیں جا سکتیں۔

حتیٰ فقہ امامیہ میں صلوۃ الغریق مشہور و معروف ہے کہ حالت غرق میں نماز کس طرح پڑھی جائے۔ یعنی اگر نماز کا وقت نکل رہا ہو اور انسان حالت غرق میں ہو تو اس حالت میں بھی نماز پڑھنا ہے، خواہ دل کے ارادوں اور سر کے اشاروں سے ہی کیوں نہ ہو۔[3]

---

[1] اعلام الوری ۲۴۵　　[2] الکافی ۳: ۲۸۷ باب الصلوۃ　　[3] التہذیب ۳: ۱۷۵

فَاِذَا قَضَیۡتُمُ الصَّلٰوۃَ فَاذۡکُرُوا اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِکُمۡ ۚ فَاِذَا اطۡمَاۡنَنۡتُمۡ فَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا ﴿۱۰۳﴾	۱۰۳۔ پھر جب تم نماز پڑھ چکو تو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرو، پھر جب اطمینان حاصل ہو جائے تو (معمول کی) نماز قائم کرو، بے شک وقت کی پابندی کے ساتھ نماز ادا کرنا مومنین پر فرض ہے۔

تشریح کلمات

کِتٰبًا: (ک ت ب) کتاب کے متعدد معانی میں سے ایک معنی حتمی اور اٹل فیصلہ ہے:

قُلۡ لَّنۡ یُّصِیۡبَنَاۤ اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا ...[1]	کہد یجیے: اللہ نے ہمارے لیے جو مقدر فرمایا ہے اس کے سوا ہمیں کوئی حادثہ پیش نہیں آتا۔
کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیۡ ...[2]	اللہ نے لکھ دیا ہے: میں اور میرے رسول ہی غالب آ کر رہیں گے۔

تفسیر آیات

فَاذۡکُرُوا اللّٰہَ: یعنی نماز سے فارغ ہونے کے بعد بھی ہر حالت میں مومن کو یاد خدا میں رہنا چاہیے۔ اس سلسلے میں تین حالتوں کا ذکر ہے۔ جن سے انسان خالی نہیں ہوتا یا حالت قیام میں ہوتا ہے یا بیٹھے ہوئے ہوتا ہے یا لیٹے ہوئے۔ ہر حالت میں ذکر خدا ممکن ہے۔ اگر راستہ چل رہا ہے، ساتھ ذکر بھی ہوسکتا ہے۔ اگر بیٹھا ہوا ہے یا لیٹا ہوا ہے تو بھی ذکر خدا ہوسکتا ہے۔ ذکر خدا کے ساتھ کسی کام کا ٹکراؤ نہیں ہوتا۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ سالم شخص کھڑا، مریض بیٹھ کر، یہ بھی ممکن نہ ہوا تو لیٹ کر نماز پڑھے۔[3]

بظاہر مَّوۡقُوۡتًا سے مراد وقت کی پابندی ہے کہ ہر نماز کے لیے ایک خاص وقت معین ہے۔ اس لیے وقت سے پہلے اور بعد میں نہیں پڑھی جا سکتی اور کسی بھی حالت میں نہیں چھوڑی جا سکتی۔ یہاں دو چیزیں واجب ہیں: ایک تو نماز پڑھنا اور دوسری وقت پر پڑھنا۔ اگر کسی وجہ سے وقت پر نہیں پڑھی جا سکی تو نماز بطور قضا بہرحال پڑھنا واجب ہے۔

حضرت محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ لِلصَّلَاۃِ وَقْتاً وَ الْاَمْرُ فِیۡہِ وَاسِعٌ یُقَدَّمُ	نماز کے لیے وقت مقرر ہے، تاہم اس حکم میں گنجائش

---

[1] ۹ توبہ: ۵۱　[2] ۵۸ مجادلہ: ۲۱　[3] الوسائل ۵: ۴۸۷

مَرَّۃً وَیُؤَخِّرُ مَرَّۃً اِلَّا الْجُمُعَۃَ فَاِنَّمَا هُوَ وَقْتٌ وَاحِدٌ۔[1]

ہے۔کبھی پہلے وقت میں، کبھی کچھ دیر سے نماز ہو سکتی ہے، سوائے جمعہ کے۔اس کے لیے ایک ہی وقت مقرر ہے۔

وَلَا تَهِنُوْا فِی ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾

۱۰۴۔ اور تم ان کافروں کے تعاقب میں تساہل سے کام نہ لینا اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو انہیں بھی ایسی ہی تکلیف پہنچتی ہے جیسے تمہیں تکلیف پہنچتی ہے اور اللہ سے جیسی امید تم رکھتے ہو ویسی امید وہ نہیں رکھتے اور اللہ جاننے والا، حکمت والا ہے۔

تشریح کلمات

لَا تَهِنُوْا: (و ہ ن) الوھن ۔ کمزوری۔

ابْتِغَآءِ: (ب غ ی) طلب اور تعاقب کرنا۔

تفسیر آیات

عسکری اعتبار سے دشمن کے مقابلے میں کمزوری دکھانا جرم ہے۔قرآن لشکر اسلام کو دستور جنگ دیتے ہوئے جنگ میں استقامت اور پامردی دکھانے کے لیے روحانی اور نفسیاتی محرک پیدا کرتا ہے۔ اگر کافر استقامت دکھاتے ہیں تو مسلمانوں کو زیادہ استقامت دکھانی چاہیے۔اس کی دو وجوہات بیان کی ہیں:

i۔ جنگ سے اگر تمہیں تکلیف پہنچ رہی ہے تو اس بات میں تم اکیلے نہیں ہو، تمہارے دشمن کو بھی تکلیف پہنچ رہی ہے، اس کے باوجود وہ تم سے لڑنے پر اڑے ہوئے ہیں۔

ii۔ اللہ سے جو امیدیں تمہیں وابستہ ہیں، وہ انہیں نہیں ہیں۔ کیونکہ مسلمان جنگ میں یا فاتح ہوتا ہے یا شہید، دونوں صورتوں میں دنیا و آخرت میں کامیاب اور سرخرو ہوتا ہے، جبکہ کفار کی استقامت کے پیچھے یہ عوامل موجود نہیں ہیں۔

اہم نکات

۱۔ مجاہد کی لغت میں ناکامی کا تصور نہیں ہے۔ یہاں فتح یا شہادت میں سے ایک کامیابی ضرور ملتی ہے۔

---

[1] مستدرک الوسائل ۳ : ۱۰۸

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىکَ اللّٰہُ ؕ وَ لَا تَکُنۡ لِّلۡخَآئِنِیۡنَ خَصِیۡمًا ﴿۱۰۵﴾ وَّ اسۡتَغۡفِرِ اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۰۶﴾

۱۰۵۔ (اے رسول) ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ جیسے اللہ نے آپ کو بتایا ہے اسی کے مطابق لوگوں میں فیصلے کریں اور خیانت کاروں کے طرفدار نہ بنیں۔

۱۰۶۔اور اللہ سے طلب مغفرت کریں، یقیناً اللہ بڑا درگزر کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

شان نزول: یہ اور بعد میں آنے والی چند آیات ایک خاص واقعے سے متعلق ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے:

انصار کے ایک خاندان بنی ابیرق کے تین بھائیوں بشیر، بشر اور مبشر نے قتادہ بن نعمان کے چچا کے گھر نقب لگا کر چوری کی اور کچھ کھانے کی اشیاء، ایک تلوار اور ایک زرہ لے گئے۔ حضرت قتادہ نے، جو بدر کے مجاہد تھے، رسول خدا (ص) کی خدمت میں شکایت کی تو ان تینوں بھائیوں نے لبید نامی ایک ایماندار شخص کو متہم کیا کہ چوری اس نے کی ہے۔ جس پر لبید برہم ہوئے اور تلوار اٹھائی اور ان لوگوں کے پاس آ کر کہا: مجھ پر چوری کا الزام عائد کرتے ہو، جب کہ تم خود ایسے جرائم کا ارتکاب کرتے ہو۔ تم وہی منافق لوگ ہو جو رسول اللہ (ص) کی ہجو کیا کرتے تھے اور قریش کی طرف نسبت دیتے تھے۔ تم نے مجھ پر جو الزام لگایا ہے، اسے ثابت کرو، ورنہ تلوار کو میں تمہارے خون سے سیراب کر دوں گا۔ یہ دیکھ کر ان لوگوں نے کہا کہ آپ واپس جائیں، آپ پر کوئی الزام نہیں لگاتے، آپ کی ذات اس قسم کے کام سے بری ہے۔ اس کے بعد ایک جماعت کو اپنے خاندان کے ایک با اثر شخص اسید بن عروہ کے ساتھ رسول اللہ (ص) کی خدمت میں روانہ کیا۔ چنانچہ اسید نے عرض کیا: یا رسول اللہ (ص) قتادہ نے ہمارے قبیلے کے ایک شریف حسب و نسب خاندان پر چوری کا الزام لگایا ہے۔ یہ سن کر رسول اللہ (ص) نے اظہار افسوس کیا اور قتادہ کی سخت سرزنش کی، جس سے قتادہ کو سخت صدمہ ہوا تو یہ آیات نازل ہوئیں، جس سے قتادہ کی بے گناہی اور دوسرے لوگوں کی چوری ثابت ہوگئی۔[1]

دوسری روایت میں آیا ہے کہ بنی ابیرق نے چوری کا الزام ایک یہودی پر لگایا اور چوری کیا ہوا اسلحہ اور زرہ اسی یہودی کے پاس رکھوا دی اور تحقیق کے وقت اسی کے گھر سے برآمد ہوئی۔ چنانچہ ظاہری علائم

---

[1] بحار الانوار ۲۲: ۲۲

کے تحت یہ تأثر قائم ہو رہا تھا کہ چوری یہودی نے کی تھی اور بنی ابیرق کے برادران بے گناہ تھے۔ چنانچہ یہ آیات نازل ہوئیں اور بنی ابیرق کے لوگ جو مسلمان تھے، مجرم ثابت ہوئے اور یہودی کو بری کر دیا۔

ان دونوں روایات میں اختلاف اس طرح ختم ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ بنی ابیرق والوں نے پہلے الزام لبید پر لگایا ہو اور بعد میں یہودی پر۔

آیت نمبر ۱۰۶ تا ۱۱۳، اسی واقعے سے مربوط ہیں اور اسی واقعے کی روشنی میں ان آیات کو سمجھنا چاہیے۔

یہاں حضور (ص) سے خطاب فرماتے ہوئے آیت کا لب و لہجہ سرزنش کا ہے۔ چنانچہ متعدد مقامات پر سیاق و سباق عبارت میں سرزنش ہوئی ہے۔ جب کہ اس آیت میں تو حضور (ص) کو استغفار کا حکم دیا گیا ہے۔ اس قسم کی تمام آیات کو سمجھنے کے لیے یہ نکتہ ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ ان آیات میں اگرچہ خطاب رسول (ص) سے ہے، لیکن مراد دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ ایسا اسلوب کلام ہے، جسے محاورے میں ایاك اعني و اسمعي یا جارة [1] ''خطاب کسی سے اور مقصود کسی اور کو سنانا ہے'' کہتے ہیں۔ اس اسلوب میں منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کو تنبیہ کے ساتھ یہ عندیہ دینا مقصود ہوتا ہے کہ وہ اس قابل ہی نہیں کہ رخ سخن ان کی طرف کیا جائے۔ لہٰذا یہ استدلال درست نہ ہوگا کہ ایسے مسائل میں جن میں قرآن کریم کی کوئی نص صریح وارد نہ ہوئی ہو، آنحضرت (ص) کو اپنی رائے سے اجتہاد کرنے کا حق حاصل تھا۔ آپ گوئی فیصلہ اپنے اجتہاد سے فرماتے، اگر اس میں کوئی غلطی ہو جاتی تو حق تعالیٰ اس پر آپ (ص) کو تنبیہ فرما کر آپ (ص) کے فیصلے کو صحیح کرا دیتے تھے۔ [2]

ہمارے نزدیک یہ نظریہ درست نہیں ہے۔ چونکہ قرآنی صریح نص نہ ہونے کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وحی کا انتظار فرماتے تھے۔

بِمَاۤ اَرٰىكَ اللّٰهُ: فیصلہ اسی طرح کرنا، جس طرح اللہ نے آپ کو بتایا ہے۔ اس جملے میں اجتہاد کی نفی ہے کہ رسول کریم، اللہ کی دی ہوئی تعلیم سے فیصلہ کرتے ہیں، رائے سے نہیں۔

پہلے بھی ذکر ہوا کہ علامہ آمدی الاحکام فی الاصول الاحکام میں صراحت کے ساتھ کہتے ہیں: رسول (ص) سے اجتہادی غلطی ہو سکتی ہے۔

ان آیات سے اسلام کی حقانیت اور اس کی تعلیمات کی روح سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات پر مسلمانوں کو ملامت کی کہ انہوں نے خاندانی تعصب کی بنا پر مجرموں کی حمایت کی اور ان چند آیات میں اللہ تعالیٰ نے نہایت ہی زور دے کر تاکید فرمائی کہ عدل و انصاف کی فراہمی میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ فریقین کا تعلق کس مذہب سے ہے۔ انصاف جیسا کہ ایک مسلمان کو مل سکتا ہے، ایک یہودی کو بھی ملنا چاہیے۔

اسلام کے نزدیک خاندان، قبیلے اور مذہب سے بھی بالاتر چیز عدل و انصاف ہے جو صرف انسانیت

---

[1] چنانچہ ائمہ علیہم السلام سے اسی طرح روایت میں آیا ہے۔ بحار الانوار ۳۲: ۱۸
[2] معارف القرآن مفتی محمد شفیع ۲: ۵۴۲

سے مربوط ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: وَلَا تَكُنۡ لِّلۡخَآٮِٕنِيۡنَ خَصِيۡمًا اور خیانت کاروں کے طرفدار نہ بنیں۔ خیانت کار کی طرفداری نہ کرنے کے لیے یہ نہیں دیکھا جانا چاہیے کہ وہ کس گروہ کا آدمی ہے۔

وَلَا تُجَادِلۡ عَنِ الَّذِيۡنَ يَخۡتَانُوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنۡ كَانَ خَوَّانًا اَثِيۡمًا ﴿۱۰۷﴾

۱۰۷۔ اور جو لوگ اپنی ذات سے خیانت کرتے ہیں آپ ان کی طرف سے ان کا دفاع نہ کریں بیشک اللہ خیانت کار اور گنہگار کو پسند نہیں کرتا۔

تشریح کلمات

مجادلة: جدال۔ مناظرہ کرنا۔ ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔

تفسیر آیات

یہاں خطاب آنحضرت (ص) سے ہے اور ان لوگوں کو تنبیہ کرنا مقصود ہے جو اس جرم کا ارتکاب کرتے اور خیانت کاروں کی وکالت کرتے ہیں۔

يَخۡتَانُوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ: خیانت اگرچہ دوسروں کے حق میں کی ہے، پھر فی الواقع اس خیانت کا اثر اس کی ذات پر مترتب ہوتا ہے، اس لیے اس کو اپنی ذات سے خیانت کہا ہے۔

اہم نکات

۱۔ یہ آیت سو فیصد ان پیشہ ور وکلاء کی ہدایت کے لیے ہے جو مجرموں اور خیانت کاروں کی طرف سے چند روپیوں کے عوض مقدمہ لڑتے ہیں۔

يَّسۡتَخۡفُوۡنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسۡتَخۡفُوۡنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمۡ اِذۡ يُبَيِّتُوۡنَ مَا لَا يَرۡضٰى مِنَ الۡقَوۡلِؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ مُحِيۡطًا ﴿۱۰۸﴾

۱۰۸۔ یہ لوگ (اپنی حرکتوں کو) لوگوں سے تو چھپا

سکتے ہیں لیکن اللہ سے نہیں چھپا سکتے اور اللہ تو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب یہ لوگ اللہ کی ناپسندیدہ باتوں میں رات کو تدبیریں سوچتے ہیں اور اللہ ان کی تمام حرکات پر احاطہ رکھتا ہے۔

تفسیر آیات

آیات کا تسلسل اسی قصے سے متعلق ہے۔ استخفاء یعنی پوشیدہ رکھنا اس صورت میں صادق آتا

ہے جب کسی دوسرے انسان کے خلاف کوئی سازش کی جا رہی ہو اور اسے لوگوں سے پوشیدہ رکھا جائے۔ کسی چیز کو لوگوں سے تو پوشیدہ رکھا جا سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کو پوشیدہ رکھنا کسی کے بس میں نہیں۔ اگرچہ وہ انسانوں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے رات بھر تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔

گناہ کرتے وقت انسان اگر یہ خیال ذہن میں زندہ رکھے کہ میں اس جرم کا ارتکاب اس منصف اور اس قاضی کے سامنے کر رہا ہوں جس کے سامنے کل مجھے پیش ہونا ہے تو انسان کبھی گناہ نہیں کرے گا۔

هٰٓاَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلۡتُمۡ عَنۡهُمۡ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا ۟ فَمَنۡ یُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنۡهُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ اَمۡ مَّنۡ یَّکُوۡنُ عَلَیۡهِمۡ وَکِیۡلًا ﴿۱۰۹﴾

۱۰۹۔ دیکھو! تم نے دنیاوی زندگی میں تو ان کا دفاع کیا مگر بروز قیامت اللہ سے ان کا دفاع کون کرے گا یا ان کا وکیل کون ہو گا؟

تفسیر آیات

اگر اس وکالت نے کچھ فائدہ دیا تو وہ دنیوی ہو گا، جس نے چند دنوں میں ختم ہو جانا ہے۔ جب کہ اس کا وبال آخرت کے لیے باقی رہے گا۔ وہاں کون اس کی وکالت کرے گا؟

اگر یہ عقیدہ مومن کے ذہن میں راسخ ہو جائے کہ کل بروز قیامت اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے تو انسان چند روز کی بے قیمت چیزوں کے لیے اپنی ابدی زندگی کو تباہ نہ کرے۔

وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا اَوۡ یَظۡلِمۡ نَفۡسَهٗ ثُمَّ یَسۡتَغۡفِرِ اللّٰهَ یَجِدِ اللّٰهَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۱۰﴾

۱۱۰۔ جو برائی کا ارتکاب کرے یا اپنے نفس پر ظلم کرے پھر اللہ سے مغفرت طلب کرے تو وہ اللہ کو درگزر کرنے والا، رحم کرنے والا پائے گا۔

تفسیر آیات

راہ حق سے بھٹکنے والوں کے لیے باب رحمت کھلا ہے۔ گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں اور اپنے نفس پر ظلم کرنے والوں کے لیے وسیلۂ استغفار ہر وقت موجود ہے۔

آیت میں دو گناہوں کا ذکر ہے، برائی اور ظلم۔ ان دونوں کا فرق بیان کرنے والے مفسرین میں بہت اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں، برائی وہ گناہ ہے جو کسی اور شخص کے ساتھ برائی کی ہو اور ظلم اپنے نفس پر کیا ہو۔ بعض دیگر کہتے ہیں۔ سُوۡٓءًا گناہ کبیرہ ہے اور ظلم گناہ صغیرہ۔ بعض بالعکس کہتے ہیں۔ ان میں بہتر

تفسیر یہ ہے کہ سُوۡٓءًا (برائی) سے مراد وہ زیادتی ہو سکتی ہے جو انسان دوسروں کے ساتھ کرتا ہے اور ظلم بہ نفس سے مراد احکام الٰہی کی خلاف ورزی ہے۔ و العلم عند اللّٰہ۔

وَ مَنۡ یَّکۡسِبۡ اِثۡمًا فَاِنَّمَا یَکۡسِبُہٗ عَلٰی نَفۡسِہٖ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ﴿۱۱۱﴾	۱۱۱۔ اور جو برائی کا ارتکاب کرتا ہے وہ اپنے لیے وبال کسب کرتا ہے اور اللہ تو بڑا علم والا، حکمت والا ہے۔
وَ مَنۡ یَّکۡسِبۡ خَطِیۡٓئَۃً اَوۡ اِثۡمًا ثُمَّ یَرۡمِ بِہٖ بَرِیۡٓـًٔا فَقَدِ احۡتَمَلَ بُہۡتَانًا وَّ اِثۡمًا مُّبِیۡنًا ﴿۱۱۲﴾	۱۱۲۔ اور جس نے خطا یا گناہ کر کے اسے کسی بے گناہ کے سر تھوپ دیا اس نے ایک بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔

تشریح کلمات

یَرۡمِ: (ر م ی) رمیٰ۔ تیر اندازی۔ بہتان لگانا بھی زبان کا زخم لگانا ہے، اسی لیے اسے رمیٰ بھی کہتے ہیں۔

بہتان: ایسا الزام جسے سن کر انسان ششدر اور حیران رہ جائے۔

تفسیر آیات

اس آیت میں ایک ایسے جرم کا ذکر ہے، جس کا تعلق الٰہی اقدار سے بھی ہے اور انسانی اقدار سے بھی۔ الٰہی اقدار سے متعلق اس لیے کہ یہ اللہ کے حکم کی نافرمانی اور خطا و گناہ کا ارتکاب کرنا ہے۔ انسانی اقدار سے متعلق اس لیے ہے کہ کسی گناہ کا الزام کسی بے گناہ شخص پر تھوپ دینا ہے۔

اس آیت میں بَرِیۡٓـًٔا تنوین تنکیر کے ساتھ مذکور ہے، جس کا مطلب بنتا ہے: کوئی بے گناہ۔ اس میں مذہب، قوم اور گروہ کی قید نہیں ہے۔ اگر کسی یہودی کے سر تھوپ دیا جائے تو بھی یہ صریح گناہ ہے۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام انسانی اقدار میں سب انسانوں کو مساوی حقوق دیتا ہے اور تمام انسان اسلام کے نزدیک محترم ہیں، بشرطیکہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کسی جرم و جاہلیت کا ارتکاب نہ کریں۔

اس آیت کا سبب نزول اگرچہ خاص واقعہ ہے، لیکن اس کا اطلاق عام اور کلی ہے، جو تمام لوگوں کے لیے ہے۔ لہٰذا اس آیت سے بہتان کے عظیم گناہ ہونے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بہتان کو گناہ تصور ہی نہیں کیا جاتا، خصوصاً سیاست میں تو بہتان کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔

وَ لَوۡ لَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکَ وَ	۱۱۳۔ اور (اے رسول) اگر اللہ کا فضل اور اس کی

رَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَیْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ

رحمت آپ کے شامل حال نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ نے تو آپ کو غلطی میں ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تھا حالانکہ وہ خود کو ہی غلطی میں ڈالتے ہیں اور وہ آپ کا تو کوئی نقصان نہیں کر سکتے اور اللہ نے آپ پر کتاب و حکمت نازل کی اور آپ کو ان باتوں کی تعلیم دی جنہیں آپ نہیں جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ: لوگ اگرچہ کوشش کریں کہ آپ (ص) ان کی خواہشات کے مطابق عمل کریں اور آپ کوئی غلط فیصلہ کریں، ان کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوگی اور وہ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔
اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس کی دو وجوہات بیان فرمائی ہیں:

i۔ اللہ نے ان پر کتاب و حکمت نازل کی۔

ii۔ انہیں علم عنایت فرمایا۔

۲۔ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ: اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ کی طرف سے کتاب و حکمت کے علاوہ بھی تعلیم کے لیے رسول اللہ (ص) کے پاس خصوصی ذرائع موجود تھے۔

۳۔ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ: جن کی وجہ سے رسول خدا (ص) علم و معرفت اور کشف حقائق کی اس منزل پر فائز تھے، جس کے بعد خلاف عصمت کسی غلطی کے سرزد ہونے کا امکان نہیں رہتا۔ چنانچہ علم و یقین کا نتیجہ عصمت ہے۔ البتہ علم و یقین حاصل ہونے کے بعد عصمت قائم رکھنے پر مجبور بھی نہیں ہوتا، بلکہ یہاں عزم و ارادہ، نفس کی پاکیزگی اور محبت الٰہی کی وجہ سے اپنے اختیار سے عصمت پر قائم رہتا ہے۔ اسی وجہ سے معصوم کی عصمت کو فضیلت حاصل ہے۔

۴۔ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ: اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ چیزوں کے ساتھ رسول اللہؐ کو ایک فضل بھی حاصل ہے۔

اہم نکات

۱۔ رسولؐ کو اللہ کی طرف سے کتاب، حکمت، علم اور فضل عظیم حاصل ہے۔

لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوٰهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿۱۱۴﴾	۱۱۴۔ ان لوگوں کی بیشتر سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں ہے مگر یہ کہ کوئی صدقہ، نیکی یا لوگوں میں اصلاح کی تلقین کرے اور جو شخص اللہ کی خوشنودی کے لیے ایسا کرے تو اسے عنقریب ہم اجر عظیم عطا کریں گے۔

تشریح کلمات

نجوی: (ن ج و) سرگوشی۔ اصل معنی یا تو بلند زمین پر تنہا کسی کے ساتھ ہونے کے ہیں یا بقول بعض اسے نجاۃ سے لیا گیا ہے، لہٰذا ناجیتہ کے اصل معنی کسی کی رہائی کے لیے اس کی مدد کرنے کے ہیں یا اپنے بھید کو دوسروں پر افشا ہونے سے بچانے کے ہیں۔ (راغب)

تفسیر آیات

زیر زمین چلنے والی باتیں نہایت خطرناک ہوتی ہیں۔ اس لیے عام طور پر راز میں دو باتیں کہی جاتی ہیں: ایک وہ جو اپنے فائدے کی ہو اور دوسری وہ جو دوسروں کے لیے نقصان دہ ہو۔ ورنہ اگر بھلائی کی بات ہو تو اکثر اسے چھپانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ البتہ بھلائی کی بات کو اس وقت چھپایا جاتا ہے، جب اسے کسی قسم کی ریاکاری سے پاک رکھنا مقصود ہو۔ چنانچہ صدقات کے بارے میں ارشاد ہوا:

إِن تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۖ وَإِن تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ...[1]	اگر تم علانیہ خیرات دو تو وہ بھی خوب ہے اور اگر پوشیدہ طور پر اہل حاجت کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔

ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ: آیت کے دوسرے حصے میں ایک اہم کلیہ بیان فرمایا: اور جو شخص اللہ کی خوشنودی کے لیے ایسا کرے تو اسے عنقریب ہم اجر عظیم عطا کریں گے۔ ظاہر ہے صدقہ، نیکی اور اصلاح اپنی جگہ حسن رکھتے ہیں۔ اللہ کی مرضی کو مقصد بنا کر اگر ان اعمال حسنہ کا انجام دینے والا بھی اپنے اندر حسن پیدا کرے تو اس صورت میں یہ عمل نیک، قابل اجر و ثواب ہوتا ہے، ورنہ اگر عمل میں حسن ہو اور عامل میں حسن نہ ہو تو اجر و ثواب کا مستحق نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک چور صدقہ دیتا ہے یا ایک پیشہ ور مجرم اور قاتل رفاہی کام کرتا ہے تو اس کا یہ عمل لوگوں کی نظروں میں بھی قابل ستائش نہ ہوگا، بلکہ لوگ اسے طعن و تشنیع کا نشانہ بنائیں گے۔ اس بات

---

[1] ۲ بقرہ: ۲۷۱

سے اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے جو عام لوگ کرتے ہیں کہ آیا غیر مسلم سائنسدانوں کو بھی کوئی ثواب ملے گا، جنہوں نے انسانیت کے لیے بہت سی خدمات انجام دی ہیں؟

اہم نکات

۱۔ اللہ کی خوشنودی کو مقصد بنانے سے مؤمن میں حسن پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ مؤمن میں حسن پیدا ہونے سے اس کے عمل میں حسن آ جاتا ہے اور ثواب میں اضافہ ہوتا ہے۔

وَ مَنۡ یُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُ الۡہُدٰی وَ یَتَّبِعۡ غَیۡرَ سَبِیۡلِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی وَ نُصۡلِہٖ جَہَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتۡ مَصِیۡرًا ﴿۱۱۵﴾

۱۱۵۔ اور جو شخص ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد بھی رسول کی مخالفت کرے اور مومنین کا راستہ چھوڑ کر کسی اور راستے پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے ہم اسے ادھر ہی چلنے دیں گے اور ہم اسے جہنم میں جھلسا دیں گے جو بدترین ٹھکانا ہے۔

تشریح کلمات

یُشَاقِقِ: (ش ق ق) انشقاق۔ مخالفت۔ گویا ہر فریق مخالفت کی ایک شِق کو اختیار کر لیتا ہے۔

تفسیر آیات

حق اور ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد صرف عناد اور عصبیت کی بنا پر رسول اللہ (ص) کے حکم کی مخالفت کرنا اور رسول (ص) کی اطاعت میں اہل ایمان نے جو روش اختیار کی ہے، اس سے ہٹ کر اپنی خواہش کے مطابق کوئی اور سبیل تلاش کرنا کفر و ضلالت کی نشانی ہے۔ یہاں دو مسائل قابل توجہ ہیں:

❁ یَتَّبِعۡ غَیۡرَ سَبِیۡلِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ: یعنی مومنین کا راستہ چھوڑ کر کسی اور راستے پر چلے۔ اس جملے میں بعض مفسرین نے اجماع کے حجت ہونے پر استدلال کیا ہے کہ جب کسی مسئلے میں مومنین نے اجماعاً ایک راستے کا انتخاب کر لیا تو دوسروں پر اس اجماع کی پیروی کرنا واجب ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ آیت کا کسی اجماع سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہاں رسول (ص) کی اطاعت اور عدم مخالفت کا ذکر ہے۔ مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ رسول اکرم (ص) کی عدم مخالفت اور اتباع میں مومنین نے جو روش بنائی ہے، اس سے ہٹ کر کوئی اور روش اختیار کرنے والا جہنمی ہے۔ جب کہ اجماع خود مومنین کی اپنی روش سے متعلق ہے۔

❁ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی: جدھر وہ چلتا ہے ہم اسے ادھر ہی چلنے دیں گے۔ اس جملے سے خیرہ و شرہ من اللّٰہ کے نظریۂ جبر کا باطل ہونا نہایت واضح ہو جاتا ہے۔ انسان اپنے اعمال میں خود مختار ہے

اور کسی قسم کا جبر اس پر حاکم نہیں ہے۔ اشاعرہ کے نظریہ جبر کے باطل ہونے پر صاحب تفسیر المنار کا اس جملے پر تبصرہ قابل مطالعہ ہے۔

اہم نکات

۱۔ جو رسولؐ کی مخالفت کرتا ہے، اللہ اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے: نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی ....۔

۲۔ جس کو اللہ اپنے حال پر چھوڑ دے، یہ اس کے لیے بڑی سزا ہے: وَسَآءَتۡ مَصِیۡرًا ... ۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ وَ یَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَمَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰہِ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا ﴿۱۱۶﴾

۱۱۶۔ اللہ صرف شرک سے درگزر نہیں کرتا اس کے علاوہ جس کو چاہے معاف کر دیتا ہے اور جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا وہ گمراہی میں دور تک چلا گیا۔

تفسیر آیات

اس مضمون کی آیت ۴۸ اسی سورہ میں پہلے بھی ذکر ہوئی ہے، لیکن دو باتوں کی وجہ سے اسی مطلب کو یہاں دوبارہ ذکر فرمایا ہے: ایک تو یہ بتانے کے لیے کہ رسول (ص) کی مخالفت اور اطاعت رسول (ص) میں مومنین کی روش کے خلاف چلنا شرک اور ناقابل معافی ہے۔ دوسری یہ کہ کسی اہم مطلب کو ذہنوں میں راسخ کرنے کا واحد ذریعہ تکرار ہے۔ جیسا کہ تجارتی اشتہارات میں تکرار اسی وجہ سے عمل میں آتا ہے۔

آیت ۴۸ میں بتایا گیا ہے کہ مشرک اللہ کی بندگی کے دائرے سے خارج ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ جو مانگتا ہے، غیر اللہ سے مانگتا ہے۔ مشرک اللہ کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا، تا کہ اللہ اسے معاف کر دے۔ وہ تو بتوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنا رخ بتوں کی طرف کرے اور اللہ اسے معاف کر دے۔

اہم نکات

۱۔ شرک اللہ کی بندگی سے خروج کا نام ہے۔

اِنۡ یَّدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَ اِنۡ یَّدۡعُوۡنَ اِلَّا شَیۡطٰنًا مَّرِیۡدًا ﴿۱۱۷﴾ لَّعَنَہُ اللّٰہُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنۡ

۱۱۷۔ وہ اللہ کے سوا صرف مؤنث صفت چیزوں کو پکارتے ہیں اور وہ تو بس باغی شیطان ہی کو پکارتے ہیں۔

۱۱۸۔ اللہ نے اس پر لعنت کی اور اس نے اللہ سے کہا: میں تیرے بندوں میں سے ایک مقررہ

عِبَادِكَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴿١١٨﴾ حصہ ضرور لے کر رہوں گا۔

تفسیر آیات

اس آیت میں شرک قابل عفو نہ ہونے کی وجہ بتائی گئی ہے کہ اللہ ایسے لوگوں کو کیسے معافی دے سکتا ہے، جب کہ یہ لوگ تو مؤنث چیزوں کو پکارتے ہیں اور شیطان کو پکارتے ہیں۔ اناث سے بعض مفسرین نے لات و عزیٰ وغیرہ مراد لیے ہیں، کیونکہ یہ الفاظ عربی محاورے میں مؤنث استعمال ہوتے ہیں اور بعض مفسرین مؤنث کے لغوی معنی مراد لیتے ہیں۔ یعنی لغت میں ہر ضعیف الاثر چیز کو انثی کہتے ہیں۔ چونکہ تمام حیوانات میں مادہ بہ نسبت نر کے کمزور ہوتی ہے۔ چنانچہ کمزور لوہے کو حدید انیث کہا جاتا ہے (المفردات)۔ اس اعتبار سے آیت کے یہ معنی بنتے ہیں کہ لوگ اللہ کے علاوہ دوسری کمزور اور بے طاقت چیزوں کو پکارتے ہیں۔

نَصِيبًا مَّفْرُوضًا: شیطان بندوں کی تمام چیزوں، حتیٰ کہ مال و اولاد اور عبادت میں سے بھی ایک قابل توجہ حصہ اپنے لیے لیتا ہے۔ یعنی عبادت میں خلوص جس قدر کم ہوگا، اسی مقدار میں شیطان کا حصہ زیادہ ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ جو غیر اللہ کے دروازے پر ہاتھ پھیلاتا ہے، وہ ایسا ہے جیسے ناتواں سے مانگے: اِلَّآ اِنٰثًا ....

وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿١١٩﴾

۱۱۹۔ اور میں انہیں ضرور گمراہ کروں گا اور انہیں آرزوؤں میں ضرور مبتلا رکھوں گا اور انہیں حکم دوں گا تو وہ ضرور جانوروں کے کان پھاڑیں گے اور میں انہیں حکم دوں گا تو وہ اللہ کی بنائی ہوئی صورت میں ضرور ردوبدل کریں گے اور جس نے اللہ کے سوا شیطان کو اپنا سرپرست بنا لیا پس یقیناً وہ صریح نقصان میں رہے گا۔

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿١٢٠﴾

۱۲۰۔ وہ انہیں وعدوں اور امیدوں میں الجھاتا ہے اور ان کے ساتھ شیطان کے وعدے بس فریب پر مبنی ہوتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۫ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿١٢١﴾

۱۲۱۔ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ اس سے بچ نکلنے کی کوئی جگہ نہیں پائیں گے۔

تشریح کلمات

التبتیك: (ب ت ك) پھاڑنا یا کاٹنا۔

تفسیر آیات

اس آیت میں شیطان کے گمراہ کن حربوں کا ذکر ہے:

i۔ شیطان بندوں کو آرزؤں میں الجھا کر یاد خدا سے غافل کر دیتا ہے۔

ii۔ لوگوں کو توہمات میں ڈال کر انسان ساز دستور حیات واحکام شریعت سے دور کرتا ہے۔ مثلاً عربوں کی ایک توہم پرستی کی طرف آیت میں اشارہ ہوا ہے کہ اونٹنی جب پانچ یا دس بچے جن لیتی تو وہ اس کے کان پھاڑ کر دیوتا کے نام کر دیتے اور اس سے کام لینا حرام سمجھتے تھے۔

ii۔ اللہ کی بنائی ہوئی صورت اور خدائی ساخت میں ردو بدل کر دیتا ہے۔ مثلاً انسان اور انسانی اعضا وجوارح کو جن اہداف ومقاصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے، ان میں استعمال ہونے نہیں دیتا۔

اگر اس سے تکوینی تغییر مراد لیا جائے تو آپریشن کے ذریعے جنس کی تبدیلی جیسے امور اس میں شامل ہوں گے اور اگر اس سے تشریعی تغییر مراد لیا جائے تو اللہ کے وضع کردہ فطری احکام کی تبدیلی اس میں شامل ہے۔

یَعِدُھُمۡ وَ یُمَنِّیۡھِمۡ: اس آیت میں وہ سبب بیان ہوا ہے، جس کی وجہ سے شیطان سے دوستی کرنے والے خسارے میں رہتے ہیں۔ وہ یہ کہ شیطان ہمیشہ الٰہی دستور حیات اور انسانی و اخلاقی اقدار کے بارے میں انسان کو دھوکے میں مبتلا کرتا ہے۔

انسان کی نفسیاتی کمزوریوں سے شیطان فائدہ اٹھاتا ہے اور اسے امیدوں اور آرزؤں کے ذریعے گمراہ کرتا ہے۔

آیت سے کلوننگ کی حرمت پر استدلال کیا جاتا ہے کہ کلوننگ تخلیقی عمل میں تغییر ہے اور تغییر اس آیت کی رو سے عمل شیطان ہے۔

مناسب ہو گا کہ اس جگہ ہم کلوننگ کے بارے میں ایک مختصر وضاحت پیش کریں، بعد میں ہم آیت کے مفہوم میں بحث کریں گے۔

انسانی تخلیق: انسانی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کا وضع کردہ معمول کچھ اس طرح ہے کہ اس میں مردوزن دونوں کا اشتراک ہوتا ہے اور اس اشتراک سے وجود میں آنے والا بچہ نہ باپ ہوتا ہے، نہ ماں، بلکہ وہ اپنی شکل وصورت و دیگر خصوصیات میں دونوں سے امتیاز رکھتا ہے۔

مرد و زن کے اشتراک کی صورت: تخلیقی عمل میں مرد و زن کے اشتراک کی صورت اس طرح

ہے کہ انسانی تخلیق سیل (Cell) سے ہوتی ہے اور ابتدائی سیل کی فراہمی میں مرد و زن دونوں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ سیل (Cell) کی دو قسمیں ہیں۔ جسمانی سیل اور جنسی سیل۔ جسمانی سیل ایک مستقل سیل ہوتا ہے جس کا مرکزہ 46 کروموزوم (Chromosome) پر مشتمل ہوتا ہے۔ جبکہ جنسی سیل مستقل سیل نہیں ہوتا بلکہ نصف سیل ہوتا ہے۔ اس کا مرکزہ صرف 23 کروموزوم پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس طرح ماں اور باپ کا جنسی سیل یعنی نطفہ پدر اور تخم مادر میں سے ہر ایک 23 کروموزم پر مشتمل ہے اور جنسی آمیزش کے ذریعہ 23 کروموزوم مرد اور 23 کروموزوم عورت فراہم کرتی ہے۔ جن سے 23+23 = 46 کروموزم پر مشتمل ایک مستقل سیل وجود میں آتا ہے۔ یہی سیل آنے والے بچے کی تخلیق کے لیے خشت اول ثابت ہوتا ہے۔ یہ آمیزش رحم میں بھی ہوتی ہے اور رحم سے خارج ٹیسٹ ٹیوب میں بھی۔

یہ ابتدائی سیل اپنی تکمیل کے بعد اپنے آپ کو تقسیم کرتا ہے۔ دو، چار، آٹھ، سولہ، بتیس۔ اس تعداد تک ہر ایک سیل سے ایک ایک بچہ وجود میں آ سکتا ہے یعنی ان 32 سیلز میں سے ہر ایک کو جدا جدا سازگار فضا فراہم کی جائے تو 32 جڑواں بچے وجود میں آ سکتے ہیں۔ البتہ 32 کے بعد اور بعض سائنسدانوں کے مطابق 125 کے بعد یہ سیلز آپس میں تقسیم کار کرتے ہیں۔ اس تقسیم کار کے بعد ہر سیل اپنے حصے میں آنے والے تخلیقی امور کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اب یہ کل انسانی تخلیق کے لیے بنیادی سیل نہیں رہتے۔ مثلاً اگر اس سیل کے ذمے مغز بنانا آیا ہے تو اب یہ سیل صرف مغز بناتا ہے۔

کلوننگ: اس طریقہ تولید میں مرد و زن کا اشتراک نہیں ہوتا، بلکہ اس میں صرف مرد یا صرف عورت سے ایک مکمل سیل کے لیے ضروری مواد یعنی 46 کروموزوم حاصل کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے جنسی سیل کی جگہ جسمانی سیل حاصل کرتے ہیں اور عورت کا ایک تخم بھی حاصل کرتے ہیں۔

اس تخم میں موجود 23 کروموزوم کو اس سے خارج کرتے ہیں اور اس خالی تخم کے اندر جسمانی سیل کے 46 کروموزوم رکھ دیتے ہیں۔ اس کروموزوم کو اس تخم کے اندر رکھنا اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس سیل کے مرکزہ اور جھلی کے درمیان میں موجود سیال مواد سیل کی تقسیم کے لیے بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ اس سیال مواد کو سیٹوپلازم (Cytoplasm) کہتے ہیں۔ یہ سیٹوپلازم اپنے مہمان کروموزوم کو تقسیم کر کے جنین کی تشکیل کا کام شروع کرتا ہے۔ اب یہ بچہ سیل کے مالک کی کاربن کاپی ہوگا۔ کیونکہ اس بچے کے تمام موروثی عناصر اس سیل کے مالک نے فراہم کیے ہیں۔ کلوننگ کی صحیح تصویر سامنے آنے کے بعد سوال اس طرح بنتا ہے۔

کیا انسان کی افزائش نسل کے لیے دو صنفوں (مرد و زن) کی جائز طریقے سے شرکت ضروری ہے یا صرف ایک صنف اس کو انجام دے سکتی ہے؟

یہاں دو نظریے موجود ہیں ایک نظریے کے تحت صرف پہلی صورت جائز ہے، دوسری صورت یعنی کلوننگ جائز نہیں ہے۔ اس عدم جواز کی دو صورتیں ہیں:

i۔ اللہ نے پیدائش انسان کے لیے جو فطری طریقہ وضع کیا ہے، اس میں تغییر جائز نہیں۔
ii۔ کلوننگ کے ذریعے انسان کی پیدائش سے افراد بشر میں شناخت اور امتیاز ختم ہو جاتا ہے، جس سے نسب، میراث، نکاح، معاملات، ڈگریوں، گواہ اور دیگر بہت سے مسائل میں شناخت اور امتیاز نہ ہونے کی وجہ سے معاشرتی نظام میں ناقابل تلافی نقصان پیدا ہو سکتا ہے، جب کہ اللہ کا ارشاد ہے:

وَمِنۡ اٰیٰتِہٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِکُمۡ وَاَلۡوَانِکُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡعٰلِمِیۡنَ ○ ...[1]	اور آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا بھی اس کی نشانیوں میں سے ہے علم رکھنے والوں کے لیے یقیناً اس میں نشانیاں ہیں.

نیز ارشاد فرمایا:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ وَّ اُنۡثٰی وَ جَعَلۡنٰکُمۡ شُعُوۡبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوۡا ؕ اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیۡمٌ خَبِیۡرٌ ○ [2]	اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا پھر تمہیں قومیں اور قبیلے بنا دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، تم میں سب سے زیادہ معزز اللہ کے نزدیک یقیناً وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے، اللہ یقیناً خوب جاننے والا خوب باخبر ہے۔

اس مؤقف پر دو اور آیتوں سے استدلال کیا جاتا ہے: پہلی آیت ہماری زیر بحث آیت ہے، جس میں شیطان کی زبانی فرمایا: وَلَاٰمُرَنَّهُمۡ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلۡقَ اللّٰهِ۔ میں انہیں حکم دوں گا تو وہ اللہ کی بنائی ہوئی خلقت میں ضرور رد و بدل کریں گے۔ دوسری آیت:

فَلۡیَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ مِمَّ خُلِقَ ؕ خُلِقَ مِنۡ مَّآءٍ دَافِقٍ ۙ یَّخۡرُجُ مِنۡۢ بَیۡنِ الصُّلۡبِ وَالتَّرَآئِبِ ○ [3]	پس انسان کو دیکھنا چاہیے وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے، وہ اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے (کی ہڈیوں) سے نکلتا ہے۔

اس اعتبار سے کلوننگ اللہ تعالیٰ کے تخلیقی نظام میں مداخلت اور تغییر ہے اور مرد و زن کے اشتراک کے بغیر انسان کی پیدائش اس قانون فطرت سے انحراف ہے۔

دوسرا نظریہ، یہ ہے کہ کلوننگ کا عمل نہ صرف یہ کہ قانون تخلیق میں مداخلت نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانون فطرت میں مداخلت ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تخلیق ابداعی ہوتی ہے۔ یعنی عدم سے وجود میں لانا اور خلق ابداعی میں مداخلت ناممکن ہے۔ چنانچہ انسانی تخلیق میں دو باتوں کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ دونوں میں انسان کی مداخلت ناممکن ہے۔ وہ ہے سیل کی تخلیق اور سیل کا ارتقائی عمل۔ کلوننگ میں نہ تو سیل کی تخلیق ہوتی ہے، نہ ہی تقسیم کے ذریعہ سیل کے ارتقائی عمل میں انسان کا کوئی کردار ہے، بلکہ

---

[1] ۳۰ روم: ۲۲ [2] ۴۹ حجرات: ۱۳ [3] ۸۶ طارق: ۵ تا ۷

یوں کہنا چاہیے کہ سیل کے مرکزی حصے DNA میں موجود تین ارب سالموں میں سے ایک سالمے میں بھی انسان مداخلت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ مفسرین نے اس آیت کے ذیل میں خلق اللّٰہ سے مراد فطرۃ اللّٰہ لیا ہے اور اللہ نے فطرۃ اللّٰہ کو دین قیم کہا ہے:

فَاَقِمۡ وَجۡہَکَ لِلدِّیۡنِ حَنِیۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰہِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡہَا ؕ لَا تَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ ٭ۙ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿٭ۙ﴾[1]	پس (اے نبی) یکسو ہو کر اپنا رخ دین (خدا) کی طرف مرکوز رکھیں، (یعنی) اللہ کی اس فطرت کی طرف جس پر اس نے سب انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہے، یہی محکم دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

حضرت محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ خلق اللہ سے مراد دین فطرت ہے[2] نیز تفسیر قرطبی میں رسول اللہؐ سے بھی ایک روایت ہے کہ اس سے مراد دین فطرت ہے۔ اس تفسیر کے مطابق خلق اللّٰہ میں رد و بدل سے مراد دین فطرت کے احکام میں رد و بدل ہے۔ یعنی شیطان کے فریب سے لوگ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دیتے ہیں۔

دوسری آیت میں فرمایا کہ انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے (کی ہڈیوں) سے نکلتا ہے۔

کلوننگ میں چونکہ مرد و زن کے اشتراک کے بغیر انسان کی پیدائش ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ قانون فطرت سے انحراف ہے۔

اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ آیت کی نظر تخلیق کے عام حالات پر ہے، جس میں مرد و زن کا اشتراک ہے۔ آیت میں اس بات کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے کہ تخلیق کا عمل اسی صورت میں منحصر ہے۔ خدا کے قانون فطرت میں بھی انحصار نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت آدم و حوا اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی تخلیق میں مرد و زن کا اشتراک نہیں ہے۔

نیز آیت کا محل بیان و مورد نظر یہ ہے کہ اللہ کے لیے قیامت کے دن دوبارہ لوگوں کو زندہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ جس نے انسانوں کو پیٹھ اور سینے سے نکلنے والے پانی سے پیدا کیا ہے، وہ اس کو دوبارہ پیدا کر سکتا ہے۔ لہٰذا محل بیان طریقہ تخلیق نہیں ہے، بلکہ امکان تخلیق ہے۔

البتہ ایک بات قابل توجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عام حالات میں جو تخلیقی طریقہ اختیار کیا ہے وہ مرد و زن کے اشتراک سے ہے۔ اس اشتراک کے بغیر اسے یک طرفہ کر دینا ایک قسم کی تغییر شمار ہو سکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ نے تخلیق کے لیے ایک قسم کا سیل مخصوص کر رکھا ہے جسے جنسی سیل کہتے ہیں۔

---

[1] ۳۰ روم آیت ۳۰　[2] التبیان اسی آیت کے ذیل میں

کلوننگ میں اس سے ہٹ کر جسمانی سیل سے تخلیق کا کام لیا جاتا ہے جو ایک قسم کی تبدیلی ہے۔

یہ کہنا کہ خود اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کی تخلیق میں یک طرفہ طریقہ تخلیق اختیار کیا ہے، درست نہیں ہے، کیونکہ حضرت عیسیٰ کی تخلیق یک طرفہ نہ تھی بلکہ:

فَنَفَخۡنَا فِیۡہَا مِنۡ رُّوۡحِنَا ....[1] ہم نے مریم میں اپنی روح پھونک دی۔

سے گمان ہوتا ہے کہ ایک قدرتی تخم مریم (س) سے جڑ گیا اور عیسیٰ (ع) کی تخلیق ہو گئی۔ تاہم یہ خدائی عمل ہے، اس کا بشری عمل کے ساتھ موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ بات ہنوز تجربہ طلب ہے کہ کیا کلوننگ سے وجود میں آنے والا انسان انفرادی اور اجتماعی زندگی دوسرے انسانوں کی طرح گزار سکے گا۔

کلوننگ کے بارے میں بہت باتیں ہمارے معاصر انسانوں کے لیے جواب طلب ہیں اور انسانی تولید میں جو قدرتی عمل ہے یعنی جنسی ملاپ، اس کے بغیر انسان پیدا ہونے لگیں تو اس کا کیا حشر ہوگا؟ اس صورت میں خاندان کے تشخص کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس بچے کی شناخت کیا ہو گی۔ کیونکہ بیالوجیکلی (Biolo gically) اس کے باپ کا تعین ہے نہ ماں کا۔ کیونکہ سیل(Cell) کا مالک یعنی جس کے سیل سے یہ بچہ پیدا ہوا ہے، بیالوجیکلی (Biologically) وہ جڑواں بھائی ہے اور سیل(Cell) کے مالک کے آبا و اجداد جیناتی اعتبار سے اس بچے کے ماں باپ ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا درج ذیل سوالات پیدا ہوں گے:

i۔ اس کا باپ کون ہو گا۔ کیونکہ باپ وہ ہے جس کے نطفے سے پیدا ہوا ہو۔ یہ بچہ کسی انسان کے نطفے سے پیدا نہیں ہوا بلکہ ایک شخص کے جسم کی ایک جز، سیل (Cell) سے پیدا ہوا ہے۔ کسی شخص کو کسی اور شخص کے بدن کی جز سے بنایا جائے، وہ اس کا باپ نہیں کہلائے گا، بلکہ بیالوجیکلی (biologically) وہ اس کا جڑواں ہے۔ خصوصاً اگر یہ سیل (cell) ایک عورت سے لیا جائے تو وہ عورت اس کا باپ یقیناً نہ ہو گی۔

بعض فقہاء نے اتفاق کیا ہے کہ سیل (cell) کا مالک اس بچے کا باپ نہیں ہے۔[2]

ii۔ اس کی ماں کون ہو گی؟ کیونکہ یہاں ایک نہیں کئی مائیں ہیں یا کوئی ماں نہیں ہے۔ کیونکہ ماں وہ ہے، جس کا تخم جرثومہ پدر کے ساتھ جفت ہو گیا ہو۔ یہاں ماں کے تخم سے کروموزومز (chromosome) نکال لیے گئے ہیں۔ صرف اس تخم کی جھلی سے کام لیا گیا ہے۔

کیا اس کی ماں وہ عورت ہو گی جس کے تخم کی جھلی سے کام لیا گیا ہے؟

یا وہ عورت جس کے رحم میں اس کو پرورش ملی؟

یا وہ عورت جس سے سیل لیا گیا۔ کیونکہ وہ باپ تو نہیں ہو سکتی تو کیا ماں ہو سکے گی؟

---

[1] ۲۱ انبیاء ۹۱ [2] آیۃ اللہ السید محمد سعید الحکیم۔ مجلہ النور شمارہ ۱۶۲

یا وہ عورت جس کی گود میں پرورش پائی؟

یا وہ عورت جس نے اس عورت کو جنا، جس سے سیل لیا گیا۔ یعنی نانی؟

iii۔ اس کے نسب کے بارے میں کیا فیصلہ ہوگا۔ کیا سیل (cell) کا مالک اگر سید ہے تو یہ بچہ سید شمار ہوگا؟

فقہاء نے جب سیل (cell) کے مالک کو باپ نہیں تسلیم کیا تو یہ بچہ نسب میں سیل (cell) کے مالک کے تابع نہ ہوگا۔

iv۔ اگر سیل(cell) کا مالک باپ نہیں ہے تو کیا وہ اس سے شادی کر سکے گا؟

اگرچہ سیل (cell) کے مالک کو باپ تسلیم نہیں کیا جاتا، تاہم یہ بچہ اس کے جسم کا حصہ ضرور ہے۔ اس اعتبار سے شادی جائز نہ ہوگی۔

بہرحال کلوننگ سے خاندانی تشخص کا خاتمہ ہوگا۔ کیونکہ ایسے بچوں کی پیدائش کے لیے جنسی ملاپ ضروری نہیں رہتا۔ اس کے نتیجے میں قدرتی انسان کی جگہ صنعتی انسان آنے کے بعد وہ کس قسم کا معاشرہ تشکیل دے گا؟ ابہامات اور سوالات ہیں۔

ایک اور بات بڑے اہتمام کے ساتھ بین الاقوامی سطح پر اٹھائی جا رہی ہے:

اگر انسانی تخلیق کے قدرتی عمل میں مداخلت ہوئی تو وارثتی جینات میں تصرف شروع ہو جائے گا اور انسان کے جینز (genies) میں موجود خاصیتوں، ذہانت، قد، رنگ وغیرہ کا علم ہو گا تو دولتمند لوگ بہتر ذہانت اوراعلیٰ صلاحیتوں کے مالک بچے بنوانا شروع کریں گے۔ اس کے نتیجے میں ایک خطرناک ناقابل تصور طبقاتی معاشرہ وجود میں آئے گا۔ کیونکہ ایک طرف ایسے بچے پیدا ہوں گے جو انسانی صلاحیتوں سے مافوق صلاحیتوں کے مالک ہوں گے۔ دوسری طرف ان کے مقابلے میں بے بس بے چارے لوگ ہوں گے۔

وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدۡخِلُهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَبَدًا‌ ؕ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقًّا‌ ؕ وَمَنۡ اَصۡدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيۡلًا ﴿۱۲۲﴾

۱۲۲۔اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک اعمال بجا لاتے ہیں عنقریب ہم انہیں ایسی جنتوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی، وہ وہاں ابد تک ہمیشہ رہیں گے، اللہ کا سچا وعدہ ہے اور بھلا اللہ سے بڑھ کر بات کا سچا کون ہوسکتا ہے؟

تفسیر آیات

۱۔ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: ایمان اور عمل صالح، دو ایسے وسائل ہیں جن کے ذریعے جنت کی ابدی زندگی مل سکتی ہے۔ نہ صرف ایمان، نہ صرف عمل، دونوں باہم ہونے کی صورت میں منزل کی طرف جانے والی مسافت طے ہو جاتی ہے۔

۲۔ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقًّا: شیطان کے جھوٹے وعدوں کے مقابلے میں الٰہی وعدوں کا ذکر ہے کہ اللہ صادق الوعد ہے اور یہ کہکر: اللہ سے بڑھ کر سچی بات کرنے والا کون ہوسکتا ہے، انسانی عقل وضمیر کو جھنجھوڑا جا رہا ہے۔

۳۔ وَمَنۡ اَصۡدَقُ مِنَ اللّٰهِ: بھلا اللہ کو جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہمیشہ محتاج جھوٹ کا سہارا لیتا ہے۔ اللہ پوری کائنات سے بے نیاز ہے۔

لَيۡسَ بِاَمَانِيِّكُمۡ وَلَاۤ اَمَانِيِّ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ ؕ مَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡۤءًا يُّجۡزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدۡ لَهٗ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيۡرًا ﴿۱۲۳﴾

۱۲۳۔ نہ تمہاری آرزوؤں سے (بات بنتی ہے)، نہ اہل کتاب کی آرزوؤں سے، جو برائی کرے گا وہ اس کی سزا پائے گا اور اللہ کے سوا نہ اسے کوئی کارساز میسر ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔

تفسیر آیات

۱۔ لَيۡسَ بِاَمَانِيِّكُمۡ: اس آیت میں نہایت اہمیت کے حامل نکتے کی وضاحت فرمائی گئی ہے کہ مذہب صرف آرزوؤں کا نام نہیں ہے، جیسا کہ دین کے تاجروں، جاہلوں اور دین دشمنوں نے خیال کر رکھا ہے۔

۲۔ مَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡۤءًا: اس آیت میں مسلمانوں سے خطاب کر کے فرمایا: تمام ادیان کا دار و مدار عمل پر ہے۔ اگر کوئی برائی کرتا ہے تو اس کی سزا بھگتنا ہوگی، خواہ مسلم ہو یا اہل کتاب۔

احادیث

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

اَلۡاَمَانِیُّ شِیۡمَۃُ الۡحُمۡقیٰ۔[1] — صرف آرزوؤں پر بھروسہ کرنا احمقوں کی عادت ہے۔

اَلۡاَمَانِیُّ ھِمَّۃُ الۡجُھَّالِ [2] — جاہلوں کا عزم وہمت یہ ہے کہ آرزوؤں پر تکیہ کریں۔

---

[1] و [2] مستدرک الوسائل ۱۳: ۴۷

اہم نکات

۱۔ علم و عقل سے عاری لوگ عمل کی جگہ صرف آرزوں پر تکیہ کرتے ہیں۔

وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّةَ وَلَا یُظۡلَمُوۡنَ نَقِیۡرًا﴿۱۲۴﴾

۱۲۴۔ اور جو نیک اعمال بجا لائے خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو (سب) جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ: عمل صالح پر مِنۡ داخل ہونے سے یہ مطلب بنتا ہے کہ نیکیوں میں سے کچھ حصہ انجام دے تو اللہ اسے جنت میں داخل کر دے گا اور یہ اللہ کے فضل وکرم کی ایک عظیم بشارت ہے۔

۲۔ مِنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی: عمل صالح کی جزا پانے میں مرد یا عورت کو کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے۔ اس میں ان قدیم مذاہب و نظریات کی رد ہے جن میں عورت کو جنس کی بنا پر عمل صالح کے اجر و ثواب کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔

۳۔ وَهُوَ مُؤۡمِنٌ: سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ عمل صالح سے اجر و ثواب کا حقدار اس وقت ہوتا ہے، جب عمل صالح انجام دینے والا مومن بھی ہو۔ کیونکہ اگر عمل صالح انجام دینے والا مومن نہیں ہے تو اس کے عمل میں تو حسن ہے، لیکن عمل کنندہ میں حسن نہیں ہے۔ ثواب کے لیے حسن فعلی کے ساتھ حسن فاعلی شرط ہے۔ مثلاً ایک شخص حرام کی کمائی سے یتیم کی مالی کفالت کرتا ہے تو اگرچہ یتیم پر رحم کرنا حسن عمل رکھتا ہے لیکن یہ شخص خود حسن فاعلی نہیں رکھتا، اس لیے اسے اس عمل کا ثواب نہیں ملے گا۔ دوسرے لفظوں میں غیر مومن اللہ کے دستور و احکام کا باغی ہے۔ باغی سے اگر کبھی کوئی اچھا کام سرزد ہو بھی جائے اور وہ کام اللہ کے حکم کی تعمیل میں نہ ہو، اپنے باغیانہ انداز فکر کے تحت ہو تو اس کا اس مولیٰ سے کوئی ربط نہ ہوگا جس کے پاس اجر و ثواب ہے۔

اہم نکات

۱۔ ایمان سے عمل کنندہ میں، پھر اس کے عمل میں حسن آتا ہے۔

وَمَنۡ اَحۡسَنُ دِیۡنًا مِّمَّنۡ اَسۡلَمَ

۱۲۵۔ اور دین میں اس سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے

وَجۡهَهٗ لِلّٰہِ وَ هُوَ مُحۡسِنٌ وَّ اتَّبَعَ مِلَّۃَ اِبۡرٰهِیۡمَ حَنِیۡفًا ؕ وَ اتَّخَذَ اللّٰہُ اِبۡرٰهِیۡمَ خَلِیۡلًا ﴿۱۲۵﴾

جس نے نیک کردار بن کر اپنے وجود کو اللہ کے سپرد کیا اور یکسوئی کے ساتھ ملت ابراہیمی کی اتباع کی؟ اور ابراہیم کو تو اللہ نے اپنا دوست بنایا ہے۔

وَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ مُّحِیۡطًا ﴿۱۲۶﴾

۱۲۶۔ اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ کا ہے اور اللہ ہر چیز پر خوب احاطہ رکھنے والا ہے۔

تفسیر آیات

سابقہ آیت میں ارشاد فرمایا: تمام ادیان کا دارومدار عمل پر ہے، صرف آرزوؤں سے بات نہیں بنتی۔ اس آیت میں فرمایا کہ عمل کے لیے دین حق کی اتباع ضروری ہے اور وہ دین حق ملت ابرہیمی کی اتباع ہے۔ یہاں ایمان و عمل اور ادیان الٰہی سے متمسک رہنے کی صورت بیان فرمائی:

i۔ انسان اپنے وجود کو اللہ کے سپرد اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ یہ ایک ایسا موقف ہے، جس کے بغیر کوئی نیک عمل قابل قبول نہیں ہے۔

ii۔ اس درست موقف پر آنے کے بعد نیک کردار بن جانا ممکن ہوتا ہے۔

iii۔ ادیان الٰہی سے متمسک رہنے کے لیے اپنے آپ کو اس سلسلے کے ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مربوط رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے اپنا خلیل بنایا ہے اور اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کسی احتیاج اور ضرورت مندی کے تحت خلیل نہیں بنایا۔ وہ آسمانوں اور زمین کا مالک ہے نیز ابراہیم علیہ السلام کو مقام خلیلی پر فائز کرنے میں کسی قسم کی دیگر قدروں کا دخل نہیں ہو سکتا، کیونکہ اللہ ہر چیز پر احاطہ رکھنے والا ہے، بلکہ ابراہیم علیہ السلام کو الٰہی اقدار کے تحت خلیل بنایا ہے۔

احادیث

امام علی رضا علیہ السلام سے روایت ہے:

اِتَّخَذَ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ اِبْرَاهِيمَ خَلِيْلًا لِاَنَّهُ لَمْ يَرِدْ اَحَدًا وَ لَمْ يَسْئَلْ اَحَداً غَيْرَ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ۔[1]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے اس لیے اپنا خلیل بنایا کہ انہوں نے کبھی کسی کو رد نہیں کیا اور کبھی بھی کسی غیر اللہ سے سوال نہیں کیا۔

---

[1] علل الشرائع ۱: ۳۴

اہم نکات

۱۔ بہتر دینداری کے تین ارکان ہیں: ۱۔ اللہ کے سامنے تسلیم کرنا۔ ۲۔ نیک کرداری۔ ۳۔ سنت ابراہیمی کی اتباع۔

وَيَسۡتَفۡتُوۡنَكَ فِى النِّسَآءِ‌ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفۡتِيۡكُمۡ فِيۡهِنَّ ۙ وَمَا يُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ فِى الۡكِتٰبِ فِىۡ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِىۡ لَا تُؤۡتُوۡنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرۡغَبُوۡنَ اَنۡ تَنۡكِحُوۡهُنَّ وَالۡمُسۡتَضۡعَفِيۡنَ مِنَ الۡوِلۡدَانِ ۙ وَاَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلۡيَتٰمٰى بِالۡقِسۡطِ‌ؕ وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيۡمًا ﴿۱۲۷﴾

۱۲۷۔ اور لوگ آپ سے عورتوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، کہدیجیے: اللہ تمہیں ان کے بارے میں حکم دیتا ہے اور کتاب میں تمہارے لیے جو حکم بیان کیا جاتا ہے وہ ان یتیم عورتوں کے متعلق ہے جن کا مقررہ حق تم انہیں ادا نہیں کرتے اور ان سے نکاح بھی کرنا چاہتے ہو اور ان بچوں کے متعلق ہے جو بے بس ہیں اور یہ (حکم بھی دیتا ہے) کہ یتیموں کے بارے میں انصاف کرو اور تم بھلائی کا جو کام بھی انجام دو گے تو اللہ یقیناً اس سے خوب آگاہ ہے۔

تشریح کلمات

يَسۡتَفۡتُوۡنَكَ: الفتوی (ف ت ی) کے معنی ہیں کسی مشکل مسئلے کا جواب دینا۔ استفتاء یعنی طلب فتویٰ۔

يَتٰمَى: (ی ت م) یتیم۔ نابالغ بچہ جو شفقت پدری سے محروم ہو جائے اور مجازاً ہر یکتا اور بے مثل چیز کو عربی میں یتیم کہتے ہیں۔ مثلاً گوہر یکتا کو درۃ یتیمۃ کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَيَسۡتَفۡتُوۡنَكَ فِى النِّسَآءِ: لوگ آپ سے عورتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ موضوع سوال کا ذکر نہیں ہے لیکن روایات اور سیاق سے معلوم ہے، عورتوں کی میراث کے بارے میں سوال ہے۔ چونکہ جاہلیت میں عورتوں اور بچوں کو ارث میں کوئی حصہ نہیں دیتے تھے۔ کہتے تھے: چونکہ عورتیں اور بچے جنگ میں کام نہیں

آتے، لہٰذا ان کو میراث نہیں دی جائے گی۔

۲۔ قُلِ اللّٰہُ یُفۡتِیۡکُمۡ فِیۡهِنَّ: لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فتویٰ طلب کیا۔ فرمایا: اللہ فتویٰ دیتا ہے، ان عورتوں کے بارے میں۔

۳۔ وَمَا یُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ فِی الۡکِتٰبِ: فتویٰ کا دوسرا مصدر، وہ احکام ہیں جو کتاب یعنی قرآن میں تمہارے لیے بیان کیے جاتے ہیں۔ وہ احکام فی یتامی النسآء ان یتیم عورتوں کے بارے میں ہیں، جن کا مقررہ حق ان کو نہیں دیتے ہو۔ مَا کُتِبَ لَهُنَّ سے مراد میراث ہے۔ جیسا کہ حضرت امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے۔

۴۔ تَرۡغَبُوۡنَ اَنۡ تَنۡکِحُوۡهُنَّ: ان یتیم عورتوں سے نکاح کرنا چاہتے ہو۔ اس جملے کی ایک تفسیر یہ ہے کہ تم ان عورتوں سے نکاح کرنا چاہتے ہو اور ان کا مقررہ حق، یعنی میراث نہیں دیتے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ تم ان عورتوں سے نکاح کرنا بھی نہیں چاہتے اور ان کا مقررہ حق یعنی میراث نہیں دیتے۔ لفظ تَرۡغَبُوۡنَ کے بعد اگر فِی آ جاتا تو رغبت کرنے کے معنوں میں ہوتا اور اگر عَن آ جائے تو رغبت نہ کرنے کے معنوں میں ہے۔ آیت میں تَرۡغَبُوۡنَ کے بعد فِی اور عَن دونوں نہیں ہیں۔ لہٰذا سیاق و سباق آیت سے تَرۡغَبُوۡنَ کے معنی سمجھنا چاہیے۔ صاحب المیزان لفظ عَن کو محذوف فرض کرتے ہیں۔ چونکہ موضوع سخن ان عورتوں کی محرومیت ہے۔

۵۔ وَالۡمُسۡتَضۡعَفِیۡنَ مِنَ الۡوِلۡدَانِ: اور بے بس بچوں کے بارے میں بھی حکم بیان فرماتا ہے کہ ان بچوں کو بھی اسی طرح میراث ملے گی، جیسے بڑوں کو ملتی ہے۔

۶۔ وَاَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلۡیَتٰمٰی بِالۡقِسۡطِ: اور یہ حکم بھی دیتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف کرو، ان کے اپنے مال اور میراث کے بارے میں۔

اہم نکات

۱۔ عورتیں، بچے اور یتیم، معاشرے کے وہ افراد ہیں جن کے حقوق کی پاسداری دوسرے افراد سے زیادہ اہم ہیں۔

وَاِنِ امۡرَاَۃٌ خَافَتۡ مِنۡۢ بَعۡلِهَا نُشُوۡزًا اَوۡ اِعۡرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡهِمَاۤ اَنۡ یُّصۡلِحَا بَیۡنَهُمَا صُلۡحًا ؕ وَالصُّلۡحُ خَیۡرٌ ؕ وَاُحۡضِرَتِ الۡاَنۡفُسُ

۱۲۸۔ اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے بے اعتنائی یا بے رخی کا اندیشہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں کہ دونوں آپس میں بہتر طریقے سے مصالحت کر لیں اور صلح تو بہر حال بہتر ہی ہے

الشُّحَّ ؕ وَ اِنۡ تُحۡسِنُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا ﴿۱۲۸﴾

اور ہر نفس کو بخل کے قریب کر دیا گیا ہے لیکن اگر تم نیکی کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تمہارے سارے اعمال سے یقیناً خوب باخبر ہے۔

تشریح کلمات

بعل: (ب ع ل) شوہر۔ شوہر کو اس تصور کے مطابق: ''شوہر کو فوقیت حاصل ہے'' بعل کہا گیا ہے۔ کیونکہ عرب ہر اس چیز کو جو دوسری اشیاء پر فوقیت رکھتی ہے، بعل کہتے ہیں۔ چنانچہ اہل عرب اپنے بت کو بعل کہکر پکارتے تھے، کیونکہ وہ اسے بلند و برتر سمجھتے تھے۔

نُشُوۡزًا: (ن ش ز) اپنی برتری کا اظہار۔

الشُّحَّ: (ش ح ح) حرص کے ساتھ بخل، جو انسان کی عادت میں داخل ہوا ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِنِ امۡرَاَۃٌ خَافَتۡ: اگر کسی شخص کی بیوی بانجھ ہے یا زن و شوہر کے تعلقات قائم کرنے کے قابل نہیں یا سن و سال کے اعتبار سے قابل رغبت نہیں رہی یا دائم المرض ہے، جس کی بنا پر شوہر اپنی حرص کی بنا پر دوسری بیویوں کی طرف مائل ہوجاتا ہے جو انسانی مزاج میں داخل ہے، آنے والی آیات کے مطابق تمام بیویوں میں قلبی تعلق قائم رکھنے میں عدل و مساوات قائم کرنا ممکن نہیں ہے۔ دوسری طرف عورت بھی خواہش رکھتی ہے کہ اس کے ساتھ بہتر سلوک ہو اور اس کے حقوق پورے کیے جائیں۔

۲۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡہِمَاۤ اَنۡ یُّصۡلِحَا: ان حالات میں یہ آیت مصالحت کا حل پیش کر رہی ہے کہ عورت اپنے حقوق کی کچھ مقدار سے دستبردار ہو اور مرد باقی حقوق کی ادائیگی میں تساہل نہ کرے۔ ایسا کرنا طلاق سے بہتر ہے اور حقوق، فرائض کی طرح نہیں ہیں کہ کمی نہ ہو سکے۔

۳۔ وَ اُحۡضِرَتِ الۡاَنۡفُسُ الشُّحَّ: بخل تو ہر نفس کے سامنے دھرا رہتا ہے۔ اس بخل کے تحت انسان مفادات کا تحفظ کرتا ہے اور مال خرچ کرنے سے کتراتا ہے۔ اس بخل کے تحت مرد اس عورت کو حقوق دینے میں اور عورت اپنے حقوق سے دستبردار ہونے میں تأمل کرتی ہے۔

۴۔ وَ اِنۡ تُحۡسِنُوۡا وَ تَتَّقُوۡا: آخر میں اللہ تعالیٰ نے مردوں سے خصوصی خطاب کے ساتھ فرمایا: مرد بے رغبتی کے باوجود اس عورت پر اپنا احسان ختم نہ کرے، کیونکہ زن و شوہر کے درمیان بیشتر حقوق مرد کے ذمے عائد ہوتے ہیں اور مرد اس نظام میں ستون کا درجہ رکھتا ہے۔ اس لیے مرد پر زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ بہت سے اختلافی مسائل کا حل مصالحت ہے۔

۲۔ بخل کا شائبہ ہر انسان میں ہوتا ہے۔ کمال یہ ہے کہ اس مذموم صفت پر انسان غالب آ جائے۔

وَلَنۡ تَسۡتَطِیۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَیۡنَ النِّسَآءِ وَلَوۡ حَرَصۡتُمۡ فَلَا تَمِیۡلُوۡا کُلَّ الۡمَیۡلِ فَتَذَرُوۡهَا کَالۡمُعَلَّقَةِ ؕ وَاِنۡ تُصۡلِحُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۲۹﴾

۱۲۹۔ اور تم بیویوں کے درمیان پورا عدل قائم نہ کر سکو گے خواہ تم کتنا ہی چاہو لیکن ایک طرف اتنے نہ جھک جاؤ کہ (دوسری کو) معلق کی طرح چھوڑ دو اور اگر تم اصلاح کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ یقیناً درگزر کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تشریح کلمات

عدل: (ع د ل) دو چیزوں کا برابر ہونا۔ عدل صرف محسوس چیزوں کے برابر ہونے کے معنی میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَنۡ تَسۡتَطِیۡعُوۡۤا: صورت اور سیرت میں فرق کی بنیاد پر انسان متعدد بیویوں میں کما حقہ مساوات قائم رکھ ہی نہیں سکتا۔ ایک خوبصورت ہے، دوسری بدشکل۔ ایک خوش مزاج ہے، دوسری بد مزاج۔ ایک جوان ہے، دوسری سن رسیدہ۔ ایک صحت مند ہے، دوسری دائم المرض۔ ایسے حالات میں اسلام یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ ان فطری رجحانات کو نابود کر کے دونوں سے یکساں قلبی تعلق قائم رکھو، کیونکہ ایسا کرنا انسان کے بس میں نہیں ہے۔

۲۔ فَلَا تَمِیۡلُوۡا کُلَّ الۡمَیۡلِ: اسلام یہاں یہ مطالبہ ضرور کرتا ہے کہ جن امور پر انسان قادر ہے، ان میں عدل و انصاف قائم رکھے۔ مثلاً نان و نفقہ، راتوں کی تقسیم و دیگر حقوق زوجین میں سے جو اس کے اختیار میں ہیں، ان میں عدل قائم رکھے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بے چاری خوبصورت نہیں ہے تو انسان بھی نہیں ہے کہ شوہر کی طرف سے نہ تو اسے زوجیت کے حقوق ملیں اور نہ کسی اور سے شادی کر سکے اور اس طرح وہ عملاً بے شوہر ہو کر رہ جائے۔

ایک اعتراض: اس سورے کی ابتدا میں فرمایا: فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَۃً ” پھر اگر

تمہیں خوف ہو کہ ان میں عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی عورت کافی ہے'' اور اس آیت میں فرمایا کہ عدل قائم کرنے پر تو انسان قادر ہی نہیں ہے، لہٰذا صرف ایک شادی کی اجازت ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ مادہ پرست ابن ابی العوجاء نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگرد ہشام کو یہی اعتراض پیش کیا تھا۔

جواب: زوجات میں عدل کرنا اور مساویانہ سلوک کرنا ان چیزوں میں واجب ہے جو انسانی عمل سے مربوط ہوں اور ممکن ہو، جیسے نان، نفقہ، راتوں کی تقسیم۔ جب کہ اس آیت میں قلبی رجحان مراد ہے۔

i۔ اگر متعدد زوجات جائز نہیں ہیں تو آیہ: فَانۡکِحُوۡا مَا طَابَ لَکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ [1] بے معنی ہو جاتی ہے۔

ii۔ آیت کا یہ جملہ: فَلَا تَمِیۡلُوۡا کُلَّ الۡمَیۡلِ ایک بیوی کی طرف اتنے نہ جھک جاؤ۔ اس اعتراض کا مسکت جواب ہے۔

iii۔ خود عصر رسالت مآب (ص) میں عام مسلمانوں کی سیرت بھی ایک واضح دلیل ہے کہ متعدد زوجات پر خود رسول اکرم (ص) کے سامنے عمل ہوتا رہا۔

احادیث

رسالتمآب (ص) سے مروی ہے کہ آپ اپنی ازواج میں مساویانہ تقسیم فرمانے کے بعد فرماتے تھے:

اللھم ھذا قسمی فیما املك فلا تؤاخذنی فیما تملك و لا املك۔ [2]

خدایا! یہ تقسیم تو اس چیز میں ہے جو میرے اختیار میں ہے اور جو کچھ تیرے اختیار میں ہے اور میرے اختیار میں نہیں ہے اس پر میرا مؤاخذہ نہ فرما۔

واضح رہے یہ دعا ہماری تعلیم کے لیے ہے کہ آداب بندگی یہ ہے کہ جو کوتاہی انسان کے اختیار میں نہ ہو اس کے لیے بھی معافی مانگا کرے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس اعتراض کا یہ جواب فرمایا:

''اگر عدل نہ کر سکو تو ایک زوجہ پر اکتفا کرو'' میں عدل در نفقہ مراد ہے۔ جب کہ اس آیت میں قلبی محبت مراد ہے۔ [3]

۳۔ وَ اِنۡ تُصۡلِحُوۡا: اگر زوجات کے درمیان تقسیم میں صلح و صفائی کرو اور ان پر زیادتی کرنے سے احتراز کرو تو تم پر اللہ مہربان ہو جائے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔

اہم نکات

۱۔ عدل و انصاف عملی کردار سے مربوط ہے، قلبی رجحانات سے نہیں۔

---

[1] ۴ نساء: ۳ [2] عوالی اللآلی ۲: ۱۳۴۔ مجمع البیان [3] الکافی ۵: ۳۶۲

وَ اِنۡ یَّتَفَرَّقَا یُغۡنِ اللّٰہُ کُلًّا مِّنۡ سَعَتِہٖ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ وَاسِعًا حَکِیۡمًا ﴿۱۳۰﴾

۱۳۰۔ اور اگر میاں بیوی دونوں نے علیحدگی اختیار کی تو اللہ اپنی وسیع قدرت سے ہر ایک کو بے نیاز کر دے گا اور اللہ بڑی وسعت والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِنۡ یَّتَفَرَّقَا: اگر مصالحت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے تو معلق چھوڑنے سے بہتر یہ ہے کہ اسے طلاق دے دی جائے۔ کیونکہ طلاق بھی نہ دے اور حقوق بھی نہ دے تو یہ بیچاری نہ زوجہ رہتی ہے، نہ بیوہ۔ طلاق کی صورت میں عورت آزاد ہو جاتی ہے۔

۲۔ وَ کَانَ اللّٰہُ وَاسِعًا حَکِیۡمًا: اور اللہ اس کے لیے کوئی راہ کھول دے گا۔ اللہ کے فضل و کرم میں کوئی تنگی نہیں ہے اور وہ حکیم ہے۔ امر واقع کے مطابق اللہ کوئی حل پیدا فرمائے گا۔

اہم نکات

۱۔ طلاق، کوئی حل نہ ہونے کی صورت میں آخری حل ہے۔

۲۔ ایک دروازہ بند ہونے سے اللہ دوسرے دروازے کھولتا ہے: یُغۡنِ اللّٰہُ کُلًّا مِّنۡ سَعَتِہٖ ....۔

وَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ لَقَدۡ وَصَّیۡنَا الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ وَ اِیَّاکُمۡ اَنِ اتَّقُوا اللّٰہَ ؕ وَ اِنۡ تَکۡفُرُوۡا فَاِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ غَنِیًّا حَمِیۡدًا ﴿۱۳۱﴾

۱۳۱۔ اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ کی ملکیت ہے، بتحقیق ہم نے تم سے پہلے اہل کتاب کو نصیحت کی ہے اور تمہیں بھی یہی نصیحت ہے کہ تقویٰ اختیار کرو اور اگر کفر اختیار کرو گے تو آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور اللہ بڑا بے نیاز، قابل ستائش ہے۔

وَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیۡلًا ﴿۱۳۲﴾

۱۳۲۔ اور اللہ ہی ان سب چیزوں کا مالک ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور کفالت کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ: جس ذات کے قبضہ قدرت میں تمام آسمان اور

زمین ہوں، اس کے لیے ان دونوں، میاں بیوی کی جدائی کے بعد ان پر مہربانی کرنے اور ان کو اچھی زندگی دینے میں کوئی شیٔ حائل نہیں ہو سکتی۔

۲۔ وَلَقَدۡ وَصَّیۡنَا: ہم نے تم سے پہلے اہل کتاب یعنی یہود و نصاری کو اور خود تم کو بھی تقویٰ کی سفارش کی ہے کہ تقویٰ یعنی گناہ سے بچنا ہر دور، ہر زمانے کے لوگوں کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ ہر ضرر رساں چیز سے اپنے آپ کو بچانا ایک فطری اور عقلی حکم بھی ہے۔ نہ بچنے والا کم عقل سمجھا جائے گا۔ حدیث میں آیا ہے: المؤمن کیس۔[1] مومن ہوشیار ہوتا ہے۔ ضرررساں چیزوں سے اجتناب کرتا ہے۔

۳۔ وَاِنۡ تَکۡفُرُوۡا فَاِنَّ لِلّٰہِ: اگر تم نے اپنے آپ کو نہیں بچایا تو اللہ کو اس سے ضرر نہیں پہنچتا۔ اللہ کو تمہارے تقویٰ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ خود تمہارے مفاد میں ہے۔ فَاِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اللہ کی قبضہ قدرت میں ہے۔ تم تقویٰ کرو، نہ کرو، اللہ کی حکومت سے فرار نہیں کر سکتے۔ البتہ تقویٰ کے ذریعے اللہ کی رحمت کے لیے اہل بن سکتے ہیں۔ وَکَانَ اللّٰہُ غَنِیًّا حَمِیۡدًا اللہ تمہارے تقویٰ سے بے نیاز تمہاری تحمید و تمجید کے بغیر بھی حَمِیۡدًا لائق ستائش ہے۔

۴۔ فَاِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ: جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، وہ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے، جس کے تحت تم کو محفوظ رکھا گیا ہے۔ اللہ کی ملکیت میں ہونے کی وجہ سے تم روئے زمین پر آباد ہو۔ اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡہِبۡکُمۡ اگر اللہ چاہے تو تم سب کو فنا کر کے تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے۔ ان آیات میں وَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ کو تین مرتبہ تکرار فرمایا: اس تکرار کی یہ توجیہ کی گئی ہے کہ پہلی بار اللہ کی اطاعت اور اللہ کے فیصلوں کو تسلیم کرنے کی ضرورت کے بیان کے لیے ہے۔ بعض فرماتے ہیں، اللہ کی مملکت کی وسعت کو بیان کرنے کے لیے ہے۔ دوسری مرتبہ اپنی مخلوقات سے بے نیازی کے اظہار کے لیے، تیسری بار اگلی آیت کے مضمون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ اگر اللہ چاہے تو تم کو فنا کر کے دوسری مخلوق کو پیدا کر سکتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ایمان باللہ کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی ہمہ جہت ملکیت پر ایمان رکھے۔

۲۔ تقویٰ تمام ادیان کی تعلیمات کا بنیادی عنصر ہے۔

اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡہِبۡکُمۡ اَیُّہَا النَّاسُ وَ یَاۡتِ بِاٰخَرِیۡنَ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَلٰی ذٰلِکَ قَدِیۡرًا ﴿۱۳۳﴾

۱۳۳۔ لوگو! اگر اللہ چاہے تو تم سب کو فنا کر کے تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے اور اس بات پر تو اللہ خوب قدرت رکھتا ہے۔

---

[1] الدعوات ص ۳۹

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ اپنی بے نیازی کو لوگوں کے اذہان میں راسخ فرما رہا ہے۔ جیسا کہ آسمانوں اور زمین کی تمام موجودات اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں، اسی طرح اے لوگو! خود تمہارا وجود بھی اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے اور تمہارے وجود سے بھی اللہ بے نیاز ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم سب کی جگہ دوسرے لوگوں کو پیدا کر سکتا ہے۔

جولوگ اس آیت کے مخاطب ہیں، ان کو فنا کرنا مشیت الٰہی کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے۔ یہ وقوع پذیر ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ البتہ دوسری آیت میں فرمایا:

وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ ۙ ثُمَّ لَا یَکُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَکُمۡ ۔[1] — اور اگر تم نے منہ پھیر لیا تو اللہ تمہارے بدلے اور لوگوں کو لے آئے گا پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔

مذکورہ آیت میں چونکہ موجود قوم کو بدل دینا، ان کے منہ پھیرنے کے ساتھ مشروط گردانا گیا، منہ ان لوگوں نے پھیر لیا، لہٰذا بدل دینا بھی وقوع پذیر ہوگیا۔

مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ ثَوَابَ الدُّنۡیَا فَعِنۡدَ اللّٰہِ ثَوَابُ الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ سَمِیۡعًۢا بَصِیۡرًا ﴿۱۳۴﴾

۱۳۴۔ جو (فقط) دنیاوی مفاد کا طالب ہے، پس اللہ کے پاس دنیا و آخرت دونوں کا ثواب موجود ہے اور اللہ خوب سننے والا، دیکھنے والا ہے۔

تفسیر آیات

ان لوگوں کے عقل و شعور کو بیدار کیا جا رہا ہے، جو صرف طالب دنیا ہیں۔ تقویٰ اختیار کرنے اور بارگاہ الٰہی میں حاضر رہنے سے دنیا اور آخرت دونوں کی سعادتیں مل سکتی ہیں لیکن یہ لوگ آخرت کی ابدی سعادت کو چھوڑ کر چند دنوں کی دنیاوی زندگی کے عیش و نوش میں بدمست ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اللہ طالب آخرت کو دنیا بھی دیدیتا ہے لیکن طالب دنیا کو آخرت نہیں دیتا۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ — ۱۳۵۔ اے ایمان والو! انصاف کے سچے داعی بن

---

[1] ۴۷ محمد: ۳۸

بِالۡقِسۡطِ شُہَدَآءَ لِلّٰہِ وَ لَوۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ اَوِ الۡوَالِدَیۡنِ وَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ۚ اِنۡ یَّکُنۡ غَنِیًّا اَوۡ فَقِیۡرًا فَاللّٰہُ اَوۡلٰی بِہِمَا ۟ فَلَا تَتَّبِعُوا الۡہَوٰۤی اَنۡ تَعۡدِلُوۡا ۚ وَ اِنۡ تَلۡوٗۤا اَوۡ تُعۡرِضُوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا ﴿۱۳۵﴾	جاؤاور اللہ کے لیے گواہ بنو اگرچہ تمہاری ذات یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، اگر کوئی امیر یا فقیر ہے تو اللہ ان کا بہتر خیرخواہ ہے، لہٰذا تم خواہش نفس کی وجہ سے عدل نہ چھوڑو اور اگر تم نے کج بیانی سے کام لیا یا (گواہی دینے سے) پہلوتہی کی تو جان لو کہ اللہ تمہارے اعمال سے یقیناً خوب باخبر ہے۔

تشریح کلمات

قَوّٰمِیۡنَ: (ق ی م) مفرد قوام۔ قیام کا صیغہ مبالغہ ہے۔ یعنی اپنی پوری قوت کے ساتھ قائم رکھو۔ بِالۡقِسۡطِ میں باء تعدی ہے۔ یعنی عدل کو قائم رکھو۔ عموماً جو ترجمہ کیا جاتا ہے: ''عدل کے ساتھ قیام کرو'' درست نہیں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ: قرآن مجید نے عدل و انصاف کی انفرادی اور اجتماعی اہمیت کے پیش نظر مختلف آیات میں اسے نہایت تاکیدی الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

مختلف آیات میں عدل کا انفرادی حکم فرمایا:

اِعۡدِلُوۡا ۟ ہُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی ...۔[1]	(ہر حال میں) عدل کرو! یہی تقویٰ کے قریب ترین ہے۔
وَ اِذَا قُلۡتُمۡ فَاعۡدِلُوۡا وَ لَوۡ کَانَ ذَا قُرۡبٰی ...۔[2]	اور جب بات کرو تو عدل کے ساتھ، اگرچہ اپنے قریب ترین رشتے داروں کے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔

ان آیات میں ہر شخص پر یہ فرض عائد کر دیا گیا ہے کہ وہ اپنے کردار و گفتار میں عدل و انصاف کرے۔

۲۔ اقامت عدل: یعنی عدل کا اجتماعی حکم اس آیت اور دیگر چند آیات میں ذکر فرمایا ہے اور اس حکم کی یہ تعبیر: کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ تم انصاف کے سچے داعی بن جاؤ کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ اقامه، قام به کی تعبیر عموماً اجتماعی حکم کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اسی لیے یہاں اعدلوا یا اقسطوا، کونوا عادلین جیسی تعبیر اختیار نہیں فرمائی۔ کیونکہ یہاں عدل و انصاف کا نظام قائم کرنے کا حکم ہے۔

---

[1] ۵ مائدہ: ۸ [2] ۶ انعام: ۱۵۳

۲۔ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ: گواہی دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو سامنے رکھو، پھر گواہی دو۔ صرف اللہ کی خوشنودی مدنظر ہو۔

۳۔ وَلَوۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ اَوِ الۡوَالِدَیۡنِ وَالۡاَقۡرَبِیۡنَ: خواہ تمہاری یہ گواہی خود اپنے ذاتی مفادات کے خلاف ہو یا والدین کے مفاد کے خلاف اور قریبی رشتہ داروں کے حق میں نہ ہوں۔ جذبات اور احساسات پر عقل کی حاکمیت ہونا چاہیے۔ اگرچہ کہنے کے لیے یہ آسان، مگر عملاً مشکل امر ہے۔

۴۔ اِنۡ یَّکُنۡ غَنِیًّا اَوۡ فَقِیۡرًا: خواہ جس کے حق میں یا خلاف گواہی دے رہے ہو، وہ فقیر یا غنی ہو، اس کا لحاظ نہ کرو۔ عدل و انصاف، فقیر اور غنی دونوں کے حق میں ہے۔

۵۔ فَاللّٰہُ اَوۡلٰی بِہِمَا: اللہ تعالیٰ اس غنی اور فقیر پر تم سے زیادہ مہربان ہے۔ اگر عدل و انصاف ان دونوں کے حق میں نہ ہوتا تو اللہ یہ قانون ہرگز نہ بناتا۔

۶۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الۡہَوٰۤی اَنۡ تَعۡدِلُوۡا: اپنے ذاتی مفاد یا والدین اور رشتہ داروں کے ساتھ ہمدردی یا غنی آدمی کا لحاظ اور فقیر آدمی پر مہربانی کرتے ہوئے عدل کو نہ چھوڑو۔ نا انصافی ان میں سے کسی کے حق میں نہیں ہے۔

۷۔ وَاِنۡ تَلۡوٗۤا اَوۡ تُعۡرِضُوۡا: اگر تم نے گواہی دیتے ہوئے حق کے خلاف کج بیانی سے کام لیا یا گواہی دینے سے منہ موڑ لیا تو اللہ تمہارے عمل سے باخبر ہے۔ یعنی تم اللہ کی نگرانی میں ہو۔ تمہارے ہر عمل کی بازپرسی ہوگی۔

احادیث

چنانچہ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

وَ الْعَدْلُ سَائِسٌ عَامٌّ۔ [۱]　　عدل، سب کی نگہداشت کرنے والا۔

عدل کی اجتماعی اہمیت کے بارے میں آپ (ع) سے روایت ہے:

وَ اِنَّ اَفْضَلَ قُرَّۃِ عَیْنِ الْوُلَاۃِ اسْتِقَامَۃُ الْعَدْلِ فِی الْبِلَادِ۔ [۲]　　حکمرانوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک ملک میں عدل و انصاف کا استحکام ہے۔

اہم نکات

۱۔ عدل و انصاف کا نظام قائم کرو۔

۲۔ گواہی صرف اللہ ہی کے لیے دیا کرو۔

۳۔ اپنی ذات اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف ہو تو بھی سچی گواہی دو۔

---

۱ نہج البلاغہ۔ ترجمہ مفتی جعفر حسینؒ۔ حکمت: ۴۳۶۔ طبع المعراج کمپنی۔ لاہور　　۲ حوالہ سابق: ۵۳۔ عہدنامہ برائے مالک اشترؒ۔

۴۔ حق پر مبنی گواہی دو، خواہ دولت مند کے خلاف جائے یا فقیر کے۔ تمہاری گواہی دینے سے فقیر و مسکین کا کچھ نہیں بگڑتا۔ تم حق کی بات کیا کرو اور فقیر کی ہمدردی اور امیر کا لحاظ نہ کیا کرو، کیونکہ عدل و انصاف اور حق کا فیصلہ امیر اور غریب، دونوں کے مفاد میں ہے۔

۵۔ سچی گواہی کو عدل و انصاف کے قیام میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ ...۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾

۱۳۶۔ اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے، سچا ایمان لے آؤ اور اس کتاب پر بھی جو اس نے اس سے پہلے نازل کی ہے اور جس نے اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور روز آخرت کا انکار کیا وہ گمراہی میں بہت دور چلا گیا۔

تفسیر آیات

۱۔ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا: ایمان والوں سے ایمان لانے کا مطالبہ قابل توجہ ہے۔ اس کی دو تفسیریں ہوسکتی ہیں:

i۔ اجمالی ایمان لانے والوں کو تفصیلی اور تحقیقی ایمان لانے کا حکم ہے۔ یہ خطاب ان لوگوں سے ہے، جو اللہ اور رسول (ص) کا انکار نہ کرنے کی وجہ سے اہل ایمان میں شامل تو ہو گئے لیکن ان کا یہ ایمان سطحی اور اجمالی ہے۔ اس قسم کا ایمان انسانی شعور و کردار پر وہ اثر نہیں چھوڑتا جو تحقیقی اور تفصیلی ایمان چھوڑتا ہے یا تفصیل سے مراد وہ امور ہیں جو اٰمَنُوْٓا کے بعد مذکور ہیں۔ یعنی اللہ اور رسولؐ پر ایمان کے بعد اس کتاب پر بھی ایمان لائیں جو رسولؐ پر نازل ہوئی ہے۔ یعنی اس جامع دستور حیات پر ایمان لائیں جو اس کتاب میں مذکور ہے۔ اس کتاب میں مذکور احکام میں اہم حکم یہ ہے:

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۤ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ [1]

اور رسول جو تمہیں دے دیں وہ لے لو اور جس سے روک دیں اس سے رک جاؤ اور اللہ کا خوف کرو، اللہ یقیناً شدید عذاب دینے والا ہے۔

---

[1] ۵۹ حشر: ۷

آیت کا رخ کلام، ضعیف الایمان لوگوں کی طرف ہے: اے ایمان والو! اپنے ایمان میں تبعیض نہ کرو کہ کچھ پر ایمان لے آؤ اور کچھ پر ایمان نہ لاؤ۔ اپنے ایمان کے تقاضے پورے کرو اور رسول جو کچھ حکم دیں اسے قبول کرو۔ ورنہ خدا، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور روز آخرت کے انکار کے حکم میں داخل ہو جاؤ گے۔

ii۔ ان ایمان والوں سے خطاب ہے، جو اپنے ایمان کے تقاضے پورے نہیں کرتے۔ ان کے شعور و کردار سے ایمان کے آثار نمایاں نہیں ہوتے۔ ان کے لیے حکم ہے کہ اپنے اعمال و سیرت کو اپنے ایمان سے ہم آہنگ کرو، کیونکہ کردار و عمل ہی ایمان کی سچی دلیل ہے۔

۲۔ بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ...: یعنی واقعی اور کامل ایمان یہ ہے کہ اللہ اور رسولؐ پر ایمان کے ساتھ اس رسولؐ پر نازل ہونے والی کتاب قرآن پر ایمان ہو اور قرآن سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں زبور، توریت، انجیل پر بھی ایمان ہو۔ اگر کوئی رسولؐ پر ایمان لے آتا ہے اور قرآن کے بعض احکام کو نہیں مانتا، اس کا یہ تفریقی ایمان قبول نہیں ہے۔

۳۔ وَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِاللّٰهِ...: کامل اور حقیقی ایمان یہ ہے کہ اللہ، ملائکہ، آسمانی کتابوں، تمام رسولوں اور یوم آخرت پر یمان لے آئیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک کا منکر ہو جاتا ہے تو اس کا یہ تفریقی ایمان مسترد ہو گا۔

۴۔ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا: گمراہی میں بہت دور نکل جائیں گے کہ راہ راست پر واپس آنا آسان نہ ہو گا۔

اہم نکات

۱۔ ایمان کے بعد ایمان کے تقاضے پورا کرنا ضروری ہے۔

۲۔ ایمان میں تبعیض ہونے کی صورت میں ایمان مسترد ہو جاتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ثُمَّ کَفَرُوۡا ثُمَّ اٰمَنُوۡا ثُمَّ کَفَرُوۡا ثُمَّ ازۡدَادُوۡا کُفۡرًا لَّمۡ یَکُنِ اللّٰهُ لِیَغۡفِرَ لَهُمۡ وَلَا لِیَهۡدِیَهُمۡ سَبِیۡلًا ﴿۱۳۷﴾

۱۳۷۔ جو لوگ ایمان لانے کے بعد پھر کافر ہو گئے، پھر ایمان لائے، پھر کافر ہو گئے، پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے، اللہ انہیں نہ تو معاف کرے گا اور نہ ہی انہیں ہدایت کا راستہ دکھائے گا۔

تفسیر آیات

سابقہ آیت سے اس آیت کا ربط اس طرح بنتا ہے: ایمان والو! نئے سرے سے پختہ اور سچا ایمان لے آؤ، کیونکہ اگر ایسا نہ ہو گا تو یہ ابن الوقتی اور مفاد کا ایمان کفر میں بدل سکتا ہے اور اگر ایمان کفر میں بدل گیا اور ایمان کے بعد کفر اختیار کر لیا اور دین و ایمان کو کھلونا بنا دیا تو اس ایمان و کفر کے تذبذب کا انجام کار کفر پر ہو گا۔ ثُمَّ ازۡدَادُوۡا کُفۡرًا۔ اس صورت میں اللہ کی طرف واپسی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ظاہر ہے کہ اللہ اسے نہیں بخشے گا اور نہ اس کی رہنمائی کرتا ہے، جو اس کی طرف آتا ہی نہیں:

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بَعۡدَ اِیۡمَانِہِمۡ ثُمَّ ازۡدَادُوۡا کُفۡرًا لَّنۡ تُقۡبَلَ تَوۡبَتُہُمۡ ۚ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الضَّآلُّوۡنَ ۝ [1]

جنہوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا پھر وہ اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے، ان کی توبہ ہرگز قبول نہ ہو گی اور یہی لوگ گمراہ ہیں۔

یعنی جو لوگ کئی بار مرتد ہوئے ہیں وہ ایسی حالت کی طرف نہیں آئیں گے جس میں مغفرت اور ہدایت کے قابل ہو جائیں۔

احادیث

حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے روایت ہے:

فَمِنَ الۡاِیۡمَانِ مَا یَکُوۡنُ ثَابِتاً مُسۡتَقِرّاً فِی الۡقُلُوۡبِ وَ مِنۡہُ مَا یَکُوۡنُ عَوَارِیَّ بَیۡنَ الۡقُلُوۡبِ وَ الصُّدُوۡرِ اِلٰی اَجَلٍ مَعۡلُوۡمٍ. [2]

ایک ایمان وہ ہے جو دلوں میں ثابت اور مستقر رہتا ہے اور ایک وہ ایمان ہے جو دلوں اور سینوں میں عارضی طور پر ایک وقت تک موجود ہوا کرتا ہے۔

بَشِّرِ الۡمُنٰفِقِیۡنَ بِاَنَّ لَہُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمَا ۝ۙ۱۳۸

۱۳۸۔ (اے رسول) منافقوں کو دردناک عذاب کا مژدہ سنا دو۔

الَّذِیۡنَ یَتَّخِذُوۡنَ الۡکٰفِرِیۡنَ اَوۡلِیَآءَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ؕ اَیَبۡتَغُوۡنَ عِنۡدَہُمُ الۡعِزَّۃَ فَاِنَّ الۡعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیۡعًا ۝۱۳۹

۱۳۹۔ جو ایمان والوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا حامی بناتے ہیں، کیا یہ لوگ ان سے عزت کی توقع رکھتے ہیں؟ بے شک ساری عزت تو خدا کی ہے۔

---

[1] ۳ آل عمران: ۹۰ [2] نہج البلاغۃ: خ ۱۸۹۔ اقسام الایمان

تفسیر آیات

۱۔ بَشِّرِ الۡمُنٰفِقِیۡنَ: منافقین کو دردناک عذاب کی نوید سنا دو۔ منافق کسی عزت و احترام کے قابل نہیں ہیں۔ اس لیے عذاب کی خبر کو خوش خبری کہکر ان کی ایک قسم کی اہانت کی ہے۔

اس آیہ شریفہ میں منافقین کی ایک اہم علامت بیان کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ منافقین اپنا قلبی لگاؤ مومنین کی بجائے کفار سے رکھتے ہیں۔ ایسا وہ اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے وہم و خیال کے مطابق عزت و تمکنت کفار کے ساتھ دوستی رکھنے کی صورت میں مل سکتی ہے۔

۲۔ فَاِنَّ الۡعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیۡعًا: آیہ شریفہ منافقین کے اس زعم باطل کو مسترد کرتے ہوئے واضح کرتی ہے: ''عزت تو ساری اللہ کی ہے۔'' اگر عزت درکار ہے تو اس ذات کی طرف آؤ جو خود صاحب عزت ہے اور وَتُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ [۱] تو جسے چاہے عزت دیتا ہے۔

مفہوم عزت: عزت ایک ناقابل تسخیر حالت کو کہتے ہیں۔ صاحب عزت مغلوب ہونے سے محفوظ رہتا ہے اور کائنات میں خدا ہی کی ذات مغلوب ہونے سے محفوظ ہے یا وہ جسے وہ مغلوب ہونے سے تحفظ دے:

وَلِلّٰہِ الۡعِزَّۃُ وَلِرَسُوۡلِہٖ وَلِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ... [۲] اور عزت تو اللہ اس کے رسول اور مؤمنین کے لیے ہے.

اہم نکات

۱۔ یہ آیہ ان لوگوں کے دعوائے ایمان و اسلام کے لیے ایک کھلی دعوت ہے جو عزت و تمکنت کے حصول کے لیے نہ صرف کفار سے دوستی کرتے ہیں بلکہ ان کے دروازوں پر عزت اور مقام کی بھیک مانگتے ہیں۔

۲۔ قرآن کفار کو دوست بنانے کو ایمان کے منافی قرار دیتا ہے، جب کہ دوستی میں برابری کا تصور ہوتا ہے، لیکن یہ لوگ کفار کا غلام بننے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔

وَقَدۡ نَزَّلَ عَلَیۡکُمۡ فِی الۡکِتٰبِ اَنۡ اِذَا سَمِعۡتُمۡ اٰیٰتِ اللّٰہِ یُکۡفَرُ بِہَا وَ یُسۡتَہۡزَاُ بِہَا فَلَا تَقۡعُدُوۡا مَعَہُمۡ حَتّٰی یَخُوۡضُوۡا فِیۡ حَدِیۡثٍ غَیۡرِہٖۤ

۱۴۰۔ اور بتحقیق اللہ نے (پہلے) اس کتاب میں تم پر یہ حکم نازل فرمایا کہ جہاں کہیں تم سن رہے ہو کہ اللہ کی آیات کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو تم ان کے ساتھ

۱؎ ۳ آل عمران: ۲۶ ۲؎ ۶۳ منافقون: ۸

اِنَّکُمۡ اِذًا مِّثۡلُہُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ جَامِعُ الۡمُنٰفِقِیۡنَ وَ الۡکٰفِرِیۡنَ فِیۡ جَہَنَّمَ جَمِیۡعَا ۙ﴿۱۴۰﴾

نہ بیٹھا کرو جب تک وہ کسی دوسری گفتگو میں نہ لگ جائیں، ورنہ تم بھی انہی کی طرح کے ہو جاؤ گے، بے شک اللہ تمام منافقین اور کافرین کو جہنم میں یکجا کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قَدۡ نَزَّلَ عَلَیۡکُمۡ: اس مدنی سورے سے پہلے نازل ہونے والے مکی سورے انعام میں پہلے یہ حکم آیا تھا:

وَ اِذَا رَاَیۡتَ الَّذِیۡنَ یَخُوۡضُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا فَاَعۡرِضۡ عَنۡہُمۡ حَتّٰی یَخُوۡضُوۡا فِیۡ حَدِیۡثٍ غَیۡرِہٖ ....[1]

اور جب آپ دیکھیں کہ لوگ ہماری آیات کے بارے میں چہ میگوئیاں کر رہے ہیں تو آپ وہاں سے ہٹ جائیں یہاں تک کہ وہ کسی دوسری گفتگو میں لگ جائیں.

سورۂ انعام کی آیہ مکہ میں مشرکین کے بارے میں اور زیر بحث آیہ مدینہ کے یہود کے بارے میں نازل ہوئی۔ مکہ کے مشرکین اور مدینہ کے یہود اللہ کی آیات کا مذاق اڑاتے تھے۔ مکہ میں کمزور مسلمان ان باتوں کو گوارا کر کے سنتے رہتے تھے۔ انہیں منع کیا گیا کہ ایسی مجلسوں میں سرے سے بیٹھا ہی نہ کریں۔ مدینے میں منافقین ایسی محفلوں میں بیٹھ کر اسلام کا مذاق اڑانے والوں کی باتیں سنا کرتے تھے۔

۲۔ اِنَّکُمۡ اِذًا مِّثۡلُہُمۡ: ورنہ تم بھی انہی کفار جیسے ہو جاؤ گے۔ یعنی تمہارا حشر بھی انہی کے ساتھ ہو گا۔

اللہ، رسول (ص) اور آیات الٰہی کے سلسلے میں غیرت و حمیت ہی ایمان کی علامت ہے۔ اگر کسی محفل میں کسی کے دین و عقیدے کا مذاق اڑایا جاتا ہے تو ممکن ہونے کی صورت میں اس کا دفاع کیا جانا چاہیے، ورنہ اس محفل کا بائیکاٹ کرنا چاہیے جو ہر شخص کے لیے ممکنہ عمل ہے۔ اگر ایسا بھی نہیں کرتا تو اس کے دل میں اپنے دین و مذہب کے بارے میں غیرت و حمیت نہیں ہے۔ نتیجۃً اس کا دل ایمان سے خالی ہے، جو نفاق کی علامت ہے۔ ان کا ٹھکانا کفار کے ساتھ ہو گا۔

ہمارے معاصر معاشرے میں ہر زمانے کی طرح اصطلاحیں بدل گئی ہیں۔ چنانچہ اگر کسی کے دل میں اپنے دین و مذہب کے بارے میں غیرت و حمیت نہیں ہے اور وہ ایسی محفلوں میں بیٹھ کر اپنے ایمان کا مذاق اڑانا سن سکتا ہے تو اسے ''روشن خیال'' کہا جاتا ہے اور اہل حمیت و غیرت کو ''بنیاد پرست'' کہا جاتا ہے۔

یہ ان لوگوں کے لیے بھی لمحہ فکریہ ہے جو صرف تلاش معاش کے لیے ایمان کے ماحول کو چھوڑ کر کفر

----

[1] ۶ انعام: ۶۸

کے ماحول میں جانا پسند کرتے ہیں، جہاں آئے دن اسلامی اقدار کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔

۳۔ اِنَّ اللّٰہَ جَامِعُ الۡمُنٰفِقِیۡنَ وَ الۡکٰفِرِیۡنَ: جس طرح منافقین اور کافرین دنیا میں مؤمنین کی عداوت میں جمع ہو جاتے ہیں، قیامت کے دن یہ دونوں جہنم میں جمع ہو جائیں گے۔

اہم نکات

۱۔ کفریات بکنے کی محفلوں میں بیٹھنے والے کافروں جیسے ہیں۔

الَّذِیۡنَ یَتَرَبَّصُوۡنَ بِکُمۡ ۚ فَاِنۡ کَانَ لَکُمۡ فَتۡحٌ مِّنَ اللّٰہِ قَالُوۡۤا اَلَمۡ نَکُنۡ مَّعَکُمۡ ۫ۖ وَ اِنۡ کَانَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ نَصِیۡبٌ ۙ قَالُوۡۤا اَلَمۡ نَسۡتَحۡوِذۡ عَلَیۡکُمۡ وَ نَمۡنَعۡکُمۡ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ؕ فَاللّٰہُ یَحۡکُمُ بَیۡنَکُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ وَ لَنۡ یَّجۡعَلَ اللّٰہُ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ سَبِیۡلًا ﴿۱۴۱﴾

۱۴۱۔ یہ (منافق) تمہارے حالات کا انتظار کرتے ہیں کہ اگر اللہ کی طرف سے تمہیں فتح حاصل ہو تو کہتے ہیں: کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اور اگر کافروں کو کچھ کامیابی مل جائے تو (ان سے) کہتے ہیں: کیا ہم تمہارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے؟ (اس کے باوجود ہم نے تمہارے ساتھ جنگ نہ کی) اور کیا ہم نے تمہیں مومنوں سے بچا نہیں لیا؟ پس اللہ قیامت کے دن تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا اور اللہ ہرگز کافروں کو مومنوں پر غالب نہیں آنے دے گا۔

تشریح کلمات

التربص: (ر ب ص) انتظار۔

الاستخواذ: (خ و ذ) غلبہ۔ تسلط۔

تفسیر آیات

۱۔ الَّذِیۡنَ یَتَرَبَّصُوۡنَ بِکُمۡ: منافقین کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ ابن الوقت ہوتے ہیں اور ہمیشہ مفاد کا انتظار کرتے ہیں۔ اسی لیے طرفین سے روابط رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ ظاہری شمولیت کو اپنے مفاد کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اپنی وفاداریوں کے ذریعے کفار سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی تمام تر سازشوں اور کوششوں کے باوجود اللہ کفار کو مومنین پر غالب آنے کی نوبت ہرگز نہیں آنے دے گا۔ یعنی صرف آخرت میں ہی نہیں بلکہ دنیا و آخرت دونوں میں کفار کا مومنین پر غلبہ نہیں ہوگا:

وَلَا تَهِنُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۝[1] — ہمت نہ ہارو اور غم نہ کرو کہ تم ہی غالب رہو گے بشرطیکہ تم مومن ہو۔

ایمان کی شرط ضروری ہے۔ کیونکہ اگر کسی بھی اقدار پر ایمان نہیں ہوگا تو اس کی کامیابی کے لیے اور کوئی ضمانت نہیں ہوسکتی۔ ایمان سے طاقت، عزم اور ارادے میں پختگی اور صبر و حوصلہ ملتا ہے، جو کامیابی کے راز ہیں۔ یہ بات بھی ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ مذکورہ اثرات خود ایمان پر مترتب ہوتے ہیں، صرف دعوائے ایمان پر نہیں۔ فیض، سخاوت سے حاصل ہوتا ہے، دعوائے سخاوت سے نہیں۔

۲۔ فَاِنۡ کَانَ لَکُمۡ فَتۡحٌ: اگر تم اہل ایمان کو فتح و نصرت مل جائے تو یہ منافقین یہ جتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھی ہیں، ہم کو بھی غنیمت میں حصہ ملنا چاہیے۔ منافقین کبھی جنگوں میں مسلمانوں کے ساتھ نکلتے تھے اور لشکر اسلام میں خلل اور بدنظمی پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ فتح ملنے کی صورت میں نعرہ لگانے میں آگے ہوتے تھے۔

۳۔ وَاِنۡ کَانَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ نَصِیۡبٌ: اگر کافروں کو کامیابی کا کوئی حصہ مل جاتا تو یہ لوگ کافروں سے کہتے: ہم ان مسلمانوں کے ساتھ مل کر تمہارے خلاف لڑ سکتے تھے لیکن ہم نے تمہارے خلاف لڑائی نہیں کی، اس طرح ہم نے تم کو اہل ایمان سے بچا لیا۔

۴۔ فَاللّٰہُ یَحۡکُمُ بَیۡنَکُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ: قیامت کے دن جب فیصلہ سنایا جائے گا تو اس وقت تمہاری فریب کاری نہیں چلے گی۔

۵۔ وَلَنۡ یَّجۡعَلَ اللّٰہُ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ سَبِیۡلًا: اللہ ہرگز کافروں کو مؤمنوں پر غالب نہیں آنے دے گا۔ بعض مفسرین کے نزدیک سبیل سے مراد وہ فتح و غلبہ ہوسکتا ہے، جس سے امت مسلمہ کا نام و نشان نہ رہے اور کفار کا بول بالا ہو۔

بعض کے نزدیک سبیل سے مراد دلیل و حجت ہے کہ کفار دلیل و منطق میں غالب نہیں آئیں گے۔

بعض مفسرین کے نزدیک سبیل سے مراد فتح و غلبہ ہے لیکن یہ ایمان کے ساتھ مربوط ہے۔ اگر ایمان میں کمزوری آ جائے تو فتح و غلبہ میں بھی کمزوری آئے گی۔ جیسا کہ فرمایا: وَلَا تَهِنُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ۔[2] یعنی اگر تم مؤمن ہو تو بالا دست رہو گے۔

اہم نکات

۱۔ ایمان کو انسانی مقدرات میں وہی مقام حاصل ہے جو اس کائناتی نظام کے دیگر مادی و معنوی عوامل کو حاصل ہے۔ اس کائناتی نظام میں جس طرح اثر کی کمزوری سے مؤثر کی کمزوری کا پتہ چلتا ہے، بالکل اسی طرح آثار کی کمزوری سے ایمان کی کمزوری کا پتہ چلتا ہے۔

---

[1] و [2] ۳ آل عمران: ۱۳۹

اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰہَ وَ ہُوَ خَادِعُہُمۡ ۚ وَ اِذَا قَامُوۡۤا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوۡا کُسَالٰی ۙ یُرَآءُوۡنَ النَّاسَ وَ لَا یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۱۴۲﴾

۱۴۲۔ یہ منافقین (اپنے زعم میں) اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں حالانکہ درحقیقت اللہ انہیں دھوکہ دے رہا ہے اور جب یہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو سستی کے ساتھ لوگوں کو دکھانے کے لیے اٹھتے ہیں اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

یہ منافقین اپنے ظاہری دکھاوے کے اعمال سے رسول اللہ (ص) اور مؤمنین کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ وہ ان کے لیے خلوص رکھتے ہیں۔ یہ رسول خدا (ص) اور مومنین کے ساتھ نہیں، فی الواقع اللہ کے ساتھ دھوکہ ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ خود یہ لوگ اس دھوکے میں ہیں کہ اس طرح وہ رسول (ص) اور مومنین کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

وَ اِذَا قَامُوۡۤا اِلَی الصَّلٰوۃِ: منافقین کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ نماز میں کاہلی کرتے ہیں اور صرف ریاکاری کے طور پر نماز پڑھتے ہیں۔

صدر اول کے منافقین اپنی ریاکاری کے لیے نماز کے محتاج تھے۔ ہمارے معاصر منافقین تو سرے سے نماز کے بھی محتاج نہیں ہیں۔ البتہ بعض حالات میں مثلاً عید کی نمازوں میں کچھ لوگوں کو ریاکاری کے لیے کبھی نماز کی ضرورت پیش آتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ نماز کے لیے تساہل نفاق کی علامت ہے۔

مُّذَبۡذَبِیۡنَ بَیۡنَ ذٰلِکَ ٭ۖ لَاۤ اِلٰی ہٰۤؤُلَآءِ وَ لَاۤ اِلٰی ہٰۤؤُلَآءِ ؕ وَ مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَلَنۡ تَجِدَ لَہٗ سَبِیۡلًا ﴿۱۴۳﴾

۱۴۳۔ یہ لوگ نہ ان کی طرف ہیں اور نہ ان کی طرف، بلکہ درمیان میں سرگرداں ہیں اور جسے اللہ گمراہی میں چھوڑ دے اس کے لیے تم کوئی راہ نہیں پا سکتے۔

تشریح کلمات

مُّذَبۡذَبِیۡنَ: (ذ ب ذ ب) معلق چیز کے ہلنے کی آواز، پھر بطور استعارہ ہر قسم کی حرکت اور اضطراب میں استعمال ہونے لگا ہے۔

تفسیر آیات

منافقین ایمان ویقین کی نعمت سے محروم ہونے کی وجہ سے مضطرب رہتے ہیں۔ کبھی وہ مسلمانوں کی طرف اور کبھی کفار کی طرف جھک جاتے ہیں۔

جس کا تکیہ اللہ پر نہ ہو، وہ ہمیشہ سراب کے پیچھے بھاگتا اور مضطرب الحال رہتا ہے۔ جب کہ ایمان کی نعمت والے ہی امن وسکون کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ جس کے مؤقف میں یکسوئی نہ ہو اس کی زندگی تذبذب کا شکار رہتی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا ﴿۱۴۴﴾	۱۴۴۔ اے ایمان والو! تم مومنوں کو چھوڑ کر کفار کو اپنا حامی مت بناؤ، کیا تم چاہتے ہو کہ خود اپنے خلاف اللہ کے پاس صریح دلیل فراہم کرو؟

تشریح کلمات

سلطان: (س ل ط) تسلط اور غلبہ۔ دلیل سے غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے دلیل کو بھی سلطان کہا گیا ہے۔

تفسیر آیات

یعنی کفار کو اپنا ولی بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا یہ عمل ان کی منافقت کی دلیل ہے، جو بروز قیامت ان کے خلاف حجت بن جائے گی اور ایسے لوگ کفار کے ساتھ محشور ہوں گے۔

۱۔ اَتُرِیْدُوْنَ: کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارے خلاف اللہ کے پاس حجت و دلیل آ جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ حجت پوری کرنے سے پہلے عذاب نہیں کرتا۔ واضح رہے کہ قرآن میں جہاں بھی سلطان کا لفظ استعمال ہوا ہے، وہ حجت و دلیل کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ چونکہ جس کے ہاتھ میں دلیل ہو گی، وہ بالا دست ہوتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ کافر کی حمایت میں جانے سے اس بات پر دلیل مکمل ہو جاتی ہے کہ یہ اہل ایمان میں نہیں ہے۔

اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ فِی الدَّرۡکِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَ لَنۡ تَجِدَ لَہُمۡ نَصِیۡرًا ﴿۱۴۵﴾	۱۴۵۔منافقین تو یقیناً جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے اور آپ کسی کو ان کا مددگار نہیں پائیں گے۔
اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَ اَصۡلَحُوۡا وَ اعۡتَصَمُوۡا بِاللّٰہِ وَ اَخۡلَصُوۡا دِیۡنَہُمۡ لِلّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ؕ وَ سَوۡفَ یُؤۡتِ اللّٰہُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۱۴۶﴾	۱۴۶۔البتہ ان میں سے جو لوگ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کر لیں اور اللہ سے متمسک رہیں اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کریں تو ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہوں گے اور اللہ عنقریب مومنوں کو اجر عظیم عطا فرمائے گا۔

تشریح کلمات

الدَّرۡکِ: (د ر ك) درجات کے مقابلے میں ہے۔ چنانچہ اوپر چڑھنے کے لیے لفظ ''درجات'' بولا جاتا ہے اور نیچے اترنے کے لیے لفظ ''درکات'' بولا جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے: درجات الجنة و درکات النار۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ: دو اعتبار سے منافق کافر سے بھی بدتر ہے:

i۔ منافق، کافر سے زیادہ بدضمیر اور بدباطن ہے۔ کیونکہ کافر اپنے مؤقف کا برملا اظہار کرتا ہے اور منافق کی نسبت انکار کی جرأت کرتا ہے۔

ii۔ منافق، ایمان کا لبادہ اوڑھ کر بظاہر معاشرتی معاملات میں ایمان کے فائدے اٹھاتا ہے اور باطن میں ایمان والوں کی جڑیں کاٹتا ہے۔ لہٰذا یہ مار آستین بن کر کافر سے زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے یہ منافق لوگ جہنم کے نچلے طبقوں میں ہوں گے۔ یعنی ان کا عذاب کفار سے بھی زیادہ ہوگا۔

۲۔ اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا: اس کے باوجود توبہ کا دروازہ ان کے لیے بھی کھلا ہے لیکن صرف ایک توبہ کر لینا ہی کافی نہیں ہے، اس کے ساتھ درج ذیل باتیں بھی ہوں:

الف: وَ اَصۡلَحُوۡا: آئندہ کے لیے اپنی اصلاح کریں۔ یعنی منافقت کی میل کچیل کو ختم کر کے نئے

سرے سے ایمان کی زندگی اختیار کریں۔
ب: وَاعۡتَصَمُوۡا: اللہ کے ساتھ متمسک رہیں۔ یعنی احکام الٰہی کے پابند رہیں۔
ج: وَاَخۡلَصُوۡا: اس کے ایمان وعمل میں مفادات کو دخل نہ ہو، بلکہ خالصتاً اللہ کے لیے ہو تو یہ لوگ مومنین کے ساتھ محشور ہوں گے۔

یہاں پر اللہ تعالٰی نے مَعَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ "مؤمنین کے ساتھ" فرمایا، من المؤمنین "مومنین میں سے" نہیں فرمایا۔ یعنی یہ منافقین توبہ و اصلاح کے بعد بھی مومنین کے ساتھ ہوں گے۔ البتہ رسوخ ایمان کے بعد یہ لوگ مومنین میں شمار ہو سکتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ توبہ اگر اصلاح، اخلاص اور عمل کے ساتھ ہو تو ایسی توبہ منافق کو بھی مومن بنا دیتی ہے۔

مَا یَفۡعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمۡ اِنۡ شَکَرۡتُمۡ وَاٰمَنۡتُمۡ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ شَاکِرًا عَلِیۡمًا ﴿۱۴۷﴾

۱۴۷۔ اگر تم شکر ادا کرو اور ایمان لے آؤ تو اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا؟ اور اللہ بڑا قدردان، بڑا جاننے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ مَا یَفۡعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمۡ : اللہ کسی جذبۂ انتقام کے تحت بندوں کو عذاب نہیں دیتا۔ بندوں کو عذاب دینے میں اللہ کو نہ کوئی لذت محسوس ہوتی ہے، نہ اس طرح وہ اپنی بالادستی، طاقت اور سلطنت کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے اور نہ ہی اپنے غم و غصے کو ٹھنڈا کرنا چاہتا ہے۔ اللہ کی ذات اس قسم کی تمام چیزوں سے پاک ہے بلکہ عذاب ناشکروں اور منکروں کے ساتھ ہونے والا ایک فطری ردعمل ہے۔ اگر بندوں کی طرف سے خود عذاب کے اسباب پیدا نہ ہوں تو اللہ کو کسی کو عذاب دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ اِنۡ شَکَرۡتُمۡ وَاٰمَنۡتُمۡ : یہاں شکر کا ذکر ایمان سے پہلے اس لیے آیا ہے کہ شکر کا مطلب یہ ہے کہ احسان مند دل سے احسان کا اعتراف کرے، زبان سے احسان کا اقرار کرے اور عمل سے اس کا ثبوت دے۔ یہ چیزیں جب انسان سے صادر ہوں گی تو اس وقت وہ اس محسن پر ایمان لائے گا۔

اہم نکات

۱۔ اس آیہ میں مومن کے لیے ایک نہایت ہی قابل توجہ اور پرمسرت خبر یہ ہے کہ جب منافق، جو

کافر سے بھی بدتر ہے اور اس کی جگہ جہنم کے نچلے طبقوں میں ہے، کی توبہ قبول ہو گی تو مومن خواہ کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو، وہ توبہ کی رحمت سے کیونکر محروم ہو سکتا ہے۔

۲۔ اللہ اپنے بندوں کو عذاب دینا نہیں چاہتا۔ وہ ارحم الراحمین ہے۔ بندوں کو صرف اتنا کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کی رحمت کے قابل بنائیں تا کہ اللہ اپنے دائرۂ رحمت سے خارج نہ کرے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾

۱۴۸۔ اللہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی (کسی کی) برملا برائی کرے، مگر یہ کہ مظلوم واقع ہوا ہو اور اللہ بڑا سننے والا، جاننے والا ہے۔

تفسیر آیات

ایک مثالی معاشرے کی تشکیل کے لیے اس امت کو انسانی و اخلاقی اقدار کی تعلیم دی جا رہی ہے اور انسانیت کی تعمیر کے لیے اس امت کو قیادت و امامت کی منزل پر فائز کرنے کے لیے ایک ایسی فضا ہموار کی جا رہی ہے، جس میں پرورش پانے والا انسان اعلی اقدار کا مالک ہو۔ اس کا ضمیر پاک اور بیدار ہو۔

۱۔ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ: کسی کی شخصیت کو مجروح کرنا، معاشرے میں اس کا راز فاش کرنا، احترام آدمیت کے منافی ہے اور کرامت انسانی کے خلاف ہے۔ اس لیے اللہ اس امت سے خطاب فرماتا ہے: ''اللہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی کسی کی برملا برائی کرے'' نیز برائی کرنے سے ایک دوسرے کے خلاف نفرتیں بڑھ جاتیں اور باہمی اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ اخوت و بھائی چارہ باقی نہیں رہتا۔ ایک دوسرے کے خلاف عداوت اور کینے سے دلوں میں اضطراب آ جاتا ہے، سکون سلب ہو جاتا ہے اور ایک مضطرب الحال معاشرہ اپنے دامن میں فساد پالتا ہے۔

۲۔ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ: اس سے زیادہ ضرر رساں ظلم و ستم کا فساد ہے۔ اس لیے مظلوم کو اجازت دی ہے کہ وہ ظالم کو برملا برا کہہ سکتا ہے۔ کیونکہ ظالم خود احترام آدمیت و انسانی کرامت کے خلاف کام کرتا ہے اور خود اپنے ضمیر کو فاش کرتا ہے، لہٰذا ایسے لوگوں کے خلاف بات کرنا، ان کی شخصیت کو مجروح کرنے کے مترادف نہیں ہو گا، کیونکہ ظالم کی شخصیت نہیں ہوتی۔

اہم نکات

۱۔ اسلام احترام آدمیت کا تحفظ فراہم کرتا ہے: لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ ....

۲۔ ظالم اپنے ظلم کی وجہ سے انسانی احترام سے محروم ہے۔

اِنۡ تُبۡدُوۡا خَیۡرًا اَوۡ تُخۡفُوۡہُ اَوۡ تَعۡفُوۡا عَنۡ سُوۡٓءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا قَدِیۡرًا ﴿۱۴۹﴾

۱۴۹۔ اگر تم کوئی نیک کام علانیہ یا خفیہ کرو یا برائی سے درگزر کرو تو اللہ بڑا معاف کرنے والا، قدرت والا ہے۔

تفسیر آیات

ایک طرف گزشتہ آیت میں احترام آدمیت کے خلاف برائی کرنے سے منع کیا، دوسری طرف اس آیت میں ایک اور اخلاقی اصول سے روشناس کرایا۔ وہ یہ کہ نیکی کا اظہار کرو یا پوشیدہ رکھو، دونوں باتوں کی اجازت ہے۔ اظہار اس نیت سے ہو کہ لوگوں میں کار خیر کا شعور بڑھے اور پوشیدہ اس لحاظ سے ہو کہ ریاکاری کا شائبہ نہ رہے۔

ساتھ ایک الٰہی اخلاق کا ذکر فرمایا کہ وہ قدرت کے باوجود درگزر کرتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

تخلقوا باخلاق اللّٰہ۔[1] اپنے آپ کو الٰہی اخلاق سے آراستہ کریں۔

عین ممکن ہونے کے باوجود ظالم سے بدلہ نہ لینا، اسے عفو کرنا اور اس کو معاشرے میں رسوا نہ کرنا الٰہی اخلاق ہے.

فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا قَدِیۡرًا: اللہ تعالیٰ بھی قدرت کے باوجود عفو فرمانے والا ہے۔

اہم نکات

۱۔ کسی کی برملا برائی کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ یعنی کسی کا راز فاش کرنا اور کسی کی شخصیت کو مجروح کرنا غیبت ہے۔ یہ احترام آدمیت اور کرامت انسانی کے خلاف ہے، جب کہ انسان اللہ کے نزدیک محترم ہے۔ ہم آئندہ آیہ غیبت کے ذیل میں اس کی تفصیل بیان کریں گے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یَقُوۡلُوۡنَ نُؤۡمِنُ بِبَعۡضٍ وَّ نَکۡفُرُ بِبَعۡضٍ ۙ

۱۵۰۔ جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور اللہ اور رسولوں کے درمیان تفریق ڈالنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں: ہم بعض پر ایمان لائیں گے اور بعض کا انکار کریں گے اور وہ اس

---

[1] بحار الانوار ۵۸ : ۱۲۹

وَّيُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يَّتَّخِذُوۡا بَيۡنَ ذٰلِكَ سَبِيۡلًا ۙ﴿۱۵۰﴾	طرح کفر و ایمان کے درمیان ایک راہ نکالنا چاہتے ہیں۔
اُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ حَقًّا ۚ وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابًا مُّهِيۡنًا ﴿۱۵۱﴾	۱۵۱۔ایسے لوگ حقیقی کافر ہیں اور ہم نے کفار کے لیے ذلت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ: یہاں کفار اور منکروں کے تین گروہ قابل تصور ہیں:

i۔ جو اللہ کو تو مانتے ہیں لیکن کسی رسول کو نہیں مانتے۔ مشرکین اللہ کو شریک کے ساتھ مانتے ہیں، رسول کو نہیں مانتے۔

ii۔ جو اللہ کو مانتے ہیں اور نہ رسولوں کو مانتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ملحد کہتے ہیں۔

iii۔ جو اللہ اور بعض رسولوں کو مانتے ہیں اور بعض دیگر رسولوں کو نہیں مانتے۔ اہل کتاب میں سے یہود حضرت عیسیٰ (ع) اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں مانتے اور نصاریٰ خاتم الانبیاء کو نہیں مانتے۔

۲۔ وَیُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّفَرِّقُوۡا: اس آیت میں فرمایا: یہ سب لوگ کافر ہیں اور سب سے آخری گروہ کے بارے میں فرمایا: یہ لوگ ایمان باللہ اور ایمان بالرسل میں تفریق ڈال رہے ہیں، حالانکہ جو اس کے بعض رسولوں کا انکار کرتے ہیں، وہ تمام رسولوں کے منکر کی طرح کافر ہیں۔

۳۔ وَّیُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَّخِذُوۡا: وہ لوگ ایمان باللّٰہو بالرسل اور کفر باللّٰہ و بالرسل کے درمیان ضلالت کا ایک راستہ نکالنا چاہتے ہیں۔ وہ راستہ ایمان باللّٰہ و ببعض الرسل ہے۔

۴۔ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ حَقًّا: کفر و ایمان کے درمیان تیسرا راستہ نہیں بنتا، بلکہ یہ لوگ حقیقی معنوں میں کافر ہیں۔ چونکہ جب یہ لوگ بعض رسولوں کو نہیں مانتے ہیں تو ان لوگوں نے اللہ کو رد کیا ہے اور یہ حقیقی کفر ہے۔

اہم نکات

۱۔ اہل کتاب پر بھی کافر کا اطلاق ہوتا ہے، تاہم مشرکین اور اہل کتاب کے کفر میں فرق موجود ہے۔

وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمۡ يُفَرِّقُوۡا بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ اُولٰٓـئِكَ	۱۵۲۔اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کے درمیان

سَوۡفَ یُؤۡتِیۡہِمۡ اُجُوۡرَہُمۡ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۵۲﴾

کسی تفریق کے بھی قائل نہیں ہیں، عنقریب اللہ ان کا اجر انہیں عطا فرمائے گا اور اللہ بڑا درگزر کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

رسولوں کے درمیان تفریق کرنے والوں کے ذکر کے بعد ان لوگوں کا تقابلی ذکر ہوا، جو بلا تفریق اللہ کے تمام رسولوں پر ایمان لاتے ہیں، تمام ادیان سماویہ کو قبول کرتے ہیں اور اللہ کی طرف سے آنے والے سب نمائندوں کو مانتے ہیں۔ وہی صحیح معنوں میں اہل ایمان ہیں اور انہی کو اجر و ثواب ملے گا۔

یَسۡـَٔلُکَ اَہۡلُ الۡکِتٰبِ اَنۡ تُنَزِّلَ عَلَیۡہِمۡ کِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدۡ سَاَلُوۡا مُوۡسٰۤی اَکۡبَرَ مِنۡ ذٰلِکَ فَقَالُوۡۤا اَرِنَا اللّٰہَ جَہۡرَۃً فَاَخَذَتۡہُمُ الصّٰعِقَۃُ بِظُلۡمِہِمۡ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الۡعِجۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡہُمُ الۡبَیِّنٰتُ فَعَفَوۡنَا عَنۡ ذٰلِکَ ۚ وَ اٰتَیۡنَا مُوۡسٰی سُلۡطٰنًا مُّبِیۡنًا ﴿۱۵۳﴾

۱۵۳۔ اہل کتاب آپ سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ آپ ان پر آسمان سے ایک کتاب اتار لائیں، جب کہ یہ لوگ اس سے بڑا مطالبہ موسیٰ سے کر چکے ہیں، چنانچہ انہوں نے کہا: ہمیں علانیہ طور پر اللہ دکھا دو، ان کی اسی زیادتی کی وجہ سے انہیں بجلی نے آ لیا پھر انہوں نے گوسالہ کو (اپنا معبود) بنایا جب کہ ان کے پاس واضح نشانیاں آ چکی تھیں، اس پر بھی ہم نے ان سے درگزر کیا اور موسیٰ کو ہم نے واضح غلبہ عطا کیا۔

تفسیر آیات

۱۔ یَسۡـَٔلُکَ اَہۡلُ الۡکِتٰبِ: مراد یہود ہیں جو یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ جس طرح حضرت موسیٰ (ع) پر آسمان سے الواح کی شکل میں کتاب نازل ہوئی ہے، اسی طرح کی کتاب ہو۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ ان یہودیوں پر کوئی کتاب نازل ہو، جس میں محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر ایمان لانے کا حکم ہو۔ تُنَزِّلَ عَلَیۡہِمۡ اس تفسیر پر قرینہ قرار دیتے ہیں۔

اس سورہ سے قبل نازل ہونے والے سورہ ہائے بقرہ، ہود، یونس وغیرہ میں قرآن کی اس دعوت کے بعد کہ اس قرآن کے برابر ایک سورہ بنا لاؤ، مدینہ کے یہودیوں کا یہ مطالبہ صرف عناد اور ہٹ دھرمی پر مبنی

تھا۔ اس لیے اس آیت میں یہود کی ہٹ دھرمی اور باطل پرستی کی ایک مثال پیش فرمائی۔

۲۔ فَقَدۡ سَاَلُوۡا مُوۡسٰۤی اَکۡبَرَ: یہ لوگ صرف آپ (ص) سے نامعقول مطالبہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ لوگ موسیٰ (ع) سے اس سے بڑا مجرمانہ مطالبہ کر چکے ہیں۔ وہ یہ کہ ہمیں اللہ علانیہ دکھا دو۔ ظاہر ہے کہ اللہ کو انسانی نگاہوں کی محدودیت میں لانے کا مطالبہ شان الٰہی میں گستاخی تھا، جس کی فوری سزا انہیں مل گئی اور ان پر بجلی ٹوٹ پڑی۔

۳۔ ثُمَّ اتَّخَذُوا الۡعِجۡلَ: ان کے پاس حضرت موسیٰ (ع) کے ذریعے واضح معجزات آنے کے باوجود یہ لوگ گوسالہ پرستی جیسی ضلالت کی طرف چلے گئے۔ لہٰذا قرآن جیسا معجزہ آنے کے باوجود اس قسم کا مطالبہ کرنا یہودی مزاج کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ ان کی پرانی عادت ہے۔

۴۔ فَعَفَوۡنَا عَنۡ ذٰلِکَ: گوسالہ پرستی کی یہ سزا دی گئی تھی کہ ان کو قتل کر دیا جائے۔ قتل کا سلسلہ جاری تھا کہ اس اثنا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے درگذری کا حکم آیا اور قتل کا سلسلہ بند کر دیا۔ لہٰذا عفو سے مراد قتل کی سزا کا معاف کرنا ہے۔ یعنی دنیا میں ملنے والی فوری سزا معاف ہو گئی۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کو نگاہوں کی محدودیت میں لانے کا مطالبہ شان الٰہی میں بڑی گستاخی ہے: اَکۡبَرَ مِنۡ ذٰلِکَ.

۲۔ گوسالہ پرستی کی دنیاوی سزا معاف ہو گئی تھی۔ فَعَفَوۡنَا عَنۡ ذٰلِکَ ...۔

وَ رَفَعۡنَا فَوۡقَہُمُ الطُّوۡرَ بِمِیۡثَاقِہِمۡ وَ قُلۡنَا لَہُمُ ادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا وَّ قُلۡنَا لَہُمۡ لَا تَعۡدُوۡا فِی السَّبۡتِ وَ اَخَذۡنَا مِنۡہُمۡ مِّیۡثَاقًا غَلِیۡظًا ﴿۱۵۴﴾

۱۵۴۔ اور ہم نے ان کے میثاق کے مطابق کوہ طور کو ان کے اوپر اٹھایا اور ہم نے انہیں حکم دیا: دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اور ہم نے ان سے کہا: ہفتہ کے دن تجاوز نہ کرو اور (اس طرح) ہم نے ان سے ایک پختہ عہد لیا۔

تفسیر آیات

اس آیت کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ بقرہ آیت ۶۳۔۹۳

فَبِمَا نَقۡضِہِمۡ مِّیۡثَاقَہُمۡ وَ کُفۡرِہِمۡ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَ قَتۡلِہِمُ الۡاَنۡۢبِیَآءَ بِغَیۡرِ حَقٍّ وَّ قَوۡلِہِمۡ قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ بَلۡ

۱۵۵۔ پھر ان کے اپنے میثاق کی خلاف ورزی، اللہ کی آیات کا انکار کرنے اور انبیاء کو ناحق قتل کرنے اور ان کے اس قول کے سبب کہ ہمارے دل غلاف میں محفوظ ہیں (اللہ نے

طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿١٥٥﴾

وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿١٥٦﴾

وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۭ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ﴿١٥٧﴾

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿١٥٨﴾

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿١٥٩﴾

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿١٦٠﴾

وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَ

انہیں سزا دی، ان کے دل غلاف میں محفوظ نہیں) بلکہ ان کے کفر کے سبب اللہ نے ان پر مہر لگا دی ہے اسی وجہ سے یہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔

۱۵۶۔ نیز ان کے کفر کے سبب اور مریم پر عظیم بہتان باندھنے کے سبب۔

۱۵۷۔ اور ان کے اس قول کے سبب کہ ہم نے اللہ کے رسول مسیح بن مریم کو قتل کیا ہے، جبکہ فی الحقیقت انہوں نے نہ انہیں قتل کیا اور نہ سولی چڑھایا بلکہ (دوسرے کو) ان کے لیے شبیہ بنا دیا گیا تھا اور جن لوگوں نے اس میں اختلاف کیا وہ اس میں شک میں مبتلا ہیں، ظن کی پیروی کے علاوہ انہیں اس بارے میں کوئی علم نہیں اور انہوں نے یقیناً مسیح کو قتل نہیں کیا۔

۱۵۸۔ بلکہ اللہ نے انہیں اپنی طرف اٹھایا اور بیشک اللہ بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

۱۵۹۔ اور اہل کتاب میں کوئی ایسا نہیں جو ان کی موت سے پہلے ان پر ایمان نہ لائے اور قیامت کے دن وہ (مسیح) ان پر گواہ ہوں گے۔

۱۶۰۔ یہود کے ظلم اور راہ خدا سے بہت روکنے کے سبب بہت سی پاک چیزیں جو (پہلے) ان پر حلال تھیں ہم نے ان پر حرام کر دیں۔

۱۶۱۔ اور اس سبب سے بھی کہ وہ سود خوری کرتے

اَکۡلِہِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ ؕ وَ اَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ مِنۡہُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ﴿۱۶۱﴾	تھے جب کہ اس سے انہیں منع کیا گیا تھا اور لوگوں کا مال ناحق کھانے کے سبب سے بھی اور ان میں سے جو کافر ہیں ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تفسیر آیات

ان آیات کا ربط کلام جملہ ہائے معترضہ کو نکالنے کے بعد اس طرح بنتا ہے کہ اللہ فرماتا ہے:

اس سبب سے کہ یہود نے عہد شکنی کی، آیات کا انکار کیا اور کہا کہ ہمارے دل غلاف میں محفوظ ہیں کہ ان دلوں پر غیر یہودی تعلیمات کا اثر نہ ہو گا اور حضرت مریم پر عظیم بہتان باندھا اور کہا کہ ہم نے مسیح کو قتل کیا اور ظلم کا ارتکاب کیا۔ اکثر لوگوں کو راہ خدا سے روکا۔ منع کرنے کے باوجود سودخوری کی۔ لوگوں کا مال ناحق کھایا۔ ان تمام باتوں کے سبب سے ہم نے ان پر بہت سی پاک چیزیں حرام کر دیں اور ان کے لیے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

موجودہ مسیحیت کا اصل اور بنیادی عقیدہ ”نظریۂ کفارہ“ ہے کہ ابن اللہ نے یا خود اللہ نے سولی چڑھ کر، اپنی جان کا نذرانہ دے کر، تمام مخلوق کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ یعنی بجائے اس کے کہ گناہ کا ارتکاب کرنے والے کفارہ ادا کرتے، خود اللہ نے اپنی جان کا نذرانہ دے کر کفارہ ادا کر دیا۔ البتہ اپنے بیٹے کی شکل میں آ کر، جو نظریہ وحدت در تثلیث کے تحت خود اللہ ہے۔

حضرت مسیح (ع) کے قتل پر یہود و نصاریٰ دونوں کا اتفاق ہے۔ یہود اس قتل کو اہانت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور مسیحی اس قتل کو عظمت مسیح (ع) کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

اسلام کا مؤقف ان سب سے جدا ہے کہ حضرت مسیح (ع) قتل ہوئے اور نہ سولی چڑھائے گئے، بلکہ یہود کو دھوکا ہوا اور اشتباہ میں کسی دوسرے کو قتل کیا۔

وَ لٰکِنۡ شُبِّہَ لَہُمۡ: لیکن دوسرے کو ان کے لیے شبیہ بنا دیا گیا۔ قرآن و احادیث میں اس کی تفصیل نہیں ملتی کہ کسے شبیہ بنایا گیا۔ تاہم بعض تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ مسیح (ع) کے بارے میں قرآنی مؤقف درست ہے:

i۔ مسیحیوں کے ایک قدیم فرقے سلیدیہ کا بھی یہی نظریہ ہے کہ یسوع کی جگہ اشتباہاً شمعون کرینی کو سولی پر چڑھا دیا گیا اور حضرت عیسیٰ (ع) کو جسم و روح سمیت آسمان پر اٹھا لیا گیا۔

ii۔ حضرت مسیح (ع) کو سزائے موت سلطنت روم کی عدالت سے ملی۔ رومی اجنبی سپاہی مسیح (ع) کو

پہچانتے نہیں تھے، اس لیے ایک منافق یہوداہ کا سہارا لیا گیا۔ چنانچہ انجیل ۱۸: ۳۔۸ میں آیا ہے:

جب یہ پلٹن اور پیادے وہاں پہنچے تو یسوع نے ان سے پھر پوچھا کہ تم کسے ڈھونڈتے ہو؟ وہ بولے یسوع ناصری کو۔ یسوع نے جواب دیا: میں تم سے کہ چکا ہوں کہ میں ہی ہوں۔

اس متن میں ''پھر پوچھا'' اور ''میں تم سے کہ چکا ہوں'' کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ رومی سپاہیوں کو مسیح (ع) کی شناخت میں کافی دقت پیش آ رہی تھی اور بار بار کہنے کے باوجود کہ میں ہی یسوع ہوں وہ باور نہیں کرتے تھے۔

iii۔اناجیل لوقا، مرقس اور متیٰ سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت مسیح (ع) اپنی شکل و صورت بدلنے پر قادر تھے۔ چنانچہ ہم یہاں انجیل لوقا کی عبارت پر اکتفا کرتے ہیں:

جب وہ دعا مانگ رہا تھا تو ایسا ہوا کہ اس کے چہرے کی صورت بدل گئی اور اس کی پوشاک سفید و براق ہوگئی۔ (لوقا ۹: ۲۹)

iv۔یہ بات ایک واضح حقیقت ہے کہ موجودہ چاروں اناجیل دوسری صدی عیسوی کے اواخر میں لکھی گئی ہیں۔ یعنی حضرت عیسیٰ (ع) کے قتل کے واقعے کے بہت بعد۔ تاہم ایک اور انجیل بھی لکھی گئی ہے جسے انجیل برنابا کہتے ہیں۔ اس انجیل میں آیا ہے:

جب سپاہیاں یہوداہ کے ہمراہ اس مقام کے نزدیک پہنچے جہاں یسوع موجود تھے تو یسوع ایک بھیڑ کا شور سن کر ڈر گئے اور گھر میں داخل ہو گئے اور گیارہ (شاگرد) سو رہے تھے۔ جب اپنے بندے کو خطرے میں گھرا ہوا پایا تو اس نے اپنے نمائندوں جبرئیل، میخائیل، رفائیل اور اودیل کو بھیجا کہ یسوع کو اس عالم سے اٹھائیں۔

پاک فرشتے آئے اور یسوع کو جنوبی کھڑکی سے لے لیا اور اٹھا لیا اور تیسرے آسمان پر فرشتوں کی صحبت میں رکھ دیا۔ ادھر یہوداہ پوری قوت سے اس کمرے میں گھس گیا جس سے یسوع کو اٹھا لیا گیا تھا تو دیکھا تمام شاگرد سو رہے ہیں۔ چنانچہ اللہ نے ایک حیرت انگیز کام کیا کہ یہوداہ کا لہجہ اور صورت بالکل یسوع کی طرح ہوگئی۔ چنانچہ ہم نے یقین کر لیا کہ یہی یسوع ہیں۔ مگر وہ ہم کو جگانے کے بعد ہمارے معلم کو تلاش کرنے لگا، جس سے ہمیں حیرت ہوئی اور ہم نے کہا: آپ ہی ہمارے سردار معلم ہیں۔ کیا آپ نے ہمیں بھلا دیا ہے؟[1]

---

[1] فی ظلال القرآن بحوالہ محاضرات فی النصرانیۃ ابوزھرہ

v۔ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں رواج یہ تھا کہ سولی کے اوپر والی لکڑی خود مجرم پر لاد کر سولی گھر تک لے جاتے تھے۔ حضرت مسیح (ع) ناتواں اور لاغر تھے۔ سولی کی لکڑی اٹھا کر فاصلے تک نہیں لے جاسکتے تھے۔ چنانچہ اس وقت کی حاکم قوم رومیوں نے ایک بدمعاش یہودی کو مجمع سے پکڑ کر صلیب کی لکڑی اس پر لاد دی۔ چنانچہ انجیل متیٰ میں یہ متن موجود ہے:

> انہیں شمعون نامی ایک کرینی آدمی ملا۔ اسے بیگار پکڑا کر صلیب اٹھوائی۔ چنانچہ سولی پر متعین افراد ایک اجنبی رومی قوم کے سپاہی اسرائیلیوں کے فرد فرد کو شناخت نہیں کر سکتے تھے، حسب دستور اسی کو مجرم سمجھے جس پر صلیب لدی ہوئی تھی۔

چنانچہ سلیدیہ فرقے کا نظریہ یہی ہے کہ سولی چڑھنے والا مسیح نہیں شمعون کرینی تھا۔

vi۔ شام اور فلسطین پر اس وقت رومیوں کی حکومت تھی ۔حضرت مسیح (ع) کو پکڑنے والے رومی سپاہیوں کے مقامی نہ ہونے کی وجہ سے فلسطین کے بنی اسرائیلی ان کے لیے اجنبی تھے اور حضرت عیسی (ع) کی گرفتاری کے وقت لوگوں کی بھیڑ کا ہر انجیل میں ذکر ملتا ہے۔ اس بھیڑ میں شُبِّہَ لَہُمۡ کا امکان بہت زیادہ ہے۔

vii۔ عقیدہ کفارہ اور قتل مسیح کا نظریہ پیش کرنے والا موجودہ مسیحیت کا بانی پولوس ہے، جو ۶۵ء میں وفات پا گیا۔ پولوس، یہودی اور مسیحیوں کا جانی دشمن تھا ۔بعد میں مسیحیت پر ایمان کا دعویٰ کیا تو مسیحی نہیں مانتے تھے لیکن برنابا کی تصدیق پر لوگوں نے اس کے ایمان کو قبول کر لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں برنابا مسیحیوں میں ایک مستند شخصیت کا مالک تھا ۔بعض اناجیل میں پولوس اور برنابا میں اختلاف کا ذکر ملتا ہے۔ یہاں تک کہ برنابا اپنی انجیل کی ابتدا میں لکھتا ہے:

> پولوس نے حضرت یسوع کی تعلیمات کو بدل کر جدید تعلیم رائج کی ہے۔ ممکن ہے برنابا کی طرف سے پولوس کے ایمان کی تصدیق کے بعد اس نے مسیحیوں میں اپنا مقام بنا لیا ہو اور جدید مذہب کی بنیاد ڈالی ہو، جب کہ اس قسم کی سازشیں کرنا یہودیوں کا شیوہ ہے۔

مذکورہ مختلف حوالوں سے اس میں اختلاف نظر آتا ہے کہ حضرت مسیح (ع) کی جگہ سولی چڑھنے والا کون تھا۔ بعض تاریخی حوالوں سے یہ شخص شمعون کرینی تھا۔ انجیل برنابا کے مطابق یہ شخص یہوداہ تھا، جو خود حضرت مسیح (ع) کے گیارہ شاگردوں میں سے ایک تھا اور قتل مسیح کی سازش میں یہودیوں کے ساتھ شریک

تھا۔ البتہ ایک ترجیحی امر یہ ہے کہ بعض اناجیل سے ثابت ہے کہ یہوداہ نے خودکشی کی تھی۔ ممکن ہے جب یہوداہ کو مردہ پایا ہو تو خودکشی پر محمول کیا ہو، جب کہ درحقیقت یہودا، مسیح (ع) کی جگہ سولی پر مرا ہو۔ یورپ کے بعض اہل تحقیق یہ نظریہ قائم کرتے ہیں کہ مسیح (ع) سولی پر بے ہوش ہو گئے تھے، انہیں مردہ سمجھ کر سولی سے اتار دیا گیا۔ وہ ہوش میں آئے اور لوگوں کی نظروں سے غائب ہو گئے وغیرہ۔

بَلۡ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيۡهِ: بلکہ اللہ نے انہیں اپنی طرف اٹھایا۔ کچھ کج سلیقہ لوگ رَفَعَ سے رفع درجات مراد لیتے ہیں جو کہ سیاق و سباق آیت کے صریحاً خلاف ہے۔ چونکہ رَفَعَ قتل کے مقابلے میں آیا ہے کہ انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انہیں اپنی طرف اٹھا لیا۔ ظاہر ہے کہ قتل کے مقابلے میں رَفَعَ آتا ہے تو مطلب صاف اور صریح یہ نکلتا ہے کہ انہیں اٹھا لیا گیا ہے، وہ قتل نہیں کیے گئے۔ اگر رفع درجات مراد ہوتا یا روح کا اٹھانا مراد ہوتا تو یہ قتل کی صورت میں بھی قابل جمع ہے۔ لفظ بَلۡ (بلکہ) کے ساتھ استدراک کا معنی نہیں بنتا۔

آیت کے آخر میں عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا کا ذکر اس بات پر شاہد ہے کہ اس سے پہلے بیان شدہ مطلب اللہ کی قہاریت اور غالب آنے سے مربوط ہے، ورنہ عیسیٰ (ع) کو موت آنے کی صورت میں تو کسی طاقت و قہاریت کا مظاہرہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس صورت میں تو دشمنانِ خدا کی سازش کامیاب ہو جاتی ہے۔

لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ: اہل کتاب میں کوئی ایسا نہ ہو گا جو ان کی موت سے پہلے ان پر ایمان نہ لائے۔ اس جملے کی دو تفسیریں ہیں:

i۔ ایک وہ جو ہم نے ترجمے میں اختیار کی ہے۔ یعنی اہل کتاب میں کوئی ایسا نہ ہو گا جو حضرت عیسیٰ (ع) کی موت سے پہلے ان پر ایمان نہ لائے۔

ii۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہ ہو گا جو اپنی موت سے پہلے حضرت عیسیٰ (ع) پر ایمان نہ لائے۔

آیت کی تعبیر میں دونوں تفسیروں کا یکساں احتمال ہے۔ البتہ خود الفاظ آیت سے قطع نظر دیگر شواہد سے پہلی تفسیر قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ حضرت عیسیٰ (ع) اب بھی زندہ ہیں اور تمام اہل کتاب پر گواہ ہوں گے۔ لہٰذا ان کی موت بھی سب کے بعد ہو گی۔

۲۔ نزول عیسیٰ (ع) کی روایات، احادیث میں تقریباً تواتر سے ثابت ہیں۔ لہٰذا جب حضرت عیسیٰ (ع) نزول فرمائیں گے تو تمام اہل کتاب ان پر ایمان لائیں گے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿١٦٢﴾	۱۶۲۔لیکن ان میں سے جو علم میں راسخ ہیں اور اہل ایمان ہیں وہ اس پر ایمان لاتے ہیں جو آپ پر نازل کیا گیا اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا اور نماز قائم کرنے والے ہیں اور زکوٰۃ دینے والے ہیں اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان لانے والے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کو عنقریب ہم اجر عظیم عطا کریں گے۔

تفسیر آیات

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ : اہل کتاب کا حضور (ص) سے یہ مطالبہ کہ آپ (ص) ان کے لیے آسمان سے ایک کتاب اتار لائیں، ایک جاہلانہ اور معاندانہ مطالبہ ہے، ورنہ جو علم میں پختہ ہیں اور ایماندار ہیں وہ ایسے نامعقول مطالبے نہیں کرتے، بلکہ وہ آپ (ص) اور سابقہ انبیاء کی تعلیمات پر ایمان لاتے ہیں۔ چونکہ انہیں معلوم ہے کہ رسالت مآب (ص) کی تعلیمات میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو انبیائے سلف کی تعلیمات و معجزات سے متصادم ہو۔

اہل تحقیق کے نزدیک الْمُقِيْمِيْنَ اگرچہ الرّٰسِخُوْنَ پر عطف ہے، تاہم یہ اعنی مقدر ہونے سے منصوب ہوا ہے۔ تفسیر قرطبی وغیرہ میں آیا ہے کہ حضرت عائشہ سے پوچھا گیا الْمُقِيْمِيْنَ کیوں ہے۔ قواعد کے اعتبار سے المقیمون ہونا چاہیے تھا تو حضرت عائشہ نے جواب میں کہا: لکھنے والوں سے غلطی ہو گئی ہے۔ ہم اس کو غلطی تسلیم نہیں کرتے، چونکہ عربی زبان میں ایسے نظیریں بہت ہیں جنہیں منصوب بالمدح کہتے ہیں۔

چنانچہ یہ کہنا درست ہے مررت بزید الکریم یعنی مررت بزید اعنی الکریم ہے۔ اس کو منصوب بالمدح کہتے ہیں۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰي نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ	۱۶۳۔ (اے رسول) ہم نے آپ کی طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوح اور ان کے بعد کے انبیاء کی طرف بھیجی اور جس طرح ہم

وَ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ وَ الۡاَسۡبَاطِ وَ عِیۡسٰی وَ اَیُّوۡبَ وَ یُوۡنُسَ وَ ہٰرُوۡنَ وَ سُلَیۡمٰنَ ۚ وَ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا ﴿۱۶۳﴾

نے ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، اولاد یعقوب، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کی طرف (وحی بھیجی) اور داؤد کو ہم نے زبور عطا کی۔

تفسیر آیات

اہل کتاب کے نامعقول مطالبے کا جواب جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ محمد (ص) پر وحی کا نزول سابقہ انبیاء کا تسلسل ہے۔ یہ کوئی انوکھی چیز نہیں ہے، جو کبھی پہلے دیکھنے میں نہ آئی ہو بلکہ یہ سنت الٰہی ہے کہ اس نے یکے بعد دیگرے انبیاء بھیجے:

وَ اِنۡ مِّنۡ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیۡہَا نَذِیۡرٌ ۔[1] اور کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔

اس قافلۂ نور کا سلسلہ حضرت نوح (ع) سے شروع ہوتا ہے اور حضرت محمد مصطفیٰ (ص) پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

الۡاَسۡبَاطِ: اولاد کی اولاد کو کہا جاتا ہے اور یہاں الۡاَسۡبَاطِ سے مراد اولاد یعقوب (ع) ہے۔ اولاد یعقوب (ع) بارہ اسباط پر مشتمل تھی۔ دس اسباط خود حضرت یعقوب (ع) کی اولاد میں سے تھیں اور دو حضرت یوسف کی اولاد میں سے۔

وَ رُسُلًا قَدۡ قَصَصۡنٰہُمۡ عَلَیۡکَ مِنۡ قَبۡلُ وَ رُسُلًا لَّمۡ نَقۡصُصۡہُمۡ عَلَیۡکَ ؕ وَ کَلَّمَ اللّٰہُ مُوۡسٰی تَکۡلِیۡمًا ﴿۱۶۴﴾

۱۶۴۔ ان رسولوں پر (وحی بھیجی) جن کے حالات کا ذکر ہم پہلے آپ سے کر چکے ہیں اور ان رسولوں پر بھی جن کے حالات کا ذکر ہم نے آپ سے نہیں کیا اور اللہ نے موسیٰ سے تو خوب باتیں کی ہیں۔

تفسیر آیات

یعنی ان سورتوں سے پہلے نازل ہونے والی مکی سورتوں میں جن انبیاء کا ذکر آیا ہے، ان کے علاوہ وہ انبیاء جن کا ذکر باقی سوروں میں آیا ہے اور وہ انبیاء جن کا ذکر قرآن میں نہیں آیا۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی طرف ایک نبی بھیجا ہے:

----

[1] ۳۵ فاطر: ۲۴

وَلَقَدۡ بَعَثۡنَا فِیۡ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوۡلًا ...۔[۱]　　اور بتحقیق ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا ہے۔

وَ اِنۡ مِّنۡ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیۡہَا نَذِیۡرٌ ۔[۲]　　اور کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔

قرآن میں تقریباً ۲۶ انبیاء کا صریحاً ذکر ہے اور بعض انبیاء کا نام لیے بغیر اشارہ فرمایا ہے۔

اکثر روایات کے مطابق انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے، جن میں سے تین سو تیرہ مرسل اور پانچ اولو العزم ہیں۔ حضرت نوح، حضرت ابراھیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

وَ کَلَّمَ اللّٰہُ مُوۡسٰی تَکۡلِیۡمًا: حضرت موسیٰ (ع) سے بلا واسطہ بات کی اور تَکۡلِیۡمًا تاکید اور تعظیم کے لیے ہے کہ موسیٰ (ع) سے اللہ تعالیٰ کی باتیں معمول سے زیادہ تھیں۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِیۡنَ وَ مُنۡذِرِیۡنَ لِئَلَّا یَکُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌۢ بَعۡدَ الرُّسُلِ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَزِیۡزًا حَکِیۡمًا ﴿۱۶۵﴾

۱۶۵۔ (یہ سب) بشارت دینے والے اور تنبیہ کرنے والے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ ان رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے کسی حجت کی گنجائش نہ رہے اور اللہ بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ رُسُلًا مُّبَشِّرِیۡنَ: اللہ تعالیٰ حجت پوری کرنے سے پہلے کسی کا مواخذہ نہیں کرتا اور ہدایت و رہنمائی فراہم کرنے سے پہلے عذاب نہیں دیتا۔ فرمایا:

وَ مَا کُنَّا مُعَذِّبِیۡنَ حَتّٰی نَبۡعَثَ رَسُوۡلًا ﴿﴾ [۳]　　اور جب تک ہم کسی رسول کو مبعوث نہ کریں عذاب دینے والے نہیں ہیں۔

اگر انسان کی ہدایت انبیاء کے ذریعے نہ ہوئی ہوتی تو عقلاً انسانوں کو یہ حجت پیش کرنے کا حق پہنچتا تھا:

رَبَّنَا لَوۡ لَاۤ اَرۡسَلۡتَ اِلَیۡنَا رَسُوۡلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِکَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّذِلَّ وَ نَخۡزٰی ﴿﴾ [۴]　　ہمارے پروردگار! تو نے ہماری طرف کسی رسول کو کیوں نہیں بھیجا کہ ذلت و رسوائی سے پہلے ہی ہم تیری آیات کی اتباع کر لیتے؟

عقلی کلیہ: یہ ایک عقلی مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی حکم کے بیان کرنے سے پہلے کہ "فلاں امر کا بجا لانا ضروری ہے یا اس امر کے ارتکاب سے پرہیز کرنا چاہیے"، اس کے ترک کرنے پر مؤاخذہ کرنا درست نہیں

---

[۱] ۱۶ النحل ۳۶　[۲] ۳۵ فاطر: ۲۴　[۳] ۱۷ اسراء: ۱۵　[۴] ۲۰ طٰہٰ: ۱۳۴

ہے۔ باپ نے بیٹے کو بتایا نہیں کہ سفر پر جانا ہے تیاری کرو تو تیاری نہ کرنے پر اس کا مؤاخذہ نہیں ہو سکتا۔
اس کلیے سے معلوم ہوا کہ انبیاء کا بھیجنا عقلاً ضروری ہے اور ہدایت بشر کے لیے نبوت کی ضرورت اس عقلی کلیے پر مبنی ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ انسانوں کی ہدایت کے لیے عقل کافی نہیں ہے بلکہ انبیاء کی ضرورت ہے، یہ بھی اسی آیت سے ثابت ہے لیکن اس آیت سے عقل سے بے نیازی ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس آیت سے ایک عقلی کلیے اور مسلمہ حقیقت کی تائید ہوتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ رسولوں کے ذریعے حجت پوری ہونے کے بعد کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔

۲۔ جس تک اللہ کا پیغام نہ پہنچا ہو اور اس میں بندے کی کوتاہی نہ ہو تو اس کا مؤاخذہ نہ ہوگا۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَاۤ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾

۱۶۶۔ لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ اس نے آپ پر نازل کیا ہے وہ اپنے علم سے نازل کیا ہے اور ساتھ فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور گواہی کے لیے تو اللہ ہی کافی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ: اہل کتاب کے معاندانہ مطالبے کا جواب جاری ہے کہ اہل کتاب اپنے عناد وعصبیت کی بنا پر چاہے حضرت محمد (ص) کی نبوت کی شہادت نہ دیں لیکن اللہ اس کی گواہی دیتا ہے اور گواہی کی صورت یہ ہے کہ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ۔ اللہ نے اس وقت کے تاریک معاشرے میں اپنے خزانۂ علم سے ایک ایسے شخص کو مالا مال کیا جس نے کسی انسانی مکتب میں تعلیم حاصل نہیں کی۔ چنانچہ اس نے اللہ کی جانب سے ایک ایسا جامع دستور حیات پیش کیا جس کی مثال پیش کرنے سے قیامت تک کے تمام انسان عاجز ہیں۔ یہ علم، یہ قرآن اور یہ جامع دستور حیات، اللہ کی جانب سے گواہ ہیں کہ محمد (ص) رسول برحق ہیں۔

۲۔ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ: چونکہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل کرنے کے لیے مامور ہوتے ہیں، لہٰذا فرشتے بھی شاہد ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًا

۱۶۷۔ بے شک جنہوں نے کفر اختیار کیا اور (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے روگردان کیا یقیناً وہ

بَعِيْدًا ﴿١٦٧﴾	گمراہی میں دور تک نکل گئے۔
اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ﴿١٦٨﴾	۱۶۸۔ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور ظلم کرتے رہے اللہ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا اور نہ ہی ان کی راہنمائی کرے گا۔
اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿١٦٩﴾	۱۶۹۔ سوائے راہ جہنم کے جس میں وہ ابد تک ہمیشہ رہیں گے اور یہ کام اللہ کے لیے نہایت سہل ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ: یہ لوگ صرف کفر پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ کفر کرنے کے بعد ہدایت کی طرف جانے والوں کے لیے راستہ روکتے ہیں۔ صد کا مضارع یصِدّ بکسر الصاد ہے تو معنی لازم اور رکنے کے معنوں ہوگا اور اگر صدّ کا مضارع یَصُدّ بضم الصاد ہے تو متعدی روکنے کے معنوں میں ہوگا۔ یہاں صدّ، یَصُدُّ روکنے کے معنوں میں ہوگا۔

۲۔ ضَلٰلًا بَعِيْدًا: دور و نزدیک کی مسافت میں ہوتا ہے، مگر یہاں شدید گمراہی کی تعبیر کے لیے بطور استعارہ بعید کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے علم سے مالا مال کر کے ایک ہستی کو انسانی سعادت کے لیے ایک جامع نظام حیات عطا فرمایا تو وہ لوگ جو از روئے عصبیت اس رسولؐ کو نہ مانیں اور کفر اختیار کریں اور اس پر اکتفا نہ کریں بلکہ راہ خدا میں رکاوٹیں کھڑی کریں، ایسے لوگ اللہ کی مغفرت اور اللہ کی رحمت و ہدایت کے اہل نہیں ہیں بلکہ یہ لوگ جہنم کے سزاوار ہیں، جہاں وہ الی الابد رہیں گے۔

۳۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا: کفر اختیار کرنے کے بعد مسلمانوں پر ظلم وستم کرنے والوں کے لیے مغفرت نہیں ہے۔ چونکہ مغفرت کی نوبت اس وقت آ سکتی ہے کہ وہ کفر اور ظلم کو ترک کر کے ایمان و انصاف کی طرف آئیں لیکن یہ لوگ کفر وستم میں مشغول ہیں۔ حالت کفر وظلم میں مغفرت کی نوبت نہیں آتی۔

۴۔ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا: نہ ہی یہ لوگ ہدایت کے قابل ہیں کہ انہیں راہ حق کی ہدایت دی جائے۔ جس راہ کی ہدایت کے لیے اہل ہیں، وہ جہنم کا راستہ ہے۔ اسی راستے پر چلنے دیا جائے گا۔

۵۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا: سوال اٹھایا جاتا ہے کہ ایک مختصر وقت کے جرم کی پاداش ہمیشہ کی ابدی سزا؟

جواب: اول تو اس نے جرم ختم نہیں کیا، خود ختم ہو گیا۔ ثانیاً اس کا جرم مٹ نہیں جاتا۔ جرم کا عمل انرجی کی شکل میں تا ابد رہتا ہے جو اسے تا ابد اذیت دیتا رہے گا۔ انسان کا عمل انرجی کی شکل میں ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ نیکی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی اور برائی اس جان نہیں چھوڑے گی۔ ثالثاً سزا اور جرم میں مدت کو دخل نہیں ہے۔ ناحق قتل پر ایک منٹ لگا ہو گا، سزا عمر قید کی مل جاتی ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے۔

ان الذین کفروا و ظلموا (آل محمد حقھم) لم یکن اللّٰہ لیغفر لھم۔[1]　　جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور آل محمد کے حقوق میں ظلم کیا، اللہ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔

واضح رہے اس روایت میں (آل محمد حقھم) ظلموا کی تفسیر ہے۔ یہ جملہ آیت کا حصہ نہیں ہے۔

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَکُمُ الرَّسُوۡلُ بِالۡحَقِّ مِنۡ رَّبِّکُمۡ فَاٰمِنُوۡا خَیۡرًا لَّکُمۡ ؕ وَ اِنۡ تَکۡفُرُوۡا فَاِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ﴿۱۷۰﴾

۱۷۰۔ اے لوگو! یہ رسول تمہارے رب کی طرف سے حق لے کر تمہارے پاس آئے ہیں پس تمہارے حق میں بہتر ہے کہ تم (ان پر) ایمان لے آؤ اور اگر تم کفر اختیار کرو تو (جان لو کہ) آسمانوں اور زمین کی موجودات کا مالک اللہ ہے اور اللہ بڑا علم رکھنے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ: رسول اللہ (ص) کی حقانیت پر دلیل دینے کے بعد روئے سخن اہل کتاب سے عامۃ الناس کی طرف موڑ دیا اور فرمایا: یہ رسول برحق ہیں، ان پر ایمان لانے میں خود تمہاری بھلائی ہے اور اسی میں تمہاری نجات اور ابدی سعادت ہے۔

۲۔ وَ اِنۡ تَکۡفُرُوۡا: اگر کفر اختیار کرو تو اس میں خود تمہارا نقصان ہے، ورنہ کفر اختیار کر کے تم اللہ کی حکومت سے فرار نہیں کر سکتے۔ تم چاہو یا نہ چاہو اللہ کی ملکیت میں ہو۔ تم نے اپنے اختیار و ارادے سے اللہ کی اطاعت نہ کی تو اس کی سلطنت سے تم خارج نہیں ہو سکتے ہو۔

یٰۤاَہۡلَ الۡکِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِیۡ دِیۡنِکُمۡ وَ لَا تَقُوۡلُوۡا عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الۡحَقَّ ؕ

۱۷۱۔ اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو سے کام نہ لو اور اللہ کے بارے میں حق بات کے سوا

---

[1] الکافی ۱: ۴۲۴

اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۡ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾	کچھ نہ کہو، بے شک مسیح عیسیٰ بن مریم تو اللہ کے رسول اور اس کا کلمہ ہیں جو اللہ نے مریم تک پہنچا دیا اور اس کی طرف سے وہ ایک روح ہیں، لہٰذا اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آؤ اور یہ نہ کہو کہ تین ہیں، اس سے باز آ جاؤ، اس میں تمہاری بہتری ہے، یقیناً اللہ تو بس ایک ہی معبود ہے، اس کی ذات اس سے پاک ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو، آسمانوں اور زمین میں موجود ساری چیزیں اسی کی ہیں اور کارسازی کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔

تشریح کلمات

تَغْلُوْا: (غ ل و) کسی کی قدر و منزلت میں حد سے گزر جانے کو غلو کہتے ہیں۔

الْمَسِيْحُ: اس کلمہ کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ آل عمران آیت ۴۵۔

الکلمۃ: لفظ کلمہ کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ آل عمران آیت ۳۸۔

رُوْحٌ: روح اس حقیقت کا نام ہے، جس کے ذریعے حیات اور زندگی وجود میں آتی ہے۔ اسی سے ہر حیات بخش کو روح کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کو بھی روح کہا گیا ہے:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ...[۱] اور اسی طرح ہم نے اپنے امر میں سے ایک روح آپ کی طرف وحی کی ہے....

شاید جبرئیل کو روح اس لیے کہا گیا ہو کہ وہ یہ حیات بخش پیغام لے کر آتے ہیں۔

تفسیر آیات

سابقہ گفتگو مطلق اہل کتاب کے ساتھ تھی۔ اب روئے سخن ان میں سے خاص کر مسیحیوں کی طرف ہے یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ سابقہ گفتگو یہود کے ساتھ تھی، اب روئے سخن نصاریٰ کی طرف ہے اور ایک اہمیت کی حامل حقیقت کی نشاندہی ہو رہی ہے اور وہ امور درج ذیل ہیں:

i۔ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ: اپنے دین میں حد سے تجاوز نہ کرو۔

---

[۱] ۴۲ شوریٰ: ۵۲

ii۔ اللہ کے بارے میں صرف حق بات کرو۔

iii۔ اور یہ نہ کہو اللہ تین ہیں۔

ا۔ مسیحیوں نے اپنے رسول کو فرزند خدا کا درجہ دے دیا اور حد سے تجاوز کیا۔ اس مشرکانہ عقیدے کو باطل ثابت کرنے کے لیے امر واقع اور حقیقت کا بیان ہو رہا ہے۔ فرمایا: مسیح بن مریم تو بس اللہ کے رسول اور اس کا کلمۃ ہیں۔

کلمۃ: اس لفظ کی تشریح پہلے بھی ہو چکی ہے کہ حضرت مسیح (ع) کو کلمہ اس لیے کہا گیا کہ انہیں باپ کے بغیر کلمۃ، کُن سے پیدا کیا گیا ہے اور جب بھی اللہ تعالیٰ ظاہری علل و اسباب سے ہٹ کر ایک تخلیقی عمل انجام دیتا ہے تو اس کے لیے کلمۃ کو علت و سبب کے طور پر پیش فرماتا ہے۔ چنانچہ حضرت یحییٰ (ع) کی پیدائش ایک بوڑھے باپ اور ایک بانجھ عورت کے ذریعے ہو رہی تھی، اس لیے انہیں بھی کلمۃ کہا:

اَنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکَ بِیَحۡیٰی مُصَدِّقًۢا بِکَلِمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ ...[1] — اللہ تجھے یحییٰ کی بشارت دیتا ہے جو کلمہ اللہ کی طرف سے ہے۔

لہٰذا کلمۃ وہ فرمان اور کلمۃ کُن ہے جو رحم مریم پر نازل ہوا تا کہ نطفۂ پدری کے بغیر بہ حکم خدا بچے کی تخلیق کے لیے آمادہ ہو جائے۔

بعد میں یونانی فلسفے سے متاثر ہو کر مسیحیوں نے اس کلمۃ کو اللہ سے صادر ہونے والی ذاتی صفت قرار دیا، جس نے بطن مریم میں داخل ہو کر جسم کی صورت اختیار کر لی اور عیسیٰ (ع) کی شکل میں دنیا میں آیا۔ چنانچہ کلام اللہ کے بارے مسلمانوں میں فرقہ اشعری کے کلام نفسی کا نظریہ ہے، جس کے مطابق کلام اللہ قدیم اور غیر مخلوق ہے۔ امامیہ اور معتزلہ کے نزدیک کلام اللہ مخلوق اور حادث ہے۔

وَ رُوۡحٌ مِّنۡہُ: مسیح (ع) اللہ کی طرف سے ایک روح ہیں۔ اس سے مسیحیوں نے یہ مطلب نکالا کہ حضرت مسیح (ع) میں خود اللہ کی روح نے حلول کیا۔ اس طرح انہوں نے روح من اللّٰہ کو روح اللہ سے تعبیر کیا اور اسے خود اللہ کی ذات اور اس کی روح قرار دیا۔ جب کہ یہ ایک عام فہم سی بات ہے کہ جس چیز کو اللہ شرف دینا چاہتا ہے، اسے اپنی طرف منسوب فرماتا ہے۔ جس گھر کو شرف بخشنا چاہا اسے بیت اللہ کہدیا اور جس ناقہ کو معجزہ بنایا اسے ناقۃ اللّٰہ کہدیا۔ اس سے بیت اور ناقہ، اللہ کا حصہ نہیں ہو سکتے نیز فرمایا:

وَمَا بِکُمۡ مِّنۡ نِّعۡمَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ ...[2] — اور تمہیں جو بھی نعمت حاصل ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔

حضرت آدم (ع) کے لیے تو اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ روح خدا کہا گیا:

فَاِذَا سَوَّیۡتُہٗ وَ نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَہٗ سٰجِدِیۡنَ ۝[3] — پس جب میں اسے درست بنا لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے لیے سجدے میں گر پڑنا۔

---

[1] ۳ آل عمران: ۳۹ [2] ۱۶ النحل: ۵۳ [3] ۳۸ ص: ۷۲

ظاہر ہے کہ حضرت ابوالبشر (ع) اور ہر بشر میں جو روح ہے، وہ اللہ ہی کی جانب سے ہے۔

وَلَا تَقُوۡلُوۡا ثَلٰثَۃٌ: ”اور یہ نہ کہو کہ تین ہیں۔“ مسیحی ایک طرف اناجیل کی صریح تعلیمات کی بنا پر خدائے واحد کو مانتے اور کہتے ہیں: خدا ایک ہے، دوسری طرف وہ مسیح (ع) اور روح القدس کو بھی خدا مانتے ہیں۔ اس طرح وہ تین خداؤں کے قائل ہو گئے۔ ایک باپ خود خدا، دوسرا کلمۂ خدا جو مسیح کی شکل کی اختیار کر گیا اور تیسرا اللہ کی وہ روح جو مسیح میں حلول کر گئی۔ اس طرح وہ توحید کے ساتھ تثلیث اور تثلیث کے ساتھ توحید کو عقیدہ بنا کر لاینحل تضادات میں مبتلا ہو گئے کہ خدا تین بھی مانے جائیں اور ایک بھی اور اس کی تشریح میں ان میں اختلافات اور فرقہ بندیوں کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔

باقی ادیان سماویہ کی طرح دین مسیحی بھی درحقیقت نظریہ توحید پر مبنی تھا۔ چنانچہ تمام اناجیل میں اس پر بے شمار شواہد موجود ہیں۔ بعد میں یونان کے فلسفے سے متاثر ہو کر تثلیث اور توحید میں باہم توافق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ کیونکہ یونانی اپنے خدا کو اقانیم ثلاثۃ کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اللہ، کلمہ اور روح۔ چنانچہ ناروے، ڈنمارک وغیرہ میں یہ عقیدہ عام تھا کہ یہ اقانیم ثلاثۃ خدائے واحد سے عبارت ہیں۔ جب یورپ میں دین مسیحی کا تعارف ہوا تو انہوں نے حضرت مسیحؑ کو ان اقانیم میں شامل کر لیا۔ اس طرح انہوں نے مسیحیت کو اپنی بت پرستی کا لبادہ پہنایا اور اس دین کو مسخ کر دیا۔

تثلیث در توحید کا نظریہ ہموار کرنے کی کوشش کی گئی کہ اللہ جوہر ہونے کے اعتبار سے ایک ہے لیکن اقانیم ہونے کے اعتبار سے تین ہے۔ وہ وجود، حیات اور علم کو اقانیم کہتے ہیں۔ اس کا واحد اقنوم ہے جو ”شخص“ اور ”اصل“ کو کہتے ہیں۔ چنانچہ وہ وجود کو باپ، علم کو بیٹا اور حیات کو روح القدس کہتے ہیں۔ یہاں تک تمام مسیحی مذاہب میں کوئی اختلاف نہیں لیکن آگے چل کر وہ اس بات میں اختلاف کرتے ہیں کہ خود جوہر اور اقانیم میں تعلق کی کیا نوعیت ہے۔ ایک مذہب کا یہ نظریہ بن گیا کہ اقنوم ثانی یعنی علم حضرت مسیحؑ کے جسم میں حلول کر گیا اور مسیحؑ سمیت تینوں اقانیم قدیم ہیں۔ ان میں سے ہر ایک خدا ہے۔ دوسرے مذہب نے یہ نظریہ قائم کیا کہ حضرت مسیحؑ بحیثیت لاہوتی خدا کا بیٹا اور خدائے کامل ہے اور ناسوتی حیثیت سے انسان ہے، اس لیے وہ قدیم بھی ہے اور حادث بھی۔ اس طرح ان میں فرقہ بندیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، جس کی بنیاد پر ایک دوسرے کی تکفیر کی گئی اور بہت سے انسانوں کا خون بہایا گیا۔

مسیحی دین بہ یک وقت تین اور ایک کا اور قدیم و حادث کا امتزاج ہے، جو نہایت نامعقول اور ناقابل فہم نظریہ ہے، جس کی توضیح و توجیہ عقل انسانی کے دائرۂ فہم میں نہ ہونے کی وجہ سے آج تک یہ نظریہ تضادات کا ایک مجموعہ اور معمہ بنا ہوا ہے۔

مثلاً مسیحیوں کا یہ نظریہ کہ حضرت عیسیٰ (ع) نے دوسرے تمام لوگوں کے گناہوں کے کفارے میں اپنی جان دے دی۔ اس نظریے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ (ع) خود خدا نہیں ہیں۔ پھر یہ کہنا تضادگوئی

ہے کہ قربانی دینے والا خود بھی خدا ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان راہ راست سے منحرف ہونے کے بعد محبت کی وجہ سے بھی گمراہ ہو جاتا ہے۔ لَا تَغۡلُوۡا۔

۲۔ راہ راست توحید کی پاسداری ہے: اِنَّمَا اللّٰہُ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ....۔

لَنۡ یَّسۡتَنۡکِفَ الۡمَسِیۡحُ اَنۡ یَّکُوۡنَ عَبۡدًا لِّلّٰہِ وَ لَا الۡمَلٰٓئِکَۃُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ ؕ وَ مَنۡ یَّسۡتَنۡکِفۡ عَنۡ عِبَادَتِہٖ وَ یَسۡتَکۡبِرۡ فَسَیَحۡشُرُہُمۡ اِلَیۡہِ جَمِیۡعًا ﴿۱۷۲﴾

۱۷۲۔ مسیح نے کبھی بھی اللہ کی بندگی کو عار نہیں سمجھا اور نہ ہی مقرب فرشتے (اسے عار سمجھتے ہیں) اور جو اللہ کی بندگی کو عار سمجھتا ہے اور تکبر کرتا ہے اللہ ان سب کو (ایک دن) اپنے سامنے جمع کرے گا۔

تفسیر آیات

مسیحی تعلیمات اور اناجیل کی آیات سے یہ بات واضح ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ خود خدا نہیں ہیں اور نہ خدا کا حصہ ہیں، کیونکہ خدا یا خدا کا کوئی حصہ خود اپنی عبادت نہیں کر سکتا۔

مشرکین کا یہ خیال تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں، اس لیے ضمناً یہاں اس مشرکانہ نظریے کی رد کے طور پر فرشتوں کی عبادت کا بھی ذکر کیا گیا۔

اہم نکات

۱۔ جس طرح شرک اللہ کی بندگی سے خارج ہونے کا سبب ہے، عبادت ترک کرنا بھی اللہ کی بندگی سے خارج ہونے کا سبب ہے۔

فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیۡہِمۡ اُجُوۡرَہُمۡ وَ یَزِیۡدُہُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ ۚ وَ اَمَّا

۱۷۳۔ پھر ایمان لانے والوں اور نیک اعمال بجا لانے والوں کو اللہ ان کا پورا اجر دے گا اور انہیں اپنے فضل سے مزید عطا کرے گا اور

الَّذِیۡنَ اسۡتَنۡکَفُوۡا وَ اسۡتَکۡبَرُوۡا فَیُعَذِّبُہُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ۬ۙ وَّ لَا یَجِدُوۡنَ لَہُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیۡرًا ﴿۱۷۳﴾

جنہوں نے (عبادت کو) عار سمجھا اور تکبر کیا انہیں اللہ دردناک عذاب دے گا اور وہ اپنے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی سرپرست اور نہ کوئی مددگار پائیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: ایمان کے ساتھ عمل صالح بجا لانے والوں کو ان کا اجر پورا پورا دیا جائے گا۔ جس اجر کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔ یعنی ایک نیکی کا دس گنا، ستر گنا اور بعض نیکیوں کا سات سو گنا، پھر بعض اشخاص کے لیے اس سات سو گنا کو کئی گنا (اضعاف) زیادہ دینے کا وعدہ ہے۔

۲۔ وَ یَزِیۡدُہُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ: اس کے ساتھ یہ نوید بھی سنائی کہ اللہ اپنے فضل سے ان کو مزید اجر و ثواب عنایت فرمائے گا۔ مزید کس قدر اجر عطا فرمائے گا؟ اس کی کوئی حد بیان نہیں فرمائی۔ اس تفصیل کا ذکر سورہائے نور آیت ۳۸، فاطر آیت ۳۰، شوری ۲۶ میں آیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ مؤمن اپنے اعمال سے نہیں، فضل الٰہی سے زیادہ امید رکھتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنْ عَامَلْتَنَا بِعَدْلِکَ لَمْ تَبْقَ لَنَا حَسَنَۃ وَ اِنْ اَنَلْتَنَا فَضْلَکَ لَمْ یَبْقَ لَنَا سَیِّئَۃٌ۔[۱]

اگر تو نے ہمارے ساتھ اپنے عدل سے برتاؤ کیا تو ہماری کوئی نیکی باقی نہیں رہے گی اور اگر تو نے اپنے فضل سے برتاؤ کیا تو ہمارا کوئی گناہ باقی نہیں رہے گا۔

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَکُمۡ بُرۡہَانٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ نُوۡرًا مُّبِیۡنًا ﴿۱۷۴﴾

۱۷۴۔ اے لوگو تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس واضح دلیل آ گئی ہے اور ہم نے تمہاری طرف روشن نور نازل کیا ہے۔

تشریح کلمات

بُرۡہَانٌ: (ب ر ہ) دلیل و حجت میں سے اس دلیل کو برھان کہتے ہیں جو نا قابل تردید ہو۔

---

[۱] شرح نہج البلاغۃ ابن ابی الحدید ۲۰ : ۳۱۹

تفسیر آیات

۱۔ یَاَیُّهَاالنَّاسُ: یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے لیے رسالتمآب (ص) کی رسالت کی حقانیت پر روشنی ڈالنے کے بعد پوری انسانیت سے خطاب فرمایا:

۲۔ قَدۡ جَآءَکُمۡ بُرۡهَانٌ: تمہاری طرف اللہ کی جانب سے ایک ناقابل تردید دلیل آ گئی ہے۔ برھان سے مراد رسول کریم (ص) کی ذات گرامی ہی ہوسکتی ہے۔ کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ایسے معاشرے میں آنکھ کھولی جو علم وتمدن سے بالکل بے بہرہ تھا۔ اس زمانے میں یونان، مصر، عراق، ایران اور ہندوستان میں علمی مراکز موجود تھے اور تمدن بھی تھا لیکن حجاز تو تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس معاشرے میں ایک شخص، ایک ایسا انسان ساز دستور حیات لے کر آتا ہے، جس کی مثال پیش کرنے سے تمام انسان قاصر ہیں۔ یہ ذات خود اپنی جگہ ایک برھان ہے۔

۳۔ نُوۡرًا مُّبِیۡنًا: اور نور مبین سے مراد قرآن مجید ہے۔ جس نے انسانیت کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر علم وتمدن کی روشن دنیا سے متعارف کرایا اور ساتھ روحانی امن وسکون کے عوامل سے روشناس کرایا۔

فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَ اعۡتَصَمُوۡا بِهٖ فَسَیُدۡخِلُهُمۡ فِیۡ رَحۡمَةٍ مِّنۡهُ وَ فَضۡلٍ ۙ وَّ یَهۡدِیۡهِمۡ اِلَیۡهِ صِرَاطًا مُّسۡتَقِیۡمًا ﴿۱۷۵﴾

۱۷۵۔ لہٰذا جو اللہ پر ایمان لے آئیں اور اس سے متمسک رہیں تو وہ جلد ہی انہیں اپنی رحمت اور فضل میں داخل کرے گا اور انہیں اپنی طرف آنے کا سیدھا راستہ دکھائے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَ اعۡتَصَمُوۡا بِهٖ: ایمان کے ذکر کے بعد ہمیشہ عمل صالح کا ذکر آتا ہے لیکن یہاں ایمان کے بعد اعتصام بالنور یعنی قرآن کے ساتھ تمسک کا ذکر فرمایا۔ چونکہ عمل کو صالح بنانے کے لیے تمسک بالقرآن ضروری ہے۔

اس آیت میں تمسک بالقران کرنے والوں کے لیے تین اہم چیزوں کا ذکر ہے، جو درج ذیل ہیں:

i۔ فَسَیُدۡخِلُهُمۡ فِیۡ رَحۡمَةٍ مِّنۡهُ: اللہ انہیں اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا۔

ii۔ وَ فَضۡلٍ: مزید فضل و کرم سے نوازے گا اور

iii۔ وَّ یَهۡدِیۡهِمۡ: سیدھی راہ کی طرف ہدایت فرمائے گا تاکہ دنیاوآخرت دونوں میں عزت وکرامت

کے ساتھ زندگی گزاریں۔

یَسۡتَفۡتُوۡنَکَ ؕ قُلِ اللّٰہُ یُفۡتِیۡکُمۡ فِی الۡکَلٰلَۃِ ؕ اِنِ امۡرُؤٌا ہَلَکَ لَیۡسَ لَہٗ وَلَدٌ وَّ لَہٗۤ اُخۡتٌ فَلَہَا نِصۡفُ مَا تَرَکَ ۚ وَ ہُوَ یَرِثُہَاۤ اِنۡ لَّمۡ یَکُنۡ لَّہَا وَلَدٌ ؕ فَاِنۡ کَانَتَا اثۡنَتَیۡنِ فَلَہُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَکَ ؕ وَ اِنۡ کَانُوۡۤا اِخۡوَۃً رِّجَالًا وَّ نِسَآءً فَلِلذَّکَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَیَیۡنِ ؕ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمۡ اَنۡ تَضِلُّوۡا ؕ وَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۱۷۶﴾

۱۷۶۔لوگ آپ سے (کلالہ کے بارے میں) دریافت کرتے ہیں، ان سے کہد یجیے : اللہ کلالہ کے بارے میں تمہیں یہ حکم دیتا ہے: اگر کوئی مرد مر جائے اور اس کی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن ہو تو اسے (بھائی کے) ترکے سے نصف حصہ ملے گا اور اگر بہن (مر جائے اور اس) کی کوئی اولاد نہ ہو تو بھائی کو بہن کا پورا ترکہ ملے گا اور اگر بہنیں دو ہوں تو دونوں کو (بھائی کے) ترکے سے دو تہائی ملے گا اور اگر بھائی بہن دونوں ہیں تو مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصے کے برابر ہوگا، اللہ تمہارے لیے (احکام) بیان فرماتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ اور اللہ ہر چیز کا پورا علم رکھتا ہے۔

شان نزول

یہ آیت حضرت جابر بن عبد اللہ انصاریؓ کے اس سوال پر نازل ہوئی کہ میرے بعد میری وارث صرف میری بہنیں ہیں، انہیں وراثت کس طرح ملے گی؟

محل کلام: اس آیت میں ان بہنوں کی میراث کا ذکر ہے جو باپ کی طرف سے ہوں یا ماں باپ دونوں کی طرف سے ہوں اور جو بہنیں صرف ماں کی طرف سے ہوں، ان کی میراث کا ذکر سورے کی ابتدا میں آ گیا۔

یہاں بہنوں اور بھائیوں کی میراث کے بارے میں چند ایک مسائل مذکور ہیں:

i۔ کوئی آدمی مر جائے اور اس کی اولاد نہ ہو لیکن اس کی ایک بہن ہو جو باپ کی طرف سے یا ماں باپ دونوں کی طرف سے ہو تو اس بہن کو بھائی کے ترکے کا نصف حصہ فرضاً ملے گا۔ باقی حصہ فقہ جعفری کے مطابق اسی بہن کو رداً ملے گا۔ بعض اہل سنت کے مطابق باقی حصہ عصبہ کو ملے

گا۔ واضح رہے کہ چچا اور اس کی اولاد اور بھائی کی اولاد کو عصبہ کہتے ہیں اور بعض اہل سنت کے نزدیک باقی بیت المال میں جمع کیا جائے گا۔

لَیۡسَ لَہٗ وَلَدٌ: جو جنا گیا ہے لغت میں اسے وَلد کہتے ہیں۔ لہٰذا یہ لفظ بیٹوں اور بیٹیوں دونوں کے لیے بولا جاتا ہے اور قرآن مجید میں متعدد مقامات پر وَلد کا لفظ بیٹوں اور بیٹیوں دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً فرمایا:

یُوۡصِیۡکُمُ اللّٰہُ فِیۡۤ اَوۡلَادِکُمۡ [1] اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تمہیں ہدایت فرماتا ہے.

بعد میں اولاد کی تشریح فرمائی:

لِلذَّکَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَیَیۡنِ [2] ایک لڑکے کا حصہ دولڑکیوں کے برابر ہے۔

اس جملے میں ذکر اور انثی اولاد کی تفصیل میں ہیں۔

ii۔ کوئی عورت مر جائے اور اس کی کوئی اولاد نہ ہو لیکن اس کا بھائی ہو تو بھائی کو پورا ترکہ ملے گا، بشرطیکہ یہ بھائی ماں باپ دونوں کی طرف سے ہو یا صرف باپ کی طرف سے ہو۔ اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

iii۔ بھائی مر جائے اور دو بہنیں ہوں تو دونوں بہنوں کو بھائی کے ترکے میں سے دو تہائی (۲/۳) حصہ ملے گا۔ باقی فقہ جعفری کے مطابق انہی دو بہنوں کو رداً ملے گا۔ بعض اہل سنت کے نزدیک عصبہ کو، بعض کے نزدیک بیت المال کو اور بعض کے نزدیک رشتہ داروں کو ملے گا۔ یعنی انہی بہنوں کو ملے گا۔

iv۔ اگر مرنے والے کے بھائی بہن دونوں موجود ہوں تو بھائی کو دو حصے اور بہن کو ایک حصہ ملے گا۔

اس مسئلے کی بہت سی دیگر فروعات فقہی کتابوں میں مذکور ہیں۔

تعصیب یعنی قریب کی موجودگی میں بعید کو وارث بنانے کی جو روایت اہل سنت کے ہاں مروی ہے، خلاف ظاہر قرآن اور خبر واحد ہے، اس لیے ناقابل عمل ہے۔ ہم اس سورے کی ابتدا میں اس نظریے کے بطلان پر بحث کر چکے ہیں۔

---

[1] و [2] ۴ نساء: ۱۱

سُورَةُ المَائدَة

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یہ سورہ رسول کریمؐ کی حیات مبارکہ کے آخری دنوں میں نازل ہوا۔ روایت کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال سے دو یا تین ماہ قبل یہ سورہ نازل ہوا۔[1] اسی لیے اس سورہ میں ناسخ آیات ہیں اور کوئی منسوخ آیت نہیں ہے۔ یہ سورہ اس وقت نازل ہوا، جب رسول کریمؐ ایک اسلامی حکومت کی تاسیس، ایک امت کی تربیت، ایک معاشرے کا قیام اور ایک دستور حیات پیش کر چکے تھے۔ انسانیت کو عہد طفولیت سے نکال کر رشد عقلی کے ارتقائی مرحلے میں داخل کر چکے تھے۔

مضامین: اس نوخیز حکومت اور جدید التاسیس معاشرے کے لیے اس سورہ میں ضروری ہدایات اور آئینی نظام دیا گیا ہے اور داخلی نظام دینے کے ساتھ ساتھ بیرونی خطرات سے بھی آگاہ کیا ہے:

☆ تمام معاہدوں کی پاسداری کرنا اسلامی نظام حکومت کے فرائض میں ہے: یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ ...۔ (۵:۱)

☆ مختلف اقوام وامم کے ساتھ تعلقات کی نوعیت: وَ اَنِ احۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ ۔ (۵:۴۹)

☆ عدل وانصاف کوانسانی حقوق کےطور پر نافذ کرنے کی ضرورت کہ یہ عدل و انصاف مسلمانوں کے بدترین دشمن یہودیوں کو بھی ملنا چاہیے: اِعۡدِلُوۡا ۟ ہُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی ....۔ وَ اِنۡ حَکَمۡتَ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِالۡقِسۡطِ ....۔ (۵: ۸ و۴۲)

☆ اسلامی حکومت کی قیادت، ولایت کا تعارف کہ کن اوصاف کے مالک اس منصب پر فائز ہو سکتے ہیں: اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗ ....۔ (۵: ۵۵)

☆ نفاذ احکام کی ضمانت کے طور پر قیادت کی اطاعت کی ضرورت: وَ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَ احۡذَرُوۡا ....۔ (۵:۹۲)

☆ امن عامہ کو تباہ کرنے والوں کی سزا: اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیۡنَ یُحَارِبُوۡنَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ یَسۡعَوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَسَادًا اَنۡ یُّقَتَّلُوۡۤا ....۔ (۵:۳۳)

---

[1] التہذیب ۱: ۳۶۱

☆ **بعض تعزیرات اور قصاص کے قوانین:** وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَۃُ فَاقۡطَعُوۡۤا اَیۡدِیَہُمَا ... ۔ (۵: ۳۸)

☆ **آسمانی نظام حکومت کی برکات:** وَلَوۡ اَنَّہُمۡ اَقَامُوا التَّوۡرٰىۃَ وَالۡاِنۡجِیۡلَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِمۡ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ لَاَکَلُوۡا مِنۡ ... ۔ (۵: ۶۶)

☆ **یہود و نصاریٰ میں موازنہ کہ ان میں کون بدتر دشمن ہے:** لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَۃً لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوا الۡیَہُوۡدَ ... ۔ (۵: ۸۲)

☆ **فرد یا کسی جماعت کے مرتد ہونے سے اب امت مسلمہ کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا:** یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَنۡ یَّرۡتَدَّ مِنۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِہٖ فَسَوۡفَ یَاۡتِی اللّٰہُ بِقَوۡمٍ یُّحِبُّہُمۡ وَ یُحِبُّوۡنَہٗۤ ... ۔ (۵: ۵۴)

☆ **اسلامی حکومت کو لاحق خطرات سے آگاہی۔**

☆ **بنی اسرائیل کے ایسے سبق آموز اور عبرت ناک واقعات کا بیان جن میں ان کی داخلی بدنظمی اور قیادت کی نافرمانی کی وجہ سے وادی سینا میں چالیس سال تک ذلت آمیز زندگی:** فَاذۡہَبۡ اَنۡتَ وَ رَبُّکَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا ہٰہُنَا قٰعِدُوۡنَ ۔ (۵: ۲۴)

☆ **انسانی تاریخ کا پہلا خونین واقعہ۔** لَاَقۡتُلَنَّکَ ... ۔ (۵: ۲۷)

☆ **سفر حج کے لیے ضروری ہدایات:** وَلَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ اَنۡ صَدُّوۡکُمۡ عَنِ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اَنۡ تَعۡتَدُوۡا ... ۔ (۵: ۲)

☆ **کھانے پینے کی چیزوں کے احکام:** حُرِّمَتۡ عَلَیۡکُمُ الۡمَیۡتَۃُ وَالدَّمُ وَلَحۡمُ الۡخِنۡزِیۡرِ ... اَلۡیَوۡمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ ... ۔ (۵: ۳ و ۵)

☆ **وضو، غسل اور تیمم کے احکام:** اِذَا قُمۡتُمۡ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغۡسِلُوۡا وُجُوۡہَکُمۡ ... ۔ (۵: ۶)

☆ **شراب اور جوئے کی حرمت: کا اعلان:** یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡخَمۡرُ وَالۡمَیۡسِرُ وَالۡاَنۡصَابُ وَالۡاَزۡلَامُ رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّیۡطٰنِ ... ۔ (۵: ۹۰)

☆ **مسیحیوں کے انحراف اور غلو کی دیگر پرزور الفاظ میں سرزنش:** لَقَدۡ کَفَرَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡمَسِیۡحُ ابۡنُ مَرۡیَمَ ... ۔ (۵: ۷۲)

☆ **احرام حج میں شکار سے بچنے کے احکام:** لَا تَقۡتُلُوا الصَّیۡدَ وَاَنۡتُمۡ حُرُمٌ ... ۔ (۵: ۹۵)

☆ **کعبہ کی اہمیت:** جَعَلَ اللّٰہُ الۡکَعۡبَۃَ الۡبَیۡتَ الۡحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ ... ۔ (۵: ۹۷)

☆ **بعض جاہلیت کی رسوم کی نفی:** مَا جَعَلَ اللّٰہُ مِنۡۢ بَحِیۡرَۃٍ وَّلَا سَآئِبَۃٍ وَّلَا وَصِیۡلَۃٍ وَّلَا حَامٍ (۵: ۱۰۳)

☆ **قانون شہادت کی مزید وضاحت:** یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا شَہَادَۃُ بَیۡنِکُمۡ اِذَا حَضَرَ ... ۔ (۵: ۱۰۶)

☆ **قسم کا کفارہ:** وَلٰکِنۡ یُّؤَاخِذُکُمۡ بِمَا عَقَّدۡتُّمُ الۡاَیۡمَانَ ۚ فَکَفَّارَتُہٗۤ اِطۡعَامُ عَشَرَۃِ مَسٰکِیۡنَ (۵: ۸۹)

☆ شعائر اللہ کی بے حرمتی سے اجتناب: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُحِلُّوۡا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهۡرَ ....(۵:۲)

☆ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعض درس آموز معجزات ونزول مائدہ: تُكَلِّمُ النَّاسَ فِی الۡمَهۡدِ وَ كَهۡلًا .. (۵:۱۱۰)

☆ اسلامی تحریک کو ناکام بنانے میں کفار کی ناکامی اور ان کی مایوسی: اَلۡیَوۡمَ یَئِسَ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ دِیۡنِكُمۡ ...(۵:۳)

☆ تکمیل دین و اتمام نعمت اور رضائے رب کی نوید: اَلۡیَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِیۡنَكُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡكُمۡ نِعۡمَتِیۡ ....(۵:۳)

اب یہ دین مکمل ہے۔ نہ اس میں تبدیلی ہوسکتی ہے نہ اضافہ نہ ترمیم، یہ ایک کامل نظام حیات ہے۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	بنام خدائے رحمٰن رحیم
یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ ۬ؕ اُحِلَّتۡ لَکُمۡ بَہِیۡمَۃُ الۡاَنۡعَامِ اِلَّا مَا یُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ غَیۡرَ مُحِلِّی الصَّیۡدِ وَ اَنۡتُمۡ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَحۡکُمُ مَا یُرِیۡدُ ①	۱۔اے ایمان والو! عہد و پیمان پورا کیا کرو، تمہارے لیے چرنے والے مویشی حلال کیے گئے ہیں سوائے ان کے جو (آیندہ) تمہیں بتا دیے جائیں گے مگر حالت احرام میں شکار کو حلال تصور نہ کرو، بیشک اللہ جیسا چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔

تشریح کلمات

الۡعُقُوۡدِ : عقد: (ع ق د) کے معنی گرہ باندھنے کے ہیں۔

بَہِیۡمَۃُ : چوپایہ کو کہتے ہیں۔

الۡاَنۡعَامِ: (ن ع م) مویشی۔

تفسیر آیات

۱۔ اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ: یہاں عہد و پیمان کے عموم الۡعُقُوۡد میں ہر قسم کے عہد و پیمان شامل ہیں، جو عقود (جمع) پر الف لام داخل ہونے کی وجہ سے ہر انسان اور ہر قوم کو اپنی اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی پیش آتے ہیں۔ اگر کسی معاشرے میں عہد و پیمان کی پابندی ضروری نہ ہو، وہاں عدل و انصاف ملنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ انسان کے مدنی الطبع ہونے کی وجہ سے انفرادی زندگی گزارنا اس کے لیے ناممکن ہے اور اجتماعی زندگی انہی معاہدوں سے عبارت ہے کہ انسان دوسروں کے ساتھ خرید و فروخت، مناکحہ اور مصالحت وغیرہ کے لیے عہد و پیمان باندھتے ہیں۔ اس قسم کے تمام معاہدے قرآن کی رو سے واجب الوفا ہیں: وَ اَوۡفُوۡا بِالۡعَہۡدِ ۚ اِنَّ الۡعَہۡدَ کَانَ مَسۡـُٔوۡلًا ۔[۱] خواہ وہ عہد فرد کا فرد کے ساتھ ہو یا ایک قوم کا کسی قوم کے ساتھ۔ حتیٰ اگر مسلمان کافروں کے

---

[۱] ۱۷ بنی اسرائیل: ۳۴

ساتھ بھی کوئی معاہدہ کرتے ہیں تو اس کو پورا کرنا ضروری ہے:

فَاَتِمُّوۡۤا اِلَیۡہِمۡ عَہۡدَہُمۡ اِلٰی مُدَّتِہِمۡ ... [1] ان (مشرکین) کا معاہدہ ان کی مقررہ مدت تک پورا کرو.

لہٰذا اس آیت کے حکم میں وہ تمام عہد و پیمان شامل ہیں جو کسی کمپنی یا حکومت کی ملازمت کے لیے کیے جاتے ہیں۔ ملازم پر ڈیوٹی پوری دینا فرض ہے اور کمپنی یا حکومت پر پوری تنخواہ دینا فرض بنتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے:

i۔ وفا بعہد ایک انسانی مسئلہ ہے جس میں تمام انسان یکساں ہیں، خواہ وہ مسلم ہوں یا کافر۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

ثَلَاثٌ لَمْ یَجْعَلِ اللّٰہُ عَزَّ وَ جَلَّ لِاَحَدٍ فِیھِنَّ رُخْصَۃً اَدَاءُ الْاَمَانَۃِ اِلَی الْبَرِّ وَ الْفَاجِرِ وَ الْوَفَاءُ بِالْعَھْدِ لِلْبَرِّ وَ الْفَاجِرِ وَ بِرُّ الْوَالِدَیْنِ بَرَّیْنِ کَانَا اَوْ فَاجِرَیْنِ۔ [2]

تین چیزوں میں اللہ عز و جل نے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی: امانت کی ادائیگی میں، خواہ وہ نیک آدمی کی ہو یا برے کی۔ عہد پورا کرنے میں، خواہ نیک آدمی سے ہو یا برے سے۔ والدین کے ساتھ نیکی میں، خواہ وہ دونوں نیک ہوں یا برے۔

ii۔ معاہدے کی پابندی اس وقت لازم ہے جب دوسرا فریق اس کی پابندی کرے۔ اگر دوسرا فریق اس معاہدے کو توڑ دیتا ہے تو اس صورت میں اس معاہدے کی پابندی لازم نہیں ہے۔

چنانچہ عہد و پیمان کی پاسداری کرنا عدل و انصاف کے لیے ایک بنیاد ہے۔ اس میں سر فہرست وہ عہد و پیمان ہے جو بندہ مسلم نے اللہ کے ساتھ باندھا ہے۔

۲۔ اُحِلَّتۡ لَکُمۡ : چنانچہ اس مختصر اور جامع تمہید کے فوراً بعد فرمایا: تمہارے لیے تمام مویشی حلال کیے گئے ہیں۔ البتہ مویشوں میں سے جو حلال نہیں ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں:

i۔ وہ مویشی جن کی حرمت کا ذکر بعد آئے گا: اِلَّا مَا یُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ۔ چنانچہ اسی سورت کی آیت ۳ میں ان کی حرمت کا ذکر آ گیا: حُرِّمَتۡ عَلَیۡکُمُ الۡمَیۡتَۃُ ...

۲۔ حالت احرام میں حلال جانور کا شکار کرنا بھی حرام ہے۔

اہم نکات

۱۔ معاہدوں کی پابندی اسلام کے نزدیک ایک خالصتاً انسانی مسئلہ ہے۔

۲۔ معاہدوں کی پابندی ہم زیستی کے لیے بنیادی بات ہے۔

۳۔ معاہدوں کی پابندی دیانتداری ہے:

لا دین لمن لا عھدلہ۔ [3] جس کا عہد و پیمان نہیں، اس کا دین نہیں۔

---

[1] ۹ برائت: ۴ [2] الکافی ۲: ۱۶۲ باب الصدق [3] مستدرک الوسائل ۱۶: ۹۶ باب وجوب الوفاء

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًا ؕ وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ②

۲۔اے ایمان والو!تم اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو اور نہ حرمت والے مہینے کی اور نہ قربانی کے جانور کی اور نہ ان جانوروں کی جن کے گلے میں پٹے باندھ دیے جائیں اور نہ ان لوگوں کی جو اپنے رب کے فضل اور خوشنودی کی تلاش میں بیت الحرام کی طرف جا رہے ہوں، ہاں! جب تم احرام سے باہرآ جاؤ تو شکار کر سکتے ہو اور جن لوگوں نے تمہیں مسجد الحرام جانے سے روکا تھا کہیں ان کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم بھی (ان پر) زیادتیاں کرنے لگو اور (یاد رکھو) نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور زیادتی (کے کاموں) میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کیا کرو اور اللہ سے ڈرو، اللہ کا عذاب یقیناً بہت سخت ہے۔

تشریح کلمات

شَعَآئِر: (ش ع ر) شعیرہ کی جمع نشانی اور علامت کو کہتے ہیں۔

الهَدْیَ: (ہ د ی) قربانی کو کہتے ہیں جو بارگاہ خداوندی میں بطور ہدیہ پیش کی جاتی ہے۔

القَلَآئِد: (ق ل د) قلادہ کی جمع ہے جو پٹے کے معنوں میں ہے۔ یعنی وہ قربانی جس کو پٹہ باندھ کر قربانی کے لیے مختص کر دیا گیا ہے تا کہ کوئی اس کا متعرّض نہ ہو۔

شَنَاٰن: (ش ن ء) بغض و عداوت۔

يَجْرِمَنَّكُمْ: (ج ر م) جَرَمَ ۔ یَجرِمُ۔ باب ضرب یضرب، محرک اور سبب کو کہتے ہیں۔ گناہ کو جرم اس

لیے کہتے ہیں کہ گناہ کے سرزد ہونے میں کوئی برا محرک کارفرما ہوتا ہے۔

آمِّیۡنَ: (ا م م) قصد کرنے والے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا تُحِلُّوۡا شَعَآئِرَ اللّٰہِ: شعائر سے مراد ہر وہ چیز جو کسی مسلک و مذہب کی عظمت اور تاریخ سے وابستہ ہو یا اس چیز میں اس نظریے اور نظام کی پہچان ہو۔ جیسے ہر حکومت کا جھنڈا اس کی پہچان کا ذریعہ ہوتا ہے اور اس جگہ حج میں بجا لائے جانے والے اعمال مراد ہو سکتے ہیں۔ جیسے وقوف عرفات و مشعر، طواف، سعی اور رمی جمرات وغیرہ۔ ان اعمال کو اعتنا میں نہ لانا اور ترک کرنا ان کی بے احترامی ہے۔

۲۔ وَ لَا الشَّہۡرَ الۡحَرَامَ: حرمت والے مہینے وہ ہیں، جن میں ہر قسم کی جنگ کرنا حرام ہے۔ یہ محرم، رجب، ذی القعدہ اور ذی الحجہ کے مہینے ہیں۔ ان کی بے احترامی سے مراد ان میں جنگ بندی کی خلاف ورزی کرنا ہے۔ حرام مہینے میں قتل و قتال کو سورہ بقرہ آیت ۲۱۷ میں قُلۡ قِتَالٌ فِیۡہِ کَبِیۡرٌ سنگین جرم قرار دیا ہے۔

۳۔ وَ لَا الۡہَدۡیَ: قربانی کے لیے جو جانور پیش کیا جاتا ہے، اس کی بے احترامی اس سے متعلق احکام کی خلاف ورزی ہے۔ اس قربانی کو قربان گاہ تک پہنچنے میں رکاوٹ ڈالنا خلاف ورزی ہے۔

۴۔ وَ لَا الۡقَلَآئِدَ: قلائد وہ قربانی ہے جس پر قربانی کی نشانی لگائی جاتی ہے تاکہ کوئی اس کو گزند نہ پہنچائے۔

۵۔ وَ لَاۤ آٰمِّیۡنَ الۡبَیۡتَ الۡحَرَامَ: بیت اللہ کے زائرین کی بے احترامی، ان کا راستہ روکنا ہے۔ بیت اللہ کے زائرین میں کسب حلال کے لیے جانے والے بھی شامل ہو جاتے ہیں، اگر فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّہِمۡ سے مراد کسب حلال لیا جائے۔

۶۔ وَ اِذَا حَلَلۡتُمۡ فَاصۡطَادُوۡا: جب احرام ختم ہو جائے تو شکار جائز ہو جاتا ہے۔

۷۔ وَ لَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ: کفار کی طرف سے مسجد الحرام کا راستہ بند کرنے کا غصہ کہیں اس بات کا محرک نہ بنے کہ تم بھی ان کے ساتھ زیادتی کرو اور ان پر تم بھی راستہ بند کرو۔ کافروں نے مسلمانوں کو حج کرنے سے روک دیا تھا۔ اس پر مسلمان مشتعل تھے اور چاہتے تھے کہ حج کے موسم میں جو کفار مسلمانوں کے علاقوں سے گزریں، ان پر چھاپے مارے جائیں اور ان کو حج کرنے سے روک دیا جائے۔ اس پر یہ حکم نازل ہوا کہ ان کی زیادتی تم کو مشتعل نہ کرے کہ تم بھی ان کے ساتھ زیادتی کرو۔ یہ ایک الٰہی اخلاق اور ضبط نفس کا ایک اعلیٰ ترین درس ہے اور اسلامی تعلیم و تربیت کا ایک نمونہ ہے۔

۸۔ تَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡبِرِّ وَ التَّقۡوٰى: نیکی اور تقویٰ جہاں ایک انفرادی عمل ہے، وہاں یہ دونوں ایک اجتماعی عمل بھی ہے کہ خود نیکی اور تقویٰ پر عمل کرے اور اس کام میں دوسروں کی مدد کرے۔ دوسروں کو نیکی کی ترغیب دے اور نیک کاموں کی رہنمائی کرے۔ اس سلسلے میں اگر کوئی رکاوٹ یا غلط فہمی ہے تو اسے دور کرے۔اس آیت میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس میں اجتماعی نیکی اور اجتماعی تقویٰ کا حکم ہے، جو انفرادی نیکی اور انفرادی تقویٰ سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اسی طرح انفرادی گناہ کے ارتکاب سے اجتماعی گناہ کا ارتکاب کہیں زیادہ قابل نفرت ہے۔ لہٰذا گناہ اور زیادتی میں مدد دینے سے منع فرمایا۔ ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے تعاون علی البر و التقویٰ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلام کے اہم ترین اصلاحی دستور ہیں۔ ان پر عمل پیرا ہونے کی صورت میں ایک اعلیٰ انسانی مثالی معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے اور مسلمانوں میں جو فکری، اخلاقی، اقتصادی اور سیاسی انحطاط آیا ہے، وہ اس اسلامی انسان ساز دستور پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے ہے۔

اہم نکات

۱۔ اسلامی شعائر کی بے حرمتی اسلام کی بے حرمتی ہے۔

۲۔ زیادتی کرنے والوں کے ساتھ زیادتی نہ کرنا، اسلام کی اعلیٰ اخلاقی تعلیم ہے۔

۳۔ نیکی اور تقویٰ میں باہمی تعاون اور گناہ اور زیادتی میں عدم تعاون، ایک اہم معاشرہ ساز دستور ہے۔

حُرِّمَتۡ عَلَیۡکُمُ الۡمَیۡتَۃُ وَ الدَّمُ وَ لَحۡمُ الۡخِنۡزِیۡرِ وَ مَاۤ اُہِلَّ لِغَیۡرِ اللّٰہِ بِہٖ وَ الۡمُنۡخَنِقَۃُ وَ الۡمَوۡقُوۡذَۃُ وَ الۡمُتَرَدِّیَۃُ وَ النَّطِیۡحَۃُ وَ مَاۤ اَکَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَکَّیۡتُمۡ ۟ وَ مَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ وَ اَنۡ تَسۡتَقۡسِمُوۡا بِالۡاَزۡلَامِ ؕ ذٰلِکُمۡ فِسۡقٌ ؕ اَلۡیَوۡمَ یَئِسَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ دِیۡنِکُمۡ

۳۔ تم پر حرام کیا گیا ہے مردار، خون، سور کا گوشت اور (وہ جانور) جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو اور وہ جو گلا گھٹ کر اور چوٹ کھا کر اور بلندی سے گر کر اور سینگ لگ کر مر گیا ہو اور جسے درندے نے کھایا ہو سوائے اس کے جسے تم (مرنے سے پہلے) ذبح کر لو اور جسے تھان پر ذبح کیا گیا ہو اور جوئے کے تیروں کے ذریعے تمہارا تقسیم کرنا (بھی حرام ہے)، یہ سب فسق ہیں، آج کافر لوگ تمہارے دین سے مایوس ہو چکے ہیں،

فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۭ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ③	پس تم ان (کافروں) سے نہیں مجھ سے ڈرو، آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا، پس جو شخص گناہ کی طرف مائل ہوئے بغیر بھوک کی وجہ سے (ان حرام چیزوں سے پرہیز نہ کرنے پر) مجبور ہو جائے تو اللہ یقیناً بڑا بخشنے والا، مہربان ہے۔

تشریح کلمات

الْمُنْخَنِقَةُ: (خ ن ق) وہ جانور جو گلا گھٹ کر مرا ہو۔

الْمَوْقُوْذَةُ: (و ق ذ) الوقذ۔ شدت ضرب کے معنوں میں ہے۔ یعنی وہ جانور جو لاٹھی یا پتھر سے مار دیا جائے۔

الْمُتَرَدِّيَةُ: (ر د ی) بلند جگہ سے گر کر مرنے والا جانور۔

النَّطِيْحَةُ: (ن ط ح) سینگ لگنے سے مرنے والا جانور۔

النُّصُب: (ن ص ب) زمانہ جاہلیت میں عرب جن پتھروں کی پوجا کرتے، ان پر جانور بھینٹ چڑھایا کرتے تھے، ان کو نصب کہتے ہیں۔

ازلام: (ز ل م) جوئے کے تیر کو کہتے ہیں۔

مَخْمَصَةٍ: (خ م ص) بھوک کے معنوں میں ہے۔

مُتَجَانِفٍ: (ج ن ف) مائل ہونا۔

تفسیر آیات

۱۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ: مردار، خون، سور کا گوشت اور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو، کی حرمت کی تشریح سورہ بقرہ آیت ۱۷۳ میں ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ وَالْمُنْخَنِقَةُ: باقی جو جانور گلا گھٹنے یا چوٹ لگنے یا بلندی سے گرنے یا سنگ لگنے یا درندوں کی چیر پھاڑ کی وجہ سے مر جاتے ہیں، وہ مردار اور غیر مذبوح ہونے کی وجہ سے حرام ہیں۔ چنانچہ

۳۔ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ: ''بجز وہ جسے تم ذبح کرو'' سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح سے مرنے

والے جانور مردار میں شامل ہونے کے باوجود، ان کا خصوصی طور پر اس لیے ذکر کیا کہ زمان نزول قرآن میں لوگ مذکورہ طریقوں سے مرنے والے جانوروں کو مردار خیال نہیں کرتے تھے۔ وہ صرف کسی بیماری کی وجہ سے مرنے والے جانوروں کو مردار سمجھتے تھے۔

۴۔ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ: جو مشرکانہ رسوم کے مطابق کسی پتھر یا دیوتا یا بھوت وغیرہ کی خوشنودی کے لیے ذبح کیے جائیں، وہ جانور حرام ہیں۔ یہ بھی اگرچہ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيۡرِ اللّٰهِ جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو میں شامل ہے لیکن عربوں میں چونکہ ایسے مراسم عام تھے، اس لیے اس کا الگ سے ذکر کیا گیا۔

۵۔ وَاَنۡ تَسۡتَقۡسِمُوۡا: ازلام، زلم کی جمع ہے۔ یہ اس تیر کو کہتے ہیں، جس کے ذریعے عرب جاہلیت میں لوگ قسمت آزمائی کرتے اور فال نکالتے تھے اور اس کا ذکر حرام جانوروں کے ذیل میں اس لیے کیا کہ عرب جاہلیت میں یہ رواج بھی عام تھا کہ کوئی جانور چند آدمیوں کے درمیان مشترکہ طور پر ذبح کیا جاتا تو اس کی تقسیم حصہ کے مطابق کرنے کی بجائے اس تیر کے ذریعے کرتے تھے جس سے جوئے کی طرح ہی کسی کو گوشت مل جاتا، کوئی محروم رہ جاتا۔ اس لیے اس طریقہ کار کی حرمت کا بھی بیان فرمایا۔

۶۔ اَلۡيَوۡمَ يَىِٕسَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ دِيۡنِكُمۡ: آج کے دن کافر لوگ تمہارے دین سے مایوس ہو گئے۔ اس آیت میں چند ایک مسائل قابل بحث ہیں:

i۔ اَلۡيَوۡمَ سے مراد اس کے ظاہری اور لغوی معنی ہیں۔ یعنی ایک خاص دن۔ اس سے مطلق زمانہ مراد لینا خلاف ظاہر ہے۔ اگر چہ اَلۡيَوۡمَ زمانے میں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن قرینہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔

اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَـكُمۡ دِيۡنَكُمۡ: آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا۔ یعنی اعلان امامت سے یہ دین مرحلۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔

ii۔ کچھ حضرات نے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ ان احکام کے بیان سے اسلامی احکام کا بیان مکمل ہوا اور اس کے بعد کوئی حکم نازل نہیں ہوا۔ یہ مؤقف بھی اس لیے درست نہیں کیونکہ بخاری کی روایت کے مطابق آخری حکم آیہ ربا ہے اور بعض کے نزدیک آیہ کلالہ ہے اور دیگر بعض احکام اس آیت کے نزول کے بعد نازل ہوئے ہیں۔

حقیقت امر یہ ہے کہ کفار نے دین اسلام کی دعوت کو پھیلنے سے روکنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا لیکن انہیں ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ان کی آخری امید یہ تھی کہ یہ دین اس کے بانی کے جانے سے ختم ہو جائے گا اور یہ دعوت اس کے داعی کی موت سے مٹ جائے گی، کیونکہ اس کی کوئی اولاد نرینہ بھی نہیں ہے اور بہت سے سلاطین اور شان و شوکت والے بادشاہان کے موت کے منہ میں جانے کے بعد ان کے نام و نشان مٹ گئے اور ان کے قبر میں جاتے ہی ان کی

حکومتوں کو زوال آ گیا

iii۔ جب رسول اللہؐ نے بحکم خدا اپنے بعد اس دین کے محافظ کا تعارف کرایا تو اس دین کے لیے بقا کی ضمانت فراہم ہو گئی اور بقول صاحب المیزان ''یہ دین مرحلہ وجود سے مرحلہ بقا میں داخل ہو گیا۔'' یہاں سے کافر مایوس ہو گئے کہ یہ رسالت ایک فرد کے پر منحصر نہیں رہی، اب یہ دعوت ایک شخص کے مرنے سے نہیں مرتی۔ چنانچہ ہم آگے ان مصادر و مآخذ کا ذکر کریں گے کہ کفار کی مایوسی اور اکمالِ دین واقعہ غدیر خم سے مربوط ہے۔

صاحب تفسیر المنار کی عبارت میں اس طرف اشارہ ملتا ہے۔ اکمالِ دین میں دین سے مراد اس کے عقائد، احکام، آداب وغیرہ کی تفصیل اور معاملات کا اجمال اور ان کو اولی الامر سے مربوط گردانا ہے۔[1]

۷۔ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ: اس امت کو نعمت ولایت سے نوازا تو نعمتوں کی تکمیل ہو گئی۔ کیونکہ اس کائنات میں سب سے بڑی نعمت توحید اور توحید کی تبلیغ، نبوت سے ہوئی اور اس کو تحفظ امامت سے ملتا ہے۔

۸۔ فَلَا تَخۡشَوۡہُمۡ وَاخۡشَوۡنِ: اب تم کفار سے نہیں، مجھ سے ڈرو۔ اس لہجے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اب بیرونی خطرات ٹل گئے ہیں۔ البتہ اس دین کو داخلی خطرات ہنوز لاحق ہیں۔ ان داخلی خطرات سے بچنے کے لیے خوفِ خدا درکار ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خوف خدا نہ رکھنے والوں کی طرف سے اس دین کو خطرہ لاحق ہے۔ یعنی اس دین کو اب کفار کی طرف سے کوئی خطرہ باقی نہ رہا، البتہ خود مسلمانوں کی طرف سے خطرہ باقی ہے:

وَضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا قَرۡیَۃً کَانَتۡ اٰمِنَۃً مُّطۡمَئِنَّۃً یَّاۡتِیۡہَا رِزۡقُہَا رَغَدًا مِّنۡ کُلِّ مَکَانٍ فَکَفَرَتۡ بِاَنۡعُمِ اللّٰہِ فَاَذَاقَہَا اللّٰہُ لِبَاسَ الۡجُوۡعِ وَالۡخَوۡفِ بِمَا کَانُوۡا یَصۡنَعُوۡنَ ﴿﴾[2]	اور اللہ ایسی بستی کی مثال دیتا ہے جو امن سکون سے تھی، ہر طرف سے اس کا وافر رزق اسے پہنچ رہا تھا، پھر اس نے اللہ کی نعمات کی ناشکری شروع کی تو اللہ نے ان کی حرکتوں کی وجہ سے انہیں بھوک اور خوف کا ذائقہ چکھا دیا۔

امامیہ نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ یہ آیت غدیر خم میں رسول اللہ صلی اللہ وآلہ وسلم کی طرف سے حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کے اعلان کے موقع پر نازل ہوئی ہے۔ امامیہ کے ساتھ اہل سنت کے ائمہ حدیث کی ایک قابل توجہ جماعت نے بھی اپنی تصنیفات میں متعدد اصحاب رسولؐ سے روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت ولایت علی علیہ السلام کے اعلان کے بعد غدیر خم میں نازل ہوئی:

۱۔ زید بن ارقم: ان کی روایت کو محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ ھ نے اپنی کتاب الولایۃ فی طرق

---

[1] المنار ۶: ۱۶۶　[2] ۱۶ نحل: ۱۱۲

حدیث الغدیر میں ذکر کیا ہے۔ ان کی اس کتاب کا ذکر ذہبی نے اپنے طبقات ۲: ۲۵۴ میں، ابن حجر نے تہذیب التہذیب ۷: ۴۱۰ میں اور ابن کثیر نے اپنی تاریخ ۱۱: ۴۶ میں کیا ہے۔

۲۔ ابوسعید خدری: ان کی روایت کو حافظ ابن مردویہ اصفہانی متوفی ۴۱۰ ھ نے ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر ۲: ۱۴، الدر المنثور ۲: ۲۵۹ اور حافظ ابونعیم اصفہانی متوفی ۴۳۰ ھ۔

۳۔ ابو ہریرہ: ان کی روایت کو حافظ ابو بکر خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ ھ نے اپنی تاریخ ۸: ۲۶۰ میں نقل کیا ہے اور تفسیر ابن کثیر ۲: ۱۴، تاریخ ابن کثیر ۵: ۲۱۰، الاتقان ۱: ۳۱ میں بھی مذکور ہے۔

۴۔ جابر بن عبد اللہ انصاری: ان کی روایت کو ابوالفتح نطنزی نے الخصائص العلویۃ میں نقل کیا ہے۔ مزید تفصیل، مصادر و مآخذ کے لیے رجوع ہو: الغدیر ۱: ۲۳۰۔

اہل سنت کے دیگر بعض مصادر میں ابن عباس، حضرت عمر، حضرت علی علیہ السلام، سمرہ اور معاویہ سے منقول ہے کہ یہ آیت حجۃ الوداع کے موقع پر عرفہ کے روز نازل ہوئی ہے تو اگر ان روایات کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ ان روایات کے ساتھ متصادم نہیں ہیں جو اس آیت کے ۱۸ ذی الحجۃ الحرام غدیر خم کے موقع پر نازل ہونے کے بارے میں وارد ہیں۔ کیونکہ عین ممکن ہے آیہ سورہ مائدہ میں عرفہ کے روز نازل ہوئی ہو اور رسول اللہ (ص) نے اس آیت کو غدیر کے موقع پر تلاوت فرمایا ہو۔

ولایت علی علیہ السلام کی اہمیت: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

ولایتی لعلی بن ابی طالب احبُّ اِلیَّ مِنْ وِلادتی منہ لان ولایتی لعلی بن ابی طالب فرض و ولادتی منہ فضل۔[1]

علی ابن ابی طالبؑ کی محبت مجھے ان کی نسبی ولادت سے زیادہ عزیز ہے۔ چونکہ علی بن ابی طالبؑ سے میری محبت فرض ہے اور نسبی ولادت فضل ہے۔

دوسری روایت میں آیا ہے:

ولایتی لآبائی احبّ الی من نسبی و ولایتی لھم تنفعنی من غیر نسب و نسبی لا ینفعنی بغیر ولایۃ۔[2]

اپنے آبا و اجداد سے میری محبت ان کی نسبی صورت سے زیادہ عزیز ہے۔ چونکہ ان کی محبت نسب نہ ہو تو بھی میرے لیے فائدہ مند ہے لیکن اگر محبت نہ ہو تو صرف نسب فائدہ مند نہیں ہے۔

۹۔ فَمَنِ اضۡطُرَّ فِیۡ مَخۡمَصَۃٍ: پس جو شخص بھوک کی وجہ سے ان حرام چیزوں کو کھانے پر مجبور ہو جائے، یعنی زندگی بچانے کے لیے مردار کے علاوہ کوئی چیز میسر نہ ہو تو یہ مردار چیزیں کھا سکتا ہے، بشرطیکہ گناہ اور عصیان کے طور پر نہ ہو۔

۱۰۔ غَیۡرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثۡمٍ: یعنی صرف اتنا کھا سکتا ہے جس سے زندگی بچ جائے۔

---

۱ الفضائل ۱۲۵۔ بحار الانوار ۳۹: ۲۹۹　　۲ مشکاۃ الانوار ص ۳۳۲

اہم نکات

۱۔ دین اسلام انسانیت کے لیے اللہ کی بڑی نعمت ہے۔ اس دین کے محافظ (امامؑ) کے تعین سے اس نعمت کی تکمیل ہو گئی۔

۲۔ بعض احکام متحرک ہیں، حالات کے ساتھ بدلتے ہیں۔ جیسے ضرورت کے وقت مردار کھانا جائز ہو جاتا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَاۤ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّاۤ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۴﴾

۴۔ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال کیا گیا ہے، کہد یجیے: تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں اور وہ شکار بھی جو تمہارے لیے ان شکاری جانوروں نے پکڑا ہو جنہیں تم نے سدھا رکھا ہے اور انہیں تم شکار پر چھوڑتے ہو، جس طریقے سے اللہ نے تمہیں سکھایا ہے، اس کے مطابق تم نے انہیں سکھایا ہو تو جو شکار وہ تمہارے لیے پکڑیں اسے کھاؤ اور اس پر اللہ کا نام لے لیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اللہ یقیناً بہت جلد حساب لینے والا ہے۔

تشریح کلمات

الطَّيِّبٰتُ: (ط ی ب) طیب اس کو کہتے ہیں جس سے انسان کے حواس بھی لذت یاب ہوں اور نفس بھی۔

مُكَلِّبِيْنَ: (ك ل ب) مکلب اس شخص کو کہتے ہیں جو کتوں کو شکار کے لیے سدھاتا اور انہیں شکار پر چھوڑتا ہے۔

الجَوَارِحِ: (ج ر ح) جرح زخم کو کہتے ہیں اور پرندوں میں شکاری جانور کو جارحہ کہتے ہیں۔ جرح کسب کرنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا: وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ [۱] یعنی اللہ اس چیز سے بھی باخبر ہے جو تم دن میں کماتے ہو۔ اسی سے اعضا کو جوارح کہتے ہیں۔

---

[۱] ۶ انعام: ۶۰

تفسیر آیات

۱۔ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ: تمام پاکیزہ چیزیں تمہارے لیے حلال کی گئی ہیں۔ یہاں سب سے پہلے تو یہ طے کرنا ضروری ہے کہ وہ کون سا معیار اور اساس ہے، جس کی بنیاد پر ہم پاک چیزوں کو ناپاک چیزوں سے الگ کر سکتے ہیں۔

وہ اساس اور کلیہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر تمام چیزیں انسان کے لیے پاک اور حلال ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

هُوَالَّذِیۡ خَلَقَ لَکُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا ...[۱] وہ وہی اللہ ہے جس نے زمین میں موجود ہر چیز کو تمہارے لیے پیدا کیا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

کُلُّ شَیْءٍ هُوَ لَکَ حَلاَلٌ حَتَّی تَعْلَمَ اَنَّهٗ حَرَامٌ بِعَیْنِهٖ۔[۲] ہر شے تیرے لیے حلال ہے جب تک تجھے اس کی حرمت کا علم نہ ہو۔

اس آیت اور دوسری متعدد آیات سے ان تمام چیزوں میں صرف پاک چیزوں کو حلال قرار دیا، اس سے تمام چیزوں کی جگہ تمام پاک چیزیں حلال ہو گئیں۔ پاک ہونے کی قید سے حلال چیزوں کا دائرہ تنگ ہو گیا۔ اب یہ سوال باقی رہا کہ پاک چیزوں کو ہم کیسے سمجھیں؟ جواب یہ ہے کہ اول تو ذوق سلیم اور فطری نظافت کے ساتھ مطابقت رکھنے والی چیزیں پاک اور حلال ہیں۔ دوم یہ کہ شاید ہر جگہ ذوق سلیم اور فطری پاکیزگی بھی فیصلہ کرنے سے معروضی حالات کی وجہ سے قاصر رہے تو یہاں خود شریعت سے مدد لی جائے گی۔ چونکہ شرعی نصوص میں بھی حیوانات، پرندے اور آبی حیوانات کے بارے میں کلیے قائم کیے ہیں، جن کے مطابق پاک اور خبیث چیزوں میں تمیز ہو سکتی ہے۔

۲۔ وَمَا عَلَّمۡتُمۡ مِّنَ الۡجَوَارِحِ: وہ شکار بھی حلال ہے جو تمہارے سدھائے ہوئے شکاری جانوروں نے پکڑا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سدھے ہوئے کتے کو تم نے اللہ کا نام لے کر چھوڑا اور اس نے حلال گوشت جانور کو پکڑ لیا اور تمہارے ہاتھ آنے سے پہلے وہ جانور مر گیا تو وہ تمہارے لیے حلال ہے اور یہی ذبح شرعی شمار ہو گا۔

فقہ جعفری کے مطابق یہ خصوصیت اور یہ حکم صرف کتے کے پکڑے ہوئے شکار کے لیے ہے، دوسرے شکاری پرندوں کا پکڑا ہوا شکار اگر زندہ ہاتھ میں آ جائے اور ذبح شرعی ہو جائے تو حلال ہے، ورنہ حرام ہے اور اس پر ائمہ علیہم السلام کی احادیث کے ساتھ خود آیت کا لفظ مُکَلِّبِیۡنَ دلیل ہے۔ کیونکہ مکلب، کتے کو شکار

---

[۱] ۲ بقرہ: ۲۹ [۲] الکافی ۵: ۳۱۳

کی تعلیم دینے کو کہتے ہیں، لہٰذا آیت کی رو سے بھی یہ حکم صرف تربیت شدہ کتے کے ساتھ مخصوص ہے۔

۳۔ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ : سدھائے ہوئے کتے کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے مالک کے لیے شکار کرتا ہے، خود نہیں کھاتا۔ اسی لیے اس کا پکڑنا مالک کے اشارے سے شمار ہوتا ہے اور حلال ہے۔ چنانچہ آیت کی تعبیر بھی یہی ہے: مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وہ جس جانور کو تمہارے لیے پکڑے تو کھاؤ۔ اگر اس نے خود کھایا تو اس نے مالک کے لیے نہیں، اپنے لیے شکار کیا ہے اور حلال نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں شکاری کے ذریعے جانور حلال ہونے کی چند ایک شرائط کا ذکر کیا گیا ہے:

پہلی شرط: شکاری کتا تربیت یافتہ ہو۔ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ ...۔

دوسری شرط: کتے کو انسان شکار کو پکڑنے کی غرض سے چھوڑے۔ اگر کتا خود جا کر پکڑ لائے تو حلال نہ ہوگا۔ یہ شرط مُكَلِّبِيْنَ سے ظاہر ہوتی ہے۔

مُكَلِّبِيْنَ: یعنی کتے کو شکار پر چھوڑا ہو۔ چنانچہ مکلب کے ایک معنی کتے کو شکار پر چھوڑنا ہے۔ چنانچہ مجمع البیان ۲: ۱۶۳ میں اس کے معنی اس طرح بیان کیے ہیں: هو الذی یسلط الکلاب علی الصید۔ مکلب اس کو کہتے ہیں جو کتوں کو شکار پر چھوڑتا ہے۔ محمد بن ابی بکر رازی نے غریب القرآن ص۶۴ میں کہا ہے: المضری للجارح و المغری له۔ یعنی شکاری کتے کو چھوڑنے اور دوڑانے والا مکلب ہے۔

تیسری شرط: یہ کہ کتا اپنے مالک کے لیے شکار پکڑ کر لائے۔ اگر اس نے خود اپنے لیے پکڑا اور شکار کو خود کتے نے کھا لیا تو حلال نہ ہوگا۔ یہ شرط مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ سے ظاہر ہے۔

چوتھی شرط: کتے کو چھوڑتے ہوئے بسم اللّٰہ کہکر چھوڑے: وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔

پانچویں شرط: شکاری کتا ہو۔ دیگر شکاری جانور کا پکڑا ہوا شکار فقہ جعفری کے مطابق حلال نہیں ہے۔ یہ شرط بھی مُكَلِّبِيْنَ سے ظاہر ہے۔ جس شکاری کو چھوڑا جا رہا ہے وہ کلب یعنی کتا ہو۔

احادیث

کافی میں امام جعفر الصادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

فِي كِتَابِ عَلِيٍّ ع فِي قَوْلِ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ قَالَ هِيَ الْكِلَابُ۔[1]	کتاب علی علیہ السلام میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ سے مراد شکاری کتے ہیں۔

دوسری روایت میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

---

[1] الکافی ۶: ۲۰۲

لا بأس باكل ماامسك الكلب مما لم يأكل الكلب منه فاذا اكل الكلب من قبل ان تدركه فلا تأكله۔[1]

کتا جس کا شکار پکڑ لے، اگر کتا اس سے نہ کھالے اور اگر ہاتھ آنے سے پہلے کتے نے کھا لیا ہے تو اس کا کھانا جائز نہیں ہے۔

اَلۡیَوۡمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ ؕ وَ طَعَامُ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمۡ ۪ وَ طَعَامُکُمۡ حِلٌّ لَّہُمۡ ۫ وَ الۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الۡمُؤۡمِنٰتِ وَ الۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ اِذَاۤ اٰتَیۡتُمُوۡہُنَّ اُجُوۡرَہُنَّ مُحۡصِنِیۡنَ غَیۡرَ مُسٰفِحِیۡنَ وَ لَا مُتَّخِذِیۡۤ اَخۡدَانٍ ؕ وَ مَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالۡاِیۡمَانِ فَقَدۡ حَبِطَ عَمَلُہٗ ۫ وَ ہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ٪﴿۵﴾

۵۔ آج تمہارے لیے تمام پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئی ہیں اور اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے اور پاکدامن مومنہ عورتیں نیز جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے ان کی پاکدامن عورتیں بھی (حلال کی گئی ہیں) بشرطیکہ ان کا مہر دے دو اور ان کی عفت کے محافظ بنو، چوری چھپے آشنائیاں یا بدکاری نہ کرو اور جو کوئی ایمان سے منکر ہو، یقیناً اس کا عمل ضائع ہو گیا اور آخرت میں وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گا۔

تشریح کلمات

طَعَامُ: (ط ع م) ہر وہ چیز جو بطور غذا کھائی جائے اسے طعم یا طعام کہتے ہیں اور کبھی طعام کا لفظ خاص گیہوں پر بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے صدقہ فطر میں ایک صاع طعام یا ایک صاع جو دینے کا حکم دیا ہے۔ جوہری نے صحاح میں کہا ہے: و ربما خصّ باطعام البُرّ۔ کبھی طعام سے صرف گیہوں مراد لیا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

اَلۡیَوۡمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ: سابقہ آیت میں اس بات کا ذکر ہوا کہ کلیہ یہ ہے کہ ہر چیز حلال

----

[1] الکافی ۶: ۲۰۳

ہے جب تک حرام ہونے پر دلیل نہ آئے۔

اس آیۂ شریفہ میں دو مباحث قابل توجہ ہیں:

ا۔ اہل کتاب یہود و نصاریٰ کا طعام حلال ہے سے مراد کیا مطلق طعام ہے، جس میں ان کا ذبیحہ بھی شامل ہے؟

یہاں دو مؤقف ہیں:

i۔ اکثر اہل سنت کا مؤقف ہے کہ اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہے۔

ii۔ فقہ جعفریہ کا مؤقف ہے کہ طعام سے مراد ذبیحہ کے علاوہ باقی طعام ہیں۔ پھر باقی طعام میں فقہ جعفریہ کے فقہاء میں دو نظریے ہیں: ایک یہ کہ اہل کتاب نجس ہیں، لہٰذا مرطوب کھانا جس کو اہل کتاب نے مس کیا ہے نجس ہے۔ دوسرا نظریہ چند ایک فقہائے امامیہ کا ہے کہ اہل کتاب پاک ہیں، لہٰذا ذبیحہ کے علاوہ تمام کھانا حلال ہے، جب نجاست لگنے کا یقین نہ ہو۔

فقہ جعفریہ کے مؤقف کی دلیل یہ ہے کہ سورۂ انعام آیت ۱۲۱ میں فرمایا: وَلَا تَاۡکُلُوۡا مِمَّا لَمۡ یُذۡکَرِ اسۡمُ اللّٰہِ عَلَیۡہِ وَ اِنَّہٗ لَفِسۡقٌ ۔ جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا اس کو مت کھاؤ، ایسا کرنا گناہ ہے۔ اس کے علاوہ سورہ ہائے بقرہ، مائدہ اور نحل میں ان ذبیحوں کو گناہ، فسق اور نجس قرار دیا ہے جن پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا۔

یہ بات کس سے پوشیدہ ہے کہ مسیحی اگر دین مسیحیت پر کاربند ہے تو وہ اپنے ذبیحہ پر ''تثلیث مقدس'' کا نام لیتا ہے۔ اگر وہ دین مسیحی کا پابند نہیں ہے تو کوئی بھی نام نہیں لیتا۔ دونوں صورتوں میں حرام ہے نیز یہ سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب اہل کتاب کسی جانور کو ذبح کرے اور اگر سرے سے ذبح ہی نہ کرے، جیسا کہ آج کل ہے تو حلال ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

یہاں اس سلسلے میں چند ایک سوال اٹھائے جاتے ہیں:

i۔ سوال: قرآن کی تعبیر یہ ہے کہ اہل کتاب کا طعام تمہارے لیے حلال ہے اور طعام ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو کھائی جائے، جس میں ذبیحہ بھی شامل ہے۔

جواب: اولاً اللہ تعالیٰ نے قرآن میں متعدد جگہوں پر ان ذبیحوں کو جن پر اللہ کا نام نہیں لیا جاتا، رجس اور ناپاک قرر دیا ہے اور اس آیت میں پاکیزہ چیزوں کو حلال کیا ہے، لہٰذا اہل کتاب کا ذبیحہ حلال چیزوں سے پہلے ہی خارج ہے۔ ثانیاً احادیث نے اس کی تفصیل بیان کی ہے کہ طعام سے مراد ذبیحہ کے علاوہ ہے۔

ii۔ سوال: اگر طعام سے مراد ذبیحہ کے علاوہ گندم، جو اور پھل وغیرہ ہیں تو یہ چیزیں اہل کتاب کی ہوں یا مشرکین کی، سب حلال ہیں تو اس کا کیا مفہوم بنے گا کہ اہل کتاب کے دانے اور پھل تمہارے لیے حلال ہیں۔

جواب: قرآن مجید نے اہل کتاب سے دوستی رکھنے، ان پر بھروسا کرنے سے سخت منع فرمایا تو اس کا یہ مطلب نکالا جا سکتا تھا کہ ان سے ہر قسم کا میل جول رکھنا جائز ہے نہیں؟ اس اشتباہ کے ازالہ کے لیے فرمایا: ان کا طعام تمہارے لیے حلال ہے۔ اس حدتک تعلقات رکھ سکتے ہیں۔ یعنی اب تم داخلی طور پر مستحکم ہوگئے ہو اور مسلمان ایک مضبوط قوم بن چکے ہیں۔ لہٰذا آج کے بعد اہل کتاب سے کھانے پینے تک کے تعلقات رکھ سکتے ہو۔

iii۔ سوال: ممکن ہے اس آیت سے وہ آیات منسوخ ہو جائیں جن میں ذبیحہ پر اللہ کا نام نہ لینے کی صورت میں حرام قرار دیا تھا۔

جواب: اس سے پہلے اسی سورہ میں فرمایا ہے: وَمَآ اُہِلَّ لِغَیۡرِ اللّٰہِ ۔ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، حرام ہے اور اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ سورۂ مائدہ کا کوئی حکم منسوخ نہیں ہوا۔

۲۔ وَالۡمُحۡصَنٰتُ: دوسرا مسئلہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کا ہے کہ اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے کہ جس طرح مومن پاکدامن عورتیں تم پر حلال ہیں، اہل کتاب کی پاکدامن عورتیں بھی تم پر حلال ہیں حالانکہ اس سے قبل نازل ہونے والی سورتوں میں کچھ اس طرح حکم ہوا تھا:

لَا تُمۡسِکُوۡا بِعِصَمِ الۡکَوَافِرِ ....[۱]　　اور کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں روکے نہ رکھو....

وَ لَا تَنۡکِحُوا الۡمُشۡرِکٰتِ حَتّٰی یُؤۡمِنَّ ....[۲]　　اور تم مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں ....

اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یہ دو آیات غیر اہل کتاب مشرک اور کافر عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور اگر الۡکَوَافِرِ کو مشرک عورتوں سے مخصوص نہ سمجھا جائے تو زیر بحث آیت ان دو آیتوں کے لیے ناسخ بن جاتی ہے۔

بہرحال ان آیات میں صریحاً ملتا ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ نکاح ہو سکتا ہے۔

اہل کتاب عورتوں سے نکاح کے جواز کے لیے چار باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے:

i۔ ان کا حق مہر ادا کر دیا جائے: اِذَاۤ اٰتَیۡتُمُوۡہُنَّ اُجُوۡرَہُنَّ ....۔

ii۔ ان کی عفت کا محافظ بن جائے۔

iii۔ بدکاری کا ارتکاب نہ کرے۔

iv۔ چوری چھپے آشنائیاں بھی نہ رکھے۔

اس سے اہل کتاب عورتوں سے نکاح کرنے میں موجود خطرات کی طرف لطیف اشارے ملتے ہیں، ان کو خاطر میں رکھنا ضروری ہے۔

---

[۱] ۶۰ ممتحنہ: ۱۰　　[۲] ۲ بقرہ: ۲۲۱

فقہائے امامیہ اس آیت کی تفسیر میں وارد احادیث کی روشنی میں اہل کتاب عورتوں سے صرف متعہ کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔

۳۔ وَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالۡاِیۡمَانِ: جو ایمان کو چھپائے تو اس کا عمل حبط ہو گا۔ ایمان پر کفر کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ حق کو پہچانتا ہے لیکن وہ اسے چھپا کر کفر کا اظہار کرتا ہے جیسے فرمایا:

وَجَحَدُوۡا بِہَا وَاسۡتَیۡقَنَتۡہَاۤ اَنۡفُسُہُمۡ ۔[1]　وہ ان نشانیوں کے منکر ہوئے حالانکہ ان کے دلوں کو یقین آ گیا تھا

احادیث

الکافی اور التہذیب میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے اہل کتاب کا طعام حلال ہونے کے بارے میں فرمایا: الحبوب۔ طعام سے مراد دانے ہیں۔[1]

تہذیب میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

لَا بَأۡسَ اَنۡ یَتَمَتَّعَ الرَّجُلُ بِالۡیَھُوۡدِیَّۃِ وَ النَّصۡرَانِیَّۃِ وَ عِنۡدَہُ حُرَّۃٌ ۔[2]　آزاد عورتیں موجود ہونے کی صورت میں بھی انسان یہودی و نصرانی عورت کے ساتھ متعہ کر سکتا ہے۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا قُمۡتُمۡ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغۡسِلُوۡا وُجُوۡہَکُمۡ وَ اَیۡدِیَکُمۡ اِلَی الۡمَرَافِقِ وَامۡسَحُوۡا بِرُءُوۡسِکُمۡ وَ اَرۡجُلَکُمۡ اِلَی الۡکَعۡبَیۡنِ ؕ وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ جُنُبًا فَاطَّہَّرُوۡا ؕ وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مَّرۡضٰۤی اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡکُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً فَتَیَمَّمُوۡا صَعِیۡدًا طَیِّبًا فَامۡسَحُوۡا بِوُجُوۡہِکُمۡ وَ

۶۔ اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھو لیا کرو نیز اپنے سروں کا اور ٹخنوں تک پاؤں کا مسح کرو، اگر تم حالت جنابت میں ہو تو پاک ہو جاؤ اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی رفع حاجت کر کے آیا ہو یا تم نے عورتوں کو ہاتھ لگایا (ہمبستری کی) ہو پھر تمہیں پانی میسر نہ آئے تو پاک مٹی سے تیمّم کرو پھر اس سے تم اپنے چہروں اور ہاتھوں

---

[1] الکافی ۶: ۲۴۰　[2] التہذیب ۷: ۲۵۶

اَیۡدِیۡکُمۡ مِّنۡہُ ؕ مَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِکِنۡ یُّرِیۡدُ لِیُطَہِّرَکُمۡ وَ لِیُتِمَّ نِعۡمَتَہٗ عَلَیۡکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ۞

کا مسح کرو، اللہ تمہیں مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتا بلکہ وہ تمہیں پاک اور تم پر اپنی نعمت مکمل کرنا چاہتا ہے شاید تم شکر کرو۔

تشریح کلمات

کَعۡبَیۡنِ: (ك ع ب) کعب اس ہڈی کو کہتے ہیں جو پاؤں اور پنڈلی کے جوڑ پر ہوتی ہے اور پاؤں کی پشت کی ابھری ہوئی ہڈی کو بھی کعب کہتے ہیں۔

جنب: (ج ن ب) دوری کے معنوں میں آتا ہے۔ جنابت اس لیے کہتے ہیں کہ یہ شرعاً نماز سے دور رہنے کا سبب بنتی ہے۔

الغَآئِط: (غ و ط) الغوط نیچی اور مطمئن جگہ کو کہتے ہیں اور لوگ رفع حاجت کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کرتے ہیں جہاں کسی دیکھنے والے سے محفوظ ہوں۔ اسی سے انسانی فضلہ کو غائط کہنے لگے۔

تیمم: (ا م م) قصد کے معنوں میں ہے۔

صَعِیۡدًا: (ص ع د) مٹی کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

اس آیۂ شریفہ میں وضو، غسل اور تیمّم کا بیان ہے، جو نماز کے لیے ضروری ہیں۔

وضو: اسلام جہاں باطنی پاکیزگی کو اہمیت دیتا ہے، وہاں ظاہری نظافت و جسمانی صفائی کو ایمان کا حصہ قرار دیتا ہے لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ وضو اور غسل کا واحد مقصد نظافت ظاہری نہیں ہے تاکہ آج کل کے روشن خیال یہ کہیں: وضو اور غسل عرب بدوؤں کے لیے ضروری تھا، آج کا مہذب اور تمدن یافتہ انسان صفائی کے شعور کی اس منزل پر فائز ہے، جہاں وضو اور غسل کی ضرورت باقی نہ رہی، بلکہ وضو، غسل اور تیمّم میں روحی طہارت اور معنوی پاکیزگی اصل مقصود ہے۔ اگر وضو اور غسل صرف ظاہری صفائی کا عمل ہوتا تو اس کا ربط ظاہری میل کچیل کے ساتھ ہونا چاہیے تھا، جب کہ وضو اور غسل کے موجبات و اسباب پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انسانی جسم و روح دونوں کی ایک کیفیت کے ساتھ مربوط ہیں۔ چنانچہ تیمّم کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عمل سے روحانی اور باطنی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اس آیہ شریفہ میں وضو کے درج ذیل احکام بیان ہوئے ہیں:

i۔ فَاغۡسِلُوۡا وُجُوۡهَكُمۡ : اپنے چہروں کو دھولیا کرو۔ چہرے کی حد فقہی کتابوں میں بیان کی گئی ہے۔

ii۔ وَاَيۡدِيَكُمۡ : اور اپنے ہاتھوں کو دھولیا کرو۔ ہاتھ کہنے سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کہاں تک دھونا ہے۔ کیونکہ کلائی تک کو بھی ہاتھ کہا جاتا ہے۔ اس لیے اس حد کو بیان فرمایا: اِلَی الۡمَرَافِقِ کہنیوں تک دھونا ہے۔ لہٰذا یہ مغسول کی حد بندی ہے، غسل کی نہیں۔ یعنی ہاتھ کی حد بیان ہو رہی ہے کہ کہنیوں سے زیادہ دھونا ہے، نہ کم، بلکہ کہنیوں تک دھونا ہے۔ دھونے کی حد بندی نہیں ہو رہی ہے کہ کہاں سے شروع کرنا ہے اور کہاں ختم کرنا ہے۔ یعنی یہاں دھونے کے لیے ابتدا اور انتہا کا ذکر نہیں ہے۔ اس میں ایک تو ہر انسان کا فطری تقاضا ہے کہ ایک خالی الذہن انسان کو اپنا ہاتھ دھونا پڑتا ہے تو وہ کس طرح دھوتا ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ کہنیوں سے نیچے انگلیوں کی طرف آئے گا۔ ثانیاً احادیث نے بتایا کہ دھونے کی ترتیب اوپر سے نیچے کی طرف ہے۔

iii۔ وَامۡسَحُوۡا بِرُءُوۡسِكُمۡ : اپنے سروں کا مسح کرو۔ اس سے مراد پورے سر کا نہیں بلکہ ایک حصے کا مسح کرنا ہے۔ یہ مطلب لفظ بِرُءُوۡسِكُمۡ میں حرف 'باء' سے نکلتا ہے۔ یہ 'ب' تبعیض کے لیے ہے۔ یہ کون سا بعض حصہ ہونا چاہیے؟ احادیث نے بتایا کہ سر کے سامنے کا حصہ ہونا چاہیے۔

اَرۡجُلَكُمۡ اِلَی الۡكَعۡبَيۡنِ اور ٹخنوں تک پاؤں کا مسح کرو۔ اس جملہ کی دو قراء تیں ہیں:

i۔ قرائت نصب: اس قرائت کے تحت اَرۡجُلَكُمۡ کے لام کو فتحہ یعنی زَبَر دے کر پڑھیں گے۔ اس قرائت کو نافع، ابن عامر، کسائی، حفص، یعقوب نے اختیار کیا ہے۔

ii۔ قرائت جر: اس قرائت کے تحت اَرۡجُلِكُم کی لام کو جر یعنی زِیر کے ساتھ پڑھیں گے۔ اس قرائت کو ابن کثیر، حمزہ، ابوعمر، اور عاصم نے اختیار کیا ہے۔

ان دو قراء توں کی بنیاد پر یہ اختلاف بھی سامنے آیا ہے کہ پاؤں کو دھونا ہے یا مسح کرنا ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس، انس بن مالک، عکرمہ، ابوعلی جبائی، شعبی کا مؤقف یہ ہے کہ پاؤں کا مسح کرنا لازمی ہے۔ یہی امامیہ کا مؤقف ہے۔ عربی قواعد کے مطابق دونوں قراء توں کی صورت میں مسح ثابت ہوتا ہے۔ چونکہ رؤس کے لفظ پر عطف کیا جائے تو اَرۡجُلِكُمۡ مجرور ہوگا اور اگر رؤس کے محل پر عطف کیا جائے تو اَرۡجُلَكُمۡ منصوب ہوگا اور عطف بَرمحل کا کوئی انکار نہیں کر سکتا، چونکہ استعمال میں رائج ہے۔ کہتے ہیں: مررت بزید و عمراً۔ شاعر نے کہا ہے:

معاوی اننا بشر فاسجع

فلسنا بالحبال ولا الحدیداً

یہاں پر لفظ حدید، الحبال پر عطف ہے اور عطف بَرمحل ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور اَرۡجُلَکُمۡ کو اَیۡدِیَکُمۡ پر عطف قرار دینا سیاق و ظاہر کلام کے خلاف ہے۔ چونکہ سیاق کلام اس طرح ہے: ''دھولیا کرو اپنے چہروں اور ہاتھوں کو کہنیوں تک اور مسح کرو اپنے سروں اور پاؤں کا ٹخنوں تک۔'' اگر سیاق کلام کے تحت پاؤں کو سروں کے حکم میں ملانا ضروری نہیں ہے تو ہاتھوں کو بھی چہروں کے ساتھ ملانا ضروری نہیں رہے گا۔ اس سے نظم کلام درہم برہم ہو جائے گا۔

محمد ابراہیم حلبی نے آیات وضو کے ضمن میں لکھا ہے:

و ارجلکم الی الکعبین فی السبعة بالنصب والجرُ المشهور ان النصب بالعطف علی وجوهکم والجر الجوار والصحیح ان الارجل معطوفة علیٰ الرؤس فی القرئتین و نصبها علی المحل و جرها علی اللفظ و ذلك لامتناع العطف علی المنصوب بالفعل بین العاطف والمعطوف علیه بجملة اجنبیة والاصل ان یفصل بینهما بمفرد فضلاً عن الجملة و لم یُسمع فی الفصیح نحو ضربت زیداً و مررت بعمرا بعطف بکر علی زیداً۔[1]	و ارجلکم سات قرائتوں میں نصب اور جر دونوں سے پڑھا گیا ہے اور مشہور یہ ہے کہ نصب وجوهکم پر عطف کی وجہ سے ہے اور جر جوار کے لیے ہے اور صحیح یہ ہے کہ ارجل دونوں قرأتوں میں رؤس پر معطوف ہے محلاً منصوب ہے اور لفظاً مجرور ہے کیونکہ منصوب پر عطف منع ہے۔ اس لیے کہ عاطف اور معطوف علیه کے درمیان ایک اجنبی جملے کا فاصلہ ہے حالانکہ ان دونوں کے درمیان ایک لفظ کا بھی فاصلہ نہ کیا چہ جائیکہ جملے کا فاصلہ کیا جائے۔ فصیح کلام میں کبھی یہ نہیں سنا گیا کہ ضربت زیداً و مررت بعمر و بکراً کہ بکراً کا عطف زیداً پر کیا گیا ہو۔

رہا یہ سوال کہ قراءت جَرُ اعراب بالجوار کی وجہ سے ہے، عطف کی وجہ سے نہیں۔ یعنی اَرۡجُلِ کو رؤس کے جوار کی وجہ سے جَرُ ملا ہے۔ جیسا کہ امرؤ القیس نے کہا ہے:

کأن ثبیراً فی عرانین و بله
کبیر اناس فی بجادٍ مزمّلٍ

اس شعر میں مزمل کو بجاد کے جوار کی وجہ سے جَر ملا، ورنہ یہ کبیر کی صفت ہونے کی وجہ سے مرفوع ہوتا نیز یہ قول بھی مشہور ہے: جحر ضبٍ خربٍ۔ اس میں خرب کو ضبٍّ کے جوار کی وجہ سے جر ملا، ورنہ یہ جحرٌ کی صفت ہے، رفع ملنا چاہیے۔

اس کا جواب یہ ہے:

---

[1] کبیری شرح منیة المصلی ص ۱۵ مطبع محمدی لاہور

اولاً: بہت سے علمائے لغت نے تصریح کی ہے کہ جَر بالمجاورۃ نہایت کمزور مسئلہ ہے اور جہاں کلام عرب میں کبھی شاذ و نادر استعمال ہوا ہے، اسی پر توقف کیا جاتا ہے، مزید قیاس نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ علامہ حلبی نے لکھا ہے:

و اما الجر علی الجوار فلا یکون فی عطف النسق لان العاطف یمنع المجاورۃ[1]

لیکن جر جوار عطف نسق میں ہرگز نہیں ہوتی کیونکہ عاطف مجاورت کو مانع ہے۔

نحو کی مشہور کتاب متن متین صفحہ ۱۶۹ طبع لاہور میں تحریر ہے:

وقدیجر للجوار اتفق علیه الفریقان و علیه حمل جمع قوله تعالیٰ: و ارجلکم بالجر و التحقیق علی ما فی المغنی والفیة للشیخ السیوطی ان فی النعت قلیل و فی التاکید نادر و فی العطف ممتنع و کذا فی موضع اللبس و لا سیما اذا تبادر خلاف المقصود۔

کبھی جر جوار کے لیے بھی دی جاتی ہے جس پر دونوں فریق (بصری و کوفی) متفق ہیں اور اسی لیے ایک جماعت نے ارشاد باری تعالیٰ: و ارجلکم کو جر پر حمل کیا ہے مگر تحقیقی بات وہ ہے جس طرح مغنی اور للشیخ سیوطی الفیة میں لکھا ہے وہ یہ ہے کہ جر جوار نعت میں کم اور تاکید میں نادر اور عطف میں ممتنع ہے اور اسی طرح مقام اشتباہ میں ممتنع ہے۔ بالخصوص جب ظاہر و متبادر، مقصود کے خلاف ہو (تو یقیناً جر جوار منع ہے)۔

سیرافی اور ابن جنی نے جر بالمجاورۃ کا انکار کیا ہے۔ ابواسحاق نحوی کہتے ہیں: قرآن میں جر بالمجاورۃ درست نہیں ہے۔ یہ صرف ضرورت شعری میں جائز ہے اور اکثر نحوی کہتے ہیں: کلام عرب میں جحر ضبٍ خرب میں رفع و جر دونوں منقول ہیں اور رفع افصح ہے۔

ثانیاً: اس پر علماء میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جر بالمجاورۃ میں حرف عطف نہیں ہوا کرتا۔[2] یہاں وَاَرۡجُلَکُمۡ میں واو عطف موجود ہے لہٰذا اس میں جر بالمجاورۃ کا نظریہ یقیناً باطل ثابت ہو جاتا ہے۔

ثالثاً: اعراب بالجوار وہاں جائز ہو سکتا ہے جہاں کلام میں اشتباہ پیدا ہونے کا خطرہ نہ ہو۔ جیسے: جحُرُ ضَبٍّ خربٍ میں خَرِب جحُرُ کی صفت ہو سکتی ہے، ضب کی نہیں ہو سکتی اور شعر میں مزمّل کَبِیۡرُا کی صفت ہو سکتی ہے، بجادٍ کی نہیں۔ جب کہ آیت میں جر بالمجاروۃ سے کلام میں اشتباہ پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔

امرؤ القیس کے شعر کے بارے میں بعض علماء کا نظریہ ہے کہ مزملٍ جر بالجوار کی وجہ سے مجرور نہیں

---

[1] کبیری شرح منیۃ المصلی ص ۱۵۔ شرح مائۃ عامل عبد الرسول ص ۱۱　[2] مغنی اللبیب ۲: ۸۹۵۔ التفسیر الکبیر ۱۱: ۱۶۱

ہے بلکہ اناسٍ کی صفت ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔

صاحب تفسیر المنار کو اسی وجہ سے کہنا پڑا:

و الظاہر انہ عطف علی الرؤس ای ہو امسحوا بارجلکم الی الکعبین۔

یعنی ظاہر آیت یہ ہے کہ ارجلکم رؤسکم پر عطف ہے اور معنی یہ بنتے ہیں کہ پاؤں کا ٹخنوں تک مسح کرو۔

اسی سے طحاوی اور ابن حزم کو یہ مؤقف اختیار کرنا پڑا کہ مسح کا حکم منسوخ ہو گیا ہے۔ اس سے مسح کا حکم ثابت ہو جاتا ہے۔ البتہ منسوخ ہونے پر قرآنی دلیل لانی پڑتی ہے، چونکہ قرآن کا نسخ قرآن سے ہو سکتا ہے، جو طحاوی اور ابن حزم کے بس میں نہیں ہے اور دیگر بعض نے مسح کا انکار نہیں کیا بلکہ مسح سے دھونا مراد لیا۔[1]

ابن حزم اپنی کتاب المحلی ۲: ۵۶ میں لکھتے ہیں:

دونوں پاؤں کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ قرآن میں مسح کا حکم نازل ہوا ہے۔ جیسے فرمایا: وَامۡسَحُوۡا بِرُءُوۡسِكُمۡ وَاَرۡجُلَكُمۡ ۔ ارجلکم کی لام کو آپ زبر دیں یا زیر، دونوں صورتوں میں یہ رؤس پر عطف ہے یا لفظ پر یا محل پر، اس کے علاوہ نہیں ہو سکتا چونکہ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان نیا جملہ نہیں آ سکتا۔

الإحکام فی أصول الأحکام میں الامام لآمدی ج ۳ ص ۶۸ طبع بیروت میں لکھتے ہیں:

ومن ابعد التاویلات مایقولہ القائلون بوجوب غسل الرجلین فی الوضوء فیقولہ تعالیٰ وَامۡسَحُوۡا بِرُءُوۡسِكُمۡ وَاَرۡجُلَكُمۡ اِلَى الۡكَعۡبَيۡنِ من ان المراد بہ الغسل و ہو فی غایۃ البعد لما فیہ من ترك العمل بما اقتضاہ ظاہر العطف من التشریك بین الرؤس و الارجل فی المسح من غیر ضرورۃ۔

بعید ترین تاویلات میں سے ان لوگوں کا قول ہے جو وضو میں پاؤں دھونے کے قائل ہیں۔ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کے فرمان وَامۡسَحُوۡا بِرُءُوۡسِكُمۡ وَاَرۡجُلَكُمۡ اِلَى الۡكَعۡبَيۡنِ میں میں مراد دھونا ہے۔ یہ بات انتہائی بعید ہے چونکہ اس میں بلا ضرورت اس عطف کے تقاضے کو ترک کرنا لازم آتا ہے جس سے پاؤں کو سروں کے ساتھ شریک کرنا ظاہر ہوتا ہے۔

ابن عباس کا یہ قول بھی مشہور ہے:

الی الناس الا غسل و لا اجد فی کتاب اللّٰہ الا مسح ۔[2]

لوگوں کو دھونے پر اصرار ہے اور مجھے کتاب اللہ میں صرف مسح کا حکم ملتا ہے۔

اس جگہ بعض معاصر لکھنے والوں کے بارے میں چند جملے کہنے پر مجبور ہوں:

---

[1] ابن ابی شیبۃ ۔ المصنف ۱: ۲۷
[2] اشرف علی تھانوی: بیان القرآن ۱: ۳۵۸

انا بلینابقوم لا یتمتعون بکفاء ۃ علمیة ولا امانة فی النقل و لا حاجز من تقوی اللّٰه و لا متانة فی التعبیر و لا رصانة فی الفهم و یأتون الی کلام اللّٰه یفسرونه فیاتون بالاعاجیب و الاکاذیب انظر الی قول بعضهم حول هذه الایة حیث یقول بکل وقاحة۔

بعض لوگوں نے اس کو مسح کے تحت داخل کیا ہے، لیکن یہ قول متواتر قرائت اور متواتر سنت کے خلاف ہے اور عربیت کے بھی۔[1]

شِنۡشَنَةٌ اَعۡرِفُها مِنۡ اَخۡزَم۔

روح المعانی کے افتراء ات بھی یہاں قابل مطالعہ ہیں اور ساتھ تفسیر المنار کی سرزنش بھی کہ صاحب تفسیر روح المعانی نے شیعوں پر بے جا الزام تراشی کی ہے۔

قرآن سے مسح کے ثبوت کے بعد سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف آتے ہیں۔

سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رد و قبول کے لیے معیار قرآن ہے۔ جو قرآن کے مطابق ہے وہ قابل قبول ہے اور جو قرآن کے خلاف ہے وہ قابل قبول نہیں ہوسکتا۔

ا۔ رفاعہ بن رافع راوی ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

انها لاتتم صلاة لاحد حتی یسبغ الوضوء کما امره اللّٰه تعالی یغسل وجهه ویدیه الی المرفقین و یمسح برأسه و رجلیه الی الکعبین۔[2]

تم میں سے کسی کی نماز پوری نہیں ہوتی، جب تک وضو اسی طرح بجا نہ لائے جس طرح اللہ نے حکم فرمایا ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ اپنا چہرہ اور دونوں ہاتھ کہنیوں تک دھوئے اور اپنے سر اور دونوں پاؤں کا ٹخنوں تک مسح کرے۔

۲۔ اوس بن ابی اوس راوی ہے:

انه رأی النبی اتی کظامة قوم بالطائف فتوضأ و مَسَحَ عَلی قَدَمَیۡه۔

رسول کریم طائف میں کسی قوم کے پانی کے پاس تشریف لائے، پھر وضو فرمایا اور دونوں پاؤں کا مسح کیا۔

دوسری روایت میں آیا ہے۔

و مسح علي نعليه و قدميه۔[3]

اور دونوں نعلین اور پاؤں پر مسح کیا۔

۳۔ عباد ابن تمیم کی روایت ہے:

ان النبی (ص) مسح علی القدمین و ان عروة کان یفعل ذلك۔[4]

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضو فرمایا اور دونوں پاؤں پر مسح کیا اور عروہ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔

---

[1] تدبر قرآن ۲: ۴۶۹ [2] سنن ابی داؤد ۱: ۲۲۷۔ حدیث نمبر ۳۵۶۔ سنن ابن ماجہ ۱: ۱۵۶۔ حدیث ۴۶۰۔ سنن نسائی ۲: ۲۲۵

[3] سنن ابی داؤد ۱: ۴۱۔ حدیث نمبر ۱۶۰۔ تفسیر طبری ۶: ۸۶۔ نیل الاوطار ۱: ۲۰۹

[4] اسد الغابۃ ۱: ۲۱۷۔ نیل الاوطار ۱: ۲۱۰۔ شرح معانی الآثار ۱: ۳۵

دوسری روایت میں مسح علی رجلیه ہے۔

۴۔ حضرت علی علیہ السلام نے مقام رحبہ میں لوگوں سے فرمایا:

کیا میں تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وضو بتاؤں؟ لوگوں نے کہا: جی ہاں!

فدعا بقعب فيه ماء فغسل وجهه و ذراعيه و مسح على رأسه و رجليه و قال: هذا وضوء من لم يحدث حدثاً۔ [1]	چنانچہ حضرت علیؑ نے ایک برتن منگوایا جس میں پانی تھا۔ اس سے آپؑ نے اپنا چہرہ اور دونوں ہاتھ دھو لیے، پھر سر اور دونوں پاؤں پر مسح کیا، پھر فرمایا: یہ اس شخص کا وضو ہے جس نے کوئی تغیر نہیں کیا۔

یہاں سوال کیا جاتا ہے کہ لم یحدث کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا وضو ہے جس کے لیے حدث واقع نہیں ہوا۔ یعنی وضو ٹوٹا نہیں تھا۔

جواب یہ ہے کہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ لم یحدث کا مطلب ''تغیر نہیں کیا'' ہے۔

پہلا قرینہ: قال للناس لوگوں میں اعلان ہے۔ جو پہلے سے وضو پر ہے، اس کے لیے جدید وضو کے لیے لوگوں میں کسی اعلان کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسرا قرینہ: الا ادلكم على وضوء رسول الله(ص)۔ کیا میں تمہیں رسول اللہ کا وضو نہ بتا دوں؟

اس سے معلوم ہوتا ہے جو واجب وضو ہے، اس کا بیان ہے۔ واجب وضو اور غیر واجب کے طریقہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ واجب وضو کے لیے پاؤں دھونا ہے اور غیر واجب مستحب وضو کے لیے مسح کرنا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

ما نزل القرآن الا المسح۔ [2]	قرآن میں صرف مسح کا حکم نازل ہوا ہے۔

۵۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

نزل القرآن بغسلين و مسحين۔ [3]	قرآن میں دو دھونے اور دو مسح کا حکم نازل ہوا ہے۔

۶۔ حضرت عثمان سے بھی مسح کی روایت آگے آنے والی ہے۔

سوال: قرآن نے کہا ہے سر کا مسح کرو، آپ حضرات سر کے ایک حصے کا مسح کیوں کرتے ہیں؟

جواب: برؤسکم میں 'با' کی وجہ سے۔ چونکہ یہ 'با' تبعیض کے لیے ہے[4]۔ چونکہ امسحوا مفعول کی طرف متعدی ہونے کے لیے 'با' کا محتاج نہیں ہے، یہ خود متعدی ہے اور بغیر 'با' کے کلام درست ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود 'با' کا ذکر بتاتا ہے کہ یہ کسی مفہوم پر دلالت کے لیے

---

[1] تفسیر ابن کثیر ۲: ۲۸۔ تفسیر طبری ۶: ۸۶ [2] التہذیب ۱: ۶۳۔ الدر المنثور ۲: ۲۶۲

[3] تفسیر ابن کثیر ۲: ۲۷۔ التہذیب ۱: ۶۳ [4] المبسوط للسرخسی باب الاقرار بالعارية

ہے اور وہ تبعیض ہے۔

سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی ثابت ہے:

ان رسول اللّٰہ (ص) توضأ فمسح الناصیۃ ولم یمسح الکل۔[1]　　رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضو فرمایا اور پیشانی کے حصے کا مسح کیا، سب کا مسح نہیں کیا۔

۷۔ انس بن مالک، موسیٰ بن انس نے اپنے والد کو بتایا:

حجاج نے لوگوں کو وضو میں پاؤں دھونے کے لیے کہا ہے۔

دوسری روایت میں آیا ہے:

حجاج نے اہواز میں خطبہ دیا اور لوگوں کو پاؤں دھونے کا حکم دیا تو انس بن مالک نے کہا:

صدق اللّٰہ و کذب الحجاج قال اللّٰہ تعالی و امسحوا برؤسکم و ارجلکم۔[2]　　اللہ نے سچ فرمایا۔ حجاج نے جھوٹ بولا۔ اللہ فرماتا ہے: اپنے سروں اور پاؤں کا مسح کرو۔

۸۔ حضرت انس کی یہ روایت بھی ہے کہ انہوں نے کہا:

نزل القرآن بالمسح۔[3]　　قرآن مسح کے حکم کے ساتھ نازل ہوا ہے۔

۹۔ عبد اللہ بن عمر سے راویت ہے:

توضأ و نعلاہ فی قدمیہ مسح ظھور قدمیہ بیدیہ ویقول کان رسول اللّٰہ یصنع ھکذا۔[4]　　انہوں نے جوتا پہن کر وضو کیا اور پاؤں کی پشت پر مسح کیا پھر کہا: رسول اللہ (ص) اسی طرح کرتے تھے۔

وضو میں اختلاف کب پیدا ہوا؟: اس سلسلے میں علامہ سید علی شہرستانی کی گرانقدر کتاب وضوء النبی سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں:

عہد ابی بکر اور عہد عمر میں وضو کے بارے میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ اگر عہد حضرت عمر میں اس سلسلے میں کوئی اختلاف موجود ہوتا تو حضرت عمر اس میں اپنا مؤقف پورے شد و مد سے پیش کرتے۔

حضرت عثمان کے دور خلافت میں وضو میں اختلاف پیدا ہوا۔ چنانچہ متقی ہندی ابی مالک دمشقی سے یہ بات نقل کرتے ہیں:

حدثت ان عثمان بن عفان اختلف فی خلافتہ فی الوضوء۔[5]　　مجھے بتایا گیا ہے کہ عثمان بن عفان کے دور خلافت میں وضو میں اختلاف پیدا ہو گیا۔

---

[1] احکام القرآن جصاص ۲: ۳۴۲ الکشاف ۱: ۶۱　[2] تفسیر طبری ۶: ۸۲۔ تفسیر ابن کثیر الجامع لاحکام القرآن ۶: ۹۲
[3] تفسیر ابن کثیر ۲: ۴۴　[4] شرح معانی الآثار ۱: ۳۵　[5] کنز العمال ۹: ۴۴۳۔ حدیث ۲۶۸۹۰

حمران راوی ہیں:

اتیت عثمان بن عفان بوضوء فتوضأ ثم قال: ان ناساً یتحدثون عن رسول اللّٰہ (ص) باحادیث لا ادری ماھی الا انی رئیت رسول اللّٰہ توضأ مثل وضوئی۔ ثم قال: من توضأ ھکذا غفرلہ ماتقدم۔[1]

میں عثمان بن عفان کی خدمت میں وضو کے وقت پہنچا تو انہوں نے وضو کیا پھر کہا: کچھ لوگ رسول اللہؐ سے احادیث بیان کرتے ہیں۔ میں نہیں جانتا وہ کیا ہیں، مگر یہ میں نے رسول اللہؐ کو دیکھا ہے، وہ اسی طرح وضو کر رہے تھے جیسے میں نے کیا ہے۔ پھر کہا: جو اس طرح وضو کرے گا، اس کے گزشتہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔

صحیح مسلم کی اس روایت سے دو قسم کے وضو کا پتہ چلتا ہے: حضرت عثمان کا وضوء اور 'ناس' لوگوں کا وضو۔

یہاں مسئلہ دو حال سے خالی نہیں ہے:

i۔ یا تو حضرت عثمان سے پہلے لوگ وضو میں پاؤں دھویا کرتے تھے۔ حضرت عثمان کے زمانے میں مسح کا نظریہ وجود میں آیا۔

ii۔ یا حضرت عثمان سے پہلے لوگ مسح کیا کرتے تھے۔ حضرت عثمان کے زمانے میں دھونے کا نظریہ نظریہ وجود میں آ گیا۔

دلائل اور شواہد کی روشنی میں دوسری صورت ثابت ہو جاتی ہے:

پہلی دلیل یہ ہے کہ اپنی خلافت کے ابتدائی سالوں میں خود حضرت عثمان پاؤں کا مسح کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں دو روایات ہیں:

پہلی روایت:

عن حمران قال دعا عثمان بماء فتوضأ ثم ضحک فقال الاتسئلون مم اضحک؟ قالوا یا امیر المؤمنین ما اضحک؟ قال: رأیت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم توضأ کما توضأتُ فمضمض و استنشق وغسل وجھہ ثلاثا و یدیہ ثلاثاً و مسح برأسہ وظھر قدمیہ۔[2]

حمران راوی ہے کہ عثمان نے پانی مانگا، پھر وضو کیا پھر ہنس دیئے۔ کہا: کیا تم پوچھتے نہیں ہو کہ میں کس چیز سے ہنس رہا ہوں؟ لوگوں نے کہا: اے امیر المؤمنین کس چیز نے ہنسایا؟ کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا ایسا ہی وضو کر رہے تھے جیسے میں نے وضو کیا۔ منہ میں پانی ڈالا، ناک میں پانی ڈالا، چہرے کو تین مرتبہ دھویا، دونوں ہاتھوں کو تین مرتبہ دھویا اور سر کا اور دونوں پاؤں کی پشت کا مسح کیا۔

---

[1] صحیح مسلم ۱: ۲۰۷، باب فضل الوضوء
[2] کنز العمال ۹: ۴۳۶ حدیث ۲۶۸۶۳

دوسری روایت:

عن حمران قال: رأيت عثمان دعا بماء فغسل كفيه ثلاثاً ومضمض واستنشق و غسل وجهه ثلاثا وذراعيه ثلاثا ومسح برأسه و ظهر قديه...۔[1]

حمران سے روایت ہے کہ میں نے عثمان کو دیکھا کہ پانی طلب کر رہے ہیں۔ پھر اپنی دونوں ہتھیلیاں دھو لیں تین بار، پھر منہ میں پانی ڈالا اور ناک میں پانی ڈالا اور چہرہ دھویا تین بار اور دونوں ہاتھ دھوئے تین بار پھر سر کا اور دونوں پاؤں کی پشت کا مسح کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ پہلے مسح پر عمل ہوتا رہا۔ عصر عثمان میں دھونے کا نظریہ پیدا ہو گیا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اصحاب میں وضو کے بارے میں سب سے زیادہ روایت حضرت عثمان کی طرف سے ہے۔ چنانچہ ابو ہریرہ کی طرف سے کل ۵۳۷۴ احادیث روایت ہیں جو سب سے زیادہ ہیں لیکن وضو کے بارے میں ایک روایت بھی نہیں ہے اور عبد اللہ بن عمر اور انس بن مالک کی دو ہزار سے زائد روایات موجود ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث بھی وضو کے بارے میں نہیں ہے۔

جب کہ حضرت عثمان کی کل روایات ۱۴۶ سے زیادہ نہیں ہیں، لیکن وضو کے بارے میں ان کی روایات بیس سے زائد ہیں۔ اس سے معلوم ہوا، وضو میں پاؤں کو دھونے کا مسئلہ بعد میں پیدا ہوا ہے۔ حضرت عثمان نے نہیں کہا کہ مسح والا وضو بدعت، باطل اور خلاف شریعت ہے۔ صرف لا ادری ما ھی کہنے پر اکتفا کیا۔

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے: عصر رسالتؐ سے لے کر عصر عثمان تک جو وضو رائج تھا، آج عثمان کے دور میں اس میں تبدیلی لائی جائے اور اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے خلاف آواز نہ اٹھائیں اور اس جدید وضو کو رائج ہونے دیا جائے، بعید از قیاس ہے۔

جواب: مقولہ ہے لیست هذه اول قارورة كسرت۔ یہ پہلی شیشی نہیں ہے جو ٹوٹ گئی۔ یہاں بہت سی شیشیاں چور چور ہو گئی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

i۔ منیٰ میں سفر میں چار رکعت نماز پڑھائی گئی۔

ii۔ فدک مروان بن حکم کو دے دیا گیا۔

iii۔ جمعہ کے دن تیسری اذان کا اضافہ کیا گیا۔

iv۔ عیدین میں خطبہ نماز سے پہلے کر دیا گیا۔

دیگر بہت سی تبدیلیاں عہد عثمان میں لائی گئیں۔

خادم رسول حضرت انس بن مالک کہتے ہیں:

ما اعرف شيئاً مما كان على عهد

میں عہد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کسی چیز کو نہیں

---

[1] کنز العمال ۹: ۴۴۲۔ حدیث ۲۶۸۸۶

النبی صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم قیل: الصلوۃ؟ قال: الیس ضعیتم ما ضعیتم فیھا۔	پہچانتا جو برقرار ہو۔ کہا گیا: نماز (تو برقرار ہے نا) کہا: کیا تم نے جو کچھ ضائع کرنا تھا اس کو نماز میں ضائع نہیں کیا۔

وَاِنۡ کُنۡتُمۡ جُنُبًا فَاطَّہَّرُوۡا: اور اگر تم حالت جنابت میں ہوتو نماز کے لیے پاک ہو جاؤ۔ یعنی غسل کرو۔ چنانچہ سورہ نساء آیت ۴۳ میں فرمایا ہے کہ جب کو غسل کرنا چاہیے: وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیۡ سَبِیۡلٍ حَتّٰی تَغۡتَسِلُوۡا۔ اس کے بعد فرمایا: اگر تم نے رفع حاجت کیا ہو یا عورتوں کو ہاتھ لگایا ہو اور سفر یا بیماری کی وجہ سے پانی کا استعمال میسر نہ ہوتو خاک پر تیمّم کرو۔ اس کی تفصیل سورہ نساء آیت ۴۳ میں گزر چکی ہے۔

مَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیَجۡعَلَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ حَرَجٍ: ''اللہ تمہیں مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔'' اس جملے اور سورہ حج کی آیت ۷۸ وَمَا جَعَلَ عَلَیۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ مِنۡ حَرَجٍ سے ایک کلی حکم سامنے آتا ہے کہ جب کوئی حکم مکلّف کے لیے باعث عسر وحرج اور غیر معمولی مشقت کا باعث بن جاتا ہے، وہ حکم اس کے حق میں منتفی ہو جاتا ہے جسے قاعدۂ لا حرج کہتے ہیں۔ مثلاً وضو اور غسل میں پانی کے استعمال میں بیماری وغیرہ کی وجہ سے غیر معمولی مشقت درپیش ہوتو وضو اور غسل کا حکم منتفی ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک ممکن اور آسان عمل واجب ہو جاتا ہے، وہ تیمّم ہے یا بغیر کسی بدل کے وہ حکم منتفی ہو جاتا ہے۔ مثلاً بھوک سے مرنے کا خوف ہوتو مردار کھانے کی حرمت، پیاس سے مرنے کا خوف ہو اور پانی میسر نہ ہوتو شراب پینے کی حرمت منتفی ہو جاتی ہے اور اس قاعدۂ لاحرج سے بہت سے احکام کا استنباط کیا جاتا ہے۔

لٰکِنۡ یُّرِیۡدُ لِیُطَہِّرَکُمۡ: بلکہ اللہ تمہیں پاکیزہ بنانا چاہتا ہے۔ وضوء اور غسل کو پانی ہونے کی صورت میں واجب کر کے پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمّم واجب کر کے تم کو ظاہری و باطنی کچیل سے پاک بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے:

ان الوضوء یکفر ما قبلہ۔[1]	وضو بجا لانے سے اس سے پہلے (کے گناہوں) کا کفارہ ہو جاتا ہے۔

وَلِیُتِمَّ نِعۡمَتَہٗ عَلَیۡکُمۡ: وضو اور غسل کے ذریعے تمہیں پاک بنا کر تم پر اپنی نعمتوں کو پورا کرنا چاہتا ہے۔

لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ: وضوء اور غسل جیسی نعمت کی قدر دانی کرو اور شکر ادا کرو۔

احادیث

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے عہد عمر میں مسح خفین میں اختلاف کیا۔ لوگوں نے کہا: ہم نے خود رسول اللہؐ کو خفین (موزوں) پر مسح کرتے دیکھا ہے تو حضرت علی علیہ

----

[1] مجمع البیان

السلام نے فرمایا: سورہ مائدہ کے نزول سے پہلے یا بعد میں؟ کہا: یہ ہم نہیں جانتے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

و لکنی ادری ان النبی ترك المسح علی الخفین حین نزلت المائدۃ۔[1]	میں جانتا ہوں کہ رسول خداؐ نے موزوں پر مسح کرنا چھوڑ دیا تھا جب مائدہ نازل ہوا۔

واضح رہے کہ مسح علی الخفین اہل سنت کے ہاں ایک مسلمہ ہے اور صحابہ کی ایک کثیر تعداد کی روایت بھی موجود ہے۔ امامیہ کا مؤقف عترت طاہرہ کی اتباع کرتے ہوئے یہ ہے کہ مسح علی الخفین کا حکم سورہ مائدہ کی آیت وضو سے منسوخ ہوا ہے اور صحابہ کی روایت منسوخ ہونے سے قبل سے متعلق ہے۔

صاحب تفسیر المنار یہاں بجا طور پر پریشان ہوتے ہیں اور کہتے ہیں:

و العقبة الکؤود فی هذه المسئلة نسبة القول بعدم اجزاء المسح علی الخفین الی جمیع العترة المطهرة.[2]	اس مسئلہ میں نہایت مشکل رکاوٹ یہ ہے کہ مسح علی الخفین جائز نہ ہونے کی بات تمام عترت مطہرہ کی طرف منسوب ہے۔

بعد میں ایسے تاویلات ظنیہ بلکہ وہمیہ سے اس کی توجیہ کرتے ہیں جو کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہے۔

وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَ مِیۡثَاقَہُ الَّذِیۡ وَاثَقَکُمۡ بِہٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا ۫ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۷﴾	۷۔ اور اس نعمت کو یاد کرو جو اللہ نے تمہیں عطا کی ہے اور اس عہد و پیمان کو بھی جو اللہ نے تم سے لے رکھا ہے جب تم نے کہا تھا: ہم نے سنا اور مانا اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ: نعمت سے مراد دین کی نعمت ہے، جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ذریعے ہدایت فرمائی۔

۲۔ مِیۡثَاقَہُ الَّذِیۡ: عہد و میثاق سے مراد ممکن ہے وہ عہد ہوں جو رسول خدا (ص) نے مختلف مواقع پر مسلمانوں سے لیے اور ممکن ہے اس سے مراد وہ عہد و پیمان ہو جو اسلام قبول کرنے کے ضمن موجود ہے اور یہ بھی امکان ہے کہ فطرت و جبلت کا عہد و پیمان مراد ہو جس پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلق فرمایا ہے۔

---

[1] المیزان ۶: ۲۳۴　[2] المنار ۶: ۲۳۸

۳۔ اِذۡقُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا: یعنی جب اسلام کی دعوت دی گئی تو تم نے جو سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا ''ہم نے سنا اور اطاعت کی'' کہا۔ یہ ہے وہ میثاق وہ عہد جس کی پابندی کرنا لازمی ہے۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ لِلّٰہِ شُہَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ ۫ وَ لَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعۡدِلُوۡا ؕ اِعۡدِلُوۡا ۟ ہُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی ۫ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸﴾

۸۔ اے ایمان والو! اللہ کے لیے بھرپور قیام کرنے والے اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تمہاری بے انصافی کا سبب نہ بنے، (ہر حال میں) عدل کرو! یہی تقویٰ کے قریب ترین ہے اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ سورہ نساء آیت ۱۳۵ میں بھی عدل وانصاف کا ذکر آیا، البتہ وہاں قَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُہَدَآءَ لِلّٰہِ فرمایا، اور یہاں قَوّٰمِیۡنَ لِلّٰہِ شُہَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ فرمایا۔ فرق ان دو آیتوں کے سیاق کلام میں یہ ہے کہ وہاں نفسانی اور ذاتی ترجیحات عدل و انصاف کے لیے رکاوٹ بن سکتے تھے، اس لیے فرمایا: عدل کے قیام میں بھرپور کردار ادا کرو اور گواہی دیتے ہوئے اللہ کو سامنے رکھو۔

۲۔ وَلَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ : اور یہاں سیاق کلام یہ ہے کہ کسی گروہ کی دشمنی حائل بن سکتی ہے کہ انسان مشتعل ہو کر ان کے ساتھ عدل و انصاف نہ کرے۔ اس لیے یہاں فرمایا: اللہ ہی کے لیے بھرپور قیام کرنے والے بن جاؤ، یعنی تعمیل احکام میں تمہارا کردار اللہ کی خوشنودی پر مبنی ہونا چاہیے۔ کسی گروہ کی دشمنی اس راہ میں رکاوٹ نہ بنے اور گواہی دیتے ہوئے عدل و انصاف کو سامنے رکھو۔

۳۔ اِعۡدِلُوۡا ۟ ہُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی : انصاف، انسانی بنیادی حقوق میں شامل ہے۔ اس آیت سے یہ بات واضح ہوئی کہ اسلام عدل و انصاف کو انسانی بنیادی حقوق میں سے قرار دیتا ہے۔ اس میں مذہب، نژاد و دیگر امور کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو یہ حکم ملا کہ دشمن کے ساتھ بھی عدل و انصاف کے ساتھ پیش آؤ۔ کیونکہ جہاں وہ دشمن ہے، وہاں وہ انسان ہے اور وہ انسان پہلے ہے اور دشمن بعد میں۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام ظلم و ناانصافی سے منع کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فَاِنَّھُمْ صِنْفَان: اِمَّا اَخٌ لَکَ فِی الدِّیْنِ وَ اِمَّا نَظِیرٌ لَکَ فِی الْخَلْقِ۔[۱]

لوگوں کی دو قسمیں ہیں: یا تو تمہارا برادر دینی ہے یا تجھ جیسی مخلوق۔

---

[۱] نہج البلاغہ خ ۵۳۔ مالک اشترؒ کے نام عہد نامہ

جب بیت المال کی تقسیم میں سب کے ساتھ مساویانہ سلوک اختیار فرمایا تو لوگوں کے اعتراض پر آپؑ نے فرمایا:

لَو كَانَ الْمَالُ لِی لَسَوَّيْتُ بَيْنَهُمْ فَكَيْفَ وَ اِنَّمَا الْمَالُ مَالُ اللّٰهِ۔[1]

اگر یہ مال میرا ذاتی ہوتا تو بھی میں ان میں مساویانہ تقسیم کر دیتا۔ اب میں کس طرح مساویانہ تقسیم نہ کروں جب کہ مال اللہ کا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ عدل اور سخاوت میں سے کون بہتر ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا:

العَدْلُ يَضَعُ الْاُمُورَ مَوَاضِعَهَا وَ الْجُودُ يُخْرِجُهَا مِنْ جِهَتِهَا وَ الْعَدْلُ سَائِسٌ عَامٌّ وَ الْجُودُ عَارِضٌ خَاصٌّ فَالْعَدْلُ اَشْرَفُهُمَا وَ اَفْضَلُهُمَا۔[2]

عدل ہر چیز کو اس کے موقع محل پر رکھتا ہے اور سخاوت ہر چیز کو اس کی حد سے باہر کر دیتی ہے۔ عدل ایک اجتماعی نظام سے عبارت ہے جب کہ سخاوت ایک خصوصی مسئلہ ہے۔ لہٰذا عدل سخاوت سے اشرف و افضل ہے۔

رسالتمآب (ص) سے روایت ہے کہ آپ (ص) نے فرمایا:

بالعدل قامت السموات و الارض۔[3]　زمین و آسمان عدل و انصاف کی بنیاد پر قائم ہیں۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۹﴾

۹۔ اللہ نے ایمان والوں اور نیک اعمال بجا لانے والوں سے ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۰﴾

۱۰۔ اور جنہوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہ جہنمی ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: انسان اگر ایمان کے ساتھ عمل صالح بجا لاتا ہے اور اس کے ساتھ گناہ کا بھی ارتکاب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ مغفرت اور درگزر فرمائے گا اور اجر عظیم بھی عنایت فرمائے گا۔

۲۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا: جو لوگ تکذیب آیات کے ساتھ کفر اختیار کرتے ہیں تو ان کو ضرور جہنم میں

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۶　[2] نہج البلاغہ مکتوب ۴۳۷　[3] عوالی اللئالی ۴: ۱۰۲

جانا ہے۔ اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ اگر ایک شخص کفر کرتا ہے لیکن تکذیب آیات کی نوبت نہیں آتی۔ مثلاً وہ اسلام سے بالکل بے خبر ہے اور اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اس کے لیے ناممکن تھا تو ایسے لوگ کافر ضرور ہیں مگر تکذیب آیات کی نوبت نہیں آئی۔ ایسے لوگوں کو مستضعف کہتے ہیں اور یہ لوگ جہنمی نہیں ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾

۱۱۔ اے ایمان والو! اللہ کا یہ احسان یاد رکھو کہ جب ایک گروہ نے تم پر دست درازی کا ارادہ کیا تو اللہ نے تمہاری طرف (بڑھنے والے) ان کے ہاتھ روک دیے اور اللہ سے ڈرتے رہو اور مومنوں کو تو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

تفسیر آیات

یہ آیت کسی ایسے واقعہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے رسول خداؐ اور مسلمانوں کو دشمن کی ایک اہم اور خطرناک سازش سے بچایا۔ اس سلسلے میں کئی ایک واقعات نقل کیے جاتے ہیں اور شان نزول ان میں سے کون سا واقعہ ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ ممکن ہے اس آیت کا ان تمام حربوں کی طرف اشارہ ہو جو مشرکین نے اسلام کی نابودی کے لیے استعمال کیے ہیں۔

دشمن سے محفوظ رکھ کر پرامن زندگی کی فراہمی بہت بڑی نعمت ہے: ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ [1] کی تفسیر میں حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ نعمت سے مراد امن اور صحت ہے۔[2]

اس نعمت کی فراہمی پر تقویٰ اور توکل کا حکم اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس نعمت کی بقا تقویٰ اور توکل سے مربوط ہے۔ چنانچہ آنے والی دو آیات سے بھی یہی مفہوم ظاہر ہوتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ تقویٰ اور توکل نعمتوں کی بقا کے لیے ضمانت ہیں۔

۲۔ اسلام کی نشو و نما میں پیش آنے والے حالات و تاریخ بیان کرنے کے سے یہ عندیہ بھی ملتا ہے کہ راہ خدا میں خالصانہ کام کرنے والوں کے خلاف ہونے والی تمام سازشیں ناکام ہو جاتی ہیں۔

---

[1] ۱۰۲ تکاثر: ۸ [2] متشابہ القرآن ۲: ۱۰۵

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا ؕ وَ قَالَ اللّٰہُ اِنِّیْ مَعَکُمْ ؕ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّکٰوۃَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَ اَقْرَضْتُمُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُکَفِّرَنَّ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَ لَاُدْخِلَنَّکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ مِنْکُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ﴿۱۲﴾

۱۲۔ اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ہم نے ان میں سے بارہ نقیبوں کا تقرر کیا اور اللہ نے (ان سے) کہا: میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی اور اگر تم میرے رسولوں پر ایمان لاؤ اور ان کی مدد کرو اور اللہ کو قرض حسن دیتے رہو تو میں تمہارے گناہوں کو تم سے ضرور دور کر دوں گا اور تمہیں ایسے باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، پھر اس کے بعد تم میں سے جس کسی نے بھی کفر اختیار کیا بتحقیق وہ راہ راست سے بھٹک گیا۔

تشریح کلمات

نقیب: کسی قوم کے حالات جاننے والا۔ نگرانی کرنے والا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ: بنی اسرائیل سے عہد میثاق کا ذکر سورۃ بقرہ آیت ۸۳ میں آ گیا اور اس عہد و میثاق کی نوعیت بھی بیان فرمائی اور اس کے فقرے بھی بیان فرمائے:

لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ ۟ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ ؕ[1]

اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور (اپنے) والدین، قریب ترین رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں پر احسان کرو اور لوگوں سے حسن گفتار سے پیش آؤ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو پھر چند افراد کے سوا تم سب برگشتہ ہو گئے اور تم لوگ روگردانی کرنے والے ہو۔

۲۔ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا: بنی اسرائیل ۱۲ قبائل پر مشتمل تھے۔ ہر قبیلہ کے لیے ایک

----

[1] ۲ بقرہ: ۸۳

نقیب مقرر کیا گیا تھا جو اپنے قبیلے کے حالات پر نظر رکھے۔ بائبل سے بھی یہی مقدار سامنے آئی ہے کہ ان نقیبوں یا سرداروں کی تعداد بارہ تھی۔

ان بارہ سرداروں کے ذمے اپنے اپنے قبیلوں کی قیادت اور رہنمائی تھی۔ نبی اسرائیل کو ہدایت اور رہنمائی کے لیے رسول اولو العزم کے علاوہ قبائلی قیادت بھی فراہم فرمائی۔ جس طرح امت مسلمہ کے لیے اولوالامر کی قیادت فراہم فرمائی۔

۳۔ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ : یہ خطاب بظاہر نقیبوں سے ہے کہ اللہ کی حمایت اور تائید حاصل کرنے کے لیے اقامہ نماز، ادائے زکوٰۃ، رسولوں پر ایمان، رسولوں کی نصرت اور انفاق فی سبیل اللّٰہ کی شرط عائد فرمائی۔ رسولوں کی نصرت سے مراد آنے والے رسولوں کی خبر دینا اور اپنی نسلوں کو ان پر ایمان لانے کی وصیت کر جانا ہوسکتا ہے۔

۴۔ لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ : مذکورہ اعمال صالحہ کے دو نتیجوں کا ذکر ہے کہ ان اعمال صالحہ بجالانے پر گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا اور جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو جائیں گے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اعمال صالحہ کا جہاں ثواب ہے وہاں گناہوں کا کفارہ بھی ہے۔ جیسے فرمایا:

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ [1] اور نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں اور رات کے کچھ حصوں میں، نیکیاں بیشک برائیوں کو دور کر دیتی ہیں.

اور حدیث میں آیا ہے:

صلوۃ اللیل کفارۃ لما اجترح بالنہار۔ [2] رات کی نماز میں دن کے گناہوں کے لیے کفارہ ہے۔

۵۔ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ : یعنی اس عہد و میثاق اور بارہ نقیبوں کی رہنمائی فراہم ہونے کے بعد بھی اگر کفر کریں، ناشکری کریں، یہ راہ حق سے انحراف ہے۔

۶۔ سَوَآءَ السَّبِیْلِ : سیدھا راستہ ہی راہ نجات ہے۔ جس میں نہ زیادتی ہو، نہ کوتاہی۔

اہم نکات:

۱۔ اللہ اتمام حجت کے لیے پہلے ہدایت کے سارے وسائل فراہم فرماتا ہے۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّیْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَ جَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِیَةً ۚ ۱۳۔ پس ان کے عہد توڑنے پر ہم نے ان پر لعنت بھیجی اور ان کے دل سخت کر دیے، یہ

---

[1] ۱۱ ھود۔ ۱۱۴ [2] بحار الانوار۔ ۸۴: ۱۳۶

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳﴾

لوگ (کتاب اللہ کے) کلمات کو اپنی جگہ سے الٹ پھیر کر دیتے ہیں اور انہیں جو نصیحت کی گئی تھی وہ اس کا ایک حصہ بھول گئے اور آئے دن ان کی کسی خیانت پر آپ آگاہ ہو رہے ہیں البتہ ان میں سے تھوڑے لوگ ایسے نہیں ہیں، سو ان سے درگزر کیجیے اور معاف کر دیجیے، بے شک اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

تشریح کلمات

لَعَنَ: (ل ع ن) دور کر دینے کے معنوں میں ہے۔ یعنی رحمت سے دور۔

قٰسِيَةً: (ق س و) قساوت۔ پتھر کی سختی سے ماخوذ ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ: اس عہد کو توڑنے کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ رحمت خدا سے دور ہو گئے۔

۲۔ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً: اور رحمت خدا سے دور ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دلوں میں ہدایت اور حق کی باتیں اترنے کا راستہ بند ہو گیا۔ یعنی ان کے دلوں میں قساوت آگئی اور ان سے ایمان کی توفیق سلب ہو گئی۔

۳۔ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ: ان دو باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب اللہ میں تحریف کرنے کے بڑے جرم کا آسانی سے ارتکاب کرنا شروع کر دیا۔

۴۔ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ: اللہ کی طرف سے جو نصیحتیں ان کے لیے آئی تھیں، وہ بھی بھول گئے۔

۵۔ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ: ان کی خیانتوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔

۶۔ فَاعْفُ عَنْهُمْ: تاہم رسول اللہ (ص) کو یہ حکم ملتا ہے کہ ان سے درگزر کیجیے، توبہ کرنے یا جزیہ دینے کی صورت میں۔

ان سے درگزر کرنے اور معاف رکھنے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے: ان سے مت الجھو۔ ان کو اپنی حالت پر چھوڑ دو۔ جیسا کہ سورۃ البقرۃ آیت ۱۰۹ میں فرمایا:

فَاعۡفُوۡا وَ اصۡفَحُوۡا حَتّٰی یَاۡتِیَ اللّٰہُ بِاَمۡرِہٖ ....

پس آپ درگزر کریں اور نظر انداز کر دیں یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ بھیج دے....

اہم نکات

۱۔ ایک جرم دوسرے جرم کو جنم دیتا ہے۔

وَ مِنَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّا نَصٰرٰۤی اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَہُمۡ فَنَسُوۡا حَظًّا مِّمَّا ذُکِّرُوۡا بِہٖ ۪ فَاَغۡرَیۡنَا بَیۡنَہُمُ الۡعَدَاوَۃَ وَ الۡبَغۡضَآءَ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ ؕ وَ سَوۡفَ یُنَبِّئُہُمُ اللّٰہُ بِمَا کَانُوۡا یَصۡنَعُوۡنَ ﴿۱۴﴾

۱۴۔اور ہم نے ان لوگوں سے (بھی) عہد لیا تھا جو کہتے ہیں: ہم نصاریٰ ہیں، پس انہوں نے (بھی) اس نصیحت کا ایک حصہ فراموش کر دیا جو انہیں کی گئی تھی تو ہم نے قیامت تک کے لیے ان کے درمیان بغض و عداوت ڈال دی اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اللہ عنقریب انہیں جتا دے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمِنَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّا نَصٰرٰۤی: جو لوگ اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں۔ اس تعبیر میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ان کا دعویٰ ہے، حقیقت میں وہ نصاریٰ نہیں ہیں۔ یعنی ناصری، عیسیٰ (ع) کے تابع نہیں ہیں۔ اگر نصاریٰ کو حضرت عیسیٰ (ع) کے شہر الناصریہ کی طرف منسوب سمجھا جائے اور اگر یہ نصاریٰ نصرت سے ہے تو یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نصرت کرنے والے نہیں ہیں۔

۲۔ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَہُمۡ: جب یہ لوگ دین عیسیٰ (ع) پر قائم تھے، اس وقت عہد و میثاق لیا تھا۔ وہ میثاق باہمی امن و آشتی اور محبت و ہم آہنگی کا تھا یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کا تھا،

۳۔ فَنَسُوۡا حَظًّا مِّمَّا ذُکِّرُوۡا بِہٖ: تو ان لوگوں نے اس عہد و میثاق کے ایک حصے کو فراموش کیا، وہ حصہ توحید ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں نے توحید کو چھوڑ کر تثلیث کو اپنایا یا یہ حصہ رسول اللہ ؐ پر ایمان لانا ہو سکتا ہے، جو حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات ایک اہم حصہ تھا۔

۴۔ فَاَغۡرَیۡنَا بَیۡنَہُمُ الۡعَدَاوَۃَ: اللہ نے ان کے دلوں سے خود ان کی اپنی شامت اعمال کی وجہ سے جذبہ محبت ختم کر کے اس کی جگہ باہمی عداوت اور دشمنی ڈال دی۔ چنانچہ مسیحیت میں اختلافات رونما ہوئے

اور ایک دوسرے کے خلاف عداوت و نفرت عام ہو گئی۔

۵۔ وَسَوۡفَ یُنَبِّئُہُمُ اللّٰہُ: قیامت کے دن ان کے اعمال اور ان کی ان خلاف ورزیوں کے اثرات، ان کے سامنے رکھ دیے جائیں گے۔ وہاں انہیں نظر آئے گا کہ وہ کن سنگین جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ یہود و نصاریٰ پر اللہ کی نعمت، ان کے ساتھ عہد و میثاق کا ذکر کرنے سے پہلے خود مسلمانوں پر اللہ کا جو احسان ہوا ہے، اس کا ذکر کیا، تاکہ مسلمان یہ سمجھ لیں کہ اللہ کی کائناتی سنت کیا ہے۔ وہ قومیں جو اللہ کی نعمتوں کے بارے میں ناشکری ہوئی ہیں اور اللہ کے عہد و پیمان کے بارے میں بدعہدی کرتی ہیں، ان کا انجام کیا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے اس میں بہت بڑی عبرت ہے۔

یٰۤاَہۡلَ الۡکِتٰبِ قَدۡ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمۡ کَثِیۡرًا مِّمَّا کُنۡتُمۡ تُخۡفُوۡنَ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ یَعۡفُوۡا عَنۡ کَثِیۡرٍ ۬ؕ قَدۡ جَآءَکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ نُوۡرٌ وَّ کِتٰبٌ مُّبِیۡنٌ ﴿ۙ۱۵﴾

یَّہۡدِیۡ بِہِ اللّٰہُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَہٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ یُخۡرِجُہُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ بِاِذۡنِہٖ وَ یَہۡدِیۡہِمۡ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۱۶﴾

۱۵۔ اے اہل کتاب! ہمارے رسول تمہارے پاس کتاب (خدا) کی وہ بہت سی باتیں تمہارے لیے کھول کر بیان کرنے کے لیے آئے ہیں جن پر تم پردہ ڈالتے رہے ہو اور بہت سی باتوں سے درگزر بھی کرتے ہیں، بتحقیق تمہارے پاس اللہ کی جانب سے نور اور روشن کتاب آ چکی ہے،

۱۶۔ جس کے ذریعے اللہ ان لوگوں کو امن و سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے، جو اس کی رضا کے طالب ہیں اور وہ اپنے اذن سے انہیں ظلمتوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے اور انہیں راہ راست کی رہنمائی فرماتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قَدۡ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلُنَا: اہل کتاب کے علماء نے دینی کتابوں میں جو تحریف و تبدیلی کی ہے، اس کے

سلسلے میں اس سے قبل مختلف مقامات پر گفتگو تفصیل سے ہوئی۔اس آیت میں ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ ہے۔ وہ یہ کہ رسول کریم (ص) ایک ناخواندہ قوم سے تعلق رکھنے اور کسی انسانی مکتب میں تعلیم حاصل نہ کرنے کے باوجود اور باوجود اس کے کہ حجاز میں کبھی بھی کوئی تعلیمی مرکز نہ رہا اور اس ماحول میں تعلیم کا کوئی ذریعہ ہی نہ تھا، ان سب باتوں کے باوجود یہ رسول (ص) توریت و انجیل کی وہ باتیں جو ان کے علماء چھپاتے تھے، ان کو کھول کر اور توریت و انجیل کے حوالے سے بیان فرماتے تھے۔ اسی لیے بہت سے علمائے اہل کتاب نے ایمان قبول کیا کہ انہیں یقین حاصل ہو گیا کہ ان باتوں پر علم حاصل کرنے کا کوئی دنیاوی ذریعہ محمدؐ کے پاس نہ تھا، نہ اب ہے۔اس کے باوجود ان تمام باتوں کی صحیح نشاندہی کرتے ہیں جن کو یہ لوگ چھپاتے رہے۔ یہ رسولؐ کی رسالت کی حقانیت پر ایک بین دلیل ہے۔

۲۔ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ : رسولؐ بہت سی ایسی باتوں میں درگزر کرتے ہیں، جن کا تعلق اس امت سے نہیں ہے۔ اس سے اس ممکنہ سوال کا جواب بھی آ گیا جو کوئی اٹھا سکتا ہے کہ اہل کتاب نے تو ان باتوں کے علاوہ بھی بہت سی باتوں پر پردہ ڈالا اور چھپایا ہے جن کو رسول اللہؐ نے کھول کر بیان نہیں کیا۔

۳۔ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ : قرآن مجید کی اس آیت میں نور اور کتاب مبین کی تعبیر سے یاد کیا اور فرمایا کہ تمہاری طرف نور آیا ہے۔ممکن ہے نور سے مراد رسول کریمؐ ہوں اور کتاب مبین سے مراد قرآن کریم۔

۴۔ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ : اللہ کی رضایت۔قرآن کریم کی خصوصیت یہ بیان کی گئی کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی رضا کے طالب لوگوں کو ہدایت فراہم فرماتی ہے۔حقیقی سعادت و نجات اور تمام امور کا دار و مدار رضایت الٰہی پر ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ [1]	اور اللہ کی طرف سے خوشنودی تو ان سب سے بڑھ کر ہے، یہی تو بڑی کامیابی ہے۔

۵۔ سُبُلَ السَّلٰمِ : امن و سلامتی کی راہیں، جس میں داخل ہونے کے بعد ہی صحیح معنوں میں انسان کو امن ملتا ہے۔فرمایا:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الْاَمْنُ ... [2]	جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے ملوث نہیں کیا، یہی لوگ امن میں ہیں۔

۶۔ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ : کفر و شرک کی سیاہ تاریکی سے ایمان کی روشنی کی طرف لے جانے والا واحد ذریعہ رضایت الٰہی ہے۔ بِاِذْنِهٖ، بعلمہ یا بلطفہ یعنی اذن سے مراد علم ہے یا لطف۔

۷۔ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ : یعنی دین اسلام کی طرف یا جنت کی طرف ان کی رہنمائی

---

[1] ۹ توبہ: ۷۲　　[2] ۶ انعام: ۸۲

کرے گا۔

اہم نکات

۱۔ رسول کی حقانیت پر ایک بین دلیل یہ ہے کہ رسول(ص) بشری وسائل کے بغیر توریت و انجیل کے احکام و علوم سے واقف تھے۔

۲۔ رضائے الٰہی ذریعہ امن و نجات ہے۔ مؤمن کے لیے رضائے الٰہی سے بڑھ کر کوئی اور چیز اہم نہیں ہے۔

لَقَدۡ کَفَرَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡمَسِیۡحُ ابۡنُ مَرۡیَمَ ؕ قُلۡ فَمَنۡ یَّمۡلِکُ مِنَ اللّٰہِ شَیۡئًا اِنۡ اَرَادَ اَنۡ یُّہۡلِکَ الۡمَسِیۡحَ ابۡنَ مَرۡیَمَ وَ اُمَّہٗ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا ؕ وَ لِلّٰہِ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا بَیۡنَہُمَا ؕ یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ بتحقیق وہ لوگ کافر ہو گئے جو کہتے ہیں: عیسیٰ بن مریم ہی خدا ہے، ان سے کہدیجئے: اللہ اگر مسیح بن مریم، ان کی ماں اور تمام اہل زمین کو ہلاک کر دینا چاہے تو اس کے آگے کس کا بس چل سکتا ہے؟ اور اللہ تو آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا مالک ہے، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

تفسیر آیات

لَقَدۡ کَفَرَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡمَسِیۡحُ: تاریخ کے مختلف ادوار میں حضرت عیسیٰ (ع) کے بارے میں مسیحیوں کے نظریات ٹوٹتے بنتے رہے:

i۔ اللہ نے حضرت مسیح (ع) میں حلول فرمایا، اس طرح حضرت مسیح (ع) ہی خدا ہیں۔

ii۔ حضرت مسیح (ع) تین مستقل خداؤں میں سے ایک ہیں اور ابن کے مقام پر فائز ہیں۔

iii۔ وہ انسان بھی ہیں اور خدا بھی۔ وہ اللہ سے جدا بھی ہیں اور ایک بھی۔

مسیحیت کی اصلاحی تحریک کے نتیجے میں جو مذہب وجود میں آیا (پروٹسٹنٹ) وہ بھی اسی عقیدے پر قائم ہے کہ مسیح (ع) اور اللہ ایک جیسے ہیں۔ دونوں ازلی، غیر مخلوق، غیر محدود ہونے میں برابر ہیں۔

اس آیت میں اس نظریے کی طرف اشارہ ہے، جو مسیح (ع) اور اللہ میں عینیت کا قائل ہے۔ اس

نظریے کی رد میں فرمایا:

i۔ اگر مسیح (ع) ہی خدا ہے تو اسے کسی اور ذات کی قہاریت کے تحت مغلوب نہیں ہونا چاہیے، جب کہ وہ مغلوب ہے اور اللہ اسے ہلاک کر سکتا ہے۔

ii۔ قُلۡ فَمَنۡ یَّمۡلِکُ: اس کے آگے کس کا بس چل سکتا ہے؟ اس جملے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب تمام اہل ارض پر اللہ کی سلطنت ہے تو مسیح (ع) اگر خدا ہے تو اس کی سلطنت کس پر ہے؟ چنانچہ انجیل متی ۲۷: ۴۶ کے مطابق خود حضرت مسیح (ع) کا بھی بس نہیں چل رہا تھا۔ چنانچہ جب سولی چڑھ رہے تھے، فرمایا: خدایا! خدایا! تو نے مجھے اس حال پر کیوں چھوڑا؟

iii۔ تمام اہل ارض، مسیح (ع) اور ان کی ماں پر جب اللہ کی سلطنت قائم ہے تو مسیح (ع) اور مریم بھی دوسری مخلوقات کی طرح اللہ کے محتاج بندے ثابت ہوئے۔

iv۔ مسیح (ع) کے ساتھ ابن مریم کا ذکر خود ایک رد ہے اس نظریے کی کہ آپؑ ابن اللّٰہ ہیں۔

v۔ وَلِلّٰہِ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ: یہ جملہ اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ کے آگے کسی کا بس نہیں چل سکتا ہے کیونکہ آسمانوں اور زمین اور کچھ ان کے درمیان میں ہیں، سب اللہ کی ملکیت میں ہیں کسی اور کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

vi۔ یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ: ملکیت کی دلیل یہ ہے کہ وہ جو چاہتا ہے خلق فرماتا ہے۔ یعنی کل کائنات پر اللہ کی ملکیت کی نوعیت، قدرت تخلیق ہے۔

وَ قَالَتِ الۡیَھُوۡدُ وَ النَّصٰرٰی نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰہِ وَ اَحِبَّآؤُہٗ ؕ قُلۡ فَلِمَ یُعَذِّبُکُمۡ بِذُنُوۡبِکُمۡ ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ بَشَرٌ مِّمَّنۡ خَلَقَ ؕ یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ لِلّٰہِ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا بَیۡنَہُمَا ۫ وَ اِلَیۡہِ الۡمَصِیۡرُ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ اور یہود و نصاریٰ کہتے ہیں: ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں، کہدیجئے پھر وہ تمہارے گناہوں پر تمہیں عذاب کیوں دیتا ہے؟ بلکہ تم بھی اس کی مخلوقات میں سے بشر ہو، وہ جسے چاہے بخش دے اور جسے چاہے عذاب دے اور آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان موجود ہے سب پر اللہ کی حکومت ہے اور (سب کو) اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یہودی قوم اس بات کو مسلمات میں شامل کرتی ہے کہ وہ اللہ کی برگزیدہ قوم ہے، بلکہ قرآنی تعبیر کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں کا ثبوت موجودہ بائبل تک میں موجود ہے۔ خروج ۴: ۲۲ میں آیا ہے: خدا نے فرمایا کہ اسرائیل میرا بیٹا بلکہ پلوٹھا ہے۔

۲۔ مسیحی بھی اپنے کو ابناء اللّٰہ، اللہ کے بیٹے سمجھتے ہیں۔ چنانچہ عہد جدید میں آیا ہے: امن و امان فراہم کرنے والوں کو بشارت ہو کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں۔ انجیل متی ۵: ۹ اور بولس نے اہل رومیہ کے نام اپنے پیغام میں کہا: جو بھی روح اللہ کی اطاعت میں آتا ہے، وہ اللہ کا بیٹا ہے۔ ۸: ۱۴۔

اللہ تعالیٰ نے اس خرافی عقیدے کے بارے میں فرمایا: اگر تم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہو تو باپ اپنے بیٹے کو، محبّ اپنے محبوب کو سزا میں نہیں ڈالتا بلکہ محبوب کی غلطیوں سے چشم پوشی کرتا ہے، جب کہ یہود و نصاریٰ نے جن جرائم کا ارتکاب کیا ہے، اس کی سزا وہ دنیا میں بھگت چکے ہیں۔ ان پر ظالموں کا مسلط ہونا، ان کی مملکت کا تاراج ہونا اور کئی بار ذلت وخواری کے ساتھ اسیر اعداء ہونا وغیرہ کس سے پوشیدہ ہے۔

۳۔ بَلۡ اَنۡتُمۡ بَشَرٌ مِّمَّنۡ خَلَقَ : اس سے ابناء اللّٰہ ہونے کی قطعی رد ہو گئی ہے، کیونکہ ابناء اللّٰہ بشر نہیں ہوں گے، کیونکہ اللہ کی ذات بشر سے بالاتر ہے۔ بفرض محال اگر اس کا کوئی بیٹا ہے تو اسے بشر سے بالاتر ہونا چاہیے۔

۴۔ عذاب و مغفرت کے بارے میں فرمایا کہ اس کا دار و مدار کسی نژاد پر نہیں ہے بلکہ مشیت الٰہی پر ہے۔ یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ : اور مشیت الٰہی اہلیت وقابلیت پر مبنی ہے اور اہلیت عمل سے مربوط ہے۔

اہم نکات

۱۔ یہ کلیہ جہاں یہود و نصاریٰ پر صادق آتا ہے، وہاں دوسرے لوگوں پر بھی صادق آتا ہے کہ کوئی گروہ، نژاد یا گروہی بنیاد پر عذاب الٰہی و قانون خداوندی سے مستثنیٰ نہیں ہے بلکہ اس کا قانون سب کے لیے یکساں ہے: اَفَمَنۡ کَانَ مُؤۡمِنًا کَمَنۡ کَانَ فَاسِقًا ؕ لَا یَسۡتَوٗنَ ۔[1] کیا مومن اور فاسق یکساں ہوں گے؟ ہرگز نہیں۔

یٰۤاَهۡلَ الۡکِتٰبِ قَدۡ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمۡ عَلٰی فَتۡرَۃٍ

۱۹۔ اے اہل کتاب! ہمارے رسول بیان (احکام) کے لیے رسولوں کی آمد کا سلسلہ ایک مدت

---

[1] ۳۲ سجدہ: ۱۸

مِّنَ الرُّسُلِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا جَآءَنَا مِنۡۢ بَشِیۡرٍ وَّ لَا نَذِیۡرٍ ۫ فَقَدۡ جَآءَکُمۡ بَشِیۡرٌ وَّ نَذِیۡرٌ ؕ وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۹﴾

تک بند رہنے کے بعد تمہارے پاس آئے ہیں تا کہ تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور تنبیہ کرنے والا نہیں آیا، پس اب تمہارے پاس وہ بشارت دینے والا اور تنبیہ کرنے والا آ گیا ہے اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

تشریح کلمات

فَتۡرَۃٍ: (ف ت ر) فتور ماند پڑنے کے معنوں میں ہے اور اسی سے کسی سلسلے کے منقطع ہونے کے لیے بھی فَتۡرَۃٍ استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

وہ رسولؐ آ گیا، جس کی آمد کی بشارت توریت اور انجیل نے دی ہے اور تحریف و تغییر کے باوجود آج کل کے نسخوں میں بھی مختلف مقامات پر اس بشارت کی گواہی مل جاتی ہے۔

چونکہ یہ رسولؐ، رسولوں کی آمد کا سلسلہ ایک مدت تک منقطع ہونے کے بعد آ رہا ہے اور اس دوران وسیع پیمانے پر تحریف و تغیر واقع ہوا ہے، یہ رسول ان حقائق کو کھول کر بیان کرے گا جن میں تحریف واقع ہوئی ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایک مدت گزرنے کے بعد ایک ناخواندہ قوم سے رسولؐ ان حقائق کو بیان کرتا ہے جو صدیوں قبل حضرت عیسیٰ (ع) نے بیان کیے ہیں۔ یہ خود اپنی جگہ رسولؐ کی حقانیت پر ایک دلیل ہے۔

اتمام حجت کے مسئلے پر اس سے قبل گفتگو ہو چکی ہے۔

احادیث

کافی میں ابو ربیع سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں:

ہم نے امام محمد باقر علیہ السلام کے ساتھ اس سال حج کیا، جس میں ہشام بن عبد الملک نے حج کیا۔ اس کے ساتھ حضرت عمر کا غلام نافع بھی تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ امام محمد باقر علیہ السلام کے گرد لوگوں کا اژدہام ہے تو نافع نے کہا یہ کون ہے، جس پر لوگوں کا اس قدر اژدہام ہے۔ کہا: یہ اہل کوفہ کے نبی محمد بن علی ہیں۔ نافع نے کہا: میں اس سے ایسے مسائل پوچھوں گا جن کا جواب نبی یا نبی کے بیٹے یا نبی کے وصی کے علاوہ کوئی اور

نہیں دے سکتا۔ ہشام نے کہا: جاؤ اور اس سے سوال کرو۔ شاید تم اسے شرمندہ کر سکو..... اس نے سوال کیا کہ حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد کے درمیان کتنے سال کا فاصلہ ہے۔ فرمایا: تمہاری رائے کے مطابق جواب دوں یا اپنی رائے کے مطابق۔ اس نے کہا دونوں کی رائے کے مطابق۔ فرمایا: تمہارے نزدیک چھ سو سال اور میرے نزدیک پانچ سو سال ہے.....[1]

اہم نکات

امت مسلمہ کو چند حقائق سے آگاہ کرنا مقصود ہے:

i۔ اول یہ کہ یہ رسولؐ سلسلۂ رسالت ایک مدت تک منقطع ہونے کے بعد آیا۔

ii۔ دوم یہ کہ پانچ صدیاں قدیم تحریف شدہ حقائق کو بیان کرنا خود اپنی جگہ ایک معجزہ ہے۔

iii۔ سوم یہ کہ اتمام حجت کے لیے آیا ہے۔ یہ اتمام حجت اہل کتاب کے لیے بھی اور باقی لوگوں کے لیے بھی ہے۔

وَ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖ یٰقَوۡمِ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ جَعَلَ فِیۡکُمۡ اَنۡۢبِیَآءَ وَ جَعَلَکُمۡ مُّلُوۡکًا ٭ۖ وَّ اٰتٰىکُمۡ مَّا لَمۡ یُؤۡتِ اَحَدًا مِّنَ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲۰﴾

۲۰۔ اور (وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! تم اللہ کی اس نعمت کو یاد رکھو جو اس نے تمہیں عنایت کی ہے، اس نے تم میں انبیاء پیدا کیے، تمہیں بادشاہ بنا دیا اور تمہیں وہ کچھ دیا جو اس نے عالمین میں کسی کو نہیں دیا۔

تفسیر آیات

بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے چند نعمتوں کا ذکر ہے:

i۔ اِذۡ جَعَلَ فِیۡکُمۡ اَنۡۢبِیَآءَ: بنی اسرائیل میں انبیاء پیدا کیے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہم السلام جیسے جلیل القدر انبیاء اس قوم میں پیدا ہوئے۔ کسی اور قوم سے اس تعداد میں انبیاء پیدا نہیں ہوئے، جس قدر بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے ہیں۔

ii۔ وَ جَعَلَکُمۡ مُّلُوۡکًا: ملوك بادشاہوں کے معنوں میں لیا جائے تو بنی اسرائیل میں حضرت

---

[1] الکافی ۸: ۳۱۱۲۰

یوسف، حضرت سلیمان علیہا السلام اور حضرت طالوت و دیگر بادشاہ حکمران رہے ہیں اور اگر ملوک سے مراد خودمختاری لیا جائے تو بھی بنی اسرائیل کو ایک لمبی مدت تک ظلم و ذلت سے آزاد ہو کر خودمختاری نصیب ہوئی ہے۔

iii۔ وَّ اٰتٰىكُمۡ : بنی اسرائیل کو وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو نہیں دیا گیا۔ مثلاً دریا کا شق ہونا، من و سلویٰ کا نازل ہونا اور پتھر سے چشمے پھوٹنا وغیرہ ایسی باتیں ہیں جو صرف بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص ہیں۔

بنی اسرائیل کے لیے ان عظیم نعمتوں کا ذکر تمہید ہے اس واقعہ کے ذکر کی، جس میں ان تمام نعمتوں کے باوجود بنی اسرائیل نے نافرمانی کی اور اپنے نبی کے ساتھ مجرمانہ سلوک کیا۔

يٰقَوۡمِ ادۡخُلُوا الۡاَرۡضَ الۡمُقَدَّسَةَ الَّتِىۡ كَتَبَ اللّٰهُ لَـكُمۡ وَلَا تَرۡتَدُّوۡا عَلٰٓى اَدۡبَارِكُمۡ فَتَـنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِيۡنَ ﴿۲۱﴾	۲۱۔اے میری قوم! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے مقرر فرمائی ہے اور پیچھے نہ ہٹنا ورنہ خسارے میں رہو گے۔
قَالُوۡا يٰمُوۡسٰٓى اِنَّ فِيۡهَا قَوۡمًا جَبَّارِيۡنَ ‌ۖ وَاِنَّا لَنۡ نَّدۡخُلَهَا حَتّٰى يَخۡرُجُوۡا مِنۡهَا‌ ۚ فَاِنۡ يَّخۡرُجُوۡا مِنۡهَا فَاِنَّا دٰخِلُوۡنَ ﴿۲۲﴾	۲۲۔ وہ کہنے لگے: اے موسیٰ! وہاں تو ایک طاقتور قوم آباد ہے اور وہ جب تک اس (زمین) سے نکل نہ جائے ہم تو اس میں ہرگز داخل نہیں ہوں گے، ہاں اگر وہ وہاں سے نکل جائیں تو ہم داخل ہو جائیں گے۔
قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيۡنَ يَخَافُوۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمَا ادۡخُلُوۡا عَلَيۡهِمُ الۡبَابَ‌ ۚ فَاِذَا دَخَلۡتُمُوۡهُ فَاِنَّكُمۡ غٰلِبُوۡنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوۡۤا اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۲۳﴾	۲۳۔خوف (خدا) رکھنے والوں میں سے دو اشخاص جنہیں اللہ نے اپنے نعمت سے نوازا تھا کہنے لگے: دروازے کی طرف سے ان پر حملہ کردو، پس جب تم اس میں داخل ہو جاؤ گے تو فتح یقیناً تمہاری ہوگی اور اگر تم مومن ہو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔
قَالُوۡا يٰمُوۡسٰٓى اِنَّا لَنۡ نَّدۡخُلَهَاۤ	۲۴۔ وہ کہنے لگے: اے موسیٰ! جب تک وہ وہاں

اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾

موجود ہیں ہم ہرگز اس میں داخل نہ ہوں گے آپ اور آپ کا پروردگار جا کر جنگ کریں ہم یہیں بیٹھے رہیں گے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۵﴾

۲۵۔ موسیٰ نے کہا: پروردگارا! میرے اختیار میں میری اپنی ذات اور میرے بھائی کے سوا کچھ نہیں ہے، لہٰذا تو ہم میں اور اس فاسق قوم میں جدائی ڈال دے۔

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾

۲۶۔(اللہ) نے فرمایا: وہ ملک ان پر چالیس سال تک حرام رہے گا، وہ زمین میں سرگرداں پھریں گے لہٰذا آپ اس فاسق قوم کے بارے میں افسوس نہ کیجیے۔

تفسیر آیات

۱۔ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ : ارض مقدس سے مراد بیت المقدس ہی کی سرزمین ہو سکتی ہے، جہاں مسجد اقصی واقع ہے، جو حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کی سرزمین ہے۔ چنانچہ توریت میں بھی اسی مضمون پر صراحت موجود ہے:

> تو اس سرزمین میں جس کی بابت خداوند نے تیرے باپ دادوں، ابرہام، اضحاک اور یعقوب سے قسم کھا کر کہا کہ اسے میں تمہیں دوں گا، سکونت کرے۔[1]

بائبل اور دیگر حوالوں سے اس واقعہ کی تفصیل اس طرح ہے:

> حضرت موسیٰ (ع) مصر سے نکلنے کے بعد اپنی قوم کے ہمراہ دشت فاران یعنی جزیرہ نمائے سینا میں مقیم رہے اور اپنی آبائی مقدس سرزمین فلسطین کو فتح کرنا حکم الٰہی تھا اور ان کی منزل، چنانچہ حضرت موسیٰ (ع) نے فلسطین پر فوج کشی سے پہلے اپنی قوم کے ہر قبیلے میں سے ایک سردار کا انتخاب کر کے فلسطین کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے یا بقول توریت جاسوسی کے لیے بھیجا کہ اس زمین کو دیکھو کہ کیسی ہے اور وہاں بسنے والے لوگ کیسے ہیں؟ طاقتور ہیں یا کمزور، تھوڑے ہیں یا بہت؟ اور وہ زمین جس میں وہ رہتے ہیں کیسی ہے؟ اچھی ہے یا بری اور وہ شہر جن میں وہ بستے ہیں، کیسے ہیں؟ خیموں میں ہیں یا قلعوں میں؟ اور زمین کیسی ہے، زرخیز یا بنجر؟ اس میں درخت ہیں یا نہیں؟[2]

---

۱ استثنا ۳۰: ۲۰ ۲ گنتی ۱۳: ۲۰

۲۔ قَالُوۡا یٰمُوۡسٰۤی اِنَّ فِیۡہَا قَوۡمًا جَبَّارِیۡنَ: ان کی تعداد ۱۲ تھی۔ ان میں سے دس نے آ کر یہ مبالغہ آمیز رپورٹ دی کہ فلسطین کے عمالقہ نہایت ہی طاقتور ہیں۔ عمالقہ اسرائیل کے پرانے حریف اور جنگجو قوم تھے، ان کے ساتھ اسرائیلی قوم کی خونریز جنگوں کی داستانوں سے ان کی تاریخ پر ہے۔ ان لوگوں نے کہا: ہم میں زور نہیں کہ ہم ان لوگوں پر چڑھیں، کیونکہ وہ ہم لوگوں سے زیادہ زور آور ہیں۔[1]

یہ زمین جس کی جاسوسی میں ہم گئے تھے، ایک زمین ہے جو اپنے بسنے والوں کو نگلتی ہے اور سب لوگ جنہیں ہم نے دیکھا، بڑے قدآور ہیں اور ہم نے وہاں جباروں کے ہاں بن عناق کو، جو جباروں کی نسل سے ہے، دیکھا اور ہم اپنی نظروں میں ان کے سامنے ایسے ہیں جیسے ٹڈے۔[2]

یہ سن کر پوری جماعت نے گریہ و زاری شروع کر دی اور کہا: اے کاش! ہم مصر میں ہی مر جاتے یا اسی بیابان میں فنا ہو جاتے۔ خداوند کس لیے ہم کو اس زمین میں لایا کہ تلوار سے گر جائیں۔ کیوں نہ ہم اپنے میں سے ایک کو بادشاہ بنائیں اور اس کی سربراہی میں مصر کو واپس چلیں۔

۳۔ قَالَ رَجُلٰنِ: یہ باتیں سن کر یوشع بن نون اور کالب بن یفنہ نے اظہار بیزاری کیا اور کہا: وہ زمین جس پر ہمارا گزر ہوا، نہایت خوب زمین ہے۔ اگر خدا ہم سے راضی ہے تو ہم کو اس زمین پر لے جائے گا۔ تم خدا سے بغاوت نہ کرو اور نہ تم اس زمین کے لوگوں سے ڈرو، وہ تو ہماری خوراک ہیں۔

۴۔ وَاِنَّا لَنۡ نَّدۡخُلَہَا: یہ باتیں سن کر اسرائیل کے سب لوگوں نے یہ جواب دیا: ان دونوں کو سنگسار کر دو۔ ہم اس سرزمین میں ہرگز داخل نہ ہوں گے۔ انہوں نے حضرت موسیٰ سے مطالبہ کیا کہ آپ خود اپنے رب کے ساتھ جائیں اور ان لوگوں سے لڑیں، ہم یہاں بیٹھے رہیں گے۔

۵۔ قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ لَاۤ اَمۡلِکُ اِلَّا نَفۡسِیۡ وَاَخِیۡ: حضرت موسیٰ نے کہا: میرے مالک میرا تو صرف اپنی جان اور اپنے بھائی پر حکم چلتا ہے۔ یعنی میری قوم میری اطاعت نہیں کر رہی ہے، نافرماں قوم ہے۔

۶۔ فَافۡرُقۡ بَیۡنَنَا وَبَیۡنَ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِیۡنَ: اس دعا میں حضرت موسیٰ (ع) اپنی فاسق اور گستاخ قوم سے جدائی طلب کر رہے ہیں۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ کوئی ایسا فیصلہ فرمائے کہ اس قوم کا فسق نمایاں ہو جائے۔ چنانچہ اگلی آیت میں فرمایا: ان کو چالیس سال سرگردانی کی سزا دے دی گئی ہے۔

۷۔ قَالَ فَاِنَّہَا مُحَرَّمَۃٌ عَلَیۡہِمۡ اَرۡبَعِیۡنَ سَنَۃً: اس نافرمانی اور اللہ تعالیٰ کی شان میں جسارت کی یہ سزا ملی کہ یہ قوم چالیس سال دشت فاران میں سرگرداں رہے گی اور فلسطین کی سرزمین کو فتح کرنے سے پہلے

---

[1] گنتی ۱۳: ۲۳　[2] گنتی ۱۲: ۳۳

اس وقت کے تمام نافرمان لوگ مر جائیں گے، سوائے یوشع اور کالب کے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پورے چالیس سال اس دشت میں بے سر و سامان پھرتے رہے اور شرق اردن فتح ہونے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتقال ہوا اور حضرت یوشع کے عہد خلافت میں بنی اسرائیل فلسطین کو فتح کرنے پر قادر ہوئے۔

اہم نکات

۱۔ تمام اقوام و امم کے ساتھ سنت الٰہیہ اور کائناتی قانون کا بیان مقصود ہے کہ قوموں کا زوال و ترقی، عزت و فضیلت اور ذلت و خواری، ان کی اپنے شامت اعمال کی وجہ سے ہے اور اس کی ایک واضح ترین مثال اور عبرتناک ترین درس بنی اسرائیل کا یہ واقعہ ہے۔

وَ اتۡلُ عَلَیۡہِمۡ نَبَاَ ابۡنَیۡ اٰدَمَ بِالۡحَقِّ ۘ اِذۡ قَرَّبَا قُرۡبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنۡ اَحَدِہِمَا وَ لَمۡ یُتَقَبَّلۡ مِنَ الۡاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقۡتُلَنَّکَ ؕ قَالَ اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ اور آپ انہیں آدم کے دونوں بیٹوں کا حقیقی قصہ سنائیں جب ان دونوں نے قربانی پیش کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول ہوئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی تو اس نے کہا: میں تجھے ضرور قتل کروں گا، (پہلے نے) کہا: اللہ تو صرف تقویٰ رکھنے والوں سے قبول کرتا ہے۔

لَئِنۡۢ بَسَطۡتَّ اِلَیَّ یَدَکَ لِتَقۡتُلَنِیۡ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیۡکَ لِاَقۡتُلَکَ ۚ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لیے اپنا ہاتھ تیری طرف بڑھانے والا نہیں ہوں میں تو عالمین کے پروردگار اللہ سے ڈرتا ہوں۔

اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ تَبُوۡٓاَ بِاِثۡمِیۡ وَ اِثۡمِکَ فَتَکُوۡنَ مِنۡ اَصۡحٰبِ النَّارِ ۚ وَ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیۡنَ ﴿ۚ۲۹﴾

۲۹۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے اور اپنے گناہ میں تم ہی پکڑے جاؤ اور دوزخی بن کر رہ جاؤ اور ظالموں کی یہی سزا ہے۔

فَطَوَّعَتۡ لَہٗ نَفۡسُہٗ قَتۡلَ اَخِیۡہِ فَقَتَلَہٗ فَاَصۡبَحَ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ چنانچہ اس کے نفس نے اسے اپنے بھائی کے قتل کی ترغیب دی اور اسے قتل کر ہی دیا پس وہ خسارہ اٹھانے والوں میں (شامل) ہو گیا۔

فَبَعَثَ اللّٰہُ غُرَابًا یَّبۡحَثُ فِی

۳۱۔ پھر اللہ نے ایک کوے کو بھیجا جو زمین کھودنے

الۡاَرۡضِ لِیُرِیَهٗ كَیۡفَ یُوَارِیۡ سَوۡءَةَ اَخِیۡهِ ؕ قَالَ یٰوَیۡلَتٰۤی اَعَجَزۡتُ اَنۡ اَكُوۡنَ مِثۡلَ هٰذَا الۡغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوۡءَةَ اَخِیۡ ۚ فَاَصۡبَحَ مِنَ النّٰدِمِیۡنَ ﴿۳۱﴾	لگا تاکہ اسے دکھادے کہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھپائے، کہنے لگا: افسوس مجھ پر کہ میں اس کوے کے برابر بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپا دیتا، پس اس کے بعد اسے بڑی ندامت ہوئی۔

تشریح کلمات

قُرۡبَان: (ق ر ب) ہر وہ چیز جس سے اللہ کی قرب جوئی کی جائے اور عرف میں قربان ذبیحہ کو کہتے ہیں اور بادشاہ کے ہم نشین کو قربان الملك کہتے ہیں۔

غُرَاب: (غ ر ب) کوا۔ اصل میں یہ لفظ غریب سے ماخوذ ہے۔ کہتے ہیں کہ کوے کو غراب اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ بہت دور تک چلا جاتا ہے۔

سَوۡءَةَ: (س و ء): شرمگاہ کے کنایہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

ویل: (و ی ل) برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور حسرت کے موقع پر۔

یبحث: (ب ح ث) بحث اصل میں زمین میں کسی چیز کو تلاش کرنے کے معنوں میں ہے۔ بعد میں ہر قسم کی تلاش اور جستجو کو بحث کہا جانے لگا۔

تفسیر آیات

وَاتۡلُ عَلَیۡهِمۡ نَبَاَ ابۡنَیۡ اٰدَمَ: انسان کی موجودہ نسل میں واقع ہونے والے پہلے خونین واقعہ اور اس کرہ ارض پر بہنے والے پہلے ناحق خون اور اولاد آدم میں وقوع پذیر ہونے والے پہلے معرکہ حق و باطل کی داستان ہے۔

اس داستان میں شر و خیر، ظلم و عدل، قساوت و رحم، تجاوز و صبر، اطاعت و نافرمانی اور سعادت و شقاوت کا ایک نمونہ ہے۔ اس داستان میں ہابیل حق کا کردار ادا کرتے ہیں اور قابیل باطل کا۔

۱۔ قبول اعمال کے لیے تقویٰ بنیاد ہے: اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الۡمُتَّقِیۡنَ اللہ تو صرف تقویٰ رکھنے والوں کے اعمال قبول فرماتا ہے۔ قرآن نے یہ نہیں بتایا کہ وہ قربانی کیا چیز ہے؟ کیونکہ اس قصے سے جو درس ملتا ہے اس میں قربانی کی نوعیت اہم نہیں ہے۔

۲۔ البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آدمؑ کے ان دو بیٹوں کو کس طرح علم ہوا کہ قربانی قبول ہوئی ہے

یا نہیں؟ اس بات کا ذکر قرآن نے دوسری جگہ کیا ہے:

اَلَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ عَہِدَ اِلَیۡنَاۤ اَلَّا نُؤۡمِنَ لِرَسُوۡلٍ حَتّٰی یَاۡتِیَنَا بِقُرۡبَانٍ تَاۡکُلُہُ النَّارُ ؕ قُلۡ قَدۡ جَآءَکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِیۡ بِالۡبَیِّنٰتِ وَ بِالَّذِیۡ قُلۡتُمۡ فَلِمَ قَتَلۡتُمُوۡہُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۱﴾

جو لوگ کہتے ہیں: ہمیں اللہ نے حکم دیا ہے کہ جب تک کوئی رسول ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ لائے جسے آگ آ کر کھا جائے، ہم اس پر ایمان نہ لائیں، کہد یجیے: مجھ سے پہلے بھی رسول روشن دلیل کے ساتھ تمہارے پاس آئے اور جس کا تم ذکر کرتے ہو وہ بھی لائے تو اگر تم سچے ہو تو تم لوگوں نے انہیں کیوں قتل کیا؟

یعنی اس زمانے میں مدعی نبوت کے لیے ضروری تھا کہ وہ جو قربانی مذبح میں پیش کرے، اسے آسمان سے آنے والی آگ جلا دے۔

۳۔ لَاَقۡتُلَنَّکَ: میں تجھے قتل کروں گا۔ یہ اس شخص کی بات ہے، جس کی قربانی قبول نہ ہوئی اور سیاق آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قتل کا محرک حسد تھا۔ چونکہ حسد میں غالباً بے گناہ کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے۔ یہاں جس کی قربانی قبول ہوئی تھی، اس کا کوئی گناہ نہ تھا۔ گناہ کا مرتکب تو وہ شخص تھا جس کی قربانی قبول نہیں ہوئی ہے۔ اس کے باوجود وہ بے گناہ کو صرف حسد کی بنیاد پر قتل کرنا چاہتا ہے۔

۴۔ لَئِنۡۢ بَسَطۡتَّ اِلَیَّ یَدَکَ: جس کی قربانی قبول ہوئی تھی وہ جواب دیتے ہیں کہ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے تو بھی میں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ یعنی مجھے سعادت کی موت قبول ہے اور شقاوت کی زندگی قبول نہیں کہ میں اپنے بھائی کو قتل کر کے زندہ رہوں۔

۵۔ خوف خدا اس راہ میں حائل ہے کہ اپنے بھائی کے خون میں ہاتھ ڈالے: اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ انہوں نے قتل کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا اور اپنے قتل میں مدد دی۔ چنانچہ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ میں اپنے قتل میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالوں گا، اپنا دفاع نہیں کروں گا۔ انہوں نے تو یہ کہا کہ تیرے اس ارادۂ قتل کے بدلہ میں، میں بھی تیرے قتل کا ارادہ نہیں کروں گا اور یہ جاننے کے باوجود کہ تو میرے قتل کی تدبیریں سوچ رہا ہے، میں تیرے قتل میں پہل نہیں کروں گا۔

۶۔ اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ تَبُوۡٓاَ بِاِثۡمِیۡ وَ اِثۡمِکَ: میں چاہتا ہوں کہ میرے اور اپنے گناہ میں تو ہی ماخوذ ہو اور تیرے قتل کا ارادہ کر کے میں بھی گناہ کا ارتکاب کروں؟ میں چاہتا ہوں کہ اپنے گناہ کے ساتھ میرے گناہ کا بوجھ تیرے ہی کندھوں پر ہو کہ میرے قتل کے بعد میرا بوجھ بھی تجھے برداشت کرنا پڑے گا یا شاید مطلب یہ ہو کہ ایک دوسرے کے قتل سے دونوں گناہ گار ہونے کی بجائے تو ہی دونوں کی جگہ گناہ کا بوجھ اٹھائے یا

۱۔ ۳ آل عمران: ۱۸۳

قیامت کے دن ظالم کے حسنات مظلوم کو دیے جائیں گے اور اگر ظالم کے حسنات نہ ہوں تو اس کو مظلوم کے گناہوں کا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔

۷۔ فَطَوَّعَتۡ لَہٗ نَفۡسُہٗ: بالآخر اس کے نفس نے اپنے بھائی کے قتل کی ٹھان لی اور حسد و شقاوت نے بالآخر اس جرم کے ارتکاب پر آمادہ کر دیا اور بھائی کو قتل کر ہی دیا۔ گویا ایک گومگو کے بعد ایک ایسے جرم کا ارتکاب کیا جو آنے والے تمام جرائم کے لیے بنیاد بنا۔

۸۔ فَبَعَثَ اللّٰہُ غُرَابًا: پھر اللہ نے ایک کوے کو بھیجا جو زمین کھودنے لگا تا کہ اسے دکھا دے کہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھپائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ابتدائی انسان کس قدر سادہ تھا کہ اسے مردے کو زمین میں چھپانے کا شعور بھی نہ تھا۔ انسان عالم طفولیت میں تھا اور طبیعیت کے اسرار و رموز سے کلی طور پر ناواقف تھا۔ بعد کے تجربات سے انسان نے طبیعیت کو تدریجاً مسخر کر دیا کہ اس وقت انسان ایٹم کی تسخیر کے مرحلے میں داخل ہے اور تسخیرِ طبیعیت کا یہ سلسلہ جاری ہے۔

۹۔ قاتل نے دیکھا کہ وہ ایک غراب کے برابر بھی سمجھ نہیں رکھتا تو اس بات پر ندامت ہوئی، قتل پر نہیں یا ممکن ہے کہ اپنی جہالت اور ناتوانی دیکھنے کے بعد قتل پر بھی ندامت ہوئی ہو۔

۱۰۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ انسان ایک ارتقا پذیر موجود ہے کہ اس زمانے کا انسان ایک چیز کو زمین کے اندر چھپانے تک کی بات کو سمجھنے پر قادر نہ تھا اور آج کا انسان معجز نما کارنامے انجام دیتا ہے، جب کہ کوا آج بھی وہی سوچ رکھتا ہے جو اس زمانے میں رکھتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہیے کہ اس وقت کے کوے میں وہ ساری صلاحیتیں موجود تھیں جو آج کے کوے میں ہیں، کیونکہ یہ ارتقا کے لیے نہیں بلکہ کسی اور موجودات کے لیے مسخر ہے۔

۱۱۔ کہتے ہیں پرندوں میں سے کوے کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنے شکار اور اپنے جمع کردہ دانوں کو زمین میں دفن کرتا ہے۔

۱۲۔ توریت میں بھی اس داستان کا ذکر ملتا ہے لیکن اس میں ہابیل کی تدفین کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ البتہ شارحین نے لکھا ہے کہ آدم و حوا نے ایک پرندے کو دیکھ کر ہابیل کو دفن کیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلامی روایات میں ان فرزندانِ آدمؑ کے نام ہابیل اور قابیل آئے ہیں جب کہ توریت میں ان کے نام ہابیل و قابین آئے ہیں۔ ناموں میں ایسا اختلاف ایک معمول ہے تاہم بعض اسلامی روایت میں بھی قابیل، قابل، قابن اور قبن کا ذکر بھی ملتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ نبوت کو نسل اسماعیلؑ میں جاری فرمایا اور نسل یہود کو اس بار نبوت کے اٹھانے

کے لیے نا اہل قرار دیا۔ یہودیوں نے از روئے حسد اس کا انتقام لینا شروع کیا اور مسلمانوں کے خلاف ان کے ناپاک عزائم کی آگ کبھی بھی فرونہیں ہوئی۔ بالکل قابیل کی طرح جو اپنے بھائی کی قربانی کی قبولیت پر حسد کرتا رہا اور بالآخر اسے قتل کر دیا۔

مِنۡ اَجۡلِ ذٰلِکَ ۚۛ کَتَبۡنَا عَلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اَنَّہٗ مَنۡ قَتَلَ نَفۡسًۢا بِغَیۡرِ نَفۡسٍ اَوۡ فَسَادٍ فِی الۡاَرۡضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیۡعًا ؕ وَ مَنۡ اَحۡیَاہَا فَکَاَنَّمَاۤ اَحۡیَا النَّاسَ جَمِیۡعًا ؕ وَ لَقَدۡ جَآءَتۡہُمۡ رُسُلُنَا بِالۡبَیِّنٰتِ ۫ ثُمَّ اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنۡہُمۡ بَعۡدَ ذٰلِکَ فِی الۡاَرۡضِ لَمُسۡرِفُوۡنَ ﴿۳۲﴾

۳۲۔اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ (حکم) مقرر کر دیا کہ جس نے کسی ایک کو قتل کیا جبکہ یہ قتل خون کے بدلے میں یا زمین میں فساد پھیلانے کے جرم میں نہ ہو تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا اور جس نے کسی ایک کی جان بچائی تو گویا اس نے تمام انسانوں کی جان بچائی اور بتحقیق ہمارے رسول واضح دلائل لے کر ان کے پاس آئے پھر اس کے بعد بھی ان میں سے اکثر لوگ ملک میں زیادتیاں کرنے والے ہی رہے۔

تفسیر آیات

مِنۡ اَجۡلِ ذٰلِکَ: اسی وجہ سے۔ یعنی اولاد آدمؑ کی طرف سے ہونے والے کشت و خون کی وجہ سے، ان میں موجود جذبہ حسد و انتقام کی وجہ سے بنی اسرائیل پر یہ حکم نافذ کر دیا گیا:

i۔ایک انسان کا ناحق قتل گویا تمام انسانوں کا قتل ہے:

الف۔ اگر سب اس قاتل کی طرح قتل کرتے اور اس کی قائم کردہ مثال پر چلتے تو کسی کی جان محفوظ نہ رہتی۔ قتل خواہ ایک فرد کے ذریعے وقوع پذیر ہو، یہ ایک انفرادی واقعہ نہیں رہتا بلکہ اس کے اثرات عمومی ہوتے ہیں اور اس پر مترتب ہونے والے نتائج کی لپیٹ میں تمام انسان آ جاتے ہیں۔ مثلاً شراب نوشی سے پاک معاشرے میں ایک شخص شراب پینے کا عمل شروع کرتا ہے تو اس کے اثرات پورے معاشرے پر پڑتے ہیں اور دیکھا دیکھی شراب پینے کا رواج عام ہو سکتا ہے۔

ب۔ یہ انسانی وحدت و مساوات کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے اور انسانی حقوق کا ایک عظیم آرٹیکل ہے کہ فرد کی حق تلفی تمام انسانوں کی حق تلفی ہے۔ انسانی اقدار کی پامالی خواہ ایک فرد کے ذریعے ہی

کیوں نہ ہو، ان اقدار کی پامالی ہے جو تمام انسانوں میں ہیں۔ چنانچہ ایک صحافی اور ایک وکیل کے حقوق کی پامالی کو صحافت اور وکالت کی برادری میں سب کے حقوق کی پامالی شمار کرتے ہیں۔

ii۔ ایک انسان کی جان بچانا گویا تمام انسانوں کی جان بچانے کے برابر ہے۔ اس میں دو باتیں موجود ہیں جو پہلے جملے میں بھی ہیں:

الف۔ یہ ایک انسانی عمل ہے، ایک کردار ہے، ایک نمونہ ہے، جسے مشعل راہ بنایا جا سکتا ہے۔ اس طرح اس سے تمام انسانوں کی نجات و حیات وابستہ ہو جاتی ہے۔

ب۔ وحدتِ اسلامی کے تحت ایک فرد کے ذریعے انسانی اقدار کی پاسداری تمام انسانوں میں موجود اقدار کی پاسداری ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید ان انسانی حقوق پر مشتمل قانون کا بنی اسرائیل پر نفاذ کا اعلان کر رہا ہے لیکن بائبل میں یہ انسان ساز قانون موجود نہیں ہے۔ البتہ قرآنی اعلان کی شہادت تلمود میں موجود ہے:

> بنی اسرائیل کی ایک جان کو جس نے ہلاک کیا، اس نے تمام دنیا کو ہلاک کیا اور جس نے بنی اسرائیل کی ایک جان کو محفوظ رکھا، کتاب اللہ کے نزدیک گویا اس نے ساری دنیا کی حفاظت کی۔

اہم نکات

۱۔ مسلمانوں کو یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ کا قانون تمام ادیان میں انسانی اقدار کا محافظ ہے۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیۡنَ یُحَارِبُوۡنَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ یَسۡعَوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَسَادًا اَنۡ یُّقَتَّلُوۡۤا اَوۡ یُصَلَّبُوۡۤا اَوۡ تُقَطَّعَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ اَرۡجُلُہُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ اَوۡ یُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ ؕ ذٰلِکَ لَہُمۡ خِزۡیٌ فِی الدُّنۡیَا وَ لَہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کرتے ہیں اور روئے زمین میں فساد پھیلاتے ہیں ان کی سزا بس یہ ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا سولی چڑھا دیے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دیے جائیں یا ملک بدر کیے جائیں، یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔

اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ

۳۴۔ سوائے ان لوگوں کے جو تمہارے قابو میں آنے

تَقۡدِرُوۡا عَلَیۡهِمۡ ۚ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۳۴﴾	سے پہلے توبہ کرلیں اور یہ بات ذہنوں میں رہے کہ اللہ بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

شان نزول

کافی میں روایت ہے کہ بنی ضبّہ کے کچھ لوگ بیماری کی حالت میں رسول خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو رسول خداؐ نے ان سے فرمایا: ہمارے ہاں قیام کرو، صحت یاب ہونے پر میں تمہیں ایک دستہ کے ہمراہ بھیجوں گا۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہمیں مدینہ سے باہر کسی جگہ رکھیں۔ حضورؐ نے انہیں زکوۃ کے اونٹوں کے ساتھ روانہ کیا کہ وہ ان کا دودھ پئیں۔ چنانچہ وہ شفایاب ہوئے تو ان لوگوں نے ان تین افراد کو قتل کر دیا جو اونٹوں پر مامور تھے۔ چنانچہ رسول اللہ (ص) کو یہ خبر ملی تو حضرت علی علیہ السلام کو روانہ کیا اور یمن کی سرزمین کے نزدیک سے ان کو اسیر کر کے لایا گیا۔ اس واقعہ کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔[1]

تفسیر آیات

۱۔ خدا اور رسول سے لڑائی اور فساد فی الارض کا مطلب اس کے وضع کردہ نظام اور قانون کی پامالی ہے جب کہ ربا کے بارے میں فرمایا:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوۡا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ○ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ[2]	اے ایمان والو! اللہ کا خوف کرو اور جو سود (لوگوں کے ذمے) باقی ہے اسے چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔

یعنی اس قانون کی خلاف ورزی اللہ و رسولؐ کے خلاف اعلان جنگ کے مترادف ہونے کی وجہ سے اللہ اور اس کا رسولؐ بھی اس کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہیں۔

فِی الۡاَرۡضِ فَسَادًا: سے مراد امن عامہ میں خلل پیدا کرنا اور اسلحہ کی برملا نمائش کرتے پھرنا ہے، جس سے ہر شخص کی جان خطرے میں پڑ جائے اور قتل و غارت، رہزنی و ڈکیتی اس میں شامل ہیں۔

۲۔ ایسے لوگوں کے لیے جو متعدد سزائیں آیت میں مذکور ہیں، ان کی تفصیل فقہی کتابوں میں مذکور ہے اور احادیث میں بھی ان کا تفصیلی ذکر ہے۔

۳۔ ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹنے سے مراد یہ ہے کہ مثلاً دائیں طرف کا پاؤں اور بائیں طرف کا ہاتھ کاٹ دیے جائیں۔ یعنی ایک جانب کا پاؤں ہو تو ہاتھ دوسری جانب کا ہو۔

---

[1] الکافی ۷: ۲۴۶　[2] ۲ بقرہ: ۲۷۸۔۲۷۹

۴۔ملک بدری سے مراد جس شہر میں وہ رہتا ہے، اس سے دوسرے شہر کی طرف شہر بدری ہے۔
۵۔ یہ سزائیں اس وقت معاف ہوسکتی ہیں جب مجرم گرفتار ہونے اور گواہ بیان دینے سے پہلے توبہ کر لیں۔گرفتاری عمل میں آنے اور گواہی دینے کے بعد حد ساقط نہیں ہوسکتی۔

احادیث

کافی میں حضرت علی رضا علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا:

> اگر وہ اللہ اور سول سے لڑائی کرتا اور زمین پر فساد پھیلاتا ہے اور قتل کا ارتکاب کرتا ہے تو اسے قتل کیا جائے گا۔ اگر قتل کے ساتھ ڈکیتی بھی کرتا ہے تو اسے قتل کیا جائے گا اور سولی بھی چڑھایا جائے گا۔اگر ڈکیتی کرے اور قتل نہ کرے تو اس کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹے جائیں گے اور اگر وہ تلوار اٹھا کر پھرتا ہے اور قتل و ڈکیتی نہیں کرتا تو اسے ملک بدر کیا جائے گا....الی آخر۔[1]

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۳۵

۳۵۔ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف (قربت) کا ذریعہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو شاید تمہیں کامیابی نصیب ہو.

تشریح کلمات

الْوَسِيْلَةَ: (و س ل): جس سے کسی شے کی قربت حاصل کی جاتی ہے اس کو وسیلہ کہتے ہیں۔
جوہری نے صحاح میں لکھا ہے: الوسیلة ما یتقرب به الی الغیر۔ لسان العرب میں لکھا ہے: الوسیلة فی الاصل ما یتوصّل به الی الشیء و یتقرب به الیه۔ راغب نے لکھا ہے: وسیلة کسی چیز کی طرف رغبت کے ساتھ پہنچنے کے معنوں میں ہے۔ حبر امت حضرت ابن عباس نے کہا ہے: اطلبوا الیه القرب فی الدرجات بالاعمال الصالحة "اعمال صالحہ سے قرب الٰہی حاصل کرو،" یعنی اعمال صالحہ کو ذریعہ بناؤ۔ اس کے علاوہ وسیلة کے معنی قربت سے بھی کیا ہے جو در اصل وسیلة کا مقصد قربت حاصل کرنا ہی ہوتا ہے نیز محبت اور منزلت بھی اس کے معانی میں مذکور ہیں۔

----
[1] الکافی ۷: ۲۴۶

تفسیر آیات

اس آیہ شریفہ میں تقویٰ کے بعد اللہ کی قربت حاصل کرنے کے لیے ذریعہ اور وسیلہ تلاش کرنے کا حکم دیا اور اس کے لیے ابۡتَغُوۡۤا کا لفظ استعمال فرمایا جو کوشش کے ساتھ کسی چیز کی تلاش کرنے کے معنوں میں ہے۔ شاید اس میں یہ لطیف اشارہ بھی ہے کہ حق کے وسیلہ کی تلاش کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لیے کوشش درکار ہوتی ہے۔

چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے بھی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رسول بنا کر عملاً ان کو وسیلہ بنایا ہے اور قولاً اس وسیلے کے بارے میں فرمایا:

قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ ....[1]

کہد یجیے: اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا....

چنانچہ اتباع رسولؐ رضائے رب کے لیے وسیلہ ہے۔

کچھ مفسرین دعائے رسولؐ کو تو وسیلہ مانتے ہیں لیکن ذات رسول (ص) کو وسیلہ نہیں مانتے[2]، انہیں اس آیت کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے:

وَ مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَہُمۡ وَ اَنۡتَ فِیۡہِمۡ ۔[3]

اور اللہ ان پر عذاب نازل نہیں کرے گا جب تک آپ ان کے درمیان موجود ہیں....

یہاں ذات محمد (ص) عذاب سے محفوظ رہنے کے لیے وسیلہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس موضوع پر فیصلہ کن حیثیت واضح کرتے ہوئے فرمایا:

وَ لَوۡ اَنَّہُمۡ رَضُوۡا مَاۤ اٰتٰىہُمُ اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗ ۙ وَ قَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰہُ سَیُؤۡتِیۡنَا اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ وَ رَسُوۡلُہٗۤ[4]

اور کیا ہی اچھا ہوتا کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو کچھ انہیں دیا ہے وہ اس پر راضی ہو جاتے اور کہتے: ہمارے لیے اللہ کافی ہے، عنقریب اللہ اپنے فضل سے ہمیں بہت کچھ دے گا اور اس کا رسول بھی....

رہا یہ سوال کہ کیا رسول اللہ (ص) کے تربیت یافتہ اصحاب رسالتمآب (ص) کو وسیلہ مانتے تھے یا نہیں؟ اس کے لیے رسول اللہ (ص) کو وسیلہ نہ ماننے والوں کے اپنے امام احمد بن حنبل کی مسند ۴: ۱۳۸ سے یہ دعا نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو رسول خدا (ص) نے ایک آشوب چشم میں مبتلا شخص کو سکھائی:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُکَ وَ اَتَوَجَّہُ بِنَبِیِّکَ مُحَمَّدٍ نَبِیِّ الرَّحۡمَۃِ یَا مُحَمَّدُ اِنِّیۡ تَوَجَّھۡتُ بِکَ اِلَی رَبِّیۡ فِیۡ حَاجَتِیۡ

اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں نبی رحمت تیرے نبی کا واسطہ دے کر۔ یا محمدؐ میں تیرا واسطہ دے کر اپنے رب کی طرف

---

[1] ۳ آل عمران: ۳۱　[2] تفسیر المنار　[3] ۸ انفال: ۳۳　[4] ۹ توبہ: ۵۹

لِتَقْضِیَ لِیُ اَللّٰھُمَّ شَفِّعْهُ فِیَّ۔　طرف رخ کرتا ہوں کہ میری حاجت کی برآوری ہو جائے۔ اے اللہ میرے بارے میں ان کی سفارش قبول فرما۔

اس دعا کو ترمذی نے کتاب الدعوۃ میں اور ابن ماجہ نے کتاب باب صلوۃ الحاجۃ میں نقل کیا ہے اور بیہقی نے بھی نقل کیا ہے جس میں ذات محمدؐ کا واسطہ دیا ہے۔ اگر ذات محمدؐ میں کوئی اثر نہیں ہے تو دعا میں بھی کوئی خصوصی اثر نہیں ہونا چاہیے، بلکہ رسولؐ کی دعا بھی دوسرے لوگوں کی دعا کی طرح ہونی چاہیے کیونکہ اگر ذات محمد (ص) کو دعا کی قبولیت میں کوئی دخل نہیں ہے تو خود دعا سب کی یکساں ہے۔

یہاں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ کسی ہستی کو ذریعہ اور وسیلہ بنانا اس صورت میں درست ہے کہ وہ اللہ کی طرف وسیلہ ہونے کے لیے مجاز ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس ہستی سے استمداد اللہ کے مقابلہ میں نہ ہو، بلکہ اللہ سے استمداد کے ذیل میں ہو۔

وفات رسولؐ کے بعد بھی طبرانی کے مطابق اصحاب کرام رسول کریمؐ سے اپنی حاجات کی برآوری کے لیے رجوع کرتے تھے:

> ایک شخص حضرت عثمان کی طرف اپنی کسی حاجت کے سلسلے میں رجوع کرتا تھا مگر حضرت عثمان اس کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ عثمان بن حنیف سے اس کا ذکر ہوا تو انہوں نے کہا: وضو کر کے مسجد جاؤ، دو رکعت نماز پڑھ کر یہ دعا پڑھو:
>
> اَللّٰھُمَّ اِنِّیٓ اَسْئَلُكَ وَ اَتَوَجَّهُ اِلَیْكَ بِنَبِیِّنا مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَبِی الرَّحْمَةِ یَا مُحَمَّدُ اِنِّیٓ اَتَوَجَّهُ بِكَ اِلٰی رَبِّیْ فَتَقْضِیَ لِیُ حَاجَتِیْ۔[1]　اے اللہ! میں نبی رحمت ہمارے نبی کا واسطہ دے کر تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف رخ کرتا ہوں، اے محمدؐ میں آپ کے ذریعے اللہ کی طرف رخ کرتا ہوں کہ میری حاجت پوری ہو جائے۔

مولائے متقیان حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے وَابۡتَغُوۡۤا اِلَیۡہِ الۡوَسِیۡلَۃَ کے بارے میں فرمایا: انا وسیلته[2] میں اس (تک پہنچنے) کا وسیلہ ہوں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَوۡ اَنَّ لَہُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا وَّ مِثۡلَہٗ مَعَہٗ لِیَفۡتَدُوۡا　۳۶۔ جو لوگ کافر ہو گئے ہیں اگر ان کے پاس زمین کے تمام خزانے ہوں اور اسی کے برابر

---

[1] معجم الطبرانی الکبیر　[2] المناقب: ۲: ۷۵

بِهٖ مِنۡ عَذَابِ يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنۡهُمۡ ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۳۶﴾

مزید بھی ہوں اور وہ یہ سب کچھ روز قیامت کے عذاب کے بدلے میں فدیہ میں دینا چاہیں تو بھی ان سے قبول نہیں کیا جائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہو گا۔

يُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يَّخۡرُجُوۡا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمۡ بِخٰرِجِيۡنَ مِنۡهَا ۫ وَلَهُمۡ عَذَابٌ مُّقِيۡمٌ ﴿۳۷﴾

۳۷۔ وہ آتش جہنم سے نکلنا چاہیں گے لیکن وہ اس سے نکل نہ سکیں گے اور ان کے لیے ہمیشہ کا عذاب ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا: کافروں میں سے ہر ایک زمین کے تمام خزانوں کا مالک ہو۔ وَّمِثۡلَهٗ مَعَهٗ ان تمام خزانوں کو دوگنا کر دیا جائے اور ان سب کا یہ کافر مالک بن جائے۔

۲۔ لِيَفۡتَدُوۡا بِهٖ مِنۡ عَذَابِ يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ: یہ کافر ان تمام خزانوں کو اس عذاب کا فدیہ دینا چاہے جو قیامت کے دن اسے لاحق ہو گا تو اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ دردناک عذاب میں مبتلا رہے گا۔

یہ ایک آخری اور قابل تصور مفروضے سے بھی بالاتر ہے کہ کافر عذاب سے بچ جائے۔ اس قابل تصور مفروضے سے بالاتر صورت میں بھی کافر عذاب سے نہیں بچ سکے گا۔ چونکہ مال و دولت مجرم کے جرم کا مداوا نہیں بن سکتی۔

۳۔ يُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يَّخۡرُجُوۡا مِنَ النَّارِ: اگرچہ ان کو علم ہے کہ آتش جہنم سے نکلنا ممکن نہیں ہے، تاہم عذاب سے نجات کی خواہش کی وجہ سے وہ اس آتش سے نکلنے کا ارادہ کریں گے۔

۴۔ وَلَهُمۡ عَذَابٌ مُّقِيۡمٌ: ان کے لیے دائمی عذاب ہو گا۔ یعنی ان کا جرم ان کی جان نہیں چھوڑے گا۔ ارادے کا مطلب آتش جہنم سے نکلنے کی کوشش ہو سکتی ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا:

كُلَّمَاۤ اَرَادُوۡۤا اَنۡ يَّخۡرُجُوۡا مِنۡهَاۤ اُعِيۡدُوۡا فِيۡهَا ....[1]

جب بھی وہ اس سے نکلنا چاہیں گے اس میں لوٹا دیے جائیں گے ....

اہم نکات

۱۔ آخرت میں دنیاوی قدریں بے قیمت ہوتی ہیں۔

۲۔ واقعی قدریں قیامت کے دن سامنے آتی ہیں۔

---

[1] ۳۲ سجدہ: ۲۰

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، ان کی کرتوت کے بدلے اللہ کی طرف سے سزا کے طور پر اور اللہ بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

تشریح کلمات

نکال: (ن ك ل) عبرتناک سزا۔ اصل میں پاؤں کی بیڑیوں اور لگام کے لوہے کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

اسلامی نظام حیات جہاں انسان کو جانی تحفظ دینے کے لیے قصاص کی سزا مقرر کرتا ہے، وہاں مالی تحفظ فراہم کرنے کے لیے مناسب اور مؤثر قانون وضع کرتا ہے۔ مال کے تحفظ کے بارے میں اسلام کا یہ مؤقف ہے کہ حُرْمَةُ مَالِ الْمُسْلِمِ كَحُرْمَةِ دَمِهِ۔[1] ”مال مسلم کو وہی حرمت حاصل ہے جو خون مسلم کو حاصل ہے۔“ جہاں اسلام احترام آدمیت کی ضمانت فراہم کرتا ہے، وہاں مسلمان کے لیے انفرادی ملکیت کو بھی تحفظ دیتا ہے۔ کیونکہ فرد کی جان و مال کے تحفظ سے ایک پرامن معاشرہ وجود میں آتا ہے اور فرد کی املاک و مال پر تجاوز ہونے کی صورت میں معاشرے کا امن تباہ ہو جاتا ہے۔

ہاتھ کاٹنے کی شرائط: ہاتھ کاٹنے کی سزا کی شرائط پر نظر ڈالیں تو اس سزا کی حکمت و فلسفہ کے سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے:

i۔ قحط۔ بھوک کی مجبوری کی وجہ سے چوری کا ارتکاب کیا ہے تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سزا کا مقصد طمع اور لالچ کا ہاتھ کاٹنا ہے۔ کیونکہ اگر یہ چوری مجبوری اور ضرورت کی وجہ سے نہیں ہے تو طمع اور لالچ کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ اس کے لیے حل یہ ہے کہ حرص اور طمع کی بنیاد پر دولت کمانے کے ذریعے ہاتھ کو کاٹ کر اس صفت بد پر ضرب کاری لگائی جائے۔

ii۔ محفوظ جگہ سے چوری کی ہو۔ مثلاً گھر دوکان وغیرہ سے۔ جس سے چار دیواری کا تحفظ مجروح ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اگر گھر کی چار دیواری کے باہر سے چوری کی ہے تو اس پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

iii۔ چوری کرنے والا عاقل ہو۔ دیوانے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

iv۔ بالغ ہو۔ نابالغ کا ہاتھ نہیں کٹے گا۔ البتہ اس کو مناسب تعزیری سزا دی جائے گی۔

v۔ مال غلط فہمی کی بنا پر نہ اٹھایا گیا ہو۔ اپنا مال تصور کر کے غیر کا مال اٹھایا ہے تو یہ چوری نہیں ہے۔

----

[1] بحار ۲۹: ۴۰۷

vi۔ مال مشترکہ نہ ہو۔ اگر مشترکہ مال سے شریک کی اجازت کے بغیر اٹھائے تو سزا نہیں ہو گی۔
vii۔ باپ بیٹے کا مال چوری کرے تو ہاتھ نہیں کٹے گا۔
viii۔ مال کو پوشیدہ طور پر اٹھایا ہو۔ اگر سب کے سامنے یہ جرم کرے تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ اس پر چوری صادق نہیں آتی۔ یہ ڈکیتی ہے، اس کی سزا الگ ہے۔

نصاب: جس نصاب پر ہاتھ کاٹا جاتا ہے وہ فقہ جعفری کے مطابق ایک چوتھائی دینار ہے۔ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا بھی یہی نظریہ ہے۔ البتہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ نصاب دس درہم ہے۔

حضرت امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

لَا یُقْطَعُ یَدُ السَّارِقِ حَتّٰی تَبْلُغَ سَرِقَتُہٗ رُبُعَ دِیْنَارٍ۔[1]　　چور کا ہاتھ اس وقت تک نہیں کاٹا جائے گا جب تک اس کی چوری ایک چوتھائی دینار تک نہ پہنچے۔

صحیح بخاری آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

تقطع ید السارق فی ربع دینار فصاعداً۔[2]　　چور کا ہاتھ ایک چوتھائی دینار یا اس سے زیادہ پر کاٹا جائے گا۔

ہاتھ کی حد: آیہ شریفہ میں تو یہ حکم آیا ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دو۔ اس سے بظاہر پورا ہاتھ کاٹنا سمجھا جاتا ہے لیکن مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ پورا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

اہل سنت کے نزدیک کلائی سے کاٹا جائے گا۔ مگر امامیہ کے نزدیک چار انگلیاں جڑ سے کاٹی جائیں گی۔ انگوٹھا اور ہتھیلی چھوڑ دی جائے گی۔ اس پر سنت سے استدلال کے علاوہ یہ حکمت منقول ہے کہ ہتھیلی سجدے کے اعضا میں سے ہے۔ وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰہِ [3] "سجدے کی جگہیں اللہ کے لیے ہیں۔" لہٰذا اعضائے سجدہ اللہ کے لیے ہیں۔

کیا ہاتھ کاٹنا ایک غیر مہذب سزا ہے؟: جرائم پر سزا دینا خود اپنی جگہ ایک لازمی امر ہے۔ کیونکہ مجرم پورے معاشرے میں بدامنی پھیلاتا ہے۔ وہ انسانی اقدار کا عملاً احترام نہیں کرتا ہے۔ لہٰذا ایسے مجرم کو سزا دینا انسانی اقدار کا احیاء ہے۔ لہٰذا جرائم کی روک تھام کے لیے ہر کوشش رحمت ہے۔ اس بدامنی کے خلاف اٹھنے والا ہر قدم امن ہے۔ اس بات پر اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ جن اسلامی معاشروں میں ہاتھ کاٹنے کی سزا رائج رہی، وہاں ہاتھ کاٹنے کی نوبت بہت ہی کم آئی ہے۔ یعنی ایسی سزاؤں کے رواج سے جرائم کم ہوتے ہیں۔ نتیجتاً سزائیں بھی کم ہوتی ہیں۔

ایک واقعہ: اصمعی اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں: میں نے آیت سرقت کی تلاوت میں غلطی سے و اللّٰہ غفور رحیم پڑھ دیا تو ایک عرب بدو نے کہا: یہ کس کا کلام ہے؟ میں نے کہا: اللہ کا۔ کہا: پھر

---

[1] الکافی ۷: ۲۲۱　[2] صحیح بخاری باب قول اللّٰہ السارق و السارقۃ　[3] ۷۲ جن: ۱۸

پڑھو۔ میں نے پھر پڑھا: و اللّٰہ غفور رحیم۔ پھر میں متوجہ ہوا کہ میں غلط پڑھ رہا ہوں اور جب میں نے پڑھا: وَ اللّٰہُ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ تو اس نے کہا: اب درست پڑھی۔ میں نے کہا تم نے کیسے سمجھا؟ کہا: اللہ عزیز و حکیم ہے تو ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ اگر غفور رحیم کا ذکر ہوتا تو ہاتھ کاٹنے کا حکم نہ ہوتا۔ اس عرب بدو کو بھی علم ہے کہ اللہ کی حکمت و قہاریت کا تقاضا اور ہے اور مغفرت و رحمت کا تقاضا کچھ اور۔

فَمَنۡ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِ ظُلۡمِہٖ وَ اَصۡلَحَ فَاِنَّ اللّٰہَ یَتُوۡبُ عَلَیۡہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۳۹﴾

۳۹۔ پس جو شخص اپنی زیادتی کے بعد توبہ کر لے اور اصلاح کر لے تو اللہ یقیناً اس کی توبہ قبول کرے گا، بے شک اللہ بڑا بخشنے والا، مہربان ہے۔

تفسیر آیات

چور کو شرعی عدالت میں پیش کرنے اور شہادت پوری ہونے سے پہلے اگر اس نے توبہ کر لی تو سزا معاف ہو جائے گی، لیکن شہادت پوری ہونے کے بعد سزا نافذ کرنی ہو گی۔

۱۔ فَمَنۡ تَابَ: چوری کا ارتکاب کرنے کے بعد اگر پشیمانی ہو جاتی ہے اور توبہ کر لیتا ہے۔

۲۔ وَ اَصۡلَحَ: اور اصلاح کر لے۔ یعنی توبہ کے بعد دوبارہ سابقہ زیادتیوں کی طرف رجوع نہ کرے۔ توبہ کے بعد اصلاح اور عمل سے توبہ کی صداقت ثابت ہوتی ہے۔

۳۔ فَاِنَّ اللّٰہَ یَتُوۡبُ عَلَیۡہِ: تو اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔ یعنی اس گناہ پر اللہ اس کو عذاب نہیں دے گا۔ گناہ کے ارتکاب کے بعد ایسا نہیں ہے کہ انسان کے سامنے کوئی چارہ کار نہ ہو۔ گناہ کا ارتکاب اللہ کی بندگی سے فرار ہے۔ فراری کے لیے چارہ کار واپسی ہے۔

۴۔ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ: اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ یعنی توبہ کا قبول کرنا اللہ کی مہربانی ہے۔ ورنہ مجرم کو معاف نہ کرے تو یہ ظلم نہ ہو گا۔

اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۴۰﴾

۴۰۔ کیا تجھے علم نہیں کہ آسمانوں اور زمین میں سلطنت اللہ کے لیے ہے؟ وہ جسے چاہے عذاب دیتا ہے اور جسے چاہے بخش دیتا ہے اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ : یہ آیت مذکورہ سزا اور توبہ کے ساتھ مربوط ہے کہ ساری کائنات پر اس کی سلطنت ہے اور صرف اسی کا حکم چلتا ہے۔

۲۔ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ : اور اسی کا منشا و مشیت کارفرما ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے لیکن اس کی مشیت اور چاہت اشاعرہ کے نظریہ کے مطابق نہیں ہے کہ وہ چاہے تو توبہ کرنے والوں، صالح لوگوں، نبیوں اور صدیقوں کو ہمیشہ کے لیے جہنم میں ڈال دے اور مفسدوں اور ظالموں پر رحم کھائے اور ہمیشہ کے لیے جنت میں داخل کرے۔[1]

بلکہ اللہ کی مشیت حکمت اور عدل و انصاف کی بنیاد پر قائم ہے۔ وہ چاہتا ہے چور جیسے مجرم کا ہاتھ کاٹا جائے اور توبہ کرنے والے سے درگزر کیا جائے۔

یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوۡلُ لَا یَحۡزُنۡكَ الَّذِیۡنَ یُسَارِعُوۡنَ فِی الۡكُفۡرِ مِنَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِاَفۡوَاهِهِمۡ وَ لَمۡ تُؤۡمِنۡ قُلُوۡبُهُمۡ ۚۛ وَ مِنَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا ۚۛ سَمّٰعُوۡنَ لِلۡكَذِبِ سَمّٰعُوۡنَ لِقَوۡمٍ اٰخَرِیۡنَ ۙ لَمۡ یَاۡتُوۡكَ ؕ یُحَرِّفُوۡنَ الۡكَلِمَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ یَقُوۡلُوۡنَ اِنۡ اُوۡتِیۡتُمۡ هٰذَا فَخُذُوۡهُ وَ اِنۡ لَّمۡ تُؤۡتَوۡهُ فَاحۡذَرُوۡا ؕ وَ مَنۡ یُّرِدِ اللّٰهُ فِتۡنَتَهٗ فَلَنۡ تَمۡلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ

۴۱۔ اے رسول! اس بات سے آپ رنجیدہ خاطر نہ ہوں کہ کچھ لوگ کفر اختیار کرنے میں بڑی تیزی دکھاتے ہیں وہ خواہ ان لوگوں میں سے ہوں جو منہ سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لا چکے ہیں جب کہ ان کے دل ایمان نہیں لائے اور خواہ ان لوگوں میں سے ہوں جو یہودی بن گئے ہیں، یہ لوگ جھوٹ (کی نسبت آپ کی طرف دینے) کے لیے جاسوسی کرتے ہیں اور ایسے لوگوں (کو گمراہ کرنے) کے لیے جاسوسی کرتے ہیں جو ابھی آپ کے دیدار کے لیے نہیں آئے، وہ کلام کو صحیح معنوں سے پھیرتے ہیں اور کہتے ہیں: اگر تمہیں یہ حکم ملا تو مانو، نہیں ملا تو بچے

---
[1] ملاحظہ ہو تفسیر رازی ۱۱: ۱۲۳۰ اور تفسیر المنار ۶: ۳۸۳

شَیۡـًٔا ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُرِدِ اللّٰہُ اَنۡ یُّطَہِّرَ قُلُوۡبَہُمۡ ؕ لَہُمۡ فِی الدُّنۡیَا خِزۡیٌ ۚۖ وَّ لَہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۴۱﴾

رہو، جسے اللہ گمراہ کرنا چاہے تو اسے بچانے کے لیے اللہ نے آپ کو کوئی اختیار نہیں دیا، یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا ہی نہیں چاہا، ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں عذاب عظیم ہے۔

شان نزول

مدینہ کے مضافات میں یہودیوں کا ایک طاقتور قبیلہ بنونضیر اور ایک کمزور قبیلہ بنوقریظہ آباد تھے۔

بنونضیر نے بنوقریظہ کو ایک ذلت آمیز معاہدے پر مجبور کر دیا کہ جس کے تحت بنونضیر کا کوئی آدمی بنوقریظہ کے کسی شخص کو قتل کر دے تو قصاص کا حق نہ ہوگا بلکہ ایک خفیف سی دیت دینا ہوگی، جب کہ بنی قریظہ کا کوئی آدمی بنونضیر کے کسی شخص کو قتل کر دے تو قصاص کے ساتھ دیت بھی دوگنی ہو گی۔

رسول کریمؐ کی ہجرت کے بعد ان میں قتل کا ایک واقعہ رونما ہوا۔ بنی قریظہ کے ایک شخص کے ہاتھوں بنی نضیر کا ایک شخص قتل ہوا۔ اس بار بنی قریظہ دوگنی دیت دینے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ جنگ چھڑنے والی تھی۔ ان کے بزرگوں کے مشورے سے یہ طے پایا کہ رسول اسلامؐ کے پاس یہ مسئلہ پیش کیا جائے۔ بنونضیر نے اس فیصلے کو قبول تو کر لیا مگر انہوں نے کچھ یہودیوں کو جاسوسی کی غرض سے مدینہ بھیجا کہ رسول اسلامؐ کا اس بارے میں کیا مؤقف ہوسکتا ہے۔ اگر اپنے مفاد میں فیصلہ ہو جائے تو مان لیا جائے، ورنہ مسترد کر دیا جائے۔

دوسرا واقعہ ایک زنا کا نقل کرتے ہیں کہ یہودیوں نے توریت کی سزا میں نرمی کر دی کہ جرم کا مرتکب بڑے خاندان کا ہونے کی وجہ سے سنگسار نہیں کیا گیا اور اس مسئلے میں رسول اسلامؐ کی طرف رجوع کرنے کا فیصلہ کیا کہ شاید آپ کوئی ہلکی سزا تجویز کریں۔ چنانچہ یہودیوں کا ایک وفد رسول اسلامؐ کی خدمت میں کعب بن اشرف کی سربراہی میں حاضر ہوا۔ چونکہ شادی شدہ مرد اور عورت نے زنا کا ارتکاب کیا تھا، توریت کے مطابق سنگساری کا حکم دیا۔ وہ بوکھلا گئے۔ آخر طے پایا کہ یہودیوں کے سب سے بڑے عالم ابن صوریا کو حکم بنایا جائے۔ چنانچہ حضورؐ نے ابن صوریا سے قسم دے کر توریت کا صحیح حکم بیان کرنے کے لیے کہا تو اس نے گواہی دی کہ شادی شدہ عورت اور مرد زنا کریں تو توریت میں بھی سزا سنگسار کرنا ہے۔ ہم نے بڑوں کے لحاظ میں زنا کی کثرت کی وجہ سے یہ سزا کوڑوں میں بدل دی تھی۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا یَحۡزُنۡکَ الَّذِیۡنَ یُسَارِعُوۡنَ فِی الۡکُفۡرِ : جو لوگ کفر اختیار کرنے میں تیزی دکھاتے ہیں، اس

سے آپؐ رنجیدہ خاطر نہ ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ ان لوگوں کو دنیا میں رسوائی ملے گی اور آخرت میں عذاب عظیم ہو گا۔

۲۔ مِنَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِاَفۡوَاہِہِمۡ وَلَمۡ تُؤۡمِنۡ قُلُوۡبُہُمۡ : کفر اختیار کرنے میں تیزی دکھانے والوں میں ایک تو منافق لوگ ہیں جو زبان سے ایمان کا اظہار کرتے ہیں جب کہ ان کے دل ایمان نہیں لائے۔ ان کے کفر میں تیزی دکھانے کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ وہ معمولی سی بات کے بارے میں انکار کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔

اس جگہ منافقین کا ذکر اس لیے ہوسکتا ہے کہ وہ یہودیوں کے ہمنوا تھے اور دونوں ایک جیسے موقف رکھتے تھے۔

۳۔ وَمِنَ الَّذِیۡنَ ہَادُوۡا: کفر میں تیزی دکھانے والوں میں یہودی آگے آگے ہیں۔ یہودیوں کے کفریات کا ذکر آگے آتا ہے۔

۴۔ سَمّٰعُوۡنَ لِلۡکَذِبِ: یہ لوگ جھوٹ کی خاطر جاسوسی کرتے ہیں۔ یعنی اپنے احبار کے جھوٹ پر پردہ ڈالنے کے لیے جاسوسی کرتے ہیں۔

۵۔ سَمّٰعُوۡنَ لِقَوۡمٍ اٰخَرِیۡنَ : ان لوگوں کے لیے جاسوسی کرتے ہیں جو آپؐ کے پاس نہیں آتے۔ یعنی خیبر و فدک کے لوگوں میں توریت کے حکم کے خلاف فیصلہ معلوم کرنے کے لیے جاسوسی کر رہے ہیں۔

۶۔ یُحَرِّفُوۡنَ الۡکَلِمَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَوَاضِعِہٖ : توریت میں سنگسار کا حکم موجود ہونے کے باوجود مِنۡۢ بَعۡدِ مَوَاضِعِہٖ تحریف کرتے ہیں۔ خود کلام کو توریت سے اٹھانے کے لیے سورہ نساء میں یُحَرِّفُوۡنَ الۡکَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِہٖ[۱] فرمایا۔ اس جگہ ان لوگوں نے یہ حکم توریت سے نہیں اٹھایا بلکہ توریت میں موجود ہونے کے باوجود بیان احکام میں تحریف کی۔

۷۔ یَقُوۡلُوۡنَ اِنۡ اُوۡتِیۡتُمۡ : وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی خواہش کے مطابق فیصلہ دینے والے ہیں تو ان کا فیصلہ قبول کیا جائے، ورنہ رد کیا جائے۔ اُوۡتِیۡتُمۡ ، الایتاء دینے کے معنوں میں ہے، جیسے وَاٰتٰىہُ اللّٰہُ الۡمُلۡکَ وَالۡحِکۡمَۃَ ...[۲] میں ہے۔

۸۔ وَمَنۡ یُّرِدِ اللّٰہُ فِتۡنَتَہٗ: جس کے بارے میں ضلالت یا عذاب کا ارادہ کیا ہے، اس کو بچانے والا کوئی نہ ہو گا۔ آیت میں فتنہ، گمراہی یا عذاب کے معنوں میں ہیں۔ جیسے وَاحۡذَرۡہُمۡ اَنۡ یَّفۡتِنُوۡکَ عَنۡۢ بَعۡضِ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ اِلَیۡکَ ....[۳] میں یَّفۡتِنُوۡکَ فتنہ، گمراہ کرنے کے معنوں میں ہے۔

۹۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ : یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں ناقابل تطہیر کثافت موجود ہے، لہٰذا ان کے اندر کی کثافت قابل تطہیر نہیں ہے۔

---

[۱] ۴ نساء: ۴۶　[۲] ۲ بقرہ: ۲۵۱　[۳] ۵ مائدہ۔ ۴۹

سَمّٰعُوۡنَ لِلۡکَذِبِ اَکّٰلُوۡنَ لِلسُّحۡتِ ؕ فَاِنۡ جَآءُوۡکَ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ اَوۡ اَعۡرِضۡ عَنۡہُمۡ ۚ وَ اِنۡ تُعۡرِضۡ عَنۡہُمۡ فَلَنۡ یَّضُرُّوۡکَ شَیۡئًا ؕ وَ اِنۡ حَکَمۡتَ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِالۡقِسۡطِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ ﴿۴۲﴾

۴۲۔ یہ لوگ جھوٹ (کی نسبت آپ کی طرف دینے) کے لیے جاسوسی کرنے والے، حرام مال خوب کھانے والے ہیں، اگر یہ لوگ آپ کے پاس (کوئی مقدمہ لے کر) آئیں تو ان میں فیصلہ کریں یا ٹال دیں (آپ کی مرضی) اور اگر آپ نے انہیں ٹال دیا تو یہ لوگ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے اور اگر آپ فیصلہ کرنا چاہیں تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیں، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

تشریح کلمات

سحت: نابود ہونے کے معنوں میں ہے۔ لَا تَفۡتَرُوۡا عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا فَیُسۡحِتَکُمۡ بِعَذَابٍ ...۔[1] سُحت نابود ہونے والے کو کہتے ہیں۔ اور حرام چونکہ دین اور مروت کو نابود کرتا ہے۔ اس لیے اسے حرام کیا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ سَمّٰعُوۡنَ لِلۡکَذِبِ: یہ لوگ جھوٹ کے لیے جاسوسی کرنے والے اور حرام کا لقمہ کھانے والے ہیں۔ اس آیت میں حرام سے مراد رشوت ہے کہ حکم توریت کو چھپا کر یہ لوگ رشوت لینے والے ہیں۔

۲۔ فَاِنۡ جَآءُوۡکَ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ اَوۡ اَعۡرِضۡ عَنۡہُمۡ: یہودی اگر اپنا مسئلہ لے کر آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ ان میں فیصلہ کر سکتے ہیں اور ٹال بھی سکتے ہیں۔ مباح عمل میں ترک و فعل دونوں برابر ہیں اور اختیار ہوتا ہے کہ دونوں میں سے ایک کو اختیار کیا جائے۔

۳۔ وَ اِنۡ حَکَمۡتَ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِالۡقِسۡطِ: اگر فیصلہ کریں تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کریں۔ انصاف اور عدالت ہر انسان کا حق ہے۔ خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ اس کا تعلق انسانی حقوق سے ہے۔

اسلامی حکومت میں یہودی اقلیت اپنے مقدمات کے فیصلے میں اپنے ججوں کی طرف رجوع کرنے اور فیصلہ لینے میں آزاد تھے۔ وہ اسلامی عدالت کی طرف رجوع کرنے کے لیے مجبور نہ تھے۔ وہ صرف اپنے

----

[1] ۲۰ طٰہٰ: ۶۱

قانون سے راہ فرار تلاش کرنے کے لیے کبھی اسلامی عدالت کی طرف رجوع کرتے تھے۔

احادیث

کافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔ فرمایا:

اَلسُّحۡتُ ثَمَنُ الۡمَیۡتَۃِ وَثَمَنُ الۡکَلۡبِ وَثَمَنُ الۡخَمۡرِ وَمَھۡرُ الۡبَغِیِّ وَالرَّشۡوَۃُ فِی الۡحُکۡمِ وَاَجۡرُ الۡکَاھِنِ۔[1]

(حرام مال) سے مراد مردار، کتا اور شراب کی قیمت، بے عفتی کی اجرت، فیصلوں میں رشوت اور کاہن کا نذرانہ ہے۔

وَکَیۡفَ یُحَکِّمُوۡنَکَ وَعِنۡدَھُمُ التَّوۡرٰىۃُ فِیۡھَا حُکۡمُ اللّٰہِ ثُمَّ یَتَوَلَّوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ ؕ وَمَاۤ اُولٰٓئِکَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۴۳﴾

۴۳۔ اور یہ لوگ آپ کو منصف کیسے بنائیں گے جبکہ ان کے پاس توریت موجود ہے جس میں اللہ کا حکم موجود ہونے کے باوجود یہ لوگ منہ پھیر لیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان ہی نہیں رکھتے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَکَیۡفَ یُحَکِّمُوۡنَکَ: اظہار تعجب ہے کہ یہود اپنی کتاب و شریعت کو چھوڑ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اپنا فیصلہ لاتے ہیں، جن کی نبوت سے ان کو انکار ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہ توریت پر ایمان رکھتے ہیں نہ اسلامی فیصلے پر۔ یہ صرف اس فیصلے کی تلاش میں ہیں، جو اپنی خواہشات کے مطابق ہو۔

۲۔ فِیۡھَا حُکۡمُ اللّٰہِ: توریت میں حکم خدا موجود ہے۔ اس جملہ سے معلوم ہوا کہ جہاں قرآن توریت میں تحریف و تبدل کا ذکر فرماتا ہے وہاں یہ بھی قبول ہے کہ توریت میں پھر بھی کچھ احکام خدا باقی ہیں۔

۳۔ ثُمَّ یَتَوَلَّوۡنَ: حکم خدا توریت میں ہونے کے باوجود وہ اس پر عمل نہیں کرتے، حالانکہ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم توریت کو مانتے ہیں تو وہ آپ کا فیصلہ کیسے مانیں گے، جب کہ وہ آپ کو اللہ کا رسول نہیں مانتے۔

۴۔ وَمَاۤ اُولٰٓئِکَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ: حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی توریت پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کا مطلب عمل ہے۔ یہود توریت پر عمل نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس پر ایمان نہیں رکھتے۔

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىۃَ فِیۡھَا ھُدًی

۴۴۔ ہم نے توریت نازل کی جس میں ہدایت

---

[1] الکافی ۵: ۱۲۶

وَّ نُوۡرٌ ۚ یَحۡکُمُ بِہَا النَّبِیُّوۡنَ الَّذِیۡنَ اَسۡلَمُوۡا لِلَّذِیۡنَ ہَادُوۡا وَ الرَّبّٰنِیُّوۡنَ وَ الۡاَحۡبَارُ بِمَا اسۡتُحۡفِظُوۡا مِنۡ کِتٰبِ اللّٰہِ وَ کَانُوۡا عَلَیۡہِ شُہَدَآءَ ۚ فَلَا تَخۡشَوُا النَّاسَ وَ اخۡشَوۡنِ وَ لَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰیٰتِیۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ؕ وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۴۴﴾

اور نور تھا، اطاعت گزار انبیاء اس کے مطابق یہودیوں کے فیصلے کرتے تھے اور علماء اور فقہاء بھی فیصلے کرتے تھے جنہیں اللہ نے کتاب کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے، لہٰذا تم لوگوں سے خوفزدہ نہ ہونا بلکہ مجھ سے خوف رکھنا اور میری آیات کو تھوڑی سی قیمت پر نہ بیچنا اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قوانین کے مطابق فیصلے نہ کریں پس وہ کافر ہیں۔

تشریح کلمات

الۡاَحۡبَارُ: (ح ب ر) مفرد حبر وہ نشان جو عمدہ اور خوبصورت معلوم ہو۔ عالم کو حبر اس لیے کہتے ہیں کہ لوگوں کے دلوں پر اس کے علم کے اثرات باقی رہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىۃَ فِیۡہَا ہُدًی وَّ نُوۡرٌ: ہم نے توریت نازل کی، اسی قسم کے مسائل کی ہدایت کے لیے۔ چنانچہ یہودیوں کو جو مسئلہ درپیش ہے، اس کی رہنمائی توریت میں موجود ہے۔ وَّ نُوۡرٌ، اس میں روشنی ہے، جس کی وجہ سے ان کے لیے کسی مسئلہ پر روشنی ڈالنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔

۲۔ یَحۡکُمُ بِہَا النَّبِیُّوۡنَ: نزول توریت کے بعد نزول انجیل تک کے انبیاء، توریت کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ الَّذِیۡنَ اَسۡلَمُوۡا جو توریت کو تسلیم کرتے تھے۔ یعنی وہ انبیاء جو توریت کے احکام کے نفاذ پر مامور تھے۔ لِلَّذِیۡنَ ہَادُوۡا یہودیوں کے درمیان فیصلے توریت کے مطابق کیا کرتے تھے۔ یہود حضرت عیسیٰ اور ان کے بعد کسی نبی کو تسلیم نہیں کرتے، لہٰذا حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے درمیانی دور کے انبیاء مراد ہو سکتے ہیں۔

۳۔ وَ الرَّبّٰنِیُّوۡنَ: وہ علماء بھی توریت کے مطابق فیصلے کرتے تھے، جو ربانی کے رتبے پر فائز تھے۔ یعنی اپنی قوم کے مربی تھے یا وہ عبادت اور توجہ الی اللہ کی وجہ سے ربانی (رب والے) کہلاتے تھے۔

۴۔ وَالۡاَحۡبَارُ :علم میں مہارت رکھنے والے بھی یہودیوں میں توریت کے مطابق فیصلے کرتے رہے ہیں۔

۵۔ بِمَا اسۡتُحۡفِظُوۡا مِنۡ کِتٰبِ اللّٰہِ: ان علمائے ربانی اور احبار کو کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا تھا کہ وہ اس کو تحریف و تبدیل سے محفوظ رکھیں اور اس کے مطابق فیصلے کیا کریں۔

بعض اہل علم نے یہاں ایک نکتہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توریت کو یہود کے علماء کی حفاظت میں دیا تھا، اس لیے ان کے لیے تحریف ممکن ہو گئی۔ قرآن کی حفاظت کو اللہ نے اپنے ذمے لیا ہے، لٰہذا قرآن میں تحریف ممکن نہیں ہے۔

۶۔ وَکَانُوۡا عَلَیۡہِ شُہَدَآءَ: اور وہ یہودی علماء توریت کے مندرجات پر گواہ بھی تھے لیکن ان لوگوں نے گواہی نہیں دی۔

۷۔ فَلَا تَخۡشَوُا النَّاسَ وَاخۡشَوۡنِ: خطاب ربانیین و احبار یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاصر یہودی علماء سے ہے کہ چونکہ تم کو توریت کی حفاظت کی ذمہ داری دی ہے تو اس سے ڈرو جس نے ذمہ داری دی ہے۔ وَلَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰیٰتِیۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا دنیا کے قلیل مفاد کے عوض میری آیات کو فروخت نہ کرو۔

۹۔ وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ: جو لوگ اللہ کے قانون کے خلاف فیصلہ کرنے کو جائز اور درست سمجھ کر فیصلہ دے دیں، وہ کافر ہیں۔

احادیث

اس آیت کی تفسیر میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جن کو حکومت کا حق ہے وہ انبیاء ائمہ اور علماء ہیں۔ ربّانی امام کی طرف اشارہ ہے اور احبار علماء ہیں۔

اہم نکات

۱۔ علماء اور فقہاء دین کے محافظ ہیں۔

۲۔ علماء کو قانون کے نفاذ اور حکومت کا حق ہے۔

۳۔ کفر اختیار کرنے والوں کا ایک اہم کام قانون کی پامالی ہے۔

وَکَتَبۡنَا عَلَیۡہِمۡ فِیۡہَاۤ اَنَّ النَّفۡسَ بِالنَّفۡسِ ۙ وَ الۡعَیۡنَ بِالۡعَیۡنِ وَ الۡاَنۡفَ بِالۡاَنۡفِ وَ الۡاُذُنَ بِالۡاُذُنِ

۴۵۔ اور ہم نے توریت میں ان پر (یہ قانون) لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان

وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾

کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت ہیں اور زخموں کا بدلہ (ان کے برابر) لیا جائے، پھر جو قصاص کو معاف کر دے تو یہ اس کے لیے (گناہوں کا) کفارہ شمار ہوگا اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں پس وہ ظالم ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ : ہم نے ان یہودیوں پر یہ قانون لازم کر دیا تھا کہ جان کے بدلے جان۔ آنکھ پھوڑنے کے مقابلے آنکھ پھوڑ دی جائے گی اور ناک کاٹنے کے مقابلے میں ناک کاٹ دی جائے گی۔ کان چھیلنے کے مقابلے میں کان چھیل دیا جائے گا۔ دانت توڑنے کے مقابلے میں دانت توڑ دیا جائے گا۔

۲۔ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ : زخموں کا بھی بدلہ ہوتا ہے۔ یعنی زخم لگانے کے مقابلے میں زخم لگایا جائے گا.

۳۔ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ : اگر قصاص کو معاف کر دیا تو یہ معاف کرنے والے کے گناہوں کا کفارہ ہوگا۔

۴۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ : اور اگر قصاص میں معاف نہ کرنے کی صورت میں، حکم خدا کے مطابق فیصلہ نہ کیا تو یہ ظالم ہوں گے۔ علمائے یہود کی طرف سے احکام توریت میں تحریف و تغیر کے سلسلے میں توریت کے قانون قصاص کا ذکر ہو رہا ہے کہ آج کی رائج توریت میں بھی قصاص کے یہی احکام موجود ہیں جو قرآن نقل کر رہا ہے۔ چنانچہ موجودہ توریت میں آیا ہے:

> اگر وہ اس صدمے سے ہلاک ہو جائے تو جان کے بدلے میں جان لے اور آنکھ کے بدلے میں آنکھ، دانت کے بدلے دانت، ہاتھ کے بدلے ہاتھ، پاؤں کے بدلے پاؤں، جلانے کے بدلے جلانا، زخم کے بدلے زخم اور چوٹ کے بدلے چوٹ۔[1]

البتہ موجودہ توریت میں عفو کا کوئی ذکر نہیں ہے، جیسے قرآن میں ہے۔

اہم نکات

۱۔ تعزیراتی قوانین تمام ادیان میں موجود تھے۔

۲۔ عفو و درگزر سے قانون کی افادیت مجروح نہیں ہوتی۔

۳۔ قانون الٰہی کا اجرا نہ ہونے کی وجہ سے عدل ناپید اور ظلم عام ہو جاتا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو، خروج ۲۱۔۲۳۔۲۵

وَقَفَّيۡنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمۡ بِعِيۡسَى ابۡنِ مَرۡيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ التَّوۡرٰٮةِ ۖ وَاٰتَيۡنٰهُ الۡاِنۡجِيۡلَ فِيۡهِ هُدًى وَّنُوۡرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ التَّوۡرٰٮةِ وَهُدًى وَّمَوۡعِظَةً لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ۞	۴۶۔ اور ان کے بعد ہم نے عیسیٰ بن مریم کو بھیجا جو اپنے سے پہلے کی کتاب توریت کی تصدیق کرتے ہیں اور ہم نے انہیں انجیل عطا کی جس میں ہدایت اور نور تھا اور جو اپنے سے پہلے والی کتاب توریت کی تصدیق کرتی تھی اور اہل تقویٰ کے لیے ہدایت اور نصیحت تھی۔

تشریح کلمات

قَفَّيۡنَا: (ق ف و) قفوت اثرہ۔ کسی کے پیچھے چلنا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَفَّيۡنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمۡ بِعِيۡسَى ابۡنِ مَرۡيَمَ یعنی توریت کو تسلیم کرنے والے انبیاء کے ربانیون اور احبار کے بعد ہم نے عیسیٰ بن مریم کو مبعوث کیا۔ عَلٰۤى اٰثَارِهِمۡ کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ علی طریقتھم۔

۲۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ التَّوۡرٰٮةِ: عیسیٰ (ع) توریت کے من اللہ ہونے اور کتاب برحق ہونے کی تصدیق کرتے ہیں، جیسا کہ ہر آنے والا نبی سابقہ آسمانی کتب کی تصدیق کرتا ہے۔

۳۔ وَاٰتَيۡنٰهُ الۡاِنۡجِيۡلَ فِيۡهِ هُدًى وَّنُوۡرٌ: حضرت عیسیٰ (ع) کو انجیل عنایت ہوئی۔ اس میں ہدایت ہے، اللہ کی توحید و عقائد کی رہنمائی ہے اور نور بھی ہے، جس سے زندگی میں پیش آنے والے مسائل شرعیہ بیان ہوئے ہیں۔

۴۔ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ التَّوۡرٰٮةِ: انجیل کے عنایت ہونے کے ذکر کے بعد یہ جملہ دوبارہ تکرار ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ توریت کی تصدیق نبی مرسل کی طرف سے بھی ہوتی ہے اور کتاب منزل کی طرف سے بھی۔

۵۔ وَهُدًى وَّمَوۡعِظَةً لِّلۡمُتَّقِيۡنَ: اگرچہ انجیل سب کے لیے ہدایت و موعظہ کرتی ہے تاہم اس سے فائدہ اٹھانے والے اہل تقویٰ ہی ہوتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سلسلہ انبیاء کی ایک اہم کڑی ہیں۔ ان کو کوئی خصوصی (مثلاً ابن اللہ

ہونے کی) حیثیت حاصل نہیں ہے۔

۲۔ انجیل میں بنی نوع بشر کے لیے ہدایت و نور اور اہل تقویٰ کے لیے نصیحت موجود تھی۔

وَلۡیَحۡکُمۡ اَہۡلُ الۡاِنۡجِیۡلِ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فِیۡہِ ؕ وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۴۷﴾

۴۷۔ اور اہل انجیل کو چاہیے کہ وہ ان احکام کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے انجیل میں نازل کیے ہیں اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ فاسق ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلۡیَحۡکُمۡ اَہۡلُ الۡاِنۡجِیۡلِ: انجیل کے ماننے والوں کو چاہیے کہ وہ انجیل میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ نازل فرمایا ہے اس کے مطابق فیصلہ کریں۔

اہل انجیل اگر اپنی آسمانی کتاب پر عمل کریں تو توریت پر بھی عمل ہو جاتا ہے، کیونکہ سوائے چند منسوخ شدہ احکام کے، انجیل نے توریت کے احکام کی تصدیق کی ہے اور قرآن پر بھی عمل ہو سکتا ہے کیونکہ انجیل میں آنے والے رسول اور اس پر نازل ہونے والی کتاب کی تصدیق موجود ہے۔

اس طرح انجیل پر عمل ہونے سے سابقہ اور لاحقہ دونوں ادیان کا برحق ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والوں کو:

الف: آیت ۴۴ میں کافر،

ب: آیت ۴۵ میں ظالم اور

ج: آیت ۴۷ میں فاسق کہا ہے۔

خلاف تنزیل فیصلہ کرنا اگر بطور انکار ہے تو یہ کفر ہے، اگر بطور عملی انحراف ہے تو فسق۔ دونوں صورتوں میں ظلم بھی صادق آتا ہے۔ اہل کتاب اپنی کتابوں کے خلاف جو فیصلے کرتے ہیں، ان میں انکار بھی، انحراف بھی اور ظلم بھی ہے، لہٰذا یہ تینوں تعبیریں ان پر صادق آتی ہیں۔

۲۔ خلاف تنزیل فیصلہ کرنے والی غیر اسلامی عدالتوں پر بھی یہی کلیہ صادق آتا ہے کہ اگر حکم اللہ کی منکر ہیں تو کافر، انحراف ہے تو فاسق ہیں۔

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ مُہَیۡمِنًا عَلَیۡہِ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الۡحَقِّ ؕ لِکُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡکُمۡ شِرۡعَۃً وَّ مِنۡہَاجًا ؕ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَکُمۡ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّ لٰکِنۡ لِّیَبۡلُوَکُمۡ فِیۡ مَاۤ اٰتٰىکُمۡ فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ ؕ اِلَی اللّٰہِ مَرۡجِعُکُمۡ جَمِیۡعًا فَیُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ فِیۡہِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۴۸﴾

۴۸۔اور (اے رسول) ہم نے آپ پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جو حق پر مبنی ہے اور اپنے سے پہلے والی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور ان پر نگران و حاکم ہے، لہٰذا آپ اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق ان کے درمیان فیصلہ کریں اور جو حق آپ کے پاس آیا ہے اسے چھوڑ کر آپ ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں، ہم نے تم میں سے ہر ایک (امت) کے لیے ایک دستور اور طرز عمل اختیار کیا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا دیتا لیکن اللہ نے تمہیں جو حکم دیا ہے اس میں تمہیں آزمانا چاہتا ہے، لہٰذا نیک کاموں میں سبقت لے جانے کی کوشش کرو، تم سب کو اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے پھر وہ تمہیں ان حقائق کی خبر دے گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔

تشریح کلمات

مُهَيۡمِنًا: (ہ ی م ن) کے متعدد معانی بیان کیے جاتے ہیں۔مثلاً امین، نگران، محافظ، تائید اور حمایت۔ لیکن یہ سب ہیمنت کے حقیقی معنی کے لوازم میں ہیں۔ چونکہ اس کے حقیقی معنی حاکم اور قیومیت ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے مبارکہ میں المھیمن بھی ہے جو قیومیت کے معنی میں ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی معاملہ پر حاکم اور قیوم ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ وہ اس کا محافظ بھی ہے اور امین بھی۔ اس طرح مہیمن کے معنی حاکم، بالادست اور فوقیت ہیں۔

شِرۡعَةً: (ش ر ع) شریعة بقول بعض اصل میں پانی کے گھاٹ کو کہتے ہیں اور اسلامی دستور کو شریعت اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہاں سے مادی و روحانی سیرابی ہوتی ہے اور اکثر واضح راستہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

منهاج: (ن ہ ج) کشادہ راہ کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یہود و نصاریٰ کی کتاب کے ذکر کے بعد قرآن کا ذکر آیا۔ اس کو مبنی برحق قرار دینے کے بعد اس قرآن کی دو اہم خصوصیات بیان فرمائیں۔

الف۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ: یہ قرآن اپنے سے پہلے نازل شدہ کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔

ب۔ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ: یہ قرآن سابقہ ادیان کی کتابوں پر حاکم اور بالادست ہے۔ مھیمن و مصدق سے یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ توریت و انجیل اپنی جگہ مبنی برحق اللہ کی طرف سے نازل شدہ آسمانی کتابیں ہیں لیکن قرآن ان کتابوں پر حاکم ہے۔ اس هیمنت اور حاکمیت کی بنا پر سابقہ کتابیں منسوخ، قرآن ناسخ، سابقہ کتابیں وقتی، قرآن دائمی و ابدی ہے اور حاکمیت کی بنیاد پر تمام آسمانی کتابوں پر قرآن مقدم ہے۔

۲۔ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ: ان یہودیوں کے درمیان فیصلہ وہی کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے۔ یعنی حکم قرآن کے مطابق ان میں فیصلہ کرو۔ چونکہ اس مسئلہ میں حکم قرآن توریت کے مطابق ہے اور جہاں مطابق نہیں، وہاں بھی حکم قرآن مقدم ہے، چونکہ قرآن سابقہ کتابوں پر حاکم اور بالا دست ہے۔

۳۔ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ: فیصلہ ما انزل اللّٰہ کے مطابق ہی کریں۔ ان یہودیوں کی خواہشات کے مطابق فیصلہ نہ کریں۔ یہ تعبیر صرف یہ بتانے کے لیے ہے کہ یہودیوں کی خواہشات، حکم خدا کے خلاف اور قابل نفرت ہیں۔

۴۔ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا: ہم نے تم میں سے ہر ایک امت کے لیے ایک دستور اور طرز عمل مقرر کیا ہے۔ کسی امت کے لیے بنائے گئے دستور کو شریعت کہتے ہیں۔ یہ دستور اس امت کے عصری تقاضوں کے مطابق ترتیب پاتا ہے۔ ان تقاضوں کے بدلنے سے شریعتیں بدل جاتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انسانی معاشروں نے غار کی زندگی سے ایٹمی دور تک مختلف مراحل طے کیے ہیں۔ ہر مرحلہ کے لیے اس کے تقاضوں کے مطابق ایک دستور حیات، ایک شریعت بنائی گئی۔ جب انسانیت سن بلوغت کو پہنچی تو اسے ایک مکمل جامع اور ابدی و دائمی دستور حیات دے دیا گیا۔ مِنْهَاجًا۔ منہاج بعض کے نزدیک اسی شریعت کے معنوں میں ہے، اگرچہ اس کے معنی واضح راستے کے ہیں تاہم مراد شریعت ہے۔

۵۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً: اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک ہی امت قرار دے کر ایک ہی نظام شریعت و دستور حیات عنایت فرماتا، مگر چونکہ امتحان و آزمائش مراد تھی اور امتحان ہر عصر و ہر زمانے میں فراہم شدہ صلاحیتوں کے مطابق ہو سکتا ہے۔

۶۔ وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ: لیکن اللہ نے تمہیں جو حکم دیا ہے اس میں آزمانا چاہتا ہے،

اس لیے تم کو ایک امت نہیں بنایا۔ لہٰذا مختلف زمانوں کی مختلف صلاحیتوں اور مختلف نعمتوں کے مطابق مختلف امتحانات ہوں گے۔ یہاں سے دستور کا بھی مختلف ہونا ضروری قرار پایا، کیونکہ انسان ارتقا پذیر ہے اور ارتقا میں مختلف مراحل طے ہوتے ہیں، لہٰذا ہر مرحلہ کے لیے الگ دستور اور ہر کلاس کے لیے الگ پرچہ ہونا ضروری ہے۔

یہاں صاحب تفسیر المنار بجا طور پر دروازہ اجتہاد بند رکھنے والوں کو حجت خدا کو مفلوج کرنے اور اس شریعت کی ممتاز حیثیت کو ختم کرنے کے مترادف قرار دیتے ہیں۔

۷۔ فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ: نیکیوں کی طرف سبقت لے جانا گزشتہ باتوں کی روشنی میں لازمی قرار پاتا ہے۔ کیونکہ اس ارتقا پذیر انسان کو مختلف ارتقائی مراحل میں مختلف امتحان سے گزرنا ہے اور اسی مقصد کے لیے اسے ایک شریعت اور ایک دستور حیات بھی عطا ہوا ہے۔ لہٰذا اس امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اس دستور پر عمل پیرا ہونے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش ہی اصل زندگی ہے۔

اہم نکات

۱۔ سابقہ کتابوں پر قرآن کو حاکمیت، گزشتہ ادیان پر دین اسلام کو فوقیت حاصل ہے۔

۲۔ انسان ارتقا پذیر ہے اور ہر ارتقائی مرحلہ کے لیے ایک دستور حیات کی ضرورت ہے۔

۳۔ شریعت کا ہدف اور مقصد امتحان و آزمائش ہے۔

۴۔ شریعت پر عمل پیرا ہونے میں سبقت لے جانا ہی مقصد زندگی ہے۔

وَ اَنِ احۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ وَ احۡذَرۡہُمۡ اَنۡ یَّفۡتِنُوۡکَ عَنۡۢ بَعۡضِ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ اِلَیۡکَ ؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاعۡلَمۡ اَنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ اَنۡ یُّصِیۡبَہُمۡ بِبَعۡضِ ذُنُوۡبِہِمۡ ؕ وَ اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوۡنَ ﴿۴۹﴾

۴۹۔ اور جو حکم اللہ نے نازل فرمایا ہے اس کے مطابق ان میں فیصلے کریں اور آپ ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں اور ان سے ہوشیار رہیں، کہیں یہ لوگ اللہ کی طرف سے آپ پر نازل شدہ کسی دستور کے بارے میں آپ کو فتنے میں نہ ڈالیں، اگر یہ منہ پھیر لیں تو جان لیجیے کہ اللہ نے ان کے بعض گناہوں کے سبب انہیں مصیبت میں مبتلا کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے اور لوگوں میں سے اکثر یقیناً فاسق ہیں۔

شان نزول

ابن عباس سے منقول ہے کہ رسول اللہ (ص) کو اپنی تعلیمات کی خلاف ورزی پر آمادہ کرنے کے لیے یہود کے بعض علماء نے ایک سازش کی۔ چنانچہ انہوں نے حضورؐ سے کہا: ہمارے مابین ایک نزاع ہے۔ اگر آپؐ ہمارے حق میں فیصلہ کر دیں تو ہم آپؐ پر ایمان لائیں گے اور ہمارے ایمان لانے پر دوسرے یہودی بھی آپؐ پر ایمان لائیں گے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاَنِ احۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ : اپنے فیصلوں میں یہودیوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔ جو اللہ نے حکم نازل فرمایا ہے، اس کے مطابق فیصلے کریں۔

۲۔ وَاحۡذَرۡہُمۡ اَنۡ یَّفۡتِنُوۡکَ : ان یہودیوں سے ہوشیار رہیں۔ کہیں یہ لوگ آپ کو کسی فتنے میں مبتلا کر کے حکم خدا سے منحرف نہ کریں۔ اس تعبیر کا مقصد یہ ہے کہ یہود کا مکر و فریب فاش ہو جائے اور یہود بھی اپنی سازش کی کامیابی سے مایوس ہو جائیں اور یہ بھی بیان کرنا بھی مقصود ہو سکتا ہے کہ احکام الٰہی کی حرمت چند افراد کے ایمان لانے سے زیادہ ہے تاکہ مسلمان احکام الٰہی میں مصلحتوں کا شکار نہ ہوں۔

۳۔ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا : اگر یہ ایمان نہیں لائیں گے تو اس ایمان نہ لانے کا نتیجہ خود یہ لوگ بھگتیں گے اور اپنے جرائم کی سزا کا وہ سامنا کریں گے۔

حضرت علامہ طباطبائی قدس سرہ وَلَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ پر ممکنہ اعتراض کا یہ جواب دیتے ہیں:

> عصمت کی وجہ سے اختیار سلب نہیں ہوتا اور نہ تکلیف ساقط ہوتی ہے بلکہ یہ علم و آگہی کی طرح ہے کہ کسی بات پر علم و یقین حاصل ہونے سے انسانی طاقت اور اعضا کی قوت محرکہ تو مفلوج نہیں ہوتی کہ اس سے فعل و ترک کا اختیار سلب ہو جائے۔ مثلاً ایک کھانے میں زہر موجود ہونے پر علم و یقین حاصل ہوتا ہے تو انسان اس کو کھانے کی غلطی کا ارتکاب نہیں کرتا، تاہم اس کے اعضا و جوارح میں اس زہریلی غذا کو کھانے کی طاقت موجود ہوتی ہے۔ ہاتھ، منہ، زبان اور دانتوں میں کھانے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے اور وہ کھا سکتے ہیں اور ترک بھی کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اس زہریلی غذا کا ترک کرنا اختیاری ہے، اگرچہ اس علم کے باوجود زہر کھانے کا امکان نہیں رہتا۔[1]

----

[1] المیزان

اہم نکات

۱۔ رسولؐ سے خطاب کے ضمن میں امت کو یہود کی گہری سازشوں سے آگاہ کرنا مقصود ہے کہ وہ مقام عصمت پر فائز خود رسول کریمؐ کو اپنی تعلیمات سے منحرف کرنے کی سازش کرتے ہیں تو ضعیف مفاد پرست، علی الخصوص اقتدار پرست افراد کے انحراف کے لیے ان کی سازش نہایت گھناؤنی ہو گی۔

۲۔ اگر اللہ کسی قوم یا فرد کو کسی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے تو خود ان کے گناہوں کی پاداش میں کرتا ہے۔ اللہ پہل نہیں کرتا۔

اَفَحُكۡمَ الۡجَاهِلِيَّةِ يَبۡغُوۡنَ ؕ وَ مَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكۡمًا لِّقَوۡمٍ يُّوۡقِنُوۡنَ ﴿۵۰﴾

۵۰۔ کیا یہ لوگ جاہلیت کے دستور کے خواہاں ہیں؟ اہل یقین کے لیے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہے؟

تفسیر آیات

۱۔ اَفَحُكۡمَ الۡجَاهِلِيَّةِ: سابقہ آیت کے ساتھ مربوط کر کے اس آیہ شریفہ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ خواہشات نفسانی کی پیروی کرنا جاہلیت ہے۔ ہمارے معاصر نظامہائے حیات کے وضع کرنے والے اور جدید تقاضوں کے بہانے سے حکم الٰہی سے انحراف کرنے والے، جاہلیت کی اس قرآنی تعریف میں صف اول میں نظر آتے ہیں۔ مغرب کی جدید جاہلیت نے تو قانون وضع کرتے ہوئے خواہشات پرستی میں قدیم جاہلیت کو بھی سرخرو کر دیا ہے۔

۲۔ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكۡمًا: اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہو سکتا ہے جو اپنی مخلوقات کے رازہائے حیات سے واقف ہو؟ کون ہو سکتا ہے جو اپنے بندوں کے حق میں اللہ سے زیادہ مہربان ہو؟۔

اہم نکات

۱۔ فیصلوں میں خواہشات کی پیروی کرنا جاہلیت ہے۔

۲۔ جاہلیت کے مقابلے میں اہل یقین ہیں، جن کی نظر میں حکم خدا ہی بہترین حکم ہے۔

۳۔ جاہلیت کی ایک علامت یہ بھی سامنے آ گئی کہ وہ اہل یقین نہیں ہوتے بلکہ شک و اضطراب میں ہوتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوا الۡيَهُوۡدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوۡلِيَآءَ ‌ۘ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ‌ ؕ وَمَنۡ يَّتَوَلَّهُمۡ مِّنۡكُمۡ فَاِنَّهٗ مِنۡهُمۡ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۵۱﴾

۵۱۔اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو اپنا حامی نہ بناؤ، یہ لوگ آپس میں حامی ضرور ہیں اور تم میں سے جو انہیں حامی بناتا ہے وہ یقیناً انہی میں شمار ہو گا، بے شک اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا۔

شان نزول

اس وقت مدینہ کے اطراف میں تین اہم قبائل بستے تھے۔ بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریظہ۔ ان قبائل نے بعد میں عہد شکنی کی اور صلح توڑ کر جنگ کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ عرب عیسائیوں کے ساتھ رومی عیسائی بھی یہودیوں کے ساتھ اسلام دشمنی میں کھڑے ہو گئے۔ ایسے حالات میں یہ چند آیات نازل ہوئیں کہ یہود و نصاریٰ کو اپنا حامی و ناصر نہ بناؤ۔

تفسیر آیات

۱۔ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ: یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے حامی اور سرپرست ہیں۔ قرآن مجید قیامت تک کے دشمنانِ اسلام کے بارے میں نہایت باریک حقائق کو بیان فرماتا ہے کہ یہود و نصاریٰ آپس میں خواہ کتنی ہی دشمنی اور عداوت کا اظہار کریں، یہ لوگ اسلام دشمنی میں آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہوں گے۔

۲۔ وَمَنۡ يَّتَوَلَّهُمۡ: جو ان سے دوستی کرے گا، اس کا شمار انہی میں ہو گا۔ کیونکہ احساس و شعور جس کے حق میں ہو گا، محبت بھی اسی سے ہوتی ہے اور قلبی لگاؤ اور محبت کے آثار کردار میں نمودار ہوتے ہیں۔ لہٰذا جس قوم سے دوستی ہو گی اس کا شمار اسی قوم سے ہونا ایک طبعی امر ہے۔

ہم نے سورہ آل عمران آیت ۲۸ میں اس موضوع پر ضروری بحث کی ہے کہ ولایت کی چار قسمیں ہیں: ولایت نصرت۔ ولایت محبت۔ ولایت وراثت اور ولایت اطاعت۔ آیت میں مطلق ولایت کو ممنوع قرار دیا ہے، لہٰذا اہل کتاب کے ساتھ ہر قسم کی ولایت قائم کرنا ممنوع ہے۔

واضح رہے ہر قسم کی ولایت ممنوع ہے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر جگہ ان سے اظہار نفرت کیا جائے اور انسانی تعلقات قائم نہ کیے جائیں، بلکہ کفار اگر مسلمانوں سے حالت جنگ میں نہیں ہیں تو ان پر احسان و انصاف کرنے کا حکم ہے۔ ملاحظہ ہو سورہ ممتحنہ آیت ۸۔

اہم نکات

۱۔ یہود و نصاریٰ سے معاملات میں مصالحت جائز ہو سکتی ہے لیکن قلبی محبت جائز نہیں۔

۲۔ یہود و نصاریٰ آپس میں ایک دوسرے کے حامی اور دوست ثابت ہوں گے۔

۳۔ دوستی اور محبت ہی کسی قوم کے ساتھ محشور ہونے کا معیار ہے۔

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

۵۲۔ پس آپ دیکھتے ہیں کہ جن کے دلوں میں بیماری ہے وہ ان میں دوڑ دھوپ کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ہمیں اس بات کا خوف ہے کہ کہیں ہم پر کوئی گردش نہ آ پڑے پس قریب ہے کہ اللہ فتح دے یا اپنی طرف سے کوئی اور بات ظاہر کرے پھر یہ لوگ اپنے اندر چھپائے ہوئے نفاق پر نادم ہوں گے۔

تفسیر آیات

یہ بات تقریباً مسلم ہے کہ سورہ مائدہ سال حجۃ الوداع میں فتح مکہ کے بعد نازل ہوا، لہٰذا اس آیت میں جس فتح کا ذکر ہے وہ کوئی اور فیصلہ کن فتح ہے۔ مکہ میں نازل ہونے والی آیات اور مدنی زندگی کے اوائل میں بھی یہود و نصاریٰ کا ذکر نہیں آتا، کیونکہ اس زمانے میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ واسطہ نہیں پڑتا تھا۔ مدنی زندگی کے آخری نصف حصے میں فتح مکہ کے بعد اگرچہ اسلام ایک طاقت بن کر ابھرا تھا، تاہم مدینہ اور اطراف مدینہ کے یہود و نصاریٰ اسلام کے خلاف سازشوں میں اپنی قوت کو مجتمع کر رہے تھے۔ اس وقت اسلام دشمن طاقتیں تین گروہ میں منقسم تھیں: ایک گروہ نے رسول اسلامؐ سے مصالحت کر لی تھی۔ دوسرا گروہ اسلام کے ساتھ برسر جنگ تھا اور تیسرا گروہ نہ صلح، نہ جنگ، بلکہ انتظار میں تھا کہ فیصلہ کن فتح کس کی ہو گی؟ ان میں سے کچھ لوگ کفر کا ہی اظہار کرتے تھے اور کچھ منافق لوگ بظاہر اسلام کا اظہار کرتے تھے اور اندر سے وہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ بھی مربوط تھے تاکہ اگر اسلام شکست سے دوچار ہو جائے تو جائے پناہ مل جائے۔

۱۔ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ: یہ مریض قلب لوگ منافقین بھی ہو سکتے اور منافقین کے علاوہ بھی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ سورہ انفال آیت ۴۹ میں فرمایا:

اِذۡ یَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ .... جب (ادھر) منافقین اور جن کے دلوں میں بیماری تھی، کہ رہے تھے....

یہ اس وقت کی بات ہے جب اسلام کفر کے ساتھ برسر پیکار تھا۔

۲۔ یَقُوۡلُوۡنَ نَخۡشٰۤی: ان کے دل میں ایمان نہ ہونے کی وجہ سے وہ مضطرب تھے۔اسلام کی فتح پر ان کا ایمان نہ تھا۔ ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ مسلمانوں کو شکست ہو جائے اور یہود غالب آ جائیں تو ہمارا کیا بنے گا؟ جبکہ امر واقع یہ ہو رہا تھا کہ فتح اسلام کی ہو رہی ہے اور یہود شکست سے دوچار ہو رہے ہیں۔

۳۔ فَعَسَی اللّٰهُ اَنۡ یَّاۡتِیَ بِالۡفَتۡحِ: اب یہ کمزور ایمان یا منافق لوگ جس گردش سے فرار کر رہے تھے، اسی میں جا پھنسے۔ اب ندامت کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ممکن ہے فتح سے مراد اسلام کی فیصلہ کن کامیابی ہو اور ممکن ہے فتح خیبر اور دیگر علاقوں کی فتح ہو۔ ان کے نزدیک اسلام و کفر میں سے فتح کسی ایک کی ہو سکتی تھی۔

۴۔ اَوۡ اَمۡرٍ مِّنۡ عِنۡدِهٖ: یا کوئی اور بات، سے کیا مراد ہے؟ بعض کے نزدیک منافقین کے نفاق کا فاش ہونا ہے۔ بعض کے نزدیک یہود کی جلا وطنی اور مدینہ سے بے دخلی ہے۔ بعض کے نزدیک جزیہ کی خواری ہے۔

۵۔ فَیُصۡبِحُوۡا عَلٰی مَاۤ اَسَرُّوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ نٰدِمِیۡنَ: جس نفاق کو ان لوگوں نے چھپایا تھا، آج اسلام کی کامیابی سے وہ ندامت میں مبتلا ہیں۔ واضح رہے اصبح کے معنی ہیں ہمیشہ صبح میں داخل ہو گے، یا صبح کا وقت نہیں ہوتا بلکہ اصبح، صار کے معنوں میں زیادہ آتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ دل کی بیماری شک و تردد ہے۔ جب کہ دل کی صحت ایمان و یقین ہے۔

۲۔ جن کے دلوں میں ایمان و ایقان نہ ہو، وہ ہمیشہ گردش ایام کے خوف سے مضطرب الحال رہتے ہیں۔

۳۔ اللہ پر تکیہ اور توکل نہ ہو تو انجام ندامت کے سوا کچھ نہ ہو گا۔

وَ یَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِیۡنَ اَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَیۡمَانِهِمۡ ۙ اِنَّهُمۡ لَمَعَکُمۡ ؕ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فَاَصۡبَحُوۡا خٰسِرِیۡنَ ﴿۵۳﴾

۵۳۔ اور اہل ایمان کہیں گے: کیا یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کے نام کی انتہائی کڑی قسمیں کھاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں؟ ان کے اعمال ضائع ہو گئے، پس وہ نامراد ہو کر رہ گئے۔

تشریح کلمات

هٰٓؤُلَآءِ: یعنی یہود و نصاریٰ۔ مَعَکُمۡ کا خطاب منافقین سے ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَیَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا: اسلام کی فیصلہ کن کامیابی کے بعد اہل ایمان دل کے مریض منافقوں سے کہیں گے: کہاں گئے وہ یہود و نصاریٰ جن کے ساتھ تمہارا گٹھ جوڑ تھا اور وہ تمہیں قسمیں کھا کر یقین دلایا کرتے تھے کہ اسلام کے خلاف جنگ میں ہم تمہارے ساتھ ہیں؟ آج اسلام کی فتح کے موقع پر وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں ہیں؟

۲۔ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ: ان بیار دل لوگوں نے اپنے آپ کو گردش زمانہ سے بچانے کے لیے جو سازش کی تھی اور مسلمانوں کی شکست کی صورت میں خود کو محفوظ رکھنے کے لیے جو بھی چارہ کار سوچا تھا، وہ ساری کوششیں بے سود ہو کر رہ گئیں۔

اہم نکات

۱۔ دنیا میں مسلمانوں کے نزدیک ان کی قلعی کھل گئی۔

۲۔ آخرت میں ان کے سارے اعمال حبط ہوں گے۔

۳۔ اس طرح دنیا و آخرت دونوں میں یہ لوگ خسارے میں رہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَنۡ یَّرۡتَدَّ مِنۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِهٖ فَسَوۡفَ یَاۡتِی اللّٰهُ بِقَوۡمٍ یُّحِبُّهُمۡ وَیُحِبُّوۡنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ ۫ یُجَاهِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَلَا یَخَافُوۡنَ لَوۡمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰهِ یُؤۡتِیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۵۴﴾

۵۴۔ اے ایمان والو! تم میں سے جو بھی اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ بہت جلد ایسے لوگوں کو پیدا کرے گا جن سے اللہ محبت کرتا ہو گا اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہوں گے، مومنین کے ساتھ نرمی سے اور کافروں کے ساتھ سختی سے پیش آنے والے ہوں گے، راہ خدا میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے، یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا، بڑا علم والا ہے۔

تشریح کلمات

يَّرْتَدَّ: (ر د د) الارتداد، اس راستے پر پلٹنے کو کہتے ہیں جس سے کوئی آیا ہو، ردۃ کفر کی طرف لوٹنے کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے۔

اَذِلَّةٍ: (ذ ل ل) الذُلّ (بضم ذال) زور وقہر کی وجہ سے جھکنے کو کہتے ہیں۔ ذِلّ (بکسر ذال) نرم خو اور طاعت کیش بن جانا۔

اَعِزَّةٍ: (ع ز ز) العِزّ اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان کو مغلوب ہونے سے محفوظ رکھے۔

شان نزول

اس آیت کے شان نزول میں متعدد اور مختلف روایات مذکور ہیں۔ ان میں سب سے قابل اعتبار روایت یہ ہے کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام اور ان کے اصحاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس روایت کو حضرات عمار، سہل بن سعد، سلمہ بن اکوع، ابو وقاص، ابوہریرہ، حذیفہ، ابن عباس اور امام محمد باقر علیہ السلام نے روایت کیا ہے: فتح خیبر کے موقع پر رسول کریمؐ نے حضرت علی علیہ السلام کے حق میں یہ الفاظ بیان فرمائے:

اُعْطِيَنَّ الرَّايَةَ غَداً رَجُلًا يُحِبُّ لاللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَ يُحِبُّهُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهُ كَرَّاراً غَيْرَفَرَّارٍلَا يَرْجِعُ حَتّٰى يَفْتَحَ اللّٰهُ عَلَى يَدِيْهِ۔[1]

کل میں علم ایسے مرد کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول (ص) سے محبت رکھتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول (ص) اس سے محبت رکھتے ہیں۔ وہ پلٹ پلٹ کر حملہ کرنے والا ہو گا، فرار کرنے والا نہ ہو گا۔ وہ اس وقت تک واپس نہیں پلٹے گا جب تک اللہ اس کے ہاتھ فتح و نصرت عطا نہ کرے۔

تفسیر آیات

۱۔ مَنْ يَّرْتَدَّ: سابقہ آیت سے اس طرح ربط بنتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی اور محبت نہ رکھو۔ جو ایسا کرے گا وہ انہی میں سے ہوگا۔ اس طرح تم میں سے کوئی مرتد ہو جاتا ہے تو اللہ ایسے لوگوں کو تمہاری جگہ پیدا کرنے والا ہے جو مرتد نہیں ہوں گے۔

۲۔ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ: اس آیت میں اس بات کی پیشگوئی ہے کہ اہل ایمان میں سے کچھ لوگ مرتد ہو جائیں گے۔

۳۔ نیز یہ پیشگوئی ہے کہ اللہ ایک ایسی قوم پیدا کرنے والا ہے جن میں ان مرتد ہونے والوں کے اوصاف نہیں ہوں گے بلکہ ان میں اچھے اوصاف موجود ہوں گے اور وہ اوصاف یہ ہوں گے:

الف۔ يُّحِبُّهُمْ: اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرے گا۔ اس محبت کا لازمہ یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہر

---

[1] سنن ابن ماجہ حدیث ۳۸۰۸۔ صحیح البخاری باب ما قیل فی لواء النبی حدیث ۲۸۱۲ و ۲۸۴۳۔ صحیح مسلم باب فضائل علی

قسم کے رذائل سے پاک رکھے گا۔ وہ اطاعت الٰہی میں منہمک ہوں گے اور آیہ قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ ...[1] کے مطابق اتباع رسولؐ محبت الٰہی کے حصول کا زینہ ہے اور اتباع رسولؐ میں تمام خوبیاں مجتمع ہیں۔ تاہم برائے مزید وضاحت دوسرے اوصاف بیان کیے۔

ب۔ وَیُحِبُّوۡنَہٗۤ: وہ اللہ سے محبت کریں گے۔ اس کا لازمہ یہ ہے کہ وہ ہر چیز پر اللہ کو مقدم سمجھیں گے۔ لہٰذا اللہ کی محبت کے ساتھ اللہ کے دشمنوں کی محبت کے لیے ان کے دل میں کوئی جگہ نہ ہو گی۔

ج: اَذِلَّۃٍ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ: وہ اپنے برادران ایمان ہی کو مقام والا پر فائز سمجھتے ہیں۔ ان کے سامنے سر تعظیم خم کرتے ہیں۔ چنانچہ والدین کے بارے میں فرمایا: وَ اخۡفِضۡ لَہُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ ...[2] اور عجز و نیاز سے ان کے آگے جھکا کرو۔ جب کہ مرتد ہونے والوں کی علامت یہ ہے کہ کہ وہ اہل ایمان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

د: اَعِزَّۃٍ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ: وہ کافروں کے بارے میں کسی مصلحت پرستی یا سودا بازی میں نہیں آتے، جب کہ مرتد ہونے والے، کافروں کو اپنا آقا بناتے ہیں۔ ان کی بالادستی قبول کرتے ہیں۔

ھ: یُجَاہِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ: راہ خدا میں جہاد کرتے ہیں۔ جان و مال کی قربانی دیتے ہیں۔ جب کہ اہل نفاق یا تو جہاد میں شرکت نہیں کرتے یا ذاتی مفاد کے لیے جہاد کرتے ہیں۔

و: وَلَا یَخَافُوۡنَ: وہ کسی ملامت کو راہ جہاد میں حائل نہیں سمجھتے۔ ان کی نگاہ اللہ کی خوشنودی پر ہے، لوگوں پر نہیں کہ وہ کیا کہتے ہیں۔

۴: یعنی اللہ کا ان سے محبت کرنا، ان کا اللہ سے محبت کرنا، مؤمنین کے ساتھ نرمی سے اور کافروں کے ساتھ سختی سے پیش آنا، راہ خدا میں جہاد کا حق ادا کرنا اور راہ خدا میں کسی ملامت گر کی اعتنا نہ کرنا، یہ سب ان پر اللہ کا فضل ہے۔

اہم نکات

۱۔ اس امت میں کچھ لوگ ایمان لانے کے بعد مرتد ہو گئے تھے۔

۲۔ ان کی جگہ نئی قوم پیدا ہو گی جو ان تمام خلاؤں کو پر کرے گی جو ان لوگوں کے مرتد ہونے سے پیدا ہوئے ہیں۔

۳۔ اس قوم کے دل عشق الٰہی سے سرشار ہوں گے۔

۱؎ ۳ آل عمران: ۳۱ ۲؎ ۱۷ اسراء: ۲۴

۴۔ اپنی قوم میں خود اعتمادی کی مثال قائم کریں گے اور اقوام عالم میں اپنی ہی قوم کو لائق تعظیم سمجھیں گے۔
۵۔ غیر مسلموں کی کسی قسم کی بالادستی قبول نہیں کریں گے۔
۶۔ جہاد فی سبیل اللہ کو اپنا شعار بنائیں گے۔
۷۔ ریاکاری کا شائبہ تک نہ ہوگا۔ لہٰذا وہ لوگوں کی باتوں پر توجہ نہیں دیں گے۔

اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَ ہُمۡ رٰکِعُوۡنَ ﴿۵۵﴾

۵۵۔ تمہارا ولی تو صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔

وَ مَنۡ یَّتَوَلَّ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فَاِنَّ حِزۡبَ اللّٰہِ ہُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ ﴿۵۶﴾

۵۶۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول اور ایمان والوں کو اپنا ولی بنائے گا تو (وہ اللہ کی جماعت میں شامل ہو جائے گا اور) اللہ کی جماعت ہی غالب آنے والی ہے۔

تشریح کلمات

حِزۡب: وہ جماعت جس میں سختی اور تشدد پایا جائے۔ (مفردات) یعنی اپنے مؤقف میں سودے بازی کرنے والے نہ ہوں۔

شان نزول

یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی، جب مسجد نبوی میں آپؑ نے حالت رکوع میں ایک سائل کو اپنی انگوٹھی عطا فرمائی۔ اس روایت کو اکثر محدثین، مؤرخین اور مفسرین نے ذکر کیا ہے اور اس حدیث کے راویان درج ذیل ہیں:

۱۔ حضرت ابن عباس۔ ۲۔ عمار بن یاسر۔ ۳۔ عبد اللہ بن مسلم ۔ ۴۔ سلمہ بن کہیل۔ ۵۔ انس بن مالک۔ ۶۔ عتبہ بن حکیم۔ ۷۔ عبد اللہ بن ابی۔ ۸۔ ابوذر غفاری۔ ۹۔ جابر بن عبد اللہ انصاری۔ ۱۰۔ عبد اللہ بن غالب۔ ۱۱۔ عمرو بن العاص۔ ۱۲۔ ابو رافع ۱۳۔ خود حضرت امام علی علیہ السلام۔ ۱۴۔ حضرت امام حسن علیہ السلام ۱۵۔ حضرت علی بن الحسین زین العابدین علیہ السلام ۔ ۱۶۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام۔

اصحاب رسولؐ و ائمہ کی یہ روایت درج ذیل مصادر میں مطالعہ کر سکتے ہیں۔

تفسیر طبری ۶: ۱۸۶، اسباب نزول واحدی، شواهد التنزیل میں حضرت ابن عباس سے پانچ

روایات موجود ہیں۔ ملاحظہ ہو جلد اول ص ۱۶۱۔ ۱۶۶ اور ص ۱۶۷۔ ۱۶۹ میں چھ اور روایات موجود ہیں۔ انساب الاشراف بلاذری، غرائب القرآن نیشاپوری، تفسیر در منثور سیوطی، لباب النقول فی اسباب النزول (از معالم المدرستین)، تفسیر سمرقندی ۱: ۴۴۵، البحر المحیط ۴: ۳۰۰۔

شاعر رسول جناب حسان بن ثابت نے اس آیت کی شان نزول کے بارے میں یہ اشعار کہے:

فانت الذی اعطیت اذ کنت راکعاً
زکاۃ فدتك النفس یا خیر راکع
فانزل فیك اللّٰہ خیر ولایۃ
و بینها فی محکمات الشرائع [1]

آپ ہی وہ ذات ہیں جس نے حالت رکوع میں زکوۃ دی۔ اے رکوع کرنے والوں میں سب سے افضل، آپ پر جان قربان۔

چنانچہ اللہ نے آپ کے لیے بہترین ولایت نازل فرمائی اور اسے اپنی محکم شریعتوں میں بیان فرمایا۔

قاضی یحییٰ نے اپنے معروف کتاب المواقف صفحہ ۴۰۵، شریف جرجانی نے شرح مواقف ۸: ۳۶۰، سعد الدین تفتازانی نے شرح مواقف ۵: ۱۷ اور علاء الدین قوشجی نے شرح تجرید میں کہا ہے کہ اس بات پر اجماع ہے کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

ان تمام محدثین مفسرین، مورخین اور متکلمین کے مقابلے میں ابن تیمیہ کا یہ قول نہایت قابل توجہ ہے۔ اس شخص کی نص عبارت یہ ہے:

قد وضع بعض الکذابین حدیثاً مفتری ان هذه الآیة نزلت فی علی لما تصدق بخاتمه فی الصلوة، وهذا کذب باجماع اهل العلم بالنقل وکذبه بین.. و ان علیا لم یتصدق بخاتمه فی الصلوة و اجمع اهل العلم بالحدیث علی ان القصة المرویة فی ذلك من الکذب الموضوع و ان جمهور الامة لم تسمع بهذا الخبر۔ [2]	بعض کذاب لوگوں نے ایک من گھڑت حدیث بنائی ہے کہ یہ آیت علی (علیہ السلام) کی شان میں نازل ہوئی، جب انہوں نے نماز میں اپنی انگوٹھی صدقہ میں دے دی۔ نقل (احادیث) کے اہل علم کا اجماع ہے کہ یہ جھوٹ ہے اور اس کا جھوٹ واضح ہے۔ علی نے اپنی انگوٹھی کا کوئی صدقہ نہیں دیا۔ حدیث کے اہل علم کا اجماع ہے کہ یہ کہانی من گھڑت، جھوٹ ہے اور جمہور امت نے ایسی کوئی روایت سنی ہی نہیں۔

---

[1] تفسیر روح المعانی ۵: ۲۹ باب ۵۵ ۔ الصراط المستقیم ۱: ۲۶۵ [2] منہاج السنۃ ۲: ۳۰

یہ ہے دیانت اور امانت فی النقل۔ گویا کہ ایک درجن سے زائد اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اورتقریباً تمام مفسرین اور متکلمین اس امت میں شمار نہیں ہوتے یا اس امت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کوئی اور جمہور امت ہے جس نے اس قسم کی روایت سنی ہی نہیں۔

ولی کے معنی: وَلِیْ کے متعدد معانی بیان کیے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اقتدار و سرپرستی اور تصرف میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بعد ناصر اور محبّ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ہم ذیل میں لسان العرب مادہ و ل ی سے ان مقامات کا ایک اجمالی ذکر کرتے ہیں۔ وَلِیْ اقتدار و سرپرستی اور تصرف در امور کے معنوں میں استعمال ہوا کرتا ہے۔

وَلِیْ: اسماء اللّٰہ میں سے ہے، جس کے معنی المتولی لامور العالم۔ امور کائنات چلانے والے کے معنوں میں۔ بعض نے کہا ہے، یہاں الناصر بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔

اَلْوَالِیْ: یہ لفظ و ل ی سے مشتق ہے۔ اس کے معنی ہیں: مالك الاشياء جميعها و المتصرف فيها۔ تمام اشیاء کا مالک اور ان میں تصرف کرنے والا۔

اِلوِلَایَة: یہ والی کا مصدر ہے (بکسر واو)۔ سلطنت و امارت کے معنوں میں ہے۔ بعض اہل لغت کہتے ہیں: الولاية (بالکسر) سلطنت و امارت کے معنوں میں آتا ہے۔ الولاية (بالفتح) نصرت کے معنوں میں ہے۔

اَوْلیٰ: یہ و ل ی سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے: احق۔ زیادہ حقدار۔

اِسْتَوْلیٰ: یہ بھی و ل ی سے مشتق ہے۔ غلبہ اور بالادستی کے معنوں میں ہے۔

اَلْمُتِوَلِّی: یہ بھی و ل ی سے مشتق ہے۔ کسی امر کے اختیارات جس کے ہاتھ میں ہوں، اس کو متولی کہتے ہیں۔

وَلَّیْتُ: کے معنی ہیں قلدته ولايته۔ میں نے اس کے اختیارات میں دے دیا۔

اَلْوَلِیّ: كل من ولى امر احد فهو وليه۔ جو کسی کے امور کی انجام دہی ہاتھ میں لے، وہ اس کا ولی ہے۔

اَلْوَلِیّ: الذی یدبر الامر۔ ولی وہ ہے جو امور کی تدبیر کرتا ہے۔ مولیٰ اور ولی دونوں کے ایک معنی ہیں۔ جو مولیٰ کی طرف منسوب ہے اس کو مولوی کہتے ہیں۔ جیسے حضرت علی علیہ السلام کی طرف منسوب کو علوی کہتے ہیں۔

وَلِیُّ الیتیم: وہ ہے الذی یلی امرہ۔ جو اس کے امور کو چلائے۔

وَلِیُّ المرءة: وہ ہے الذی یلی عقد النکاح۔ جس کے ہاتھ میں اس کے عقد نکاح کا اختیار ہو۔

وَلّاہ العمل: کسی کام پر لگانا۔

تَوَلّی العمل: کسی کام کو اپنے ذمے لینا۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا: مادہ و ل ی سے تقریباً تمام مشتقات، اقتدار و اختیار اور تصرف کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ البتہ یہ مادہ نصرت اور محبت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے، مگر ان معنوں کے اس قدر مشتقات نہیں ہیں۔

اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہو سکتے ہیں کہ ولی ان متعدد معنوں میں مشترک معنوی ہے اور دوسرے معانی میں کسی حد تک تصرف و اختیار موجود ہونے کی وجہ سے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ناصر کسی کے امور پر تصرف کرنے سے عبارت ہے۔ محبّ وہ ہے جو اپنے محبوب کے ساتھ قلبی لگاؤ رکھتا ہو۔ یہ ایک رشتہ اور تعلق ہے، جس سے وہ اپنے محبوب کے امور کو آسانی سے انجام دیتا ہے۔

لہٰذا جو ولی اللّٰہ کے مقام پر فائز ہوتا ہے، وہ اللہ کی بندگی دوسروں سے زیادہ آسانی کے ساتھ کرتا ہے۔

اگر یہ لفظ متعدد معانی میں مشترک لفظی ہے تو یہاں چند ایک قرآئن موجود ہیں، جن سے معنی مراد کے تعین میں مدد ملتی ہے۔

پہلا قرینہ: اس آیت کا پہلا قرینہ اِنَّمَا ہے۔ بالاجماع یہ لفظ حصر کے لیے استعمال ہوتا ہے، جس کی وجہ سے آیت کا مطلب یہ بنتا ہے: تمہارا ولی صرف اور صرف اللہ، اس کا رسول اور رکوع کی حالت میں زکوٰۃ دینے والا ہے۔ یعنی تمہارا ولی صرف ان تینوں میں منحصر ہے۔ ظاہر ہے ناصر، حامی اور دوست ان تینوں میں منحصر نہیں ہے، بلکہ تمام مؤمنین پر لازم ہے کہ وہ آپس میں محبت رکھیں اور ایک دوسرے کی مدد و نصرت کریں۔

دوسرا قرینہ: جب یہ لفظ اللہ کی طرف منسوب ہو گا تو ولایت کا معنی حاکمیت ہو گا: هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ...[1]۔ اقتدار خدائے برحق کے لیے مختص ہے۔ چنانچہ قرآنی اصطلاح میں یہ لفظ جب بھی اللہ کی طرف منسوب ہوا، تصرف و اقتدار کے معنوں میں آیا ہے: اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۔[2] یہ اللہ کا تصرف و اقتدار ہے جس کے تحت وہ مؤمنوں کو تاریکی سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا ہے: اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ....[3]

پس یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ اس کائنات میں حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ذات کو حاصل ہے: لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔[4]

اللہ کے بعد یہ حاکمیت اللہ کی طرف سے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل ہے: اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ ۔[5] یعنی نبی مؤمنین کی جانوں پر خود ان سے زیادہ تصرف کا حق رکھتے ہیں۔

ولیکم میں اللہ، رسول اور الذین آمنوا سب کے لیے ایک ہی لفظ ولیکم استعمال ہوا ہے۔

---

[1] ۱۸ کہف ۴۴　[2] ۲ بقرہ: ۲۵۷　[3] ۷ اعراف ۱۵۵　[4] ۲ بقرہ: ۱۰۷　[5] ۳۳ احزاب: ۶

اس سے معلوم ہوا، تینوں میں وَلی ایک ہی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جس معنی میں اللہ اور اس کا رسول ولی ہیں، رکوع میں زکوٰۃ دینے والے بھی اسی معنی میں ولی ہیں۔ چونکہ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ لفظ ایک مرتبہ استعمال کر کے ایک ہی معنی مراد لیا جا سکتا ہے۔ مثلا اگر کوئی کسی سے یہ کہدے: احمد، حسن اور قاسم تمہارے ولی ہیں تو یہ نہیں ہوسکتا کہ احمد کو سرپرست، حسن کو دوست اور قاسم کو حامی و ناصر مراد لیا جائے۔ پس معلوم ہوا جس معنی میں اللہ اور اس کا رسول ولی ہیں، رکوع میں زکوۃ دینے والے بھی اس معنی میں ولی ہیں۔

تیسرا قرینہ: یہ کہ وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ کا خطاب تمام مؤمنین سے ہے۔ پھر اگر وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا بھی تمام مؤمنین ہیں تو اس سے لازم آتا ہے کہ تمام مؤمنین تمام مؤمنین کے ولی ہیں۔ یعنی ہر ایک اپنے آپ کا ولی ہے۔ اس سے معلوم ہوا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ کے مخاطب تمام مؤمنین ہیں۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا سے مراد تمام مؤمنین نہیں ہیں۔

چوتھا قرینہ: وہ حدیث ہے جو حضرت ابوذر غفاریؓ نے روایت کی ہے کہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اللھم ان اخی موسیٰ سالك قال (رب اشرح لی صدری ویسرلی امری و احلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی و اجعل لی وزیراً من اھلی ھارون اخی اشدد بہ ازری و اشرکہ فی امری کی نسبحك کثیراً انك کنت بنا بصیراً فاوحیت الیہ قد اوتیت سؤلك یا موسی۔ اللھم انی عبدك و نبیك فاشرح لی صدری ویسرلی امری و اجعل لی وزیراً من اھلی علیا اخی اشددبہ ظھری۔[1]

اے اللہ! میرے بھائی موسیٰ نے تجھ سے سوال کیا: میرے پروردگار میرا سینہ کشادہ کر دے اور میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ وہ میری باتیں سمجھ جائیں اور میرے کنبے میں سے میرا ایک وزیر بنا دے میرے بھائی ہارون کو۔ اسے میرا پشت پناہ بنا دے اور اسے میرے امر میں شریک بنا دے تاکہ ہم تیری خوب تسبیح کریں اور تجھے کثرت سے یاد کریں اور تو ہمارے حال پر خوب نظر رکھتا ہے۔ تو نے موسیٰ کی طرف وحی فرمائی کہ اے موسیٰ! تجھے تیری مراد دے دی گئی۔ پروردگار! میں تیرا عبد اور نبی ہوں۔ میرا بھی سینہ کشادہ کر دے اور میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے اور میرے کنبے میں سے ایک وزیر بنا دے میرے بھائی علی کو، اسے میرا پشت پناہ بنا دے۔

رکوع: جن لوگوں کو علی علیہ السلام کی ولایت شاق گزرتی ہے وہ لفظ رکوع کے ساتھ اپنی امیدیں وابستہ کرتے ہیں اور وہ اس لفظ کو نماز کے رکوع نہیں، خضوع کے معنوں میں لیتے ہیں اور آیت کے یہ معنی

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی ۱۱: ۲۵۔ ۸۸:۶۵ باب ۵۵ ذیل آیہ انما ولیکم...

کرتے ہیں: ''اور وہ جو خضوع کے ساتھ زکوٰۃ دیتے ہیں۔'' حالانکہ زکوٰۃ کے ساتھ خضوع کا کوئی جوڑ نہیں بنتا۔ خضوع نماز کے ساتھ ہوتا ہے اور زکوٰۃ کے ساتھ خلوص ہوتا ہے۔ جیسا کہ نماز میں خضوع وخشوع کے بارے میں فرمایا:

قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ فِیۡ صَلَاتِہِمۡ خٰشِعُوۡنَ ﴿۲﴾ [۱]

وہ ایمان والے یقیناً فلاح پا گئے۔ جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں۔

اور زکوٰۃ میں خلوص کے بارے میں فرمایا:

وَ مَاۤ اٰتَیۡتُمۡ مِّنۡ زَکٰوۃٍ تُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُضۡعِفُوۡنَ ﴿۳۹﴾ [۲]

اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دیتے ہو پس ایسے لوگ ہی (اپنا مال) دوچند کرنے والے ہیں۔

چنانچہ قرآنی استعمالات میں زکوٰۃ کے ساتھ خشوع وخضوع کا لفظ کبھی استعمال نہیں ہوا۔

اور کہا: جمع کا صیغہ مفرد کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ یہاں الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ... وَ ہُمۡ رٰکِعُوۡنَ جمع کا صیغہ ہے۔ پھر یہی لوگ کہتے ہیں: وَ ہُمۡ یَنۡہَوۡنَ عَنۡہُ وَ یَنۡـَٔوۡنَ عَنۡہُ ... [۳] (جمع کا صیغہ) حضرت ابو طالب کے عدم ایمان کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ گویا کہ جمع کا صیغہ مفرد میں باپ کی قدح کے لیے استعمال ہو سکتا ہے، بیٹے کی مدح کے لیے نہیں ہو سکتا۔

استعمالات قرآن میں متعدد آیات ہیں، جہاں جمع کا صیغہ مفرد کے لیے استعمال ہوا: اَلَّذِیۡنَ قَالَ لَہُمُ النَّاسُ ... [۴] النَّاسُ سے مراد نعیم بن مسعود ہے۔ یَقُوۡلُوۡنَ نَخۡشٰۤی اَنۡ تُصِیۡبَنَا دَآئِرَۃٌ ... [۵] میں جمع کا صیغہ عبد اللہ بن ابی کے لیے استعمال ہوا وغیرہ وغیرہ۔

پھر کہا: رکوع میں زکوٰۃ دینا، نماز میں خشوع وخضوع کے منافی ہے۔ جواب یہ ہے کہ مساکین کی فریاد رسی بہترین عبادت ہے۔ حدیث میں آیا ہے: و القربة الی اللّٰه حب المساکین۔ [۶] مساکین سے محبت قرب الٰہی کا باعث ہے۔ مسکین کو مسجد نبویؐ میں کسی نے کچھ نہ دیا تو اس نے اللہ کو پکارا۔ اللہ کی طرف جانے والی آواز اگر علی علیہ السلام نے سن لی تو یہ عبادت بالائے عبادت ہے۔ شیعہ مصادر میں یہ حدیث ہے: أن عمدة عبادة الاغنیاء اعانة الفقراء۔ [۷] مالداروں کی بہترین عبادت فقراء کی کمک ہے۔

کہتے ہیں علی کے پاس اتنا مال کہاں تھا کہ زکوٰۃ واجب ہو جائے۔ یہ اعتراض استعمالات قرآن

---

[۱] ۲۳ مومنون: ۱۔۲　[۲] ۳۰ روم: ۳۹

[۳] ۶ انعام ۲۶۔ ترجمہ: اور یہ (لوگوں کو) اس سے روکتے ہیں اور (خود بھی) ان سے دور رہتے ہیں....

[۴] ۳ آل عمران: ۱۷۲　[۵] ۵ مائدہ: ۵۲۔ ترجمہ: اور کہتے ہیں: ہمیں اس بات کا خوف ہے کہ کہیں ہم پر کوئی گردش نہ آ پڑے۔

[۶] کنز العمال حدیث ۴۳۴۷۹　[۷] بحار الانوار ۱۹: ۲۶

سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے کرتے ہیں۔ قرآنی اصطلاحات میں راہ خدا میں ہونے والے ہر انفاق اور خرچ کو زکوٰۃ کہتے ہیں اور صدقہ بھی کہتے ہیں: خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِہِمۡ صَدَقَۃً ....[1] ان کے اموال سے صدقہ لیا کرو۔ اور اِنفاق بھی کہتے ہیں۔ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ[2] پھر اگر نصاب پورا ہے تو جو زکوٰۃ دی جاتی ہے، وہ صدقہ واجبہ ہے۔ نصاب پورا نہ ہونے کی صورت میں انفاق ہوتا ہے اور وہ زکوٰۃ یا صدقہ مستحبہ ہے: یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ ۬ؕ قُلِ الۡعَفۡوَ ۔[3] لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں؟ کہدیجئے جو ضرورت سے زیادہ ہو۔ ضرورت سے زیادہ (بچت) پر خمس دینا ہوتا ہے۔ خمس بھی انفاق ہے۔

وَ مَنۡ یَّتَوَلَّ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ: پس جو لوگ اللہ کی ولایت اور رسول کی ولایت اور وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: کی ولایت میں آتے ہیں، وہ اس حزب کے رکن بنتے ہیں جو غالب آنے والا ہے. واضح رہے۔ التولی کے معنی ہیں الاخذ ولیاً ولایت قبول کرنا۔

اہم نکات

۱۔ ولایت و حاکمیت، اللہ، رسولؐ اور رکوع میں زکوٰۃ دینے والوں میں منحصر ہے۔ دوستی، محبت اور نصرت کی خاصیت تو تمام مومنین میں موجود ہے۔

۲۔ نماز و زکوٰۃ پر بیک وقت عمل صرف یہاں ہوا ہے۔

۳۔ مقام ولایت پر فائز ان ذوات کی ولایت کو قبول کرنے والی ایک خاص جماعت ہوگی جو غالب رہے گی۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا دِیۡنَکُمۡ ہُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ وَ الۡکُفَّارَ اَوۡلِیَآءَ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۵۷﴾

۵۷۔ اے ایمان والو! ان لوگوں کو جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی جنہوں نے تمہارے دین کو مذاق اور کھیل بنایا ہے اور کفار کو اپنا حامی نہ بناؤ اور اللہ کا خوف کرو اگر تم اہل ایمان ہو۔

تشریح کلمات

ہُزُوًا: (ہ ز ء) الھزء۔ اندرونی طور پر کسی کا مذاق اڑانا۔

لَعِبًا: (ل ع ب) لعاب دہن۔ منہ سے بہنے والی رال۔ کھیل کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

---

[1] ۹ توبہ ۱۰۳ [2] ۲ بقرۃ: ۳ [3] ۲ بقرہ: ۲۱۹

تفسیر آیات

اہل کتاب اور کفار سے قلبی لگاؤ اور امیدیں وابستہ کرنے سے منع فرماتے ہوئے اس منع کے پیچھے جو عوامل و اسباب ہیں، ان کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ تمہارے دین اور تمہارے ایمان و عقائد کا مذاق اڑائیں، بھلا ان سے قلبی لگاؤ یا ان کو اپنا حامی بنانا ممکن ہے؟ اگر کسی کو ایسے لوگوں سے واقعی محبت ہوتی ہے تو اس کا ایمان مشکوک ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰہَ: اس سلسلے میں خوف خدا کرو، ورنہ تم بھی مذاق بنانے والوں میں شمار ہو جاؤ گے۔

اہم نکات

۱۔ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ اسلام کو قابل تمسخر سمجھتے ہیں۔

۲۔ یہود و نصاریٰ کو اپنا حامی بنانے سے ایمان مشکوک ہو جاتا ہے۔

وَ اِذَا نَادَیۡتُمۡ اِلَی الصَّلٰوۃِ اتَّخَذُوۡہَا ہُزُوًا وَّ لَعِبًا ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَوۡمٌ لَّا یَعۡقِلُوۡنَ ﴿۵۸﴾

۵۸۔ اور جب تم نماز کے لیے اذان دیتے ہو تو یہ لوگ اسے مذاق اور تماشا بنا لیتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ عقل نہیں رکھتے۔

تفسیر آیات

یہ سورہ جمعہ کے بعد پہلی آیت ہے جس میں اذان کا ذکر ہے۔ عبادت کے لیے پکارنے (اذان) کو مذاق بنانے کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اللہ کی بندگی کو سنجیدہ عمل نہیں سمجھتے اور یہ ان کی کم عقلی کی دلیل ہے کہ راز بندگی کو نہیں سمجھتے۔

۱۔ وَ اِذَا نَادَیۡتُمۡ اِلَی الصَّلٰوۃِ اتَّخَذُوۡہَا ہُزُوًا: جب تم نماز کے لیے اذان دیتے ہو تو یہ لوگ اسے مذاق اور کھیل بناتے ہیں۔ اتَّخَذُوۡہَا میں ضمیر اذان کی طرف جانا سیاق کلام سے زیادہ مناسب ہے کہ اذان کی آواز ان کافروں تک پہنچ جاتی تو وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے اور اذان اور نماز کی طرف دعوت دینے کو ایک غیر سنجیدہ عمل سمجھتے تھے۔

۲۔ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَوۡمٌ لَّا یَعۡقِلُوۡنَ: اذان کا تمسخر اس وجہ سے کر رہے ہیں کہ وہ اذان کے مندرجات اور اس ندا کے مضمون کی تہ تک پہنچنے کی فکری و عقلی قابلیت نہیں رکھتے اور قابلیت نہ رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ بندگی کا ذوق نہیں رکھتے۔

اذان اسلامی شعار: آیت سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اذان کسی شخص کے مشورے سے نہیں ،وحی کے ذریعے نازل ہوئی اور قرآن سے اذان کا حکم ثابت ہے۔ اس آیت کے علاوہ سورۂ جمعہ میں بھی اذان کا ذکر آیا ہے۔

مضمون اذان: لوگوں کو اللہ کی عبادت کی طرف متوجہ کرنے کا ایک طریقہ تو وہ ہے جو مسیحیوں میں رائج ہے اور ناقوس بجایا جاتا ہے۔ جس میں صرف آواز ہے، مضمون نہیں ہے۔ ایک شور ہے، پیغام نہیں ہے۔ مگر اسلامی اذان ایک پیغام ہے، ایک دعوت ہے۔ اس میں آفاقی مضمون ہے۔ اس میں آواز ہے تو یہ ایک انسان کی آواز بے جان شور نہیں ہے۔ اس میں ایک دین کے عقائد و عمل پر مشتمل ایک وسیع مضمون ہے۔ اپنے دین کے اصولی عقائد کا اعلان ہے اور دین میں نماز یعنی اللہ کی عبودیت کی اہمیت اور افادیت کا بھی اعلان ہے۔ جس کی ابتداء اللہ کی کبریائی سے ہوتی ہے اور اختتام اللہ کی وحدانیت پر۔

احادیث

المؤذن اطول الناس اعناقاً یوم القیامۃ۔ [1]

اذان دینے والوں کی گردن قیامت کے دن سب سے اونچی ہو گی۔

ان الملائکۃ اذا سمعت الاذان من اھل الارض قالت ھذہ اصوات امۃ محمد بتوحید اللّٰہ فیستغفرون اللّٰہ لامۃ محمد حتی یفرغوا۔ [2]

فرشتے جب اہل ارض کی اذان سنتے ہیں تو کہتے ہیں یہ امت محمدؐ کی آواز ہے اللہ کی وحدانیت کے اقرار ہیں۔ پھر وہ امت محمد کے لیے استغفار کرتے ہیں فارغ ہونے تک۔

قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ هَلۡ تَنۡقِمُوۡنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنۡ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلُ ۙ وَاَنَّ اَكۡثَرَكُمۡ فٰسِقُوۡنَ﴿۵۹﴾

۵۹۔ کہد یجیے: اے اہل کتاب! آیا تم صرف اس بات پر ہم سے نفرت کرتے ہو کہ ہم اللہ پر اور اس کی کتاب پر جو ہماری طرف نازل ہوئی اور جو پہلے نازل ہوئی، ایمان لائے ہیں (یہ کوئی وجہ نفرت نہیں ہے بلکہ) وجہ یہ ہے کہ تم میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔

تشریح کلمات

نقم: ناپسند کرنا۔ بدلہ لینا

---

[1] الوسائل۔ ۵: ۳۷۶
[2] الفقیہ۔ ۱: ۲۸۱

تفسیر آیات

اس آیت میں اہل کتاب کے ساتھ ایک منطقی بات ہے کہ تم کس بات پر ہم پر برہم ہو۔ ہم تو تمام کتابوں پر ایمان لے آئے۔ ہم تمام انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ تم ہو جو اپنے مفاد کی چیزوں پر ایمان لاتے ہو اور دوسروں کا انکار کرتے ہو۔ لہٰذا اس عناد اور برہمی کی وجہ خود تمہارا فسق ہے، ورنہ ہمارے رسولؐ کو نہ ماننے کی وجہ سے ہمیں تم پر برہم ہونا چاہیے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی بندگی کو سنجیدہ عمل نہ سمجھنا کم عقلی کی علامت ہے۔

۲۔ مسلمان اہل کتاب کی مقدس کتابوں کو مانتے ہیں۔

۳۔ اہل کتاب مسلمانوں کی کتاب کو نہیں مانتے۔

۴۔ نتیجے کے طور پر مسلمانوں کے جذبات مجروح ہونے سے اہل کتاب کے خلاف برہم ہونا چاہیے، لیکن معاملہ برعکس ہے۔

قُلۡ هَلۡ اُنَبِّئُكُمۡ بِشَرٍّ مِّنۡ ذٰلِكَ مَثُوۡبَةً عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ مَنۡ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيۡهِ وَ جَعَلَ مِنۡهُمُ الۡقِرَدَةَ وَ الۡخَنَازِيۡرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوۡتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنۡ سَوَآءِ السَّبِيۡلِ ﴿۶۰﴾

۶۰۔ کہد یجئے: کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اللہ کے ہاں پاداش کے اعتبار سے اس سے بھی بدتر لوگ کون ہیں؟ وہ (لوگ ہیں) جن پر اللہ نے لعنت کی اور جن پر وہ غضبناک ہوا اور جن میں سے کچھ کو اس نے بندر اور سور بنا دیا اور جو شیطان کے پجاری ہیں، ایسے لوگوں کا ٹھکانا بھی بدترین ہے اور یہ سیدھے راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

تشریح کلمات

مَثُوۡبَةً: (ث و ب) زیادہ تر جزائے خیر پر بولا جاتا ہے۔ تاہم کبھی جزائے بد کے لیے بطور استعارہ بولا جاتا ہے۔ جیسے اس آیت میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ بِشَرٍّ مِّنۡ ذٰلِكَ مَثُوۡبَةً: بفرض محال اگر مسلمانوں کا ان چیزوں پر ایمان لانا برا ہے تو اہل کتاب تو

اس سے بدتر جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یعنی اگر مسلمانوں کا ایمان لانا تمہارے نزدیک بد ہے تو ہمارے نزدیک تمہارا ایمان نہ لانا بدتر ہے۔

۲۔ مَنۡ لَّعَنَہُ اللّٰہُ وَغَضِبَ عَلَیۡہِ: یعنی درحقیقت اگر کسی چیز کو ناپسند کرنا ہے تو اس شخص کو ناپسند کیا جائے گا جس پر اللہ نے لعنت بھیجی ہے اور اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور اس کے فسق و فجور کی وجہ سے اس پر غضبناک ہوا ہے یا یہ اس کو ذلت و خواری سے دوچار کر کے اس سے جزیہ لیا جاتا ہے۔

۳۔ وَجَعَلَ مِنۡہُمُ الۡقِرَدَۃَ وَالۡخَنَازِیۡرَ: قابل نفرت وہ ہیں جن کے جرائم کی وجہ سے ان کو بندر اور سور کی شکل میں مسخ کیا گیا ہے۔

۴۔ وَعَبَدَ الطَّاغُوۡتَ: قابل نفرت تو وہ لوگ ہیں جو طاغوت کے پجاری ہیں۔ بعض طاغوت سے مراد شیطان لیتے ہیں، بعض گوسالہ مراد لیتے ہیں۔ جب کہ غیر اللہ کی پرستش اور غیر اللہ کی اطاعت، طاغوت کی پرستش ہے۔ سجود و رکوع والی پرستش نہیں ہے۔

۵۔ اُولٰٓئِکَ شَرٌّ مَّکَانًا: قابل نفرت تو وہ لوگ ہوں گے جن کا ٹھکانا قابل نفرت ہوگا اور راہ حق سے انحراف اور گمراہی میں آگے ہوں گے۔

اہم نکات

۱۔ اہل کتاب اور اسلام دشمن، ہر بد سے بدتر جرائم کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔

۲۔ اللہ کی طرف سے لعنت اور غضب کا سزاوار بن جانا، ہر بد سے بدتر ہے۔

وَ اِذَا جَآءُوۡکُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا وَ قَدۡ دَّخَلُوۡا بِالۡکُفۡرِ وَ ہُمۡ قَدۡ خَرَجُوۡا بِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا کَانُوۡا یَکۡتُمُوۡنَ ﴿۶۱﴾

۶۱۔ اور جب یہ لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے تھے حالانکہ وہ کفر لے کر آئے تھے اور کفر ہی کو لے کر چلے گئے اور جو کچھ یہ (دلوں میں) چھپائے ہوئے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاِذَا جَآءُوۡکُمۡ: اہل کتاب میں سے منافقین کا ذکر ہے، جو ایمان کا اظہار کر کے مومنین کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ اگرچہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ اس سے مراد غیر اہل کتاب منافقین ہوں۔

۲۔ قَدۡ دَّخَلُوۡا بِالۡکُفۡرِ: عام طور پر تو یہ ہوتا تھا کہ لوگ اسلام کے بارے میں بدنیتی لے کر

آتے تھے، مگر حضورؐ کے کلام و اخلاق دیکھ کر حلقہ بگوش اسلام ہوتے تھے۔ مگر یہ لوگ اس قدر بدطینت ہیں کہ وہ جیسے کفر کے ساتھ حضورؐ کی خدمت میں داخل ہوتے تھے، کفر لے کر وہاں سے نکلتے تھے۔

۳۔ وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا کَانُوۡا یَکۡتُمُوۡنَ: جس کفر کو یہ لوگ اپنے دلوں میں چھپاتے ہیں، ان دلوں کا خالق اسے خوب جانتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اہل کتاب کے منافقین اسلام کی کسی تعلیم سے متاثر نہیں ہوں گے۔

وَ تَرٰی کَثِیۡرًا مِّنۡہُمۡ یُسَارِعُوۡنَ فِی الۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ وَ اَکۡلِہِمُ السُّحۡتَ ؕ لَبِئۡسَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۶۲﴾

۶۲۔ اور ان میں سے اکثر کو آپ گناہ، زیادتی اور حرام کھانے کے لیے دوڑتے ہوئے دیکھتے ہیں، کتنا برا کام ہے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔

لَوۡ لَا یَنۡہٰہُمُ الرَّبّٰنِیُّوۡنَ وَ الۡاَحۡبَارُ عَنۡ قَوۡلِہِمُ الۡاِثۡمَ وَ اَکۡلِہِمُ السُّحۡتَ ؕ لَبِئۡسَ مَا کَانُوۡا یَصۡنَعُوۡنَ ﴿۶۳﴾

۶۳۔ ان کے علماء اور فقہاء انہیں گناہ کی باتوں اور حرام کھانے سے منع کیوں نہیں کرتے؟ ان کا یہ عمل کتنا برا ہے؟

تشریح کلمات

الرَّبّٰنِیُّوۡنَ: بنابر قولے نصاریٰ کے علماء کو ربانیون اور احبار یہود کے علماء کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ تَرٰی کَثِیۡرًا مِّنۡہُمۡ: اہل کتاب میں سے بہت سے لوگوں کو آپ تین حالتوں سے خالی نہیں دیکھتے:

الف: یُسَارِعُوۡنَ فِی الۡاِثۡمِ: وہ گناہ کی طرف لپکتے ہیں۔ اس گناہ میں سرفہرست کفر، اسلام کا مذاق اڑانا ہے۔

ب: وَ الۡعُدۡوَانِ: زیادتی اور حدود اللہ سے تجاوز کرنے کی طرف بھی یہ لوگ بڑی سرعت سے جاتے ہیں۔

ج: وَ اَکۡلِہِمُ السُّحۡتَ: رشوت خوری میں بھی یہ لوگ پیش پیش ہیں یا مطلق حرام خوری میں یہ لوگ

آگے ہیں۔

۲۔ لَبِئۡسَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ: مذکورہ اعمال وہ ہیں جن کے برے ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

۳۔ لَوۡ لَا یَنۡہٰىہُمُ الرَّبّٰنِیُّوۡنَ وَ الۡاَحۡبَارُ: یہود و نصاریٰ کے علماء اپنی قوم کے لوگوں کو گناہ کی باتیں کرنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے؟ قَوۡلِہِمُ الۡاِثۡمَ سے مراد بعض کے نزدیک کتاب خدا کی تحریف ہے اور بعض کے نزدیک خلاف حق باتیں ہیں۔ یہی زیادہ مناسب ہے۔

۴۔ لَبِئۡسَ مَا کَانُوۡا یَصۡنَعُوۡنَ: یعنی ان کے علماء کا کردار کس قدر برا ہے کہ ان کے سامنے لوگ گناہ اور جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں اور یہ لوگ خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ معاشرے میں گناہ عام ہوں اور علماء پر سکوت طاری ہو، یہ یہودی خصلت ہے۔ اس میں امر بمعروف و نہی از منکر کے واجب ہونے کا ثبوت ہے۔

اہم نکات

۱۔ عوام فسق و فجور میں مبتلا ہوں، علماء سکوت اختیار کریں، یہ ہیں یہودی خصلتیں۔

وَ قَالَتِ الۡیَہُوۡدُ یَدُ اللّٰہِ مَغۡلُوۡلَۃٌ ؕ غُلَّتۡ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ لُعِنُوۡا بِمَا قَالُوۡا ۘ بَلۡ یَدٰہُ مَبۡسُوۡطَتٰنِ ۙ یُنۡفِقُ کَیۡفَ یَشَآءُ ؕ وَ لَیَزِیۡدَنَّ کَثِیۡرًا مِّنۡہُمۡ مَّاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ طُغۡیَانًا وَّ کُفۡرًا ؕ وَ اَلۡقَیۡنَا بَیۡنَہُمُ الۡعَدَاوَۃَ وَ الۡبَغۡضَآءَ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ ؕ کُلَّمَاۤ اَوۡقَدُوۡا نَارًا لِّلۡحَرۡبِ اَطۡفَاَہَا اللّٰہُ ۙ وَ یَسۡعَوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَسَادًا ؕ وَ اللّٰہُ لَا یُحِبُّ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۶۴﴾

۶۴۔ اور یہود کہتے ہیں: اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، خود ان کے ہاتھ باندھے جائیں اور ان پر لعنت ہو اس (گستاخانہ) بات پر بلکہ اللہ کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور (اے رسول) آپ کے رب کی طرف سے جو کتاب آپ پر نازل ہوئی ہے وہ ان میں سے اکثر لوگوں کی سرکشی اور کفر میں مزید اضافہ کرے گی اور ہم نے قیامت تک کے لیے ان کے درمیان عداوت اور بغض ڈال دیا ہے، یہ جب جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں تو اللہ اسے بجھا دیتا ہے اور یہ لوگ زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور اللہ فسادیوں کو دوست نہیں رکھتا۔

تشریح کلمات

یَد: ہاتھ کہنا اس جگہ محاورہ ہے۔ جب بخل یا ناممکن ہونے کی وجہ سے کوئی خرچ نہیں کرتا تو کہتے ہیں اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالَتِ الۡيَهُوۡدُ يَدُ اللّٰهِ مَغۡلُوۡلَةٌ: یہود کہتے ہیں اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ یہود مسئلہ قضا و قدر اور نسخ احکام میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ کے فیصلے ہرگز نہیں بدلتے۔ آغاز خلقت میں جو کچھ فیصلہ ہوا ہے، خود اللہ اس کا کاربند ہے اور اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ یعنی اللہ بے بس ہے۔ جب کہ قرآن کا مؤقف یہ ہے:

يَمۡحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثۡبِتُ ۚ وَعِنۡدَهٗۤ اُمُّ الۡكِتٰبِ ۝ [۱]　　اللہ جسے چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے قائم رکھتا ہے اور اسی کے پاس ام الکتاب ہے۔

اس آیت کی یہ تفسیر بھی کی جاتی ہے کہ بعض یہود نے اس بات کا اظہار کیا کہ اب اللہ تعالیٰ نے یہود کے بارے میں بخل سے کام لینا شروع کیا ہے۔ ماضی کی طرح یہود پر اپنی نعمتوں کی فراوانی نہیں کر رہا ہے۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ یہودیوں نے اسلامی تصور انفاق کا تمسخر کیا۔ جیسے آیہ:

مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا ... [۲]　　کوئی ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے تاکہ اللہ اسے کئی گنا زیادہ دے؟

لیکن صحیح موقف یہ ہے کہ یہودیوں کا یہ ایک ایسا نظریہ ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ سے فیض کا سلسلہ رکا ہوا ہے۔ چنانچہ جواب سے ان کا یہ موقف واضح ہو جاتا ہے، جس میں فرمایا: یُنۡفِقُ کَیۡفَ یَشَآءُ، بلکہ وہ جس طرح چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ یُنۡفِقُ سے مراد صرف روزی دینا نہیں، بلکہ مطلق عطا ہے۔

واضح رہے اللہ کے فیصلے سابقہ فیصلوں میں نقص کی وجہ سے نہیں، بلکہ احکام میں حالات کے بدلنے اور رزق و عطا میں استحقاق اور اہلیت میں تبدیلی آنے کی وجہ سے بدلتے ہیں۔ اس کی تفصیل مقدمہ میں مسئلہ نسخ و بدا میں ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ وَلَيَزِيۡدَنَّ كَثِيۡرًا: یہود چونکہ اپنے آپ کو اللہ کی برگزیدہ قوم خیال کرتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ دنیا میں یہود ہی کو بالادستی کا حق حاصل ہے، ایسے میں مسلمانوں کو قیادت سنبھالتے دیکھ کر وہ آگ بگولا ہو جاتے ہیں اور ان کی سرکشی اور کفر میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی حسد و نفاق کی وجہ سے وہ جنگ کرنے پر اتر آتے ہیں۔

---

[۱] ۱۳ رعد: ۳۹　　[۲] ۲ بقرہ۔ ۲۴۵

۳۔ وَ اَلۡقَیۡنَا بَیۡنَہُمُ الۡعَدَاوَۃَ: یہود کے مختلف فرقے ایک دوسرے کے ساتھ بغض و عناد میں رہے ہیں۔ ہمارے زمانے میں بھی ان کا آپس میں بغض و عناد نظر آتا لیکن تاریخ میں ان کا باہمی عناد شدید رہا ہے۔

۴۔ کُلَّمَاۤ اَوۡقَدُوۡا نَارًا: یہ یہودی جب بالواسطہ یا بلا واسطہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں تو اللہ ان کی یہ ناپاک سازش ناکام بنا دیتا ہے۔

۵۔ وَ یَسۡعَوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَسَادًا: زمین میں فساد پھیلانا یہود کی سرشت میں رچا بسا ہے۔ اس قوم کی دماغی صلاحیت فساد و استحصال پر صرف ہوتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ یہود کا یہ نظریہ ہے کہ اللہ مجبور ہے۔

۲۔ رزق و عطا اور موت و حیات میں اللہ کے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں: بَلۡ یَدٰہُ مَبۡسُوۡطَتٰنِ ...۔

۳۔ خدا جیسے احکام میں فیصلے بدلتا ہے، کائناتی نظام میں بھی فیصلے بدلتا ہے: کَیۡفَ یَشَآءُ ...۔

۴۔ اللہ کو خواہ تشریع میں، خواہ تکوین میں، بے بس سمجھنے والے اللہ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں: وَ لُعِنُوۡا بِمَا قَالُوۡا ...۔

وَ لَوۡ اَنَّ اَہۡلَ الۡکِتٰبِ اٰمَنُوۡا وَ اتَّقَوۡا لَکَفَّرۡنَا عَنۡہُمۡ سَیِّاٰتِہِمۡ وَ لَاَدۡخَلۡنٰہُمۡ جَنّٰتِ النَّعِیۡمِ ﴿۶۵﴾

۶۵۔ اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان کے گناہ معاف کر دیتے اور انہیں نعمتوں والی جنتوں میں داخل کر دیتے۔

تفسیر آیات

اگر اہل کتاب رسول کریمؐ کی رسالت پر ایمان لے آتے اور مذکورہ قولی و فعلی گناہوں کو ترک کر دیتے تو ان کے گناہوں کا یہی کفارہ ہوتا۔

دوسری جگہ فرمایا:

اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡہِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ...۔[1] نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں۔

اسلام قبول کرنا سب سے بڑی نیکی ہے، جس سے گناہ مٹ جاتے ہیں۔ تیسری جگہ فرمایا:

اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا کَبَآئِرَ مَا تُنۡہَوۡنَ عَنۡہُ نُکَفِّرۡ عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ ...۔[2] اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے اجتناب کرو جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے تو ہم تمہارے (چھوٹے چھوٹے) گناہ معاف کر دیں گے۔

کفر جیسے گناہ کبیرہ سے ایمان کی طرف آنے کے بعد سارے گناہ مٹ جائیں گے۔

---

[1] ۱۱ ہود: ۱۱۴ [2] ۴ نساء: ۳۱

اہم نکات

۱۔ ایمان کے ساتھ اگر تقویٰ ہو تو گناہ مٹ جاتے ہیں۔

وَ لَوۡ اَنَّہُمۡ اَقَامُوا التَّوۡرٰىۃَ وَ الۡاِنۡجِیۡلَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِمۡ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ لَاَکَلُوۡا مِنۡ فَوۡقِہِمۡ وَ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِہِمۡ ؕ مِنۡہُمۡ اُمَّۃٌ مُّقۡتَصِدَۃٌ ؕ وَ کَثِیۡرٌ مِّنۡہُمۡ سَآءَ مَا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۶۶﴾

۶۶۔ اور اگر یہ اہل کتاب توریت و انجیل اور ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل شدہ دیگر تعلیمات کو قائم رکھتے تو وہ اپنے اوپر کی (آسمانی برکات) اور نیچے کی (زمینی برکات) سے مالا مال ہوتے، ان میں سے کچھ میانہ رو بھی ہیں، لیکن ان میں اکثریت بدکردار لوگوں کی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَوۡ اَنَّہُمۡ اَقَامُوا التَّوۡرٰىۃَ: اللہ کی طرف سے عطا کردہ تعلیمات اور ادیان سماویہ کا مطلب صرف عبادت اور آخرت و قیامت کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ ان ادیان نے انسانوں کے لیے ایک جامع نظام حیات، ایک کامل دستور دیا ہے۔ یہ کامل دستور عدل و انصاف کا دستور ہے۔ عدل کا نظام قائم ہونے کی صورت میں نعمتوں کی فراوانی اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ امام زین العابدین علیہ السلام سے روایت ہے، آپؑ نے فرمایا:

بِالۡعَدۡلِ تَتَضَاعَفُ الۡبَرَکَاتُ۔[1]	عدل سے برکتیں دوبالا ہو جاتی ہیں۔

الٰہی نظام، عدل و انصاف کا نظام ہے، جس پر صحیح طریقے سے عمل کیا جاتا تو امن و آشتی کی پرسکون فضا میں آبی وسائل سے استفادے، زمین کی آبادی، پیداوار میں وسعت، رزق میں فراوانی اور تقسیم دولت میں عدل و انصاف سے دنیاوی زندگی بھی نعمتوں اور رحمتوں سے مالا مال ہو سکتی ہے۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں یہ نہیں فرمایا: ولو انھم اٰمنوا بلکہ فرمایا: وَلَوۡ اَنَّہُمۡ اَقَامُوا۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ صرف مان لینے سے نہیں بلکہ ان تعلیمات پر عمل کرنے اور انہیں قائم رکھنے سے اس نظام کی برکتوں سے فیضیاب ہو سکتے ہیں۔

۲۔ مِنۡہُمۡ اُمَّۃٌ مُّقۡتَصِدَۃٌ: یہودیوں میں بھی ایک گروہ ایسا تھا جو حق پر قائم رہا۔ روایت کے مطابق یہ گروہ وہی ہے جو ایمان لے آیا اور دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔

اہم نکات

۱۔ الٰہی نظام دنیاوی زندگی کے لیے عدل و انصاف کا نظام فراہم کرتا ہے۔

۲۔ صرف مان لینے سے نہیں بلکہ عمل سے یہ نظام میسر آ سکتا ہے اور نافذ ہو سکتا ہے۔

---

[1] مستدرک الوسائل ۱۱: ۳۲۰

۳۔ دنیا و آخرت، دونوں کی سعادتیں ایک جگہ جمع ہو سکتی ہیں۔ جیسا کہ دونوں سے محرومی بھی ہو سکتی ہے۔

۴۔ آسمانی تعلیمات میں نعمتوں کی فراوانی کے خلاف کوئی تصور نہیں ہے۔

يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۷﴾

۶۷۔ اے رسول! جو آپ کے پروردگار کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے اسے پہنچا دیجیے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے اللہ کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ آپ کو لوگوں (کے شر) سے محفوظ رکھے گا، بے شک اللہ کافروں کی رہنمائی نہیں کرتا۔

شان نزول

یہ آیہ شریفہ ۱۸ ذی الحجۃ الحرام بروز جمعرات حجۃ الوداع ۱۰ ہجری کو رسول اللہؐ پر اس وقت نازل ہوئی جب آپؐ غدیر خم نامی جگہ پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے آگے نکل جانے والوں کو جو مقام جحفہ کے قریب پہنچ گئے تھے، واپس بلایا اور آنے والوں کا انتظار کیا اور تقریباً ایک لاکھ کے مجمع میں حضرت علی علیہ السلام کا ہاتھ بلند کر کے فرمایا:

ان اللّٰہ مولای و انا مولی المؤمنین و انا اولی بھم من انفسھم فمن کنت مولاہ فعلی مولاہ۔

اللہ میرا مولا ہے اور میں مومنوں کا مولا ہوں اور ان کے نفسوں سے اولی ہوں۔ پس جس کا میں مولا ہوں اس کے علی مولا ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ نے اس کو تین بار دہرایا۔ بقول امام حنابلہ احمد بن حنبل کے چار مرتبہ دہرایا۔ اس کے بعد فرمایا:

اللّٰھم وال من والاہ و عاد من عاداہ و احب من احبہ و ابغض من ابغضہ و اخذل من اخذلہ و ادر الحق معہ حیث دار الا فیبلغ الشاھد الغائب۔

اے اللہ! جو اس سے محبت رکھے تو اس سے محبت رکھ اور جو اس سے دشمنی رکھے تو اس سے دشمنی رکھ اور جو اس سے محبت کرے تو اس سے محبت کر، جو اس سے بغض رکھے تو اس سے بغض رکھ، جو اس کو ترک کرے تو اس کو ترک کر اور حق کو وہاں پھیر دے جہاں علی ہو۔ دیکھو جو یہاں حاضر ہیں ان پر واجب ہے کہ وہ سب تک یہ بات پہنچا دیں۔

اس حدیث کو امام احمد بن حنبل نے چالیس طریق سے، ابن جریر طبری نے ستر سے زائد طریق سے، علامہ جزری المقری نے ۸۰ طریق سے، علامہ ابن عقدہ نے ۱۰۵ طریق سے، علامہ ابن سعید سجستانی نے ۱۲۰ طریق سے، علامہ ابوبکر جعابی نے ۱۲۵ طریق سے روایت کیا ہے۔[1] امیر محمد یمنی سے منقول ہے کہ وہ حدیث غدیر کو ۱۵۰ طریق سے روایت کرتے ہیں۔[2]

ہمارے معاصر علامہ امینی اپنی شہرہ آفاق کتاب الغدیر جلد اول میں ۱۱۰ اصحاب سے یہ روایت ثابت کرتے ہیں۔ صاحب الغدیر کی تحقیق کے مطابق درج ذیل اصحاب رسولؐ نے روایت کی ہے کہ یہ آیت غدیر خم کے موقع پر حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے:

i۔ زید بن ارقم: ان کی روایت کو امام طبری کتاب الولایۃ میں نقل کرتے ہیں۔

ii۔ ابوسعید الخدری: ان سے ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور ابن عساکر نے روایت نقل کی ہے۔ الدرالمنثور ۲: ۵۲۸ طبع بیروت ۱۹۹۰۔ الواحدی اسباب النزول ص ۱۰۵۔

iii۔ عبد اللہ بن مسعود: ان سے ابن مردویہ نے روایت کی ہے۔ الدرالمنثور ۲: ۵۲۸۔ فتح القدیر، الشوکانی ۳: ۵۷۔

iv۔ عبد اللہ بن عباس: حافظ ابوسعید سجستانی کتاب الولایۃ میں، بدخشانی نے مفتاح النجا میں، آلوسی نے تفسیر روح المعانی ۲: ۳۴۸ میں ان کی روایت نقل کی ہے۔

v۔ جابر بن عبد اللہ انصاری: حافظ حاکم الحسکانی نے شواھد التنزیل میں ان کی روایت نقل کی ہے۔

vi۔ ابوہریرہ: شیخ الاسلام حموینی نے فرائد السمطین میں ان کی روایت نقل کی ہے۔

vii۔ براء بن عازب: السید علی ہمدانی نے المودۃ القربیٰ میں، السید عبد الوہاب البخاری نے اپنی تفسیر میں ان کی روایت بیان کی ہے۔

اسی طرح ایک سو دس اصحاب نے یہ حدیث روایت کی ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الغدیر جلد اول۔

تفسیر آیات

۱۔ یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوۡلُ: اس لقب کے ساتھ خطاب سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ آگے آنے والا حکم منصب رسالت سے مربوط اہم معاملہ ہے، جس کا نہ پہنچانا ساری رسالت کے نہ پہنچانے کے مترادف ہے۔

۲۔ وَاللّٰهُ یَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاسِ: یہ سورہ رسول کریمؐ کی حیات طیبہ کے آخری دنوں میں نازل ہوا ہے۔

---

[1] تعلیق الھدایۃ العقول ص۳۰　[2] الغدیر

فتح مکہ، فتح خیبر اور فتح خندق کے بعد تبلیغ رسالت میں کوئی خطرہ باقی نہیں رہ گیا تھا، لہٰذا جس خطرے کا آیت میں ذکر ہے، وہ خود رسولؐ کو لاحق کسی خطرے کا ذکر نہیں ہو سکتا نیز شان رسالت اس بات سے بالاتر ہے کہ کسی ذاتی خوف و خطرے کی وجہ سے تبلیغ رسالت میں کوتاہی کرے۔

۳۔ وَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسَالَتَہٗ: سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسے حکم کی تبلیغ کی بات ہے جس پر پورے اسلامی نظام کا مدار ہے۔

۴۔ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ: سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم پہلے رسولؐ پر نازل ہو چکا تھا۔ شاید رسولؐ اس کی تبلیغ کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں تھے اور ساتھ خود اہل اسلام کی طرف سے الزام تراشی کا خطرہ بھی تھا کہ رسولؐ کنبہ پرستی کرتے ہیں، کیونکہ اس وقت کے معاشرے میں اگرچہ مخلص مؤمنین کی کمی نہیں تھی، تاہم ان میں منافقین بھی تھے، ضعیف الایمان لوگ بھی تھے اور ایسے لوگ بھی تھے جو بقول قرآن، ان کے دلوں میں مرض ہے اور کچھ لوگ رسول اللہؐ کو دنیاوی بادشاہوں پر قیاس کرتے تھے اور قانون سازی میں خود رسول اللہؐ کے عمل دخل کو بعید از قیاس نہیں سمجھتے تھے۔

۵۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الۡکٰفِرِیۡنَ: یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر رسولؐ کو اس حکم کی تبلیغ میں خود امت کے افراد سے خطرہ لاحق تھا تو جملہ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الۡکٰفِرِیۡنَ مناسب معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اس حکم کا کافروں سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

جواب یہ ہے کہ کفر سے مراد اسی آیت کے مندرجات کا انکار ہے، جیسا کہ آیہ حج میں فرمایا:

وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الۡبَیۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَیۡہِ سَبِیۡلًا ؕ وَمَنۡ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ [1]	اور لوگوں پر اللہ کا حق ہے کہ جو اس گھر جانے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس گھر کا حج کرے اور جو کوئی اس سے انکار کرتا ہے تو (اس کا اپنا نقصان ہے) اللہ تو عالمین سے بے نیاز ہے۔

یہاں کفر سے مراد حج کا انکار ہے۔

اہم نکات

۱۔ بعض بنیادی احکام ایسے ہیں جن کی تبلیغ پر پوری رسالت موقوف ہے۔

۲۔ اس حکم کی تبلیغ سے جو خطرہ لاحق تھا، وہ اہل کتاب سے نہیں تھا، کیونکہ اہل کتاب کے بارے میں اس سے پہلے کھلے اور سخت لفظوں میں اظہار برائت ہو چکا ہے۔

قُلۡ یٰۤاَہۡلَ الۡکِتٰبِ لَسۡتُمۡ عَلٰی شَیۡءٍ	۶۸۔ (اے رسول) کہدیجیے: اے اہل کتاب! جب تک تم توریت اور انجیل اور جو کچھ تمہارے

---

[1] ۳ آل عمران: ۹۷

حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ لَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾

رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے کو قائم نہ کرو تم کسی قابل اعتنا مذہب پر نہیں ہو اور (اے رسول) آپ کے رب کی طرف سے جو کتاب آپ پر نازل ہوئی ہے وہ ان میں سے اکثر لوگوں کی سرکشی اور کفر میں مزید اضافہ کرے گی مگر آپ ان کافروں کے حال پر افسوس نہ کریں۔

تفسیر آیات

۱۔ لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ: اہل کتاب اگر حضرت موسیٰ وحضرت عیسیٰ علیہما السلام کی امت ہونے پر ناز کرتے ہیں تو یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ وہ جن رسولوں کی امت ہونے کے مدعی ہیں اگر وہ اس مذہب کی کتابوں اور دیگر تعلیمات پر عمل نہیں کرتے اور جو نظام حیات ان کو دیا گیا ہے، اس کو قائم نہیں کرتے تو پھر ان کا مذہب قابل اعتنا نہیں ہے۔ اگر وہ اپنی آسمانی کتابوں اور دیگر تعلیمات کو کما حقہ قبول کریں تو انہیں ماننا پڑے گا کہ سلسلہ نبوت اب نسل اسماعیل میں ہے اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برحق رسول ہیں۔

۲۔ وَلَيَزِيْدَنَّ: یہ قرآن جہاں اس پر ایمان لانے والوں کے لیے پند و ہدایت کا سامان فراہم کرتا ہے۔ وہاں اس کے منکرین اور حاسدین کی سرکشی اور کفر میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ چنانچہ ہر حجت اور ہدایت کا یہی نتیجہ سامنے آتا ہے۔ قبول کرنے والوں کے لیے رحمت، رد کرنے والوں کے عذاب ونکبت جیسے:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ۝[۱]

اور ہم قرآن میں سے ایسی چیز نازل کرتے ہیں جو مومنین کے لیے تو شفا اور رحمت ہے لیکن ظالموں کے لیے تو صرف خسارے میں اضافہ کرتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ تعلیمات دینی پر ایمان کے بعد ان کا قائم رکھنا ہی مذہب ہے۔
۲۔ قرآنی نظام کے قیام کے بغیر ہم مذہب اسلام کے پیروکار نہیں بن سکتے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ

۶۹۔ جو لوگ اللہ اور روز آخرت پر ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل انجام دیتے ہیں وہ خواہ مسلمان

---
۱ ۱۷ بنی اسرائیل: ۸۲

اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۹﴾

ہوں یا یہودی یا صابی ہوں یا عیسائی انہیں (روز قیامت) نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ محزون ہوں گے۔

تفسیر آیات

نجات و سعادت کے لیے اسم و عنوان کو نہیں ایمان و عمل کو دخل ہے۔ مسلمان اپنے دین کے مطابق یہود، صابی اور نصاریٰ اپنے زمانے کی حجت کے مطابق ایمان لاتے اور عمل صالح انجام دیں تو سب کو نجات مل جائے گی۔

اس آیت کی تفسیر سورۂ بقرہ آیت ۶۲ میں بیان ہو چکی ہے۔

لَقَدۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَ بَنِيۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ وَ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡهِمۡ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمۡ رَسُوۡلٌۢ بِمَا لَا تَهۡوٰۤى اَنۡفُسُهُمۡ ۙ فَرِيۡقًا كَذَّبُوۡا وَفَرِيۡقًا يَّقۡتُلُوۡنَ ﴿۷۰﴾

۷۰۔ بتحقیق ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کی طرف رسول بھیجے لیکن جب بھی کوئی رسول ان کی طرف ان کی خواہشات کے خلاف کچھ لے کر آیا تو انہوں نے بعض کو تو جھٹلا دیا اور بعض کو قتل کر دیا۔

تفسیر آیات

ایک کلیہ بیان ہو رہا ہے کہ بنی اسرائیل کبھی بھی کسی رسول پر اپنی خواہشات کی قربانی کی بنیاد پر ایمان نہیں لائے، نہ صرف ایمان نہیں لائے بلکہ ان میں سے کچھ کو جھٹلا دیا اور کچھ کو قتل کیا۔

تاریخ ادیان کی روشنی میں قرآن کی یہ ایک عظیم تعلیم ہے کہ قوموں کو اپنے علماء اور ہادیان و ناصحان حق کی پیروی کرنا چاہیے۔ اگر کسی قوم نے اپنے علماء سے یہ توقع رکھی کہ وہ ان کی خواہشات کے مطابق بات کریں تو ان کا حشر بھی بنی اسرائیل کی طرح ہوگا۔ چونکہ اس میں حقائق کا مسخ ہے اور اس میں قیادت کو تابع اور تابع کو قیادت کا حق دیا جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ہدایت و ارتقا ہمیشہ وقتی خواہشات کی قربانی کی بنیاد پر ممکن ہے۔

۲۔ آج بھی لوگ ایسے ہادیان و ناصحان سے نفرت کرتے ہیں جو ان کی خواہشات کے خلاف کوئی حکم خدا بیان کرتے ہیں۔

وَحَسِبُوۡۤا اَلَّا تَکُوۡنَ فِتۡنَۃٌ فَعَمُوۡا وَصَمُّوۡا ثُمَّ تَابَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ ثُمَّ عَمُوۡا وَصَمُّوۡا کَثِیۡرٌ مِّنۡہُمۡ ؕ وَاللّٰہُ بَصِیۡرٌۢ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۷۱﴾

۷۱۔ اور ان کا خیال یہ تھا کہ ایسا کرنے سے کوئی فتنہ نہیں ہوگا، اس لیے وہ اندھے اور بہرے ہو گئے، پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول کی پھر ان میں اکثر اندھے اور بہرے ہو گئے اور اللہ ان کے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَحَسِبُوۡۤا اَلَّا تَکُوۡنَ فِتۡنَۃٌ: یہود چونکہ اپنے آپ کو اللہ کی برگزیدہ قوم سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ وہ جس جرم کا بھی ارتکاب کریں گے اس کا مؤاخذہ نہ ہوگا۔

۲۔ فَعَمُوۡا وَصَمُّوۡا: اس باطل نظریے نے ان کو اندھا اور بہرا کر دیا۔ اس لیے وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ انبیائے کرام کی تکذیب اور قتل کرنے سے کوئی خرابی کیا لازم آئے گی، اللہ نے بنی اسرائیل کو عذاب میں ڈالنا نہیں اور اس کے علاوہ اور کیا خرابی ہو سکتی ہے۔

۳۔ ثُمَّ تَابَ اللّٰہُ: یعنی اللہ نے ان پر توجہ فرمائی اور ان کے لیے ہدایت کا سامان فراہم کر دیا اور یہ بات بھی سمجھا دی کسی انسان کو نسلی بنیاد پر کوئی چھوٹ نہیں ملے گی۔

۴۔ ثُمَّ عَمُوۡا وَصَمُّوۡا: وہ پھر اپنی قدیم ضلالت کی طرف لوٹ آئے۔ اس کے بعد کسی توبہ اور ہدایت کا ذکر نہیں ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد سے اب تک یہ اپنی قدیم گمراہی میں پڑے ہیں۔

۵۔ کَثِیۡرٌ مِّنۡہُمۡ: ان میں سے بہت سے لوگ اندھے بہرے ہو گئے، سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس قوم میں کچھ لوگ پھر بھی حق پر قائم رہے ہیں چونکہ یہ نہیں فرمایا کہ سب لوگ اندھے بہرے ہو گئے۔

بعض کا یہ خیال ہے کہ اس آیت میں ان دو حادثات کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد پیش آئے۔ پہلا حادثہ بخت نصر آشوری کا ہے، جس نے بیت المقدس پر کئی بار حملہ کیا۔ ۶۰۶ء اور ۵۹۸ء اور ۵۸۸ء قبل مسیح۔ آخری حملے میں بنی اسرائیل کو اسیر بنا کر بابل لے آئے۔ پھر ان کی توبہ قبول ہوئی۔ ایران کے کورش کبیر نے آشوریوں پر حملہ کیا۔ بابل فتح کیا۔ بنی اسرائیل کو وطن واپس جانے کی اجازت دی۔ اس کے بعد رومیوں نے متعدد حملے کیے اور یہود منتشر ہو گئے۔

اہم نکات

۱۔ خواہش پرست لوگ ارتکاب جرم کی یہ توجیہ اس لیے کرتے ہیں کہ اس سے کوئی خرابی نہیں آئے گی۔

۲۔ خواہشات کے غلام کی عقل و حواس درست کام نہیں کرتے: فَعَمُوۡا وَ صَمُّوۡا....

۳۔ خواہشات کے قفس میں آنے کے بعد ہدایت و نصیحت بھی غیر مؤثر ہو جاتی ہے: ثُمَّ عَمُوۡا وَ صَمُّوۡا.

لَقَدۡ کَفَرَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡمَسِیۡحُ ابۡنُ مَرۡیَمَ ؕ وَ قَالَ الۡمَسِیۡحُ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اعۡبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیۡ وَ رَبَّکُمۡ ؕ اِنَّہٗ مَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰہِ فَقَدۡ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِ الۡجَنَّۃَ وَ مَاۡوٰىہُ النَّارُ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۷۲﴾

۷۲۔ وہ لوگ یقیناً کافر ہو گئے جو کہتے ہیں: مسیح بن مریم ہی خدا ہیں جبکہ خود مسیح کہا کرتے تھے: اے بنی اسرائیل! تم اللہ ہی کی پرستش کرو جو میرا اور تمہارا رب ہے، بے شک جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا بتحقیق اللہ نے اس پر جنت کو حرام کر دیا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ آیت کے پہلے حصے کی تفسیر اسی سورہ آیت ۱۷ میں ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ موجودہ تحریف شدہ انجیل میں قرآن مجید کے اس بیان کی تائید موجود ہے۔ چنانچہ متی ۴: ۱۰ میں آیا ہے:

> تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔

اور لوقا ۴: ۸ میں آیا ہے:

> تو خدا اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔

اور لوقا ۱۸: ۱۹ میں آیا ہے:

> یسوع نے اس سے کہا: تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے؟ کوئی نیک نہیں مگر ایک ہے یعنی خدا۔

اور انجیل یوحنا ۱۷: ۳ میں آیا ہے:

ابدی زندگی یہ ہے کہ لوگ تجھے پہچان لیں کہ تو ہی واحد حقیقی خدا ہے اور یسوع مسیح وہ ہیں جن کو آپ نے رسول بنا کر بھیجا۔

۳۔ حضرت مسیح (ع) کے خدا نہ ہونے پر ایک واضح دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کی تمام شریعتوں میں یہ بات واضح کر کے بتائی ہے کہ شرک کرنے والے پر جنت حرام ہے۔ جنت اللہ کی خوشنودی کی جگہ ہے اور سب سے زیادہ اللہ کو ناپسند یہ ہے کہ اس کے ساتھ کسی اور کو بھی اللہ کا درجہ دے دیا جائے۔

مسیحیت میں موجود موحدانہ تعلیمات کی بنا پر ہر زمانے میں خود مسیحیوں میں کوئی نہ کوئی موحد موجود رہتا ہے۔ چنانچہ اسپین کے معروف طبیب اور عالم سرویٹوس نے عقیدہ تثلیث کا انکار کیا تو مسیحیت کے دونوں فرقوں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ نے ان پر کفر کا فتویٰ لگایا۔ چنانچہ یہ وہاں سے بھاگے تھے مگر جنیوا میں یہ گرفتار ہوئے۔ ان پر مقدمہ چلا اور ان کو جلا دیا گیا۔[۱]

لَقَدۡ کَفَرَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ ۘ وَ مَا مِنۡ اِلٰہٍ اِلَّاۤ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ؕ وَ اِنۡ لَّمۡ یَنۡتَہُوۡا عَمَّا یَقُوۡلُوۡنَ لَیَمَسَّنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۷۳﴾

۷۳۔ بتحقیق وہ لوگ کافر ہو گئے جو کہتے ہیں: بیشک اللہ تین میں کا تیسرا ہے، جب کہ خدائے واحد کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور اگر یہ لوگ اپنی ان باتوں سے باز نہیں آتے تو ان میں سے کفر کرنے والوں پر دردناک عذاب ضرور واقع ہو گا۔

تفسیر آیات

مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ باپ، بیٹا اور روح القدس تین اقنوم (اصل) ہیں۔ ان میں سے ہر ایک الگ الگ بھی خدا ہے اور تینوں مجتمعاً مل کر ایک خدا ہیں۔[۲] ان کا عقیدہ تثلیث کن مراحل سے گزر کر وجود میں آیا اس پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔

خود اناجیل میں موجود تعلیمات کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام توحید کے داعی اور اللہ واحد کی

---

[۱] الموسوعة العربية الميسرة ص ۹۷۸

[۲] ایک شخص سے عقیدہ تثلیث کے بارے میں سوال کیا گیا جو تازہ مسیحی ہوا تھا تو اس نے کہا: ایک تین ہیں اور تین ایک ہے۔ ان میں سے ایک سولی چڑھ گیا اور مر گیا، لہٰذا سب مر گئے، چونکہ یہ سب ایک وحدت میں تھے، لہٰذا اس وقت کوئی خدا نہیں ہے۔ اگر کوئی خدا موجود رہ گیا ہے تو وحدت ٹوٹ جاتی ہے۔

عبادت کی طرف دعوت دینے والے تھے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی عقیدہ توحید ان کے شاگردوں میں موجود و رائج تھا۔ چنانچہ انجیل برنابا عقیدہ توحید اور مسیح (ع) کے رسول ہونے کی قائل ہے لیکن بعد میں بت پرستانہ ذہنیت کے لوگ اس مذہب میں داخل ہونے کی وجہ سے دین مسیحیت کی اصل شکل وصورت مسخ ہو کر رہ گئی۔

سب سے پہلے یہ اختلاف وجود میں آیا کہ حضرت مسیح (ع)، اللہ ہیں یا رسول۔ چنانچہ ایک نظریہ تو پہلے سے یہ قائم تھا کہ مسیح (ع) اللہ کے رسول ہیں۔ دوسرا نظریہ یہ بنا کہ مسیح (ع) اللہ کے رسول ضرور ہیں لیکن ان کا اللہ کے پاس ایک خاص مقام اور اللہ سے ایک خاص ربط ہے۔ تیسرا نظریہ یہ تھا کہ مسیح (ع) اللہ کا بیٹا ہیں چونکہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے، تاہم مخلوق بھی ہیں۔ چوتھا نظریہ یہ وجود میں آیا کہ مسیح (ع) اللہ کے بیٹے ہیں اور مخلوق نہیں، باپ کی طرح قدیم ہیں۔

چنانچہ ۳۲۵ عیسوی میں ان اختلافات کے تصفیہ کے لیے نیقیا میں ایک بڑا اجتماع ہوا جس میں ۴۸ ہزار علماء اور ماہرین نے شرکت کی۔ چنانچہ روم کا شہنشاہ قسطنطین، جو بت پرست سے تازہ نصرانی بن گیا تھا اور مسیحیت کے بارے میں اسے کچھ علم نہ تھا، نے یہ نظریہ اپنا لیا کہ مسیح (ع) ہی خدا ہیں۔ اس نظریہ کو دوسروں پر مسلط کیا اور باقی مذاہب پر پابندی لگا دی۔ خصوصاً نظریہ توحید پر۔

اس کے بعد روح القدس کے بارے میں ایک نیا اختلاف سامنے آیا۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے روح القدس کو بھی خدا کا درجہ دیا اور کچھ منکر ہو گئے۔

۳۸۱ عیسوی میں قسطنطنیہ میں ایک اور اجتماع ہوا جس میں یہ فیصلہ صادر ہوا:

> روح القدس روح اللہ ہیں۔ روح اللہ، اللہ کی حیات ہیں۔ اگر ہم نے روح اللہ کو مخلوق کہا تو اللہ کی حیات مخلوق ہو جاتی ہے۔ اگر اللہ کی حیات مخلوق ہوتی تو اللہ حَی نہ ہوا۔ اگر ہم نے اللہ کو حَی (زندہ) نہیں سمجھا تو ہم کافر ہو گئے۔
>
> چنانچہ اس اجتماع میں روح القدس بھی خدا کے درجہ پر فائز ہو گیا اور باپ، بیٹا اور روح القدس کی تثلیث کو آخری شکل دے دی گئی۔

اس کے بعد ایک اور اختلاف حضرت مسیح (ع) کے الٰہی اور انسانی پہلو کے بارے میں وجود میں آیا۔ ان میں سے کچھ نے یہ نظریہ قائم کیا کہ یہاں ایک اقنوم ہے اور ایک طبیعت الٰہی، اقنوم باپ کی طرف سے ہے اور انسانی طبیعت حضرت مریم (س) کی طرف سے، لیکن اس نظریے کے کافی مخالفین موجود تھے۔

چنانچہ اس اختلاف کے فیصلے کے لیے ایک اور اجتماع ۴۳۱ء میں شہر افس میں منعقد ہوا، جس میں یہ فیصلہ ہوا:

> مریم عذراء، اللہ کی والدہ ہیں اور مسیح (ع) برحق خدا ہیں اور انسان بھی ہیں اور

دونوں طبیعتیں ایک ہی اقنوم میں جمع ہیں۔

اس کے بعد اسی شہر افس میں ایک اور اجتماع ہوا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا:

حضرت مسیح ایک ہی طبیعت کا نام ہے، جس میں لاہوت اور ناسوت دونوں جمع ہیں۔

لیکن یہ نظریہ بھی تسلیم نہیں کیا گیا۔ اختلاف گرم رہا۔ چنانچہ ۴۵۱ عیسوی میں خلقیدونیہ کالیسڈن میں ایک اور اجتماع ہوا۔ اس میں یہ فیصلہ ہوا:

مسیح (ع) ایک نہیں دو طبیعتوں کے مالک تھے۔ لاہوت ایک طبیعت ہے اور ناسوت اپنی جگہ ایک اور طبیعت ہے۔ یہ دونوں مسیح میں جمع ہو گئی ہیں۔[1]

اَفَلَا یَتُوۡبُوۡنَ اِلَی اللّٰہِ وَ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَہٗ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۷۴﴾

۷۴۔ آخر یہ لوگ اللہ کے آگے توبہ کیوں نہیں کرتے اور مغفرت کیوں نہیں مانگتے؟ اللہ بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

مَا الۡمَسِیۡحُ ابۡنُ مَرۡیَمَ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِہِ الرُّسُلُ ؕ وَ اُمُّہٗ صِدِّیۡقَۃٌ ؕ کَانَا یَاۡکُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنۡظُرۡ کَیۡفَ نُبَیِّنُ لَہُمُ الۡاٰیٰتِ ثُمَّ انۡظُرۡ اَنّٰی یُؤۡفَکُوۡنَ ﴿۷۵﴾

۷۵۔ مسیح بن مریم تو صرف اللہ کے رسول ہیں، ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں اور ان کی والدہ صدیقہ (راست باز خاتون) تھیں، دونوں کھانا کھایا کرتے تھے، دیکھو ہم کس طرح ان کے لیے اپنی آیات کھول کر بیان کرتے ہیں پھر دیکھو یہ لوگ کدھر الٹے جا رہے ہیں۔

تفسیر آیات

الوہیت مسیح کی نفی پر اس آیت میں چند ایک دلائل موجود ہیں:

۱۔ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِہِ الرُّسُلُ: مسیح (ع) صرف رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ ان کو آیات عطا ہوئیں، ان کے ہاتھ سے معجزات صادر ہوئے، ان پر شریعتیں نازل ہوئیں، ان کو کتاب عطا کی گئی۔

مسیح بھی اسی سلسلہ انبیاء کی ایک کڑی ہیں۔ ان پر کتاب نازل ہوئی ہے تو سابقہ انبیاء پر بھی

---

[1] محاضرات فی النصرانیۃ محمد ابوزہرہ سے تلخیص۔

کتابیں نازل ہوئی ہیں۔ ان کو بغیر باپ کے پیدا کیا ہے تو حضرت آدم (ع) کو بغیر باپ اور ماں کے پیدا کیا ہے۔ ان کے ہاتھ سے مردے زندہ ہوئے ہیں تو خلیل کے لیے آگ گلستان بن گئی ہے۔ ان سے بیماروں کو شفا ملتی ہے تو عصائے کلیم سے پانی کے چشمے پھوٹے ہیں وغیرہ۔

۲۔ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ : اور ان کی والدہ راست باز خاتون تھیں۔ وہ اس بات پر بھی راست باز تھیں کہ وہ یہودیوں کی طرف سے عائد کردہ تمام اتہامات سے پاک تھیں اور اس بات پر بھی وہ صدیقہ تھیں کہ مسیح (ع) کو انہوں نے جنا ہے اور جو ماں سے جنا ہے، وہ خدا نہیں ہو سکتا۔

۳۔ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ : یہ دونوں انسان تھے۔ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ اس میں بھی دو نکتے ہیں:

الف : اگر مسیحی صرف مسیح ہی کو خدا سمجھتے ہیں اور مریم کو خدا نہیں سمجھتے تو یہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت مسیح بالکل حضرت مریم کی طرح جسمانی ضرورتوں کے محتاج تھے اور کھانا کھاتے تھے اور دونوں ایک طرح کے بشر تھے تو ان میں سے ایک خدا ہو اور دوسرا نہ ہو، کیسے ممکن ہے؟

ب: اگر دونوں کو خدا مانتے ہیں تو اس صورت میں بھی عقیدہ معقول نہیں ہے، کیونکہ یہ دونوں کھانا کھاتے تھے اور ظاہر ہے کہ کھانے کا محتاج ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا جسم تحلیل ہوتا ہے۔ اس تحلیل شدہ اجزا کا تدارک طعام کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس طرح ایک جسم اپنی حیات کو برقرار رکھنے کے لیے طعام کا محتاج ہے۔ جس کی حیات طعام کی محتاج ہو وہ کیسے خدا بن سکتا ہے؟

اہم نکات

۱۔ مسیح میں خدا ہونے کی کوئی خصوصیت نہیں۔ وہ سلسلہ انبیاء میں ایک نبی ہیں۔

۲۔ کھانا، پینا، سردی گرمی محسوس کرنا مخلوق، محتاج اور بندہ ہونے کی نشانیاں ہیں۔

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ؕ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۷۶

۷۶۔ کہدیجیے: کیا تم اللہ کے سوا ایسی چیز کی پرستش کرتے ہو جو تمہارے نقصان اور نفع پر کوئی اختیار نہیں رکھتی؟ اور اللہ ہی خوب سننے، جاننے والا ہے۔

تفسیر آیات

انسان کسی ہستی کی عبادت اس لیے کرتا ہے کہ وہ کائنات کی خالق اور مالک ہے۔ اس طرح وہ ہر خیر و شر اور نفع و نقصان کی بھی مالک ہوتی ہے لیکن اگر کوئی چیز کسی بھی خیر و شر کی مالک نہ ہو، وہ خود کسی اور کی

مملوک ہو تو وہ خدا کیسے بن سکتی ہے؟

ثانیاً نقصان اور نفع کا ذکر اس لیے کیا ہو کہ اگرچہ عبادت کا معیار، اس کا اہل ہونا اور کمال کا مالک ہونا ہے، لیکن اکثر لوگ دفع ضرر کی خاطر اور خوف کی وجہ سے عبادت کرتے ہیں اور نفع کی خاطر عبادت کرنا بھی انسانی سرشت میں موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ اس آیہ شریفہ میں فرماتا ہے کہ جن لوگوں کی تم پرستش کرتے ہو، وہ دفع ضرر پر قادر ہیں نہ کسی نفع کے حصول پر۔

اہم نکات

۱۔ انسان اپنی عبادت میں بھی دفع ضرر اور جذب منفعت کی طمع رکھتا ہے۔

۲۔ عبادت سے دفع ضرر اور حصول منفعت کو اس آیہ میں ضمناً قبول کیا ہے۔

قُلۡ یٰۤاَہۡلَ الۡکِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِیۡ دِیۡنِکُمۡ غَیۡرَ الۡحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعُوۡۤا اَہۡوَآءَ قَوۡمٍ قَدۡ ضَلُّوۡا مِنۡ قَبۡلُ وَ اَضَلُّوۡا کَثِیۡرًا وَّ ضَلُّوۡا عَنۡ سَوَآءِ السَّبِیۡلِ ﴿۷۷﴾

۷۷۔ کہدیجیے: اے اہل کتاب اپنے دین میں ناحق مبالغہ نہ کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو پہلے ہی گمراہی میں مبتلا ہیں اور دوسرے بہت سے لوگوں کو بھی گمراہی میں ڈال چکے ہیں اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا تَغۡلُوۡا: سابقہ آیت کے ذیل میں بیان کیا گیا کہ مسیحیوں نے اپنے دین میں غلو اور مبالغہ کے کتنے مراحل طے کیے۔

۲۔ وَلَا تَتَّبِعُوۡۤا اَہۡوَآءَ قَوۡمٍ قَدۡ ضَلُّوۡا: اس آیت میں ایک اور اہم حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ وہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ اس میں غلو اور مبالغہ کا اصل سرچشمہ کہاں ہے؟ قرآن فرماتا ہے کہ یہ ان لوگوں کی پیروی سے آیا ہے جو پہلے ہی گمراہی میں مبتلا تھے۔

مسیحی تاریخ کا گہرا مطالعہ کرنے والا بخوبی جانتا ہے کہ ان کے دین میں خرافات دو گروہوں کی طرف سے داخل ہوئے ہیں۔ ایک یہود اور دوسرا یونان کے بت پرست۔ اس مطلب پر گواہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا

میں مسیحی عالم ریورنید چارلس اینڈرسن سکاٹ کا مقالہ ہے، جس میں اعتراف کرتے ہیں کہ باپ، بیٹا اور روح القدس کی اصطلاحیں یہودی ذرائع کی بہم پہنچائی ہوئی ہیں۔

لُعِنَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِیۡسَی ابۡنِ مَرۡیَمَ ؕ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوۡا وَّ کَانُوۡا یَعۡتَدُوۡنَ ﴿۷۸﴾

۷۸۔ بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر اختیار کیا، داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے ان پر لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔

کَانُوۡا لَا یَتَنَاہَوۡنَ عَنۡ مُّنۡکَرٍ فَعَلُوۡہُ ؕ لَبِئۡسَ مَا کَانُوۡا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۷۹﴾

۷۹۔ جن برے کاموں کے وہ مرتکب ہوتے تھے ان سے وہ باز نہیں آتے تھے، ان کا یہ عمل کتنا برا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لُعِنَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیہا السلام نے جو بنی اسرائیل پر لعنت بھیجی ہے، اس کا ذکر عہد عتیق اور عہد جدید میں موجود ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل نے حضرت داؤدؑ کے زمانے میں قانون سبت (ہفتے کے دن مچھلی شکار نہ کرنے کے حکم) کو توڑا اور حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں ان کی تکذیب کی۔

ذٰلِکَ: بنی اسرائیل کے ملعون واقع ہونے کے دو بنیادی اسباب کا ذکر ہے:

i۔ بِمَا عَصَوۡا: ایک تو ان کا عصیان اور سرکشی ہے۔

ii۔ لَا یَتَنَاہَوۡنَ: وہ منکرات کے ارتکاب سے باز نہیں آتے تھے۔

یعنی منکرات اور برائیوں کے آگے کوئی لگام نہ تھی۔

اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ انبیاء کی زبان سے ملعون ہونے والے ملعون ہی ہوتے ہیں، انبیاء کی لعنت رحمت میں نہیں بدلتی۔ جیسا کہ کچھ لوگوں نے اس سلسلے میں بعض ملعونوں کو بچانے کے لیے حدیث گھڑ لی ہے۔

اہم نکات

۱۔ بنی اسرائیل خود اپنی قوم میں مبعوث ہونے والے انبیاء کی زبان سے ہی ملعون قرار پائے ہیں:

لُعِنَ الَّذِیۡنَ ۔۔۔۔

۲۔ جس معاشرے میں لوگ برائیوں سے باز نہ آئیں، ان کا بھی یہی حشر ہو گا: کَانُوۡا لَا یَتَنَاہَوۡنَ ...

تَرٰی کَثِیۡرًا مِّنۡہُمۡ یَتَوَلَّوۡنَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ؕ لَبِئۡسَ مَا قَدَّمَتۡ لَہُمۡ اَنۡفُسُہُمۡ اَنۡ سَخِطَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ وَ فِی الۡعَذَابِ ہُمۡ خٰلِدُوۡنَ ﴿۸۰﴾

۸۰۔ آپ ان میں سے بیشتر لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ (مسلمانوں کے مقابلے میں) کافروں سے دوستی کرتے ہیں، انہوں نے جو کچھ اپنے لیے آگے بھیجا ہے وہ نہایت برا ہے جس سے اللہ ان پر ناراض ہوا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔

وَ لَوۡ کَانُوۡا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ النَّبِیِّ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِ مَا اتَّخَذُوۡہُمۡ اَوۡلِیَآءَ وَ لٰکِنَّ کَثِیۡرًا مِّنۡہُمۡ فٰسِقُوۡنَ ﴿۸۱﴾

۸۱۔ اور اگر وہ اللہ اور نبی اور ان کی طرف نازل کردہ کتاب پر ایمان رکھتے تو ایسے لوگوں سے دوستی نہ کرتے مگر ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ تَرٰی کَثِیۡرًا مِّنۡہُمۡ: اے رسولؐ! آپؐ اپنے معاصر بنی اسرائیل کو دیکھتے ہیں کہ وہ آپؐ کے مقابلے میں کافروں سے دوستی کرتے ہیں اور آپؐ کے خلاف جنگ کرنے کے لیے ان کی مدد کرتے ہیں، حالانکہ آپؐ ان کی کتاب پر ایمان رکھتے اور ان کی کتاب کی تصدیق کرتے ہیں۔ مشرکین تو ان کی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے۔

۲۔ وَ لَوۡ کَانُوۡا یُؤۡمِنُوۡنَ: اگر یہ لوگ اللہ اور نبی پر ایمان رکھتے، خواہ خود حضرت موسیٰ (ع) پر ایمان رکھتے تو وہ حضرت موسیٰ (ع) کے منکرین سے دوستی نہ کرتے۔

سلسلۂ آیات اہل کتاب، خاص کر یہودیوں کے بارے میں ہے، لہٰذا آیت میں النَّبِیِّ سے مراد حضرت موسیٰ (ع) ہی ہو سکتے ہیں۔

۳۔ وَ لٰکِنَّ کَثِیۡرًا مِّنۡہُمۡ فٰسِقُوۡنَ: یہودیوں میں بہت سے لوگ خود حضرت موسیٰ (ع) پر ایمان کے تقاضوں کی خلاف ورزی کر کے فاسق ہو گئے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ یہود اسلام کے مقابلے میں اپنے دیگر دشمنوں سے صلح کے لیے آمادہ ہیں: یَتَوَلَّوۡنَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا۔

۲۔ اسلام کے دشمن سے دوستی کرنا یہود کی قدیمی روش ہے۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَۃً لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوا الۡیَہُوۡدَ وَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا ۚ وَ لَتَجِدَنَّ اَقۡرَبَہُمۡ مَّوَدَّۃً لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوا الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّا نَصٰرٰی ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّ مِنۡہُمۡ قِسِّیۡسِیۡنَ وَ رُہۡبَانًا وَّ اَنَّہُمۡ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ ﴿۸۲﴾

۸۲۔ (اے رسول) اہل ایمان کے ساتھ عداوت میں یہود اور مشرکین کو آپ پیش پیش پائیں گے اور ایمان والوں کے ساتھ دوستی میں انہیں قریب تر پائیں گے، جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں عالم اور درویش صفت لوگ ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔

تشریح کلمات

قِسِّیۡسِیۡنَ: قس عربی میں رات کو کسی شے کے طلب کرنے کے معنوں میں ہے۔ علمائے نصاریٰ شب بیدار عابد ہوتے ہیں، اس لیے انہیں قِسِّیۡسِیۡنَ کہا ہے اور یہ امکان بھی دیتے ہیں کہ یہ لفظ ثریانی یا لاطینی سے منتقل ہو کر عربی میں داخل ہوا ہے یا فارسی کے لفظ کشیش کا مُعرب ہے۔ ان کے مذہبی رہنماؤں میں قسیس دوسرے درجہ پر آتا ہے۔ شماس، قسیس، اسقف۔

تفسیر آیات

۱۔ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ: سابقہ آیت میں یہ بتا دیا کہ یہود و مشرکین میں قدر مشترک اسلام دشمنی ہے۔ اس سے پہلے یہود و نصاریٰ کے مشترک جرائم کا بھی تفصیل سے ذکر ہوا۔ اس آیت میں یہود و نصاریٰ کے درمیان ایک قسم کا موازنہ ہو رہا ہے کہ ان میں کون اسلام دشمنی میں پیش پیش ہے۔

۲۔ الۡیَہُوۡدَ وَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا: اسلام کے دو دشمنوں یہود اور مشرکین میں سے یہود کا ذکر پہلے فرما کر اشارہ فرمایا: ان دونوں میں سے بھی شدید دشمن یہود ہیں۔ چنانچہ یہ بات کس سے پوشیدہ ہے کہ صدر اسلام سے لے کر آج تک یہود کی اسلام دشمنی سب سے زیادہ رہی ہے۔ مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ عہد شکنی سے لے کر آج تک اسلام اور مسلمانوں کو کسی دشمن سے اذیت پہنچی ہے تو اس کے پیچھے یہود کا ہاتھ ہے۔ اسلامی تعلیمات اور مقدسات کے خلاف کوئی سازش ہوئی ہے تو اس کے پیچھے ایک یہودی دماغ کام کر رہا

ہوتا ہے۔

۳۔ وَلَتَجِدَنَّ اَقۡرَبَہُمۡ : یہ بات محتاج بیان نہیں کہ یہود و مشرکین اسلام دشمنی میں کس قدر آگے رہے ہیں۔ البتہ یہ بات وضاحت طلب ہے کہ نصاریٰ اسلام والوں سے دوستی میں سب سے آگے ہیں۔

اگرچہ صلیبی جنگوں میں اور آج تک اسلام کے خلاف اسرائیل اور یہود کی حمایت میں عیسائیوں نے اسلام دشمنی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے، تاہم جب اسلام کی دعوت دنیا کے چہار سو پھیل رہی تھی تو یہودیوں کی بہ نسبت عیسائی سربراہوں نے مثبت ردعمل کا اظہار کیا۔ چنانچہ حبشہ کے نجاشی، روم کے ہرقل اور مصر کے مقوقس نے اس دعوت پر یا تو لبیک کہی یا احسن طریقے سے ردعمل کا اظہار کیا اور آج تک مسیحی اسلام کی دعوت قبول کر لیتے ہیں۔

بعض مفسرین نصاریٰ سے مراد زمان عیسیٰ (ع) کے حقیقی نصاریٰ لیتے ہیں۔ ایک موقف جو قرین واقع ہے، یہ ہے کہ مراد، نصاریٰ بعنوان مکتب نہیں، ایک گروہ ہے، چنانچہ اس آیت میں یہود کا نام بعنوان مکتب لیا ہے اور نصاری کا جب ذکر آیا تو فرمایا: الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّا نَصٰرٰی ، اہل ایمان کے ساتھ دوستی میں قریب تر وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں: ہم نصاریٰ ہیں۔ اس میں ایک گروہ کا ذکر ہے جو دین نصاریٰ کے ساتھ منسلک تھے۔ اس پر دوسرا قرینہ یہ ہے کہ اگلی آیت (۸۳) میں اس گروہ کے اوصاف کا ذکر ہے۔ آیت ۸۴ میں اس گروہ کی زبان سے ان کے مثبت موقف کا ذکر ہے۔ آیت ۸۵ میں ان کے لیے جزائے خیر کا ذکر ہے۔ یہ ساری باتیں مکتب نصاریٰ کے بارے میں نہیں ہیں بلکہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو کہتے ہیں: اِنَّا نَصٰرٰی ....

اس گروہ کے مسلمانوں کے قریب تر ہونے کی وجہ اور سبب یہ بیان فرماتا ہے کہ اس میں علماء موجود ہیں اور دوسری وجہ یہ کہ ان میں تکبر نہیں ہے۔ چونکہ تکبر راہ حق کی طرف آنے کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یعنی یہ ایک ایسا گروہ تھا جس میں ایسے علماء موجود تھے جو تکبر کی بدصفت سے متصف نہ تھے۔

احادیث

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

جن عیسائیوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے، وہ ایک قوم گزری ہے عیسیٰ (ع) اور محمدؐ کے درمیان جو محمدؐ کی آمد کی منتظر تھی۔[1]

ابن عباس سے روایت ہے:

جو یہ خیال کرتا ہے، یہ آیت نصاریٰ کے بارے میں ہے، اس نے جھوٹ بولا، بلکہ یہ ان چالیس نصرانیوں کے بارے میں ہے جن کے سامنے جب رسول اللہ

----

[1] تفسیر عیاشی

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کی تلاوت فرمائی تو ان کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ ان میں سے تیس افراد حبشہ سے اور آٹھ افراد شام سے تھے۔[1]

اہم نکات

۱۔ علماء کا وجود قبول ہدایت کے لیے فضا کو سازگار بنانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔
۲۔ تکبر و نخوت ہر قسم کی ہدایت کے لیے رکاوٹ ہے۔

وَاِذَا سَمِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَی الرَّسُوۡلِ تَرٰۤی اَعۡیُنَہُمۡ تَفِیۡضُ مِنَ الدَّمۡعِ مِمَّا عَرَفُوۡا مِنَ الۡحَقِّ ۚ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاکۡتُبۡنَا مَعَ الشّٰہِدِیۡنَ ﴿۸۳﴾	۸۳۔ اور جب وہ رسول کی طرف نازل ہونے والے کلام کو سنتے ہیں، آپ دیکھتے ہیں کہ معرفت حق کی بدولت ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں، وہ کہتے ہیں: ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے ہیں پس ہمیں گواہی دینے والوں میں شامل فرما۔

شان نزول

ہجرت نبویؐ سے پہلے مسلمانوں کی ایک جماعت نے ملک حبشہ کی طرف ہجرت کی اور نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر طیارؓ نے سورۂ مریم کی چند آیات پڑھ کر سنائیں جس پر نجاشی اور ان کے علماء کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

اس سے اس نظریے کو تقویت ملتی ہے کہ سابقہ اور یہ آیت دونوں نجاشی اور اس جیسے نصرانیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاِذَا سَمِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَی الرَّسُوۡلِ: جب یہ لوگ رسولؐ پر نازل ہونے والی آیات سنتے ہیں تو فرط جذبات سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ اگر کسی بات کا اظہار لفظوں سے نہیں ہوسکتا تو آنسو مؤثر ترین ذریعہ ہیں یا یوں کہنا چاہیے کہ جس تاثر کا اظہار آنسوؤں سے ہوتا ہے، وہ لفظوں سے نہیں ہوتا۔

۲۔ مِمَّا عَرَفُوۡا مِنَ الۡحَقِّ: یہ آنسو حق کی معرفت کی وجہ سے آ رہے ہیں، لہٰذا یہ معرفت حق کے آثار ہیں۔

----

[1] تفسیر التبیان

۳۔ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا: اس معرفت کے بعد اقرار بالایمان ایک لازمی امر تھا، چنانچہ وہ ایمان لے آتے ہیں۔

۴۔ فَاکۡتُبۡنَا مَعَ الشّٰہِدِیۡنَ: اسلام کی حقانیت کی شہادت دینے والوں کی صف میں داخل کرنے کی درخواست بھی اس معرفت کے آثار میں سے ہے۔

اہم نکات

۱۔ رقت قلب، بیداریٔ روح اور معرفت حق کی علامت ہے۔

۲۔ لہٰذا جن کی آنکھیں اشکبار نہیں ہوتیں، ان کی روحیں جامد اور معرفت حق کے لیے نااہل ہوتی ہیں۔

وَ مَا لَنَا لَا نُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَ مَا جَآءَنَا مِنَ الۡحَقِّ ۙ وَ نَطۡمَعُ اَنۡ یُّدۡخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الۡقَوۡمِ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۸۴﴾

۸۴۔ اور ہم اللہ پر اور اس حق پر کیوں نہ ایمان لائیں جو ہمارے پاس آیا ہے؟ اور ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں نیک بندوں کی صف میں شامل کر لے گا۔

فَاَثَابَہُمُ اللّٰہُ بِمَا قَالُوۡا جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ وَ ذٰلِکَ جَزَآءُ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۸۵﴾

۸۵۔ اللہ نے اس قول کے عوض انہیں ایسی جنتوں سے نوازا ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور نیکو کاروں کا یہی صلہ ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَحِیۡمِ ﴿۸۶﴾

۸۶۔ اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہ جہنمی ہیں۔

تفسیر آیات

یہ ان لوگوں کے اوصاف ہیں جو اہل اسلام سے محبت رکھتے ہیں اور ایمان لانے کے لیے آمادہ ہیں۔

۱۔ وَ مَا لَنَا لَا نُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ: تاریکی چھٹ جانے سے حق نظر آنے کے بعد ہم کیوں ایمان نہیں لائیں گے۔

۲۔ وَ نَطۡمَعُ اَنۡ یُّدۡخِلَنَا: ہمیں امید ہے کہ حق کی معرفت کے بعد ہم نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے کہ ہم صالحین کی صف میں شامل ہو جائیں۔

۳۔ فَاَثَابَہُمُ اللّٰہُ بِمَا قَالُوۡا: ان لوگوں نے ایمان کے اظہار میں جو باتیں کہی ہیں، ان باتوں کے عوض میں اللہ انہیں جنت عطا فرمائے گا۔ ایمان کے لیے پہلا مرحلہ اقرر باللسان ہے، لہٰذا فرمایا بِمَا قَالُوۡا جو باتیں ان لوگوں نے کی ہیں، ان کے عوض میں اللہ نے ان کو ثواب میں جنت عنایت فرمائی۔

اہم نکات

۱۔ معرفت حق کے بعد ایمان نہ لانا، معقول نہیں۔

۲۔ صالحین میں شامل ہونے کی آرزو و امید ایمان لانے پر موقوف ہے۔

۳۔ مثبت باتوں کا بھی صلہ ہوتا ہے:۔فَاَثَابَہُمُ اللّٰہُ بِمَا قَالُوۡا....

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُحَرِّمُوۡا طَیِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمۡ وَ لَا تَعۡتَدُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡمُعۡتَدِیۡنَ ﴿۸۷﴾

۸۷۔ اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں اللہ نے تمہارے لیے حلال کر دی ہیں انہیں حرام نہ کرو اور حد سے تجاوز بھی نہ کرو، اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو یقیناً دوست نہیں رکھتا۔

وَ کُلُوۡا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ حَلٰلًا طَیِّبًا ۪ وَّ اتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیۡۤ اَنۡتُمۡ بِہٖ مُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۸۸﴾

۸۸۔ اور جو حلال اور پاکیزہ چیزیں اللہ نے تمہیں عنایت کر رکھی ہیں ان میں سے کھاؤ اور اس اللہ کا خوف کرو جس پر تمہارا ایمان ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا تُحَرِّمُوۡا: اہل ایمان کی توجہ ان کے ایمان کے تقاضوں کی طرف دلائی جا رہی ہے کہ کائنات پر، خواہ عالم تکوین و تخلیق ہو یا عالم تشریع و تقنین، اللہ کی حاکمیت ہے۔ اس میں دخل اندازی نہ کرو اور حلال و حرام کی شریعت سازی کا کام اپنے ہاتھ میں مت لو۔ حلال و حرام وہی ہے جو اللہ کی طرف سے مقرر ہے۔ اللہ کے مقرر کردہ احکام کو اعتنا میں نہ لانا، اس کی طرف سے قائم کردہ حد سے تجاوز کے مترادف ہے۔

۲۔ وَ کُلُوۡا: پاکیزہ اور حلال روزی کھاؤ۔ اسلام دین فطرت ہونے کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ انسانی فطرت اور اس کے کائناتی تقاضے اسلام کے ہر حکم کے پیش نظر ہوں۔ ایک طرف انسان کو کھانے پینے کی ضرورت ہو اور دنیا کی مختلف چیزوں سے لذت حاصل کرنے کی صلاحیت بھی اس میں ودیعت فرمائی گئی ہو، پھر ان سے فائدہ اٹھانے کی ممانعت بھی ہو، ممکن نہیں ہے اور زمین میں صرف بقائے حیات کی محدود چیزیں نہیں

ہیں، یہ مقصد تو صرف گندم یا جو کے دانے سے بھی پورا ہو سکتا ہے، بلکہ مختلف رنگ اور مختلف لذت کی ہزاروں چیزوں کو زمین میں پیدا کر کے ان کو اپنے بندوں پر حرام کر دے، کیسے ممکن ہے:

قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِیۡنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیۡۤ اَخۡرَجَ لِعِبَادِہٖ وَ الطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزۡقِ ؕ قُلۡ ہِیَ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا خَالِصَۃً یَّوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ...[1]

کہد یجیے: اللہ کی اس زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے نکالی اور پاک رزق کو کس نے حرام کیا؟ کہد یجیے: یہ چیزیں دنیاوی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے دن تو خالصتاً انہی کے لیے ہوں گی ....

البتہ شریعت اور قانون پر ایمان و عمل ضروری ہے جس کے تحت ان میں سے حلال اور پاکیزہ چیزوں کی پہچان ہو جاتی ہے۔

اس سے ان لوگوں کے اس خیال کی رد ہو گئی جو عیسائی راہبوں، ہندوؤں، بدھ مذہب کے لوگوں اور تصوف زدہ افراد کی طرح ترک لذات کو روحانی ترقی کا زینہ سمجھتے ہیں۔

حضورؐ کے زمانے میں کچھ لوگ اس ذہنیت کے ہو گئے تھے تو ان کے بارے میں حضورؐ نے خطبہ دیا اور فرمایا:

> ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ انہوں نے پاک چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر دیا ہے۔ دیکھو میں رات کو سوتا ہوں، نکاح کرتا ہوں، دن کو روزہ رکھتا بھی ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ جو میری سنت پر عمل نہ کرے، وہ مجھ سے نہیں ہے۔[2]

اہم نکات

۱۔ اسلام میں رہبانیت (ترک دنیا) کا تصور نہیں ہے۔

۲۔ تخلیق ہو یا تقنین، ہر چیز پر اللہ کی حاکمیت ہے۔ بندہ اپنی طرف سے دخل نہیں کر سکتا۔

۳۔ ایمان کا لازمہ تقویٰ ہے۔ یقین کا لازمہ خوف ہے۔ جیسا کہ بے یقین کا لازمہ لاابالی ہے: وَّاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیۡۤ اَنۡتُمۡ بِہٖ مُؤۡمِنُوۡنَ۔

لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغۡوِ فِیۡۤ اَیۡمَانِکُمۡ وَ لٰکِنۡ یُّؤَاخِذُکُمۡ بِمَا عَقَّدۡتُّمُ الۡاَیۡمَانَ ۚ فَکَفَّارَتُہٗۤ

۸۹۔ اللہ تمہاری بے مقصد قسموں پر تمہارا مواخذہ نہیں کرے گا لیکن جو سنجیدہ قسمیں تم کھاتے ہو ان کا مواخذہ ہو گا، پس اس (قسم توڑنے)

۱؎ ۷ اعراف: ۳۲ ۲؎ الوسائل ۲۳: ۲۴۳

اِطۡعَامُ عَشَرَۃِ مَسٰکِیۡنَ مِنۡ اَوۡسَطِ مَا تُطۡعِمُوۡنَ اَہۡلِیۡکُمۡ اَوۡ کِسۡوَتُہُمۡ اَوۡ تَحۡرِیۡرُ رَقَبَۃٍ ؕ فَمَنۡ لَّمۡ یَجِدۡ فَصِیَامُ ثَلٰثَۃِ اَیَّامٍ ؕ ذٰلِکَ کَفَّارَۃُ اَیۡمَانِکُمۡ اِذَا حَلَفۡتُمۡ ؕ وَ احۡفَظُوۡۤا اَیۡمَانَکُمۡ ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمۡ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۸۹﴾

کا کفارہ دس محتاجوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلانا ہے جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا انہیں کپڑا پہنانا یا غلام آزاد کرنا ہے اور جسے یہ میسر نہ ہو وہ تین دن روزے رکھے، جب تم قسم کھاؤ (اور اسے توڑ دو) تو یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو، اللہ اسی طرح اپنی آیات تمہارے لیے کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم شکر ادا کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ: اگر بلا ارادہ زبان سے از روئے محاورہ یا تکیہ کلام، قسم کا لفظ نکل گیا ہے تو اس کا کوئی کفارہ اور مواخذہ نہیں ہے۔ کیونکہ قسم میں قصد و ارادہ شرط ہے۔

۲۔ وَ لٰکِنۡ یُّؤَاخِذُکُمۡ: لیکن جو سنجیدہ قسمیں تم کھاتے ہو، اس کا مؤاخذہ ہو گا۔

سورہ بقرۃ آیت ۲۲۵ میں مذکور قسم کھا کر دعائیں مانگی جائیں، مثلاً: اے اللہ تیرے ذات کی قسم کھا کر تجھ سے مانگتا ہوں۔ اس قسم کی قسموں کا کفارہ نہیں ہے۔

جس سنجیدہ قسم کا کفارہ ہے، وہ یہ ہے کہ قسم بخدا میں یہ کام کر کے رہوں گا۔ اگر یہ کام نہ کیا تو اس کو قسم توڑنا کہتے ہیں۔ اس کا کفارہ ہے۔

۳۔ فَکَفَّارَتُہٗۤ: اس قسم کے توڑنے کا کفارہ درج ذیل کفاروں میں سے ایک ہے:

الف: اِطۡعَامُ عَشَرَۃِ مَسٰکِیۡنَ: دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے اور کھانا کھلانا چاہیے۔ اس کی قیمت دینا کافی نہیں ہے۔ کھانا اوسط درجے کا کھلانا ہو گا، جو انسان اپنے گھر والوں کو کھلاتا ہے: مِنۡ اَوۡسَطِ مَا تُطۡعِمُوۡنَ اَہۡلِیۡکُمۡ ۔

ب: اَوۡ کِسۡوَتُہُمۡ: یا ان کو یعنی دس مسکینوں کو کپڑے پہنانا ہو گا۔ فقہ جعفری کے مطابق کسوۃ سے مراد قمیض اور شلوار ہے۔

ج: یا ایک غلام آزاد کرنا ہے۔ ان تینوں میں سے جس کو بھی چاہے اختیار کیا جائے۔

۴۔ وَاحۡفَظُوۡۤا اَیۡمَانَکُمۡ: قسموں کی حفاظت سے مراد یہ ہے کہ جب قسم کھاؤ تو اس کی پاسداری کرو۔ یعنی قسم نہ توڑو یا سرے سے قسم نہ کھاؤ۔

۵۔ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمۡ اٰیٰتِہٖ: یعنی اللہ نے تمہارے لیے احکام بیان کر کے اور قسم کی صورت میں مؤاخذے اور گناہ سے نکلنے کا راستہ بیان کر کے تم پر احسان فرمایا ہے تا کہ تم اس کا شکر ادا کرو۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے نام کے ساتھ قسم کھائی جائے تو قصد و ارادے کو دخل ہے۔

۲۔ قسم کا کفارہ معاشرے کی ضرورتوں کا مداوا ہے کہ کسی غریب کا کام بنے۔ کوئی غلام آزاد ہو جائے۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡخَمۡرُ وَ الۡمَیۡسِرُ وَ الۡاَنۡصَابُ وَ الۡاَزۡلَامُ رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّیۡطٰنِ فَاجۡتَنِبُوۡہُ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۹۰﴾

۹۰۔ اے ایمان والو! شراب اور جوا اور مقدس تھان اور پانسے سب ناپاک شیطانی عمل ہیں پس اس سے پرہیز کرو تاکہ تم نجات حاصل کر سکو۔

اِنَّمَا یُرِیۡدُ الشَّیۡطٰنُ اَنۡ یُّوۡقِعَ بَیۡنَکُمُ الۡعَدَاوَۃَ وَ الۡبَغۡضَآءَ فِی الۡخَمۡرِ وَ الۡمَیۡسِرِ وَ یَصُدَّکُمۡ عَنۡ ذِکۡرِ اللّٰہِ وَ عَنِ الصَّلٰوۃِ ۚ فَہَلۡ اَنۡتُمۡ مُّنۡتَہُوۡنَ ﴿۹۱﴾

۹۱۔ شیطان تو بس یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دے اور تمہیں یاد خدا اور نماز سے روکے تو کیا تم باز آ جاؤ گے؟

تفسیر آیات

۱۔ اَلۡخَمۡرُ: شراب کے بارے میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۹ میں تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔ انصاب و ازلام کے بارے میں سورہ مائدہ آیت ۳ میں تفصیل بیان ہو چکی ہے۔

حرمت شراب کے بارے میں دو حکم اس سے پہلے بھی آ چکے ہیں۔ اب آخری حکم پوری صراحت اور تاکید کے ساتھ اس آیت میں آیا ہے۔ یہ حرمت صرف شراب تک محدود نہیں ہے۔ اس کی حرمت کا اصل

سبب اس میں موجود نشہ کی خاصیت ہے، لہٰذا کلی حکم قائم کیا جاتا ہے: کل مسکر حرام۔ ہر نشہ آور چیز حرام ہے یا شراب کی تعریف نشہ آور چیز سے کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا: رسول اللہؐ فرماتے تھے:

كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ وَ كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ۔[1] ہر نشہ آور چیز حرام ہے اور ہر نشہ آور چیز شراب ہے۔

شراب حرام ہے، خواہ اس کی مقدار تھوڑی ہی کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ فرمایا:

فَمَا اَسْكَرَ كَثِيْرُهُ فَقَلِيْلُهُ حَرَامٌ[2] ہر وہ چیز جس کی کثیر مقدار نشہ آور ہو، اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے۔

۲۔ وَالۡمَیۡسِرُ: جوا کھیلنا ایک غیر پیداواری عمل ہونے کے ساتھ معاشرے میں بد امنی، نفرت اور جرائم کا سبب بھی ہے اور ایک نہایت غیر منطقی، غیر انسانی اور غیر اخلاقی عمل ہے کہ ایک شخص بلا استحقاق کسی دوسرے کی دولت پر قابض ہو جائے۔ جس مال و دولت کو سالہا سال کی جفاکشی سے کمایا ہے، چند لمحوں میں دوسرے کے ہاتھ میں چلی جائے اور ایک حسرت اس کے عوض میں مل جائے۔

۳۔ وَالۡاَنۡصَابُ: عرب جاہلیت میں جن پتھروں کی پوجا کرتے تھے، ان کو انصاب کہتے ہیں۔

۴۔ وَالۡاَزۡلَامُ: زلم کی جمع ہے۔ یہ اس تیر کو کہتے ہیں جس کے ذریعے عرب جاہلیت کے دور میں قسمت آزمائی کرتے اور فال نکالتے تھے۔

اس آیت میں شراب اور جوئے کے دنیاوی اور اخروی چند مضرات بیان کیے ہیں:

i۔ شراب اور جوا ناپاک اور فکری پاکیزگی اور نفس کی طہارت کے خلاف ہیں۔

ii۔ عمل شیطان ہیں، جو ہر قسم کی اخلاقی و انسانی قدروں سے دور ہیں۔

iii۔ اِنَّمَا یُرِیۡدُ الشَّیۡطٰنُ: شراب اور جوا دشمنی اور کینے کا باعث ہیں جو شرابی اور جوئے کے معاشرے میں ہمیشہ مشاہدے میں آتے ہیں۔ جیسا کہ قدیم جاہلیت ان دونوں خباثتوں میں ملوث ہونے کی وجہ سے اخلاق سے دور، غیر انسانی قباحتوں کی اتھاہ گہرائیوں میں گری ہوئی تھی، ایسے ہی آج کل کی جدید جاہلیت بھی انہی دو خباثتوں کی وجہ سے تمام تر انسانی و اخلاقی قدروں سے محروم ہو چکی ہے۔

iv۔ وَ یَصُدَّکُمۡ عَنۡ ذِکۡرِ اللّٰہِ: شراب انسان کو ذکر خدا اور نماز سے روک دیتی ہے: وَلَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ...۔[3] ذکر خدا انسانی قدروں کے احیاء کے لیے بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

---

[1] و [2] الکافی ۶: ۴۰۸ [3] ۲۹ عنکبوت: ۴۵

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ ۔[1] نماز ذکر خدا کی اکمل فرد، دین کا ستون، مومن کی معراج اور عبودیت و بندگی کی روح ہے اور کمال مطلق کی بندگی، بندے کا کمال ہے۔ کیونکہ کمال کا ادراک واعتراف دلیل ہے اس بات پر کہ اعتراف و ادراک کنندہ ان قدروں کا مالک ہے۔ ذکر خدا سے روکنے کا مطلب یہ ہے کہ رب کو مطلق طور پر فراموش کر دیا جائے اور جو اللہ کو یاد نہیں کرتا اور فراموش کرتا ہے، وہ دنیا میں فکری و عقلی عدم توازن کا شکار ہو کر ایک اضطراب و پریشانی کے دنیاوی جہنم میں جلتا ہے:

وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِکۡرِیۡ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیۡشَۃً ضَنۡکًا ....[2]	اور جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا اسے یقیناً ایک تنگ زندگی نصیب ہو گی ....

v۔ فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّنۡتَهُوۡنَ : کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے؟ اس لہجے سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس سے پہلے شراب کی ممنوعیت کی چنداں پرواہ نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد لوگوں نے کہا: ہم باز آ گئے۔ حضرت عمر نے فرمایا: انتھینا انتھینا ہم باز آ گئے، ہم باز آ گئے۔[3]

دریابادی اس جگہ لکھتے ہیں:

> کیسا نظام تھا بارگاہ نبوت کا اور کیسی زبردست اصلاحی قوت تھی عرب کے اس اُمی حکیم کی کہ دم کے دم میں پرانے اور عمر بھر کے شرابیوں، جواریوں کو پاکباز و متقی بلکہ پاکبازوں اور صالحین کا سردار بنا دیا۔

احادیث

امام رضا علیہ السلام سے منقول ہے:

مَا بَعَثَ اللّٰہُ نَبِیّاً اِلَّا بِتَحْرِیمِ الْخَمْرِ...۔[4]	اللہ نے تمام انبیاء کو شراب کی حرمت کے حکم کے ساتھ مبعوث کیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ فلاح ونجات، ناپاکی اور عمل شیطان سے اجتناب کرنے میں ہے۔

۲۔ مسلمانوں میں بغض و عداوت شیطان ہی کی طرف سے پھیلتی ہے۔

۳۔ ذکر خدا اور نماز سے باز رکھنے والی چیزیں شیطانی عمل ہیں۔

---

[1] ۲۰ طٰہ: ۱۴ [2] ۲۰ طٰہ: ۱۲۴ [3] ابن جریر طبری [4] التہذیب ۹: ۱۰۲

وَاَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاحۡذَرُوۡا ۚ فَاِنۡ تَوَلَّيۡتُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ﴿۹۲﴾

۹۲۔ اور اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنا بچاؤ کرو پھر اگر تم نے منہ پھیر لیا تو جان لو ہمارے رسول کی ذمے داری تو بس واضح طور پر حکم پہنچا دینا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاَطِيۡعُوا اللّٰهَ: شراب، جوئے وغیرہ سے باز آنے کا حکم بیان کرنے پر تاکید مزید کے طور پر فرمایا: ان ناپاک چیزوں کو ترک کر کے اللہ اور اس کی رسولؐ کی اطاعت کرو۔

۲۔ وَاحۡذَرُوۡا: اپنا بچاؤ کرو۔ حذر ضرر رساں چیز سے بچنے کو کہتے ہیں۔

۳۔ فَاِنۡ تَوَلَّيۡتُمۡ: اگر اس بار بھی اطاعت نہ ہوئی تو نہایت تہدیدی لہجے میں فرمایا: جان لو! ہمارے رسول کی ذمہ داری تو بس واضح طور پر حکم پہنچا دینا ہے لیکن تمہاری یہ نافرمانی خود اللہ تعالیٰ کے خلاف جنگ ہے۔

اہم نکات

۱۔ مومن کا بچاؤ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت ہے۔

لَيۡسَ عَلَى الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيۡمَا طَعِمُوۡۤا اِذَا مَا اتَّقَوۡا وَّاٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوۡا وَّاٰمَنُوۡا ثُمَّ اتَّقَوۡا وَّاَحۡسَنُوۡا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۹۳﴾

۹۳۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال بجا لائے ان کی ان چیزوں پر کوئی گرفت نہ ہو گی جو وہ کھا پی چکے ہیں بشرطیکہ (آیندہ) پرہیز کریں اور ایمان پر قائم رہیں اور نیک اعمال بجا لائیں پھر پرہیز کریں اور ایمان پر قائم رہیں پھر پرہیز کریں اور نیکی کریں اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

شان نزول

تفسیر صافی میں آیا ہے کہ جب شراب اور جوئے کی حرمت کا حکم بڑی شدت کے ساتھ آیا تو مہاجرین اور انصار نے حضورؐ سے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! ہمارے ساتھی دنیا سے چلے گئے اور قتل ہو گئے، وہ تو شراب نوشی کرتے تھے، اللہ نے اسے ناپاک اور عمل شیطان قرار دیا ہے تو ان کا کیا بنے گا؟ اس پر یہ آیت

نازل ہوئی۔

تفسیر آیات

شراب کی حرمت کا حکم آنے سے پہلے جن لوگوں نے شراب نوشی کی ہے، ان کا کوئی گناہ نہ ہو گا، البتہ اس حکم کے نافذ ہونے کے بعد اس سے پرہیز کریں۔ اس سلسلے میں تین مرتبہ تقویٰ اور دو مرتبہ ایمان کا ذکر آیا کہ سابقہ شراب نوشی پر کوئی گرفت نہ ہوگی:

i۔ اگر تقویٰ، ایمان اور عمل صالح ہوں۔

ii۔ پھر تقویٰ اختیار کریں اور جو حکم حرمت شراب پر آیا ہے، اس پر ایمان پختہ ہو۔

iii۔ پھر تقویٰ، لیکن اس مرتبہ احسان کی منزل پر فائز ہوں کہ نیت نیکی کی ہو، نیت میں خلل نہ ہو۔

واضح رہے اللہ کی طرف سے آنے والے ہر حکم پر ایمان رکھنا ایمان تفصیلی کہلاتا ہے جو اللہ و رسولؐ پر اجمالی ایمان کا لازمہ ہے۔ اگر کسی حکم کا منکر ہو جائے تو اس کا ایمان قائم نہیں رہتا۔

احادیث

کافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

اَلْاِیْمَانُ حَالَاتٌ وَ دَرَجَاتٌ وَ طَبَقَاتٌ وَ مَنَازِلُ فَمِنْہُ التَّامُّ الْمُنْتَہَی تَمَامُہُ وَ مِنْہُ النَّاقِصُ الْبَیِّنُ نُقْصَانُہُ وَ مِنْہُ الرَّاجِحُ الزَّائِدُ رُجْحَانُہُ۔[1]

ایمان کے مختلف حالات، درجات، طبقہ بندیاں اور منزلیں ہیں۔ کچھ ان میں سے کامل اور کچھ انتہائی کامل ہیں۔ کچھ کم اور انتہائی کم درجہ کے ہیں اور ان میں سے کچھ رجحان اور کچھ زیادہ رجحان والے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ لاعلمی میں اگر گناہ سرزد ہوا ہے تو گرفت نہ ہوگی بشرطیکہ یہ لاعلمی تقصیر و کوتاہی کی وجہ سے نہ ہو اور بشرطیکہ علم میں آنے کے بعد اس پر ایمان رکھیں اور پرہیز کریں۔

۲۔ خدا و رسولؐ پر ایمان کا حتمی لازمہ یہ ہے کہ ان کے ہر حکم کو تسلیم کریں۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَیَبۡلُوَنَّکُمُ اللّٰہُ بِشَیۡءٍ مِّنَ الصَّیۡدِ تَنَالُہٗۤ اَیۡدِیۡکُمۡ وَ رِمَاحُکُمۡ لِیَعۡلَمَ اللّٰہُ

۹۴۔ اے ایمان والو! اللہ ان شکاروں کے ذریعے تمہیں آزمائش میں ڈالے گا جنہیں تم اپنے ہاتھوں اور اپنے نیزوں کے ذریعے پکڑتے ہو تاکہ اللہ یہ معلوم کرے کہ اس سے غائبانہ طور

---

[1] الکافی ۲: ۳۳

مَنۡ یَّخَافُہٗ بِالۡغَیۡبِ ۚ فَمَنِ اعۡتَدٰی بَعۡدَ ذٰلِکَ فَلَہٗ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۹۴﴾

پر کون ڈرتا ہے پس جو اس کے بعد (بھی) حد سے تجاوز کرے اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَیَبۡلُوَنَّکُمُ: شکار کو عربوں کی معیشت میں اہم حیثیت حاصل تھی۔ خصوصاً اس آیت کے نزول کے وقت سال حدیبیہ احرام کی حالت میں قیام کے دنوں میں شکار بڑی کثرت سے لوگوں کی دست رسی میں آتے تھے۔ اس وقت شکار کی حرمت کا حکم ایک آزمائش تھا۔

۲۔ لِیَعۡلَمَ اللّٰہُ: اس آزمائش میں یہ جاننا مطلوب ہے کہ ان دیکھے خدا سے کون ڈرتا ہے۔ امتحان و آزمائش کے بارے میں پہلے تفصیل سے بات ہو گئی ہے کہ امتحان سے اللہ کوئی علم حاصل نہیں کرنا چاہتا۔ وہ عالم الغیب ہے بلکہ استحقاق اور قابلیت کے لیے امتحان ضروری ہے۔

۳۔ فَمَنِ اعۡتَدٰی: جو حدود، شکار کے بارے میں متعین ہیں، ان سے تجاوز کرنے کی صورت میں دردناک عذاب ہوگا۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقۡتُلُوا الصَّیۡدَ وَ اَنۡتُمۡ حُرُمٌ ؕ وَ مَنۡ قَتَلَہٗ مِنۡکُمۡ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثۡلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ یَحۡکُمُ بِہٖ ذَوَا عَدۡلٍ مِّنۡکُمۡ ہَدۡیًۢا بٰلِغَ الۡکَعۡبَۃِ اَوۡ کَفَّارَۃٌ طَعَامُ مَسٰکِیۡنَ اَوۡ عَدۡلُ ذٰلِکَ صِیَامًا لِّیَذُوۡقَ وَبَالَ اَمۡرِہٖ ؕ عَفَا اللّٰہُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَ مَنۡ عَادَ فَیَنۡتَقِمُ اللّٰہُ مِنۡہُ ؕ وَ اللّٰہُ عَزِیۡزٌ ذُو انۡتِقَامٍ ﴿۹۵﴾

۹۵۔ اے ایمان والو! احرام کی حالت میں شکار نہ کرو، اگر تم میں سے کوئی جان بوجھ کر (کوئی جانور) مار دے تو جو جانور اس نے مارا ہے اس کے برابر ایک جانور مویشیوں میں سے قربان کرے جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل افراد کریں، یہ قربانی کعبہ پہنچائی جائے یا مسکینوں کو کھانا کھلانے کا کفارہ دے یا اس کے برابر روزے رکھے تاکہ اپنے کیے کا ذائقہ چکھے، جو ہو چکا اسے اللہ نے معاف کر دیا اور اگر کسی نے اس غلطی کا اعادہ کیا تو اللہ اس سے انتقام لے گا اور اللہ بڑا غالب آنے والا، انتقام لینے والا ہے۔

تشریح کلمات

اَلۡکَعۡبَۃِ: (ک ع ب) اصل میں ہر اس مقام کو کہتے ہیں جو ٹخنے کی شکل پر چکور بنا ہوا ہو۔ اس لیے

بیت الحرام کے خانہ خدا کو کعبہ کہتے ہیں۔ (راغب)

حُرُمٌ : (ح ر م) جس سے روک دیا گیا ہو اس کو ''حرام'' کہتے ہیں۔ مطلوبہ چیزیں جس سے رد کر دی گئی ہوں اس کو ''محروم'' کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا تَقۡتُلُوا الصَّیۡدَ: حج کے احرام کی حالت میں خشکی کے جانوروں کا شکار کرنا حرام ہے، اگر یہ شکار مُّتَعَمِّدًا جان بوجھ کر ہو۔

۲۔ فَجَزَآءٌ مِّثۡلُ مَا قَتَلَ: اگر کوئی جان بوجھ کر خشکی کے جانور کا شکار کرے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ جس جانور کا شکار کیا گیا ہے، اس کی مثل یعنی اس جیسا جانور کفارے میں دیا جائے۔

۳۔ یَحۡکُمُ بِہٖ ذَوَا عَدۡلٍ مِّنۡکُمۡ: دو عادل افراد اس کا فیصلہ کریں کہ کون سا جانور اس کی مثل ہے۔

۴۔ ہَدۡیًۢا بٰلِغَ الۡکَعۡبَۃِ: یہ کفارہ کعبہ کی سرزمین میں قربانی کی شکل میں انجام دینا چاہیے۔ فقہ جعفری کے مطابق اگر یہ شکار حج کے احرام میں کیا گیا ہے تو اس کا کفارہ منی میں اور اگر عمرہ کے احرام میں ہو تو مکہ میں ذبح ہونا چاہیے۔

آیت کا نزول عمرہ کے بارے میں ہے یا الۡکَعۡبَۃِ سے مراد ارض کعبہ ہے، جس میں منی بھی شامل ہے، لہٰذا یہ حکم قرآن کے خلاف نہیں ہے۔

۵۔ اَوۡ کَفَّارَۃٌ طَعَامُ مَسٰکِیۡنَ: یا مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے۔ فقہ جعفری کے مطابق شکار شدہ جانور کی مثل کی قیمت کا طعام کھلایا جائے گا۔

۶۔ اَوۡ عَدۡلُ ذٰلِکَ صِیَامًا: یا اس کے برابر روزے رکھے۔ برابر سے مراد یہ ہے کہ اس جانور کی مثل کی قیمت میں جس قدر طعام بنتا ہے اس میں ہر ایک مد (۷۵۰ گرام گندم جو وغیرہ) یا دو مد کے مقابلے میں ایک دن روزہ رکھا جائے۔

۷۔ لِّیَذُوۡقَ وَبَالَ اَمۡرِہٖ: تاکہ اپنے عمل کے وبال کا ذائقہ چکھے اور جرم کی حرمت کی خلاف ورزی کی سزا بھگتے۔ کیا یہ کفارات ترتیبی ہیں؟ یعنی پہلا ممکن نہ ہونے کی صورت میں دوسرا، یہ بھی ممکن نہ ہونے کی صورت میں تیسرا ہے یا شروع سے ان میں سے جس کو چاہے اختیار کرے؟ فقہی مسائل کی کتابوں میں مذکور ہے۔

۸۔ عَفَا اللّٰہُ عَمَّا سَلَفَ: اس حکم کے نزول سے پہلے جو شکار ہوئے ہیں، ان کا کفارہ نہیں ہے۔ ان کو اللہ نے معاف فرمایا ہے۔

۹۔ وَمَنۡ عَادَ فَیَنۡتَقِمُ اللّٰہُ مِنۡہُ: شکار پہلی بار کیا ہو تو اس کا کفارہ ہے۔ دوبارہ اعادہ کیا تو گناہ

شدید ہونے کی وجہ سے کفارہ نہیں ہے۔

اُحِلَّ لَکُمۡ صَیۡدُ الۡبَحۡرِ وَ طَعَامُہٗ مَتَاعًا لَّکُمۡ وَ لِلسَّیَّارَۃِ ۚ وَ حُرِّمَ عَلَیۡکُمۡ صَیۡدُ الۡبَرِّ مَا دُمۡتُمۡ حُرُمًا ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیۡۤ اِلَیۡہِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۹۶﴾	۹۶۔ تمہارے لیے سمندری شکار اور اس کا کھانا حلال کر دیا گیا ہے، یہ تمہارے اور مسافروں کے فائدے میں ہے اور جب تک تم احرام میں ہو خشکی کا شکار تم پر حرام کر دیا گیا ہے اور جس اللہ کے سامنے جمع کیے جاؤ گے اس سے ڈرتے رہو۔

تفسیر آیات

۱۔ اُحِلَّ لَکُمۡ صَیۡدُ الۡبَحۡرِ: شیخ طوسی علیہ الرحمہ التبیان میں آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں: اذا حل صید البحر صید الانہار لان العرب تسمی النہر بحراً ومنہ قولہ ظَہَرَ الۡفَسَادُ فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ [۱] یعنی جب سمندر کا شکار حلال ہے تو دریا کا شکار بھی حلال ہے، چونکہ عرب دریا کو بھی بحر کہتے ہیں۔ آگے فرماتے ہیں: اغلب یہ ہے کہ نمکین پانی کو بحر کہتے ہیں لیکن اطلاق کی صورت میں بلا اختلاف اس میں دریا بھی شامل ہوتے ہیں بلا اختلاف صَیۡدُ سے مراد تازہ مچھلی ہے، دریا میں مردہ مچھلی اس میں شامل نہیں ہے۔ چونکہ فقہ جعفری میں پانی میں مردہ مچھلی محرم، غیر محرم سب کے لیے حرام ہے۔

۲۔ وَ طَعَامُہٗ: اس کا کھانا بھی حلال ہے۔ اگر کوئی اور شکار کرے تو بھی اس کا کھانا حلال ہے۔ جب کہ خشکی میں اگر کوئی اور شکار کرے تو دوسروں کے لیے بھی کھانا حرام ہے۔

۳۔ امن کے اس تربیتی دائرے میں آبی حیوانات کو نہیں رکھا۔ اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ مقیم اور مسافر کے زاد راہ کا کوئی ذریعہ فراہم رہے۔ مَتَاعًا لَّکُمۡ سے مراد مقیم اور وَ لِلسَّیَّارَۃِ سے مراد مسافر ہے۔

۴۔ وَ حُرِّمَ عَلَیۡکُمۡ صَیۡدُ الۡبَرِّ مَا دُمۡتُمۡ: البتہ احرام کی حالت میں خشکی کا شکار تمہارے لیے حرام ہے۔

جَعَلَ اللّٰہُ الۡکَعۡبَۃَ الۡبَیۡتَ الۡحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ وَ الشَّہۡرَ الۡحَرَامَ وَ	۹۷۔ اللہ نے حرمت کے گھر کعبہ کو لوگوں کے لیے (امور معاش اور معاد کی) استواری (کا ذریعہ) بنایا اور حرمت کے مہینوں کو بھی

----

[۱] ۳۰ روم: ۴۱

الۡهَدۡیَ وَ الۡقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ وَ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۹۷﴾	اور قربانی کے جانور کو بھی اور ان جانوروں کو بھی جن کے گلے میں پٹے باندھے گئے ہوں، یہ اس لیے تاکہ تم جان لو کہ اللہ وہ سب کچھ جانتا ہے جو آسمانوں میں اور زمین میں ہے اور یہ کہ اللہ ہر چیز کا خوب علم رکھتا ہے۔
اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۹۸﴾	۹۸۔ جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے اور بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ جَعَلَ اللّٰهُ الۡكَعۡبَةَ: کعبہ کی اہمیت صرف اس کے تقدیسی اور عبادتی پہلو سے نہیں ہے بلکہ اس میں لوگوں کی زندگی کے بہت سے مصالح اور مفادات بھی مضمر ہیں۔ کل کعبہ قتل و غارت کے مارے ہوئے عربوں کے لیے جائے امن تھا۔ سال بھر کی خوفناک خانہ جنگیوں میں چار ماہ حرمت والے مہینوں میں امن و سکون ملتا تھا، جن میں وہ اپنی معیشت اور تجارت کے لیے امن سے آتے اور جاتے تھے۔ حج کی وجہ سے ان غیر زراعتی خشک علاقوں کے لوگوں کے لیے دنیا بھر سے آنے والی نعمتوں کی فراوانی ہوتی تھی۔

اَوَ لَمۡ نُمَكِّنۡ لَّهُمۡ حَرَمًا اٰمِنًا یُّجۡبٰۤی اِلَیۡهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَیۡءٍ رِّزۡقًا مِّنۡ لَّدُنَّا وَ لٰكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ○	کیا ہم نے ایک پرامن حرم ان کے اختیار میں نہیں رکھا جس کی طرف ہر چیز کے ثمرات کھنچے چلے آتے ہیں؟ یہ رزق ہماری طرف سے عطا کے طور پر ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔

آج کعبہ اور حرم دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے ایک عظیم مرکز ہے، جہاں دنیا بھر کے مسلمان جمع ہوتے ہیں۔ یہی جمع ہونا اپنے اندر بہت سے ثمرات رکھتا ہے۔ اگرچہ ایک محدود وقت میں اس سے فائدہ اٹھانے میں حکومتوں کی طرف سے رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں لیکن یہ ہر زمانے کے انسانی، معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور عسکری مسائل کا حل تلاش کرنے کا ایک ایسا مقام و مرکز ہے جس پر امت اسلامیہ کے تمام تقدیر ساز امور اور نظام کا قیام عمل میں آ سکتا ہے۔

۲۔ وَ الشَّهۡرَ الۡحَرَامَ: اور وہ ماہ ہائے حرمت جن میں جنگ و قتال ممنوع ہے، حرمت کے ان مہینوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی معاش و معاد کے لیے بنیادی ستون قرار دیا ہے۔

----
۱ ۲۸ قصص: ۵۷

۳۔ وَالۡھَدۡیَ وَالۡقَلَآئِدَ: اس طرح قربانی کے جانوروں سے بھی تمہاری معاش و معاد درست ہوتا ہے۔ ان قربانیوں سے اللہ کی خوشنودی حاصل کی جا سکتی ہے اور ساتھ ان کے گوشت سے تم استفادہ کر سکتے ہو۔

۴۔ ذٰلِکَ لِتَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ: ایک علیم و قدیر ذات ہی انسانی احتیاجات کی باریکیوں کو سمجھ سکتی اور قانون وضع کر سکتی ہے۔

۵۔ اِعۡلَمُوۡۤا: یہ بات بھی انسان کو ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اللہ جب انسانی احتیاجات کے مطابق قانون وضع فرماتا ہے تو اس قانون کو پامال کرنے والوں کو شدید عذاب دے گا اور اس کی پابندی کرنے والوں پر مہربانی فرمائے گا۔

اس بات سے انسان اس نکتہ کی طرف متوجہ ہو ہی جاتا ہے: بے شک اللہ سب چیزوں کا خوب جاننے والا ہے۔

احادیث

امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کے ذیل میں روایت ہے:

جَعَلَهَا اللّٰهُ لِدِیْنِهِمْ وَ مَعَایِشِهِمْ۔[1]　　کعبہ کو اللہ نے لوگوں کے دین اور معیشت کے لیے قیام اور ستون بنا دیا ہے۔

اہم نکات

۱۔　کعبہ سے مسلمانوں کے عبادتی، دفاعی اور اقتصادی امور وابستہ ہیں۔

مَا عَلَی الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ ؕ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَ مَا تَکۡتُمُوۡنَ ﴿۹۹﴾

۹۹۔ رسول کے ذمے بس حکم پہنچا دینا ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ ظاہر کرتے ہو اللہ سب جانتا ہے۔

تفسیر آیات

اس سے پہلے جو احکام بیان ہوئے، ان کی مزید تاکید و تشدید ہے کہ رسولؐ کی ذمے داری صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔ ان احکام کی نافرمانی کی صورت میں تمہارے ظاہر و باطن کا حساب لینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ ارشاد باری ہے:

فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ وَ عَلَیۡنَا الۡحِسَابُ ۔[2]　　... بہرحال آپؐ کے ذمے صرف پیغام پہنچانا اور ہمارے ذمے حساب لینا ہے۔

---

[1] وسائل الشیعۃ ۱۱: ۶۰　　[2] ۱۳ رعد: ۴۰

قُلۡ لَّا یَسۡتَوِی الۡخَبِیۡثُ وَ الطَّیِّبُ وَ لَوۡ اَعۡجَبَکَ کَثۡرَۃُ الۡخَبِیۡثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰہَ یٰۤاُولِی الۡاَلۡبَابِ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾

۱۰۰۔ (اے رسول) کہدیجیے: ناپاک اور پاک برابر نہیں ہو سکتے خواہ ناپاکی کی فراوانی تمہیں بھلی لگے، پس اے صاحبان عقل اللہ کی نافرمانی سے بچو شاید تمہیں نجات مل جائے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ لَّا یَسۡتَوِی: دین اور شریعت امر واقع اور حقائق پر مبنی قدروں پر استوار ہے اور حقیقت یہ ہے کہ پاک اور ناپاک یکساں نہیں ہو سکتے، خواہ حقائق میں ہوں یا کردار و صفات میں۔ مثلاً حلال و حرام، مفید و مضر، مؤمن و کافر، عادل و ظالم، مصلح و مفسد اور عالم و جاہل یکساں نہیں ہو سکتے۔

۲۔ وَ لَوۡ اَعۡجَبَکَ کَثۡرَۃُ الۡخَبِیۡثِ: خواہ ناپاک کی کثرت اور فراوانی تم کو بھلی لگے۔ دین اسلام طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام قرار دیتا ہے، لہٰذا جو چیز حقیقت میں ناپاک ہے، وہ ہمیشہ ناپاک ہے۔ کثرت و قلت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے اور جو چیز پاک ہے، وہ ہمیشہ پاک ہے، خواہ وہ حقیر و قلیل ہی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا عقل سے خطاب کر کے فرمایا کہ کثرت کو معیار نہ بناؤ بلکہ اقدار کو معیار بناؤ۔

۳۔ فَاتَّقُوا اللّٰہَ: صاحبان عقل کو مخاطب قرار دے کر فرمایا: تم کثرت کو معیار نہ بناؤ اور حقائق کو معیار بناؤ۔

۴۔ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ: تمہاری کامیابی حقیقت بینی کے ساتھ مربوط ہے۔

اہم نکات

۱۔ سطحی سوچ رکھنے والے کثرت سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔
۲۔ جب کہ عقل والے قدروں کی پاسداری کرتے ہیں: فَاتَّقُوا اللّٰہَ یٰۤاُولِی الۡاَلۡبَابِ ....
۳۔ محسوس پرست تعداد دیکھتے ہیں اور عاقل اقدار۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَسۡـَٔلُوۡا عَنۡ اَشۡیَآءَ اِنۡ تُبۡدَ لَکُمۡ تَسُؤۡکُمۡ ۚ وَ اِنۡ تَسۡـَٔلُوۡا عَنۡہَا حِیۡنَ یُنَزَّلُ

۱۰۱۔ اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں بری لگیں اور اگر ان کے بارے میں نزول قرآن کے وقت پوچھو گے تو وہ تم پر ظاہر

الۡقُرۡاٰنُ تُبۡدَ لَکُمۡ ؕ عَفَا اللّٰہُ عَنۡہَا ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ حَلِیۡمٌ ﴿۱۰۱﴾

کردی جائیں گی (جو کچھ اب تک ہو) اس سے اللہ نے درگزر فرمایا اور اللہ بڑا بخشنے والا، بردبار ہے۔

قَدۡ سَاَلَہَا قَوۡمٌ مِّنۡ قَبۡلِکُمۡ ثُمَّ اَصۡبَحُوۡا بِہَا کٰفِرِیۡنَ ﴿۱۰۲﴾

۱۰۲۔ایسی باتیں تم سے پہلے لوگوں نے بھی پوچھی تھیں پھر وہ لوگ انہی باتوں کی وجہ سے کافر ہو گئے۔

تفسیر آیات

۱۔ تَسۡـَٔلُوۡا عَنۡ اَشۡیَآءَ: بعض لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فضول باتیں پوچھتے تھے جن کا تعلق ان کے دین سے تھا نہ دنیا سے، بلکہ اس کا جواب اگر دیا جائے تو وہ سوال کرنے والے کے حق میں بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ قرآن بنا بر مصلحت بعض احکام کو مقام عمل میں وسعت دینا چاہتا ہے۔ اسی لیے اس کو بطور اجمال بیان کرتا ہے، کیونکہ اگر تفصیلات میں جائے تو دائرۂ عمل تنگ ہو جاتا ہے۔اس پر عمل کرنا مشکل ہو جاتا ہے ۔مثلاً قوم موسیٰ سے کہا گیا تھا کہ ایک گائے ذبح کرو۔ اگر ان لوگوں نے سوالات کا ایک سلسلہ شروع نہ کیا ہوتا تو کسی بھی گائے کو ذبح کیا جاتا تعمیل ہو جاتی اور کوئی مشکل پیش نہ آتی لیکن ان کے پے درپے سوالوں نے ان کے لیے کام کس قدر مشکل کر دیا اور ان پر عمل کرنا مشکل ہونے کی وجہ سے یا فاسق ہو جاتے یا انکار کر کے کفر تک پہنچتے۔

۲۔ اِنۡ تُبۡدَ لَکُمۡ تَسُؤۡکُمۡ : ان چیزوں کو اگر تم پر ظاہر کر دیا جائے تو تمہیں بری لگیں گی۔ مثلاً تمہاری موت کس وقت آئے گی۔تمہارا باپ وہ نہیں جس کی طرف تو منسوب ہے وغیرہ۔ اس صورت میں وہ اپنی بدنامی دیکھ کر رسولؐ کی تکذیب کریں گے اور نتیجہ کفر کا نکلے گا۔

۳۔ وَ اِنۡ تَسۡـَٔلُوۡا عَنۡہَا حِیۡنَ یُنَزَّلُ الۡقُرۡاٰنُ : اگر نزول قرآن کے وقت پوچھو تو وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔بعض مفسرین کے مطابق اس آیت کے معنی یہ ہیں: جن چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ان چیزوں کے بارے میں اگر نزول قرآن کے وقت پوچھو تو وہ تم کو بتا دی جائیں گی کا یہ مطلب نہیں کہ نزول وحی کے وقت پوچھنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کے بارے میں نہ پوچھو، پھر بھی اگر نزول قرآن کے وقت پوچھا گیا تو بتا دی جائیں گی۔

۴۔ عَفَا اللّٰہُ عَنۡہَا: اس جملے کا ایک معنی یہی ہے جو ترجمے میں اختیار کیا گیا۔ دوسرا معنی یہ بتایا گیا ہے: جن چیزوں سے درگذر اختیار کیا گیا ہے، ان کے بارے میں نہ پوچھو۔ اس صورت میں لَا تَسۡـَٔلُوۡا کے ساتھ مربوط ہے، جو بعید ہونے کی وجہ سے بعید ہے۔

۵۔ قَدۡ سَاَلَہَا قَوۡمٌ مِّنۡ قَبۡلِکُمۡ : چنانچہ سابقہ اقوام نے اس قسم کے سوالات کیے تو حقائق بیان

ہونے پر وہ منکر ہو گئے۔

احادیث

حدیث میں آیا ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا ہے اور امامیہ کتب میں آیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ تَعَالَی افْتَرَضَ عَلَیْکُمْ فَرَائِضَ فَلَا تُضَیِّعُوھَا، وَ حَدَّ لَکُمْ حُدُوداً فَلَا تَعْتَدُوھَا وَ نَھَاکُمْ عَنْ اَشْیَاءَ فَلَا تَنْتَھِکُوھَا وَ سَکَتَ لَکُمْ عَنْ اَشْیَاءَ وَ لَمْ یَدَعْھَا نِسْیَاناً فَلَا تَتَکَلَّفُوھَا۔[1]

اللہ نے تم پر کچھ چیزیں فرض کی ہیں، ان کو ضائع نہ کرو۔ کچھ حدود متعین کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ کچھ چیزوں سے منع کیا ہے، ان کی خلاف ورزی نہ کرو اور کچھ چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے بغیر اس کے کہ اسے بھول گیا ہو، ان میں مت الجھو۔

تعجب کا مقام یہ ہے کہ ہمارے معاشروں میں بالکل اس حدیث کے خلاف عمل ہوتا ہے۔ یہاں فرائض و حدودو اور محرمات کے بارے میں تو لوگ سوال کرتے ہی نہیں، صرف ان چیزوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں جن سے اللہ نے خاموشی اختیار کی ہے۔

اہم نکات

۱۔ سوال کے سلیقہ کی تعلیم دی جا رہی ہے کہ کس قسم کے سوال کرنے چاہئیں اور کس قسم کے سوال نہیں کرنے چاہئیں: لَا تَسۡـَٔلُوۡا عَنۡ اَشۡیَآءَ ....

۲۔ فضول چیزوں کے بارے میں سوال فسق و کفر کا موجب بن سکتا ہے۔

مَا جَعَلَ اللّٰہُ مِنۡۢ بَحِیۡرَۃٍ وَّ لَا سَآئِبَۃٍ وَّ لَا وَصِیۡلَۃٍ وَّ لَا حَامٍ ۙ وَّ لٰکِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یَفۡتَرُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ ؕ وَ اَکۡثَرُہُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۰۳﴾

۱۰۳۔ اللہ نے نہ کوئی بحیرہ بنایا ہے اور نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام، بلکہ کافر لوگ اللہ پر جھوٹ افترا کرتے ہیں اور ان میں اکثر تو عقل ہی نہیں رکھتے۔

تفسیر آیات

عرب جاہلیت کی بعض بدعات اور ان کے خود ساختہ احکام کی بات ہو رہی ہے کہ وہ بعض جانوروں

---

[1] مجمع البیان۔ شرح نہج البلاغۃ ۱۸: ۲۶۷

کو نشان لگا کر چھوڑتے تھے، پھر ان سے خدمات لینا اور سوار ہونا وغیرہ حرام سمجھتے تھے اور ان جانوروں کے مختلف نام رکھتے تھے۔

۱۔ بَحِیۡرَۃٍ: اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو پانچ مرتبہ بچے جن چکی ہو اور چھٹی بار بچہ نہ ہوا ہو۔ اس کا کان چیر کر نشان لگاتے تھے اور پھر اس سے کوئی کام نہیں لیتے تھے، نہ اسے ذبح کیا جاتا تھا۔

۲۔ سَآئِبَۃٍ: اس اونٹنی کو کہتے ہیں، جو کسی مسافر کے باسلامت واپس آنے یا بیماری کی شفایابی وغیرہ کے لیے نذر مانتے تھے اور کہتے تھے کہ فلاں کام ہو جائے تو ناقتی سائبۃ، پھر وہ اس اونٹنی سے کوئی کام نہیں لیتے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ سائبۃ اس اونٹنی کو کہتے تھے جو دس دفعہ مادہ بچے جن چکی ہو، جن میں کوئی نر نہ ہو۔

۳۔ وَصِیۡلَۃٍ: بکری کا پہلا بچہ اگر مادہ ہوتا تو اسے اپنے لیے رکھ لیتے تھے۔ اگر نر ہوتا تو اسے خداؤں کے نام ذبح کرتے تھے اور اگر نر اور مادہ ایک ساتھ پیدا ہو جائیں تو نر کو خداؤں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس کا نام وصیلۃ رکھ دیا گیا تھا۔

۴۔ حَامٍ: اونٹ کا پوتا جب سواری کے قابل ہو جاتا ہے تو عمر رسیدہ اونٹ کو آزاد چھوڑتے یا اس کے شکم سے دس بچے پیدا ہو جاتے تو بھی آزاد چھوڑتے۔

اس آیت میں فرمایا کہ اللہ نے یہ احکام مقرر نہیں کیے، یہ لوگوں کی خود ساختہ چیزیں ہیں۔

وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰی مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَ اِلَی الرَّسُوۡلِ قَالُوۡا حَسۡبُنَا مَا وَجَدۡنَا عَلَیۡہِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوۡ کَانَ اٰبَآؤُہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ شَیۡئًا وَّ لَا یَہۡتَدُوۡنَ﴿۱۰۴﴾

۱۰۴۔ اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جو دستور اللہ نے نازل کیا ہے اس کی طرف اور رسول کی طرف آؤ تو وہ کہتے ہیں: ہمارے لیے وہی (دستور) کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا، خواہ ان کے باپ دادا کچھ بھی نہ جانتے ہوں اور ہدایت پر بھی نہ ہوں۔

تفسیر آیات

اسلام کے حیات آفرین دستور کی طرف دعوت کے مقابلے میں سامنے آنے والے ردعمل کا ذکر ہے کہ اس دعوت پر لبیک کہنے کی بجائے وہ اندھی تقلید کو ترجیح دیتے تھے۔ اندھی تقلید سے مراد یہ ہے کہ جاہل دوسرے جاہل کی تقلید کرے، خواہ وہ کچھ نہ جانتا ہو اور نہ ہی ہدایت پر ہو۔ تمام انسانی معاشرے جاہل کے

عالم کی طرف رجوع کرنے پر قائم ہیں کہ زندگی کے تمام مسائل میں وہ ماہرین کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ان کی باتوں پر عمل کرتے ہیں جو خود آشنائی نہیں رکھتے۔

اہم نکات

۱۔ جاہل، جاہل کی تقلید نہیں کر سکتا: لَا یَعۡلَمُوۡنَ شَیۡـًٔا وَّ لَا یَہۡتَدُوۡنَ۔

۲۔ جاہل اس عالم کی تقلید کر سکتا ہے جو علم اور ہدایت رکھتا ہو۔

۳۔ عالم، عالم کی تقلید نہیں کر سکتا بلکہ وہ اپنے علم پر عمل کرے گا۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا عَلَیۡکُمۡ اَنۡفُسَکُمۡ ۚ لَا یَضُرُّکُمۡ مَّنۡ ضَلَّ اِذَا اہۡتَدَیۡتُمۡ ؕ اِلَی اللّٰہِ مَرۡجِعُکُمۡ جَمِیۡعًا فَیُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾

۱۰۵۔ اے ایمان والو! اپنی فکر کرو اگر تم خود راہ راست پر ہو تو جو گمراہ ہے تمہارا کچھ نہیں بگاڑے گا، تم سب کو پلٹ کر اللہ کی طرف جانا ہے پھر وہ تمہیں آگاہ کرے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔

تفسیر آیات

اگر آپ ایسے فاسد معاشرے میں رہتے ہیں جس کی اصلاح کے لیے آپ کے پاس کوئی چارہ کار نہیں ہے تو اس صورت میں آپ کو چاہیے کہ ساری ہمت اور توجہ اپنی ذات پر مرکوز رکھیں اور گمراہیوں کی بہتات اور گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کی کثرت کہیں آپ کو بھی گمراہ نہ کر دے۔ حق، حق ہوتا ہے، خواہ اس پر عمل کرنے والے کم ہوں اور باطل، باطل ہوتا ہے، خواہ اس پر ساری دنیا عمل کرے۔ دوسروں کی گمراہی سے مؤمن کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا، خواہ پوری روئے زمین پر صرف ایک مومن ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ قوم لوط میں حضرت لوط (ع) کے گھر کے سوا کوئی مسلمان گھرانہ نہیں تھا:

فَمَا وَجَدۡنَا فِیۡہَا غَیۡرَ بَیۡتٍ مِّنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ○ [1]

وہاں ہم نے ایک گھر کے علاوہ مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔

لہٰذا اگر مؤمن خود ہدایت پر ہو تو دوسروں کی گمراہی سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی .... [2]

اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا ....

---

[1] ۵۱ ذاریات: ۳۶ [2] ۶ انعام ۱۶۵

لہٰذا کفر و ضلال، فسق و فجور، بے راہ روی اور بے عفتی کی کثرت مومن کے ایمان کو متزلزل نہیں کر سکتی۔ کہیں ایسا نہ ہو بے راہ روی کو عام ہوتے دیکھ کر آپ سوچنے لگ جائیں: دنیا بدل گئی ہے، سب لوگ مزے لوٹ رہے ہیں، صرف میں پرانی باتوں میں مبتلا رہوں:

قُلۡ لَّا یَسۡتَوِی الۡخَبِیۡثُ وَ الطَّیِّبُ وَ لَوۡ اَعۡجَبَکَ کَثۡرَۃُ الۡخَبِیۡثِ ...[1] (اے رسول) کہد یجیے: ناپاک اور پاک برابر نہیں ہو سکتے، خواہ ناپاکی کی فراوانی تمہیں بھلی لگے ....

واضح رہے کہ مؤمن کے خود راہ راست اور ہدایت پر قائم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے تمام فرائض پر عمل پیرا ہے۔ ان فرائض میں سب سے اہم ترین فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے، لہٰذا جب مومن خود ہدایت پر ہے تو وہ دعوت الی الحق کے اس فریضے کو ترک نہیں کرے گا۔ لہٰذا اس آیت کا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ساتھ کوئی تضاد نہیں ہے۔ ثانیاً ہو سکتا ہے اس آیت کا اطلاق امر بالمعروف ممکن یا مؤثر نہ ہونے کی صورت میں ہو۔

دوسرے لفظوں میں آیت کی اس طرح تشریح ہونی چاہیے: اگر آپ نے دوسروں کو حق کی دعوت نہیں دی اور امر بمعروف و نہی از منکر کا فریضہ انجام نہیں دیا ہے تو آپ کو اپنی فکر کرنا چاہیے، کیونکہ اس صورت میں آپ اِذَا اهۡتَدَیۡتُمۡ ''اگر تم خود راہ راست پر ہو'' میں شامل نہیں ہیں۔ دوسروں کی گمراہی کے آپ جوابدہ ہو سکتے ہیں۔

اور اگر آپ نے حق کی دعوت دی ہے، امر بمعروف نہی از منکر پر عمل کیا ہے اور وہ غیر مؤثر رہا، لوگ گمراہی میں چلے گئے تو اِنۡ عَلَیۡکَ اِلَّا الۡبَلٰغُ ۔[2] آپ کے ذمے صرف (پیغام) پہنچا دینا ہے۔ ان کی گمراہی کے آپ ذمہ دار نہیں ہیں۔ آپ ان کو راہ راست پر لانے کے لیے طاقت استعمال نہیں کریں گے۔ اگر طاقت استعمال کرنا درست ہوتا تو یہ کام اللہ کی طرف سے ہو جاتا:

وَ لَوۡ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ کُلُّهُمۡ جَمِیۡعًا ...[3] اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام اہل زمین ایمان لے آتے۔

اسی طرح ہے اگر آپ کے لیے دعوت حق ممکن ہی نہیں تو ان صورتوں کے لیے فرمایا: عَلَیۡکُمۡ اَنۡفُسَکُمۡ ۔ آپ پر دوسروں کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ آپ صرف اپنی ذات کی فکر کریں۔ آپ ہدایت پر ہیں۔ آپ نے اپنا فریضہ پورا انجام دیا ہے، لہٰذا دوسروں کی گمراہی آپ کو ضرر نہیں دے گی۔

اِلَی اللّٰهِ مَرۡجِعُکُمۡ جَمِیۡعًا: آخر میں ہدایت پانے والے اور ضلالت پر چلنے والے سب کو اللہ کی بارگاہ میں جانا ہے اور ہر ایک کو خود اپنی جوابدہی کی فکر کرنا چاہیے۔ دوسروں کی نہیں: وَ لَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ۔[4] تم لوگوں سے (گزشتہ امتوں کے بارے میں) نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے۔

---

[1] ۵ مائدہ: ۱۰۰ [2] ۴۲ شوریٰ: ۴۸ [3] ۱۰ یونس ۹۹ [4] ۲ بقرہ: ۱۳۴

احادیث

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرو، لیکن اگر لوگ دنیادار، حریص اور خواہش پرست ہو جائیں اور ہر شخص خودسر ہو جائے تو اپنی ذات کو بچا لو اور لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔[1]

اہم نکات

۱۔ باطل کی کثرت سے حق متزلزل نہیں ہوتا۔

۲۔ دوسروں کا کھوج لگانے کی بجائے اپنی ذات کی اصلاح کریں۔

۳۔ اگر تو خود راہ راست پر ہے تو ساری دنیا کی گمراہی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ

۱۰۶۔ اے ایمان والو! جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے تو وصیت کرتے وقت گواہی کے لیے تم میں سے دو عادل شخص موجود ہوں یا جب تم سفر میں ہو اور موت کی مصیبت پیش آ رہی ہو تو دوسرے دو (غیر مسلموں) کو گواہ بنا لو، اگر تمہیں ان گواہوں پر شک ہو جائے تو نماز کے بعد دونوں گواہوں کو روک لو کہ وہ دونوں اللہ کی قسم کھائیں کہ ہم گواہی کا کوئی معاوضہ نہیں لیں گے اگرچہ رشتہ داری کا معاملہ ہی کیوں نہ ہو اور نہ ہم خدائی شہادت کو چھپائیں گے، اگر ایسا کریں تو ہم گناہگاروں میں سے ہو جائیں گے۔

۱۰۷۔ پھر اگر انکشاف ہو جائے کہ ان دونوں نے (جھوٹ بول کر) گناہ کا ارتکاب کیا تھا تو

---

[1] نور الثقلین ۱: ۶۸۴

اِثۡمًا فَاٰخَرٰنِ یَقُوۡمٰنِ مَقَامَہُمَا مِنَ الَّذِیۡنَ اسۡتَحَقَّ عَلَیۡہِمُ الۡاَوۡلَیٰنِ فَیُقۡسِمٰنِ بِاللّٰہِ لَشَہَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنۡ شَہَادَتِہِمَا وَ مَا اعۡتَدَیۡنَاۤ ۫ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۰۷﴾

ان کی جگہ دو اور افراد جن کی حق تلفی ہو گئی ہو اور وہ (میت کے) قریبی ہوں کھڑے ہو جائیں اور اللہ کی قسم کھائیں کہ ہماری شہادت ان کی شہادت سے زیادہ برحق ہے اور ہم نے کوئی تجاوز نہیں کیا، اگر ایسا کریں تو ہم ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔

ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَنۡ یَّاۡتُوۡا بِالشَّہَادَۃِ عَلٰی وَجۡہِہَاۤ اَوۡ یَخَافُوۡۤا اَنۡ تُرَدَّ اَیۡمَانٌۢ بَعۡدَ اَیۡمَانِہِمۡ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ وَ اسۡمَعُوۡا ؕ وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۱۰۸﴾

۱۰۸۔اس طرح زیادہ امید کی جا سکتی ہے کہ لوگ صحیح شہادت پیش کریں یا اس بات کا خوف کریں کہ ان کی قسموں کے بعد ہماری قسمیں رد کر دی جائیں گی اور اللہ سے ڈرو اور سنو اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کرتا۔

شان نزول

ایک مسلمان دو عیسائیوں کے ہمراہ تجارت کی غرض سے شام گیا۔ مسلمان سفر میں مریض ہو گیا تو اس نے اپنی وصیت میں سامان کی فہرست لکھ کر سامان میں رکھ دی اور دونوں ساتھیوں کو وصیت کی میرا سامان میرے گھر پہنچا دیں۔ چنانچہ مسلمان کا انتقال ہوا۔ دونوں عیسائیوں نے اپنی پسند کا سامان نکال لیا۔ باقی گھر پہنچا دیا۔ گھر والوں کو سامان کی فہرست مل گئی۔ جو مال مفقود تھا، اس کے بارے میں دریافت کیا تو عیسائیوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ حضورؐ کی خدمت میں مسئلہ پیش کیا۔ آپؐ نے نماز عصر کے بعد ان کو بلایا۔ ان سے قسم لی۔ بعد میں وہ مفقود سامان کسی جگہ پایا گیا تو حضورؐ کے سامنے مسئلہ دوبارہ پیش کیا گیا تو حضورؐ نے مسلمان کے وارثوں سے قسم لی اور ان کے حق میں فیصلہ دیا۔

تفسیر آیات

۱۔ شَہَادَۃُ بَیۡنِکُمۡ: اگر موت کا وقت آ جائے۔ یعنی موت کے آثار ظاہر ہو جائیں تو دو عادل مسلمانوں کو اپنی وصیت کے لیے گواہ بناؤ۔ اس میں وصیت کی ضرورت کا ایک مسلّم کے طور پر ذکر فرمایا۔ مِّنۡکُمۡ سے مراد مسلمانوں میں سے ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ اَوۡ اٰخَرٰنِ: اگر گواہی کے لیے کوئی مسلم موجود نہیں ہے تو دوسرے دو کو گواہ بنایا جائے۔ دوسرے

دو سے مراد اہل کتاب، یہود و نصاریٰ ہیں۔ چونکہ اسلام مشرکین کو کسی شمار میں نہیں رکھتا۔

۳۔ اِنۡ اَنۡتُمۡ ضَرَبۡتُمۡ فِی الۡاَرۡضِ: غیر مسلم اہل کتاب کو گواہ بنانا صرف سفر کی حالت میں درست ہے۔

۴۔ تَحۡبِسُوۡنَهُمَا مِنۡۢ بَعۡدِ الصَّلٰوۃِ: اگر وارثوں کو شک گزرے تو ان دونوں گواہوں کو نماز کے بعد روک لیا جائے گا۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کے مطابق نماز سے مراد نماز عصر ہے۔ تو یہ دونوں گواہ قسم کھائیں گے۔ یعنی یہ دونوں غیر مسلم گواہ قسم کھائیں گے۔ واضح رہے کہ گواہ پر قسم نہیں ہے۔ صرف اس وصیت کے گواہوں پر قسم ہے جس پر ان دونوں گواہوں کے علاوہ کوئی اور سند نہ ہو۔ اس صورت میں یہ دونوں جہاں گواہ ہیں، وہاں وہ مدعی بھی بن جاتے ہیں کہ فلانی نے وصیت کی ہے۔[۱]

۵۔ لَا نَشۡتَرِیۡ بِهٖ ثَمَنًا: قسم کا یہ مضمون ہونا چاہیے کہ اس گواہی دینے میں کوئی مفاد حاصل نہیں کرنا چاہتے، خواہ یہ گواہی قریبی رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور نہ ہی ہم کسی بات کو چھپاتے ہیں۔

۶۔ فَاِنۡ عُثِرَ: اگر انکشاف ہو جائے کہ دونوں گواہوں نے جھوٹ بولا تھا۔ اسۡتَحَقَّاۤ اِثۡمًا گناہ کے ارتکاب سے مراد جھوٹی گواہی ہے۔ اس صورت میں فَاٰخَرٰنِ یَقُوۡمٰنِ مَقَامَهُمَا، ان کی جگہ دو اور افراد گواہی کے لیے آمادہ ہو جائیں گے۔ مِنَ الَّذِیۡنَ اسۡتَحَقَّ عَلَیۡهِمُ ان دو گواہوں کا تعلق ان لوگوں سے ہو کہ پہلے کے دو گواہ جن کا حق مارنا چاہتے تھے۔ اسۡتَحَقَّ عَلَیۡهِمُ یعنی اجرم علیھم۔ جن پر زیادتی کر کے گناہ کے مستحق ہوئے تھے، وہ میت کے رشتہ دار ہیں۔ الۡاَوۡلَیٰنِ یہ دو گواہ میت کے قریبی رشتہ دار ہوں۔ الۡاَوۡلَیٰنِ یعنی الاولی بالمیت۔ الۡاَوۡلَیٰنِ بدل ہے فَاٰخَرٰنِ کا اور نحو میں معرفہ، نکرہ کا بدل ہو سکتا ہے۔ بعض کے نزدیک الۡاَوۡلَیٰنِ مبتدا ہے اور فَاٰخَرٰنِ یَقُوۡمٰنِ خبر ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر دونوں گواہوں سے خیانت کے آثار ظاہر ہوئے تو میت کے رشتہ داروں میں سے دو افراد ان کی جگہ آمادہ ہو جائیں گے اور قسم کھائیں گے۔

زجاج نے کہا ہے کہ یہ آیت ترتیب کے اعتبار سے قرآن کی مشکل ترین آیت ہے۔[۲]

۷۔ فَیُقۡسِمٰنِ: یہ دوسرے دو گواہ قسم کھائیں گے اور قسم کا یہ مضمون ہوگا: لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ ہم دونوں کی گواہی ان دونوں کی گواہی سے زیادہ برحق ہے۔ وَ مَا اعۡتَدَیۡنَاۤ ہم نے یہ گواہی دے کر سابقہ گواہوں کے ساتھ زیادتی نہیں کی، صرف حق کی بات کی ہے۔

۸۔ ذٰلِكَ اَدۡنٰۤی: مذکورہ یہ طریقہ کار درست شہادت پیش کرنے کے زیادہ قریب ہے۔ اَوۡ یَخَافُوۡۤا یا گواہی دیتے وقت یہ ڈر سچ بات کرنے کے لیے فائدہ دے گا کہ کہیں ہماری گواہی کے بعد دوسرے لوگ ہمارے گواہی کے خلاف کھڑے نہ ہو جائیں۔

آیات کا مفہوم اور خلاصہ یہ ہے کہ اگر موت کا وقت قریب آ جائے تو دو عادل اشخاص کو اپنی وصیت

---

[۱] التبیان　　[۲] المیزان

کے لیے گواہ بناؤ۔ اگر تم حالت سفر میں ہو اور مسلمان گواہ میسر نہ آئیں تو غیر مسلم اہل کتاب میں سے کسی دو کو گواہ بناؤ۔ اگر میت کے وارثوں کو شک ہو جائے تو ان دونوں گواہوں کو نماز کے بعد روک لیا جائے اور ان سے اپنے گواہی کے سچ ہونے پر قسم لی جائے۔ اس طرح فیصلہ کر لیا جائے اور اگر انکشاف ہو جائے کہ ان دونوں گواہوں نے جھوٹ بولا تھا تو ان کی بجائے میت کے قریبی لوگوں میں سے دو گواہ پیش ہوں اور قسم کھا کر کہیں: ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی سے زیادہ درست ہے۔

اس قانون میں واقع تک پہنچنے کے لیے دو ذریعے موجود ہیں: اول یہ کہ شک کی صورت میں خود گواہوں کو قسم کھانا پڑتی ہے اور غالباً قسم جھوٹ ہونے کی صورت میں نہیں کھاتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وارثوں پر قسم آنے کی صورت میں ان دونوں کی گواہی غلط ثابت ہو جائے گی اور ان دونوں کے لیے فضیحت کا باعث بنے گی۔ یہ وہ دو باتیں ہیں جن کی وجہ سے درست گواہی مل سکتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ مسلم میسر نہ آنے کی صورت میں اہل کتاب کو گواہ بنانا درست ہے۔

۲۔ قسم کھلانا عدالتوں کے حق تک پہنچ سکنے کا ایک ذریعہ ہے۔

۳۔ گواہی تمام انسانی معاشروں کی ضرورت ہے۔

۴۔ اسلامی معاشرے میں عادل ہی کو ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔

۵۔ عادل، اسلامی معاشرے کی ایک ضرورت ہے۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿١٠٩﴾

۱۰۹۔ (اس دن کا خوف کرو) جس دن اللہ سب رسولوں کو جمع کر کے ان سے پوچھے گا: (امتوں کی طرف سے) تمہیں کیا جواب ملا؟ وہ عرض کریں گے: (تیرے علم کی نسبت) ہمیں علم ہی نہیں، غیب کی باتوں کو یقیناً تو ہی خوب جانتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یَوۡمَ یَجۡمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ: یہ قیامت کے دن کا ذکر ہے کہ تمام انبیاء سے ان کی امتوں کے بارے میں سوال ہو گا۔ یعنی سب کے سامنے ہر امت کا راز فاش ہو جائے گا۔ اگر اپنے رسول سے اچھا برتاؤ نہیں کیا ہے تو تمام مخلوق کے سامنے فضیحت و رسوائی اٹھانا ہو گی اور اس کے بعد عذاب الیم ہو گا۔

۲۔ قَالُوۡا لَا عِلۡمَ لَنَا: رسولوں کی طرف سے اظہار لاعلمی کرنا آداب بندگی ہے۔ کیونکہ یہاں عدالت الٰہیہ میں علم خدا کے سامنے لب کشائی کرنا خلاف ادب تصور کیا جاتا ہے۔ قیامت کے دن جہاں رسولوں سے

سوال ہو گا کہ امتوں نے ان کی دعوت کا کیا جواب دیا؟ خود امتوں سے بھی سوال ہو گا۔ جیسا کہ فرمایا:

فَلَنَسۡـَٔلَنَّ الَّذِیۡنَ اُرۡسِلَ اِلَیۡہِمۡ وَ لَنَسۡـَٔلَنَّ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ۙ [1]

پس جن کی طرف پیغمبر بھیجے گئے ہم ہر صورت میں ان سے سوال کریں گے اور خود پیغمبروں سے بھی ہم ضرور پوچھیں گے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے دن اپنے رسول کے سامنے اللہ کو حساب دینا ہو گا۔

۲۔ اس دن تمام راز فاش ہو جائیں گے۔

اِذۡ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ اذۡکُرۡ نِعۡمَتِیۡ عَلَیۡکَ وَ عَلٰی وَالِدَتِکَ ۘ اِذۡ اَیَّدۡتُّکَ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ ۟ تُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الۡمَہۡدِ وَ کَہۡلًا ۚ وَ اِذۡ عَلَّمۡتُکَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ التَّوۡرٰىۃَ وَ الۡاِنۡجِیۡلَ ۚ وَ اِذۡ تَخۡلُقُ مِنَ الطِّیۡنِ کَہَیۡـَٔۃِ الطَّیۡرِ بِاِذۡنِیۡ فَتَنۡفُخُ فِیۡہَا فَتَکُوۡنُ طَیۡرًۢا بِاِذۡنِیۡ وَ تُبۡرِئُ الۡاَکۡمَہَ وَ الۡاَبۡرَصَ بِاِذۡنِیۡ ۚ وَ اِذۡ تُخۡرِجُ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِیۡ ۚ وَ اِذۡ کَفَفۡتُ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ عَنۡکَ اِذۡ جِئۡتَہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡہُمۡ اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۱۰﴾

۱۱۰۔ جب عیسیٰ بن مریم سے اللہ نے فرمایا: یاد کرو میری اس نعمت کو جو میں نے تمہیں اور تمہاری والدہ کو عطا کی ہے جب میں نے روح القدس کے ذریعے تمہاری تائید کی، تم گہوارے میں اور بڑے ہو کر لوگوں سے باتیں کرتے تھے اور جب میں نے تمہیں کتاب، حکمت، توریت اور انجیل کی تعلیم دی اور جب تم میرے حکم سے مٹی سے پرندے کا پتلا بناتے تھے پھر تم اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا اور تم مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے صحت یاب کرتے تھے اور تم میرے حکم سے مردوں کو (زندہ کر کے) نکال کھڑا کرتے تھے اور جب میں نے بنی اسرائیل کو اس وقت تم سے روک رکھا جب تم ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تھے تو ان میں سے کفر اختیار کرنے والوں نے کہا: یہ تو ایک کھلا جادو ہے۔

---

[1] ۷ الاعراف: ۶

تفسیر آیات

۱۔ اُذۡکُرۡ نِعۡمَتِیۡ: اللہ کی ان نعمتوں کا ذکر ہے جن سے اللہ نے حضرت عیسیٰ (ع) اور ان کی والدہ حضرت مریم (س) کو نوازا ہے۔ اگلے جملوں میں ان نعمتوں کا ذکر ہے۔

۲۔ اِذۡ اَیَّدۡتُّکَ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ: ان نعمتوں میں سے ایک اہم نعمت یہ ہے کہ اللہ نے حضرت عیسیٰ (ع) کو اپنی تائید و حمایت سے نوازنے کے لیے روح القدس کو ذریعہ بنایا۔ روح القدس کے بارے میں سورہ بقرہ آیت ۸۷ میں تشریح ہو چکی ہے۔ تُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الۡمَهۡدِ۔ گہوارے میں کلام کرنا روح القدس کی تائید سے ممکن ہوا ہے۔

۳۔ وَ اِذۡ عَلَّمۡتُکَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ: کتاب سے مراد وحی اور حکمت سے مراد حقیقت بینی ہے اور اس کے بعد توریت و انجیل کا ذکر عام کے بعد خاص کا ذکر ہے، جو اس خاص کی اہمیت کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔

۴۔ وَ اِذۡ تَخۡلُقُ مِنَ الطِّیۡنِ: مٹی سے پرندے کا پتلا بنانے، مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو شفا دینے کے بارے میں آل عمران ۴۵ تا ۵۰ میں ذکر ہو گیا

۵۔ وَ اِذۡ تُخۡرِجُ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِیۡ: کہ آپ مردوں کو قبروں سے نکالتے ہیں۔ سورۃ آل عمران میں اُحۡیِ زندہ کرتا ہوں فرمایا: یعنی جب حضرت عیسیٰ (ع) اپنی زبان سے اظہار نعمت کرتے ہیں تو زندہ کرتا ہوں فرماتے ہیں لیکن اللہ نے اسے تُخۡرِجُ نکالتے ہو، فرمایا، اس بات کی وضاحت کے لیے کہ آپؑ ایسے لوگوں کو زندہ کرتے تھے جو قبروں میں دفن ہو چکے تھے۔

۶۔ اِذۡ کَفَفۡتُ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ عَنۡکَ: جب یہودی آپؑ کو قتل کرنا چاہتے تھے تو اللہ نے آپ کو بچایا اور جو آیات بینات اور واضح معجزات آپ نے پیش کیے ان کو جادو کہکر مسترد کر دیا تو اللہ نے آپ کو ان کے مکر سے بچا لیا۔

اس موضوع پر مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ آل عمران: ۴۵ تا ۵۰۔

وَ اِذۡ اَوۡحَیۡتُ اِلَی الۡحَوَارِیّٖنَ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِیۡ وَ بِرَسُوۡلِیۡ ۚ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا وَ اشۡهَدۡ بِاَنَّنَا مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۱۱﴾

۱۱۱۔ اور جب میں نے حواریوں پر الہام کیا کہ وہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لے آئیں تو وہ کہنے لگے: ہم ایمان لے آئے اور گواہ رہیے کہ ہم مسلمان ہیں۔

تفسیر آیات

حوارین سے مراد حضرت عیسیٰ (ع) پر ایمان لانے میں سابقین اولین ہیں۔

یہاں وحی سے مراد الہام ہے۔ جیسا کہ قرآن نے متعدد جگہوں پر الہام کو وحی سے تعبیر کیا ہے۔ وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوۡسٰۤی ...[1] اور ہم نے مادر موسیٰ کی طرف وحی کی۔ وَاَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ ...[2] اور آپ کے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی۔

یہ الہام سابقہ ایمان لے آنے اور حواری کے مقام پر فائز ہونے کے بعد تجدید عہد کے لیے ہوا ہے۔

اَنۡ اٰمِنُوۡا بِیۡ وَ بِرَسُوۡلِیۡ: اس ایمان سے مراد ممکن ہے، اس عہد و میثاق پر ایمان ہو جو مسیحی مذہب کو بچانے کے لیے ان کو پیش آنے والا ہے۔

وَاشۡہَدۡ بِاَنَّنَا مُسۡلِمُوۡنَ: سے بھی اس بات کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے کہ ہم اس سنگین ذمہ داری کو دل و جان سے تسلیم کرتے ہیں۔

اِذۡ قَالَ الۡحَوَارِیُّوۡنَ یٰعِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ ہَلۡ یَسۡتَطِیۡعُ رَبُّکَ اَنۡ یُّنَزِّلَ عَلَیۡنَا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰہَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۱۲﴾

۱۱۲۔ (وہ وقت یاد کرو) جب حواریوں نے کہا: اے عیسیٰ بن مریم کیا آپ کا رب ہمارے لیے آسمان سے کھانے کا خوان اتار سکتا ہے؟ تو عیسیٰ نے کہا: اگر تم مومن ہو تو اللہ سے ڈرو۔

قَالُوۡا نُرِیۡدُ اَنۡ نَّاۡکُلَ مِنۡہَا وَ تَطۡمَئِنَّ قُلُوۡبُنَا وَ نَعۡلَمَ اَنۡ قَدۡ صَدَقۡتَنَا وَ نَکُوۡنَ عَلَیۡہَا مِنَ الشّٰہِدِیۡنَ ﴿۱۱۳﴾

۱۱۳۔ انہوں نے کہا: ہم چاہتے ہیں کہ اس (خوان) میں سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور یہ جان لیں کہ آپ نے ہم سے سچ کہا ہے اور اس پر ہم گواہ رہیں۔

قَالَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ اللّٰہُمَّ رَبَّنَاۤ اَنۡزِلۡ عَلَیۡنَا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ تَکُوۡنُ لَنَا عِیۡدًا لِّاَوَّلِنَا وَ اٰخِرِنَا وَ اٰیَۃً مِّنۡکَ ۚ وَ ارۡزُقۡنَا وَ اَنۡتَ خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡنَ ﴿۱۱۴﴾

۱۱۴۔ تب عیسیٰ بن مریم نے دعا کی: اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! ہمارے لیے آسمان سے کھانے کا ایک خوان نازل فرما کہ ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لیے وہ دن عید اور تیری طرف سے نشانی ہو اور ہمیں رزق دے کہ تو بہترین رزق دینے والا ہے۔

---

[1] ۲۸ قصص: ۷   [2] ۱۶ نحل: ۶۸

قَالَ اللّٰہُ اِنِّیۡ مُنَزِّلُہَا عَلَیۡکُمۡ ۚ فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بَعۡدُ مِنۡکُمۡ فَاِنِّیۡۤ اُعَذِّبُہٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُہٗۤ اَحَدًا مِّنَ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۱۵﴾

۱۱۵۔اللہ نے فرمایا: میں یہ خوان تم پر نازل کرنے والا ہوں لیکن اگر اس کے بعد تم میں سے کوئی کفر اختیار کرے گا تو اسے میں ایسا عذاب دوں گا کہ اس جیسا عذاب عالمین میں کسی کو نہ دیا ہوگا۔

تفسیر آیات

یہ سوال حواریوں کی طرف سے اس وقت کیا گیا جب وہ حضرت عیسیٰ (ع) پر ایمان لا چکے تھے اور ان کے حواریوں میں شامل ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ حواری حضرت عیسیٰ (ع) کی معجزانہ ولادت اور گہوارہ میں کلام کرنے کو دیکھ کر ایمان لائے، اس کے باوجود مائدہ کا مطالبہ کیا معنی رکھتا ہے؟

جواب یہ ہے کہ یہ درست ہے کہ ان کا یہ مطالبہ ایک قسم کے عدم اطمینان کا اظہار تھا، اس لیے حضرت عیسیٰ نے ان کو ان الفاظ میں سرزنش کی:

اتَّقُوا اللّٰہَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ۔ اگر تم ایمان والے ہو تو خدا سے ڈرو۔

یعنی ایسی خلاف ایمان باتیں نہ کرو۔

لیکن حواریوں نے اپنے مطالبہ کے جائز اور نیک نیتی پر مبنی ہونے اور یہ مطالبہ ایمان کے منافی نہ ہونے پر درج ذیل مطالب بیان کیے:

i۔ تَطۡمَئِنَّ قُلُوۡبُنَا: اس خوان سے کھا کر ہمارے دلوں میں اطمینان آئے گا۔

ii۔ وَنَعۡلَمَ اَنۡ قَدۡ صَدَقۡتَنَا: آپؑ کی نبوت کی صداقت پر ایک اور تازہ معجزہ سامنے آئے گا۔

iii۔ وَنَکُوۡنَ عَلَیۡہَا مِنَ الشّٰہِدِیۡنَ: دوسروں کے لیے ہم آپؑ کی صداقت پر گواہی دیں گے۔

سیاق آیت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی توجیہ حضرت عیسیٰ (ع) نے پسند فرمائی اور نزول مائدہ کی دعا کے ضمن میں اس کے دیگر فوائد و مصالح کی طرف اشارہ فرمایا:

i۔ تَکُوۡنُ لَنَا عِیۡدًا: نزول مائدہ پوری امت کے لیے عید بن جائے۔

ii۔ وَاٰیَۃً مِّنۡکَ: امت عیسیٰ (ع) کے لیے ایک خصوصی نشانی کی حیثیت بن جائے۔

iii۔ وَارۡزُقۡنَا: اللہ کی طرف سے پانے والے براہ راست رزق کی سعادت سے مالا مال ہو جائیں۔

دعائے مسیح (ع) نے شرف قبولیت حاصل کرنا ہی تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں خوان نازل کرنے والا ہوں۔ اللہ کی طرف سے ایک حتمی وعدہ آنے کے بعد خوان نازل ہونا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین بعض روایت کی بنا پر لکھتے ہیں: سخت ترین عذاب کی دھمکی سن کر حواریوں نے اپنا مطالبہ

واپس لے لیا۔

موجودہ اناجیل میں اس خوان کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ بعض واقعات ملتے ہیں لیکن جو واقعہ قرآن نے بیان کیا ہے، اس کے مطابق نہیں ہے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ حضرت عیسیٰ (ع) کے صدیوں بعد جمع ہونے والی اناجیل سے یہ واقعہ رہ گیا ہو اور عین ممکن ہے کہ اس واقعہ کے ضمن میں حضرت عیسیٰ (ع) کے ابن اللہ نہ ہونے اور رسول ہونے پر واضح دلائل موجود ہوں، اس لیے اسے حذف کر دیا ہو۔

اہم نکات

۱۔ بلا ضرورت معجزہ کا مطالبہ بھی ایک قسم کا انکار ہے: اتَّقُوا اللّٰهَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ۔

۲۔ اسلاف کے کارنامے نسلوں کے لیے اثر چھوڑتے ہیں: عِيۡدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا ....

۳۔ معجزات و دلائل سے ایمان میں اضافہ ہوسکتا ہے: وَتَطۡمَئِنَّ قُلُوۡبُنَا ....

۴۔ معجزات و دلائل کے بعد انتقام بھی سخت ہوگا: اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا ....

وَاِذۡ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ ءَاَنۡتَ قُلۡتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوۡنِيۡ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيۡنِ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبۡحٰنَكَ مَا يَكُوۡنُ لِيۡۤ اَنۡ اَقُوۡلَ مَا لَيۡسَ لِيۡ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنۡ كُنۡتُ قُلۡتُهٗ فَقَدۡ عَلِمۡتَهٗ ؕ تَعۡلَمُ مَا فِيۡ نَفۡسِيۡ وَلَاۤ اَعۡلَمُ مَا فِيۡ نَفۡسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ عَلَّامُ الۡغُيُوۡبِ ﴿۱۱۶﴾

۱۱۶۔ اور (وہ وقت یاد کرو) جب اللہ نے فرمایا: اے عیسیٰ بن مریم کیا آپ نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری والدہ کو خدا بناؤ؟ عیسیٰ نے عرض کی: تو پاک ہے میں ایسی بات کیسے کہ سکتا ہوں جس کا مجھے کوئی حق ہی نہیں؟ اگر میں نے ایسا کچھ کہا ہوتا تو تجھے علم ہوتا کیونکہ تو میرے دل کی بات جانتا ہے لیکن میں تیرے اسرار نہیں جانتا، یقیناً تو ہی غیب کی باتیں خوب جاننے والا ہے۔

مَا قُلۡتُ لَهُمۡ اِلَّا مَاۤ اَمَرۡتَنِيۡ بِهٖۤ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيۡ وَرَبَّكُمۡ ۚ وَكُنۡتُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا مَّا دُمۡتُ

۱۱۷۔ میں نے تو ان سے صرف وہی کہا جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا کہ اس اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے، جب تک میں ان

فِيۡهِمۡ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيۡتَنِيۡ كُنۡتَ اَنۡتَ الرَّقِيۡبَ عَلَيۡهِمۡ ؕ وَاَنۡتَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ ﴿۱۱۷﴾

کے درمیان رہا میں ان پر گواہ رہا اور جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو خود ہی ان پر نگران ہے اور تو ہی ہر چیز پر گواہ ہے۔

اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ فَاِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۱۱۸﴾

۱۱۸۔ اگر تو انہیں عذاب دے تو یہ تیرے ہی بندے ہیں اور اگر تو انہیں بخش دے تو تو ہی غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اتَّخِذُوۡنِیۡ وَاُمِّیَ اِلٰـہَیۡنِ: اے عیسیٰ کیا آپ نے لوگوں سے کہا تھا، اللہ کو چھوڑ کر مجھے اور میری والدہ کو معبود بناؤ؟

اگرچہ مسیحی تعلیمات میں حضرت مریم (س) کو معبود بنانے کا تصور سرے سے نہیں ہے لیکن حضرت عیسیٰ (ع) کے صدیوں بعد مسیحیوں نے مریم (س) کو مادر خدا کا لقب دیا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ حضرت مریم (س) کو الوہیت کا مقام دینا شروع کیا۔ بعد میں چرچ کی طرف سے اسے رسمیت بھی حاصل ہوگئی۔ اس کے بعد کیتھولک گرجاؤں میں ان کی قدآور تصویریں آویزاں کرنا شروع ہو گیا، جن کے سامنے وہ مریم (س) کی عبادت کے مراسم ادا کرنے لگے۔ حضرت مریم (س) کی عبادت کے مختلف مظاہر سامنے آنے شروع ہو گئے۔ ایک تو یہ کہ ان کی حمد و ثنا پر مشتمل نماز۔ دوسرا ان کے آگے مشکل کشائی کے لیے دعائیں کرنا۔ تیسرا ان کے نام روزہ رکھنا جو صیام مریم سے موسوم تھا۔

تفسیر روح المعانی کے مطابق عیسائیوں میں ایک قوم ایسی گزری ہے جو حضرت مریم (س) کے خدا ہونے کی قائل تھی۔

مریم پرستی کی شدت میں ظہور اسلام کے بعد پروٹسٹنٹ کی اصلاحی تحریک سے کمی آ گئی ہے۔

۲۔ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ: اللہ کو چھوڑ کر مسیح اور مریم کو خدا بنانے سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی وحدانیت کو چھوڑ کر۔ ورنہ وہ مسیح و مادر مسیح و روح القدس کے ساتھ اللہ کو بھی معبود بناتے ہیں، کیونکہ اللہ کی مطلق عبادت مطلوب نہیں ہے، بلکہ وحدانیت کے ساتھ عبادت ہو تو یہ اللہ کی عبادت ہے۔ شرک کے ساتھ ایمان و عبادت قابل تسلیم نہیں ہے۔

۳۔ مَاقُلۡتُ لَہُمۡ اِلَّا مَاۤ اَمَرۡتَنِیۡ: میں نے تو ان سے صرف وہی کہا ہے جس کا تو نے حکم دیا تھا

کہ اللہ ہی کی عبادت کرو، جو میرا اور تمہارا رب ہے۔

چنانچہ موجودہ تثلیثی انجیل بھی اس اعتراف سے خالی نہیں ہے:

ابدی زندگی یہ ہے کہ لوگ تیری معرفت حاصل کریں کہ تو ہی حقیقی اور واحد معبود ہے۔ یسوع مسیح کو آپ نے بھیجا۔[1]

۴۔ وَ كُنۡتُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا مَّا دُمۡتُ: جب تک میں ان کے درمیان رہا میں ان پر گواہ رہا۔ اس جملے میں یہ علم ہو گیا کہ رسول کی دو ذمہ داریاں ہوتی ہیں: ایک تبلیغ اور دوسری گواہی دینا۔ یعنی ہر رسول اپنی امت کے اعمال پر گواہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے آیت میں ذکر ہوا کہ قیامت کے دن اللہ سب رسولوں کو جمع کر کے ان سے پوچھے گا کہ تمہیں کیا جواب ملا؟ چنانچہ دوسری جگہ ارشاد فرمایا: وَ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا[2] قیامت کے دن وہ (مسیح) ان پر گواہ ہوں گے۔

۵۔ اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ: اگر تو انہیں عذاب دے تو یہ تیرے ہی بندے ہیں۔ اس تعبیر میں کہ یہ تیرے ہی بندے ہیں، ایک قسم کی رحم طلبی کا شائبہ ہے۔ کیونکہ اگر مقام انتقام میں ہوتے تو یہ کہتے: یہ لوگ مشرک ہیں۔ ساتھ ہی بندگی کے آداب کا اظہار بھی ہے: یہ تیرے بندے ہیں، جن پر صرف تیرا ہی حکم نافذ ہوتا ہے۔

احادیث

منقول ہے کہ سلیمان بن خالد، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھتے ہیں کہ کیا حضرت عیسیٰ (ع) نے اللہ کے جواب میں مذکورہ باتیں کی ہیں؟ فرمایا:

ان اللّٰه اذا اراد امراً ان یکون، قصّه قبل ان یکون کأن قد کان۔[3]	اللہ جب کسی امر کا ارادہ فرماتا ہے تو اس واقعہ کو اس طرح بیان فرماتا ہے کہ گویا وقوع پذیر ہوا ہے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے دن تمام رسولوں سے سوال ہو گا، خاص کر عیسیٰ (ع) سے۔

۲۔ مسیح (ع) نے کبھی شرک کی دعوت نہیں دی۔ وہ معصوم تھے۔ ایسی باتوں سے پاک تھے۔

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوۡمُ يَنۡفَعُ الصّٰدِقِيۡنَ صِدۡقُهُمۡ ؕ لَهُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِيۡ مِنۡ	۱۱۹۔ اللہ نے فرمایا: یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کو ان کی سچائی فائدہ دے گی، ان کے لیے

---

[1] یوحنا ۱۷:۳ از المنار　[2] ۴ نساء: ۱۵۹　[3] نور الثقلین۔ بحار الانوار ۹: ۲۰۰

تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡهُ ؕ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۱۱۹﴾	ایسی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں جن میں وہ ابد تک ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں، یہی بڑی کامیابی ہے۔
لِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا فِیۡهِنَّ ؕ وَ هُوَ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۲۰﴾	۱۲۰۔ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان موجود ہے سب پر اللہ کی سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر آیات

حضرت عیسیٰ (ع) کا جواب سچائی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے کہ بروز قیامت اللہ کی بارگاہ میں جو بیان دیا وہ سب حق پر مبنی تھا اور وہ اپنی ساری باتوں میں صادق القول نکلے۔ آخرت میں اللہ کے سامنے صادق القول وہ ہو سکتے ہیں جنہوں نے دنیا میں کوئی نافرمانی نہ کی ہو۔

اس کے بعد ایسے صادق القول افراد کے بارے میں جنت کی بشارت کے بعد فرمایا: رَضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ ۔ ان سے اللہ راضی ہوگا۔ حقیقی بندوں کے لیے اللہ کی رضایت کے مقابلہ میں جنت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ چنانچہ سورۂ توبہ میں جنت کے ذکر کے بعد فرمایا:

وَ رِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكۡبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۷۲﴾[1]	اور اللہ کی طرف سے خوشنودی تو ان سب سے بڑھ کر ہے، یہی تو بڑی کامیابی ہے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے دن سچ بولنے کے لیے دنیا میں گناہ نہ کرنا ہوگا: یَنۡفَعُ الصّٰدِقِیۡنَ ....۔

۲۔ ہر عمل کا مطمح نظر رضائے الٰہی ہونا چاہیے: رَضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ ....

---

[1] ۹ توبہ: ۷۲

فہرست مطالب

سورة آل عمران

سورۃ النسآء

سورة المائدة

☆☆☆☆☆